دانتوں کی جلا
اور
بقا کے لئے!
تبت ٹوتھ پیسٹ
سادہ یا کلوروفل
تبت ٹوتھ پیسٹ کے استعمال سے آپ کے دانت ہمیشہ صاف
اور چمکدار، منہ جراثیم سے پاک اور مسوڑھے مضبوط رہیں گے
کوہِ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ کراچی۔ ڈھاکہ
TIBET
TOOTH PASTE
TIBET

Habib Bank Limited
(پاکستان میں تشکیل شدہ)
قائم شدہ: ۱۹۴۱ء
حبیب بینک میں پس انداز کیجئے
پس انداز کیجئے
اور
ان کے مُستقبل کا
تحفّظ کیجئے ..
...اُس کو محض مقدرات پر نہ چھوڑیئے
حبیب بینک میں پس انداز کیجئے۔
اُن کی شادمانی اور مستقبل کی بہبودی کے لئے
باقاعدگی کے ساتھ پس انداز کیجئے۔
آج ہی فیملی سیونگ اکاؤنٹ کھولیئے۔
* حساب صرف ۵ روپے سے کھولا جا سکتا ہے۔
* ۵۰،۰۰۰ روپے تک ۲½ فیصد سود ادا کیا جاتا ہے۔
* رقومات بذریعہ چیک نکالی جا سکتی ہیں۔
مشرقی اور مغربی پاکستان میں ۲۰۲ شاخیں ہیں
حبیب بینک لمیٹڈ

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات کراچی لاہور و پشاور

جاری شدہ: ۱۹۴۵ ★ فون - ۴۳۹۹۳

مرتبہ

صہبا لکھنوی

قیمت	زر سالانہ
دس روپے	بارہ روپے

مکتبۂ افکار
رابسن روڈ کراچی

لندن آفس

۱۸- ایکل روڈ - لندن - این - ڈبلیو - ۶ - (انگلینڈ)

ڈاکٹر عندلیب شادانی

تعارف

مکرمی صہبا صاحب، السلام علیکم
ابھی ابھی آپ کا خط ملا۔ آپ حفیظ نمبر نکال رہے ہیں، اچھا خیال ہے،
آپ نے حفیظ کا ذکر کرکے خدا جانے کتنی پرانی یادوں کے چراغ روشن
کردیئے۔ مضمون تو مجھ سے لکھا نہ جائے گا۔ یہ دو سطریں گھسیٹے گھسیٹے
فی البدیہہ چند مصرعے ذہن میں آگئے۔ والسلام۔ اخلاص مند،
عندلیب شادانی

حفیظ کو جانتی ہے دنیا، حفیظ کا پھر ہو کیا تعارف
حفیظ کا نام لے دیا بس، حفیظ کا ہو گیا تعارف

حفیظ کا ذکر کیا سنائیں، رفیق دیرینہ ہے ہمارا
ہمیں وہ دن خوب یاد ہیں جب افق پہ چمکا تھا یہ ستارا

وہ اُس کی یکسر نگار نظمیں، وہ اُس کے یکسر بہار نغمے
شباب کے گل کدوں میں پہنچے جمال کی خلوتوں میں گونجے

اُسی نے بھڑکائی تھی محبت کی آگ تازہ جوانیوں میں
بہت دنوں تک بیان ہوتے رہے وہ قصے کہانیوں میں

ترتیب

تشکیلِ تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظؔ کا حصّہ ہے
نصف صدی کا قصّہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

سرِورق :۔ عبدالرحمٰن چغتائی

نگارخانے میں

ہفت رنگ

آئینہ خانے میں

بقلم خود

زخمہ بر تارِ رگِ جاں

فکر و فن

اشاریہ

سال سوا سال پہلے کی بات ہے۔

پاکستان رائٹرز گلڈ کی کسی تقریب میں جمیل الدین عالی سے (جو میرے عزیز ترین دوست اور گلڈ کے روحِ رواں ہیں اور جنہیں "بابائے گلڈ" کہنا زیادہ صحیح ہوگا) میری ملاقات ہوئی۔ دورانِ گفتگو انہوں نے مجھ سے کہا: "صہبا بھائی! 'جوش نمبر' بلاشبہ افکار کا ایک ادبی کارنامہ ہے۔ اب آپ ہی 'حفیظ نمبر' بھی شائع کیجئے۔" میں نے بلا پس و پیش جواب دیا۔ "ضرور شائع کروں گا۔ دعا کرو کہ میں جلد اپنی مشکلات پر قابو پا لوں۔" کہنے لگے: "آپ گلڈ کے اشتراک سے 'حفیظ نمبر' نکالئے۔ ذاتی طور پر میں ہر ممکن تعاون کروں گا۔" میں نے کہا: "اعلان سے پہلے حفیظ صاحب کی تحریری اجازت ضروری ہے تاکہ نمبر کے سلسلے میں ان کا عملی تعاون مل سکے۔"

یہ تھی ابتدا 'حفیظ نمبر' کی۔

کچھ عرصے کے بعد حفیظ صاحب کی خدمت میں ایک خط بھیجا گیا۔ اس خط پر عالی کے اور میرے دستخط تھے۔ حفیظ صاحب نے اس خط کا مختصر سا جواب بھیج دیا۔ اس جواب میں ایک بڑے اور عظیم شاعر کا انکسار بھی تھا اور ہمارے پُرخلوص جذبات کا احترام بھی۔ چنانچہ اجازت ملتے ہی 'جوش نمبر' کے دوسرے ایڈیشن میں میں نے 'حفیظ نمبر' کا اعلان کر دیا، اور نمبر کی تیاری شروع ہو گئی۔

حفیظ صاحب سے ملاقات کی۔ بار بار انہیں زحمت دی۔ اُن کے دوستوں اور قدر دانوں کو 'حفیظ نمبر' کے لئے خطوط لکھے — یاد دہانیاں کیں — بیشتر اہلِ قلم حضرات نے نہ صرف افکار کے اس اقدام کو سراہا بلکہ بروقت مضامین بھی ارسال کر دیئے — کئی ایک نے صرف وعدوں کا سہارا دیا — چند ایک نے معروفیت اور

بیماری کا عذر کیا۔ بعض حضرات نے جواب دینے کی ضرورت بھی نہ سمجھی ـــ البتہ سید ضمیر جعفری نے جو افکار کے دیرینہ رفیق و معاون اور حفیظ صاحب کے سچے قدر داں ہیں، قدم قدم پر نہ صرف میرا حوصلہ بڑھایا، بلکہ صحیح معنوں میں عملی تعاون دے کر کئی سخت مرحلوں کو آسان کر دیا۔ ان کی پرخلوص مساعی سے مجھے کئی غیر مطبوعہ خطوط، قیمتی مضامین اور قلمی مسودات مل گئے۔

اِدھر حفیظ صاحب نے بھی ہر ممکن تعاون فرمایا ـــ انتہائی مصروفیت کے باوجود میری درخواست پر قومی ترانے سے متعلق ایک اہم اور دستاویزی مضمون لکھا (جو آئندہ صفحات میں شامل ہے) انتخاب کلام کی زحمت گوارا کی ـــ تازہ و غیر مطبوعہ کلام عنایت فرمایا، اور کئی ایسی نادر و نایاب تصاویر عطا فرما دیں جن کے بغیر ان کی زندگی کے مختلف ادوار کا تصویری احاطہ ممکن نہ تھا اور اس طرح ایک سال کی جد و جہد اور چند در چند صبر آزما مرحلوں کے بعد آج 'حفیظ نمبر' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اور اب یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ یہ نمبر حفیظ صاحب کے شایانِ شان ہے کہ نہیں۔

سچ پُوچھیے تو یہ نمبر جمیل الدین عالی کی تحریک، گلڈ کے کسی قدر مالی اشتراک اور افکار کے تمام تر وسائل کی ایک مشترکہ اور پرخلوص کوشش ہے ـــ یہ ایک حقیر سا نذرانہ ہے زندہ دوستی، قدر دانی اور اعترافِ عظمت کا۔ یہ نذرانۂ عقیدت اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ دنیا کی زندہ قوموں کی طرح پاکستان بھی ایک زندہ قوم ہے۔ اور اس سرزمین کے وارث، اپنے اہلِ قلم اور اکابرین کی قدر و منزلت اور ان کے کارناموں کے عملی اعتراف میں کسی سے پیچھے نہیں۔

'افکار' کو فخر ہے کہ وہ 'جوش نمبر' کے بعد 'حفیظ نمبر' پیش کر رہا ہے۔ اُسے اس بات پر بھی فخر ہے کہ 'حفیظ نمبر' نکالنے کے سلسلے میں "قرعۂ فال" اُسی کے نام نکلا، ورنہ پاکستان میں نہ ادبی رسالوں کی کمی ہے نہ مرحوم ادیبوں اور دانشوروں پر ضخیم نمبر شائع کرنے والوں کی ـــ اس لئے حفیظ صاحب نے 'جوش صاحب اور 'جوش نمبر' کے بار بار تذکرے پر جو کچھ اپنے خط میں تحریر فرمایا ہے اُس کا اُنہیں حق ہے ـــ لیکن اس اظہار کا مجھے بھی حق ہے کہ جوش اور حفیظ اگرچہ ہم عصر ہیں لیکن دونوں کے راستے جدا جدا ہیں ـــ دونوں کی شاعری اور ان کے فکر و اسلوب، اظہار و بیان اور معتقدات و نظریات میں نمایاں اختلاف ہے ـــ لیکن ان اختلافات کے باوجود ادب کا کوئی طالب علم اس حقیقت سے انکار نہیں

کر سکتا کہ ان دونوں بزرگ و محترم، گرامی قدر اور عہد آفریں شخصیتوں نے گذشتہ نصف صدی کے شعری ادب پر نہ صرف گہرے اثرات ڈالے ہیں بلکہ اپنے اپنے دائرۂ کار میں اردو شاعری کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے اور جدید اور جدید تر نسل کی رہنمائی بھی کی ہے۔

گذشتہ ۲۰ سال سے 'افکار' نامساعد حالات کے باوجود زبان و ادب کی بری بھلی جو بھی خدمت کر رہا ہے، وہ افکار دوستوں سے پوشیدہ نہیں ـــــ احترامِ روایت کے ساتھ ساتھ اعترافِ عظمت وفن 'افکار' کا مسلک تھا، ہے اور رہے گا۔ چنانچہ زندہ دوستی کی جس روایت کا 'افکار' نے 'جوش نمبر' سے آغاز کیا تھا 'حفیظ نمبر' اسی کی دوسری کڑی ہے ـــ خدا دونوں کو تا دیر سلامت رکھے اور 'افکار' کو یہ مواقع فراہم کرے کہ وہ جوش و حفیظ کے بعد دوسرے اکابرین کے شایانِ شان نمبر شائع کر کے اردو ادب کی تاریخ میں زندہ دوستی، قدردانی اور اعترافِ کمال کے نئے ابواب کا اضافہ کرتا رہے۔

اس نمبر کے سلسلے میں تمام اہلِ قلم اور قدردانِ حفیظ فرداً فرداً میرے اور ساری اردو دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں جن کے پرخلوص تعاون سے 'حفیظ نمبر' مرتب ہو سکا۔ خصوصیت کے ساتھ عبدالرحمٰن چغتائی، سید ضمیر جعفری، بریگیڈیر گلزار احمد، پروفیسر محمد منوّر، دوارکا داس شعلہ، محمد خورشید عاصم اور اکرام قمر کا ممنون ہوں جنہوں نے کئی قیمتی خطوط اور نادر مسودات سے نوازا ـــــ چغتائی صاحب نے مضمون کے علاوہ 'حفیظ نمبر' کا حسین و معنی آفریں سرِ ورق بھی عطا فرما کر مزید کرم کیا۔ اگر ان کرم فرماؤں، رفیقوں اور حفیظ دوستوں کا مثالی تعاون نصیب نہ ہوتا تو شاید یہ دستاویزی نمبر اس اہتمام سے شائع نہ ہو سکتا۔

آخر میں مجھے اجازت دیجئے کہ میں پھر وہی جملہ دہراؤں جو میں نے 'جوش نمبر' پیش کرتے ہوئے لکھا تھا ـــــ

"بظاہر یہ ایک بے نام سی کوشش ہے لیکن
ہو سکتا ہے کہ یہ حقیر سی کوشش آئندہ ادبی تاریخ
کا حصہ بن جائے"

۳۰ / ۶ / ۷۳ ـــ

جمیلُ الدّین عالی

سُنتا جا شرماتا جا

زوال آمادہ اور ترقی پسند معاشروں میں ایک فرق یہ بھی ہوتا ہے کہ اوّل الذکر اپنے اکابر اور بطورِ خاص زندہ مشاہیر کے معاملے میں انفعالیت، چڑچڑے پن اور تنقیص نویسی کا شکار رہتا ہے جب کہ آخر الذکر ہر ممکن طریقے سے اُن کی ہمت افزائی کرتا ہے ان کی توقیر اور ان کے اعزاز کو بڑھاتا ہے۔ میں نے روس میں دیکھا کہ جب ناظم حکمت ترکمانستان کے دارالحکومت عشق آباد کے ہوائی اڈے پر اترے تو گو درجۂ حرارت دس زیرِ صفر تھا اور کھلے میدان میں کھڑے رہنا مقامیوں کے لئے بھی سخت دشوار تھا مگر چار پانچ ہزار کا مجمع صرف ان کی پذیرائی کو موجود تھا اور سینکڑوں لڑکے لڑکیاں ان کے دستخط لینے کے لئے لمبی لمبی قطاریں بنائے کھڑے تھے۔ امریکی 'انداز' نرالے ہیں مگر اپنے مشاہیر کی توقیر کرنے میں یہ قوم بھی کسی سے کم نہیں۔ انعام اکرام کی بات تو الگ ہے جو قوم انہیں پیش کرتی رہتی ہے۔ ابھی سنہ ۶۱ء میں جب صدر کینیڈی اپنے عہدے کا حلف لے رہے تھے تو شاعر رابرٹ فراسٹ کو بطورِ خاص اس تقریب میں مدعو کیا گیا تھا اور پروگرام میں حلف کے علاوہ صرف ایک اور مد تھی۔ رابرٹ فراسٹ کی نظم۔ یہ نظم نہ کینیڈی کا قصیدہ تھی نہ تہنیت نہ جھٹی، بلکہ امریکی قوم امریکی جمہوریہ کے متعلق ایک فلسفیانہ اور شاعرانہ بیان تھا۔

ممکن ہے یہ دونوں مثالیں حفیظ صاحب کے سلسلے میں غلط ہوں یعنی ممکن ہے کہ لاہور اور کراچی کے کافی ہاؤس والے دانشوروں یا خالص "اہلِ زبان" خواتین و حضرات کی رائے میں حفیظ صاحب چہ نسبت خاک را با عالم پاک کی ذیل میں آتے ہوں۔ میں نہ ترکی جانتا ہوں نہ انگریزی کہ ناظم حکمت اور رابرٹ فراسٹ سے حفیظ صاحب کا ادبی موازنہ کروں، مگر میں دو باتیں ضرور جانتا ہوں۔ ایک اردو زبان اور دوسرے حصولِ پاکستان کی تاریخ، اور اس سے کسی کو انکار نہیں کہ حفیظ صاحب نے ان دونوں شعبوں میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ اب کوئی غالب کوئی اقبال زمان و مکاں کی حدود پھاند کر عالمی مقابلوں میں پہونچ جائے تو یہ خدا کی دین ہے۔ اور اردو ہی کیا اتنی بڑی انگریزی زبان بھی آج تک دوسرا شیکسپیئر نہ پیدا کر سکی۔ لیکن عام طور پر اپنی بلندیوں اور پستیوں کا اندازہ اپنے ہی پیمانوں سے کرنا پڑتا ہے۔ اپنے انگریزی کے پروفیسروں کے بقول پاکستان بونوں کی دنیا ہے۔ اچھا یہی سہی۔ تو ہم بونے کیا کریں؟ صبح شام اپنی پستیوں پر روئیں، اور جو بونا ذرا قد نکالتا ہوا معلوم ہو اس کی ٹانگیں توڑ دیں اور معجزوں کے انتظار

میں کسی جن کی آمد کا انتظار کریں، یا چونکہ انگریزی کے پاکستانی پروفیسروں کے بقول اردو زبان بالکل کم مایہ ہے اس لئے صرف انگریزی شروع کر دیں۔ آخر ہمیں بھی تو اپنی محدودات کے باوجود جینے اور خوش رہنے کی آرزو ہے، اور خوشی میں ایک عنصر فخر و مباہات کے اسباب جمع کرنا بھی ہے۔

مجھے تو بہت خوشی ہے کہ ہم یونوں میں حفیظ جالندھری جیسا قد آور بونا موجود ہے جس کے گیت اور غزلیں ہماری لسانی ثقافت کا سرمایہ بنے ہوئے ہیں۔ مجھے اس کی بھی خوشی ہے کہ دنیا کے پیچیدہ سیاسی نقشے پر ایک کٹا پھٹا ملک پاکستان بھی موجود ہے جہاں خواہ مجھے ہزار ظالموں اور استحصال پسندوں کا شکار رہنا پڑے مگر میرے نام کے عربی یا فارسی الفاظ کی بنا پر کوئی میری زندگی اجیرن نہیں کر سکتا۔ اور مجھے معلوم ہے کہ اس کٹے پھٹے غریب مگر میرے لئے محفوظ پاکستان کے حصول کے لئے حفیظ صاحب نے اپنی بساط بھر کام کیا تھا۔ مثلاً وہ مسلم لیگ کے بڑے بڑے جلسوں میں ناخواندہ مگر آزادی کے آرزومند مسلم عوام کے دل شاہنامۂ اسلام سے گرماتے تھے۔ میلاد کی بڑی بڑی تقریبات میں سلام پڑھتے تھے۔ اور جن جن سرکاری اور سیاسی حلقوں اور جلسوں تک ان کی پہنچ تھی، وہاں قدرے ستے پاکستان ہی کی بات کرتے تھے۔ ان کی قومی نظموں، نعتوں اور سلاموں کی مستقل ادبی حیثیت الگ متعین ہوتی رہے گی مگر اس میں شک نہیں کہ ان کی وقتی افادیت بھرپور تھی۔ ایک تحریک ایک بہت بڑے انجن کی طرح ہوتی ہے جس میں ہزاروں چھوٹے بڑے پرزے ہوتے ہیں۔ آج ہمارے ملک میں ایسے کتنے جانے پہچانے ادیب رہ گئے ہیں جو بیک وقت اچھے شاعر بھی ہوں، اور جنہوں نے اپنے ملک کی تعمیر میں کوئی بھی مثبت کردار ادا کیا ہو۔ میں تو آج تک یہی یاد کر کے اتراتا ہوں کہ جب عربک کالج دلی میں قائد اعظم نے سنہ ۱۹۴۶ء والا عظیم الشان کنونشن منعقد کیا تھا تو میں مندوبین کو پانی پلانے والے پچاس رضا کاروں میں سے ایک تھا۔

ہاں حفیظ صاحب میں بہت سی برائیاں ہوں گی۔ اُن کے کلام میں ادبی اور لسانی خامیاں بھی ہوں گی اور پستیاں بھی، جن پر اُن کے ناقدین آزادانہ تبصرہ کریں گے ہر غیر معمولی آدمی کے عیب زیادہ معلوم اور زیادہ قابلِ گفتگو ہوتے ہیں، مگر اس کی خوبیوں، اس کی صلاحیتوں اور اس کے کارناموں کو تسلیم کرنا بھی اس کے معاشرے، اس کے ملک، اس کے ساتھیوں کا فرض ہے۔ میں حفیظ صاحب کا عاشق ہوں اس لئے ان پر کوئی محاکمہ نہیں کر سکتا۔

گلڈ کے لئے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ اسے افکار نے "حفیظ نمبر" کے لئے کسی قدر دامے درمے شریک کیا۔ سخنے کی ذمہ داری تمام تر افکار پر ہے۔

حفیظ صاحب اردو ادب کی تاریخ کا

ایک روشن باب ہیں، اور تحریکِ پاکستان

کے ایک قابلِ ذکر کارکن۔ جن لوگوں کو

اردو ادب سے دلچسپی ہے وہ حفیظ کو جانتے اور مانتے ہیں۔ جنہیں پاکستان کی ضرورت کا یقین ہے اُن پر بھی حفیظ صاحب کی بری بھلی خدمات کا اعتراف فرض ہے۔ پاکستان کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوئے ہیں اور یہاں کوئی کب آیا، اور کون کب آتا ہے کسی کے ادبی مقام یا کسی کی حبّ الوطنی پرکھنے کا پیمانہ نہیں۔ کیوں کہ یہ ایک نیا ملک ہے اور کسی ایک فرد کسی ایک جماعت، کسی ایک صوبے کی اجارہ داری کے لئے نہیں بنا لیکن جنہیں اس سے محبت، وابستگی اور اُس کے آلام و مصائب کا بوجھ اٹھانے میں اولیت حاصل رہی وہ یقیناً خصوصی توجہ کے مستحق ہیں، اور حفیظ صاحب ہمارے اکابرین اولین میں شامل ہیں۔

مجھے شبہ ہے کہ اس نمبر پر بہت سے حضرات ناک بھوں چڑھائیں گے۔ حالانکہ اپنے ایک مایۂ ناز شاعر ایک کارکن اپنے قومی ترانے کے مصنف کو ہم لے دے کر ایک رسالے کا ایک نمبر پیش کر رہے ہیں۔ اور دوسری طرف ہزاروں بلیک مارکیٹیے اسمگلر، استحصال پسند، جاگیردار، سرمایہ دار اور بدکردار اس ملک اور اس ملک کے وسائل کو روند روند کر اعلیٰ سے اعلیٰ مقام حاصل کئے جاتے ہیں اور کافی ہاؤس والے دانشور اور اصلی، اہلِ زبان، اور ہم سب اس تماشے کو ٹک ٹک دیکھتے ہیں یا کسی نہ کسی عنوان ان کی استحصال پسندی کے آلۂ کار بنے رہتے ہیں، مگر "حفیظ نمبر" کے معاملے میں بہت سی زبانیں اور قلم تیزی سے حرکت میں آجائیں گے۔ ان سے میں گذارش کروں گا کہ بابا کچھ اور نہ کر سکو تو اپنے ادیبوں ہی کی عزت بڑھاؤ۔ آج اس معاشرے میں حفیظ بہت غنیمت ہے اور اس کی بلند مقامی دانشوروں کی انفرادی اور طبقاتی محرومیوں کے زخموں کا کچھ نہ کچھ اندمال کرتی ہے۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس مضمون کو کئی حلقوں میں بوگس کہا جائے گا۔

ابو الاثر حفیظ جالندھری

ایک خط

مدیرِ افکار کے نام

بی -۲- باتھ آئی لینڈ

کراچی

میرے کرم فرما جناب صہبا لکھنوی کی خدمت میں سلام مسنون۔

آج آپ کے ارشادات کا حتمی جواب عرض کر رہا ہوں۔ اس سے پہلے میں آپ کے اور جمیل الدین عالی صاحب کے مکتوب کا مختصر جواب دے چکا ہوں۔

میری گذارش کا مفہوم واضح تھا کہ "حفیظ نمبر" نکالنے کا خیال اور اس کا اظہار میری عزت افزائی ہے۔ آخر وہ کون شاعر ہے جسے کسی نہ کسی جہت سے اہلِ دانش و بینش کے حضور پیش کیا جائے تو وہ منہ سے اظہارِ انکسار کرتا ہوا اندر ہی اندر اپنی اہمیت پر پھولا نہ سمائے۔ میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آپ کے اور پاکستانی اہلِ قلم کی جمعیت کے اشتراک سے اس عزت افزائی کے ارادے کا اظہار پاکر مسرت ہوئی۔ لیکن اپنی ذات کے محاسبے میں یہ مسرت دیر پا نظر نہیں آئی تھی۔ اسی وجہ سے انتہائی سادگی اور صاف گوئی سے میں نے عرض کیا تھا کہ ابھی مجھ سے بہتر لوگ زندہ موجود ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ پہلے اُن سے نپٹ لیں، پھر اگر زندگی ہی میں میری باری بھی آگئی تو میرا چلتا دھندا بھی ہو جائے گا!

معلوم ہوتا ہے آپ صاحبوں نے میری بات نہیں مانی، اور اعلان فرما دیا۔ اور اس اعلان میں بھی جوش نمبر کا حوالہ دیا ہے۔ اور مجھ سے تین دن کے اصرار میں بھی بار بار فرمایا ہے کہ چونکہ "جوش نمبر" نکالا جا چکا ہے لہٰذا اب اگر "حفیظ نمبر" نہ نکلا تو کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔

"کیوں اچھی بات نہ ہوگی؟" اگرچہ میں یہ بات اچھی طرح سمجھ نہیں سکا۔ تاہم آپ نے ایک بہت ہی موٹا تازہ مجموعہ اذکار "جوش نمبر" کی صورت میں مجھ پر نازل کر دیا ہے۔ اور میں نے مفت راہ گفت کہتے ہوئے جلد جلد

اس کے ورق اُلٹے اور سرسری نگاہ بھی ڈالی ہے۔ سمجھ گیا ہوں کہ اچھی بات اب یہی ہے کہ یا تو چپ رہوں یا آپ کے حکم کی تعمیل کروں۔ ع

چڑھ جا بیٹا سُولی۔ رام بھلا کرے گا

یعنی جیسا کچھ بھی میرے معاصرین میں سے چند اہلِ نظر مجھے دیکھتے ہیں ایک ہی آئینۂ افکار میں اپنی مختلف صورتیں جیتے جی میں خود بھی دیکھ لوں۔ آپ کے اعلان کے بعد اب کوئی چارۂ کار ہو بھی تو نہیں سکتا۔ کیوں کہ اگر آپ مجھ سے پوچھے بغیر ہی افکار کو "حفیظ نمبر" کا نام دے کر جو جی میں آئے چھاپ دیں تو میں کیا کرلوں گا!

جالندھری ہوں تو کیا ہوا۔ اردو زبان کے شاعروں ہی میں گنا جاچکا ہوں۔ محفلوں مشاعروں میں بھی جانا بند نہیں کیا۔ تعلیمی، معاشرتی مجالس میں بھی انٹ سنٹ اردو ہی میں کہہ سناتا ہوں۔ انجمنوں کے لئے چندے بھی ابھی تک دلواتا ہوں۔ پھولوں کے ہار پہنے ہوئے ان تقاریب کی بازی بہ زعم خود جیت کر اپنی حیات کے عملی میدانوں سے گزرتا ہوں۔ قدم قدم پہ اپنے ہاروں کے انبار پر اپاہج اور گلکار رلا دے ہوئے گھر پہ پہنچتا ہوں، اور ایک مسکراہٹ مسکراتا ہوں جو دوسرے نہیں دیکھ پاتے ــــ! ورنہ وہ میری حماقتوں پر اور بھی قہقہے لگاتے۔ یہاں ایک تازہ شعر سن لیجئے ؎

خونِ جگر آنکھوں سے نہ ٹپکا، منہ سے شعلہ بن کر لپکا
شعبدہ گر ہوں، مجھ پر ہنسئے میں بھی ہنستا ہی تو رہا ہوں

میرے بھائی۔ جب زندگی یہی ہے تو لیجئے اوکھلی میں سر رکھے دیتا ہوں۔ یعنی دھمکیوں کے لئے اگر میری اجازت کی ضرورت ہے تو دنیا کی نگاہوں سے غیب ہوجانے سے پہلے اجازت حاضر ہے۔

چونکہ آپ "حفیظ نمبر" نکالنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں اور اس سلسلے میں مجھ سے بھی تعاون چاہتے ہیں تو لیجئے۔ جو تعاون میں پیش کرسکتا ہوں اس کی طرف اشارا کئے دیتا ہوں۔

چونکہ آپ نے بار بار "جوش نمبر" کا حوالہ دیا ہے۔ اس لئے حفیظ نمبر کے سلسلے میں میرا اولین تعاون یہ ہے کہ میں آج خود اپنے ہی قلم سے یہ واضح کردوں کہ میں شعر و شاعری کی کسی حسینۂ نازنین کے معاشقے میں جوش کا رقیب نہیں ہوں۔

جنابِ محترم شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی سے میری شناسائی کا آغاز سنہ ۱۹۲۱ء سے ہے۔ ان دنوں میں جالندھر سے ادبی رسالہ "اعجاز" اپنے استادِ ملک الشعرا مولانا غلام قادر گرامی کی سرپرستی میں نکالنے کے مبادیات طے کر رہا تھا۔ اس دوران دہلی، میرٹھ، کانپور، رام پور، لکھنؤ، اور دوسرے اردو مراکز کی سیاحت کے لئے نکلا تھا۔ تاکہ بزرگ اور محترم ادبا و شعرا سے ذاتی تعارف کا شرف حاصل ہوجائے۔

گرامی صاحب نے مجھے دہلی میں حکیم اجمل خاں اور جناب نواب سائل کے نام، لکھنؤ میں مولانا عبدالحلیم شرر کے نام تعارفی خطوط دیئے تھے۔ لکھنؤ میں جناب عزیز لکھنوی سے بھی ملاقات ہوئی۔ تو عزیز مرحوم نے اپنے شاگردوں کے طور پر جناب جوش اور جناب مرزا جعفر علی خاں اثر کا تذکرہ کیا۔

جوش صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام شائع ہو چکا تھا۔ میں نے بھی لکھنؤ ہی میں اس سے استفادہ کیا ــــ یہ کتاب دوسرے شعرا کے دواوین سے قدرے الگ نظر آئی۔ مرزا صاحب سے کان پور میں جا کر ملا۔ بلکہ اُن کا مہمان رہا۔ کان پور ہی میں جناب حسرت موہانی اور جگر صاحب سے ملاقات کا شرف ملا تھا۔ اُنا وُ میں جگ موہن لال رواں سے تعارف ہوا تھا۔

جوش صاحب سے میں ملیح آباد جا کر ملاقی ہوا تھا۔ میری ملاقات چند ہی ساعت کی تھی۔ اُس وقت سے ذاتی شناسائی ہے۔ ان سے بعد میں بھی کبھی کبھار محض بر سر محفل مشاعرہ یا کسی بزم احباب میں ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ بہت لمبی نہ تھیں میرے اُن کے مشاغل ہم رنگ نہیں۔ اور ہم خیالات اور اظہار خیالات میں بھی ہم آہنگ نہیں۔

غزل میں تو بہت سے شاعر اپنی اپنی جداگانہ روش کے باوجود ایک قدر مشترک رکھ سکتے ہیں۔ لیکن قلب و نظر کے معاملے میں تضاد ہو تو ہم عصری ہمرہی نہیں ہو سکتی۔

جوش کی شاعرانہ دھوم دھام کا قائل ہوں۔ لیکن مجھے کوئی حق نہیں کہ ان کے فنی کمال یا زوال پر کچھ کہوں جوش صاحب تو خیر بڑے نامی نامور ہیں۔ میں تو کسی مبتدی کے بارے میں رائے کیا اس کو فنی مشورہ دینے سے بھی ڈرتا ہوں۔ میں تو اتنی بات کسی "نو مشق" سے بھی نہیں کہہ سکتا کہ بھائی جو کہنا چاہتے ہو اپنے ذہن کے ترازو میں اس کو تول لو۔ اور اظہار خیال کے لئے وہی الفاظ ڈھونڈ نکالو جن کے بغیر بات نہیں بنتی۔ اور پھر ان کو اپنے موضوع کے مقام پر بٹھانے کی زحمت بھی گوارا کر لو۔ کیوں کہ سینہ کاوی کے بغیر خیال شعر بن کر جریدۂ عالم پر ثبت نہیں ہو سکتا ــ

خشک سیروں تن شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

میرا تجربہ ہے کہ اپنے خاص الخاص اصلاح طلب کے علاوہ کسی شاعر کو مشورہ دینا اس کو ہمیشہ کے لئے دشمن بنا لینا ہے۔ جب یہ صورت ہو تو فرمایئے جوش ایسے نامی شاعر پر کچھ کہنا مجھ سے کہاں ممکن ہے۔

میں مقصدیت کے پیشِ نظر حالی اور اقبال سے متاثر ہوں۔ معاشرے کی ذہنی اور عملی صحت کے لئے، عفتِ خیال و نظر کے لئے اپنی بساط کے مطابق اپنی صلاحیتِ فن کو استعمال کر رہا ہوں۔ لہٰذا میں جوش صاحب کے ساتھ بانہہ میں بانہہ ڈال کر کیسے چل سکتا ہوں۔

مجھے یہ حروف بھی لکھنے پڑے۔ کیوں کہ آپ نے اپنے قول کے مطابق "حفیظ نمبر" نکالنے کی ضرورت اس لئے محسوس کی ہے کہ آپ جوش صاحب کا نمبر نکال چکے ہیں اور وہ نمبر آپ کے نزدیک کامیاب رہا ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ حفیظ تو شاعرِ پاکستان مشہور ہے "حفیظ نمبر" بھی وہی رنگ لائے گا۔ مجھے معاف کر دیجئے صہبا صاحب اگر آپ بار بار جوش نمبر کا حوالہ نہ دیتے تو میں ہرگز یہ سطور نہ لکھتا۔

دیکھئے۔ جوش نمبر کے لئے لکھنے والے جو بزرگ ہیں اس طرز کے لوگ حفیظ نمبر کے لئے لکھنا پسند نہ کریں گے۔ یقیناً بقول آپ کے میری سب سے یاد اللہ ہے۔ ان میں سے اکثر اہل نظر بھی ہیں۔ اسلوب بیان کی نزاکتوں کو

اور زبان کی آنوٹوں کو جاننے والے بھی ہیں۔ میری تحسین بھی فرماتے ہیں۔ لیکن یہ نہ بھولئے کہ جہاں مقصدیت کم ہو لیکن پرانا جذبۂ تربیت وطنیت وافر ہو ــــ وہاں ؏

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

کا نقش ہر عالم پیدا و ہویدا رہتا ہے۔

مختصراً آپ سے میرا تعارف فی الحال یہ ہے کہ میں سب سے پہلے آپ کو اس امر سے خبردار کر دوں کہ میرے قدر دانوں کا حلقہ تو محض عوام الناس ہیں۔ ہندو ہوں یا مسلمان، دل تو رکھتے ہیں لیکن زبانِ قلم سے کام نہیں لے سکتے ؏

میں عامی ہوں مخاطب ہی عوام الناس ہیں میرے

یا پھر وہ اہلِ قلم ہیں، جو میری ہی طرح ؏

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

کا ورد کرتے ہوئے میرے ہم نوا اور میرے ہم قافلہ ہیں۔ ہاں وہ سب میرے قدر دان اور مجھ پر مہربان ہیں۔ وہ اہلِ قلم ہی نہیں اہلِ قلب و نظر بھی ہیں۔ لیکن وہ ابھی تک تعمیرِ مقاصدِ پاکستان میں منہمک ہیں۔ خود اپنی ذاتی نمود کی نہ ان کو پروا ہے نہ فرصت۔ وہ تو تخریب کاروں کے ہجوم میں چند مٹھی لپٹے ہوئے ملت و ملک ہی کے کام میں لگے ہوئے ہیں جس کام میں ان کو ؏

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

لہٰذا میری ذات کی جو نمود آپ پیش کرنا چاہتے ہیں میں نہیں سمجھتا کہ آپ ان میں سے (چند ایک کے سوا) بہت سوں سے میرے سلسلے کے لئے محض حفیظ کا نام لیتے ہی کچھ لکھوا کر منگا لیں گے۔ آپ کہیں گے کہ پھر وہ قدر داں کن معنوں میں ہیں؟

ہاں وہ ان معنوں میں قدر داں ہیں کہ مجھے خدمتِ ملی میں اپنا ساتھی جانتے ہیں۔ کیا میرے لئے اس سے اور بھی بڑی کوئی سعادت ہے؟

مناسب یہ ہے کہ آپ مجھ سے حفیظ پر لکھنے والوں کے نام نہ پوچھئے۔ میرا تعاون یہ ہے کہ میں آپ کو ایک نام ایسا بتا دوں جو مجھ پر لکھنے والوں کو مجھ سے بہتر جاننے والوں میں ایک ہے۔ یہ نام سید ضمیر جعفری صاحب کا ہے ــــ میرا پنجاہ سالہ جشنِ حیات منانے کے دو اولین مفکرین میں ایک ضمیر صاحب بھی تھے۔ ان سے اگر کچھ طلب کیا جائے تو وہ سید بادشاہ بھی ہیں۔ سید داد و دہش سے انکار نہیں کیا کرتے۔ ان کو پنجابی لہجے میں "بادشاہو" کہہ کر آپ قابو میں لاسکتے ہیں۔ اور وہ آپ کو اچھے اچھے لوگوں کے اسمائے گرامی کے علاوہ اور بھی بہت کچھ بتا سکتے ہیں۔ پاکستان میں تو ہر وقت عوام الناس ہی نہیں اہلِ قلم کے سامنے بھی ہوں۔ ضمیر صاحب ان کو مجھ سے بہتر طریقے پر مخاطب کر سکتے ہیں ــــ

ہاں، یہ سچ ہے کہ میرے یارانِ قدیم میں سے اولین۔ مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی ہیں۔ پھر ایم اسلم ہیں،

صوفی غلام مصطفٰے تبسم ہیں، ڈاکٹر نذیر پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور، اور حمید احمد خاں پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور ہیں سید ذوالفقار علی بخاری ہیں، امتیاز علی تاج ہیں۔ سید عابد علی عابد ہیں۔ اللہ ان کو میری رحلت کے بعد کم از کم تیس تیس برس زندہ رکھے، تاکہ میری موت پر مضحکہ انگیز یا متانت آمیز حرکات پوچھنے والوں کو مواد مل سکے۔ لیکن میں ان کو خود کبھی اپنی ذات پر لکھنے کے لئے نہ کہوں گا۔

اور وہ جو چل دیئے ہیں، ان میں میرے محسن اور بزرگ بھی تھے۔ اور حلقۂ نیازمندان لاہور بھی اور بہت سے اور بھی ——— مولانا گرامی، شیخ عبدالقادر، پنڈت برجموہن دتا تریہ، علامہ اقبال، سر راس مسعود، بابائے اردو مولوی عبدالحق، سالک، تاثیر، حسرت، پطرس، ایسے بزرگوں اور دوستوں کو اب میں کہاں سے لاؤں۔ سروجنی نائیڈو، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، قاضی عبدالغفار، مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی، حکیم اجمل خاں، جناب منّی، جناب ناطق لکھنوی، جناب سائل و بیخود دہلوی، جناب فانی بدایونی، سب مجھے بہت ہی قریب سے جاننے اور اپنی مرضی کا ماننے والوں میں سے تھے۔ اب وہ عالم بالا پر ہیں اور وہاں سے ؎

پیام آرہے ہیں مرے دوستوں کے　　　مری راہ اہل عدم دیکھتے ہیں

میری دعا ہے کہ جو زندہ ہیں وہ تادیر سلامت باکرامت رہیں۔ بقول داغ ؎

خدا زندہ رکھے مرے دوستوں کو　　　بہت چل بسے اور کھڑے رہے ہیں

رہ گئے، وہ جو مجھ سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ جن کو اصلاح میں شاگرد کہتے ہیں، نام تو بہت ہیں۔ لیکن وہ شاعری میں بدنام کم ہیں۔ بغاموں میں ہری چند اختر پر لوک سدھار چکے۔ کرشن کانت مالویہ بھی مدت ہوئی جا چکے۔ جو باقی ہیں وہ بھارت میں ڈیرے جمانے کے بعد اپنے ہی خول میں سما چکے ہیں۔ مجھے کیا یاد رکھیں گے جو خود اپنی پرانی ادبی زندگی بھلا چکے ہیں۔ بزرگ شاعروں میں تلوک چند محروم دہلی میں اور جناب پنڈت جوش ملسیانی نکودر کے اندر اپنے اپنے آل پریوار میں مگن ہیں۔ میرے لئے اُن کا مگن رہنا ہی سب کچھ ہے۔

میرے نونہالوں میں بھارت کے اندر دیوان برندرا ناتھ، ظفر پیامی ہیں۔ میرے پرانے دوستوں میں بابا پیارے لال بیدی ہیں۔ سیاسی لوگوں کا میں ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ ورنہ شیخ محمد عبداللہ شیر کشمیر اور ان کے ساتھ ہی چند ایسے نام لیتا جو اس نیم برعظیم اور خاص طور پر کشمیر کی آزادی کے سلسلے میں شعر و شاعری اور زبان کشائی کے ذریعے بیڈول نہیں۔ میری بے ڈھول خدمات کے شاہد انِ عادل ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، ڈاکٹر سید عابد حسین، جناب سیدین سید محمد مہدی (نواب مہدی نواز جنگ) بلکہ بھارت کے ان سے بڑوں سے بڑے لوگ بھی ہیں۔ لیکن ابھی وقت نہیں آیا کہ وہ آزادی کے بعد مجھے اپنا گھر بنانے کے موجودہ عالم میں دیکھ کر پرانی بے گھری کی کش مکش اور ان حسین یادوں کو دہرائیں۔ جب اپنے اپنے رنگ سے ہم سب انگریزی زنجیریں توڑنے کے لئے ممد و معاون تھے۔

بات یہ ہے کہ سیاستین ابھی تک اُن اہل قلم کو یہاں بھی اور وہاں بھی وہ مقام دینے کی فرصت نہیں پا رہے جن کی سینہ کاویوں سے زندگی زندگی بنتی ہے۔ اور جو دلوں کو جوڑتے ہیں، توڑتے نہیں۔

بھارت میں خالص ادب و شعر کی وجہ سے مجھے عزت بخشنے والوں میں میرے پیارے رشید صدیقی ہیں لیکن اب

نہ جانے کیوں میری ان کی خط وکتابت بھی دم سادھ چکی ہے۔ جناب نیاز کو جو کچھ کہنا تھا میری جوبلی کی تقریب پر فرما چکے۔ اور میرے لئے وہ کافی ووافی ہے۔ البتہ طعن وطنز اور گالی گلوچ کی ضرورت ہو تو بزرگوں کے حلقوں میں سے کسی ایک کو چھیڑ دیجیے۔ ادبی بزرگوں کے چھتے وہاں بھی ہیں اور یہاں بھی۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ چونکہ مجھ پر بزرگوں کا ڈنک ابھی تک اثر نہیں کر سکا۔ اس لئے وہ بھی شاید ہی آپ کی مدد کریں۔

بھارت میں دوارکاداس شعلہ کو لکھئے۔ وہ مجھے بہت کچھ جانتے ہیں۔ میں نے ان کو ان کی عنفوان شباب کے وقت شاعری کے لئے خوار ہوتے دیکھ کر شاگردوں کی دھما چوکڑی سے بچایا تھا۔ اور ان کے پتا سے میں نے مسلمان اور شاعر ہونے کے باوجود "بھلا مانس" ہونے کا خطاب بھی پایا تھا۔ اگر دوارکاداس نے اپنی خاندانی جھنجھٹوں سے فرصت پا کر کچھ لکھ دیا تو وہ جہاں تک میرے پرانے ملنے جلنے والوں اور شعر و شاعری کی وجہ سے جاننے والوں کا تعلق ہے ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں ہو جائے گا۔ رہ گیا میں "بقلم خود"۔ کاش آپ جان سکتے کہ میں کس قدر الجھا ہوا ہوں۔ دلجمعی موجود نہ ہو تو مربوط تحریر ممکن نہیں۔ آپ نے فوٹو بھی مانگے ہیں۔ حسینوں کی چند تصاویر تو میرے پاس نہیں ہیں۔ کیوں کہ میں تو اس عالم میں رہا ہوں کہ میرا اپنا شعر میری زبان پر ہے ؎

اپنی نگاہ کے سوا کچھ بھی نہیں میں دیکھتا — خود کو بھی دیکھنا ذرا اہلِ نظر میں کون ہوں!

میری نظر میں مجھ سے بڑا حسین کوئی ہے ہی نہیں۔ جس کی تصویر سے البم سجاتا پھروں۔ اپنی ہی صورت کے چند پہلو میں آپ کو دے دوں گا۔ جن پر میں نے خود یہ لکھا ہے ؎

ہے حسن یہی شئے تو کہاں اور تہ کیجئے — سودا نہیں مطلوب ذرا دیکھ رہا ہوں

خطوط۔ ہاں خطوط کے لئے بھی ضمیر جعفری سے پوچھئے وہ کسی نہ کسی سے لے دیں گے۔ ضمیر میری موت کے جلد وارد ہو جانے کی غیر متوقع خبر کی توقع مدتوں سے رکھتے ہیں۔ اور ان معاملات میں چاق و چوبند رہنے والے انشا پرداز ہیں۔ وہی آپ کی مدد کر سکے۔ میرے اپنے خطوط بھی حسینوں کے لئے نہیں ہوں گے۔ جو لوگ میری اپنی ہی وضع قطع کے ہیں اُن ہی کو کبھی خط لکھتا یا جواب دیتا ہوں۔ اور میں خط لکھنے میں انتہائی گھامڑ اور بے ربط ہوں۔ بے تکلف دوستوں سے عبارت آرائی بھی میرا مقصود نہیں ہوتا۔ البتہ آپ نے قومی ترانے کے بارے میں مجھے اپنی زبان قلم سے کچھ لکھنے کی جو فرمائش کی ہے میں کچھ نہ کچھ مختصر اس سلسلے میں ضرور لکھ دوں گا۔

لیجئے۔ اب خط بہت لمبا ہو گیا ہے۔ آپ کی بات نہیں بنی، تو اداریہ کر لیجئے۔ یا مان لیجئے کہ مجھ میں بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ جتنا کچھ بھی میں بن چکا ہوں اس کی مرمت کا اہل نہیں رہا۔ اب دوسرے جو کچھ مجھے بناتے ہیں بنوا دیجئے۔

آپ کے افکار کی حفیظ نمبر کی آمد آمد مجھے تو جس رنگ سے نظر آ رہی ہے میرے لئے اپنے ہی ایک شعر کی صورت ہے ؎

پری رُخوں کی زباں سے کلام سن کے مرا
بہت سے لوگ مری شکل دیکھنے آئے

دعاگو حفیظ

۳۱ر جولائی سنہ ۱۹۶۲ء

حفیظ کی خدمات

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں
صدر پاکستان کی نظر میں

"ملت اور ادب کے لئے حفیظ کی عظیم الشان خدمات اس قدر واضح ہیں کہ میری طرف سے کسی تعریف کی ضرورت نہیں؛ اُن کی لافانی تصنیف "شاہنامۂ اسلام" میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک رزمیہ نگاری کا تعلق ہے معلوم و معروف لٹریچر میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ حفیظ نے اس میں اسلام کی عظمت رفتہ کے نقوش کو اپنے مخصوص، دل نشیں اور پیارے انداز میں اُجاگر کیا ہے۔ ہمارے سپاہیوں کے لئے اس میں جوش و عزیمت کے جوچشمے بند ہیں، ایک سپاہی کی حیثیت سے، میرا دل اُسے اچھی طرح سے محسوس کر سکتا ہے۔"

(اقتباس پیغام جشن طلائی حفیظ منعقدہ مئی ۶۵ء بمقام راولپنڈی)

پیغام

جناب عبدالمنعم خان گورنر مشرقی پاکستان

" مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ " افکار" کراچی نے " حفیظ نمبر" شائع کرنے کا عزم کیا ہے ۔

وقت کی سب سے بڑی ضرورت بیمار معاشرے کا علاج ہے ۔ سائنس کی زبردست ترقی کے باوجود انسان کی روحانی بے سروسامانی بڑھتی جا رہی ہے ۔ اس خطرناک صورتِ حال کا مقابلہ صرف اسلام ہی کر سکتا ہے ۔ مسلمانوں کی مذہبی، رُوحانی، اور ثقافتی بیداری میں بلاشبہ حفیظ جالندھری کا بڑا ہاتھ ہے ۔ اس اسلام دوست شاعر کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا ارادہ لائق ستائش ہے ۔ اس سلسلے میں "افکار" کو میں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں ۔

مجھے امید ہے کہ " حفیظ نمبر" ادب، تہذیب اور ثقافت کا بہترین ترجمان ہوگا ۔ میں اس کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں ۔"

ص۔ل

حفیظ جالندھری

زندگی شخصیت اور فن کا ایک جائزہ

- نام ــــــ محمد حفیظ
- تخلص ــــــ حفیظ
- کنیت ــــــ ابوالاثر
- تاریخ ولادت ــــــ ۱۴ر جنوری سنہ ۱۹۰۰ء
- مقام ولادت ــــــ جالندھر۔ پرانے صوبۂ پنجاب کا ایک بہت ہی قدیم شہر

اَبّ وجَد

خاندان ــــــ مسلم راجپوت۔ گوت چوہان۔ مسلمان ہوجانے کے باوجود رانا۔ راجہ اور ٹھاکر بہت سے افراد خاندان کے نام کے ساتھ وابستہ رہا۔

والد ــــــ حافظ شمس الدین
(سنہ ۱۹۴۰ء میں وفات پائی)

والدہ ــــــ بتول
(سنہ ۱۹۲۵ء میں انتقال کیا)

دادا ــــــ رانا حاجی مہرالدین
حج کے لئے گئے تھے۔ حج کے بعد مدینہ منورہ گئے۔ واپسی پر بہت دنوں مکہ اور جدہ کے درمیان اپنے والد کے مزار پر روزانہ حاضری دیتے رہے۔ ایک سال وہیں گذار دیا۔ دوسرا حج کرکے واپس آئے۔ ساری عمر "بابا مکہ" کہلائے۔

پردادا ــــــ رانا امام بخش خاں
سکھوں کے خلاف مجاہدان سید احمد شہید بریلوی کے امدادی تھے۔ جب انگریزی عملداری پنجاب میں بھی ہوگئی تو سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی (جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا) میں معتوب ہوگئے۔ اشتہاری ملزم قرار پائے۔ عرب کی طرف ہجرت کی، راہ میں مولوی رحمت اللہ سے ملے۔ جدہ اور مکہ کے درمیان وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

سگڑدادا : رانا ٹھاکر عبدالشکور

ریاست جودھ پور کے چوہان خاندان کے ایک معزز فرد رانا ٹھاکر پرتھوی سنگھ — جو فرخ سیر کے دور میں اپنے کنبے سمیت اسلام قبول کر کے رانا عبدالشکور کہلائے حفیظ کے سگڑ دادا تھے۔

آپ مسلمان ہونے کے بعد جودھ پور سے ہجرت کر کے ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر میں مقیم ہوئے جہاں انہیں جاگیر بخشی گئی تھی۔ مرہٹوں سے جہاد کے لئے احمد شاہ ابدالی اس راہ سے گذرا تو اس کی فوج میں اس کنبے کے ۳۲ افراد شامل ہو گئے۔ پانی پت کی تیسری لڑائی میں حافظ رحمت خاں شہید روہیلہ کی اسلامی فوج میں شامل کئے گئے جو رحمت خاں کے فرزند عنایت خاں روہیلہ کی سرداری میں ابدالی کی کمک پر آئی تھی۔ یہ بائیس کے بائیس نو مسلم مجاہد سب پانی پت میں شہید ہو گئے۔

بھائی بہن

سگا بھائی کوئی نہیں۔ ایک سوتیلا بھائی اور اس کی اولاد موجود ہے۔ اور حفیظ صاحب ان کی اپنے مرحوم والد کی طرح عزت کرتے ہیں اور ان کے بچوں کی خدمت اپنی والدہ کی وصیت کے مطابق اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

دو حقیقی بہنیں اور ان کی اولاد دیں بھی موجود ہیں

تعلیم و مطالعہ

والدہ نے کلمۂ طیبہ، کلمۂ شہادت، درود، الحمد اور قل ہو اللہ کی سورتیں تین چار برس کی عمر میں ہی یاد کرا دی تھیں۔

ابتدائی تعلیم کا آغاز سنہ ۱۹۰۵ء میں جالندھر کی حوض والی مسجد میں ہوا۔ ناظرہ قرآن پڑھا — اور کریما، مقیماں زبانی رٹ لیں۔

سنہ ۱۹۰۷ء میں مشن ہائی اسکول کی ایک شاخ پرائمری اسکول میں داخل ہوئے تین ہی مہینے میں دوسری جماعت میں آ گئے۔ پھر یہ اسکول چھوڑ کر گورنمنٹ ہائی اسکول جالندھر کی دوسری جماعت میں داخلہ لیا — سنہ ۱۹۰۹ء میں دوآبہ آریہ اسکول میں چوتھی جماعت میں داخل ہوئے۔ وہاں ایک آریہ سماجی لڑکے نے ".... و شوکا نے مُسلیا" کہہ دیا۔ حفیظ کے ہاتھ میں قلم تراش تھا وہ مار دیا۔ چنانچہ آریہ اسکول سے نکل پڑا کچھ دنوں بعد مشن ہائی اسکول میں آ گئے۔

شعر و شاعری اور قصے کہانیاں پڑھنے کی لت تھی اسکول سے ساتویں جماعت کا امتحان دے کر گھر سے کھائے گھرے ہوئے۔ اس کے بعد کسی تعلیمی ادارے سے منسلک نہیں ہوئے۔ البتہ اپنے ذوق و وجدان سے وسیع پیمانے پر مطالعہ کیا، اور اردو کے علاوہ ہندی، فارسی اور انگریزی

پہلا شعر

سنہ ۱۹۰۷ء میں جب زیرِ تعلیم تھے
سات سال کی عمر میں پہلا شعر کہا

محمدؐ کی کشتی میں ہوں گا سوار
تو لگ جائے گا میرا بیڑا بھی پار

پر بھی قدرت حاصل کر لی۔

مسجد کے جدی امام کے علاوہ مولوی عبدالوہاب جو سید احمد شہید کی تحریک آزادی کے ایک مجاہد تھے، ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا حفیظ پر اب تک اثر ہے۔ اور اسکول میں بابو لال جی کبڑے کی قمیصوں اور مولوی فتح دین کی گھڑیوں چھڑیوں کا بھی۔ یہ وہ اساتذہ ہیں جن کا حفیظ کے دل پر گہرا نقش ہے۔

فارسی میں حفیظ نے مولوی سید احمد علی شاہ کی خصوصی توجہ سے درک حاصل کیا۔

اوائل عمر میں قرآن مجید اور دیگر مذہبی کتب کے علاوہ اخلاقی کتابوں سے بھی متاثر ہوئے۔ اس کے بعد ناول اور ہلکی پھلکی ادبی کتابوں کا وسیع پیمانے پر مطالعہ کیا۔ طلسم ہوشربا۔ فسانۂ آزاد، آرائش محفل اور مولوی نذیر احمد کی کتابوں سے ذہن ابھی تک متاثر ہے۔ مولانا گرامی سے تعلق قائم ہونے کے بعد فارسی شعر و شاعری کا بھی مطالعہ کیا۔ عربی لغات اور قرآن پاک کی تفاسیر سے اب بھی شغف ہے۔

پہلی غزل

سنہ ۱۹۱۱ء میں جب حفیظ صاحب چھٹی جماعت میں تھے پہلی غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

خواب میں دلدار کی تصویر ہم نے دیکھ لی
رات کو جاگی ہوئی تقدیر ہم نے دیکھ لی

شادی - بیوی - بچے

پہلی شادی سنہ ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ سسرال لاہور میں تھی۔

پہلی بیوی کا نام "زینب خاتون" تھا۔ رخالہ کی بیٹی تھیں) اس بیوی کے بطن سے آٹھ لڑکیاں پیدا ہوئیں پانچ زندہ ہیں۔

دوسری شادی پہلی بیوی کی موجودگی میں سنہ ۱۹۳۹ء میں ہوئی۔ دوسری بیوی کا نام "انیلا" تھا جو انگریز خاتون تھیں۔

شادی سے پہلے اس انگریز خاتون نے "Hafeez - Poet son of India" نامی کتاب لکھی۔ اس میں حفیظ کی سوانح حیات بیان کی گئی ہے۔ یہ شادی حفیظ کی پہلی بیوی کے ایما سے ہوئی تھی۔ اس امید میں کہ شاید ایک اولاد نرینہ ودیعت ہو۔ لیکن اس سے بھی ایک بیٹی ہی ملی۔ سوکنوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ آخر یہ رشتہ سنہ ۱۹۵۲ء میں طلاق پر ختم ہوا۔

اس انگریز بیوی سے حفیظ کی ایک بیٹی ہے جس کی پرورش حفیظ کی دوسری بیٹیوں کے ساتھ ہی ہوئی۔ اور اب لاہور کے ایک ہاشمی خاندان میں اس کا عقد ہو چکا ہے۔ یہ خاندان لندن میں کاروبار کرتا ہے۔

تیسری شادی۔ حفیظ کی پہلی بیوی زینب کا سنہ ۱۹۵۴ء میں انتقال ہو گیا۔

حفیظ کا ارادہ شادی کا نہ تھا۔ لیکن اس کی مصروفیات تھی اور گھریلو ذمہ داریوں کے علاوہ شاید بہنوں کے لیے ایک بھائی کی حسرت بھی تھی۔ گھر میں ناکتخدا لڑکیوں اور دو بیوہ لڑکیوں کی اہم ترین ذمہ داری اور رات دن قومی جلسوں اور ہر مقام پر قومی شاعر کی طلب اسے پریشان کر رہی تھی۔ حسن اتفاق سے آپ کے کلام کی ایک قدردان خاتون نے جو حفیظ کی بیگم کا پرسہ دینے آئی تھیں، رفتہ رفتہ حفیظ کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانے کا حوصلہ دے کر

سنہ ۱۹۵۵ء میں حفیظ کی رفیقۂ حیات بن گئیں۔ اُن کے بطن سے بھی ایک بیٹی سیزیرین آپریشن سے پیدا ہوئی۔ حفیظ نے اس کا نام "رضائے حفیظ" رکھا۔ یہ بھی حفیظ کی ساتویں بیٹی ہے۔ اور حفیظ اسے اپنی روح بھی کہتے ہیں، اور اپنی ساری زندگی کا آخری حرف گردانتے ہیں۔

ذوقِ شعر و شاعری

لڑکپن میں نعت خوانی کا شوق تھا۔ قوالی کی محفلوں میں بھی شوق سے جاتے۔ اس دور کے میلے ٹھیلے جلسے جلوس ناچ رنگ وعظ و نصیحت اور ہندوؤں کے نگر کیرتن سادھو سنتوں کے بھجن سب حفیظ کے لئے دلچسپی کا سامان تھے۔ تھیٹر دیکھا تو اس کے رسیا ہو گئے۔ کسی واعظ نے مثنوی رومی لحن سے سنا دی، تو بس مثنوی کا مطالعہ کرنے لگے۔ بیساکھی میں سکھ بھولیوں کی ٹولیوں میں پنجابی بولیاں گھڑنے اور ٹولی کے ساتھ گشت لگانے لگے۔ غرض کہ ایک طوفانِ حیات تھا جو اس چھوٹے سے وجود میں سمایا تھا۔

پہلی مطبوعہ نظم!

سنہ ۱۹۱۷ء میں آپ کی پہلی نظم "کوئی سامان پیدا کر" کے زیرِ عنوان روزنامہ "زمیندار" لاہور میں شائع ہوئی۔ یہ نظم ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست کا آغاز تھا۔ اس نظم کے دو شعر یہ ہیں ؎

کوئی کافر کوئی مشرک کوئی شیطان پیدا کر
شریفِ مکہ سا لیکن نہ بے ایمان پیدا کر

گرا دے شرک کا جھنڈا در بیت المقدس سے
صلاح الدین جیسا پھر کوئی انسان پیدا کر

تلمذِ سخن

سنہ ۱۹۱۱ء میں سب سے پہلے جالندھر کے ایک اسکول ٹیچر سرفراز خاں سرور صاحب کو چند غزلیں دکھائیں۔ لیکن چند غزلوں کے بعد اپنے ہی ذوق پر اعتماد کرنا شروع کر دیا۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں مولانا گرامی کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہ کیا۔ انہوں نے سہل ممتنع پر مائل کیا۔ گرامی سے ساتھ آج تک گہری وابستگی ہے۔ خود شاگردی و استادی بطور پیشہ کبھی اختیار نہیں کی۔ ویسے غیر رسمی طور پر بیشتر شعراء ان سے مستفید ہوئے۔ جن میں ہری چند اختر، ذوالفقار بخاری، فاخر ہریانوی، حمید جالندھری، پروفیسر حمید کوثر، احسن ایم اے جالندھری مرحوم، دوارکا داس شعلہ، مبارک علی ساغر، اور ایسے ہی بہت سے شعراء شامل ہیں جن کا نام لکھنے کی حفیظ اجازت نہیں دیتے۔

خلیل داس چترویدی کی شخصیت سے بطور خاص متاثر ہوئے شعر میں مذہبی رنگ مولانا حالی کا غالب رہا۔ جوانی میں مومن اور کبیر داس کے علاوہ داغ کے رنگِ سخن کے دلدادہ رہے۔ اور ان کا اثر بھی قبول کیا۔ داغ کا رنگ اختیار کرنے کی کوشش میں اکثر ان کی غزلوں میں اپنا شعر شامل کرکے اس کی داد بھی داغ مرحوم کو دلوانے کا مزا لیتے رہے۔ لیکن اپنے طرزِ خاص اور اپنی انفرادیت کا برصغیر میں لوہا منوایا۔

معنوی اساتذہ

سر عبدالقادر، سر راس مسعود، سید سجاد حیدر یلدرم خواجہ حسن نظامی، مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، سائل دہلوی اور نواب لوہارو کے علاوہ بنارس کے بابا

ملازمت، کاروبار، صحافت اور ادارت

۱۹۱۵ء : میکویان کے قریب ریلوے لائن بچھائی جا رہی تھی، وہاں ٹائم کیپر کی حیثیت سے گھر سے بھاگ کھڑے ہونے کے دوران چند ماہ ملازمت کی (تنخواہ ۲۲ روپے)

۱۹۱۶ء : جالندھر میں عطر کی دوکان کھولی، جو حفیظ کے شاعر دوستوں اور اُن کے حسین محبوبوں نے بڑھا دی۔

۱۹۱۶ تا ۱۹۱۸ء : جنگ کے دوران فوجی وردیوں کی تیاری کا ٹھیکہ لیا۔ اور پھر خیاطی کے علاوہ ٹوپیاں بنانے کا کام بھی سیکھنا چاہا تا کہ خیاطوں سے کام لے سکیں۔ لیکن ناکام رہے۔

۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۱ء : زیرہ ضلع فیروز پور اور اوکاڑہ ضلع منٹگمری میں سنگر کمپنی کے مینجر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

۱۹۲۱ء : ملک الشعراء فارسی مولانا گرامی کی زیر سرپرستی اور اپنی ملکیت و ادارت میں رسالہ "اعجاز" جالندھر سے نکالا۔ اس رسالے کے صرف پانچ شمارے شائع ہو سکے۔

حفیظ کا پہلا گیت

حفیظ نے پہلا گیت سنہ ۱۹۲۳ء میں لکھا تھا جو "جی نڈھال ہے" کے عنوان سے "ہزار داستان" میں شائع ہوا۔ اس کے بعد تو حفیظ کے نغموں، ترانوں سے اردو کے زمین و آسمان بس گئے۔

میرا سلام لے جا، کرشن مسری، اندھی جوانی برسات تاروں بھری رات، ابھی تو میں جوان ہوں، لو پھر بسنت آئی، دیکھ اس دنیا کا نظارا، دل ہے پرائے بس میں، پریت کا گیت، سپنا، تیری منزل دور، اور درشن وغیرہ سے "نغمہ زار" "سوز و ساز" اور "تلخابۂ شیریں" لبالب ہیں۔

۱۹۲۲ء : رسالہ "شباب" اردو لاہور کے جائنٹ ایڈیٹر رہے۔ ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ تھی۔

۱۹۲۳ء : تین ماہ روزنامہ "زمیندار" میں مراسلات کی زبان درست کرنے کے لئے "پارٹ ٹائم" ملازمت کی۔ کچھ دنوں رسالہ "تبلیغ" کے نائب مدیر رہے۔ پھر اسی سال لاہور کے بہترین ادبی رسالہ "ہزار داستان" اور "نونہال" کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔

۱۹۲۴ء : میں "ہزار داستان" اور "نونہال" کے مالک کی غلط روش پر ادارت سے دست کش ہو گئے ہوا یہ کہ سید امتیاز علی تاج، سالک پطرس بخاری وغیرہ سے حفیظ کی دوستی تھی۔ "پھول" اور "تہذیب النسا" کو "ہزار داستان" اور "نونہال" کا مالک رقیب سمجھتا تھا۔ اس نے حفیظ کو اپنے مد مقابل کا دوست جان کر ان سے تعلقات کا طعنہ دیا، یہ بات حفیظ کو ناگوار گذری اور وہ علیحدہ ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد "پھول" اور "تہذیب النسا" میں نائب مدیر

کی حیثیت سے کام کیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں ملازمت کے علاوہ حفیظ نے معرکہ آرا مشاعروں اور جلسوں میں حصہ لے کر اپنے فن سے جادو جگایا اور شہرت و مقبولیت کی منزلوں کو سر کیا۔

۱۹۲۵ء : میں ریاست خیرپور میرس میں شاعر دربار کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ جو چند ہی ماہ میں قید و بند اور ریاست سے اخراج کی صورت میں ختم ہوا۔ تنخواہ تین سو روپیہ، بنگلہ، سواری اور طعام کے علاوہ۔

۱۹۲۵ء : کے اواخر میں ہفتہ وار "حمایت الاسلام" کے مدیر مقرر ہوئے تنخواہ ڈیڑھ سو روپیہ۔

۱۹۲۶ء : میں ماہنامہ "مخزن" کے ادارتی فرائض انجام دیے۔

۱۹۳۰ء : میں ماڈل ٹاؤن لاہور سے ہفتہ وار "کارزار" نکالا جو دو سال تک جاری رہا۔

۱۹۴۲ء : دوسری جنگ عظیم کے دوران پبلسٹی کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمہ آئی اینڈ بی کے وزیر سر اکبر حیدری مرحوم نے ان کو اصرار کے ساتھ کانگریسی پالیسی کے خلاف مدد کے لئے بلایا۔ پہلے آرگنائزر، پھر ڈائرکٹر اور آخر میں ڈائرکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ یہ ملازمت سنہ ۱۹۴۶ء تک رہی تنخواہ سات سو سے انیس سو تک۔

پھر قائد اعظم کے ایما پر پاکستان کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔

۱۹۴۷ء : میں پاکستان کی مسلح افواج میں ڈائرکٹر آف مورل (اخلاقیات) کی حیثیت سے سنہ ۱۹۵۳ء تک خدمات انجام دیں۔ تنخواہ پندرہ سو روپے تک۔

۱۹۵۵ء : میں دیہی امداد ترقی کے مرکزی دفتر میں فیلڈ ڈائرکٹر آف پبلسٹی مقرر ہوئے اور ان کی نگرانی میں رسالہ "پاک سرزمین" جاری ہوا۔

۱۹۶۱ء : میں محکمہ ترقی دیہات کے خاتمے پر ادارۂ تعمیر نو میں تبدیل کر دیے گئے۔

حفیظ پر انگریزی میں پہلی کتاب

حفیظ کی شخصیت اور فن پر انگریزی کی کتاب آپ کی انگریز بیگم "ایملا" نے شادی سے پہلے لکھی اور شادی کے بعد شائع کی۔

فوجی خدمات

۱۹۴۰ء میں سر اکبر حیدری کے ایما پر حفیظ نے حکومت ہند کو سمعی و بصری Audo Visual جنگی پبلسٹی کا ایک منصوبہ پیش کیا۔ جسے وزیر دفاع فیروز خاں نون وائسرائے کے پاس لے گئے۔ یہ منصوبہ انوکھا تھا جو منظور کیا گیا۔ اس منصوبے کو چلانے کے لئے حفیظ ہی کو حکومت کا ہاتھ بٹانے کے لئے ایک عہدہ پیش کیا گیا۔ حفیظ سرکاری ملازمت کے خلاف تھے۔ لیکن بہت ہی بڑے بڑے سلطان اہل الرائے جن میں شیخ سر عبدالقادر، سر اکبر حیدری، نواب

محمد اسماعیل خاں اور ہز ہائی نس بھوپال حمید اللہ خاں بھی تھے اس جنگ میں انگریزوں کی فتح اس لیے چاہتے تھے کہ اگر انگریز ہار گئے تو ہندوستان پر جاپان ہندوؤں کے ساتھ مل کر چھا جائے گا۔ اور مسلمان پھر غلام رہیں گے۔ حفیظ ٹاؤن پارٹی میں تھے۔ لہٰذا انہوں نے حفیظ کو مشورہ دیا کہ وہ پبلسٹی پر دابیں ہو جائیں۔ چنانچہ پہلے وہ آرگنائزر پھر ڈائرکٹر اور آخری دور ملازمت میں ڈائرکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ پبلسٹی کے سلسلے میں ان کے لکھے ہوئے فوجی گانے اور گیت سادھوؤں اور فقیروں کے ذریعے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے، اور ان کو شہریوں میں بے مثال مقبولیت نہیں ہوئی سپاہیوں کے لئے بھی ولولہ انگیز گیت تھے۔ لیکن سب گیتوں میں ہندوستان کی آزادی کی روح سموئی ہوئی تھی۔

تقسیم ہند کے فوراً بعد آپ نے جنگ کشمیر میں عملی حصہ لیا۔ زخمی بھی ہوئے۔ کشمیر کی جنگ کے متعلق شروع سے آخر تک گیت تیار کرتے رہے۔ آزاد کشمیر ریڈیو کی تنظیم کی۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں جہاد کشمیر کی پبلسٹی کے لئے مشرقی پاکستان گئے۔

سنہ ۱۹۴۹ء میں ہی پاکستان کی مسلح افواج کا شجاعانہ اسلامی اور سرفروشانہ معیار بلند کرنے کے لئے ڈائرکٹر آف سروسز (مسلح افواج پاکستان) مقرر کیے گئے۔ جہاں انہوں نے اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔ وہ نیوی، ایئر فورس اور بری افواج کے نوجوانوں کے ہمیشہ قریب رہے اور ان کی ذہنی تربیت میں ہمیشہ نمایاں حصہ لیا۔

حفیظ کی ملی اور سماجی خدمات

حفیظ ابتدا ہی سے برصغیر پاک و ہند کی بیشتر انجمنوں، اداروں، تنظیموں اور تحریکوں کے لئے چندے کی فراہمی کا سب سے بڑا ذریعہ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی مشہور و معروف قومی اور رومانی نظموں کی بدولت لاکھوں روپے انجمنوں کے لئے فراہم کئے۔ وہ ایک اندازے کے مطابق صرف انجمن حمایت الاسلام لاہور کے لئے اب تک کم از کم بیس لاکھ روپے فراہم کر چکے ہیں۔

دو یادگار نظمیں!

سنہ ۱۹۱۹ء میں انیس سال کی عمر میں ڈاکٹر کچلو کی فرمائش پر پہلی قومی نظم لکھی۔ اور جالندھر میں پراونشل کانگریس کے جلسے میں سنائی۔ چند ہی دن بعد جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آیا۔ یہ نظم انگریزوں کے خلاف تھی۔ اور حفیظ نے اسے ایک بہت بڑے جلسے میں سنائی تھی..... جس کی وجہ سے گرفتار ہو کر حفیظ صاحب تین دن جیل میں رہے۔ یہ نظم حفیظ صاحب کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ نایاب ہے۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں کشمیر کا پیدل سفر کیا۔ اور وہاں اپنی کشمیر پر پہلی نظم لکھی۔ جو "شباب اردو" لاہور میں شائع ہوئی تھی اور اس کا عنوان تھا: "چشمہ ورناگ پر ایک آنسو"۔ شیخ محمد عبداللہ شیر کشمیر ان دنوں شاید میٹرک پاس تھے ان کا قول ہے کہ اس نظم نے سب سے پہلے ان کی روح میں کشمیر کو آزاد کرانے کی چنگاری سلگائی تھی۔ یہ نظم کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ شباب اردو کے فائل اور حفیظ کے پرانے بیاض میں موجود ہے۔

سب کا حفیظ

بچوں کے لئے، حفیظ نے آسان زبان میں ان گنت تخلیقات کرکے بچوں کے ادب میں جو گراں مایہ اضافہ کیا ہے وہ اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔

عورتوں کے لئے: عورتوں کی اصلاح اور ان کی ذہنی تربیت کے لئے حفیظ نے ان گنت نظمیں لکھیں جو آج بھی مقبولِ خاص و عام ہیں۔

روایت سے بغاوت

سنہ ۱۹۲۳ء میں "فرصت کی تلاش" کے زیرِ عنوان حفیظ نے ایک ایسی نظم لکھی جس میں نہ صرف اظہارِ خیال اور شعری اصولوں کی قدیم روایت سے بغاوت کی گئی تھی بلکہ یہ پہلی کامیاب نظم تھی جس میں انہوں نے ترقی پسندی کی بہت سی منزلیں ایک ہی جست میں طے کر لی تھیں۔ اس نظم کے ذریعے رنگِ جدید کی طرف رہنمائی کی گئی تھی۔ لیکن اس کی اشاعت پر عام ادبی حلقوں میں اور بالخصوص اودھ پنچ لکھنؤ نے بڑی لے دے کی اور ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ "بے تکی" نظم اور بے تکا شاعر بہت دنوں تک بحث کا موضوع رہا۔

چند مقبول ترین تخلیقات

★ میرا سلام لے جا ★ ابھی تو میں جوان ہوں
● برسات ● جاگ سوزِ عشق جاگ
★ رقاصہ ★ تین سنئے
● دیکھتا چلا گیا ● صحرا کی دعا
★ ولادتِ نبیؐ ★ سلام اے آمنہ کے لال
● درۂ خیبر اور ● تصویر کشمیر

اعزازات وخطابات

ابوالاثر: کپورتھلہ کے ایک مشاعرے میں جس میں مولانا گرامی شریک تھے، دو غزلیں استاد کی اصلاح کے بغیر سنائیں۔ ان غزلوں کے مندرجہ ذیل اشعار سے مولانا گرامی بے حد متاثر ہوئے ؂

رزاقِ دوجہاں کے خزانے کو کیا ہوا
ملتا ہے رنج وہ بھی کسی کا دیا ہوا

وہ ہوئے پردہ شکن انجمن آرا ہو کر
رہ گیا میں ہمہ تن چشمِ تماشا ہو کر

اسی مشاعرے میں ہی آپ کو مولانا گرامی نے "ابوالاثر" کی کنیت بخشی، اور اس پر اصرار کیا۔

خان صاحب۔ خان بہادر: برطانوی حکومت نے انہیں پہلے "خان صاحب" اور پھر "خان بہادر" کا خطاب دیا۔ جو آپ نے پاکستان آنے کے بعد قائدِ اعظم کی خواہش پر واپس کر دیا۔

ملک الشعراء: وائسرائے ہند کی اجازت سے ریاست ٹونک نے ملک الشعراء کا اعزاز دیا۔

نواب حسان الملک بہادر: یہ خطاب ریاست حیدرآباد سے ملا۔

فردوسیٔ اسلام: ریاست بھوپال نے "شاہنامۂ اسلام" کی تصنیف پر "فردوسیٔ اسلام" کا اعزاز دیا۔

"نائٹ ہڈ" کے لئے قیامِ پاکستان سے قبل برطانوی حکومت نے پوچھا تھا مگر قائدِ اعظم کے حکم پر حفیظ نے انکار کر دیا!

قومی ترانے

پاکستان کے قومی ترانے کے علاوہ آزاد کشمیر کا قومی ترانہ لکھنے کا شرف بھی حفیظ کو ہی حاصل ہے۔

شاہنامۂ اسلام

حفیظ نے "شاہنامۂ اسلام" کا آغاز سنہ ۱۹۲۷ء میں کیا۔ چند اشعار لکھ کر محض اس لئے ضائع کر دیئے کہ وہ وزن اور بحر کے لحاظ سے رزمیہ کے لئے مناسب نہیں معلوم ہوئے۔ شاہنامہ کی پہلی جلد سنہ ۱۹۲۸ء میں طبع ہوئی شاہنامہ کے آغاز کے لئے خواجہ حسن نظامی نے ۳۰۰ روپے سے حفیظ کی پہلی اور آخری مدد کی۔ شاہنامہ کی اب تک پچاس لاکھ سے زیادہ جلدیں طبع ہو چکی ہیں۔

سفر و ملاقات

حفیظ بچپن ہی سے سیر و سیاحت کے شائق ہیں۔ ابتداءً گھر سے بھاگ کر دہلی، میرٹھ، بمبئی کلکتہ اور اطراف لاہور کے چکر لگاتے تھے۔ پھر جب ذمہ دارانہ زندگی کا آغاز کیا تو ــــ

۱۹۲۱ تا ۱۹۲۲ء: ماہنامۂ اعجاز کے سلسلے میں لاہور، دہلی، اور یوپی کا سفر کیا۔ لکھنؤ میں سرائے کی کوٹھڑی میں ٹھہرے اور عزیز لکھنوی، شرر لکھنوی، ایڈیٹر روزنامہ ہمدم۔ جالب دہلوی، یاس یگانہ چنگیزی، حسرت اور صفی لکھنوی سے ملاقاتیں کیں۔ کانپور میں نواب جعفر علی خاں اثر کے مہمان ہوئے اور دیا نرائن نگم، حسرت موہانی سے ملے۔ حلیم لائبریری کے لائبریرین احسن سنبھلی کے یہاں جگر مراد آبادی سے پہلی ملاقات ہوئی رام پور میں شوق قدوائی سے نیاز حاصل کیا۔ ملیح آباد میں جوش سے ملاقات کی۔ لاہور میں چغتائی صاحب اور علامہ اقبال سے بہت قریبی تعلق قائم رہا۔ اواخر میں "اعجاز" بند کرکے مستقل قیام کے لئے لاہور آگئے۔ اسی سن میں کشمیر کا پیدل سفر کیا۔

۱۹۲۳ء: میں مرتضیٰ احمد خاں میکش کے ہمراہ دوبارہ کشمیر کا پیدل سفر کیا۔

۱۹۲۵ء: میں کئی ماہ تک ریاست خیرپور میرس (سندھ) میں بحیثیت شاعر دربار مقیم رہے جولائی میں ایک نظم "رقاصہ" پڑھنے پر گرفتار کر لئے گئے۔ تین دن تک محبوس رہنے کے بعد خارج از ریاست کئے گئے۔

حفیظ

اُردو گیتوں کے بانی

اردو میں سہل اور آسان زبان میں گیتوں کو رواج دینے کی اولیت حفیظ ہی کو حاصل ہے۔ یہ انہیں کی خلاقانہ صلاحیتوں کا نتیجہ ہے کہ اردو میں گیتوں کو قبولِ عام حاصل ہوا۔

۱۹۲۶ تا ۱۹۳۳ء: لاہور میں قیام پذیر رہے لیکن ہندوستان کے ہر شہر بلکہ مشہور قصبات میں بھی مشاعروں یا اسلامی انجمنوں کے جلسوں میں بلائے جاتے رہے۔

۱۹۳۵ء: میں مدینہ منورہ میں دربارِ رسالت میں حاضری دی، پھر مکہ معظمہ میں حج کی سعادت حاصل کی۔

۱۹۳۷ء: میں پہلی بار لندن گئے۔ سر عبدالقادر جو ان دنوں انڈیا آفس کے ممبر تھے، لاہور آئے

ہوئے تھے۔ آپ نے حفیظ کو بیمار دیکھ کر لندن چلنے کا مشورہ دیا۔ وہاں ڈیڑھ سال قیام رہا۔ برنارڈ شا سے ملاقات کی۔ کئی اجتماعات میں اپنا اردو کلام سنایا۔ سر عبدالقادر اس کا انگریزی میں ترجمہ کر دیتے تھے۔

لارکس اسکول آف لینگویجز میں داخلہ لیا ——— اخبارات اور بات چیت سے انگریزی کی استعداد پیدا کی۔ اسی زمانے میں انیلا سے ملاقات ہوئی، اس سے بھی انگریزی پڑھی، انیلا نے اپنی کتاب کے لئے مواد حاصل کیا

۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۶ء دہلی میں بسلسلۂ ملازمت مقیم رہے۔ اس دوران میں ہندوستان کا شاید ہی کوئی چھوٹا یا بڑا شہر بچا ہو جسے آپ نے نہ دیکھا ہو۔

۱۹۴۷ء : میں قائد اعظمؒ کے ایما پر شملہ میں مقیم تھے۔ وہاں سے ستمبر میں اپنے کنبے کی عورتوں سمیت ننگے سر ننگے پیر سب کچھ لٹا کر لاہور پہونچے۔ شملے میں حفیظ اور ان کے مربی سر عبدالقادر مرحوم قاتلوں میں گھر گئے تھے ——— ان کے بیٹے منظور قادر بیرسٹر اور الطاف قادر جو ان دنوں کرنل تھے اور آج کل لفٹیننٹ جنرل ہیں، اطلاع پا کر ملاکوٹ میں پھنسے ہوئے حفیظ اور ان کے کنبے کو لاہور لائے۔ پاکستان کے موجودہ صدر بھی انبالے سے اس کنوائے کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ صدر ایوب سے حفیظ کی پہلی ملاقات اسی راہ میں ہوئی۔

۱۹۴۸ء : مارچ میں کشمیر کی پبلسٹی کے سلسلے میں مشرقی پاکستان گئے اور وہاں موجودہ صدر پاکستان کے مہمان ہوئے جو ان دنوں میجر جنرل اور مشرقی بنگال کے G.O.C تھے۔

۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۷ء : کراچی میں قیام پذیر رہے۔

۱۹۵۸ء : میں پاکستان کے وفد کے لیڈر کی حیثیت سے افریشیائی رائٹرز کانفرنس میں شمولیت کے لئے تاشقند گئے۔ کانفرنس کے بعد باکو، طفلس اور کوہ قاف کی سیر کی۔ ماسکو بھی گئے۔ سائبیریا کا علاقہ بھی دیکھا۔ استالن آباد میں، فارسی کے اولین شاعر رودکی کی گیارہ سو سالہ برسی کی تقریب میں بھی شامل ہوئے۔ وہاں سے سمرقند، ترمذ اور عاشق آباد گئے۔ واپسی میں کابل اور قندھار بھی دیکھے۔

۱۹۵۸ء
تا
۱۹۶۳ء

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

کے مصداق

حفیظ نے اس عرصے میں کسی ایک جگہ جم کر قیام نہیں کیا۔ کبھی وہ کراچی میں مقیم رہے۔ کبھی لاہور میں قیام کیا۔ اور کبھی پنڈی میں رہے۔ آج کل مستقل طور پر پنڈی میں قیام ہے۔

چند انتسابات

منسوب بہ یادِ گرامی
"نغمہ زار"
(۱۹۲۵ء)

پیش کش
ہر اُس فرزندِ توحید کی خدمت میں
جو
کلمہ طیبہ
لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ
مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ
پر
ایمان رکھتا ہے
شاہنامۂ اسلام ——— (۱۹۲۸ء)

انتساب دائمی
بیادگار شیخ سر عبدالقادر مرحوم
"سوز و ساز"
(۱۹۳۲ء)

پیش کش
ملت کے مفلوک مزدوروں
کی خدمت میں!
"یہ ہماری انجمن"
(۱۹۰۸ء)

انتساب
بنام سید سجاد حیدر یلدرم
"ہفت پیکر"
(۱۹۲۹ء)

فہمیدہ
میری چھوٹی سی بھولی بھالی بیٹی
عمر میں ظاہرہ سے کچھ ہی بڑی۔ پڑھنے لکھنے میں زیادہ جی نہیں لگتا۔ باتیں سنو تو ایسی جیسے ساری دنیا کو عقل سکھا رہی ہو۔ لیکن ابھی تک انگوٹھا چوستی ہے۔ میں نے اپنی بہت سی نظمیں لکھتے وقت اس بچی سے خاص اثر لیا ہے۔
اس لئے
اپنے گیتوں کی یہ دوسری کتاب
اُس کے نام سے
دنیا بھر کے بچے بچیوں کو تحفہ دیتا ہوں
"حفیظ کے گیت اور نظمیں"
(۱۹۳۹ء)

سعیدہ کوثر
میری بیٹی! — تم اپنی بہنوں سے بڑی ہو اور خدا کے فضل سے بہت ذہین ہو۔ لیکن مجھے وہ دن یاد ہیں۔ جب بہت ننھی سی تھیں اور کہا کرتی تھیں — "ابا — میں چڑیا ہوں — چیں، چیں، چیں —" ان دنوں میں بچوں کی نظمیں لکھا کرتا تھا، اور مجھے نظمیں لکھنے میں تمہاری چیں چیں سے بہت مدد ملتی تھی چنانچہ میری ان نظموں میں تمہارا بھی حصہ ہے
اس لئے
میں یہ چوتھی کتاب
تمہارے نام کے ساتھ پیش کرتا ہوں!
"حفیظ کے گیت اور نظمیں"
(۱۹۳۹ء)

حفیظ کی مطبوعہ تصانیف

نظم :	پہلا مجموعۂ کلام	نغمہ زار	سنہ ۱۹۲۵ء پہلا ایڈیشن
	دوسرا مجموعۂ کلام	سوز و ساز	سنہ ۱۹۳۲ء " "
	تیسرا مجموعۂ کلام	تلخابۂ شیریں	سنہ ۱۹۴۷ء " "
	سلام	کتابچہ	سنہ ۱۹۲۴ء میں
	رقاصہ	"	سنہ ۱۹۲۶ء "
	پردہ اور تعلیم	"	سنہ ۱۹۲۷ء "
	یہ ہماری انجمن	"	سنہ ۱۹۲۸ء "
	تصویر کشمیر	(۵۰ بند کی نظم)	سنہ ۱۹۳۷ء "
	شاہنامۂ اسلام	جلد اول	سنہ ۱۹۲۸ء
		جلد دوم	سنہ ۱۹۳۲ء
		جلد سوم	سنہ ۱۹۴۰ء
		جلد چہارم	سنہ ۱۹۴۷ء
نثر :	ہفت پیکر	(طبعزاد افسانے)	سنہ ۱۹۲۹ء
	معیاری افسانے	(ماخوذ)	سنہ ۱۹۳۳ء
	انتخاب حالی معہ مقدمہ		سنہ ۱۹۶۱ء
بچوں کے لئے :	حفیظ کے گیت اور نظمیں	(چار حصے)	سنہ ۱۹۳۹ء
	ہندوستان ہمارا	(تاریخ ہند نظم میں)	
	بہار کے پھول		
	پھول مالا		
	عمر عیار	(دو حصے)	
	الف لیلہ کی چند کہانیاں		

زیر ترتیب مجموعے

نظم :	منظوم تاریخ پاکستان
	نیا مجموعۂ کلام
نثر :	قومی ترانے کا افسانہ

جنگ و آہنگ (ہفت روزہ کالم جو روزنامہ جنگ کراچی اور راولپنڈی میں شائع ہوتا ہے)

وہ عندلیب نغمہ سنج ہوں اے حمید
سوز سخن سے آگ لگا دوں بہار میں

حفیظ کی دوسری بیگم ایلا — مصنفہ '' حفیظ ہونٹ مین آف انڈیا ''
حفیظ کی شخصیت اور فن پر یہ کتاب بیگم ایلا نے شادی سے قبل تحریر کی تھی

۱۹۳۷ء ۔ گلاسکو ۔ جواں سال حفیظ جس نے دیارِ مغرب کی متعدد تقریبات میں اپنا اردو کلام
سنا کر اس کا انگریزی ترجمہ سنا کر سامعین سے داد وصول کرتے ہوئے شہرت و مقبولیت حاصل کی ۔

۱۹۵۵ء ـ کراچی میں (دائیں سے بائیں) صبا (بیٹی) سمیعہ (بیٹی) حفیظ ـ بیگم خورشید حفیظ اور فہمیدہ (بیٹی)
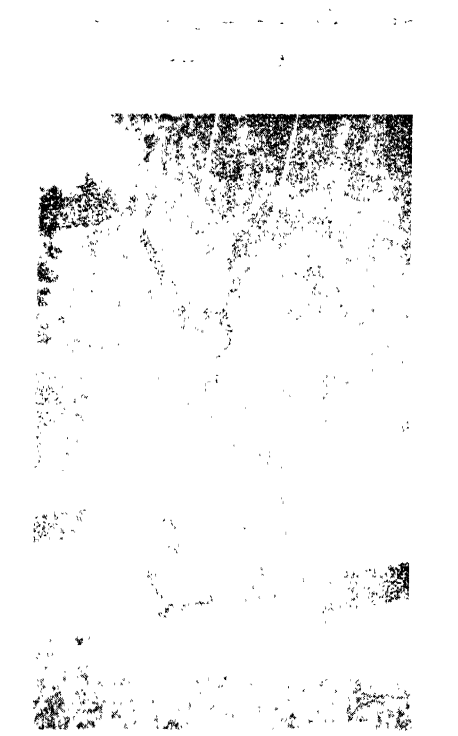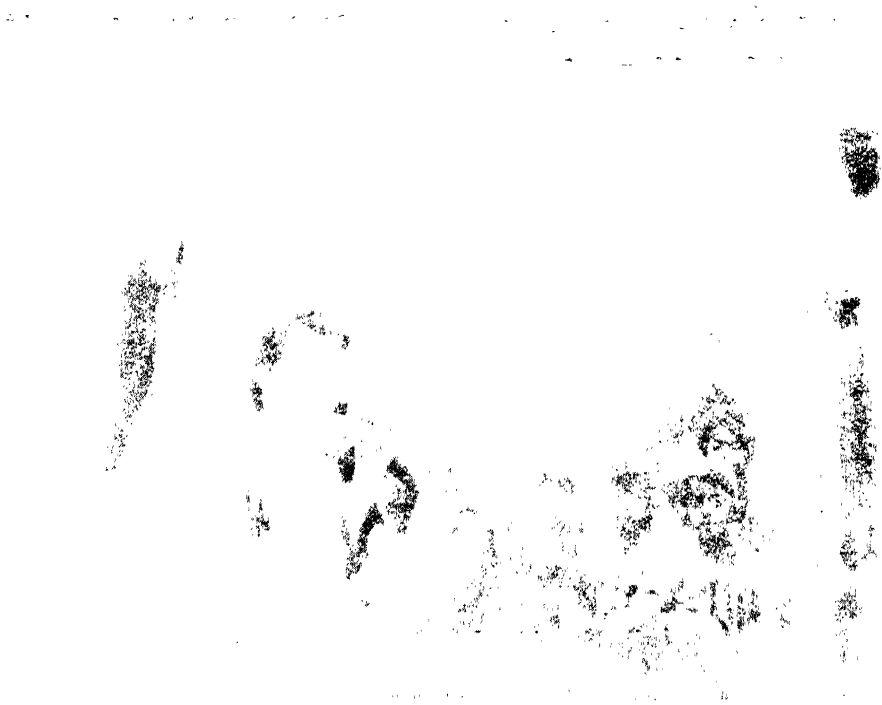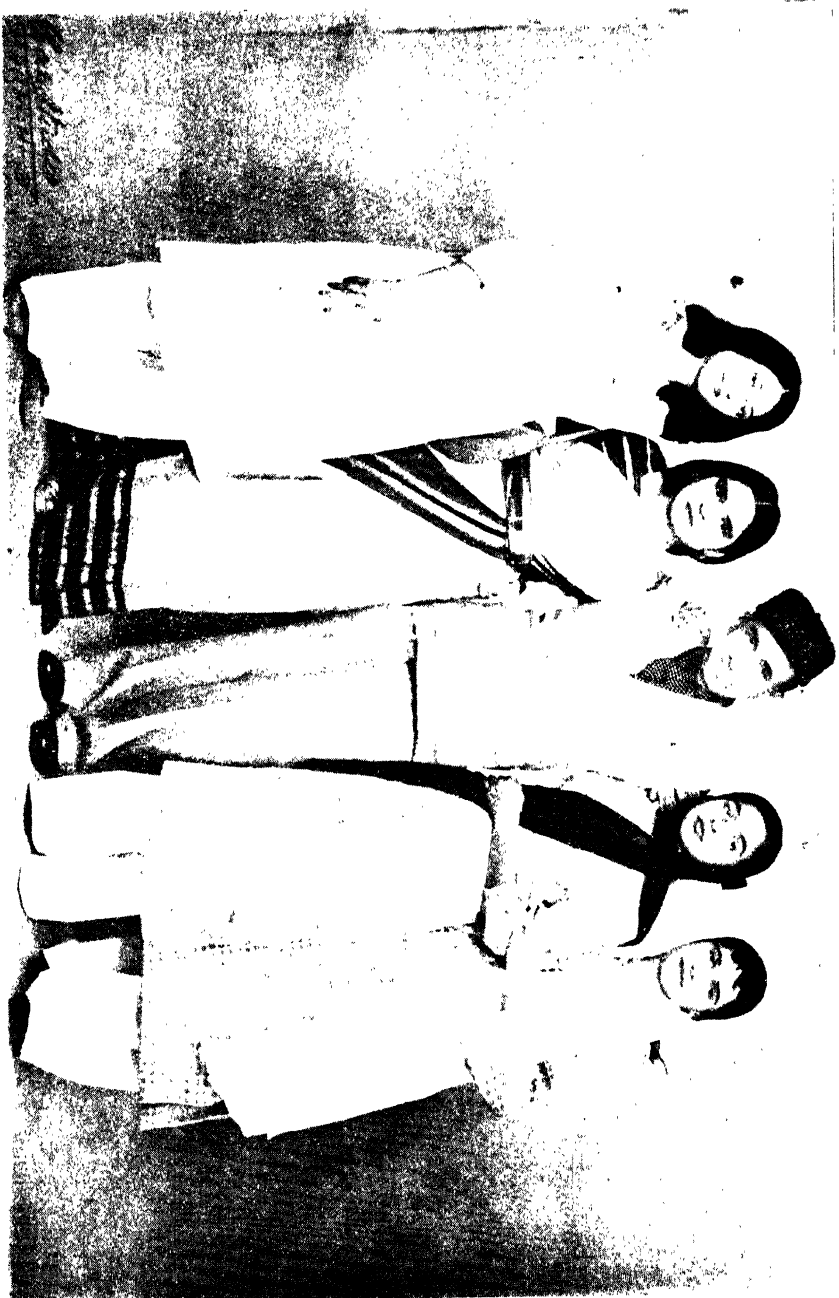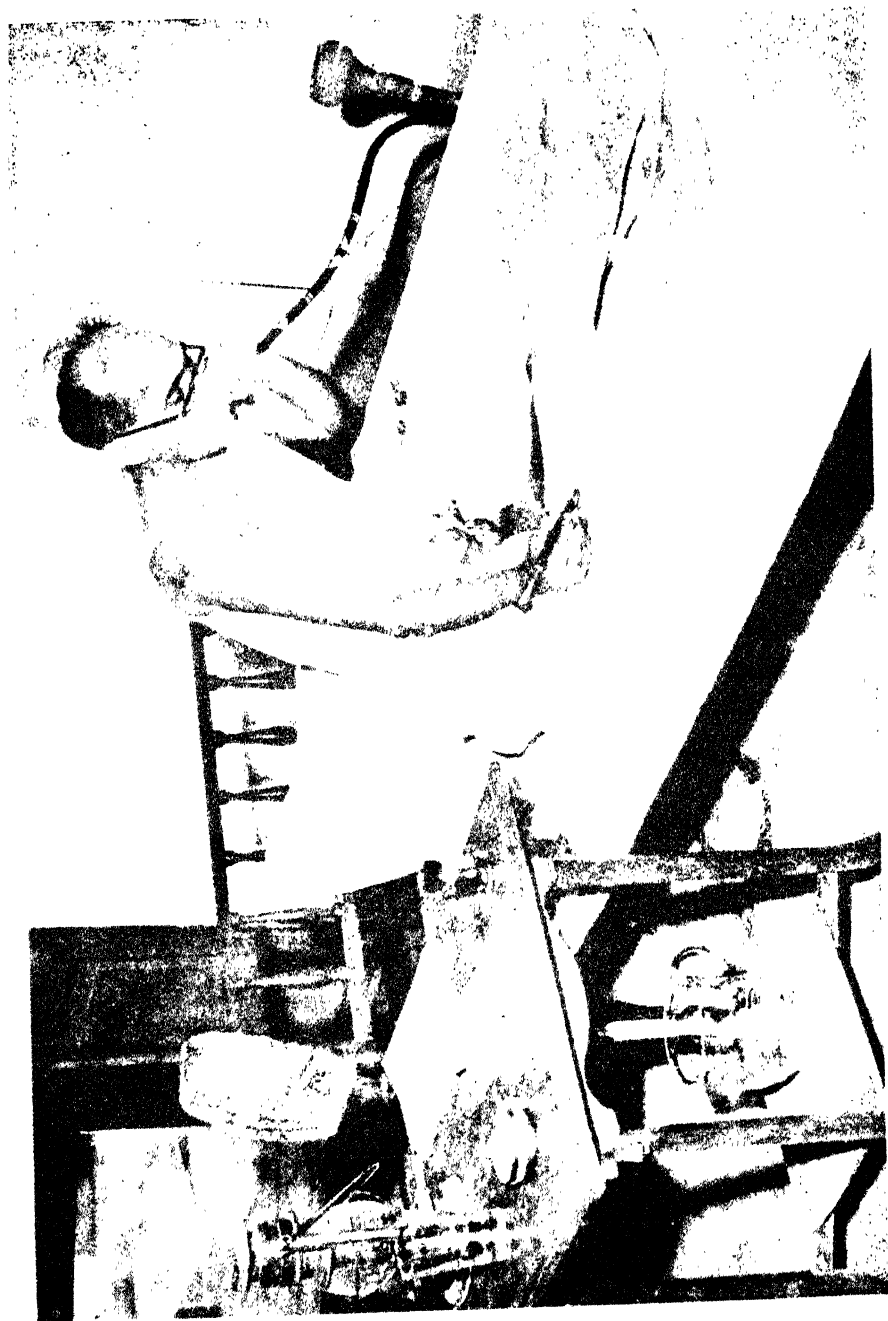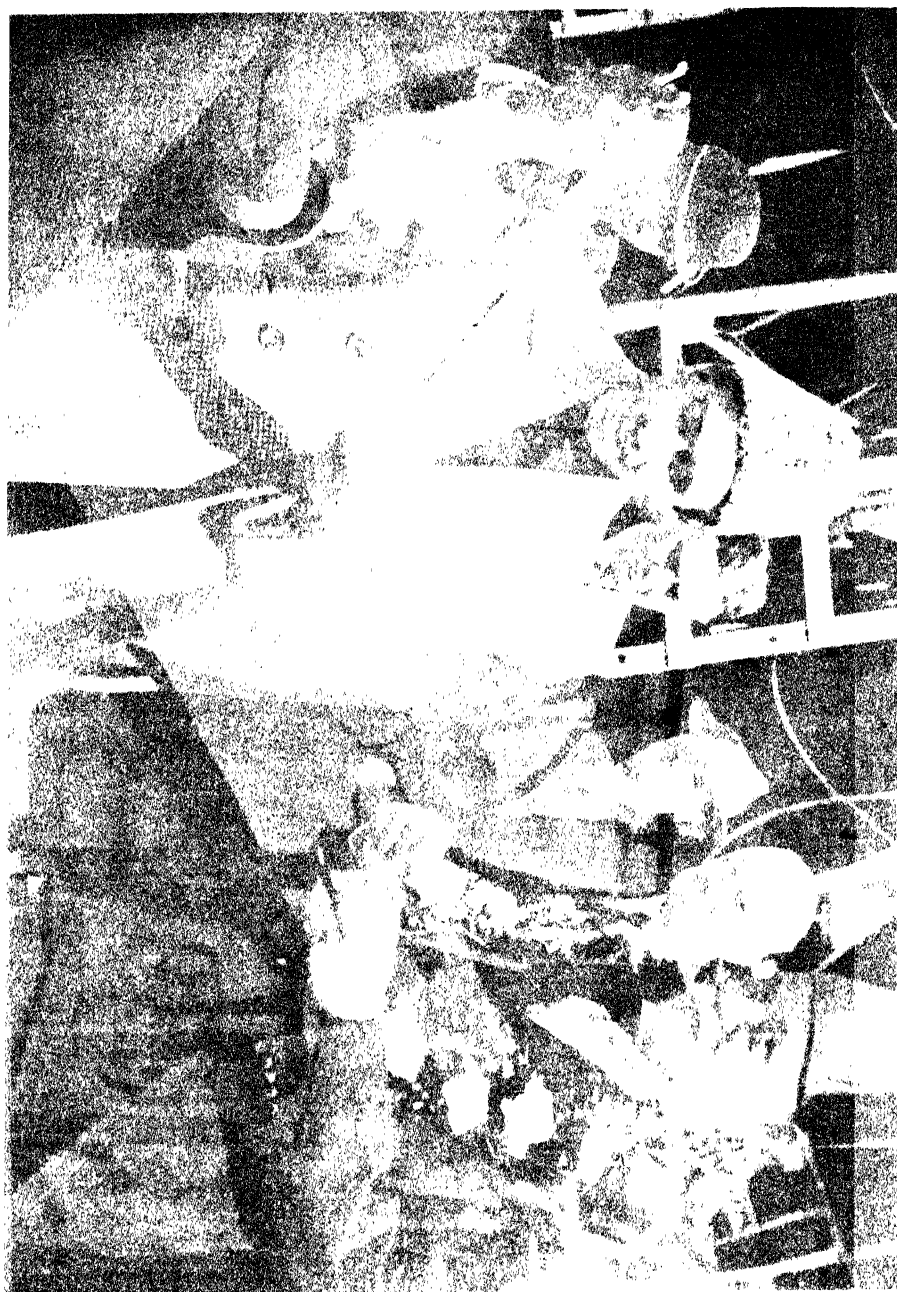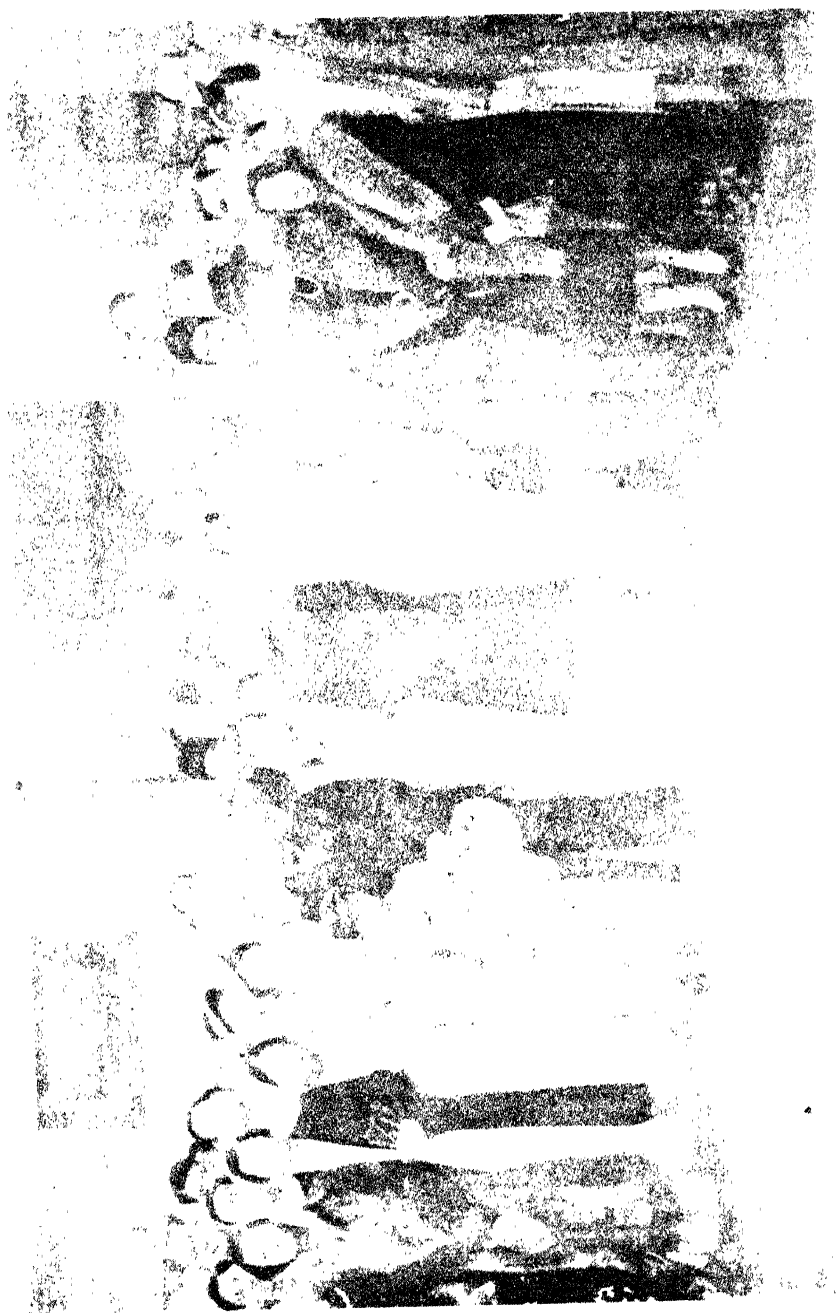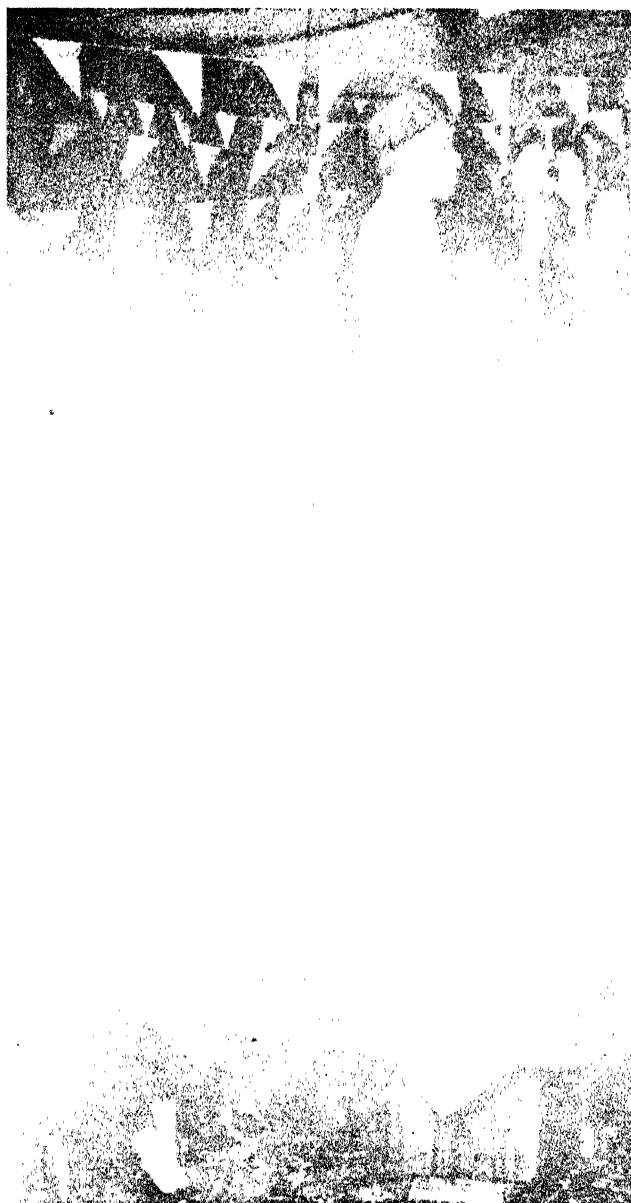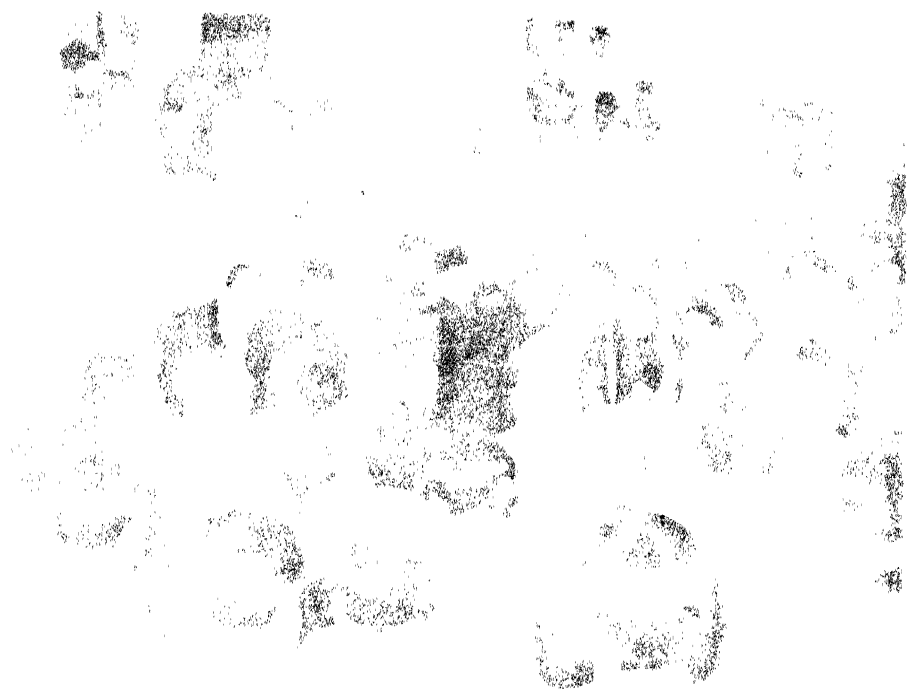
۱۹۳۷ء لاخ لیمن، اسکاٹ لینڈ میں
حفیظ۔ شیخ سر عبدالقادر کے ساتھ

۱۹۶۰ء — دہلی
حفیظ اپنے عزیز شاگرد
دوارکا داس شعلہ کے ساتھ

۱۹۶۰ء — کراچی
(دائیں سے بائیں)
فضل الرحمان اشک، حفیظ،
مجیب انصاری، سعید بہاری
اور ڈاکٹر کرنل رشید

حفیظ اور سید سبط حسن

ارشد، حفیظ، اے ڈی اظہر اور ممتاز حسن
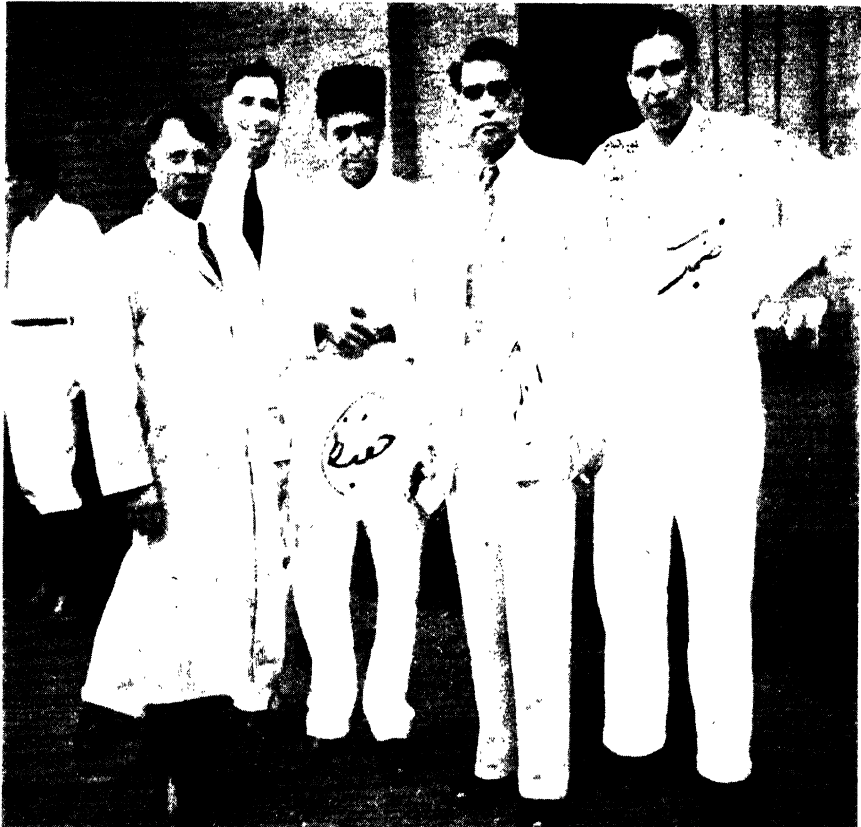
راجہ سید ضمیر جعفری، اے ڈی اظہر، حفیظ، بشیر احمد خاں اور ڈاکٹر نصیر الدین
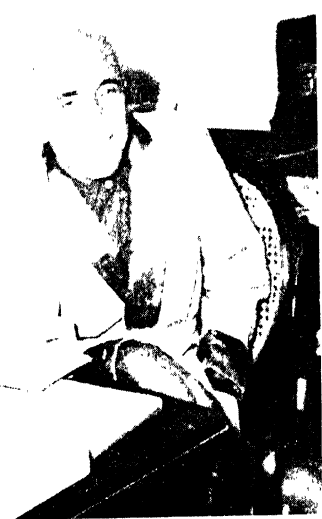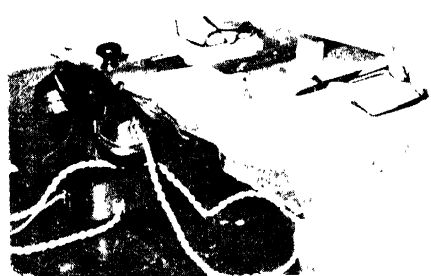
سرخیاں کچھ مل گئیں اپنے فسانے کے لئے

۱۹۵۵ء کراچی میں بیگم خورشید حفیظ — ضیا ، فمیدہ اور شمیم کے ساتھ

۱۹۵۵ء — کراچی میں حفظ وضع اور ایک مجلسی ڈائریکٹر کی حیثیت سے

ہفت رنگ

- قومی ترانہ
- قومی ترانے کا افسانہ
- تازہ و غیر مطبوعہ کلام
- اصلاح شدہ ورق
- دو یادگار نظمیں
- حفیظ کے خطوط
- حفیظ کے لطیفے

حفیظ

قومی ترانہ

پاک سرزمین شاد باد کشورِ حسین شاد باد
تو نشانِ عزمِ عالی شان ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

پاک سرزمین کا نظام قوّتِ اخوّتِ عوام
قوم، مُلک، سلطنت پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مُراد

پرچمِ ستارہ و ہلال رہبرِ ترقّی و کمال
ترجمانِ ماضی شانِ حال جانِ استقبال
سایۂ خدائے ذوالجلال

ابوالاثر حفیظ جالندھری

قومی ترانے کا افسانہ

جناب صہبا - اپنی زیر تصنیف کتاب سے
دو باب ارسال کر رہا ہوں - (حفیظ)

(۱)

دسمبر سنہ ۱۹۴۷ء میں مرحوم لیاقت علی خاں راولپنڈی تشریف لائے تھے۔ ایک "ایٹ ہوم" پر میں بھی حاضر تھا۔ مجھ سے قومی ترانے پر کچھ بات ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ قومی ترانہ نہ تو خالی شعر و شاعری ہے اور نہ عام یا نامی موسیقی۔ ملت کو زندگی دینے والی روح کا اظہار الفاظ میں ہوتا ہے۔ الفاظ مناسب وزن اور اعتدال کے ساتھ مرتب ہو کر وہ نغمۂ حیات بنتے ہیں جو اس قوم و ملت کا مقصود ہے۔ الفاظ کی یہ موزونیت دُھن کہلاتی ہے۔ یہ دُھن سازوں سے ہم آہنگ ہو کر ہر فرد میں ملی زندگی کی اُمنگ قائم رکھتی اور پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔ الفاظ معنی لاتے ہیں۔ موسیقی ان معانی کو کانوں کے ذریعے دلوں تک پہونچانے کا خوش گوار ذریعہ ہے۔ دُھن اور الفاظ دونوں کو بیک وقت فوجی اور شہری سازوں کی آواز سے ہم رنگ و ہم آہنگ منصۂ شہود پر لانا ضروری ہے۔ شاعر کو حُسنِ صوت یعنی الفاظ کی اپنی دلکش موسیقی سے معمور ہونا چاہیے۔ اور شاعر کا کن رس ہونا اور ساتھ ہی دل و جان کے ساتھ ملت کی روح سے ہم نفس ہونا لازم ہے۔ شاعری یہ تینوں صلاحیتیں اور تخلیقی قوتیں جب تک بروئے کار نہ آئیں قومی ترانہ نہیں بن سکے گا۔ لیاقت علی خاں نے فرمایا: آپ کے سوا دوسرا کون ہے؟

میں نے عرض کیا اگر مجھ سے یہ خدمت طلب کرتے ہیں تو مجھے کا ہے گا ہے آرکسٹرے کے چند سازندوں اور ایک فوجی بینڈ ماسٹر کی ضرورت بھی ہوگی۔ آرکسٹرے یا بینڈ کا مہیا کرنا مجھ ایسے شاعر مفلوک کے بس کی بات نہیں۔

میری اس وضاحت پر جناب لیاقت نے مسرت کا اظہار کیا اور وعدہ کیا کہ کراچی پہنچتے ہی ریڈیو پاکستان کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اپنے آرکسٹرا کے سازندے خالی اوقات پر آپ سے تعاون کریں۔ حفیظ صاحب اب آپ اس کام میں بھی لگ ہی جائیے گا ---!

ممدوح کے کراچی تشریف لے جانے کے چند روز بعد حکومت کی طرف سے ایک اشتہار شائع ہوا کہ دس ہزار روپیہ اس ایک شخص کو انعام دیا جائے گا جو پاکستانی قومی ترانے کے الفاظ اور دُھن دونوں تیار کر دے۔ لیکن اگر کوئی شاعر محض الفاظ میں قومی ترانہ تخلیق کرے اور منظور کر لیا جائے۔ لیکن اُس کی دھن کوئی دوسرا موسیقار بنائے تو ان دونوں کو پانچ پانچ ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا!

ساتھ ہی اخبارات میں نکلا کہ یہ دس ہزار کی رقم افریقہ سے کسی تاجر صاحب نے اپنے والد مرحوم کی یادگار پاکستانی ترانے کی وجہ سے قائم رکھنے کے لئے مرحوم قائد ملت کے سپرد کر دی ہے۔ اور محترم لیاقت علی خاں نے تمام دنیا کو مقابلے کے لئے دعوت دے دی ہے کہ

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

میں اس اعلان کو دیکھ کر جناب لیاقت علی خاں کو مشورہ دینے والوں کی نااہلی فن اور ذہنی افتاد پر متعجب ہوا۔
مجھے معلوم تھا کہ انعام کا لالچ کسی بھی صاحب فن کو بیک وقت شاعر اور موسیقار نہیں بنا سکتا۔ اور پھر اردو کے شاعروں کو میں جانتا تھا۔ بڑے بڑے نامی نامور دل کو میں نے گذشتہ جنگ عظیم کے دوران پرکھا تھا۔ جن دنوں میں جنگی پبلسٹی بذریعہ شعر و نغمہ اور تمثیل کا ڈائرکٹر تھا۔ تو اردو شاعروں سے گیت کبھی بن نہ آئے تھے۔ وہ جو کچھ بھی لکھ کر حصولِ رقم کے لئے بھیجتے تھے۔ میں محض قدرے نئے خیال کا کوئی شائبہ پا کر ان کو رقم دے دیا کرتا۔ اور ان میں سے بہت سوں کے لکھے ہوئے پر ایک آدھ کے ساتھ ہیر پھیر کر ان کے نام نامی ہی کو کافی دوائی ثابت کرنے کے لئے خود اپنے قلم سے اُن کی نغز گوئی کو واہ واہ میں ڈھال دیتا تھا۔

میری اس حماقت کے چشم دید گواہ بفضل خدا زندہ موجود ہیں۔ اور ان شعراء کی نغز گوئی بھی۔

اب اپنے ملک اپنی ملت کے لئے قومی ترانہ لکھنے کی خاطر محترم لیاقت علی خاں نے سب کے سامنے انعام کی تنگنی بکھیر کر اس طرح پکارا تھا جیسے اردو کے شاعر بٹیر ہوں اور قومی ترانہ لکھنے والوں کا مقابلہ بٹیروں کی پالی!

میں نے خیال کیا: مجھ نالائق کے ساتھ ریڈیو کے آرکسٹرا کی گاہے گاہے وابستگی کے لئے احکام جاری کرنے کا وعدہ ممدوح بھول گئے، یا سیاسی مصلحت یہی تھی کہ آخر کیوں نہ شاعروں اور موسیقاروں کا بھی ایک دنگل ہو ہی جائے!

اب کوئی چارہ کار نہ تھا بجز اس کے کہ میں منقارِ زیر پر بیٹھا رہوں۔ مجھے یقین تھا کہ اس طرح نہ کوئی شاعر روحِ پاکستان کے لئے قابل قبول الفاظ ترتیب دے سکے گا۔ اور نہ کوئی موسیقی داں دوسرے کے تخلیق کردہ الفاظ کی روح کو ملحوظ رکھ کر پاکستان کے قومی مزاج کے لئے دُھن بنا سکے گا۔

اشتہار میں درج کی ہوئی مدت متعینہ ختم ہو گئی۔ پھر ایک اور مدت دی گئی۔ وہ بھی ختم ہو گئی۔ مجھے کسی نے بتایا کہ سینکڑوں شاعروں کے لکھے ہوئے محض الفاظ اور بیسیوں موسیقاروں کی محض دھنیں اندرون پاکستان اور بیرون پاکستان، ہندوستان، افریقہ، یورپ اور امریکہ تک سے آئی ہیں۔ ایران اور عراق سے بھی موسیقاروں نے دُھنیں موسیقی کی نوٹیشن کے ساتھ بھیجی ہیں۔

میں نے یہ بھی سُنا کہ پاکستان کے چند باکمال شاعروں نے موسیقی کے ساتھ ریکارڈ بنوا کر بھی بھیجے ہیں۔

اس آخری صورت سے میری امید بندھی کہ الحمدللہ کسی سے تو کوئی نتیجہ برآمد ہو پایا ہے ـــ لیکن پھر خاموشی سی چھا گئی۔ اخبارات میں ترانے کے لئے یاد دہانیاں ہونے لگیں۔ آوازے کسے جانے لگے۔ پھبتیاں اڑنے لگیں۔ مشورے دیئے گئے۔

میں نے پھر ایک خط جس کی نقل میرے پاس موجود ہے رجسٹری شدہ جناب قائد ملت کی خدمت میں ارسال کیا۔ میرے خط کا مفہوم یہ تھا کہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اگر ابھی تک ترانۂ پاکستان کو نہیں ملا، تو اگر ممدوح مناسب جانیں ابھی ریڈیو کے آرکسٹرے پر میرے لئے کسی کسی وقت کام کرنے کی آسانی کے احکام جاری فرما دیں۔ تاکہ اگر ابھی تک کوئی یہ خدمت نہیں کر سکا تو اس مقابلہ بازی کے ذریعے انعام سے الگ رہ کر میں یہ کام کروں گا

افسوس مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ یقیناً پاکستان کے وزیر اعظم کو بہت مصروف ہونا چاہیئے۔ خصوصاً ـ جب کہ سیاست دانوں کا ہر وقت ایک ہجوم ارد گرد ہو، اور دوسرے ہجوم کو اس پر فتح پا کر اس کی شکست سے ہر آن مزا چکھنا پاکستان کے آغاز ہی سے سیاست کی نفاست بن چکا ہو ـــ ایسے عالم میں قومی ترانے کی غرض سے کسی شاعر کی چٹھی کا جواب دینا وزیر اعظم لیاقت علی خاں سے تو شاید متوقع تھا لیکن لیاقت علی خاں کے بہت ہی مصروف پرائیویٹ سکرٹریوں میں یہ بے لیاقتی کہاں تھی کہ حفیظ ایسے فرومایہ کا وصول شدہ خط پیش کر دیتے اور جواب بھی لوچھتے۔

یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ایک مدت بعد جب میں محض ایک شاعر اور مرحوم لیاقت حسن اتفاق سے چٹاگانگ کے سرکٹ ہاؤس میں ایک صوفے پر بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ مرحوم نے مجھ سے ترانے کا تذکرہ دوبارہ کیا تھا۔ تو میں نے اپنے مذکورہ خط کی یاد دہانی کی تھی۔ مرحوم نے اس خط کی وصولی سے لاعلمی ظاہر فرمائی تھی۔

کوزہ گرے پیدا شد

قصہ مختصر۔ اسی طرح ڈیڑھ برس کے قریب مدت گذر گئی۔ ایک دن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ میں لاہور کے ہوائی اڈے پر کسی دوست کو اڑانے کے لئے رخصت کرنے گیا۔ وہاں اپنے پرانے یار جانی اے ڈی اظہر سے ملاقات ہو گئی۔ اے۔ ڈی اظہر اگرچہ ان دنوں خود شاعر نہیں بنے تھے۔ لیکن شعر کا ذوق جو گھٹی نوشی کے ساتھ ہی نوش فرمایا تھا اب تک اندر ہی اندر ابل رہا تھا۔ وہ کسی صاحب ذوق دوست سے اتفاقیہ ملیں اور شعر کے سوا کوئی اور بات کریں۔ توبہ۔!

شعر سے بڑھ کر بات قومی ترانے تک جا پہونچی۔ وہ بہت بڑے " ماخوذیئے " بھی ہیں۔ لیکن ماخوذ اپنے ایسے خاص الخاص دوستوں ہی کو کرتے ہیں جو سہہ جانے کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ ماخوذ کرتے وقت وہ ایک ماں ہوتے ہیں اب ماں پر کون جواب میں ہاتھ بڑھائے! اور پھر ماں بھی ایسی جید!

اظہر نے مجھے ماخوذ کیا کہ: حفیظ تم سے امید تھی کہ قومی ترانہ تخلیق کر دوگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم " یہ ہو گئے، ہو " "وہ ہو گئے ہو" کبھی جاگتے تھے اب سو گئے ہو؟

میں نے کھڑا کھیل فرخ آبادی دیکھ کر جھٹ وضاحت حال کر دی۔

اظہر ماخوذیئے ہی نہیں، انصاف پرور اور غیرت مند بھی ہیں۔ صورت حال سن کر سب کچھ سمجھ گئے۔ پنجابی طرز کی

موٹی موٹی مگر نادر ملّاحیاں ہوا میں اڑانے لگے۔

یہ ملّاحیاں اس لئے سنا رہے تھے کہ سامنے عالی جناب خواجہ شہاب الدین، خواجہ ناظم الدین کے چھوٹے بھائی بہت ذہین سیاست دان، لیاقت کابینہ وزارت مرکزی میں بہت سارے محکموں کے پاسبان اور ساری سیاست و ریاستِ پاکستان کے پشتیبان لاہور سے کراچی کی طرف اڑنے کے لئے آئے تھے۔ اظہر بھی کراچی کی طرف پر تولے ہوئے تھے۔ اظہر نے مجھ سے کہا کہ دیکھو میں ترانۂ قومی کے لئے ایک کمیٹی بنانے کی بات خواجہ صاحب سے کہتا ہوں — آخر اظہر اُڑ گئے۔

قرعۂ فال بنام

چند ماہ بعد لاہور ہی میں اظہر سے پھر مُٹ بھیڑ ہو گئی۔ لو بھئی۔ کمیٹی کی داغ بیل تو خواجہ شہاب الدین سے ڈلوا دی ہے۔ اب اپنی عادت پر تن نہ بانا۔ یہ اور وہ نہ بن جانا۔ جلد بتاؤ ترانہ کمیٹی کے لئے رکن ارکان کا نام تجویز کریں۔ میں غور و فکر کرنے لگا تو فرمایا:

"کاغذ پر لکھ دو۔ کاغذ پر اپنے ہاتھ سے۔ پھر ہمیں الزام نہ دینا کہ روڑے اٹک رہے ہیں"

میں نے اپنے حقوق سے غور و فکر کے بل پر پاکستانی ترانہ پر بہت سا غور و فکر فرمانے والے چند افراد کے نام لکھ دیئے۔

رفیق غزنوی اور سرور شیرازی کو موسیقی دانی کے علاوہ شعر و ادب کی سمجھ بوجھ کے لئے۔ کوی جسیم الدین کو بنگالی موسیقی اور شاعری کے نمائندے کے طور پر۔ یہ صاحب میرے ماتحت جنگ عظیم میں بنگلہ زبان کی پبلسٹی کے لئے بطور شاعر کام کر چکے تھے۔ ان کے سوا میں کسی بنگالی شاعر سے اس وقت ذاتی طور پر واقف نہ تھا۔

ڈاکٹر تاثیر (اب مرحوم) کو بطور شاعر و نقادِ فن۔

سید ذوالفقار علی بخاری صاحب کو اس لئے کہ وہ اگرچہ کسی پرانے دور میں اپنے آپ کو شاگردِ حفیظ ہونے پر فخر کا اظہار کرتے تھے۔ لیکن اس وقت کنٹرولر ریڈیو پاکستان تھے۔ یعنی حیثیت استاد۔ اس سبب سے میرے بھی استاد ہی تو تھے۔ ان کا اس کمیٹی میں نام اس لئے ضروری تھا کہ وہ ریڈیو کے کنٹرولر ہونے کی وجہ سے شاعروں، ادبی فیچر لکھنے والوں اور نقادوں کے علاوہ موسیقاروں، سازندوں کے بھی ناظم الامور تھے، جن سے مجھے کام لینا تھا۔ ان سے کام بخاری صاحب کی منشا کے بغیر لیا جا ہی نہیں سکتا تھا۔

مسٹر اے ڈی اظہر کسی شعبۂ فکر و عمل میں بند نہیں تھے۔ پاکستان کی تشکیل کے مقصد اور ملت کی اصل روح سے باخبر تنقید کرتے ہوئے کسی دوست کا تو کیا خود اپنا بھی لحاظ نہ کرنے والے، اپنی حتمی رائے کے اظہار میں کٹ مرنے والے۔

میں نے یہ نام لکھ دیئے تو اسی کاغذ پر اظہر نے میرا نام بھی ایزاد کر دیا۔

ایک مہینہ گذر گیا تو مجھے ایک مراسلہ ملا کہ میں قومی ترانہ کمیٹی کا رکن بنایا گیا ہوں لہٰذا یکم مارچ سنہ ۱۹۴۹ء کی صبح کراچی کی میٹنگ میں شامل ہو جاؤں۔

میں کراچی گیا، اور سردار عبدالرب خاں نشتر کی اقامت گاہ پر وقت معینہ پر حاضر ہو گیا۔ وہیں معلوم ہوا کہ ترانہ کمیٹی کے ارکان مندرجہ ذیل حضرات ہیں :

سردار عبدالرب نشتر	وزیر سرکار
پیرزادہ عبدالستار	وزیر سرکار
پروفیسر چکراورتی	بنگالی رکن مجلس مقننہ
چودھری نذیر احمد خاں	پنجابی رکن مجلس مقننہ
سید ذوالفقار علی بخاری	ان دنوں ریڈیو پاکستان
مسٹر اے ڈی اظہر	سخن فہم اور صاحب الرائے
مسٹر جسیم الدین	بنگالی شاعر
حفیظ	اردو شاعر
ایس ایم اکرام	جائنٹ سکرٹری انفارمیشن براڈکاسٹنگ سکریٹری اور کنوینر ترانہ کمیٹی

یعنی کمیٹی میں ڈاکٹر تاثیر، رفیق غزنوی اور سرور نیازی نہیں لیے گئے۔ مجھے افسوس ہوا کہ دو صاحبانِ ذوق شعر و ادب اور ماہرانِ موسیقی اور ایک وہ نقادِ شعر و ادب و موسیقی و مصوری جس کا بدل ملک میں دوسرا نہیں اس کمیٹی میں نہیں لیے گئے۔

مجھے کیا معلوم تھا کہ اب فنکاری اور فنکاری کا جائزہ لینے کے لئے فنکاروں یا نقادوں کی ضرورت نہیں رہی۔ سیاسی لیڈر اور برسر اقتدار لوگ سب کچھ جانتے ہیں۔ ان کی خوشنودی لازمۂ فنکاری قرار دی جا چکی ہے۔

بہرحال ترانہ کمیٹی کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ دو سو سے زیادہ نظمیں دھنوں کے بغیر سامنے رکھ دی گئیں۔ تریسٹھ کے قریب خالی دھنیں الفاظ کے بغیر انگریزی موسیقی نوٹیشن کے ساتھ پیش کر دی گئیں۔ اور بتایا گیا کہ ان نظموں اور ان دھنوں میں کوئی ایک بھی کسی صورت میں پاکستان کے لئے قابلِ قبول نہیں نظر آئی۔

سید ذوالفقار علی بخاری صاحب نے جو میرے ساتھ ہی کرسی پر متمکن تھے۔ بولنے میں پہل کی۔ فرمایا پاکستان کا ترانہ ہرگز ہرگز ہمارے ملک میں نہیں بن سکتا۔ یورپ، انگلستان یا امریکہ میں بنوانا پڑے گا۔

ذوالفقار کی تیزیٔ گفتار پر سب، ان کا منہ تکنے لگے۔ میں نے بھی تعجب سے ان پر نگاہ ڈالی۔ وہ اپنی پرانی مسکراہٹ مسکرائے۔

سردار نشتر ہنسے۔ فرمایا :
"بھئی خوب اسلامی پاکستان کا ترانہ ہے لیکن بنا ہو گا انگلستان اور امریکہ میں"
دوسرے ارکان بھی ہنسے۔ آخر نقشہ ٹی کنٹونٹ ہو رہے

قرعۂ فالی بنامِ من دیوانہ زدند

اب جلد جلد یہ متفقہ طور پر طے ہوا کہ پاکستان کا ترانہ اردو میں ہوگا۔ اور یہ کام اب محض اکیلے حفیظ جالندھری کے ذمے ہے کہ الفاظ اور دُھن جس طرح کی چاہیئے تخلیق کرکے جلد از جلد پیش کرے۔

کیا ہو کیا نہ ہو۔ ہوا کا رخ پہچاننے والے میرے پیارے بھولے بھالے سنے بھی اس قرارداد کے فوراً بعد فرمایا کہ ہاں اس ملک میں محض حفیظ ہی یہ کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ یہ فرما کر میری طرف مشفقانہ زیرلب تبسّم کیا۔

میں اس وقت تک قطعاً خاموش بیٹھا تھا۔ اب مجھے پوچھنا پڑا کہ حضور اتنے کثیر التعداد شعراء باکمال کی کاوشیں اور اتنے ملکی اور بیرونی موسیقاروں کی تراوشیں ناقابلِ قبول قرار دی جاچکی ہیں۔ تو کمیٹی کو عاجز پر ذمہ داری ڈالتے وقت یہ ضرور واضح فرما دینا چاہیئے کہ پاکستان اور ملت پاکستان کا نظریۂ حیات کیا ہے۔ یہ رہنمائی آپ فرما دیجئے تو میں انشاء اللہ اس کمیٹی کے مطلوب مقصود کی منزل تک پہونچنے کی جان و دل سے کوشش کروں گا۔

یہ سوال پھر مزید بحث کا موضوع بنا۔ میں حیرت زدہ تھا کہ مقصود دلوں میں واضح ہو تو ہو مگر کسی بزرگ کی زبان میری مدد نہ کر سکی۔

آخر بڑی ردو قدح کے بعد جس میں میں نے بھی حصہ لیا فیصلہ یہ ہوا کہ یہ سوچنا بھی میرا ہی کام ہے۔ البتہ قید لگا دی گئی کہ لازماً ترانہ اسلامی ہو۔ لیکن اس میں اللہ اور محمدؐ کا نام، اسلام، جہاد۔ یا شہادت کے الفاظ نہ ہوں۔

میں نے عرض کیا: بہت خوب۔ اس قید کے باوجود انشاء اللہ ترانہ اسلامی ہوگا۔ لیکن نوٹ فرما لیا جائے کہ جب کام محض میرے سپرد ہے تو میں نہ اس اشتہاری مقابلے میں آؤں گا اور نہ انعام لوں گا۔ ساتھ ہی براہ عنایت جناب بخاری کو یہ کمیٹی تلقین کردے کہ لاہور، کراچی اور پشاور جہاں جہاں میں دورے پر رہتا ہوں، احکام جاری فرما دیں کہ چند آرکسٹرے والے جب اپنے براڈ کاسٹ کے کام سے فارغ ہوں تو میں چند ساعت الفاظ کی آواز کو سازوں سے ہم آہنگ کیا کروں۔

میری یہ گذارشات بہت مسرت سے مان لی گئیں، اور جناب کنٹرولر صاحب نے کمیٹی کو یقین دلایا کہ حفیظ صاحب جس ریڈیو اسٹیشن پر چاہیں آرکسٹرا کے فارغ وقت میں پوری مدد ملے گی!

گورامنہ اور کالا چور

یوں حسن و خوبی اس کمیٹی کی...[illegible] مجلس برخواست ہونے کا اعلان ہوگیا۔ دوسرے ارکان اپنی جگہ سے اٹھے اور جناب سردار نشتر رخصت ہونے لگے۔ میں نے بھی اٹھنا چاہا لیکن ایک ہاتھ میری گردن میں بانہہ ڈال کر میرا کندھا دبا رہا تھا میں سمجھا شاید پرانا جوشِ محبت عود کر آیا ہے۔ لیکن دو لب جو میرے داہنے کان میں سرگوشی فرما رہے تھے وہ میرے قلب پر اب تک نقش ہے۔

"اُستاد ترانہ کالے چور کا منظور کرا دوں گا۔ آپ کا منظور نہیں ہوگا"!

ہیں مسکرایا۔ چونکہ یہ مبارزت دوستانہ ادلے خاص کا انداز لئے ہوئے تھی۔ میں نے بھی اسی طرح سرگوشی ہی میں اس کا جواب پیش کیا۔

"شاگرد جی۔ ترانہ تو پاکستان کی "سادھ" ہی کا منظور کرے گا۔ پھر گورا بھی ہو تو اُس کے منہ پر کالک ہی نظر آئے گی"

(۲)

دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ ـــ

یہ ترانے کے حقیقت نما افسانے کی تمہید تھی۔ تمہید اتنی طولانی ہے تو کہانی مختصر کیسے ہو سکتی ہے؟ ملی ترانے کے چند بند ملت کے حضور نذرانہ پیش کرنے کے لئے جس منزلِ ہفت خواں میں سے میں تن تنہا گذرا ہوں وہ تو ایک داستانِ طلسم ہوشربا ہے جس میں اس بے نوا طلسم کشا کو ایسے ایسے مہیب جادوگروں کے عملی اطوار سے دوچار ہونا پڑا کہ داستانِ امیر حمزہ کا اسد غازی بھی پناہ مانگے!

اس داستان کا تو ایک باب بھی افکار کے پورے شمارے میں سما نہیں سکے گا۔ اگر واقعی یہ واقعات حقیقت پسندی اور ایمان داری کے ساتھ کسی کا خوف کھائے بغیر لکھے جائیں تو یہ کتاب ساری دنیا کے قومی ترانوں کی تاریخ کے مقابل اپنی نظیر آپ ہوگی۔ اسی طرح جیسے ساری دنیا میں خود پاکستان کی تشکیل ایک فردِ واحد کی ذہنی، جسمانی، قانونی، سیاسی، اخلاقی و روحانی جدوجہد کی بے نظیر واحد تصویر ہے۔ جزاک اللہ۔ اے قائدِ اعظم محمد علی جناح ـــ اے ہمارے نور الصباح ـــ!

ترانۂ پاکستان کے چند الفاظ ہیں۔ لیکن ان کا افسانہ چند صد صفحات چاہتا ہے۔ میرا ارادہ ایک کتاب کی صورت میں اس افسانے کو حقیقت پسندوں کے سامنے پیش کر دینے کا ہے۔ تاکہ پاکستان کے ساتھ سندر ہے۔ مجھے اس خدمت سے باز رکھنے، اور سازشوں کے ساتھ چند ایسے الفاظ منظور کرا لینے کے لئے جو راہیں اختیار کی گئیں، اُن کا طشت از بام کرنا میرا کام نہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن میرا تخلیق کردہ ترانہ جب حکومت نے منظور فرما لیا تھا۔ اس کے بعد قومی ترانے کا احترام لازم تھا۔ لیکن ایسا نہ کیا گیا۔ چھ مہینے تک مسلسل اخبارات میں میرا ہی نہیں ترانۂ پاکستان کا مضحکہ اڑایا جاتا رہا۔

گالیاں مجھی کو نہیں ترانہ منظور ہو جانے کے بعد میری بیٹیوں کے نام لے لے کر اخباروں میں دی گئیں۔ اس پر بھی صبر و شکر میرا شیوہ ہے۔

بنگالی اور اردو کا سوال اٹھایا گیا۔ بنگالی اور اردو ہی کا نہیں۔ ترانہ بچے بچے کی زبان پر آ جانے کے بعد ابھی تک ان لوگوں کے کوڑھ میں کھاج موجود ہے۔ اردو کی بجائے پنجابی بولی میں ترانے کی آواز بھی اٹھائی گئی۔ اس لئے لازم آیا کہ ان سازشوں کے ڈھول کا پول کھول کر ہمیشہ کے لئے رکھ جاؤں ـــ لہٰذا میری درازئ عمر کے لئے مناسب ہو تو اس کتاب تک کے لئے میرے جیتے چلے جانے کی دعا کیجئے۔

آپ نے تمہید میں دیکھ لیا کہ ترانے کی تخلیق میرے سپرد کر دی گئی تھی۔ میں ان دنوں افواجِ پاکستان میں تبلیغ

شجاعتِ اسلامی کے لئے بلایا جا چکا تھا۔ میں نے تین مہینے بنگال، سندھ، بلوچستان، شمال مغربی سرحد اور پنجاب کے چند شہروں اور قصبوں کا دورہ کیا۔ مجھے بہت سی دھنیں سوجھیں۔ میں نے لاہور، کراچی اور پشاور کے ریڈیو اسٹیشنوں پر ان دھنوں کو سازوں پر جانچا۔

لاہور اور کراچی کے ریڈیو اسٹیشنوں پر میری حاضری پر وہاں خوش آمدید اور چائے کی مدارات میں تو کمی نہیں ہوئی لیکن جب بھی میں نے لفظوں کی آواز سازوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے سازندوں کی معیت چاہی تو ہمیشہ نظر آیا کہ کسی نہ کسی بات کی ہیرا پھیری ہے ـــــ کبھی کوئی سازندہ اچانک بیمار ہو گیا ـــــ کبھی کوئی ساز عین وقت پر تکان سے بے سُری ہانکنے پر تیار ہو گیا۔

سات آٹھ مرتبہ ایسا ہی ہوا۔

پشاور میں چونکہ میں فوجی بینڈ کے بھی دو آدمی لے گیا تھا۔ وہاں ایک دن تو کام ہوا۔ جس کا ایک فوٹو شاید اسی شمارے میں موجود ہے۔ دوسرے دن جب فوجی بینڈ والے کو میں نہیں لا سکا تو ریڈیو کے سازیوں میں بھی اپنے مطلوب کو نہیں پا سکا۔

ریڈیو پر تقریباً سبھی میرے شناسا تھے۔ میرے دوست، صاحبانِ ذوق و نظر اور حفیظ نواز تھے میں نے اُن سے شکوہ کیا تو مجھے الگ لے جا کر یہ فرمایا گیا :

"حفیظ صاحب! ہمیں آنکھیں بچھا دینے کا تو حکم ہے
لیکن جس کام کے لئے آپ آئے ہیں اُس کے بارے میں یہ سمجھ
لیجئے کہ ہمیں نوکری بھی کرنی ہے!"

یہ عذر کافی و وافی تھا۔ میری تسلی ہو گئی۔ ان سے کوئی شکوہ نہ رہا ـــــ!

بہر آئینہ میں نے الفاظ اور دھن دونوں اپنی ہی "کن رسی" کے بل پر بیک وقت تخلیق کئے اور جیسے کچھ بھی ریکارڈ ریڈیو والوں نے بنا دیئے بن گئے۔

ریکارڈ مجھے مل گئے تو میں نے سکریٹری ترانہ کمیٹی جناب ایس ایم اکرام کو اطلاع دے دی کہ الفاظ اور بنیادی دھن تیار ہیں، ترانہ کمیٹی کا اجلاس بلا لیجئے۔

میں تین مہینے کی اس انتہائی دماغی محنت کے سبب بیمار ہو گیا تھا۔ لہٰذا راولپنڈی کے فوجی ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ اس لئے ترانہ کمیٹی کا اجلاس ۴ جولائی سنہ ۱۹۴۹ء محض میرے لکھے ہوئے ترانے کی جانچ پڑتال کے لئے بلوایا گیا

اس دوران جو کچھ ہوتا رہا، اس طومار میں اردو انگریزی اخبارات کے بے شمار کالم ہیں جن سے ترانے کے لئے شورے اور میری شعر گوئی کی موجودہ خرابی کو گذشتہ کامیابی کا خمار بیان کیا گیا۔ میرے بڑھاپے کا رنگ شباب میری چال ڈھال ہی نہیں میرے گھریلو معاملات پر تنقید احتسابی یعنی ایسا سب کچھ موجود کر دیا گیا جو ہر خدمتِ عوام کرنے والے کو ہراساں کر دے۔

لیکن یہاں ان سب سے قطع نظر کرنا اور فقط ایک اندراج پر اکتفا لازم ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس دوران محترم

قائد ملت اپریل سنہ ۱۹۴۹ء میں انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ وہاں دوسرے امور کے علاوہ اخبارات میں یہ خبر بھی شائع ہوئی ۔ انگریزی روزنامے کا اقتباس حاضر ہے :

Daily Telegraph hails PM's Press conference : other UK papers evince little interest

From Dawn London Office

LONDON, April 30: The Daily Telegraph is the only national (Tory) daily which gave a fairly good report to the Pakistan Prime Minister, Mr. Liaquat Ali Khan's Press conference to political writers of the British and foreign Press.

Declaring that there would be widespread sympathy with Mr. Liaquat Ali Khan's appeal that Pakistan's membership of the Commonwealth should not be taken for granted, it said: "Pakistan is thought here as a firm and reliable friend".

The *London Times* reported only words from the Prime Minister's conference in an inside page, while the Labour Party's official organ, *Daily Herald*, treated it very lightly.

A correspondent had asked the Prime Minister at the Press conference whether Pakistan had any national anthem.

Ignoring totally the Prime Minister's important statement on the declaration of policy regarding the Commonwealth, Afghanistan, Communism, the minorities and a number of answers to serious questions, the *Daily Herald* correspondent simply advertised, "the Prime Minister of Pakistan asked me to help him in getting a national anthems for his country. At present, it has none. Its Government are offering £500 for an acceptable anthem. I should think the tune will have to be related closely to the Quranic chants as Pakistan is primarily an Islamic State."

Extracts from "DAWN" Karachi
Tuesday, May 3, 1949.

اس کے معنی - یعنی ہمارے قائد ملت کو یقین دلایا گیا تھا کہ پاکستان کا قومی ترانہ ولایت ہی سے منگوایا جانا چاہئے یہ یقین دلانے والے کون تھے ؟ اور کیا مغربی موسیقی ترانۂ قومی میں استعمال فرمانے سے ان کا مقصد پاکستان میں اسلامی روح کو مجروح اور تہذیب فرنگی کا مفتوح رکھنا نہیں تھا!

اناڑیوں سے مجھے کھیلنا پڑا اے دوست
سمجھا سمجھا کے نئی چال مات کھائے جا

پاکستان ٹائمز اور دیگر اخبارات میں جو خبر شائع ہوئی، وہ درج ذیل ہے:

حفیظ جالندھری کے گیت پر ترانہ کمیٹی غور کرے گی

کراچی۔ ۱۳ رمئی۔ حکومت پاکستان نے قومی ترانے کی جو کمیٹی مقرر کی تھی وہ ۲۹ رمئی کو مشہور "مسلمان" شاعر حفیظ جالندھری کے گانے اور اس کے سُروں کے متعلق غور کرے گی۔ قومی ترانے کی کمیٹی کے صدر اور پاکستان کے وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر اس جلسے کی صدارت کریں گے۔ اس سے پہلے تقریباً بیس تیس گانے جن میں چند مغربی فنکاروں کے گانے بھی شامل تھے، حکومت کی نگرانی میں فوجی بینڈ پر آزمائشی طور پر گائے گئے۔ لیکن پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خاں نے ان میں سے کسی گانے کو منظور نہیں کیا۔ اس کے بعد حفیظ جالندھری سے کہا گیا کہ وہ قومی ترانہ تیار کریں، اور اُس کی سُریں بھی بنائیں۔ مسٹر حفیظ جالندھری نے حکومت کو مطلع کیا ہے کہ انہوں نے "قومی ترانہ" تیار کر لیا ہے۔　　(امروز۔ ۱۵ رمئی ۱۹۴۹ء)

ان اخباروں کا انداز خبر دہی آپ کے سامنے ہے۔ مسٹر حفیظ جالندھری مسلمان شاعر ملّی ترانے کی بجائے گیت اور گانے وغیرہ کے الفاظ کی عمومیت اور بازاریت کو ملاحظہ فرمایئے۔

خیر چلئے۔ ترانہ کمیٹی کا اجلاس کراچی میں دیکھئے۔ قائد ملت کی متذکرہ اپیل پر دوسرے ملکوں سے اور بھی دھنیں اور اردو، فارسی کے شعراء کی طرف سے بہت سے اور ترانے پیش ہوئے۔ سب کے بعد میں نے بھی اپنے الفاظ خود ترنم سے سنائے۔ میرے لکھے ہوئے ترانے کا پہلا بند یہ تھا ——— میں یہاں دھن کے سُروں کی نوٹیشن نہیں دے سکتا۔ بہر حال پہلا بند حاضر ہے؎

اے میرے آباد وطن آزاد پاکستان
زندہ باد پاکستان
زندہ باد پاکستان
تیرے سمندر۔ تیرے دریا
کُہسار و مَیدان
عزت، شوکت، شان
خُدائے پاک کا ہے احسان
تو ہے پاک امانت

جس پر
زندگیاں قربان
جس پر
زندگیاں قربان
تجھ پہ نچھاور مال، جان، اولاد، پاکستان
زندہ باد پاکستان

اس ترانے کے دو بند اور بھی ہیں جن کا یہاں درج کرنا اس لئے ضروری نہیں کہ یہ جو کچھ بھی ہو قومی ترانہ نہیں ہے۔ اور میں اس کو دوسرے قومی گیت کی صورت میں پیش کر چکا ہوں۔ البتہ یہ کہنا کافی ہے کہ میں نے ان تینوں بندوں میں پاکستان کے مشرق و مغرب دونوں بازوؤں کے لئے ایک ہی روح کا اظہار سادہ الفاظ اور معتدل متحرک دھن میں کیا تھا۔

کمیٹی کے اجلاس میں جب بنیادی دھن کے ساتھ ہم آہنگ الفاظ سازوں کی رنگا رنگی کے ایک ولولہ انگیز رنگ کی صورت میں ریکارڈ پر سنے گئے، تو کمیٹی کے ارکان سر بھی ہلانے لگے۔ بعض تو اپنے قدموں کی تھاپ سے فرش پر اور اپنی انگلیوں کی تھاپ سے اپنی آرام کرسیوں پر لَے کے تأثر کا پتہ دینے لگے۔

—— اس منظر کے دیکھنے والے ابھی زندہ ہیں۔ خدا اُن کو میری موت کے بعد بھی زندہ رکھے تاکہ وہ میرے دعوے کے محاسبوں کا گھر بھر سکیں۔

خیر۔ اب مجھ سے رنگ رنگ کے استفسار بھی ہونے لگے۔ میں جواب ہی دے رہا تھا کہ یکایک وہی کوری "رگِ محبت" پھڑکی۔ غبار کے دل بادلوں سے بجلی کڑکی:

"صاحب یہ انصاف نہیں ہے —— "

سردار نشتر نے پوچھا:

"انصاف کیا نہیں ہے بھئی؟"

جواب ملا:

"ہمارے ریڈیو پر بہت سے عالی شان گویّے ہیں اور بہت سے شاعران نامدار بھی ہیں جن کو حفیظ صاحب کی مانند آسانیاں نہیں دی گئیں، ورنہ وہ بھی ترانے اور دھنیں پیش کر سکتے تھے"

اس پر سردار صاحب نے جو فرمایا، اس کا مفہوم یہ ہے۔ صاحب آپ تو آغاز ہی سے اس کام میں سب سے آگے ہیں۔ جب حفیظ اس میدان میں تھے ہی نہیں۔ ترانے کے الفاظ اور دُھنوں کی صورت میں اتنا کچھ پیش ہو کر مسترد کرنے میں آپ شامل تھے۔ اسی لئے یہ کام حفیظ صاحب کے سپرد آپ کی موجودگی بلکہ آپ کی تائید اور تحسین سے کیا گیا تھا۔ اور پھر حفیظ صاحب انعامی مقابلے میں تو شامل بھی نہیں۔

ہاں جناب: "لیکن بہت سے اور شاعر بھی تو انعامی مقابلے میں شامل نہیں ہوئے۔ اُن کو بھی موقع ملنا چاہئے"

"بھئی اب لنچ کا وقت ہو گیا ہے۔ حفیظ صاحب نے بہت حسن و خوبی سے ترانہ کمیٹی کی ہدایت کے مطابق الفاظ

اور بنیادی دھن پیش کر دی ہے۔ اس میں اصلاح یا ترقی کے لئے آج ہی طے ہونا چاہئے۔ ۴ بجے سہ پہر آپ سب صاحبان تشریف لے آیئے تاکہ ہم کسی فیصلے پر پہونچ جائیں"!

الغرض اس دھاندلی میں یہ نشست اٹھی۔ چودھری نذیر احمد نے مجھے وہ چیز دی جسے "لفٹ" کہتے ہیں، اور ایسے مقام پر اتار دیا جہاں سے میں وکٹوریا لے کر اپنے میزبان مجیب انصاری کے مکان کی چار دیواری میں چلا گیا، اور اس صورت حال پر اس نئی چال پر خندۂ پُرملال فرماتا ہوا چند لقمے حلق میں اُتار ڈالے۔

کل شام ہی میں پنڈی سے کراچی آیا تھا۔ میرے پاس کراچی میں کار کہاں تھی۔ اور سرکار دولتمدار سے بھی دوسروں کی طرح "اسٹاف کار" طلب فرمانا اپنے لئے بے کار جانا۔ "بے بس" میں ہمیشہ ہی سے ہوں۔ بسوں میں کھڑے رہنے کی سکت نہیں۔ لہٰذا پھر سڑک سوار ہوا۔ تو ایک مریل گھوڑے میں جتی ہوئی وکٹوریا میں بہ خرابیٔ بسیار سردار عبدالرب خاں نشتر مرحوم کے دولت کدے پر آ پہونچا۔ اراکین موجود تھے۔ میں پون گھنٹہ لیٹ تھا۔ دو امدادی کمیٹیاں تجویز ہو چکی تھیں۔ ایک ٹیون کمیٹی ایک پڑتال کمیٹی — جن کا کام یہ تھا کہ اب تک جو کچھ ہو چکا ہے ہدایت کے مطابق اس کی پڑتال کے بعد ترانہ کمیٹی کے آئندہ اجلاس میں پیش کریں۔

مجھے بتایا گیا کہ سید ذوالفقار علی بخاری صاحب نے جناب جوشؔ ملیح آبادی، جناب سیمابؔ، جناب جگرؔ، جناب تبسمؔ، جناب سالکؔ اور جناب کرنل فیض احمد فیضؔ مدیر اعلیٰ پاکستان ٹائمز اور امروز کے اسمائے گرامی پیش کئے ہیں۔ جن سے جناب جوشؔ کے علاوہ کمیٹی خط وکتابت کرے گی۔

میرا ایما طلب کیا گیا۔ میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ کیوں کہ اگرچہ دوسری نشست بھی میرے تخلیق کردہ ترانے کے بارے میں ردّ وقبول یا ترمیم و ترقی کا فیصلہ ہو جانے کے لئے تھی۔ لیکن میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ قومی ترانے کی تخلیق کو محض اپنی ہی توفیق سمجھ لوں۔ میرے ایسے بزرگ اور محترم شاعروں کا نام آئے اور میں اس خدمت کو اپنی ہی جاگیر جان کر ان کو ان کی سعادت سے محروم کروں۔ میرے اللہ نے مجھے اس انانیت سے باز رکھا۔ میرا اپنا ہی تو شعر ہے کہ ؎

دوستوں کو بھی ملے درد کی دولت یارب
میرا اپنا ہی بھلا ہو مجھے منظور نہیں

میں نے عرض کیا، "بزرگو! پاکستان کے لئے بہترین ترانہ مہیا کرنا اس کمیٹی کا مقصود ہے۔ کوئی بھی اس کو تخلیق کرے قوم وملت پر احسان کرے گا۔ اور یہ احسان مجھ پر بھی ہوگا!

سردار عبدالرب خاں نشتر کی نگاہِ شکر گذار کے ساتھ میں اس نشست سے رخصت ہوا۔ میں تعجب کر رہا تھا کہ جن بزرگ شاعروں کے نام بخاری صاحب نے پیش کئے ہیں ان میں ہر ایک واقعی شاعر باکمال ہے۔ یہ جس کالے چور کا ذکر تھا وہ کون ہے —!

اس مرتبہ مجھے پاکستان کے بحری بیڑے کے مجاہدوں کو بھی مخاطب کرنا تھا۔ ایک ہفتہ میں کراچی ہی میں ٹھہرا رہا۔ دو مرتبہ مرحوم چھاگلا مجھ سے ایک بحری مرکز "بہادر" پر ملاقات کرنے آئے مجھ سے ان کی کسی زمانے میں سر عبداللہ ہارون مرحوم کے ہاں پہلے بھی دو چار ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ یہ ان دنوں کی ملاقاتیں تھیں جب جنگ عالمگیر کے دوران میں نے

سونگ پبلسٹی کا ایک مرکز کراچی میں بھی حاجی نذیر الدین صاحب کی ماتحتی میں قائم کیا تھا۔ ان دنوں چھاگلا صاحب میرے تخلیق کردہ جنگی گیت سُن کر مجھے موسیقی کے کتابی رموز کے حوالوں کی مطابقت کے ساتھ تحسین سے نوازا کرتے تھے۔

اب اس مرتبہ اِن دو سرسری ملاقاتوں میں مرحوم نے مجھ سے کچھ پنجابی دھنوں کے سننے کی فرمائش کی۔ میں نے جالندھر کی پنجابی میں اپنی بولیاں، اور ساتھ ہی ان کے مقابل ماہیا کے دو چار بول بھی ترنم سے سنائے۔

یہ بہت بزرگ آدمی تھے۔ موسیقی کی کتابیں پڑھی تھیں۔ خود گا تو نہیں سکتے تھے لیکن اصولوں کا تذکرہ اُن کا معمول تھا۔ انہوں نے مجھ سے میرے لکھے ہوئے ترانے کی دھن بھی سنی۔ اور بہت تحسین کی۔ اور فرمایا: یہ بچے بچے کو یاد ہو جائے گا۔ بہت تھرلنگ ہے۔

اے کاش مجھے معلوم ہوتا۔ یا وہ بزرگ مجھ پر اعتماد کر کے بیان فرما دیتے کہ ایک سندھی وزیر باتدبیر اور ریڈیو کے صاحب نے ان سے دھن کی فرمائش کی ہے۔ اگر وہ بتا دیتے تو میں سکوت افزا کی بجائے متحرک دھن کے لئے اُن سے تعاون کرتا۔ ہم دونوں وہیں بیٹھ جاتے اور لفظ اور دھن کے لئے دو قالب ایک جان بن جاتے:

لیکن اللہ کو یہ منظور نہ تھا۔ میرے لئے مقدر تھا کہ اس ملت مسلمۂ پاکستان کے حضور ایک ملی ترانہ پیش کرنے کے بارے میں سازشوں اور کاسہ لیسیوں کے عبرت انگیز مناظر دیکھوں۔

مجھے اعتراف ہے کہ میری سادہ دلی کو یہ وہم بھی نہ تھا کہ اب ایک نہیں پس پردۂ زنگاری اور زیر دامان وسیہ کاری دو معشوق ہیں اور اس معمر بزرگ کو پھانسا گیا ہے۔ اس لئے کہ رنگ، روغن اور غازہ کے لئے ہڈی تو اس کی پیسی جائے، اور نکھار کالے چور کے منہ پر آئے۔

کراچی کی اس نشست کے بعد بطور رکن کبھی کبھی کوئی غیر اہم اطلاع مجھے ملتی رہی۔ لیکن ہو کیا رہا ہے؟ — اس کی باضابطہ اطلاع سب مجھے مدتوں نہیں دی گئی۔ ترانہ کمیٹی کے کسی اجلاس کا کوئی ایجنڈا کسی اور ممبر کو بھی نہیں بھیجا گیا۔ مگر اخباروں میں آئے دن بھانت بھانت کے تمسخر انگیز اداریئے، کالم اور خبریں چھپتی رہیں۔ افواہیں بھی پھیلیں اور پھیلائی گئیں۔ مجھ سے اخبارات میں براہ راست استفسار در استفسار بھی ہوئے۔

میں نے بالآخر ایک بیان میں اعتراف کیا کہ میں مقتدر حضرات سے ڈرتا ہوں۔ اس لئے جب تک قوم میری جان اور عزت و آبرو کو علانیہ پناہ نہ دے میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔

میرے اس عذر پر تعجب بھی ہوا کہ یہ یہ وہی حفیظ ہے جو علانیہ برسرِ مجلس سچ کہنے سے باز نہیں رہتا تھا، آج غیر معمولی طور پر کانپ رہا ہے۔

ہاں میں کانپ رہا تھا۔ اب فن کا نہیں جیتھوں کا زمانہ تھا۔ قومی ترانے سے پہلے کوئی بھی گھنونی حرکت اور واردات کبھی کرائی جا سکتی تھی — اور کچھ نہیں تو جھوٹی خبریں اڑا کر شاہنامۂ اسلام کے مصنف کا منہ کم از کم اس پاکستان میں تو کالا کر دیا جانا کچھ مشکل نہ تھا۔

میرے اس فقرے کا جواب کہ:

"چور کالا ہو یا گورا اس کے سینے کی سیاہی اس کے ماتھے پر آ جائے گی"

ایک تو مل چکا تھا کہ میرا اپنی دھن پر تخلیق کردہ ترانہ اب لبیا ل تانے سو رہا تھا۔ اور اس کی جگہ کچھ اور لانے کے لئے وہ سب کچھ ہو رہا تھا جو اندھیرے ہی میں ہو سکتا ہے۔

میں ان امور کو کتاب ہی میں لاؤں گا یہاں کالا چور کا ایک ہی شائستہ حرکت کا نمونہ آپ کو دکھاؤں گا۔

اقتباس ایک طویل خط کا ہے جو روزنامہ امروز کی ۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ یہ یاد رکھئے کہ میرا ترانہ ہر جولائی کو کمیٹی کے اندر پیش ہو چکا تھا۔ اس خط کی چند سطریں ملاحظہ فرمائیے اور اندازہ لگائیے کہ اس خط کے نیچے میں راقم کا نام "ناسوتی" شائع ہوا ہے وہ کون صاحب ہو سکتے ہیں۔

> "اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ان دنوں پاکستان کا قومی ترانہ لکھا جا رہا ہے۔ اور حکام کی طرف سے اس بات کی تاکید کی جا رہی ہے کہ اس کی دھن بھی پاکستانی بلکہ خالص اسلامی ہو۔ پچھلے دنوں ہمارے ملک کے ایک مشہور شاعر نے جو موسیقی کے آداب اور نغمہ طرازی کے اصولوں سے بھی واقف ہے، قومی ترانہ لکھا اور اس کی دھن بھی قائم کی۔ آپ کو یہ سن کے تعجب ہوگا کہ یہ دھن ہندوستانی تھیٹر کے ایک مشہور گانے سے لی گئی تھی، اور ترانے کے الفاظ بھی اسی دھن کی مناسبت سے تلاش کئے گئے تھے۔ یہ گانا شاید آپ نے بھی سنا ہو سے
>
> ارغوانی شراب میری جانی شراب
> آجا آجا تجھے ڈالوں پیٹ میں
>
> اگر پاکستانی موسیقی کا ملکوت یعنی سب سے اونچا مقام یہی ہے تو فرمائیے پھر ناسوتی کیا کریں؟"
>
> "ناسوتی"

امروز میں مجھے یہ پڑھ کر ہنسی بھی آئی رحم بھی آیا۔ آخر بے چارہ کالا چور! اپنے گورے یار کے بلائے ہوئے ہی نہیں برما برما کر انتڑیوں کے اندر پہونچائے ہوئے جانی — ارغوانی پانی کو کس کس رنگ سے اُگل رہا ہے —!

دُھن مت سُن، سر دُھن

ایک دن کا ذکر ہے کہ میں پاک آرمی ہیڈ کوارٹر راولپنڈی میں دن کے گیارہ بجے میجر جنرل رضا ایڈجوٹینٹ جنرل کے

ساتھ تھا کہ کراچی سے ٹیلیفون ٹرنک کال ہوئی۔ ترانہ کمیٹی کے سکریٹری ایس ایم اکرام کی جگہ محترم کرنل علوی مجھ سے مخاطب تھے۔ فرمایا۔ یہ پیغام اوپر سے آپ تک پہونچانے کا حکم ہے کہ حسن اتفاق سے ترانہ کمیٹی کے بعض ارکان کراچی میں موجود ہو گئے ہیں آپ بھی فوراً پہونچ جائیں۔ آج ہی تین بجے پیرزادہ عبدالستار کے بنگلے پر بہت ہی اہم اجلاس ہے۔

میں نے عرض کیا کہ راولپنڈی میں اس وقت دن کے گیارہ بجے ہیں۔ جسمانی طور پر تو ممکن نہیں کہ میں کراچی تین بجے آسکوں۔ آج ہوائی جہاز کا دن بھی نہیں ہے۔

فرمایا: آپ تو فوج میں ہیں کسی ایئر فورس کے جہاز کو حکم دیجئے۔ آپ ڈائرکٹر آف مورالز ہیں یا نہیں۔؟

کرنل علوی میرے بہت ہی پیارے دوست ہیں۔ میں نے پوچھا:

"علوی جی۔ کیا آپ تمسخر کر رہے ہیں؟"

کرنل صاحب نے جواب دیا:

"نہیں حفیظ صاحب۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کا آج کراچی آنا ممکن نہیں۔ لیکن مجھے یہی حکم ملا ہے۔ ساتھ یہ بھی عرض کرنے کا حکم ہے کہ اگر آپ آ نہیں سکتے تو تار کے ذریعے کمیٹی کے فیصلے کی تائید میں Consent بھیج دیجئے کہ قومی ترانے کی دھن آپ کو منظور ہے۔"

"اچھا۔ یہ ترانے کی دھن کا معاملہ ہے!" ٹیلیفون پر مجھ سے بے اختیار ہنسی چھوٹی۔ میں نے عرض کیا۔ "حکم دینے والوں سے کہہ دیجئے کہ یہ ملت اسلام اور پاکستان کا اہم ترین معاملہ ہے۔ دھن کو سنے بغیر حفیظ جالندھری اس کی تائید کرے۔ ناممکن۔

"ایں از من نمی آید!"

اندھیری رات چھاپا مارتی ہے پول نگا ہوں پہ

میں نے تو ٹرنک کال کے ذریعے دھن سنے بغیر سر دھننا منظور نہ کیا۔ لیکن اندھوں میں صبح کے ظہور کا شور مچ گیا ان الفاظ کے پڑھنے والے اگر پاکستانی ہیں وہ اگر فی الحال خدا لگتی کہہ نہ سکیں تو کم از کم خدا لگتی پر غور تو ضرور فرمائیں کہ قائد اعظم کے بعد وزیروں اور ان کے بعض پر تزویر مشیروں اور انگریزی وقت کے کارندوں نے کیا اندھیر گردی مچا رکھی تھی۔

یہ زر۔ زن۔ زمین کا معاملہ نہ تھا ـــــ یہ عہدہ و اقتدار کی دوڑ نہ تھی ـــــ یہ تو پاکستان کی موجودہ اور آئندہ نسلوں اور پاکستان کے لئے بھی اور ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے بھی چند الفاظ جمع کرنے کا اور حسن کاری کے فن کا معاملہ تھا۔ ہنر کا معاملہ۔ حسن نیت کا، اور صرف پاکستان ہی نہیں ساری ملت اسلامی کی ذہنی تربیت کا معاملہ۔ اس میں گندی سیاست کی خباثت کوئی اچھی بات نہ تھی۔

میں انہی خیالات میں مگن فوج پاکستان کے دلوں کو گرمانے میں لگا رہا۔ کہ ذیل کی خبر میرے سامنے آگئی۔ ملاحظہ فرمائیے:

پاکستان کا قومی ترانہ

کراچی ۲۰ راگست - یاد ہوگا کہ حکومت
پاکستان نے قومی ترانے کے سلسلے میں ملک کے ادیبوں
اور شاعروں سے قومی ترانہ بنانے کے لئے کہا تھا اور
انعام کا اعلان بھی کیا گیا تھا - معلوم ہوا ہے کہ
۲۱ پاکستان کے قومی ترانے کی کمیٹی نے ریڈیو پاکستان
اور مسٹر چھاگلا کی بنائی ہوئی دھن منظور کر لی ہے
(ا - پ - پ) (امروز - ۲۳ راگست ۴۹ء)

ملاحظہ فرمایا آپ نے، یعنی ترانہ کمیٹی کا کوئی ایجنڈا کسی رکن کو نہیں بھیجا گیا۔ جس شخص کے کندھوں پر یہ کام کمیٹی نے اتفاق رائے سے خود رکھا تھا اس کو دھن سنے بغیر منظور کر لینے کی فرمائش ہوتی ہے۔ وہ جسمانی طور پر حاضر ہو ہی نہیں سکتا اور دھن منظور کر لی جاتی ہے۔

کون منظور کرتا ہے۔ یہ مجھے کیا خبر ـــ میں کیا جانوں ـــ!

واہ رے کالے چور ـــ! اب معلوم ہوا ہے کہ ترانہ چوروں کا بیوپار بنایا جا رہا ہے۔

پانچ برس تک چور اندھیرے میں اپنا کام کرتا رہا۔ لیکن ؎

اجالے نے اندھیرے کو شکست فاش دی آخر

اندھیرے میں جو کچھ بیتی، وہ افکار کے ان صفحات میں سما نہیں سکتی ـــ اس کے لئے عرض کر چکا ہوں ـــ کہ میری کتاب فسانۂ ترانہ کا انتظار کیجئے ـــ اور دیکھئے کہ جب "سا دھ" ہی کا ترانہ پاکستان نے اپنے لئے قبول فرمالیا تو ترانے کے مصنف کو کس طرح چور کے یاروں نے آ لیا ـــ

حفیظ اہل زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

(حفیظ)

حفیظ جالندھری

نیا دَور

نئے دَور میں۔ نشہ اُتر جائے گا شخصی قوّت کا
بر سرِ بزمِ عام چلے گا دَورِ جامِ اخوت کا
قیدِ بشر کی زنجیریں جمہور کے ہاتھوں ٹوٹیں گی
غلبۂ زر کی تقدیریں مزدور کے ہاتھوں پھوٹیں گی

نئے دَور میں ــــ محنت سرمایہ گردانی جائے گی
مُفت خور کی توند نہ عالی پایہ جانی جائے گی
قدرِ ہنر معیارِ نظر ہی سے پہچانی جائے گی
پیسے پر منقوش کوئی بھی رائے نہ مانی جائے گی

حفیظ جالندھری

رہروانِ مدینہ سے خطاب

(دو بند)

قدم اٹھا۔ قدم ملا
قدم اٹھا کے چل
قدم ملا کے چل
ترا وجود روشنی ہے چشم ارض کے لئے
خدا کا نام لے کے چل ادائے فرض کے لئے
ادائے فرض کے لئے
قدم اٹھا کے چل
قدم ملا کے چل

قدم اٹھا — قدم اٹھا
قدم اٹھا کے چل
قدم ملا کے چل
مجاہدانِ پاکباز تیرے ہم طریق ہیں
جُدا نہ ان سے رکھ قدم کہ یہ ترے رفیق ہیں
قدم ملا کے چل
اَدائے فرض کے لئے
قدم اٹھا کے چل

حفیظ جالندھری

باہمت جواں مردوں سے

(رھگذارِ کہکشاں کے چند شعر)

ہر بلندی تم کو دیتی ہے بلندی کا پیام
ہر اُفق سے آسماں کرتا ہے جھک جھک کر سلام

ایک منزل دُوسری منزل کا دیتی ہے نشاں
اک نیا عالم عیاں ہوتا ہے تم پر ہر زماں

شب اندھیری ہے تو کیا جب نُورِ جاں مَوجود ہے
آسماں پر رھگذارِ کہکشاں موجود ہے

نوعِ انسانی کی منزل کا یہ تنہا راستہ
نقشِ پائے ہادیٔ کامل سے ہے آراستہ

حفیظ جالندھری

جزیرے

(آزادی کے بعد ملک کے بیشمار رہنماؤں کی ادائیں)

قافلے برباد ہو کر رہ گئے، تو کیا ہوا
مطمئن ہیں قافلہ سالار اپنے کام سے
عہدہ و منصب کی بازی جیت کر گھڑ دوڑ میں
تھان پر ہیں ریشمی گھوڑے بڑے آرام سے
قافلے برباد ہو کر رہ گئے تو کیا ہوا

رہنماؤں کو سجا کر منزلِ مقصود پر
ٹھوکریں کھاتا ہے تاریکی میں امت کا جلوس
جن بہشتی مقبروں پر ہو گئے روشن چراغ
ملتِ بیضا بھی تھے چند گنتی کے نفوس
قافلے برباد ہو کر رہ گئے تو کیا ہوا

کیوں گروہِ عام کی ذلت کا غم کھائیں خواص
جن کو اس ذلت میں لذت کے ذخیرے مل گئے
کشتیاں گرداب میں چھوڑیں ۔ خدا حافظ کہا
ناخدا خوش ہیں کہ ان کو تو جزیرے مل گئے

حفیظ جالندھری

انگریز سے آزادی کے دوران
جب خونِ انسانیت بہہ رہا تھا

(سہمے ہوئے اہل قلم میں حفیظ صاحب کے خطبۂ صدارت کے چند بند)

اس بزم کی بخشی گئی مجھ کو جو صدارت
نوخیز جوانوں کی ہے اک طرفہ شرارت
ہیں اس کے یہ معنی کہ نہیں مجھ میں حرارت
کرسی پہ بٹھایا ہے مجھے بہر زیارت
یعنی مری خدمت کا یہ انعام ملا ہے
بیٹھا رہوں۔ دیکھا کروں، یہ کام ملا ہے

حالانکہ ابھی میں بھی جواں ہوں مرا دل بھی
لیلائے ترقی کا ہے مجنوں مرا دل بھی
ہر فتنۂ تازہ کا ہے مفتوں مرا دل بھی
ہر حادثۂ نو سے ہے پُرخوں مرا دل بھی
پھر میری جوانی پہ نہیں آج یقیں کیوں
یاروں نے بنایا ہے مجھے صدر نشیں کیوں

اے اہلِ قلم! رنگِ جہاں دیکھ رہے ہو
یہ خون کا سیلابِ رواں دیکھ رہے ہو
ہے خاکِ وطن شعلہ فشاں دیکھ رہے ہو

افلاک پہ آہوں کا دُھواں دیکھ رہے ہو
یہ زہرِ سیاست ہے کہ ہے قہرِ الٰہی
اے اہلِ قلم دیکھ رہے ہو یہ تباہی

جس نور کو اجسام میں ڈھالا تھا خدا نے
وہ حُور جسے گود میں پالا تھا حیا نے
جس حُسن کے شاعر کی زباں پر تھے ترانے
جو شکل سُجھاتی تھی ادیبوں کو فسانے
آج اُس کا برا حال ہے۔ تم دیکھ رہے ہو
راہوں میں وہ پامال ہے۔ تم دیکھ رہے ہو

برچھوں پہ چڑھائے ہوئے اجسام کے پرچم
ہر سینے پہ دوشیزۂ معصومہ کا سر خم
اس جسمِ برہنہ پہ بھی ہر دخترِ آدم
آتی ہے نظر اوڑھے ہوئے چادرِ مریم
خاموش نگاہوں کی حیا دیکھ رہے ہو
کاٹے ہوئے ہاتھوں کی دعا دیکھ رہے ہو

اس طرزِ گذارش کی ملے مجھ کو معافی
تم سب ہو سخن سنج۔ ادیب اور صحافی
اے اہلِ قلم دیکھتے رہنا نہیں کافی
یارو کوئی تجویز کرو نسخۂ شافی
ورنہ مجھے ڈر ہے یہ مرض اور بڑھے گا
چڑھتا ہوا دریائے جنوں اور چڑھے گا

حفیظ جالندھری

میرا آغازِ فن

(حفیظ صاحب کے جشن طلائی منعقدہ راولپنڈی مئی ۱۹۵۰ء کی یادگار نظم کے چند بند درج ذیل ہیں۔)

مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ
کہ میں اور مرا جذبۂ مخلصانہ
سرِ راہ گاتے ہوئے اک ترانہ
قدم با قدم اور شانہ بشانہ
نہ جانے کہاں سے ہوئے تھے روانہ
کوئی منزل تھی، خبر کو چلے تھے۔ کہ حرفِ دعا تھے اثر کو چلے تھے
فقط سیر تھی یا سفر کو چلے تھے۔ نہیں جانتے تھے کدھر کو چلے تھے
چلے جا رہے تھے مگر والہانہ
لگاتے ہوئے نعرۂ عاشقانہ
مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ

مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ
کہ میں اور مرا جذبۂ مخلصانہ
نظر باز تھے اور جلووں کے عادی
لئے جا رہی تھی وہیں خوش ارادی

جہاں جلوہ فرما تھے کہسار و وادی
کہ یہ حسنِ فطرت کے رنگیں نظارے　　　بشر کی نگاہِ تغافل کے مارے
اُداس اور افسردہ سارے کے سارے　　　بڑی دیر سے منتظر تھے ہمارے
ہم آئے تو ان سب نے مل کر صدا دی
حفیظ اِس طرف۔ یہ ہے تصویر خانہ!
مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ

مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ
کہ میں اور مرا جذبۂ مخلصانہ
بہر رنگ تھے حسنِ فطرت کے شیدا
بہ شب کی سیاہی۔ سحر کا سپیدا
بیک وقت ہم چاہتے تھے بہ پیدا
تصور کے بازارِ صنعت میں گھومے　　　خیالوں میں لہرائے خوابوں میں جھومے
بفکرے "جھولے" بہ وصفِ "طلوعے"　　　نہ پوچھو کہ ہم نے قدم کس کے چومے
مگر کر لیا دستِ تخلیق پیدا
ملا اَحْسَنُ الْخَالِقِیْن کا خزانہ
مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ

مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ
کہ میں اور مرا جذبۂ مخلصانہ
کھلنڈرے تھے خود بھی کھلنڈرا ہی فن تھا

یہ فردوسِ حوّا کا طفلانہ پن تھا
یہ آدم کا گم کردہ باغِ عدن تھا

ہمارا تخیّل تھا استاد کامل　　یہ استاد تھا نقش بندی کا حامل
عمل حُب کا سیکھا نے ہم کبھی عامل　　ہوئے اب تو قدرت کے کھیلوں میں شامل

یہی ایک مدّت ہمارا چلن تھا
چلاتے رہے قدرتی کارخانہ
مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ

مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ
کہ میں اور مرا جذبۂ مخلصانہ
اگرچہ گرو" عشق جی" کے تھے چیلے
مگر ہم نے خود بھی نئے کھیل کھیلے
کٹورے بھرے اور دریا اُنڈیلے
چٹانوں پہ روئی کے گالے دھکیلے
ندی میں لگائے ستاروں کے میلے

دل و دیدہ پابندِ آزادیوں کے　　گرفتار خوابوں کی شہزادیوں کے
بہت شوخ و بیباک تھیں اپنی چالیں　　یہاں عرض کرتا ہوں چند اک مثالیں
مثالیں کہ منہ بولتی مورتیں ہیں　　نئے چوکھٹوں میں نئی صورتیں ہیں

یہ شکلیں نہیں ہیں فقط ہیں اشارے
ذرا دیکھنا رنگ کیا تھے ہمارے

کہیں خشک پتوں میں جا کر کھڑکنا　　کہیں کونپلوں کے دلوں میں دھڑکنا

کہیں کاہ میں مثلِ شعلہ بھڑکنا
کہیں کوہ پر رعد بن کر کڑکنا

کہیں قبضۂ گل میں شمشیر دینا　　　　کہیں پتھروں کے جگر چیر دینا
اگر کوہکن کو جوئے شیر دینا
تو پھر پیرزن کو بھی تدبیر دینا

اُجالوں کے نیچے اندھیرا دکھانا　　　　ہواؤں کا سایہ گھنیرا بنانا
خلاؤں میں بجلی کا ڈیرا لگانا
کھلی دوپہر کو سویرا بتانا

کبھی شاخساروں سے مل مل کے گانا　　　　کبھی اُن کی سازنگیاں توڑ جانا
کبھی ابرِ لُطف و کرم بن کے آنا
کبھی برف باری کے طوفاں اٹھانا

کبھی چُھپ کے غنچوں کی خوشبو چُرانا　　　　کلی کی طبیعت کبھی گدگدانا
کفِ گل سے شبنم کے موتی گرانا
سرِ برگ تھالی پہ تالی بجانا

فضا پر ہماری عملداریاں تھیں　　　　فسوں سازیاں شعبدہ کاریاں تھیں
اگر قہرماں تھے ستم کاریاں تھیں
اگر مہرباں تھے توکل کاریاں تھیں

یہ رنگین فطرت تھی در اصل سادی　　　　نہ فطرت فسادی نہ ہم تھے فسادی
جہاں ہم نے جو شکل چاہی بنا دی　　　　سخن دوست کے گھر میں شادی رچا دی
غزل، زمزمہ، گیت، نغمہ، ترانہ
مجھے یاد ہے آج تک وہ زمانہ

حفیظ جالندھری

(تین سال بعد پاکستان میں پہلی غزل)

یہ کیا مقام ہے وہ نظارے کہاں گئے
وہ پھول کیا ہوئے وہ ستارے کہاں گئے

یارانِ بزم جرأتِ رندانہ کیا ہوئی
اُن مست انکھڑیوں کے اشارے کہاں گئے

ایک اور دَور کا وہ تقاضا کدھر گیا
اُمڈے ہوئے وہ ہوش کے دھارے کہاں گئے

افتاد کیوں ہے لغزشِ مستانہ کیوں نہیں؟
وہ عذرِ مے کشی کے سہارے کہاں گئے

باندھا تھا کیا ہوا یہ وہ اُمید کا طلسم
رنگینیٔ نظر کے غبارے کہاں گئے

اُٹھ اُٹھ کے بیٹھ بیٹھ چکی گرد راہ کی
یارو وہ قافلے تھکے ہارے کہاں گئے

ہر میرِ کارواں سے مجھے پوچھنا پڑا
ساتھی ترے کدھر کو سدھارے کہاں گئے

فرما گئے تھے راہ میں بیٹھ انتظار کر
آئے نہیں پلٹ کے وہ پیارے کہاں گئے

تم سے بھی جن کا عہدِ وفا اُستوار تھا
اے دشمنو! وہ دوست ہمارے کہاں گئے؟

کشتی نئی بنی کہ اُٹھا لے گیا کوئی
تختے جو لگ گئے تھے کنارے۔ کہاں گئے؟

اب ڈوبتوں سے پوچھتا پھرتا ہے ناخدا
جن کو لگا چکا ہوں کنارے۔ کہاں گئے

بے تاب تیرے درد سے تھے چارہ گر حفیظ
کیا جانیے وہ درد کے مارے کہاں گئے

حفیظ جالندھری

(غزلوں میں سے ایک اور غزل)

جھگڑا دانے پانی کا ہے دام و قفس کی بات نہیں
اپنے بس کی بات نہیں، صیاد کے بس کی بات نہیں

جان سے پیارے یار ہمارے قید وفا سے چھوٹ گئے
سارے رشتے ٹوٹ گئے اک تارِ نفس کی بات نہیں

تیرا پھولوں کا بستر بھی راہگذارِ سیل میں ہے
آقا! اب یہ بندے ہی کے خار و خس کی بات نہیں!

دونوں ہجر میں رو دیتے ہیں دونوں وصل کے طالب ہیں
حسن بھلا کیسے پہچانے عشق و ہوس کی بات نہیں

سازِ نفیرِ خواب سے غش ہے قافلۂ آرام طلب
اندازِ خاموشیٔ لب آوازِ جرس کی بات نہیں

نوش ہے عنوان نیش نتیجہ۔ ان شیریں افسانوں کا
تذکرہ ہے انسانوں کا یہ مور و مگس کی بات نہیں

کارِ مغاں یہ قند کا شربت بیچنے والے کیا جانیں؟
تلخی و مستی بھی ہے غزل میں خالی رس کی بات نہیں

تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

حفیظ جالندھری

(پھر ایک غزل)

سمٹ آئے ہیں گھر میں ویرانے
تو کدھر جا رہا ہے دیوانے

کہہ گئے الفراق یارانے
رہ گئے نا تمام افسانے

دوستی اب گلے کا ہار نہیں
تار ٹوٹا بکھر گئے دانے

صبح دم اپنی اپنی راہ لگے
شمع کے جاں نثار پروانے

ساقیا اب رواروی کا ہے دَور
بھر دے بھر دے کچھ اور پیمانے

ایک کعبہ نہ بن سکا ہم سے
توڑ ڈالے ہزار بُت خانے

ماتمِ اہلِ ظرف کے دن ہیں
اختراما ہیں بند مے خانے

کر رہا ہوں تلاش اپنوں کی
جب سے گم ہو گئے ہیں بیگانے

زندگی سے نپٹ رہا ہوں ابھی
موت کیا ہے مری بلا جانے

ہم نے روکا حفیظ کو ورنہ
اور بھی کچھ لگے تھے فرمانے

تقدیر کی گردش مجھے ایک ایسے ماحول میں لے گئی جہاں ایک فرد واحد ہزارہا انسانوں کے سرمایۂ محنت کو شراب کے پیالے میں غرق کر کے چڑھا جانے پر مُصر تھا۔

تباہ حال محنتی مزدور کسان، مرد عورت روٹی کے لئے ہلکان ہوئے جاتے تھے، لیکن شخص مذکور حق "آبائی" کے نام سے خون پسینے کے اس حاصل کو ایک بازاری عورت کے نخروں اور بھڑووں کی بُوالہوسی کی بھینٹ چڑھائے ڈالتا تھا۔

ریاست پر رئیس مُسلّط تھا، رئیس پر رقاصہ۔

میں اجنبی تھا۔ شاعر جان کر رقاصہ نے نسیبہ کی فرمائش کر دی، تعمیل ضروری تھی۔ میں نے یہ نظم بھری محفل میں کہہ سنائی ــــ!

صلہ ــــ دارو گیر۔ قید و بند ــــ آخر یا بدست دیگرے دست بدست دگرے، اس رنگین ماحول سے نکال دیا گیا۔

یہ واقعہ سنہ ۱۹۲۵ء کا ہے۔

رئیس سدھار چکا۔ رقاصہ کسی گوشۂ گمنامی میں اپنی جھریوں کو آخری رقص کے لئے ترتیب دے رہی ہے۔ لیکن یہ نظم باقی ہے اور جب تک ایسے رئیس ایسی ریاستیں اور ایسی رقاصائیں موجود ہیں، باقی رہے گی ــــ انشاء اللہ

(حفیظ)

ڈاکٹر تاثیر

دیباچہ

" رقاصہ " حفیظ کی شاعری میں ایک نئے باب کا افتتاح ہے ۔ " تاروں بھری رات " " برسات " اور " نغمہ زار " کی دیگر نظموں کو ہم محسوسات کی شاعری کہہ سکتے ہیں ۔ فضا کے ہر گوشے میں ــــ نکہتوں کی کیفیت آوری رنگوں کا خمار اور مناظر کی سرمستیاں رقصاں نظر آتی ہیں ۔

شاعر کے سامنے گاؤں کی کھلی فضائیں ہیں ۔ قدرت وسیع مرغزاروں میں کھیل رہی ہے ۔ معاشرت کی شاہراہیں پیچیدگیوں سے پاک ہیں ۔ ہر چیز پر دوشیزگی کا عالم ہے لیکن جب وہ اس آزاد زندگی سے نکل کر وہاں پہونچتا ہے جہاں ہر راستہ پیچیدہ ہے ۔ جہاں ہجوم خلائق سے تنفس گھٹنے لگتا ہے اور جہاں " کشمکش حیات " اور " تنازع للبقا " پر خروش عروج پر ہیں وہ ٹھٹک کر رہ جاتا ہے ۔ اور ان حالات کو کہ جن کے ساتھ روزمرہ سابقہ پڑنے کی وجہ سے ہماری قوت جائزہ شل ہو چکی ہے ۔ اس " نگاہ اولیں " سے دیکھتا ہے جو ایک سچے شاعر کی خصوصیت ہے ۔ وہ شہروں کی معاشرت کو اچھی طرح جان لیتا ہے اور سطحی خوش نمائیوں اور دل فریبیوں سے گذر کر اس داغ برص کو بے نقاب کر دیتا ہے جسے حریر و پرنیاں کے نہ در نہ پردوں میں چھپایا جاتا ہے ۔ گویا یہ رقاصہ عورتیں شہر کے ہر شعبۂ حیات کا ایک نمونہ ہیں ۔ آدمیوں کے اس جنگل میں ہر آئی خوش نما رنگوں میں ڈھنپا ہوا ہوتا ہے ۔ ہر گناہ کے لئے ایک دل فریب نام ہوتا ہے ۔

" رقاصہ " ایک نظم ہے وعظ نہیں ۔ اس میں کوئی اقتصادی اور معاشرتی حل نہیں بتایا گیا ۔ یہ محض اس درخشاں لمحے کا منظر ہے جس میں شاعر گناہ کے متعفن اور برص آلود جسم کو اس کے اصلی رنگ میں عریاں دیکھتا ہے ۔ اور یہ خوف ناک لمحہ ہمارے ذہن میں ہمیشہ کے لئے پیوست ہو جاتا ہے ۔ شاعری اسی لئے وعظ و نصیحت سے زیادہ موثر ہوتی ہے ۔

رقاصہ کا مسئلہ ایک اہم معاشرتی مسئلہ ہے ۔ اس لعنت کا استیصال تمام اسلامی ممالک میں

ہو چکا ہے۔ دوسرے آزاد ملکوں میں بھی اس کے متعلق کئی ایک اصلاحی قوانین جاری ہیں۔ مگر ہندوستان کہ جہاں آزادی سے آزاد خیالی اور آزاد خیالی سے پریشان خیالی مراد لی جاتی ہے، اس مسئلے میں یورپ سے بھی زیادہ "آزاد" ہے۔ یہاں یہ پیشہ معاشرت کا ایک جزو لاینفک قرار دیا جاتا ہے۔ اور اگر کسی ایک فرد کو اس کے خلاف کوئی ردِ عمل بھی ہوتا ہے تو وہ محض عارضی جوش ہوتا ہے۔ حفیظ نے اس نقص کو پوری طرح نمایاں کرنے کے لئے تمام نظم ایک ایسے آدمی کے تشخص میں لکھی ہے کہ جو ایک بار تو اس گناہ کے خلاف اپنی آواز بہت زور سے اٹھاتا ہے۔ مگر اس بلند آہنگی کا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ پھر ہمیشہ کے لئے اپنے حال میں مست ہو جاتا ہے۔ گویا قوم ایک شرابی کی طرح ہے کہ جس کے نشے میں یکایک ایسا دفعہ آجاتا ہے جب وہ اپنے آپ کو بہت کچھ لعنت ملامت کرتا ہے۔ مگر پھر اس غیر معمولی محنت سے تھک کر وہ پہلے سے بھی زیادہ گہرے عیش میں منہمک ہو جاتا ہے!!

یہ دیباچہ ایک اکتا دینے والے وعظ کی صورت پکڑ رہا ہے۔ اس لئے میں اپنی بحث کو یہیں ختم کرتا ہوں، اور شاعری وعظ و نصیحت سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے!　　　　(سنہ ۱۹۲۰ء)

رقاصہ

اُٹھی ہے مغرب سے گھٹا　　پینے کا موسم آگیا
ہے رقص میں اک مہ لقا　　نازک ادا ناز آفریں

ہاں ناچتی جا گائے جا　　نظروں سے دل برمائے جا
تڑپائے جا تڑپائے جا　　او دشمنِ دنیا و دیں

تیرا تھرکنا خوب ہے　　تیری ادائیں دل نشیں
لیکن ٹھہر تو کون ہے　　او نیم عریاں نازنیں
کیا مشرقی عورت ہے تو　　ہرگز نہیں ہرگز نہیں
تیری ہنسی بے باک ہے
تیری نظر چالاک ہے

اف کس قدر دل سوز ہے　　تقریر یا زاری تری
کتنی ہوس آموز ہے　　یہ سادہ پُرکاری تری

نخلِ وفا کی ڈالیاں
ہوتی ہیں عفت والیاں

وہ حُسن کی شہزادیاں　　پردے کی ہیں آبادیاں
چشمِ فلک نے آج تک　　دیکھی نہیں ان کی جھلک
سرمایۂ شرم و حیا　　زیور ہے ان کے حسن کا
شوہر کے دکھ سہتی ہیں وہ　　منہ سے نہیں کہتی ہیں وہ
کب سامنے آتی ہیں وہ　　غیرت سے کٹ جاتی ہیں وہ
اعزازِ ملت اُن سے ہے　　نامِ شرافت اُن سے ہے
اسلام پر قائم ہیں وہ　　پاکیزہ و صائم ہیں وہ

تجھ میں نہیں شرم و حیا
تجھ میں نہیں مہر و وفا

سچ سچ بتا تو کون ہے　　او بے حیا تو کون ہے
احساسِ عزت کیوں نہیں　　شرم اور غیرت کیوں نہیں
یہ پُرفسوں غمزے ترے　　نامحرموں کے سامنے
ہٹ سامنے سے دُور ہو　　مردُود ہو مقہور ہو
تقدیر کی ہیٹی ہے تو　　شیطان کی بیٹی ہے تو
جس قوم کی عورت ہے تو　　اس قوم پر لعنت ہے تو

لیکن ٹھہر جانا ذرا
تیری نہیں کوئی خطا

مردوں میں غیرت ہی نہیں　　قومی حمیت ہی نہیں
وہ ملتِ بیضا کہ تھی　　سارے جہاں کی روشنی

ہندوستاں کی روشنی

جمعیتِ اسلامیاں　　شاہنشہِ ہندوستاں
اب اس میں دم کچھ بھی نہیں　　ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں
ملی سیاست اٹھ گئی　　بازو کی طاقت اٹھ گئی
شانِ حجازی اب کہاں　　وہ ترکتازی اب کہاں
اب غزنوی ہمت گئی　　اب بابری شوکت گئی
ایمان عالمگیر کا　　مسلم کے دل سے اُٹھ گیا
قوم اب جفا پیشہ ہوئی　　بلکہ گدا پیشہ ہوئی
اب رنگ ہی کچھ اور ہے　　بے غیرتی کا دور ہے
یہ قوم اب مٹنے کو ہے　　یہ نرد اب پٹنے کو ہے

افسوس یہ ہندوستاں!
یہ گلشنِ جنت نشاں!

ایمان داروں کا وطن!　　طاعت گذاروں کا وطن!
رہ جائے گا ویرانہ پھر　　بن جائے گا بُت خانہ پھر
لیکن مجھے کیا خبط ہے　　تقریر کیوں بے ربط ہے
ایسا بہک جاتا ہوں میں　　مُنہ آئی بک جاتا ہوں میں
اتنا شرابی ہو گیا　　عقل و خرد کو کھو گیا
مجھ کو زمانے سے غرض؟　　مٹنے مٹانے سے غرض؟
ہندوستاں سے کام کیا　　یہ کفر کیا اسلام کیا

جینے دو جینے دو مجھے
پینے دو پینے دو مجھے

جب حشر کا دن آئے گا　　اُس وقت دیکھا جائے گا
ہاں ناچتی جا، گائے جا　　نظروں سے دل برمائے جا

تڑپائے جا، تڑپائے جا
او دشمنِ دنیا و دیں

حفیظ

تصویرِ کشمیر

(۲)

عرضِ حال

یہ نظم ستمبر سنہ ۱۹۳۵ء میں سری نگر کے (ڈلیس) "کمانڈنگ مشاعرے" کے لئے روا روی میں لکھی گئی تھی۔ میں اس مشاعرے میں اپنے قدیم دوست چودھری غلام حیدر داماں کے سخنور بھانجے قیس شروانی کے شدید اصرار پر دست بدست دھکیل کر لے جایا گیا تھا۔ میرے دہنے ہاتھ کا انگوٹھا ایسے شدید درد میں مبتلا تھا جس کا مزہ کسی عاشق کے دل نے بھی نہ چکھا ہوگا۔

مشاعرے کے لئے مصرع دیا گیا تھا ؎

"ذرہ ذرہ جاں فزا ہے گلشنِ کشمیر کا!"

غزل کہہ کر لب کا منہ چڑانے کی جرأت نہ تھی۔ مدتوں سے کشمیر کے مختلف اور متضاد مناظر میری روح میں بسے ہوئے تھے۔ مدیر "ہمدرد" اور "شیر کشمیر" کی دیرینہ فرمائش بھی تھی۔ لہٰذا قافیے کی رعایت سے کشمیر ہی پر کچھ کہنے کا تہیہ کر لیا۔ "کشمیر والے صاحب" کی تمہید میں رات کے دو بجے بائیں ہاتھ سے نظم لکھنا شروع کی۔ اور دوسرے دن تین بجے سہ پہر تک مسلسل لکھتا رہا۔ آخر دوستوں کے کھٹ کھٹانے اور دروازہ توڑ ڈالنے کی دھمکی سے مجبور ہو کر قلم رکھ دیا۔

نظم نامکمل اور تشنہ ہے۔ تکمیل اور ترمیم کے لئے طبیعت آج تک حاضر نہ ہو سکی۔ میں نے یہ نظم اپنے محترم شفیق اور سچے مربی سید سر راس مسعود صاحب (مرحوم) کی خدمت میں بھیج کر رائے طلب کی تھی۔ انہوں نے گذشتہ مئی سنہ ۱۹۳۷ء میں چند سطور ــــ شاید میرا دل بڑھانے کے لئے ــــ لکھ بھیجی تھیں، اور نظم کو شائع کر دینے پر زور دیا تھا۔ کیا خبر تھی کہ میرے لئے یہ ان کی آخری تحریر ہوگی۔

میں ان سطور کو اپنے مربی کی آخری یادگار کے طور پر نظم کے ساتھ شائع کرتا ہوں۔

(حفیظ)

سیّد سرّاس مسعود

تقریب

میرا حفیظ نہ واعظ ہے نہ سیاسی مبلغ۔ بے چارہ محض شاعر ہے۔ سیاسیات اور پند و نصائح کے دامان و گریباں اس کی دسترس سے دور ہیں۔

میں حفیظ کے رنگِ سخن پر شیدا ہوں۔ اور اُس کے سادہ مگر پراثر کلام سے ہمیشہ ایسی کیفیت میں ڈوب جاتا ہوں جس کا اظہار میری زبان نہیں کر سکتی۔ اس کلام سے مجھ پر ہمیشہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو زبان کے اُن سب بڑے بڑے شعرا میں جن کو میں جانتا ہوں ایک حفیظ ہی ایسا ہے جس کے متعلق میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کا دائرہ کار صرف مشاہدات اور محسوسات کی ترجمانی تک محدود ہے۔ اور وہ اس دائرہ کار میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حفیظ کا دل ایک آئینہ خانہ ہے۔ دنیا کی رنگا رنگی آوازوں اور صورتوں کے لباس میں اس آئینہ خانے کی سیر کیا کرتی ہے۔ نغمہ بھی نالہ بھی۔ زشت بھی خوب بھی۔ کبھی مل جل کر کبھی الگ الگ یہاں آتے ہیں۔ اپنے اپنے عکس دیکھتے ہیں۔ مسکراتے ہیں۔ بسورتے ہیں۔ اتراتے ہیں۔ منہ بناتے ہیں۔ اس گنبد میں قہقہے بھی لگاتے ہیں۔ آہ و بکا بھی کرتے ہیں۔ میرا شاعر ان کیفیات میں کھو جاتا ہے۔ کبھی حیرت کبھی حسرت کے کلمات کبھی تحسین و مسرت کے الفاظ اس کی زبان پر آجاتے ہیں۔

یہی ہے حفیظ کی شاعری ـــــ

جہانِ گذراں کے مختلف اور متضاد رنگوں اور آوازوں کا ورود یوں تو ہر شاعر کے خانۂ دل میں ہوتا ہے لیکن ہر دل آئینہ خانہ نہیں، اور ہر شاعر حفیظ نہیں۔

حفیظ کے یہ دل نواز دوست حفیظ کو بھی اس کے آئینہ خانۂ دل میں کھینچ لے جاتے ہیں تاکہ وہ بھی ان سب کا شریکِ حال رہے۔

شاید کبھی کبھی وہ ان آنے جانے والوں کی ہنگامہ آرائیوں اور بے وقت کی شہنائیوں سے تنگ آجاتا ہے

کیوں کہ جب کبھی بے اذن حاصل کیے بغیر آدھمکتے ہیں تو نکالے نہیں نکلتے۔ نہ آنسو بن کر ٹپکنا پسند کرتے ہیں، نہ خندہ و استہزا ہو کر تشریف لے جانا قبول کرتے ہیں۔ شاعر خفا ہوتا ہے تو سب مل کر اس کی روح کو جھنجوڑتے ہیں، پامال کرتے ہیں۔ شاعر چیختا ہے، چلاتا ہے اودہائی دیتا ہے۔

یہ ہیں "میرے حفیظ" کے اشعار۔ مشاہدات کے عکس۔ نغموں کی گونج۔ آنے جانے والے خیالات و تاثرات کے نقوش قدم۔ بعض سطحی بعض بہت گہرے۔ مگر سب شوخ، رنگین اور دل رُبا۔

میں نے کشمیر کو خود بھی دیکھا ہے، اور اب حفیظ کی کھینچی ہوئی "تصویرِ کشمیر" پیش نظر ہے۔ میرا خیال ہے کہ جس طرح حفیظ نے کشمیر کو دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اپنی سیاحت کے دوران میں خود میں نے بھی اسی نظر سے دیکھا اور اسی دل سے محسوس کیا تھا ——— لیکن یہ خیال کہ میں نے بھی اسی نظر سے دیکھا اور محسوس کیا تھا، حفیظ کی کھینچی ہوئی اسی تصویرِ کشمیر کو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔

حفیظ پر کیا موقوف ہے۔ میں سمجھتا ہوں دنیا میں جتنے بڑے بڑے شاعر ہیں اُن سب کا کمال یہی ہے وہ اپنے اپنے مشاہدات اور محسوسات کو اس رنگ سے مجسم کر دیتے ہیں کہ ہر دیکھنے اور محسوس کرنے والا اُن کے مشاہدات اور محسوسات کو خود اپنے مشاہدات اور محسوسات یقین کرنے لگتا ہے۔

میں زبان و بیان سے ناواقف۔ کول[1] کا ایک گنوار ہوں۔ مجھ کو حفیظ ایسے شاعر کی شاعری پر (جو ابھی اپنے ہم عصر شعرا میں زندہ موجود ہے) ——— اس سے زیادہ لکھنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ لہٰذا ختم کرتا ہوں۔

مجھے یقین ہے حفیظ کا کھینچا ہوا یہ مرقع ہندوستان کے ہر سچے فرزند کے خانۂ دل کو تصویر خانہ بنا دے گا۔ کیوں کہ نہ تو اس میں کوئی سیاسی تبلیغ ہے، نہ واعظانہ پند و نصائح ہیں۔ حفیظ خالص شاعر ہے اور اسی بات پر اس کو فخر ہونا چاہیے۔

راس مسعود

(۳ رمئی سنہ ۱۹۳۷ء)

---

[1] کول یا کوئل علی گڑھ کا پہلا نام ہے۔

(ایک طویل نظم کے چند بند)

تصویرِ کشمیر

(۱)

برف کی اونچائیاں برفاب کی گہرائیاں
رنگ و بو کی شوخیاں پھولوں کی بے پروائیاں
سبز قالینوں پہ دیوداروں کی بزم آرائیاں
بنتے تنتے چلتے پھرتے ابر کی پرچھائیاں
آگے پیچھے دوڑنا تاریکی و تنویر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۲)

ندیاں ہر سو تھرکتی ناچتی گاتی ہوئی
کسمساتی لڑکھڑاتی پیچ بل کھاتی ہوئی
آدمی کیا پتھروں کو وجد میں لاتی ہوئی
اپنی اپنی منزلِ مقصود کو جاتی ہوئی
کرتی جاتی ہیں نگاہوں پر عمل تسخیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۳)

تا بہ دامانِ نظر چیلوں کے دیوداروں کے بن
سینۂ ہر سنگ خارا سے رواں نہر لبن

---

(۱) وادیٔ لدّار اور وادیٔ سندھ، کھلن مرگ اور آرل پتر وغیرہ کا نظارہ کرو۔
(۲) وائل سے کنگن کی طرف اور پہلگام سے چندن اُڑی کا پیدل سفر کرو۔
(۳) کشمیر کی بعض جھیلوں اور ندیوں کی رنگت دودھیا ہے۔

بوالہوس کے واسطے لیکن یہ رستے ہیں کٹھن
مر گیا سر پھوڑ کر ان پتھروں سے کوہکن
سُن لیا تھا نام بے چارے نے جوئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۴)

عامیوں نے کہہ دیا کشمیر کو جنت نشاں
ورنہ جنت میں یہ حسن و رنگ و شادابی کہاں
کیا ہے جنت۔ چند حوریں اک چمن دو ندیاں
خیر زاہد کی رعایت سے یہ کہتا ہوں کہ ہاں
عالمِ بالا یہ ہے پرتو اسی کشمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۵)

حسن کی افراط خوبی کی فراوانی یہاں
ہے نظر کو اعترافِ تنگ دامانی یہاں
بہرِ جان و جسم ہر نعمت کی ارزانی یہاں
بے کس و محتاج لیکن نوعِ انسانی یہاں
نقش فریادی ہے یہ تقدیر کی تحریر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۶)

اک طرف مہمان خوش اوقات خوش دل خوش لباس
ایک جانب میزباں! فاقہ زدہ تصویرِ یاس

---

(۴) تسنیم و سلسبیل (۵) نمک کے سوا کشمیر میں ہر چیز بافراط موجود ہے
(۶) سیاحانِ کشمیر اور باشندگانِ کشمیر۔

اک طرف مے کا نشہ پھل کا مزہ پھولوں کی باس
اک طرف بے کیف مزدوری کا حاصل بھوک پیاس
اک تماشائی ہے اک فرزند ہے کشمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۷)

جس کی محنت سے چمن میں روئے گل پر خندہ ہے
اس کا گھر تاریک اس کا اپنا منظر گندہ ہے
نقش صناعی کا جس کی لوحِ دل پر کندہ ہے
اس کی مجبوری کو دیکھو بندگی کا بندہ ہے
سانس لینے میں بھی اُس کو خوف ہے تعزیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۸)

یہ چمن اغیار کی شعلہ خرامی کے لئے
یہ ثمر شیریں ہیں اپنی تلخ کامی کے لئے
زندگانی ہے یہاں مرگِ دوامی کے لئے
مائیں جنتی ہیں یہاں بچے غلامی کے لئے
ہر نفس اک سلسلہ ہے قیدِ بے زنجیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۹)

اس سے بڑھ کر اور کچھ چاہے تو شالامار دیکھ
آنکھ رکھتا ہے تو یہ رنگِ گل و گلزار دیکھ

---

(۷) کشمیر کے صناع آج بھی دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتے مگر ناقدری کا شکار ہیں
(۸) غیر ملکی لوگ سرمائے کے بل پر یہاں ایک قسم کی شانِ تحکم رکھتے ہیں۔

کچھ نہیں دیکھا ابھی پھر دیکھ پھر اک بار دیکھ
شانِ مغلیہ کے یہ مٹتے ہوئے آثار دیکھ
تو نے دیکھا ہے کہیں ایسا بھی فنِ تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

---

(۹) شالامار باغ۔ ڈل کے مرطوب کناروں سے ہٹ ہوا۔ ایک پختہ چاردیواری سے محصور، شہنشاہِ جہانگیر، اور ملکہ نور جہاں کے مذاقِ رنگین کی تصویر زمانے کے دستِ بُردسے بچا کھچا لیکن اڑے ہوئے رنگ پر بھی دل و نظر کو دنگ کرنے کے لئے تیار۔ اس باغ کے متعدد طبقے۔ چمن چنار۔ نخل ہائے ثمردار۔ گلشن۔ نہر۔ آبشار۔ فوارے اور بارہ دری اوران سب کا امتزاج انسان کو آئینۂ حیرت بنا دیتا ہے۔ اگرچہ بارہ دری کے جواہرات لٹ چکے ہیں فوارے شکستہ ہیں اور سنگِ موسیٰ کے چند ستون غائب کئے جا چکے ہیں۔ تاہم جی چاہتا ہے کہ دیکھتے جاؤ۔ موجودہ حکومت نے اس کو قائم رکھنے کے لئے اپنی بساط بھر کوشش کی ہے اور ہر اتوار اس کی نہروں اور فواروں کے لئے پانی بھی دے دیا جاتا ہے۔ اس لئے اہلِ نظر اور صاحبانِ ذوق سیاحوں کے علاوہ کشمیر میں موسمِ گرما گذارنے والے دوکاندار اور پنجاب کی گرمی سے بھاگے ہوئے ہما شما بھی کثرت سے یہاں وارد ہوتے ہیں اور اپنی زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ سیر و تفریح کے لئے کشمیر کو منتخب کرنے کی داد ایک دوسرے سے لیتے ہیں۔ نیا سوٹ پہنے ہوئے مرد تکلف اور محنت سے آراستہ کی ہوئی ساڑھیوں میں ملفوف عورتیں۔ ناک بہتے ہوئے اور جگہ جگہ غلاظت پھیلاتے ہوئے چیختے چلاتے بچے۔ دوڑتے بھاگتے، بچوں کو چھیلاتے، عورتوں کو گھورتے سیٹیاں بجاتے اور طرح طرح کے گانے گاتے ہوئے نوجوان، ان چند دنوں پر چھا جاتے ہیں۔ نمائش اور تفریحی حرکات کی ایسی بہتات ہوتی ہے جس سے فضا کا سکون قائم نہیں رہتا۔ سبزہ پامال اور پھولوں کے کنج تعفن سے معمور ہو جاتے ہیں۔ شہنشاہ جہانگیر نے اپنی رعایا کی داد رسی کے لئے زنجیرِ عدل لٹکائی تھی اور اس کی محبوبہ نور جہاں نے ایک عامی کو بے اختیارانہ گستاخی نظر کی سزا دے کر اپنے شہنشاہ خاوند سے منصفانہ سزا پائی تھی۔ لیکن اپنے اس عدل و انصاف کے باوجود وہ کبھی یہ تصور نہ رکھتے ہوں گے کہ ان کے بعد ان کی پرسکون خلوت گاہوں پر کبھی ایسا وقت بھی آئے گا کہ عامیوں کا گروہ یہاں آ گھسے گا۔ اور اپنے ہی ناموس پر گستاخ نگاہوں کے تیر چلائے گا۔ اور ان حرکات سے روح کی بالیدگی پائے گا۔

شاہ جہاں جو مغلوں کے فنِ تعمیر کا معمارِ اعظم بھی تھا، اُس نے شالامارِ کشمیر کو "آئیڈیل" بنایا، اور

(۱۰)

چشم شاعر نے کئے ہیں آنسو ان کو مٹی میں نہ رول
بے خبر انمول جوہر کو ترازو سے نہ تول
ایک گوشے میں ادب سے بیٹھ جا منہ سے نہ بول
او تماشائی! تصور شرط ہے آنکھیں نہ کھول
چشم دل سے دیکھ نقشہ گردشِ تقدیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۱۱)

ہے عجب دھندلی ضیا اُجلا اندھیرا باغ میں
ہر چمن کو نور پوشوں نے ہے گھیرا باغ میں
ہے شناسا اب کوئی تیرا نہ میرا باغ میں
بانیانِ باغ کا اترا ہے ڈیرا باغ میں
خوف ہے تعزیر کا اِن کو نہ دار و گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۱۲)

کیا مجالِ دم زدن شاہوں کے ارشادات پر

لاہور میں اس کی ناکام نقل اتاری۔ اُس نے تاج محل کا تصور کشمیر میں منتقل کر دیا۔ اس نے قلعۂ دہلی میں اپنے لئے بہشت آرات کی اور تخت طاؤس پر بیٹھا۔ لیکن جب اُداس ہُوا، پکار اٹھا ؎

خورد گندم آدم از جنت کشیدا اندش بروں
من کہ خوردم آشِ جو یارب بہ کشمیرم رساں

شہنشاہ عالمگیر کو بھی زمانہ کی آنکھ نے ملکی مہمات کو ملتوی کر کے کشمیر کی طرف بڑھتے اور اس باغ کے سبزے پر نماز یں ادا کرتے دیکھا۔ ان سب کو خواب میں بھی یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ یہ باغات بدستِ بیگاں ہو جائیں گے۔ (حفیظ)

شاہدِ عادل ہے تاریخ ان کے احسانات پر
جو نظر رکھتی قصر و ایوانات پر باغات پر
کاش وہ مرکوز ہوتی آدمی کی ذات پر
پھر بجا ہوتا گلہ کوتاہیٔ تدبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۱۳)

نسلِ انسانی کو ٹھہرایا گیا ہے کارِ زشت
رائیگاں ہوتی رہی مزدور کی زرخیز کشت
رنگ و نغمہ ساغرِ و گل سبزہ و گل سنگ و خشت
خواب کے عالم کو اہلِ مقدرت سمجھے بہشت
خواب دیکھا منہ نہ دیکھا خواب کی تعبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(۱۴)

اہلِ زر کشمیریوں کے حال پر ہنستے ہیں آج
نام ہے ان کا فریبی حیلہ گر رو بہ مزاج
بے دلی۔ بے اعتمادی۔ مفلسی اور احتیاج
بندگی صدہا برس کی اور مسلسل سامراج
کس قدر ساماں فراہم ہے یہاں تحقیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

حفیظ

حفیظ کے خطوط

کیپٹن سید ضمیر جعفری کے نام

(خطوط کے بارے میں ایک خط)

برادرم صہبا صاحب! السلام علیکم!

"حفیظ نمبر" کے لئے آپ نے مجھ سے حفیظ صاحب کے خطوط کی فرمائش کی تھی۔ تعمیل ارشاد کر رہا ہوں۔ مگر "تعمیل ارشاد" کے ساتھ ساتھ ان خطوط کے بارے میں کچھ میں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں:

حفیظ صاحب سے میرے ذاتی روابط کی ابتدا ۱۹۴۸ء میں جہلم کے ایک مشاعرے سے ہوئی جس کا انتظام میرے سپرد تھا۔ بعد میں یہ مشاعرہ گویا میری زندگی میں داخل ہو گیا۔ اور روابط رفتہ رفتہ گہری موانست کا رنگ ...... اختیار کر گئے۔ میری طرف سے تو ابتداً بھی اور آج بھی اس رشتے کی نوعیت معتقدانہ و نیاز مندانہ ہے۔ لیکن یہ حفیظ صاحب کی شفقت و محبت ہے کہ وہ اس ناچیز کو اپنے عزیز دوستوں میں جگہ دیتے ہیں۔

اس دوران میں ہمارے درمیان جب کبھی فاصلہ حائل ہوا ہے۔ مراسلت کا سلسلہ برابر قائم رہا ہے۔ اس مدت میں حفیظ صاحب نے جتنے خطوط بھی مجھے لکھے وہ سب میرے پاس محفوظ ہیں۔ انہیں میں سے چند آپ کی نذر کر رہا ہوں۔

ظاہر ہے یہ خطوط مختلف مواقع پر رواروی میں لکھے گئے ہیں۔ حفیظ اس معاملے میں یوں بھی کچھ زیادہ بے پروائی اور رواروی روا رکھتے ہیں۔ آپ میری فائل میں ان کے خط دیکھیں تو چھوٹے چھوٹے پرزوں کا انبار نظر آئے گا۔ کوئی خط بستر میں لیٹے لیٹے لکھا گیا ہے تو کوئی خط سفر میں بیٹھے بیٹھے رقم ہوا ہے۔ کسی پر شہر، تاریخ اور مہینہ درج ہے۔ کوئی خط اس سے بھی بے نیاز ہے۔

میں نے ــــ "برادرم السلام علیکم سے لے کر والسلام تک" ــــ پورے کے پورے خط نقل کر دینے کے بجائے اقتباسات پیش کرنا مناسب سمجھا ہے۔ تاکہ شخصیت کی وہ تصویر جو خطوط کے آئینے سے جھلکتی ہے، کسی قدر واضح ہو کر سامنے آ سکے۔

ایک بات اور بھی!

یہ خطوط جس دور میں لکھے گئے ہیں، وہ حفیظ کی بعض معرکہ آرا کامیابیوں، اور کئی دل خراش حوادث کا زمانہ ہے۔ اُن کی گولڈن جوبلی منائی گئی۔ قومی ترانے کی تخلیق ہوئی۔ ہلالِ امتیاز کا خطاب ملا۔ اس کے برعکس اسی زمانے میں اُن کی بیوی کا انتقال ہوا۔ بعض یارانِ قدیم کی موت کا سانحہ دیکھا۔ بچیوں کی بیماری سے دوچار رہے۔ اور خود بھی طویل علالت سے گذرنا پڑا۔ جس کے بعد وہ ابھی تک دراصل سنبھل نہیں سکے۔ مجموعی طور پر یہ زمانہ ان کے لئے انتہائی ذہنی و جسمانی اذیت اور کرب کا زمانہ رہا ہے جس کا نہایت گہرا پرتو اُن کے خطوط میں جابجا نظر آتا ہے۔

نیاز مند:

ضمیر جعفری

(۱)

۷۰ کیلالائنز۔ ملیر چھاؤنی

۱۸ اکتوبر ۶۵۲

برادرم ضمیر۔ السلام علیکم!

میرے محترم اور محسن دوست سے کہہ دیں کہ میرے معاملات خدا ہی کے سپرد ہیں۔ جس حالت میں ۱۹۴۷ء سے اب تک گذر رہی ہے، اسی کا ہاتھ ہے جو ہر وقت اس گناہگار کو لئے چلا جا رہا ہے۔۔۔ اگر خدا پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یقین نہ ہوتا تو میں اب تک پاگل ہو چکا ہوتا۔ ہاں یہ درست ہے کہ ضعفِ قلب اور تنہائی اور بے کسی کا احساس کبھی کبھی آہ کرنے کے گناہ کا ارتکاب کرا دیتا ہے۔ مگر یہ آہ بھی کسی اللہ ہی کے بندے کے سامنے نکلتی ہے۔

ضمیر۔ اول تو امید نہیں کہ آنکھیں کھلیں۔ لیکن جب میرے وقت کی آنکھ کھلے گی تو وہ دیکھے گا کہ مجھ کو توڑ کر اُس نے کتنا عمدہ جوہر ضائع کیا ہے جو اس وقت کا اپنا ہی جوہر تھا۔

(۲)

یقین کرو۔ میں جب بھی اپنے خاص دوستوں کو خط لکھتا ہوں۔ حتی الوسع کوشش کرتا ہوں کہ اپنی طبیعت کے ملال کا اظہار نہ ہو۔ کیوں کہ وہاں دور بیٹھے ہوئے تم کو غمگین کرنا بڑی بیہودگی ہے۔ لیکن زندگی بھر تصنع سے کام نہیں لیا۔ نہ تکلف برتا۔ اس لئے سادہ سی تحریر میں بھی میری پراگندگی نمایاں ہو ہی جاتی ہے۔

چہ کند بے نوا ہمیں دارد!

تم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ میں حوادث و اذکار بے زدنی سے گھبرانے والا کبھی نہ تھا۔ میں سوائے ایک شاعر کے اور کچھ نہ تھا، اور شاعری جذباتی بات ہے۔ لیکن میں نے ذمہ داری کی زندگی بھی ساتھ ہی اختیار کی۔ اس ذمہ داری کی زندگی میں میرا گھرانا، میرے خویش و اقارب کے ساتھ میرے دوست آشنا اور وہ لوگ بھی تھے جو کسی نہ کسی طرح میری راہِ حیات میں سامنے آئے۔ اور جن کی امداد میرے خیال میں میرے جذبات نے میری ذمہ داریوں میں شامل کر دی ہر شخص کے سامنے تھلکنا بھی کچھ کھلا معلوم نہ ہوا۔ مجھے روٹی بھی کمانی تھی۔ شاعری بھی کرنی تھی۔ پھر اعلائے کلمۃ الحق کا

جذبہ بھی لاحق/موجود تھا۔ یہ تھی میری زندگی، لہٰذا لڑتا رہا۔ اونٹ لدنے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ لیکن مجھے اس تمام انبار کو متوازن رکھ کر اپنی پیٹھ کو شکستن ۔ سے بچانے کی سمجھ نہیں تھی۔ لہٰذا یہ سب بوجھ آپس میں بھی ٹکرائے۔ اور سب نے میری ریڑھ کی ہڈی اور میری پسلیوں کو بھی توڑ دیا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں۔ —— اب ٹوٹا ہوا پڑا ہوں!

بہرصورت میرے دوست، اگر تم یہ سنو کہ حفیظ جالندھری صاحب خیرباد کہہ گئے تو میری انتہائی کش مکش کے گواہ رہنا۔ میں نے اپنی جانب سے کمی نہیں کی۔ معاشرہ جو کچھ بھی ہے، گذشتہ کے اعمال کا نتیجہ ہے اور اب جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بھی نتائج ہیں۔ جو موجود رہے گا، دیکھ لے گا۔

از کراچی (۱۶-۶-۵۴ء)

(۳)

خیر، وہ تعلقات بھی عزیز تھے۔ لیکن بلوغیتِ دل و نگاہ کے بعد تعلقات کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ اور بدل جانی چاہئے۔ میں خود جذباتی قسم کا آدمی ہوں۔ لیکن مجھے ہمیشہ گہرے احساسِ وفا اور گہرے احساسِ ذمہ داری کی تلاش رہی ہے۔

کراچی (۲۱-۱۰-۵۴ء)

(۴)

..... میں مشاعرے میں شریک ہونا نہیں چاہتا تھا اور پوری "اپوا" مجھ پر دھاوا بول رہی تھی۔ اپنی بیوی کی مار کھا لینا آسان ہے۔ دوسروں کی بیویاں جب مارتی بیٹھتی ہیں تو کوئی گنجائش دم زدنی باقی نہیں رکھتیں۔ یہ مشاعرہ جس میں آپ کے تشریف لانے کی خبر بھی گرم تھی، میرے لئے بہت سے خطرات کا موجب تھا۔ مکھیاں بہت ہیں —— ان کی بھن بھن سے دور ہی رہنا بہتر ہے!

خیر، شادی یا عقدِ ثانی میری کسی جسمانی ضرورت کے لئے ضروری نہیں ہے۔ اگرچہ یہ ضرورت موجود ہے لیکن اب میرے کنٹرول میں ہے۔ بات یہ ہے کہ میرے گھر کا مرکز ٹوٹ چکا ہے۔ شمیم بے چاری تنہا مجھے دیکھتی بھالتی ہے —— لیکن تا بکے؟ میں نے بارہا ان امور کے لئے بہت سی تجاویز سوچی ہیں لیکن سوائے عقدِ ثانی کے کوئی چارہ نظر نہیں آتا، مگر یہ معاملہ ایسا آسان نہیں۔ جُوا مجھے کھیلنا نہیں آتا اور یہ ہے جُوا۔ یہ ہیں میرے مصائب، میری الجھنیں —— میری ذہنی افتاد۔ میری جسمانی علالتیں۔ میرے مزاج کے تمام نقائص۔ میرے دوستوں کے حدودِ محبت اور اعدا کی وسعتِ نفرت۔ وغیرہ سب کچھ میری نگاہ میں ہے۔ ان حالات میں ایک ایسے رفیق کی ضرورت مجھے لاحق ہے جو کم از کم میرے ان آخری سانسوں کے پورا ہونے تک مجھے "چلتے چلے جانے" پر آمادہ رکھے۔ وہ کہاں سے ملے۔ ایسا رفیق کہاں ہے ۔ مجھے نہیں معلوم۔

(کراچی ۲-۱۲-۵۴ء)

(۵)

میں تقریباً تنہا رہا ہوں اور اب تو واقعی ایک لق و دق صحرا میں ہوں۔ کوئی قریب نہیں۔ یہ ہجوم جو ارد گرد دیکھتا ہوں، انسان نہیں ہیں، ناچتے ہوئے آگ بگولے ہیں۔ خدا ان کی لپیٹ سے بچائے۔ کہیں کہیں دور کچھ نخلستان

اُن کی طرف دیکھتا ہوا چل رہا ہوں۔ ان میں سے ایک تم بھی ہو۔ کبھی کبھی سراسیمہ بھی معلوم ہوتے ہو!
میاں۔ جانتے ہو کہ میں ڈوب رہا ہوں۔ جانتے ہو کہ کسی کو پکارتا بھی نہیں۔ بس یہ چاہتا ہوں، آواز دیتے جاؤ تاکہ میں اتنا تو مطمئن رہوں کہ میرے ڈوبنے کی ادا کوئی دیکھ رہا ہے۔

(کراچی۔ ۱۱-۱۲-۵۴ء)

(۶)

اس زمانے کی دوستیاں اور تعلقات عجیب اور قسم کے ہیں۔ اوقات گذاری، اکٹھے بیٹھنا خوش وقت ہو لینا کبھی کبھار ضرورت کے وقت ساتھ دینا لیکن اگر اپنی ذات کی انجمن میں پھنستی نظر آئے تو کتی کاٹ جانا۔ مجھے افسوس نہیں بہت کہ میں ان سے بالکل جداگانہ خیالات اور احساسات دوستی کے بارے میں رکھتا ہوں۔ میں دوستوں کو ان کی ذرا ذرا سی بات پر صاف، بے تکلف اور سچا دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ دوستی مشکل ضرور ہے لیکن میری شکل کو بھی دیکھنا چاہیئے۔

باقی شعر و شاعری، فن و ہنر، میری کامیابیاں ناکامیابیاں، یہ سب کچھ کوئی ایسی باتیں نہیں ہیں کہ انسان اُن کے لئے ہلاک ہو جائے۔ میں نے کوئی ایسا تیر زندگی میں شعر و شاعری کے سلسلے میں نہیں مارا جو مجھ سے پہلے صاحبانِ فن سے رہ گیا ہو۔ بہر حال اس کے لئے اس دورِ تنگ معاش میں محنت کرتا رہا۔

ایک بات جو تم نے اس خط میں لکھی ہے۔ مجھے اختلاف ہے۔ نہیں ضمیر۔ مجھ میں تمرّد کی رمک نہیں ہے۔ میری فطرت میں خوشامد اور جھکنا نہیں ہے۔ انکسار اور بات ہے۔ اور دنیاوی طاقت کے سامنے سجدہ ریزی اور بات ہے۔ میں بھی جھکتا ہوں مگر بڑے دل، بڑے ہنر، بڑی اخلاقی و تخلیقی شخصیت کے سامنے، بڑے اخلاص اور بڑی محبت کے سامنے۔ یہ لوگ جن کو تم نے بڑے لوگ کہا ہے' میری نظر میں بڑے نہیں ہیں۔ اگر ہیں' تو محض اس طرح کے بڑے جیسے کوئی بڑے بڑے سینگوں والا بیل —— یا اژدہا —— مجھے ان سے کوئی غرض نہیں۔

باقی رہی ترانے کی بات۔ یہ سخن گسترانہ بات ہے۔ میں پاکستان سے محبت رکھتا ہوں اور اس کا احترام کرتا ہوں یہ وطن ہمارے لئے انعام ہے۔ میں پاکستانی فوج کی عزت اور احترام کو اپنا ایمان سمجھتا ہوں۔ میں پاکستان کے جھنڈے کو اسلام کا جھنڈا سمجھتا ہوں۔

فی الحال ان سے پوچھو کہ یہ آخر ترانے میں کیا چاہتے تھے۔ جب یہ الفاظ میں بتا دیں کہ ترانہ میں یہ ہونا چاہیئے' اس وقت بحث کا آغاز ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے کوئی بھی نہیں بتا سکے گا کہ یہ چاہتے کیا ہیں؟

عزیز کا خط مجھے ملا ہے۔ خدا اس کی مدد کرے۔ حوصلہ دلاتے رہو۔ ہمارا کام خود حوصلہ کرنا اور اپنے درماندہ دوستوں کو حوصلہ دینا ہے۔ خان صاحب خود نہ ملیں تو جا کر مل لیا کرو۔ ضمیر دنیا میں کوئی بھی چھوٹا بڑا نہیں ہے۔

(کراچی)

(۷)

ضمیر۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اپنے آغازِ حیاتِ شعر و سخن میں بھی دوسروں کا دل دکھایا ہو۔ میں تو اپنے ہم عصروں

کا دل بڑھتا ہوا بڑھتا رہا ہوں۔ لیکن ان رفقا میں سے مجھے تو اب تک ایک بھی نظر نہیں آیا جس نے مجھ پر پے در پے وار نہ کئے ہوں۔ اور کس بنا پر؟ میرے کلام میں نقائص کی بنا پر نہیں۔ اے کاش میرے نقائص کی بنا پر ہوتا۔ تاکہ میں شکر گذار ہوتا۔ نہیں یہ وار یہ حملے میری کامیابیوں کی وجہ سے ہوئے، اور ہو رہے ہیں۔

اس پر تعجب نہ کرو کہ وہ ننگے ہو گئے۔ تعجب اس پر کرو کہ میں کب سے ان لوگوں کے ساتھ نباہ رہا ہوں۔ میں جو کچھ بھی ہوں۔ شاعر ہوں یا نغمہ باز ——— ان سے بہرحال و آئینۃً الگ ہوں۔ میرا منصب ادب جو کچھ بھی ہو شعر و سخن کے سلسلے میں سنجیدہ خدمتِ انسانیت ہے۔

رہ گیا یہ معاملہ کہ دھن پہلے تھی اور الفاظ بعد میں لکھے گئے، اس لئے ترانہ کمزور ہے۔ ہرگز نہیں۔ ترانہ کمزور نہیں ہے۔ میں نے اس دھن میں پروقار پر شوکت الفاظ رکھ کر ترانے کو قومی کر دیا ہے۔ حسنِ صورت کے لحاظ سے بھی اور حسنِ معنی کے لحاظ سے بھی۔ باقی رہا یہ کہ یہ فارسی عربی کے الفاظ سے مملو ہے۔ یقیناً ہے اور ہونا چاہئے۔ فارسی عربی کے الفاظ اردو سے نکال دیجئے تو باقی رہ جاتی ہے ہندی ——— ہہ ہہ ہہ ———

سُندر دیش پاکستان

جس پر ہم تیاگیں پران

میرے خیال میں ایسی زبان ہماری موجودہ صورتِ نفسی کے لحاظ سے مضحکہ انگیز ہے ——— کہتے ہیں یہ ترانہ عوام کے اُن اَن پڑھوں کی زبان میں نہیں ہے جو ہمارے پاکستان میں ۹۵ فی صدی ہیں۔ یعنی یہ چاہتے ہیں کہ بلوچی، مکرانی، پروہی، سندھی، کچھی، گجراتی، مارواڑی، حصاری، رہتکی، بنگالی، لاہوری پنجابی، پھوٹھوہاری پنجابی، مری کے اردگرد کی پہاڑی، ہزاروی، کشمیری، بلتستانی، گلگتی، چترالی، پشتو اور پھر لکھنوی، دہلوی، ناگپوری، حیدرآبادی، مدراسی، بنگالی بولنے والے مختلف عناصر کے لئے جو اَن پڑھ ہیں اور اپنے اپنے لہجے اور اپنی اپنی الگ الگ بولیاں بولتے ہیں۔ ان سب کے لئے ان کے جاہلانہ لہجوں اور زبانوں کے مطابق، ان کی جاہلانہ نعرہ بازیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک قومی ترانہ لکھا جائے۔ اللہ اللہ کیا منطق ہے۔ یعنی ان سب اَن پڑھوں کو تعلیم دینا مقصود نہیں۔ ان کی جاہلیت کو ہمیشہ کے لئے مطمئن اور ایک جاہلانہ سطح پر رکھنے کے لئے قومی ترانہ بھی جاہلانہ ہی ہونا چاہئے۔

اچھا صاحب۔ لکھئے اتنے مختلف جاہلوں کی مختلف بولیوں کو یکجا کر کے ایک ترانہ ——— کون روکتا ہے ——— میں تو پاکستان کے ترانے کو ایسے مضحکے کے خیال سے بھی قریب نہیں رکھنا چاہتا۔ میں اس سلسلے میں نرم کے تصور سے بھی لرزتا ہوں۔

میں اس معرکے سے بددل نہیں ہوں۔ گالیاں شکست خوردہ دیا کرتے ہیں۔ شاعروں، متشاعروں کا یہ گروہ جو ترانۂ قومی تو لکھ نہیں سکا، اب کمینگی کا مظاہرہ اس طرح کر رہا ہے۔ یہ تو ہیجڑوں کی تالیاں ہیں۔ میرے قلب پر اس کا ذرہ بھر اثر نہیں۔ تاریخِ ادب میں ان کا یہ شور اعترافِ شکست کی صورت میں قائم رہے گا۔ میرے کمال کے سبب سے نہیں۔ ان کی اپنی عاجزی کے سبب سے۔

معاف کرنا، یہ لمبا خط چارپائی پر لیٹے رہنے کی وجہ سے ممکن ہے پریشان خیالی کا مجموعہ ہو۔ اپنی صورت ہی کی طرح بدخط بھی ہوں۔ تمہارا خط بھی اس مرتبہ بمشکل پڑھا گیا۔ جلدی میں لکھا ہوا تھا۔ بکارِ محض ــــ

(از کراچی)

(۸)

..... باہر دنیا برسرِ جنگ اور گھر میں ہر کوئی دل تنگ ــــ بیماری، معذوری، کس مپرسی کے ساتھ بے وفائی کا ہر لحظہ شکار ہوں۔ الحمد للہ۔ وہ اس طرح مجھے آلائشوں سے پاک کر رہا ہے ؎

سہارا کیوں لیا تھا ناخدا کا
خدا بھی کیوں کرے امداد میری

(کراچی)

(۹)

کراچی

۱۳-۱-۵۵ء

آج ۱۳ / جنوری ہے۔ کل میں ۵۵ برس کا ہو جاؤں گا۔ خیال نہیں تھا کہ جوبلی کے بعد بھی اور سفر باقی ہے یہ پانچ برس میں طرح گذرے ہیں۔ تم نے صرف تھوڑی سی ظاہری جھلک دیکھی ہے ــــ جس وقت سے قدم اٹھا رہا ہوں۔ وہ کسی کو نظر نہیں آ سکتے۔ زندگی بہرحال قدرتِ خداوندی کی طرف سے ایک عطیہ ہے۔ جس کا کوئی مقصد ضرور ہوگا ــــ میں نے ہی تو کہا تھا ؎

کرم کیا دلِ بے مدّعا دیا تو نے
ترے کرم کا مگر کوئی مدّعا نہ ملا

پھر کہا تھا ؎

ہے مدعائے عشق میں دنیائے مدعا
یہ مدّعا نہ ہو تو کوئی مدّعا نہ ہو

جانِ برادر! ــــ اب تک دلِ مدّعا کے ملنے کی وجہ نہیں معلوم ہوئی۔ عشق پر غالب نے جو فرما دیا تھا، آج میں بھی اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ ع

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

خیر، جانے دو ان بے ربط باتوں کو۔ کوئی کام کی بات کرو ــــ کام کی بات کیا ہے؟ مجھے معلوم نہیں۔ جو بھی کام کی باتیں میں نے کیں، وہ اس وقت میرے اردگرد شکستہ و بوسیدہ، ٹکڑے ٹکڑے، پرزے پرزے ہو کر بکھری پڑی ہیں ــــ!

(۱۰)

مشاعرہ؟ ــــ ہاں، ابھی ڈیڑھ مہینہ باقی ہے ــــ

ترس از بلائے کہ شب درمیاں

فضلی صاحب سے بھی اور جناب جگر و روش و ساغر سے بھی پرانے مراسم ہیں — اس عالم میں کہ زندگی ہمیشہ کے لئے خوابِ فراموش ہونے والی ہے، ایک مرتبہ اگر اپنی راہ سے دو قدم ہٹ کر بھی پیچھے مڑ کر دیکھ لینے کی گنجائش ہو سکی تو بڑی بات ہے۔ شاید پرانے دور کی کوئی جھلک خشک لبوں پر تبسم کی لہر پیدا کر دے!

(از کراچی ۱۹۵۵ء)

(۱۱)

....شعر و سخن فن ہے اور اس فن کا تعلق انسانی صلاحیتوں کی انتہائی گہرائیوں سے ہے۔ دل میں جذبہ! دماغ میں خیال! اور طبع میں احساس سب رکھتے ہیں۔ شاعری یا دوسرے فنون اس جذبہ، خیال اور احساس کے حسین اظہار کا نام ہے۔ کانے، لولے، لنگڑے بچے پیدا کرنے سے ماں کا پیٹ تو خالی ہو جاتا ہے۔ لیکن دنیا میں حسین صورتوں کی فراوانی نہیں ہوتی۔

(کراچی - ۳۱-۸-۵۵ء)

(۱۲)

الحمدللہ۔ چار مہینے سے آزاد و بے نکیل۔ بے شرکت غیرے "کلبل" کر رہا ہوں "انہوں" نے حساب صاف کر دیا ہے۔ ایک پیسہ نہیں ملا۔ ۳۰ ستمبر کو ملیر چھاؤنی کا مکان چھوڑ دیا ہے۔ اور اب کراچی کی نئی آبادی میں ۴۰۰/- روپیہ ماہوار کرایہ پر دو سال کی پیشگی دے کر ایک نامکمل مکان کی تکمیل میں مدد کر رہا ہوں۔

آپ کا خط چونکہ ٹائپ میں تھا لہٰذا اتنا ہی بے کیف تھا۔

(کراچی - ۶-۱۰-۵۵ء)

(۱۳)

اعظم (ڈاکٹر اعظم کریوی مرحوم) قتل ہو گیا۔ اور اس کا قتل ایک ایسا راز ہے جس کو مجھ ایسا کم فہم تو سمجھ نہیں سکتا۔ غریب آدمی۔ فلک زدہ۔ ہائے افسوس۔

حسرت (چراغ حسن) بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ مجھے حسرت اور آپ کے تعلقات کا پورا علم ہے۔ اور آپ کی دضعداری کے علاوہ آپ کے قلب سے واقف ہوں۔ مجھے واقعی حسرت کی موت کا بہت بڑا صدمہ ہے۔ آپ کو معلوم نہیں لیکن مجھے وہ دن یاد ہیں جب تاثیر اور حسرت وغیرہ سے ملاقاتیں رہتی تھیں۔ میں حسرت سے کبھی بھیگ کر تو نہیں مل سکا۔ میرے ان کے درمیان کوئی قدر مشترک سوائے شعر و سخن کے نہ تھی۔ البتہ اُن کی سخن فہمی اور سخن سنجی۔ علم و فن جس کا تعلق ادب سے ہے، حسرت کی نظر میرے خیال میں اس وقت (تاثیر کے بعد) سب سے زیادہ گہری تھی۔ اس کی معلومات موجودہ دور کے اخبار نویسوں سے بدرجہا زیادہ تھیں۔ وہ شگفتہ نویس بھی تھا۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

(۱۴)

خط نہیں آیا مہینہ ہو گیا

جعفری بالکل کمینہ ہو گیا

(کراچی ۳ اکتوبر ۱۹۵۵ء)

(۱۵)

عزیز (جناب عزیز ملک راولپنڈی) کی رنجش میرے سر آنکھوں پر۔ آخر میرے دوستوں کو مجھ سے رنجیدہ ہونے اور مجھے اپنے قدموں پر تھپکانے کا حق حاصل ہے۔ عزیز غلط فہمی میں مبتلا ہے، میں نہیں ہوں۔ مجھے تو وہ اپنے بچوں سے بھی زیادہ پیارا ہے۔ البتہ بچوں کو بعض اوقات ڈانٹ ڈپٹ بھی کرنی پڑتی ہے۔ وہ خفا ہو جاتے ہیں تو من بھی جاتے ہیں۔ یہی معاملہ عزیز کا ہے۔ میرے نزدیک تو یہی ہے ـــ اس کی وہ جانے ـــ تم میرا ایک کام کرو۔ اس کو ڈھونڈ لو۔ تنہائی میں لے جاؤ۔ اس کا ہاتھ اٹھالو اور منہ چوم لو۔ وہ حیران ہو کر دیکھے تو بتا دو کہ یہ حفیظ کی طرف سے ہے۔

کراچی ۔ ۱۴-۱۲-۵۵ء)

(۱۶)

("ہلالِ امتیاز" کے خطاب پر میرے۔ پارک یاد کے تار پر)

تم گویا ایک تارے کی طرح اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے ہو ـــ تم جانتے ہو کہ مجھے ملک الشعرا، حسان الملک، بہادر، خان بہادر وغیرہ کے خطابات سے نوازا گیا تھا۔ لیکن نہ میں نے ان کو استعمال کیا، نہ اُن پر مجھے کوئی فخر تھا۔ لیکن اپنے مجاہدوں کی حکومت کی طرف سے "ہلالِ امتیاز" میرے لئے واقعی بہت بڑی عزت ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ہلال کی مانند پاکستان کو روشن کرنے کے لئے ابھی جیتا اور کام کرنا ہے۔

(۱۷)

میرے پاس ایک ایسی دولت ہے جو میں نے ساری عمر خدا کی دی ہوئی صلاحیتِ قلب و نظر سے خود پیدا کی ہے۔ یہ دولت ہے میرا لکھا ہوا۔ مکمل اور نامکمل۔ میں اب اس فکر میں مر رہا ہوں کہ نامکمل کو مکمل کر دوں۔ اور ابھی جو کچھ سینے میں دفینہ پڑا ہے اس کو اگل دوں۔

(۱۸)

بے وقوف دوست!

تم مجھ سے کس قدر خوش رہ سکتے ہو۔ میں ایک آنکھ سے روتا ہوں۔ دوسری سے ہنستا ہوں۔ ایسا جانور محاورے میں سُنا تو ہوگا، دیکھا نہ ہوگا ـــ آؤ مجھے دیکھو کہ پھر کبھی کوئی ایسی مخلوق پیدا نہ کی جائے گی، یا پیدا نہ کی جا سکے گی۔

(کراچی)

(۱۹)

ضمیر۔ جی چاہتا ہے ـــ وہ زمین[1] جس کا میں نے تذکرہ کیا تھا لے لوں ـــ وہاں بیٹھ جاؤں ـــ آتے جاتے دوست مل لیا کریں گے ـــ مر جاؤں گا تو تمہارے قریب ہی ایک اور درگاہ بن جائے گی۔ وہاں مشاعرہ

---

[1] زمین کا یہ قطعہ جہلم اور سوہاوہ کے درمیان ایک برساتی ندی کے کنارے واقع ہے۔ اس کے ایک طرف سے جرنیلی سڑک اور دوسری طرف سے ریلوے لائن گزرتی ہے۔ وسط میں رہٹ ہے اور سامنے ندی!

کرا لیا کرنا۔ میری روح کو ثواب پہونچ جائے گا۔ مشاعرہ پیر نام رکھ دینا۔

(کراچی - ۲۳-۷-۵۶ء)

(۲۰)

ابھی تک تمہاری دعائیں کامیاب ہیں کہ میں سلامت ہوں۔ اگر سلامتی کے معنی یہی ہیں کہ موٹر کار یا کسی ٹرک کے نیچے آ کر کچلا نہیں گیا۔ ہاتھ پیر ٹوٹ نہیں گئے۔ سانس آتا جاتا ہے۔ چلتا پھرتا کھاتا پیتا۔ لوگوں کے روبرو ہنستا بھی ہوں اور لوگوں کو ہنساتا بھی ہوں۔ تنہائی میں رو بھی دیتا ہوں

لیکن کیا تم نے کبھی کوئی پرندہ اپنے ہاتھ سے ذبح کیا ہے یا ذبح ہوتے قریب سے دیکھا ہے۔ وہ جسے ذبح کر کے چھوڑ دیا جائے۔ وہ پھڑپھڑاتا ہے۔ بازو ہلاتا ہے۔ اس کا سر ڈھلکا ہوا لیکن آنکھیں کھلی ہوتی ہیں۔ پرندہ ہو یا کوئی اور جاندار اس کی یہ حرکت — "حرکت مذبوحی" کہلاتی ہے۔ یہ ہے میری سلامتی!

(کراچی - ۱۰-۱-۵۷ء)

(۲۱)

پنڈت لہری چند اختر کی موت پر میرے دکھ کا اندازہ ضمیر، کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے کسی نے پرسا نہیں دیا۔ مجھے ٹیلی فون پر ممتاز حسن صاحب کی بیگم نے بتایا۔ اور میں نے یہاں کراچی میں ذوالفقار بخاری، محمود نظامی، احمد سلمان وغیرہ کو ٹیلی فون پر بتایا۔ ممتاز حسن یہاں نہیں تھے۔

مجھ سے کسی نے پنڈت پر کچھ کہنے اور لکھنے یا مجھ سے بات چیت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ صرف میری بچیاں روئیں کیوں کہ وہ پنڈت کے ہاتھوں میں کھیلی اور پلی بڑھی تھیں۔ جیسے وہ ان کا چچا نہیں بڑا بھائی تھا — میرا گھر ایسا ماتم کدہ ہے جس کا کوئی پرسان حال نہیں۔ جہاں صرف ماتم ہے، ماتمی کوئی نہیں —

پاکستان میں جناب ممتاز حسن ایک مقتدر باہمت اور مخلص دوست پنڈت جی کے ہیں جن کے وجود نے میری بے کسی کی لاج رکھ لی ہے۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا — چپ ہوں — گم ہوا — [illegible] ہو جاؤں گا — گم ہو جاؤں گا!

سوز و ساز کا دیباچہ "بقلم خود" کے عنوان سے لکھنا چاہتا ہوں۔ اس میں پنڈت کا تذکرہ لازمی ہے۔ ہوش قائم رہے تو لکھوں گا۔

(کراچی - ۲۱-۱-۵۸ء)

(۲۲)

تم بالکل بے وقوف ہو ضمیر۔ تم کو قطعاً معلوم نہیں کہ میں اس سانس کو جاری رکھنے کے لیے کہاں کہاں سے یعنی اپنی جان و جسم کے کن خشک ذروں سے توانائی کھینچ رہا ہوں۔

ابھی ابھی شیخ نذیر کی نظم "دارا مارا" کسی اخبار میں آئی اور اہل انشا نے سنائی۔ میں پڑھ چکا تھا اس لیے اس سے سنانے کو کہا۔ شیخ نذیر کتنا بڑا مشاق ہے۔ الحمد للہ میرا ایک دوست ایسا بھی ہے جس

شعر ہر رنگ میں کہنا ہے ترا کام حفیظ
آج ہم مان گئے، مان گئے، مان گئے

بس حفیظ کی جگہ نذیر لکھ دیجئے!

(کراچی)

(۲۳)

پچھلی مرتبہ تو تم کو خدا نے باندھ کر بھیج دیا تھا۔ اگرچہ دھاگا کچا تھا، مگر میرے جذبۂ دل نے تم کو کھینچ بلایا تھا۔ اب وعدے کا پاس کرو۔ ہفتے کی شام پہونچ جاؤ۔ رات رہو۔ دوسرے دن یعنی اتوار کی شام کو چلے جائیں۔ یہ شعر سنتے ہوئے ؎

جاؤ ہاں جاؤ ہوئی صبح شب وصل نمود
سلسلہ نامہ و پیغام کا جاری رکھنا

یہی کمرہ نمبر ۲ (C.M.H) میں اور میری بیوی اور بھتیجی بچی فیملی وارڈ میں مریض اور "مریضہ" ہیں۔ خواجہ رشید (کرنل ڈاکٹر خواجہ رشید) سے رشتہ ہے

ابھی باقی ہے میعاد مصیبت
ابھی کچھ اور جینا چاہتا ہوں

(مری - ۱۸-۷-۵۸ء)

(۲۴)

خداوند کریم والدہ کا سایہ آپ پر قائم رکھے۔ یہ ذات پھر کبھی حاصل نہ ہوگی۔ یاد رکھنا اگر طبیعت کی سہل انگاری نے تمہیں فریضۂ فرزندی سے خیالاً بھی غافل رکھا تو تم مرتے دم تک اپنی ذات کو معاف نہ کر سکو گے۔ بلکہ ضمیر اگر میری بات مانو تو چھٹی لے کر اپنے گاؤں چلے جاؤ۔ اور والدہ چاہے تو ہر وقت ان کے قریب بیٹھو۔ اُن سے باتیں کرو۔ اُن کے وہی بچے بن جاؤ جو توتلی زبان سے اماں کے دل پر راج کرتا تھا۔

(کراچی - ۹-۸-۵۸ء)

(۲۵)

..... دوستی مشکل بات ہے۔ بہت ہی مشکل۔ باپ، بھائی، بیٹا، بھتیجا، چچا، نانا، ماموں یا شوہر وغیرہ آسان ہے۔ دوست ہونا بہت مشکل ہے۔ دوست!

اس راہ میں ایسے بھی مقام آتے ہیں جن کے بارے میں اگرامی کہہ گیا ہے ع
ولایتے کہ در آں بندہ ہے خداوند است

(مری - ۱۰-۶-۵۹ء)

(۲۶)

ماڈل ٹاؤن۔ لاہور۔ ۵-۱۲-۶۱ء

آپ سچ کہتے ہیں۔ میرے بارے میں ہر کوئی سچ کہتا ہے۔ میں دنوں میں دوسروں کے لئے بھاگتا اور اپنے

ذاتی معاملات کو قربان کردیا کرتا تھا اُس وقت شاباش اور احسنت کہنے والے وہی ہوا کرتے تھے جن کے لئے میں بربوں سے تھپیڑوں سے نبرد آزما رہا کرتا تھا۔ اُن دنوں اُن کو میرے ذاتی معاملات نظر ہی نہ آتے تھے آج جب کہ میں بھنور میں ہوں مجھ پر ذاتی معاملات کے بارے میں کوتاہی کا الزام ہر طرف سے، ہر کشتی اور ہر کنارے سے پکار پکار کر لگایا جا رہا ہے ـــ اور یہ الزام خدا کی قسم حق و بجا ہے۔ البتہ الزام لگانے والے وہی تو ہیں جن کی خاطر میں اپنی ذات سے باہر نکلا تھا۔ خیر یہ فلسفیانہ تلخیاں ہیں ان پر ہنس دو۔

میرے تازہ تین شعر پڑھ لیجئے ؎

غم موجود ہے، آنسو بھی ہیں، کھا تو رہا ہوں، پی تو رہا ہوں
جینا اور کسے کہتے ہیں اچھا خاصا جی تو رہا ہوں

یارو میں نے اپنا سینہ اپنے ہاتھوں چاک کیا ہے
سچ کہتے ہو۔ لیکن دیکھو اپنے ہاتھوں سی تو رہا ہوں

خونِ جگر آنکھوں سے نہ ٹپکا۔ شعلہ بن کر منہ سے لپکا
شعبدہ بازیٔ فن پر ہنسیے میں بھی ہنستا ہی تو رہا ہوں

اس وقت میں گھر میں بیٹھا ہوں۔ بیوی، بیمار بچی کو لے کر شہر لاہور طبیب کے ہاں گئی ہے۔ مجھ پر نزلہ رکا ہوا ہے۔ غنودہ ہوں، مگر غنیمت! علاؤ الدین تک جانا یا حساب[1] کتاب کرانا فی الحال عذر خواہی کے سپرد کرتا ہوں۔ اور یہ... چیک ارسال کرتا ہوں!

خدا کرے میری بھاوج جہاں آرا اور بچے خوش و خرم اور تندرست ہوں۔ اور ان سب کی تندرستی کے طفیل اللہ مجھ پر بھی رحم کرے۔ اور میری بچیاں یا تو میری موت سے پہلے ہی مر جائیں یا اللہ اُن کے لئے کوئی سامان فرما دے ؎

کوئی چارہ نہیں دُعا کے سوا
کوئی سُنتا نہیں خدا کے سوا

(۲۷)

... آپ کا مقالہ "حفیظ کے ساتھ چند لمحے" "ماہِ نو" میں نظر آیا۔ آپ کو خیال ہوگا کہ حفیظ بہت تعریف کرے گا اور مارے خوشی کے خودکشی کر لے گا ـــ تعریف اس لئے نہیں کرتا کہ تم اس سے بہتر بھی لکھ سکتے تھے۔ بشرطیکہ ـــ ہاں بشرطیکہ ذرا اور غور و تعمق سے کام لیتے۔ تاہم تم نے جس رنگ سے بھی لکھا ہے آج شاید دوسرا اس رنگ سے نہ لکھ سکے۔ اب اس کو تعریف سمجھو یا مذمت ـــ میرا ایمان تو یہ ہے کہ شعر کی طرح شعر پر کچھ لکھنا بھی محنت چاہتا ہے اور یہ محنت کسی کام کی نہیں اگر مذاق درست نہ ہو۔ آپ کا مذاق درست ہے، مسلم ہے ـــ لیکن محنت ـــ ہائے اس کی عادت نہیں ـــ ضمیر، بہت گہرا سمندر بہت طوفانی نہیں ہوتا۔ (کراچی)

[1] میری کتاب کی رائلٹی کا حساب کتاب (ض)

پروفیسر محمد منوّر کے نام

(۱)

ابوالاثر حفیظ جالندھری
c/o Post Master
Murree
28/9/60

پیارے منور بھائی۔ السلام علیکم۔

آپ کا 24/9/60 کا مکتوب کل ملا۔ میں حیران ہوں آپ میرے لئے اتنا طومار لکھنے کی زحمت کیوں گوارا کرتے ہیں۔ قوم و ملت کی نگاہیں اگر ایک ہی نقطے پر سمٹ آئی ہیں تو یہ میرے لئے ایک نقطہ کافی ہو گیا ہے۔ اور میری عافیت اسی میں ہے کہ زیادہ نگاہوں کی اب قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ میں نے رفتہ رفتہ نگاہوں کے ہجوم سے فرار میں کامیابی حاصل کر لی ہے ؎

اپنی نگاہ کے سوا کچھ بھی نہیں میں دیکھتا
مجھکو کبھی دیکھنا ذرا اہلِ نظر میں کون ہوں

میں کون ہوں — یہ آپ بتائیں —— البتہ ——
یہ اپنی نگاہ میں نے آپ ہی میں دیکھی —— اور اُسی کو اب تک قلب میں لئے بیٹھا ہوں۔

اور سمجھا رہوں گا —— یار منوّر —— اس دنیا سے تا ایں وقت بڑے بڑے

بھاری بھاری محبت سے بوجھ کون اٹھائے۔ بس فقط ایک یاد ہی یا ایک آدھ

شفقت کسی کی یا محبت کافی ہے —— سنا ہے۔ بزرگ شفقت فرماتے ہیں

خورد محبت۔ آپ بزرگ بھی ہیں خورد بھی۔ خورد عمر میں بزرگ عقل و علم و ہنر

(فن میں آپکو (معاف فرمائیے) میں نہ بزرگ سمجھتا ہوں نہ خورد)

اپنی جلن سے میں ساری عمر جلتا جلتا رہا ہوں —— جلنا

میرے کام نہ آیا۔ البتہ جلنا میرے لئے موجودہ صورت حال انعام کے

طور پر لایا ہے —— لیکن میں بہک رہا ہوں —— مجھے کہنا یہ ہے۔ کہ آپ

سے جو ایک قلبی تعلق ہو گیا ہے —— اس میں نہ آپکی کوئی خوبی ہے نہ میری کوئی

کمزوری —— قلبی تعلق کے لئے قربی و فراقی دونوں بے معنی ہیں ——

یہیں ختم ہے بحث معیار حسن
جو دل لے گیا دلربا ہو گیا

حفیظ

ہاں میں تم کو بہت وسیع جانتا ہوں — لیکن ابھی تک تم کو کامل شامل حال نہیں ہے — یہ اللہ کی دین ہے — میں کون اور آپ کون ———

میرے اُنکے تعلقات سے دنیا کو کیا واسطہ ——— اور دیکھئے اگر آپ بھی یہ غلطی کر بیٹھے کہ اردو گندگی کے ڈھیر کو یہ انوکھا ملاپ نظر آ جائے تو یہ ڈھیر مجھ میں ایسے کیڑے ڈالیگی کہ آپ کو چھپنے مشکل ہو جائیں گے ———

ہاں میں تنہا ہوں — بے یار و مددگار — یعنی اللہ کے سوا اور رسول اللہ کے سوا اس کائنات میں کوئی نہیں ——— اور اللہ اور رسول اللہ کا میں تمام شعار ہوں ——— یہ انسان — خدا کی پناہ —

ابنِ آدم کو ابنِ آدم سے
قبر میں بھی پناہ مشکل ہے

منور جی —— اگر سانس کچھ مدت اور باقی ہیں — تو کبھی بدر
(نہ جانے کب) یہیں ادھر آ بیٹھا اکیلے بیٹھ کر — اکیلے —— پھر میری
سرگزشت سنیے گا — اور سر دھنیے گا —— ایسی کہانی ایسا افسانہ
ایسی سرگزشت شاید آپ نے کسی آٹو بایوگرافی تو کیا — کسی ناول
میں بھی نہ پڑھی ہوگی —— آپ کی دعا قبول ہو سکے — تو دعا کیجیے۔
کہ میں آئندہ ملاقات تک زندہ رہوں

میرا خیال ہے میں یہاں سے ۲ مرکو راولپنڈی چلا جاؤں گا
وہاں سے کدھر کا رخ کروں گا یہ اطلاع آپکو مل جائیگی —— ہاں مجھے چشتی
کا خط ملا تھا — میں نے اس کو مبارکباد دیدی ہے — لیکن اسکا پتہ تو
میں نے لدھیانہ ہی کا لکھا ہے —— خدا کرے اسکو خط مل گیا ہو

میری عمر بہت گزر گئی ہے — یا بہت تھک گیا ہوں —
ورنہ میں تمکو (آپکو نہیں) — تم میں خورشید منور شامل ہیں — کسی دور مقام
پہ لے جا کر لیتی لیتا —

قریشی[1] عبداللہ شاہ کے لیئے لکھنے کا یہ وقت نہیں ہے،
اور نہ ان کا نام ضمناً میں لینے کی جرأت کر سکتا ہوں۔

حفیظ

(۲)

D/2 Bath Island
Karachi
6/3/61

پیارے مرزا منور السلام علیکم

آپکا 2/6 کا خط مجھے ابھی ابھی ملا۔ اس سے پہلے نیاز شاہد
کا جواب اسی وقت دیدیا تھا۔ میرا خیال ہے مرزا صاحب۔ کہ آپکو میرا خط
نہیں ملا۔ کسی اور کے ہاتھ لگ گیا۔ یہ یقینی ہے کہ میں نے جواب لکھا اور خود سپرد
ڈاک کیا تھا۔ اس خط کے نہ ملنے کا رنج اس لئے ہے۔ کہ میں نے بعض (اپنے
ذاتی) مصائب بیان کئے تھے۔ اور یہ صرف آپکے سامنے بیان کئے تھے
کسی اور کے لئے نہیں

یہ خط خدا کرے آپکو مل جائے ــــ

۱۔ قریشی محمد عبداللہ شاہ صاحب ایڈووکیٹ سرگودھا

میرے کریم النفس منور بھائی ۔ یہ عجیب واقعہ ہے ۔ کہ

دنیائے دوں پر میری نگاہ واپسیں کے وقت آپ اور آپ کی امتی

پھر اسی دنیائے دوں میں نظر آگئے ۔ کاش آپ نہ ملتے ۔ آپ سے ملنے سے

میری اس دنیا سے مفارقت چند روز لیعنی رہنے کی حسرت ساتھ لیے

جاری ہے ۔ تفصیل فضول ہے مرزا جی ۔ آپ نہیں جانتے میں کس حال میں

ہوں ۔ داغ کا شعر کبھی محض اسلوب بیان کی عمدگی سے یاد رہ گیا تھا ۔

اب میرے حسب حال ہے ؎

وہ مصیبت سنی نہیں جاتی
جو مصیبت کو دیکھتا ہوں میں

لاکھوں ہزاروں مداحوں واہ واہ کرنے والوں ۔ اور لاکھوں

ہزاروں دعائے خیر کرنے والوں کے درمیان ۔ وہ شخص جو کوشش عمر یا کتمان

اور یہ اور وہ سب کچھ کہا جاتا تھا تن تنہا خود بھی بیمار ہے ۔ اور اپنی بیمار

ذریت کا تیماردار ہے ۔ خدا کی قسم تنہا ۔ میرا یہ حال موجود میں ۔ وقت

ضائع کرنے والا کوئی نہیں

میری سب سے بڑی بیٹی تسنیم دماغی عارضے کا شکار ہے۔
میں ہی چوبیس گھنٹے اسکی نگرانی تیمارداری دوا دارو کر رہا ہوں۔
اور خود جو حال میرا اس بیماری میں ہو رہا تھا۔ اور جسکے سبب مجھے قطعی آرام
کرنے کی تلقین کی گئی تھی۔ اب وہ آرام قابل دید ہے لیکن
مہر بلب ہوں۔ رضائے الٰہی پر راضی۔ نہ کوئی بھائی نہ کوئی بیٹا،
نہ کوئی یار دوست کوئی ہے جو چند روز میرے قریب رہ کر ساتھ
دے ۔۔۔ ہنسنے بولنے والے لاکھوں تھے۔ اس کرب کی حالت
میں کون اپنی جان کو دوسرے کا روگ لگائے۔

یہ ہے میری حالت میری جان ۔۔۔ میں نے آپکا خط
بڑے انتظار کے بعد پایا ۔۔۔ اپنے قلب کو شکر گزار پایا ۔۔۔ خورشید
کے خط کا جواب میں نہیں دے سکا ۔۔۔ دماغی حالت ایسی ہے۔
کہ بمشکل ایک سطر لکھ سکتا ہوں ۔۔۔ وفاق کے لئے میں لازماً"
کچھ نہ کچھ لکھونگا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ کہ اپنے پیارے عزیز امنور

کسی محفل میں کسی جگہ بیٹھ سکوں ــــ
دعا گو
حفیظ

محمد خورشید عاصم کے نام

(۱)

مری
۲۹-۹-۱۹۶۰ء

عزیز القدر خورشید میاں۔ السلام علیکم۔

آپ کا ۲۸-۹-۱۹۶۰ء کا خط مجھے آج دوپہر کے بعد مل گیا۔ پرسوں منور جی[1] کا خط بھی آیا تھا۔ کل اُن کو جواب میں "انڈ سنٹ" لکھ چکا ہوں۔ وہ زمانہ اور تھا جب ع

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں

اب عقل کی بات تو کیا بے عقل کی بات بھی ربط نہیں کھاتی۔ اور تم کہتے ہو (دیکھا کس قدر جلد میں آپ سے تم پر آ گیا ہوں) میرا خط باعث تشویش ہوا ہے کیوں کہ میں نے مسکرانا چھوڑ دیا ہے۔ کیوں کہ میری یامردی غائب معلوم ہوتی ہے اور اس کا باعث تم نزلہ سمجھتے ہو جو ہر باشعور اور حساس آدمی کی وراثت ہے۔ وراثت یعنی اسے وراثت میں ملا ہے نزلہ ـــ کیوں کہ یہ لوگ معاشرے میں یا معاشرے کے عضو ضعیف ہیں۔ اور نزلہ بر عضو ضعیف ریزد' محاورہ بھی ہے ـــ ہے نا یہی بات جو تم کہہ رہے ہو ـــ خونِ جگر۔ جگردار آدمی کے جگر کا خون ضعف کا باعث تو نہ ہونا چاہیے تھا۔ پھر میں صحت کے معاملے میں ہاؤ ہو کیوں کر رہا ہوں ـــ شاعری ـــ نہیں میں تو جہاد کا شاعر تھا۔ بہرحال تم جوان آدمی ہو ـــ معاشرہ نزلہ بن کر حساس اور باشعور لوگوں پر گرتا ہے۔ بدنصیبی سے تم بھی حساس اور باشعور نظر آتے ہو اپنی جوانی کو معاشرے سے بچنے کی سپر بناؤ ـــ

من نکردم شما حذر بکنید

ورنہ میری عمر میں خدانخواستہ تم کو بھی ہاؤ ہو کرنی پڑے ـــ روح کی زندگی کی مجھے خبر نہیں۔ البتہ دل زندہ لایا تھا وہ نہ جانے کہاں چلا گیا ہے ـــ حالی نے اس کی رام کہانی چھوڑ دی تھی ـــ میں حال ہی میں اس امر سے واقف ہوا کہ دلِ زندہ کی رام کہانی چھوڑنا آسان ہے ـــ لیکن آہ و بکا رام کہانی چھوڑنے کے بعد بھی جاری ہی رہتی ہے۔

میرا پروگرام ـــ فی الحال کوئی نہیں۔ حرکتِ مذبوحی میں مبتلا ہوں ـــ میرے دور کے لوگ چل دیے۔ میں ابھی پر پُرزے ہی تول رہا ہوں ـــ بہرحال آپ جیسی دعا چاہیں کرتے جائیں ـ

---

[1] پروفیسر محمد منور۔ گورنمنٹ کالج لاہور

منور پر جناب قریشی[1] کا اثر لا بدی امر ہے ــــ وہ تو وہ ہیں کہ چند باتیں ہی میرے گوش میں آئی ہیں ان سے ایک لمحہ نہ ملنے یا مل سکنے پر افسردہ ہوں۔

لیکن منور کو چاہیے کہ قریشی جی کو زندہ و پائندہ جان کر ان پر ایک بہت ہی دلچسپ کتاب لکھ ڈالیں ــــ میں یہ بات بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا ہوں ــــ وہ جیسا انتقال فرما گئے ہیں لیکن روحانی طور پر قریشی صاحب منور میں حلول کئے ہوئے ہیں۔

جب تک وہ یہ کام شروع نہ کریں گے ــــ خورشید ــــ میری بات یاد رکھو ــــ وہ اعصاب کی شکست کا سامنا کرتے رہیں گے۔

اب یہ میرا کم تمہارا زیادہ فرض ہے کہ منور کم از کم دو گھنٹے ہر روز اُن کے لطائف و ظرائف اور ان کی زندگی کے حسن کو کاغذ پر ڈھالیں ــــ اور میرے حوالے کریں۔ میں (اگر زندہ ہوں) اس کو اپنے قلم سے چند اشعار کے ساتھ چھاپوں گا ــــ کتاب کی صورت میں ــــ

میرے لئے آپ دونوں تم اور منور (منور کے سبب سے تم) اس دور میں دو رحمت کے فرشتوں کی طرح جھلک دکھا گئے ہو ــــ میں بہت پرانا اور اچھا خاصہ پسا ہوا سُرمہ ہوں ــــ شاید چشم بصیرت کو اس سُرمہ سے بھی تھوڑی سی جِلا مل سکے۔

میرا مری میں رہنے کا پروگرام تو حیدر چشتی[2] کے چلے جانے کے بعد ہی تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ اب میں بہت جلد پنڈی سے لاہور یا کراچی جانے پر مجبور ہوں ــــ حسن ابدال بھی آؤں گا ــــ کب آؤں گا ــــ ابھی طے نہیں ــــ یہاں سے پلٹ کر راولپنڈی صرف ایک آدھ دن ہی قیام ہوگا۔

بیوی بیمار ہے۔ بچی بیمار ہے۔ اور میں خود نزار ہوں ــــ یار کچھ ایسا ہی حال ہے کہ اس مرتبہ میں خطوط میں بیماری اور لاچاری کے علاوہ کچھ بھی بک نہیں سکا۔

خیر سے داغ نے کہا ہے ؎

ہم تو فریاد و فغاں آہ و بُکا کرتے ہیں
جن سے کچھ ہو نہیں سکتا وہ دعا کرتے ہیں

حفیظ

(۲)

۲/بی باتھ آئیلینڈ
کراچی۔ ۲۴-۱۰-۶۰

---

[1] مرحوم قریشی عبداللہ شاہ صاحب ایڈوکیٹ سرگودھا
[2] پروفیسر غلام حیدر چشتی گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج جہلم

یعنی[1] تم سب گدھے ہو —— ہر وہ شخص گدھا ہے جو اپنے برابر کے دوستوں کو گدھا کہے۔ تم نے مجھے محترم اور تم تینوں ایک بہت ہی معزز دوست کو گدھا کہتے اور لکھتے ہو —— سزا دوں گا ورنہ مجھے لکھو —— کہ محترم کے معنی کیا ہیں —— ؟

گجُستہ۔ تمہارا ۱۷-۱۰-۶۰ء کا خط ملا —— لمبا جواب دینے کے قابل نہیں۔ تمہارے طرزِ خطاب سے تاؤ میں آیا ہوں۔ اگر اس خط میں تم جو کچھ اصلی ہو نہ جھلکتے تو میں منظوم گالیاں لکھتا —— خیر! اؤ اب غصہ تھوک کے رہتا ہوں —— مجھے تمہارا وہ خط مل جاتا تو میں تمہیں تار دے کر پنڈی بلا لیتا۔ کبھی میرے ساتھ میری بیوی تھی اور بچی اور ہم ایک رشتے دار کے گھر جو حکومت کے ڈپٹی سکریٹری ہیں (وہی جن کے گھر میرے دماغ کی رگوں نے پھٹنے اور میرے بیہوش ہونے کی وضع اختیار کی تھی) اور وہاں بیوی کو چھوڑ کر حسن ابدال آنا ممکن نہ تھا۔ یار یہ عزیزوں کی مہمانی شکل ہے' مجھے وہاں —— یعنی پنڈی میں ایک مکان پشاور روڈ پر ملنے والا ہے۔ جب میں وہاں آ گیا تو ہر تیسرے چوتھے —— از بہر محبت نہیں مانتے نہ مانو از بہر تفنن ہی سہی حفیظ اپنی موٹر کار پر سوار "حسن[2]" کے ابدال بن جایا کریں گے اور گجر وہاں گاجریں کھایا اُڑایا کریں گے —— انشاء اللہ —— میری زندگی کا معاملہ اللہ میاں سے طے کر لیجئے —— بڑا مزا رہے گا۔

مرزا جی[3] کی گوشمالی اب مجھے ضرور کرنی ہے۔ اس شخص کا دماغ قطعاً خراب ہو گیا ہے۔ یہ بیمار ہو کر اب تم کو بھی —— اس خرچے کو بھی —— اور محمد پہلوان سخن کو بھی ڈرانے دھمکانے پر آمادہ ہے۔ دیکھو —— خورشید جی —— اب مرزے کے بغیر میری زندگی بالکل موت رہے گی۔ میں چاہتا ہوں —— سازش میں تم میرا ساتھ دو؛

اُس کو کسی بہانے (جب میں پنڈی آ جاؤں) بُلا لیں۔ ایک ٹانگ اس کی توڑ ڈالیں —— دونوں آنکھوں پر کھوپے چڑھا دیں —— پھر نہ پڑھ سکے گا نہ بھاگ سکے گا —— اسے خوب مار مار کر کھلائیں پلائیں —— کہو کیا ارادہ ہے۔

شرط یہ ہے کہ اس منل بچے کو پتہ نہ چلے۔
میں تمہارے خط کا لاجیکل جواب نہ لکھوں گا۔ جو میرے دل میں ہے کہہ دیا ——
تمہارا جواب آنے پر پھر لکھوں گا۔

---

[1] اس خط کا آغاز و انجام نہیں ہے۔ یعنی بغیر دعا سلام کے شروع ہوا بغیر نام کے ختم۔
خط بنام محمد خورشید عالم کیڈٹ کالج حسن ابدال۔
[2] قصبہ حسن ابدال کی رعایت سے
[3] پروفیسر محمد منور گورنمنٹ کالج لاہور

اکرام قمر کے نام

ایک واقعہ، ایک خط

یہ ستمبر سنہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ ابو الاثر حضرت حفیظ جالندھری مع اپنے بیوی۔ بچوں کے گرمیاں گزارنے کے لئے شملہ آئے ہوئے تھے۔ میں اور میری تابش صدیقی بھی سلسلۂ ملازمت وہیں تھے۔ میرے ایک عزیز ترین دوست عبدالروف اپنی بیمار بیوہ والدہ معظمہ اور تین بہنوں کے ساتھ شملہ آئے ہوئے تھے۔ ان کا قیام جاکھو کی چوٹی پر واقع ایک کوٹھی کی نچلی منزل میں تھا۔ جس کی بالائی منزل میں مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی، ایشور سنگھ آرٹسٹ اور کامریڈ موہن سنگھ فروکش تھے۔ سر عبدالقادر مرحوم بھی شملے میں کیتھو کی ترائی میں ایک کوٹھی میں گرمیاں گزار رہے تھے، مشہور کمیونسٹ لیڈر کامریڈ بی۔ پی۔ ایل۔ بیدی حفیظ صاحب کے پاس آئے ہوئے تھے۔ وہ زمانہ بڑے سیاسی انقلاب کا تھا۔ اس برِ عظیم کے دونوں ملکوں —— پاکستان اور ہندوستان —— کو آزادی مل رہی تھی۔ وحشیانہ فسادات کی دہشت ناک آگ بھڑک اٹھی تھی۔ شملے کا مسلمان چاروں طرف سے غیر مسلم ریاستوں اور علاقوں میں گھرا ہوا تھا۔ ان کے صحیح سلامت بچ نکلنے کی کوئی راہ نہ تھی۔ لفٹننٹ کرنل (اب لفٹننٹ جنرل) الطاف قادر اپنے والد بزرگوار سر عبدالقادر مرحوم کو لے جانے کے لئے ایک فوجی کنوائے لے کر شملے آئے۔ سر عبدالقادر مرحوم نے حفیظ صاحب کو بھی ساتھ چلنے کے لئے کہلا بھیجا۔

میرے دوست عبدالروف صاحب کا قیام جاکھو پر تھا۔ وہاں سے اُن کے کنبے کو نکال کر کسی مسلمان محلے میں پہونچانا جان پر کھیلنے کے مترادف تھا۔ کیوں کہ سارا راستہ ہندو سکھوں کی آبادی تھی۔ اس مسلمان کنبے کی جان و آبرو بچانے کے لئے راجندر سنگھ بیدی، ایشور سنگھ آرٹسٹ اور کامریڈ موہن سنگھ رات کو کوٹھی کی نچلی منزل میں سوتے اور یہ مسلمان کنبہ اُوپر کی منزل میں سوتا، تاکہ اگر آس پاس کے غیر مسلم غنڈے نچلی منزل میں آباد مسلمان کنبے پر دھاوا بولیں تو وہاں سے یہ سکھ برآمد ہو کر انہیں بتائیں کہ وہ مسلمان کنبہ تو یہاں سے چلا گیا ہے اور اس منزل پر بھی ہم نے قبضہ کر لیا ہے۔ سہر رہا ہے' یہ بھی بتاتا جاؤں کہ یہ کوٹھی ایک مسلمان

له مکمل غــزل انتخاب کلام میں شامل ہے۔(حفیظ)

۔۔۔ بیگم زینت فدا حسن ۔۔۔ کی ملکیت تھی ۔ یہ سکھ دوست رؤف صاحب کے کنبے کی حفاظت کے لئے ہر ممکن قدم اٹھا رہے تھے ۔ اور یہ سب کچھ صرف انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت تھا۔ ورنہ اس سے پہلے اس مسلمان کنبے کی ان سکھ نوجوانوں سے کوئی واقفیت نہیں تھی ۔

جب راجندر سنگھ بیدی ، ایشور سنگھ آرٹسٹ اور کامریڈ موہن سنگھ کو بی۔ پی ۔ ایل بیدی کی زبانی مذکورہ بالا نوجی کنوائے کی خبر ملی تو وہ سیدھے حفیظ صاحب کے پاس پہونچے ۔حفیظ صاحب میری وجہ سے رؤف کو جانتے تھے ۔ ان تین انسانیت نواز سکھ دوستوں نے حفیظ صاحب سے گذارش کی کہ ہماری کوٹھی کی نچلی منزل میں رؤف صاحب اپنی بیمار بیوہ ماں اور تین نوعمر یتیم بہنوں کے ساتھ رہتے ہیں ۔ ہم ان کی جان و آبرو بچانے کے لئے ہر ممکن تدبیر کر رہے ہیں ، اور کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے ۔ لیکن حالات جو رُخ اختیار کرتے جا رہے ہیں ۔ اُس میں نہ اس کنبے کو غیر مسلم غنڈوں سے زیادہ عرصے تک بچایا جا سکتا ہے اور نہ حفاظت سے نکال کر کسی مسلمان محلے ہی میں پہونچایا جا سکتا ہے ۔ حالات روز بروز مخدوش سے مخدوش تر ہوتے جا رہے ہیں ۔ اگر آپ پانچ افراد کے اس کنبے کو بھی اپنے ساتھ لاہور لے جا سکیں تو یہ بہت بڑی نیکی ہوگی ۔ حفیظ صاحب انسانی ہمدردی اور اسلامی اخوت کے جذبے کے تحت اس پر فوراً آمادہ ہو گئے ۔ انہوں نے اپنی انگریز بیوی انیلا اور اُس کی کم سن بچی کو وہیں شملے میں کامریڈ بی ۔ پی ۔ ایل بیدی کی نگرانی میں چھوڑا ۔ اپنا کثیر سامان بھی وہیں چھوڑ دیا ۔ اور یوں اس مسلمان کنبے کے لئے گنجائش نکال لی ۔

کنوائے کو ۸ ستمبر کی صبح کو چلنا تھا ۔ میں اور ثابش صدیقی بگڑتے ہوئے حالات کو دیکھ کر ۷ ستمبر کو بعد دوپہر اپنا مکان چھوڑ کر مسلمانوں کے ایک محلے ۔۔۔ لداخی محلے ۔۔۔ میں منتقل ہو گئے ۔ حفیظ صاحب نے ۷ ستمبر کی شام کو ہم دونوں کو بہت تلاش کیا ۔ لیکن اُنہیں ہمارا کوئی پتہ نہ مل سکا ۔۔۔ آدھی رات کو راجندر سنگھ بیدی ، ایشور سنگھ آرٹسٹ اور کامریڈ موہن سنگھ نے رؤف صاحب کے کنبے کو رکشاؤں میں بٹھا کر ، ان رکشاؤں کو خود کھینچ کر ، جاکھو کی چوٹی سے کیتھو کی ترائی میں سر عبدالقادر مرحوم کی قیام گاہ تک پہونچایا ۔ ان سکھ دوستوں کی انسانی ہمدردی کا یہ عملی اظہار ایسا تھا کہ اُس دور میں اس کی مثال خال خال ہی ملتی ہے ۔۔۔ حضرت ابو الاثر نے اسلامی اخوت و ایثار کا ایسا مظاہرہ کیا کہ وہ بیوہ ضعیفہ اور ان کی یتیم بچیاں آج تک ان کے لئے سراپا دعا و تشکر ہیں ۔

حضرت ابو الاثر نے بخیریت لاہور پہونچنے کے بعد شملے کے مسلمانوں کو بحفاظت نکال لانے کا انتظام کرانے کے لئے تگ و دو کی ۔ آپ نے مجھے وہاں سے ۲۰ ستمبر کو مندرجہ ذیل گرامی نامہ تحریر فرمایا :۔　　　(اکرام قمر)

قیس شروانی (مدیر فردوس سیالکوٹ) کے نام

"فردوسِ ادب" (کا شمارہ نمبر ۲ ماہ) مل گیا۔ ساتھ ہی چند خطوط ملے جو آپ کے فردوسِ ادب سے لطف اندوز ہونے والوں نے میری پرسشِ حال کے لئے لکھے ہیں۔ تنہا آپ کی خدمت میں ایک ذاتی عذر گناہ کے بعد اب یا مربا راور نام بنام جواب دہی کرنی پڑ گئی ہے۔ اور میں احباب دیوبند کو دو لفظوں میں ٹرخا بھی نہیں سکتا۔ کیوں کہ میری ساری عمر کا فراہم کردہ سرمایہ یہی لوگ ہیں۔ بقول داغ ؎

خدا زندہ رکھے مرے دوستوں کو
بہت جا چکے اور تھوڑے رہے ہیں

میں نے پہلا مکتوب پڑھتے ہی فردوس کا باب کھولا تو دروازے کے اندر میری آنکھوں کو اپنا وہی ذاتی نیاز نامہ جلوہ آرا نظر آیا۔ اب آپ سے کیا کہوں، آپ نے تو مجھے جیتے ہی فردوس میں داخل کر ہی لیا۔ البتہ فردوسیوں کو یہ کیسے بتاؤں کہ ؎

زندگی سے نپٹ رہا ہوں ابھی
موت کیا ہے مری بلا جانے

میرا عذر جو پذیرا ہونا چاہئے تھا۔ یہ تھا کہ جب سے دماغ کی رگیں پھٹ چکی ہیں۔ میں ایسے شعر کی فکر سے کٹ گیا ہوں جس کو پرکھنے والے ٹکسال پر ابھی تک موجود ہیں۔ دور کیوں جاؤں 'فردوس ادب' کے اسی شمارے میں نظم ہو یا غزل صورت و معنی کے لحاظ سے میرے لئے وہی ترازو پیش کرتی ہے جس پر کبھی میں "کج مج" بیان نے اپنے شعر کو تول لیا تھا۔

قیس جی۔ آپ کے اس فردوس میں (جہاں تک شعر کا تعلق ہے) ملک کے دوسرے ادبی حلقوں سے بہت زیادہ سلیقہ موجود ہے۔ کاش میں بھی دوسری دنیا کے فردوس کی طرف کشاں کشاں لے جائے جانے سے پیشتر ایک آدھ پھول پنکھڑی اپنے دلِ پرخون کی یادگار کے طور پر چھوڑ سکوں۔ بہر آئینہ فردوس نے اپنی ہی نظم کا ایک مصرع بار بار میرے سامنے پیش کیا۔ ؏

جنت میں کب رہنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

لہٰذا زندگی رہی تو یہ معذور قلم اس باغ پر بہار کے لئے تھوڑی بہت بیتا کاری کرے گا ضرور۔ پھول نہ سہی کانٹا ہی معیاری مل گیا تو کھٹکنے کے لئے دامانِ نگاہ کے حضور موجود کر دیا جائے گا۔ تا کہ سند رہے۔ فی الحال خلیق قریشی صاحب کے اس شعر پر سر دھن رہا ہوں ؎

عشرت کے قہقہوں میں تو ہوتے ہیں سب شریک
روتا ہے کون درد کے ماروں کے ساتھ ساتھ

البتہ ایک جگہ میں اٹک گیا ہوں۔ آپ نے جموں اور کشمیر میں پہلے کل ہند مشاعرے پر جو کچھ لکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ

آپ بھی اچھے خاصے کھلکڑ ہو گئے ہیں۔ آپ نے بہت سے شاعروں کی یاد کو ایک ہی نقطے میں سمیٹ دیا ہے۔ ہاتھی کے پاؤں کے نیچے سب پاؤں کچلے گئے ہیں۔

میرا گمان نہیں مشاہدہ ہے کہ جموں اور کشمیر کے اس پہلے مشاعرے میں جب پہلی مرتبہ سیماب صاحب کے ساتھ ساغر صاحب اور جمال صابری جمل وارد ہوئے تھے۔ پنڈت ہری چند اختر، حکیم یوسف حسن، امر چند قیس اور سوہن لال ساحر شامل نہیں تھے۔

مجھے اب تک یاد ہے کہ میں مولانا سُہا کے پاس لاہور میں بیٹھا تھا کہ مولانا تاجور صاحب تشریف لائے۔ وہ جموں سے پلٹے تھے۔ تاجور صاحب نے جموں کے مشاعرے کا تذکرہ کیا جہاں وہ ارباب علم کے شعراء کو ساتھ لے جا کر شریک ہونے کے لئے گئے تھے۔ مولانا نے ہمیں بتایا کہ سیماب صاحب دو عدد خوبرو چھوکرے ہمراہ لائے تھے۔ ایک کا تخلص ساغر اور دوسرے کا جمال تھا۔ اور بقول تاجور سیماب صاحب اپنے ساتھ یہ چھوکرے اپنے کو شاعر اعظم منوانے کے لئے رکھتے ہیں۔

مولانا تاجور بڑے لسان تھے۔ آپ نے ساغر صاحب کے شعر پڑھنے ہی کا نہیں بلکہ اسٹیج پر تھرکنے کا سماں بیان کیا۔ اور اعتراف کیا کہ خود تاجور صاحب اور ان کے ساتھی اُن ہر دو عروس کے براتی بن کر رہ گئے تھے۔ اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"حفیظ صاحب، آپ اس وقت تو ہنس رہے ہیں۔ اگر آپ بھی وہاں ہوتے، تو آپ کو بھی ہماری ہی طرح کھسیانا ہو کر آنا پڑتا"

مولانا سہا اور میں مولانا تاجور کے حسن گفتار پر قہقہے لگا رہے تھے۔

تاجور صاحب نے بتایا کہ سیماب اور ان کے چھوکرے بھی کل ہی لاہور پہنچے ہیں۔ انارکلی کے اندر شیخ کی سرائے میں ٹھہرے ہیں۔

خیر مولانا تو تشریف لے گئے۔ مولانا سہا نے میری فرمائش پر ایک آدمی کو بھیجا کہ سیماب صاحب ہوں تو ان کو دعوت دی جائے۔ اور ان کے چھوکروں کی ادائے شعر خوانی سے لذت حاصل کی جائے۔ لیکن آدمی واپس آیا، خبر لایا کہ وہ لوگ رات ہی کی گاڑی سے آگرے جا چکے ہیں۔

میں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ اس کے دوسرے سال جموں ہی میں تاجور اور اُن کے ساتھی شاعروں کی بجائے مجھے اور میرے چند ساتھیوں کو دعوت دی گئی۔ رام رچھپال سنگھ شیدا صدارت کے لئے بلائے گئے۔ مجھے سیماب و ساغر سے (جن کو میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا) "دوبدو" یا محاورے کے لحاظ سے "دوچار" ہونا پڑا تھا۔

واقعہ یوں ہے کہ اس وقت تو تاجور صاحب کی بات آئی گئی ہو گئی۔ میں خیرپور سندھ بطور شاعر دربار چلا گیا، جہاں چند ماہ رہ کر مجھے "رقاصہ" لکھنے اور دربار میں سنا دینے کی پاداش میں تین دن حوالات میں رہ کر "بدستے دگرے بدستے دگرے" بدھو کی طرح گھر لوٹنا مقدر تھا۔ اس کے بعد آتا ہے جموں کا وہ شاعرہ جس میں اس

مرتبہ ہمیں یہی حفیظ اور حفیظی حلقۂ شعراء

حفیظ کی بزمِ پنجاب سے لاہور میں شعر و فن کے الگ الگ محاذ بن چکے تھے۔ اب آپ کو یاد آ جائے گا کہ میں اور میرے ساتھ ڈاکٹر تاثیر (جو ان دنوں ایم اے تھے۔ پی ایچ ڈی نہیں تھے) پنڈت ہری چند اختر۔ سوہن لال ساحر۔ اور رام چند قیس جموں پہونچے تھے اور آپ کی اس قدیم حویلی میں ریذیڈنسی روڈ پر ٹھہرے تھے۔ حکیم یوسف حسن مدیر نیرنگ خیال اگرچہ شاعر نہ تھے مگر ہم نے ان کو اپنے ساتھ "طائفہ" کے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے لیا تھا۔ تاکہ ساغر و جمال کی نگاہوں سے شاعروں کے دل قابو میں رہیں۔

مشاعرے کے صدر رام رچھپال سنگھ شیدا ہمارے ساتھ ٹرین کے ایک ہی خانے میں سے جموں اسٹیشن پر اترے تھے۔ ہم مشاعرے سے ایک دن پہلے اس لئے پہونچ گئے تھے کہ مرتبین و ممیں توی ندی کی لہریں بھی لے لیں۔ اور مشاعرے میں کھسیانے ہو کر اٹھنے سے پہلے جموں کی سیر بھی ہو جائے۔

تاجور صاحب کے ارباب علم میں سے محض برادرم اثر صہبائی اور سید عابد علی عابد ہی آئے تھے بسمل صاحب دوسرے دن آئے تھے۔ اب کے ان کے ساتھ ساغر تو تھے لیکن افسوس جمال کا جمال جہاں آرا اس مرتبہ نظر افروز نہ تھا۔ بلکہ آگرے کے ایک جوتوں کے سوداگر حاجی محمد عمر صاحب اپنے لحیم شحیم تن و توش اور اچھی خاصی داڑھی کے ساتھ موجود تھے۔ اور سیماب صاحب کے ایک فرزند بھی تھے۔ یہ بزرگ بنگالی داڑھی والے عمر صاحب۔ صاحب دیوان بھی بیان کئے گئے تھے اور یہ بھی ثابت ہوا تھا کہ سیماب صاحب نے ایک دیوان حاجی صاحب کے لئے خاص قدر و قیمت سے شائع فرما دیا ہوا تھا۔

اس رات مشاعرے میں جو کچھ پیش آیا وہ بھلایا نہیں جا سکتا۔ مصرع طرح تو مجھے یاد نہیں البتہ دیوانہ چاہئے افسانہ چاہئے زمین تھی۔

میں اور میرے ساتھی سب کے سب آغاز ہی سے مشاعرے میں حاضر تھے۔ لیکن سیماب صاحب اور ساغر صاحب کی خدمت میں بار بار اہل مشاعرہ کی طرف سے تشریف لے آنے کے لئے پیامی بھیجے جاتے اور جواب لاتے چلے جا رہے تھے کہ ابھی تو غزلیں صاف ہو رہی ہیں۔ ابھی تو شیروانی کی سلوٹیں درست کی جا رہی ہیں۔ ابھی تو چوڑی دار پاجامے کی چوڑیاں چاول کی پیچ کے ساتھ جمائی جا رہی ہیں۔

ادھر مشاعرے میں پے درپے مقامی شعراء داد سخن دے رہے تھے۔ لیکن بار بار شور اٹھتا کہ ساغر صاحب .... ساغر صاحب کو بلاؤ۔

پیامی جواب لایا: وہ فرماتے ہیں کہ سواری تو ابھی ہی نہیں گئی۔ آئیں تو کیسے؟

مزہ یہ ہے کہ مشاعرہ قیام گاہ سے کچھ بہت دور نہ تھا۔ نیز یہ کہ سواری سے ان کی مراد موٹر کار تھی۔ اور موٹر کار کو اس وقت پہاڑ پر لانا۔ جوئے شیر کو میدان سے ماؤنٹ ایورسٹ تک لے جانا تھا۔ بہر حال مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ ایک صد اور سوا سینتالیس گز کا فاصلہ قیام گاہ سے مشاعرے تک بہزار خرابی ایک ڈانگے کی نجم فتح کے ساتھ طے کرایا گیا۔ اور ہجوم سے وہ آئے۔ وہ آئے کا شور آسمانوں تک پہونچایا گیا۔

ہم مزلے رہے تھے۔ اختر اور تاثیر نے میری طرف دیکھا۔ میں نے انگلی لبوں پر رکھ کر ان کو ہنسی روکنے کی تلقین کی مبادا معلوم ہو، یا تھا کہ عروس سخن ہے جو اب پردے سے نکلی ہے۔ اور ہم سب اس جلوۂ تصویر دل پذیر کے پس منظر کے لئے یہاں جمع کئے گئے ہیں۔

سامعین مشاعرہ کے شور نے بوڑھے کا نسخہ صدر سمجھے ہوئے اخبار نویس اور کہنہ مشق شاعر رام رچھپال سنگھ شیدا کو مجبور کر دیا کہ اب ساغر صاحب کو فوراً پیش کر دیں۔

ساغر صاحب تشریف لائے۔ تالیاں بجیں۔ نظم ارشاد ہوئی۔ پہلے ہی مصرعے سے واہ واہ کا ڈونگرا برسنا شروع ہو گیا۔ شاعر لوگ حیران تھے کہ اکثر اشعار بہت کچھ سر کھپانے کے باوجود ہمارے فہم سے باہر ہیں۔ شاید عوام کے عوام پہلے ہی سے ان اشعار پر مدتوں غور و خوض فرماتے ہوئے ان کے ادق الفاظ کے معنی و غوامض پر بحث و مباحث کے بعد فیصلہ کر کے آئے ہیں۔ اسی لئے معلق سے معلق تراکیب سنتے ہی 'آہا' اور 'ہو ہو' ہو رہی ہے۔

میرے ساتھی شعرا حیرت میں تھے اور میں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ داد شعر کی نہیں، یہ داد اس ہاتھ کی ہے جو شعر کا مصرع منہ سے نکلنے کے ساتھ ہی پہلے تو تھوڑی دیر ہوا میں ناچتا ہے اور پھر سامعین کی نگاہوں کو اپنے ساتھ نچواتا ہوا یک لخت مصرعے کے خاتمے کے ساتھ بجلی کی طرح گرتا ہے۔

ہائے بے چارے سامعین۔ سمجھتے تھے کہ شعر و شاعری کا کمال شاید یہی ہے۔ مشاعرہ ایسی دست بے پناہ کے اٹھنے اور گرنے ہی کا نام ہے —!

قیس صاحب ..... شعر و ادب میں ہر فرد پر ایک دور جاہلیت بھی گزرتا ہے۔ اب میں نے جانا کہ مولانا تاجور صاحب ایسے وقیع سخنور ادیب اور لسان اور ان کے ارباب علم و انوں پر جموں کے پہلے مشاعرے میں کیا کچھ نہ بیت گئی ہوگی۔ لہٰذا ساغر صاحب کے بیٹھنے سے پہلے ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے حلقۂ احباب میں سے کسی کو اس وقت تک اٹھ کر شعر پڑھنے نہ دوں گا جب تک اس طلسم ہوشربا کو توڑ نہ ڈالوں۔

میں نے چٹ پر لکھ کر اپنا نام صدر کی خدمت میں پہنچا دیا۔

تاثیر اور پنڈت ہری چند روکتے رہے۔ لیکن میں نے کہا: بہتر ہے کہ سب سے پہلے جموں کی ٹھونگ میرے نصیب میں آئے۔

صدر نے بھی تامل کرنا چاہا۔ لیکن میرے اصرار کے سامنے پیش نہ چلی۔

میں اٹھا اور قیس صاحب۔ آپ کو یاد آ جانا چاہئے کہ میں نے سب سے پہلے کون سی نظم جموں کے اس شاعر کش مشاعرے میں پڑھی تھی۔ آپ کو یاد نہ رہا ہو تو میں یاد دلائے دیتا ہوں ......

یہ نظم تھی — "شاندار گنگا"

میں نے یہ نظم چوتھی پانچویں جماعت کے بچوں کے لئے اخبار پھول میں چند برس پہلے شائع کی تھی۔ ہاں چوتھی پانچویں جماعت کے طالب علموں کے لئے۔ اور میں نے نظم پڑھنے سے پہلے دو فقرے کہے تھے کہ والے جموں کے باسیو آپ توی ندی کی لہریا تو دن رات دیکھتے ہیں آج ذرا گنگا دیوی کا خرام ناز بھی ملاحظہ فرمائیے!

اور میں نے یہ نظم سُنا ڈالی۔

اس نظم میں دریائے گنگا کے گنگوتری سے نکلنے اور پھر اپنے میدانی پہاڑیوں سے خراج لیتے ہوئے بہتے چلے جانے کے چند مناظر تھے۔ جو ہر شخص کی سمجھ اور تصور میں آسکتے تھے۔ اور جو بہت ہی سادہ طفلانہ اردو میں نظم کئے گئے تھے۔

آپ ذرا اپنے تصور کو جموں کے اس مشاعرے تک پلٹا سکیں تو سامعین کی کیفیت کا نقشہ سامنے آجائے گا، ہاں۔ مجھے یقین تھا کہ یہ بچوں کے ذہن کے مطابق لکھی ہوئی نظم ہی ان ادق اور مغلق نظمیات کا اصل توڑ ہے۔

مجھے کیا اب تو ہر ایک کو نظر آگیا کہ شعر و شاعری کے معنی کیا ہیں۔ جیسے سننے والوں کی آنکھوں سے پردے سے اٹھ گئے ہوں۔ سامعین کو اچانک یہ معلوم ہوا کہ شعر تو سمجھ میں بھی آسکتا ہے۔ شعر میں بہتا ہوا دریا تو مشاعرے میں بیٹھے ہوئے بھی آنکھوں کے سامنے لہرا سکتا ہے۔

میں یہ نظم پڑھ کر بیٹھ گیا۔

اب طلسم ہوشربا ٹوٹ چکا تھا۔ ساغر صاحب کو پھر سیماب صاحب نے بار بار اٹھوایا کہ اب مشاعرہ "دستکاری" کے بس کا نہ پایا۔ اب صورت یہ تھی کہ ہم شاعر لوگ تو اسٹیج پر بیٹھے ہوئے ساغر صاحب کو روایتی داد دیتے تھے۔ لیکن سامنے کا ہجوم سامعین۔ اب ہمارے داد دینے پر ہنستا تھا۔

بار بار لوگوں کے اصرار نے مجھے بلایا۔ آخر۔ ابھی تو میں جوان ہوں سنئے۔ دوران ساغر صاحب سیماب کو خفا کر کے مشاعرے سے کسی بہانے تشریف لے گئے۔ اور پھر نہیں پلٹے۔ لہٰذا اب دوسرے شعراء نے اپنا اپنا کلام اہل ذوق کے اصرار پر بار بار سُنایا۔

یہ تھا دورِ جاہلیت کا وہ معرکہ۔ جو جموں کے مشاعرے میں پیش آیا۔ اور یہی وہ دن تھا جس کے بعد میرے محترم سیماب اور نوجوان ساغر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھ پنجابی کے خلاف، اپنے رسائل میں جی میں جو آیا لکھتے چلے جانے کی روش اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

میرا خیال ہے کہ فردوسِ ادب کے لئے یہ اچھا خاصا "خلیان" لکھ ڈالا ہے۔ جب قلم اٹھایا تھا تو خیال تھا کہ محض چند سطور کے ذریعے جموں کے شاعروں کے بارے میں آپ کی یادداشت میں وہ مشاعرے آؤں جس میں یہ عاجز اور ڈاکٹر تاثیر۔ پنڈت ہری چند اختر۔ قیس۔ ریاض اور سوہن لال ساحر پہلی مرتبہ حاضر ہوئے تھے۔ اور پھر ہمیشہ کے لئے جموں کشمیر سے ہماری وابستگی ہو گئی تھی۔

اس مشاعرے کے بعد بہت سے مشاعروں میں یہ عاجز موجود تھا۔ لیکن سیماب و ساغر سے پھر جموں میں ملاقات نصیب نہیں ہوئی۔ وہ جاہلیت کا دور میں بھی بھول چکا تھا۔ اپنے مضمون میں "آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا" اب میں جموں کے پہلے مشاعرے کی اس طرحی غزل کا مطلع نقل کئے دیتا ہوں۔ آہ ان دنوں میں بھی طرحی غزلیں شوق سے کہتا تھا۔ کاش وہ زمانہ چند دن کے لئے دوبارہ آجائے ؎

مل جائے مے تو سجدۂ شکرانہ چاہئے
پیتے ہی ایک لغزش مستانہ چاہئے !

حفیظ

نریش کمار شاد

حفیظ کے لطیفے

شکوی

کسی رئیس کے ہاں دعوت تھی۔ مدعو حضرات میں دیگر معززین کے علاوہ کئی شاعر اور ادیب بھی تھے۔ جن میں حضرت جوش ملیح آبادی بھی شامل تھے۔ جو اپنے بیشتر دوسرے شاعروں کے ہمراہ مصروفِ نا و نوش تھے۔

پیتے پیتے نہ جانے جوش صاحب کو کیا سوجھی کہ انہوں نے فرمایا: "وہم مونث ہے اور جو لوگ اسے مذکر لکھتے ہیں غلطی کرتے ہیں"۔

ہری چند اختر نے فوراً تردید کرتے ہوئے کہا: "نہیں قبلہ! آپ کو مغالطہ ہوا ہے۔ وہم "مونث" نہیں مذکر ہے"۔

لیکن جوش صاحب اس عالم میں کسی کی بات کو صحیح تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ بدستور اپنی بات پر اڑے رہے۔ اور اختر اور جوش کے درمیان تذکیرو تانیث کی یہ بحث کافی سنجیدگی اور طوالت اختیار کر گئی۔

حفیظ جالندھری بھی وہیں موجود تھے۔ اس بحث سے کچھ کبیدہ خاطر ہوئے تو انہوں نے اختر صاحب سے مخاطب ہو کر کہا:

"یار اختر! تم بھی نہایت ہوشیار آدمی ہو۔ بے چارے جوش کو نشے میں دیکھ کر ایک غلط بات اُس سے منوا رہے ہو۔ وہ غریب ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ داغ دہلوی نے جو کہا ہے ؎

شکوی نہیں کسی کی ملاقات کی مجھے
تم جانتے ہو وہم ہے جس بات کی مجھے"

تکلیف

حفیظ جالندھری سر کے بالوں کے بارے میں "فارغ البال" ہیں۔ کسی خوش فکر دوست نے پوچھا:

"حفیظ صاحب! سر کے بال نہ ہونے سے کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی"

"تکلیف کیا ہوتی ہے ہے" حفیظ نے جواب دیا "البتہ وضو کرتے وقت یہ معلوم نہیں ہوتا کہ منہ کو کہاں تک دھونا ہے"

اعتراف وانکار

دلّی کے ایک ہند و پاک مشاعرے میں حفیظ صاحب اپنی غزل سنا رہے تھے، کہ فراق گورکھپوری نے دفعتاً بلند آواز سے کہنا شروع کیا:

"واہ حفیظ پیارے کیا گلا پایا ہے۔ یار میرا سارا کلام لے لو، اور اپنی آواز مجھے دے دو"

حفیظ نے فی الفور شعر کو ادھورا چھوڑ کر فراق سے کہنے لگے:

"جناب فراق صاحب! میں آپ کا نیازمند ہوں۔ میری آواز تو کیا آپ مجھے بھی لے لیجئے۔ لیکن خدا کے لئے مجھے اپنا کلام نہ دیجئے!"

نکتہ آفریں

دلّی کے انڈو پاک مشاعرے میں ساغر نظامی اپنی غزل سنا رہے تھے جب انہوں نے یہ شعر پڑھا کہ ؎

بہت تلخ تھی زندگانی مگر
گلوں گل رخوں میں بسر ہوگئی

تو حفیظ صاحب نے بے اختیار داد دیتے ہوئے کہا۔ سبحان اللہ کیا بات ہے بسر ہوگئی سے یہاں مراد ہے شیریں ہوگئی"

"میں نے زندگی میں کبھی شراب نہیں پی۔ البتہ ایک مرتبہ حیدر آباد میں جب میری طبیعت بہت اُداس تھی، ایک بے تکلف دوست نے مجھے جنجر پلائی۔
بعد میں معلوم ہوا کہ جنجر میں جن ملی ہوئی تھی"

(حفیظ)

چھوٹی صنعتیں
بڑی اہمیت
مغربی پاکستان کے طول و عرض میں گیارہ ہزار چھوٹی صنعتیں
مُلک میں معاشی ترقی و خوش حالی پھیلانے میں مدد دے رہی ہیں۔
مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کا
نصب العین ان چھوٹی صنعتوں کی سرپرستی کرنا
اور انہیں فروغ دینا ہے۔
پاکستانی مصنوعات
روزمرّہ استعمال میں لایئے
اور تحفہ کے طور پر دیجیے
مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن
NATIONAL 704 3
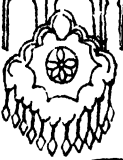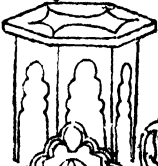
"SCISSORS"
میں قینچی سگریٹ پیتا ہوں
PAKISTAN TOBACCO COMPANY LIMITED SUCCESSORS TO W.D.&H.O. WILLS, BRISTOL & LONDON

یہ سائینس کی ترقی کا کرشمہ نہیں ہے
گولڈن
ایرو
گولڈن
راکٹ
گولڈن راکٹ
وضع، خوبصورتی اور
پائیداری کے لئے
قابل اعتماد نام ہے
آدم جی کاٹن ملز۔ آدم جی انڈسٹریز ڈویژن
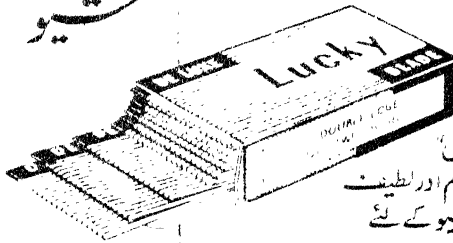
اتنا ہی
نرم اور
لطیف
لکی
شیو
Lucky
''لکی''
نرم اور لطیف
شیو کے لئے
لکی بلیڈ انڈسٹریز کراچی
PROGRESSIVE
LB/3 63

آئینہ خانے میں

- اخوتِ پاکستان
- حفیظ صاحب کی باتیں
- حفیظ۔ ایک جھلک
- میرا حفیظ
- حفیظ۔ ایک پیاری عظیم شخصیت
- حفیظ پہلی مرتبہ علی گڑھ میں
- حفیظ میری نظر میں
- پاک سرزمین کا نظام
- شاعرِ پاکستان
- نغمہ زار کا حفیظ
- بھیا

عبدالرحمٰن چغتائی

اخوّتِ پاکستان

ایک وہ زمانہ تھا اور اس بات کی تلاش رہتی تھی۔ کچھ ہو۔ بیکار سے بیگار بھلی والا معاملہ تھا! اپنی مصروفیتوں کا ثبوت دینے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا تھا۔ کئی رسالے، سالنامے اور مجلسیں بنا ڈالیں مگر جی نہ بھرتا تھا۔ آج میں ایک عدیم الفرصت آدمی ہوں جس کے اندر افسانے جنم لیتے ہیں تو اندر ہی اندر ختم ہو جاتے ہیں۔ انوکھے انوکھے موضوع سوجھتے ہیں، تحریر میں نہ آنے سے محو ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات تنقید پر قلم اٹھانے کو دل چاہتا ہے مگر خود ہی تنقید کا شکار ہو کر رہ جاتا ہوں اور تنقید کا رخ بدل جاتا ہے۔ فلم انڈسٹری کی حالت پر رونا آتا ہے تو پیتے ہی آنسوؤں کا زہر پی لینا پڑتا ہے۔ مسلمانوں کا اپنے فنون سے برتاؤ محض اور فنونِ ملک کی ریاکاریاں دیکھ کر جی بیٹھ بھی جائے تو اپنا سہارا لینا پڑتا ہے۔ دل تو چاہتا ہے۔ یہ ہو وہ ہو۔ پر چغتائی کس کس کو خوش کرے۔ ترکہ ہو یا ورثہ پھر رنگوں اور خطوں میں الجھ کے ان کے سلجھاؤ میں لگ جاتا ہے اور یہ بھی کہ اس میں میری بقا ہے۔ پھر میری تخلیق ہی تو میری مصروفیتوں کا ذریعہ ہے میں ایک عدیم الفرصت آدمی ہوں۔ مجھے میرے محبوب دوست مداح اور بلند نظر مصنفین۔ پبلشر اور رسالے والے بطور نذر کے اور بغیر کسی شرط کے وہ سب کچھ بھیجتے ہیں جو وہ ثقافتی قدروں کے لئے پیدا کرتے ہیں۔ میں ہر بار شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میرا ضمیر ہر گھڑی چاہتا ہے کہ ہر دوست کے تقاضوں کو پورا کروں۔ اپنی انسانیت کا ثبوت دوں مگر میں ایک ایسا عدیم الفرصت آدمی ہوا کہ ہر ممکن کوشش کے باوجود مجبور کا مجبور رہ جاتا ہوں۔ پھر بھی اپنی طرف سے خلوص کے اظہار کا موقع کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا جو کچھ انجام دے سکا انجام دینے میں کوتاہی بھی نہیں کی۔

افکار کے مالک اور ایڈیٹر اسی طرح دوسرے مالک اور ایڈیٹر اگر یہ جان جائیں کہ میں مضمون کیوں نہیں لکھتا۔ افسانے کیوں نہیں بھیجتا۔ میری مجبوریاں مجبوریاں ہیں تو وہ رسالے جو ادھر ادھر سے آجمع ہوتے ہیں۔ وہ تو رہے اور جو نہیں آتے وہ بھی آنے شروع ہو جائیں۔ میں ایک ایسی نعمت سے اور زیادہ مالا مال ہو جاؤں جس پر انسان جیتا ہے اور انسان کہلانے کا حق رکھتا ہے اس لئے بھی کہ میرے جاننے والے زندہ و تابندہ ہیں غالباً یہ احساس بھی میرے لئے امید افزا ہے کہ میرا بھی اخلاقیات میں کچھ حصہ ہے پاکستان کے آرٹ کا مستقبل۔ کبھی تجریدی آرٹ اور اس کے فنکار۔ کبھی اقبال کا مصور ایڈیشن۔ کبھی یہ کبھی وہ چغتائی سب کچھ دیکھتا ہے۔ سنتا ہے۔ جو وہ کہہ سکتا ہے کہہ دیتا ہے یہی کہ فرائض سے فرار گناہِ عظیم ہے میں عدیم الفرصت ہوتے ہوئے بھی واسطہ بلاواسطہ جو مجھے کہنا ہوتا ہے کہنے سے کبھی دریغ بھی نہیں کرتا۔ اپنی زبان اپنے الفاظ اپنی تحریر اور اپنی تکنیک میں جس سے میری انفرادیت مسلمہ ہے۔

"حفیظ نمبر" کو بھی بعض نمبروں کی طرح نظر انداز کر سکتا تھا۔ ٹال سکتا تھا مگر حفیظ کو کیسے ٹال سکتا تھا جو بھائی۔ دوست۔ عمر کے بہترین حصے کا بہترین ساتھی سب کچھ ہے ان کی سلامتی میں اپنی بھی سلامتی پوشیدہ ہے جن کی زندگی کا نصب العین اس روشنی کی تلاش رہی ہو جس سے انسان

سکہ رائج ہوتا ہے۔ حفیظ جالندھر میں پلا، پروان چڑھا۔ روزی کمانے کے لئے بڑے بڑے داؤ لگاتا رہا۔ کھیل کھیلتا رہا مگر جب لاہور پہنچا تو یوں مل جل گیا جیسے سارا بچپن اور ساری جوانی اکھٹی گزری ہے۔

حفیظ کے دو ساتھی مجھے یاد ہیں ایک ہری چند اختر دوسرا سلطان کھوسٹ مجھے کبھی حفیظ کے ان ساتھیوں سے نفرت نہیں ہوئی البتہ یہ خیال نہ چٹکیاں لیتا رہا ایک چھوڑ یہ دو ہم زاد پر اسرار تھیں تو ایک دوسرے کا ایک دوسرے پر جینا ضروری ہے ہوتے ہوتے حفیظ کے گرد ایک بار کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر تاثیر۔ پطرس بخاری۔ مجید ملک۔ سید امتیاز علی تاج، ڈاکٹر نذیر۔ بدر الدین بدر۔ غلام عباس۔ صوفی تبسم۔ حکیم یوسف حسن ایڈیٹر نیرنگ خیال کی بھی ایک اہم پوزیشن تھی۔ کبھی کبھار اس محفل میں ایم اسلم بھی نظر آجاتے تھے ہر ایک اپنا اپنا گلی ڈنڈا لے کر گلی کوچوں میں گلے پھاڑتا۔ آواز لگاتا مل کر یل دیں میدان گرم ہو جاتا ان دنوں ہر ایک کوئی ایسی داستان ساتھ لاتا ہو اتنی تازہ اور جدید ترقی پسندی کی حامل ہوتی تھی کہ سب کچھ بھول جاتا نہ گھر یاد رہتا اور نہ کوئی غرض سوائے ادب کے اور ایک ایسے ادب کے کہ جس میں بغاوت کا ہر پہلو نمایاں ہوتا۔ حفیظ کے سامنے ان دنوں صرف تخلیق کا ہی سوال نہ تھا بلکہ تخلیق کے لئے غذا حاصل کرنا اس سے کہیں زیادہ مشکل تھا۔ ان محفلوں کے لئے کوئی مقام مخصوص نہ تھا کبھی تاثیر کا گھر اکھاڑہ بنا ہے کبھی دفتر نیرنگ خیال اور کبھی میرے ہاں اودھم مچ رہا ہے اس قدر اودھم اور اس قدر شور اور قہقہے بلند ہوتے تھے کہ ہر بار یہی گمان ہوتا تھا ہاتھا پائی پر نوبت پہونچ گئی ہے ان محفلوں میں حفیظ ہر بار کوئی نہ کوئی نظم یا غزل سناتا اور داد حاصل کرتا تھا مجھے یاد ہے شاہنامہ اسلام کے اکثر حصے پہلی بار وہیں سنے اور حفیظ نے تنقید کا سامنا کیا۔

ان مجلسوں میں پطرس اور تاثیر بڑے ذہین اور پڑھے لکھے مطالعہ سے بے نیاز تھے ان کی یاد کبھی محو نہ ہوگی اور یہی دو شخصیتیں تھیں جن کی طنز اور تنقید نے حفیظ کے آرٹ اور شاعری میں انقلاب عظیم پیدا کیا اور حفیظ کو موقع ملا وہ اپنے ان جوہروں سے باخبر ہو جو اس کے اندر پختہ ہوتے جا رہے تھے جو وہ لے کر جالندھر سے لاہور پہنچ گیا تھا۔

حفیظ کی ساری زندگی میں روزی کے سوال کو بڑی اہمیت رہی ہے اور غالباً یہی کمزوری ہر آرٹسٹ کا ساتھ دیتی رہی ہے اور اسی سے ہر تصویر تکمیل پاتی رہی۔ ہے اور اسی سے آرٹسٹ کے اندر جوہر ابھرنے اور ناچنے لگتے ہیں اور وہ نالے۔ دریا اور سمندر چھان مارتا ہے باوجود خالق ہونے کے روزی کے لئے دربدری کبھی بشارت سے کم نہیں ــــ اپنے ساتھ کیا گزری؟ حفیظ کے ساتھ کیا گزری ــــ یہ اس نظام کے تحت ہے جس سے ہر قدم آگے کی طرف اٹھتا ہے اور انسان کبھی اپنے عزم سے مایوس نہیں ہوتا۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب لاہور میں مشاعرے اس شان اور طمطراق سے ہوتے تھے کہ ہر معزز شہری رونق محفل ہوتا تھا اور اپنی ذمہ داری یا میں یہ بھی ایک ذمہ داری سمجھتا تھا ایک مشاعرہ جس کی صدارت سر عبدالقادر فرما رہے تھے اس مشاعرے میں ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا حصہ ہو جہاں کا شاعر شریک نہ ہو، مرزا یگانہ، جگر مراد آبادی، اصغر گونڈوی، ساغر نظامی۔ سیماب اکبر آبادی۔ ڈاکٹر خالد۔ تاثیر پطرس۔ تاج محمد خیال۔ فاخر ہریانوی تاجور اور چھوٹے بڑے سبھی شاعر موجود تھے مگر اس مشاعرے میں جو عزت حفیظ کو حاصل ہوئی وہ اس کے عروج کا سنگ میل تھی اور وہ ایک ایسی تحریک کا سالار بن گیا کہ اس کی نقالی ہونے لگی۔ اس کی اٹھان اور شہرت نے چھوٹی چھوٹی بحروں اور سادہ سادہ الفاظ میں گیت لکھے، نظمیں کہیں۔ اتنی بلند ہمتی اور خود اعتمادی سے کہیں کہ آج اور ہمیشہ اردو ادب میں زندہ رہیں گی۔

پطرس اور تاثیر دو ایسی شخصیتیں تھیں جنہوں نے حفیظ کے آرٹ میں اپنے بے پناہ مطالعہ اور تنقید سے اور اس ہمدردی سے جو انہیں حفیظ کے آرٹ سے تھی اسے ایک ایسے رجحان کی طرف موڑ دیا کہ وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس کے پڑھنے میں اس کے سر فہرست آنے میں اپنا زور قلم اور تخیل صرف کرنے میں اسے کیا کچھ کرنا ہوگا تاثیر اور پطرس ہمیشہ اپنی فطرت سے مجبور اپنے بھرپور مطالعے، اپنے علم کی وسعتوں سے اسے مستقبل کی نظروں سے دیکھتے تھے اور ایک آدھ فقرہ طنزاً یا ارادۃً آوازے کے طور پر کس دیتے تھے کہ حفیظ تلملا اٹھتا۔ اس کے اندر طوفان اٹھ

کھڑا ہوا لیکن ہر دوسری نشست پر حفیظ کا اعتماد مضبوط ہوتا اور وہ جرأت سے اپنے پاؤں پر کھڑا نظر آتا۔ جالندھر کا آوارہ گرد روزی کی تلاش میں جالندھر کا روزی رساں بن گیا۔ الوالاثر حفیظ ملک الشعرا بن گیا۔ دیکھتے دیکھتے وہ کیا کچھ بن گیا۔ وہ جو دولت سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ میرے نزدیک اس آرٹسٹ کا فن بہت سی نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ روحانی خوشیاں، نفسیاتی خواہشات، اقتصادی بدحالی کا شکار ہوتے ہوئے بھی فطرت فیضان سے آرٹسٹ کو کبھی محروم نہیں رکھتی۔ غالباً اس واقعہ کی یاد ہی نے مجھے اس بات پر مجبور کر دیا ہوگا کہ اس واقعہ کو دہراؤں جس کی میری نگاہ میں بڑی اہمیت ہے ورنہ میرا کوئی مقام نہیں کہ میں اپنی بیکار الفاظی سے حفیظ جیسے بلند پایہ شاعر اور ادیب پر طبع آزمائی کروں جس کی ایجادات اور ندرت نے ہماری شاعری کا باب بدل ڈالا ہے ہم دوستوں نے زندگی کے بہترین دن اور بھرپور جوانی کے لمحے مل جل کر گزارے ہیں۔ میرا آرٹ ہو یا حفیظ کی شاعری ان کے پروان چڑھنے کے اسباب کتنے بھی مختلف ہوں پر ہیں وہی جن سے آرٹسٹ پلتا ہے۔ آرٹسٹ کے اندر اسی کا پیدا ہوتا ہے۔ آرٹسٹ آرٹسٹ کہلاتا ہے۔

آرٹ اور شاعری میں پھلنے پھولنے کے اسباب اور سامان یقیناً مختلف ہیں اور ان کو پروان چڑھنے کا ماحول بھی انہیں اپنی ضرورت کے مطابق ملتا ہے۔ وہ مراحل بھی جو اس کے سنگ میل تک ختم نہیں ہوتے۔ یہ واقعہ بھی انہی دنوں کا ہے جب میں اور میرا آرٹ پھلنے پھولنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ تنقید کے آرٹ نے میری اپنی زندگی میں ایک ایسا آہنگ پیدا کر دیا تھا کہ اپنی ناداری کے احساس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کا تجزیہ ضروری تھا جن کے بغیر اپنی ندرت۔ اپنی ذہنی بلندی اور انفرادیت بھینٹ چڑھتی نظر آتی تھی آرٹ جو کبھی کے لئے ایک نمائندہ زبان ہونے کی حیثیت رکھتا ہے ہر تہذیب و ملت سے اپنے مداحوں اور عقیدت مندوں کو تلاش کر لیتا ہے۔ ذاتی طور پر میرا ہندو اور سکھ دوستوں سے بڑا پیار تھا اور اتنا گہرا ربط تھا کہ بڑی بڑی اہم شخصیتیں میرے گرد جمع رہیں اور مجھے اس بات کا یقین دلاتیں کہ آرٹ کا مستقبل میرے ذمے ہے۔ میرے ماں پاپا پورن سنگھ۔ بھائی ویر سنگھ جی اور پروفیسر کشمیرا سنگھ بمعہ چند اور دوستوں کے جمع تھے یہ وہ شخصیتیں تھیں جن سے کسی قوم کا وقار بلند اور قوم قوموں میں شمار ہوتی ہے۔ وہ سب میرے بڑھتے ہوئے امکانات کے مدنظر جدید ہندوستانی آرٹ کے مستقبل کے متعلق نہ صرف خیال آرائی کرتے بلکہ بنگال اسکول کی صوبہ پرستی کی مذمت بھی کرتے اور کہتے ان کا مرکزی تصور سوائے بدھ مت کی ابدیت کے ادھر ادھر نہیں دیکھ سکا۔ پھر عمر خیام کا نظریۂ زندگی موضوع بن گیا۔ میں نے ترقی پسندانہ تحریک کے سلسلہ میں حفیظ کا ذکر چھیڑ دیا اور اپنے موضوع کو مشاعروں کی اہمیت سے تیز تر کر دیا۔ اب آرٹ کے ساتھ ادب بھی تاثرات کا حصہ بن گیا خصوصیت سے میرے آرٹ نے جب اہل نظر کی توجہ کو اپنی طرف موڑ لیا اور میری طرز نگارش ایک نیا موضوع بن گئی تو مجھے ہندوستان کے مختلف حصوں سے مبارک کے خط دھڑا دھڑ ملنے لگے اور میں نے چاہا کہ ہمارے ادیب بھی ان میں حصہ دار ہوں۔ آخر فیصلہ ہوا حفیظ کے پاس پہنچنا چاہئے چنانچہ میں اپنے غیر مسلم دوستوں کو لے کر حفیظ کے پاس جا پہنچا حفیظ ان دنوں لاہور میں میوہ منڈی کے قریب ایک مختصر سے مکان میں رہائش رکھتا تھا اور اسے اس کے اپنے الفاظ میں زندگی کو نبھانے کے لئے آٹے اور دال کا بھاؤ زبانی یاد تھا۔

جب ہم سب دوست حفیظ کے ہاں پہنچے تو حفیظ اپنی توقع کے خلاف یہ تمام دیکھ کر ان صورتوں سے کچھ پریشان سا نظر آیا۔ میں نے ایک ایک کا تعارف کراتے ہوئے کہا یہ میرے دوست خود بھی شاعر اور مصنف ہیں۔ دوست یہ وہ دوست ہیں جن کے وجود سے کسی قوم کی زندگی اور اس کی سلامتی کا ثبوت ملتا ہے۔

بھائی ویر سنگھ جی اور پاپا پورن سنگھ اردو فارسی جانتے تھے اور پنجابی اور انگریزی کے باکمال شاعر تھے انہیں حفیظ کے سینکڑوں اشعار زبانی یاد تھے اور یہی حال پروفیسر کشمیرا سنگھ کا تھا۔ حفیظ اپنی عادت کے مطابق اپنی بپتا کہتے رہے اور میں تائید کرتا رہا آخر کار نوبت یہ پہنچی کہ حفیظ دوستوں کو اپنے کلام سے مستفید کرے۔

شاعرانہ ماحول نظر آیا۔ بلند بلند خیالوں اور تصورات نے حفیظ کو حرکت دی اور ہمارا شاعر گرما اٹھا اور وہ اپنی انمول نظمیں اور گیت اپنے مخصوص

انداز میں اپنی لے میں پڑھنے لگا۔ اور وہ مرد مید ان وہ گوشے تلاش کرنے لگا جنہیں دا سے اس کی انفرادیت اور جمالیاتی حسن کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا آرٹسٹ کی قلبی واردات نے ہر سننے والے کو اپنا ہم نوا بنا لیا تھا۔ ویسے بھی حفیظ میں صلح پسندی کی چاشنی زیادہ ہے۔ وہ خوش آہنگ اور خوش طبع بھی ہے اس نے میرے دوستوں کو جواب اس کے گرویدہ تھے اپنا بنانے میں انہیں اپنے اس فن تقریب پایا جیسے وہ مدت سے ان کی تلاش میں تھا حفیظ نے جب یہ فقرہ پڑھا اور اسے دو تین بار دہرایا، یہ سنداب پٹنے کو ہے، تو پورن سنگھ اٹھ کر ناچنے لگا اور حفیظ کے الفاظ دہرانے لگا نزدیکیا سارا ہندوستان پٹنے کو ہے ایک ایک فرد ٹینے کو ہے حفیظ کو اپنے فن میں کبھی ناکامی نہیں ہوئی اثر کی شخصیت متاثر نہ کرسکے مگر اس کے تخیل کے آگے سر خم کرنا ہی پڑتا ہے۔

پطرس بخاری ہمیشہ آزادانہ تعریف بھی کرتے تھے لیکن بعض اوقات وہ ایسی شرارت پر اتر آتے تھے اور ایسی کمزوری کرید نکالتے تھے کہ داد دینے کو دل چاہتا تھا انہیں حفیظ کی مشرقیت اور معاشرے کی زبان ہونے کا یقین تھا پھر بھی ایسا اعتراض کر دیتے تھے کہ حفیظ اپنے ماضی کے سرمایہ پر ناز کرتے ہوئے بھی تلملا اٹھتا تھا تاثیر بخاری سے کہیں زیادہ پر خلوص تھا۔ حفیظ کو بیدار کرنے اور حفیظ کے لئے راہیں کشادہ کرنے میں اس کا بہت بڑا حصہ تھا۔ پھر بھی یہ دونوں کبھی کبھار یک زبان ہو کر کہہ دیتے تھے ابھی تیرے سیکھنے کے دن ہیں تجھے ریاضت اور محنت کی سخت ضرورت ہے میرے سکھ دوستوں نے خصوصیت سے پاپا پورن سنگھ نے حفیظ کو سن کر کہا تھا شاعرانہ متانت کے بغیر کوئی شاعر مقبولیت حاصل نہیں کر سکتا حفیظ نے پورن کی دنیا بدل ڈالی۔ اس کی حیثیت بین الاقوامی اس کے اعلیٰ تخیل کی مرہون منت ہے۔ میں اقبال کا بے پناہ مداح ہوں۔ میں نے ایسٹ اینڈ ویسٹ میں ان پر کئی مضمون لکھے ہیں۔ ایک کتاب بھی تصنیف کی ہے مگر شاعر حفیظ کی راہیں ان پابندیوں سے آزاد اور کشادہ ہیں۔

میرے نزدیک حفیظ اپنا ہے۔ وہ سب کا اپنا ہے۔ اس کے کلام کو دوام ہے اس نے اگرچہ مغرب کے نئے رجحانات اور ادبی سرمایہ کو ظاہرا نہیں چھوا مگر بھی وہ جدید اور ترقی پسند ہے اس نے فارم میں تبدیلیاں نہیں کیں میں اسنے بحریں بدلی ہیں اور اس کی صلاحیتوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حفیظ اپنے الفاظ اور محاوروں کا مسیحا ہے۔ ان میں اتنی گہرائی اور معنویت پیدا ہو گئی ہے کہ ضرب المثل بن گئے ہیں۔ کتنے شاعر اپنے حقیقی منصب کو سمجھتے ہیں اور ذمہ داریوں کو دیکھتے ہیں یہ ایک کامیاب انسان ہی دیکھ سکتا ہے۔ میرے خیال میں اگر حفیظ شاہنامۂ اسلام نہ لکھتا تو وہ اس سے کہیں زیادہ بلند پایہ شاعر ہوتا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ معیار پر پورا نہیں اترتا مطلب صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنے تخیل اور رجحان کو کسی اور موضوع کے کلام میں لاتا تو خدا جانے وہ کتنے جوہر اگلتا اور اس کی شاعرانہ مہارت کو کتنی بلندی حاصل ہوتی۔ جو اسے ہر بار واقعات کی تلاش اور جستجو میں نظر انداز کرنا پڑی)۔

میرے بس میں ہوتا تو میں اپنی تخلیق کا نصف خود حذف کر دیتا جو میرے فکر اور توجہ کو ذہنی ابہام کا شکار بناتی رہی۔ میری مصوری کا سرمایہ کردار کی تشکیل اور کردار کی اہمیت ہے۔ ہمیشہ مجھے کردار خاص حسن، اور خاص لباس میں نظر آتا ہے اور اس کے خد و خال میں بھی تفصیل کی تلاش رہتی ہے جو آرٹسٹ کے دماغی توازن اور باطنی جوہروں سے منسلک نظر آتے ہیں جو فرد اور جماعت کے تصادم سے پیدا ہوتے ہیں۔ خون جگر کی رنگینی۔ حسن کا بانکپن یہ سبھی کچھ ریاضت کم اپیل زیادہ نظر آتی ہے

جنگ عظیم اگرچہ اپنے پورے جلال پر تھی اور اس عذاب الٰہی کی شمع کچھ ٹمٹمانے بھی لگی تھی۔ انگریز طبقہ کو اپنی فتح کا یقین بھی ہوتا جا رہا تھا ایک رات کا ذکر ہے ہم نیاز مندان لاہور دہلی میں جمع تھے جہاں زبان تخیل اور شخصیتوں سے ارزاں بکتی ہے۔ رات کے بارہ بارہ سے ایک اور ایک سے دو تقریباً دو بجے کا وقت تھا اس محفل میں مولانا عبدالمجید سالک، پطرس بخاری، ذوالفقار بخاری، آغا حمید، عباس تیفی، تاثیر، حفیظ اور مجید ملک بھی موجود تھے حفیظ جب اس خاموشی میں اپنی بلند آہنگ آواز میں نظم یا غزل پڑھتا تھا تو سراہٹ پر یہ گمان ہوتا تھا کہ ابھی ابھی لوگ اپنے اپنے گھونسلے نکل کر اس بے ہودگی پر لعن طعن کرنے لگیں گے باتیں چلتے چلتے نغموں اور نغموں کی انشاط سے گزر کر بعید عقلی مسائل کی جگہ بھکڑ بازی نے لے لی۔ حفیظ کی رمز شناسی نے جوان دلوں خود بھی جنگ کو بھسم کرنے کا تریاق تلاش کر رہا تھا طنز اور مذاق کو مسخر سمجھ کر گرما اٹھا جیسے وہ برسوں سے بلا بھیجا بیٹھا تھا۔ دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے وہ اپنی نشست سے اٹھا اور مجھے خطاب کرتے ہوئے بولا۔ نظم لکھنے شعر کہنے سے ترجمہ کرنا کہیں مشکل ہے۔ یہ علم کے ناگ دیوتا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے یونہی دیکھتے ہیں گے تخلیق زندہ رہے گی اور خالق کے گن گاتی رہے گی۔

پروفیسر محمد منوّر

حفیظ صاحب کی باتیں

میرا خیال تھا کہ حفیظ صاحب کی غزل پر کچھ لکھوں ۔ پھر سوچا حفیظ صاحب کے کلام نظم و نثر پر لکھنے والے جہاں ان کے کئی عقیدت مند موجود ہیں وہاں خالص تنقیدی نظر سے پرکھنے والے نقاد بھی زندہ و سلامت ہیں ۔ میں کیوں نہ حفیظ صاحب کی چند باتیں قلمبند کر دوں ۔

شاعر کی گفتگو بھی ایک طرح سے اس کا غیر مطبوعہ کلام ہے ۔ قافیہ و اوزان کی قید نہیں ہوتی ورنہ شاعر خود تو بدستور موجود ہوتا ہے ۔ وہی خیالات و جذبات، وہی پسند و ناپسند، وہی مروت و تمکنت ۔ وہی خوبیاں وہی کمزوریاں ـــــ مطبوعہ کلام تو اہل نظر کے سامنے ہے ہی تھوڑا سا غیر مطبوعہ کلام میں نذر کرتا ہوں ۔

کاش حفیظ صاحب اپنے سوانح خود مرتب کرتے ۔ انہوں نے رنگا رنگ تماشے دیکھے بھی اور کئے بھی ۔ ان کے سوانح یقیناً دلکش، سبق آموز، ہمت افزا، ایمان افروز اور مسرت بخش ہوں گے ۔ پچھلی نصف صدی کی سیاسی، اجتماعی، ادبی اور دینی کشمکش ان کی نگاہوں کے سامنے رہی ۔ وہ ان ہنگاموں میں کہیں بلاواسطہ اور کہیں بالواسطہ شریک و سہیم رہے ۔ اگر وہ آپ بیتی جو یقیناً جگ بیتی کی آئینہ دار ہوگی حفیظ صاحب کے اپنے مخصوص اسلوب بیان کی خلعت فاخرہ میں جلوہ گر ہو تو لطف آ جائے ۔ حفیظ صاحب کا اسلوب نثر بیک وقت متین بھی ہے اور شگفتہ بھی ۔ اس میں خار بھی ہیں اور گل بھی ۔ خمار بھی ہے اور مستی بھی ۔ ظرافت بھی ہے اور طنز بھی، کہیں تیزی کہیں نرمی، کہیں دل آویز ٹھہراؤ کہیں شور انگیز بہاؤ ـــــ مرزا غالب کی نثر ان کے شعر کا جواب تھی حفیظ صاحب کی نثر ان کے شعر کی ہمسر ہے ۔

مگر بات تو حفیظ صاحب کی باتوں سے چلی تھی ۔ میں نے ذیل میں حفیظ صاحب کی چند باتیں قید تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے ۔ میرا حافظہ عرب راویوں کا سا نہیں ۔ لہٰذا حفیظ صاحب کے الفاظ اور جملے جوں کے توں لوح حافظہ پر ثبت نہ رہ سکے تاہم کوشش کی ہے کہ ان کے بیان کی روح مجروح نہ ہو ـــــ کیا پتہ راویوں کی عدم ثقاہت سے ڈر کر حفیظ صاحب کبھی خود ہی سب کچھ لکھ ڈالیں اور اپنی باتوں کو مسخ ہونے سے بچا لیں

اچھا تو سنئے !

پھاٹک والا

میں نے محکمہ انہار کی پانچ چھ سال نوکری کی تھی ۔ ایک روز باتوں باتوں میں حفیظ صاحب مجھ سے کہنے لگے " یار تم بھی بڑے ظالم واقع ہوئے ہو ۔ محکمہ انہار کی ملازمت کیوں چھوڑ دی ؟ وہ زندگی تو بڑی رومان انگیز ہوتی ہے ۔ ٹھکانا عموماً کسی نہر کے کنارے دیہاتی ماحول، خاموشی، درخت، سبزہ، رنگ رنگ کی فصلیں، سادہ بھولے بھالے ملاقاتی ۔ پرندوں کی نغمگی، حیوانوں کی مستی ـــ یہ سب کچھ چھوڑ کر شہروں کی تنگ اور انسانیت کے لئے باعث ننگ فضا میں آ گئے ہو ؟ ـ آخر کالج تو وہیں ہوں گے جہاں آبادی زیادہ ہوگی ۔ باقی محکموں کے ملازمین

تو کچھ کبھی شہر میں کبھی دیہات میں۔ اور نہیں تو دورہ ہی ہو۔ غیر پروفیسر تو دیہات سے بالکل کٹ کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا مزاج بڑا پکا شہری مزاج ہوتا ہے۔ عوام سے ان کا دور کا بھی کوئی لین دین نہیں ہوتا۔ یہی باعث ہے کہ پروفیسروں کی دنیا میں گھٹن ہوتی ہے۔ شہروں سے دور بھاگو منوّر، مناظر فطرت میں پناہ لو۔ اگر ملازمت کرنا ہے تو ــــ کیا بتاؤں میرے نزدیک کونسی ملازمت سب سے زیادہ دلکش ہے۔ اگر میرا بس چلتا تو میں کسی خاموش سی برانچ لائن پر ریل کا ــــ پھاٹک والا ہوتا ــــ میں جب بھی کسی ایسے پھاٹک والے کو دیکھتا ہوں تو بڑا رشک آتا ہے ــــ دیکھیں تو! خاموش سی لائن۔ دن میں کوئی دو تین گاڑیاں آئیں، پھاٹک بند کر دیا۔ پھاٹک کھول دیا ــــ کوارٹر کا ننھا سا کمرہ، چھوٹا سا صحن، کوئی ہمسایہ نہ پاسبان۔ نہ سائیکل والوں کی گھنٹیاں نہ تانگے والوں کی پیں پیں موٹروں ــــ نہ کسی خالق اولاد آدم کا غوغا ــــ کوارٹر کی بغل میں دو ایک سایہ دار درخت از قسم شیشم و بکائن لگا رکھے ہوں۔ ایک دو بکریاں پال رکھی ہوں۔ دونوں وقت ان کا تازہ دودھ نوش جان کیا جائے۔ چند مرغیاں ادھر ادھر کڑکڑا رہی ہوں ــــ کوارٹر کے قریب ہی چھوٹی سی کھوئی ہو جس میں سے حسب ضرورت ڈول ڈال کر پانی نکال لیا جائے۔ ٹھنڈا پانی۔ ڈول بھی اپنا، رسی بھی اپنی ــــ فارغ وقت میں غزل لکھی جائے، کہہ کر گائی جائے ــــ وسعتیں ہی وسعتیں۔ فراغتیں ہی فراغتیں ــــ"

کباب فروش

گزشتہ سرما کے دوران میں ایک روز حفیظ صاحب اور میں پرانے لاہور کی تنگ سڑکوں اور تاریک گلیوں میں ہوا کھا رہے تھے۔ ہوا کھانا اس لیے کہ کوئی خاص کام نہ تھا۔ حفیظ صاحب کو شاید کھانسی کا کوئی نسخہ سا بنوانا تھا جو ذرا سی دیر میں بن گیا۔ اس کے بعد ہم یہاں ــــ وہاں گھومتے چلے جا رہے تھے۔ حفیظ صاحب کبھی بتاشوں کا بھاؤ پوچھتے کبھی ریوڑیوں کا۔ کبھی دیسی کھانڈ کا اور کبھی کسی چھتری یا چھڑی کا ــــ پھر ہر دس قدم پر مجھ سے کہتے "میاں پروفیسر زندگی کتابوں کی الماریوں میں بند نہیں ہے اس بھاڑ جھونکنے والے کا حال آ کے دیکھو۔ یہ ہے اس کی امیدوں کا اکلوتا گھر ــ تھکے تو نہیں ہو؟ آج اتوار تھا تم چاہ رہے تھے کہ مجھ سے ہٹ کے دھوپ تاپوں گا۔ ہمارے ساتھ دوستی رکھو گے تو بس اسی طرح پیش کر دو گے چلو گے اور چلتے رہو گے ــ ویسے تھک جاؤ تو بتا دینا"

حفیظ صاحب اپنی لہر میں بولے چلے جا رہے تھے میں "ہاں، ہوں، بجا، صحیح، ٹھیک ہے، خوب، جی، کیوں نہیں" وغیرہ کے سہارے شریک گفتگو تھا۔ ایک مقام پر ایک دکان کبابوں کی نظر پڑی۔ حفیظ صاحب دکان کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ میں بھی کاندھا جوڑ کر "ٹک ٹک دیدم" کی تصویر بن گیا۔

حفیظ صاحب نے کباب فروش سے کہا "آپ کباب تیل میں تل رہے ہیں؟"

کباب فروش نے جلے بھنے لہجے میں جواب دیا "ہاں ہاں میاں جی تیل میں تل رہا ہوں مگر اس وہم میں مت پڑیے کہ یہ تیل ہے یہ اتنا ابل چکا ہے کہ اب گھی بن گیا ہے۔ لوگ ان کبابوں کو جوشاندے کے طور پر کھاتے ہیں۔ یہ کباب انفلوئنزا کا علاج ہیں۔ زکام تو ان کے سونگھتے ہی ہوا ہو جاتا ہے"

حفیظ صاحب نے پوچھا "آپ سیخ کباب بھی بناتے ہیں؟"

کباب فروش نے جل کر ارشاد کیا "بس صاحب یہی ہیں جو سامنے ہیں۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ میں نے دکھاوے کے لئے یہ رکھ چھوڑے ہیں اور کھلاتا سیخ کے کباب ہوں یا یہ کہ جن سے دشمنی ہے انہیں تلے ہوئے کھلاتا ہوں اور دوستوں کے لئے سیخ کے کباب چھپا رکھے ہیں ــ آپ میرے دشمن تو نہیں ــ یہ بھی نہیں کہ کسی کے خوف سے سیخ کباب چھپا رکھے ہوں۔ آپ نے کیسے فرض کر لیا ہے کہ میں آپ سے ڈرتا ہوں۔ میاں جی میرے پاس کباب کم ہوتے ہیں اور گاہک زیادہ ۔ گاہک زیادہ ہوتے ہیں اور بیٹھنے کے لئے جگہ تنگ ہے۔ بس کوئی۔۔"

کباب فروش کی گرم رفتاری جاری تھی کہ حفیظ صاحب نے مجھے کہنی ماری اور کہا "یہ کوئی میرا ہم مزاج معلوم ہوتا ہے ـ آؤ اس کے کباب کھائیں"

فلک بینی

حفیظ صاحب اور میں لاہور کے انارکلی بازار میں سے گزر رہے تھے۔ کیوں گزر رہے تھے یاد نہیں۔ غالباً بے سبب گزر رہے تھے انارکلی میں سے گزرنے والوں کی بھاری اکثریت بے سبب ہی گزرتی ہے۔ حفیظ صاحب اپنے شباب کی باتیں سنانے میں محو تھے "منور تمہیں معلوم ہے کہ مفلسی میں ہم نے کیا کیا عیاشی فرمائی ہے؟ محنت مزدوری سے جب فارغ ہوتے تو احباب ایک جگہ جمع ہو جاتے، میرے پاس جگہ ہوتی تو میرے یہاں، یا کسی اور کے یہاں۔ سب جمع ہوتے اور لایعنی نغمے الاپنے لگ پڑتے۔ تالیاں پیٹتے۔ ہنکارتے۔ مغلظ بکتے — خدا کی قسم یہ بڑی عیاشی ہے۔ وہ یاری بھی کیا یاری جس میں آدمی "گپت" نہ کر سکے۔

میں نے تائید کی۔ "بات تو ٹھیک ہے"

حفیظ صاحب چلتے چلتے رک گئے۔ میری طرف دیکھا اور کہا "یار منور! مان لو گے کہ حفیظ کبھی اتنا نڈر بھی تھا"

"کتنا؟" میں نے پوچھا

بولے "بارہا یوں بھی ہوا کہ میں، میرے چند احباب، سلطان کھوسٹ اور فلاں اور فلاں موسم گرما میں عین دوپہر کے وقت گھر سے نکل کر انارکلی بازار میں پہونچ جاتے اور از راہ شرارت توے کی طرح تپتی ہوئی سڑک پر بڑی بے تکلفی سے چار زانو بیٹھ جاتے اور بڑے انہماک کے ساتھ سبھی "یک نگاہ" آسمان کی ایک خاص سمت میں دیکھنا شروع کر دیتے۔ جو بھی ہمیں دیکھتا منہ اٹھا کے آسمان کو تاکنے لگ پڑتا۔ دیکھا دیکھی دیکھنے والوں کا ہجوم سا ہو جاتا اور ہم آہستہ سے اٹھ کر چپ چاپ چل دیتے — سو ڈیڑھ سو قدم چل کر پھر بیٹھ جاتے۔ منہ آسمان کی طرف کسی خاص سمت ہوتا اور کھو جاتے — پاس سے گزرنے والے یکے بعد دیگرے بے اختیار ہماری نگاہوں کے تعاقب میں نگاہیں دوڑانے لگ پڑتے — اور ذرا سی دیر میں بھیڑ لگ جاتی چنانچہ ہم بڑی بے نیازی سے بیٹھ جھاڑتے ہوئے اٹھتے سو قدم آگے جا بیٹھتے — تمہارا کیا خیال ہے۔ سڑک گرم نہ ہوتی تھی؟ گمنامی میں کیا آزادیاں تھیں — اب انارکلی بازار میں ایک پر نشست جما کے "کار فلک بینی" کیوں کر ممکن ہے؟ اب میں تنہا حفیظ نہیں حفیظ جالندھری ہوں۔ اپنی شہرت اور وقار کا زندانی —"

شعر بزور علم

حفیظ صاحب کا اسلوب شعر عموماً سہل ممتنع ہے۔ وہ سادہ بات سادہ الفاظ میں کہنا پسند کرتے ہیں۔ شوخی و ندرت ادا انکا سب سے زیادہ کارگر حربہ ہے۔ چنانچہ خواہاں رہتے ہیں کہ دوسرے بھی سادہ نگاری کو اپنا شعار بنائیں حالانکہ ہر اسلوب بیان اپنے خالق کی شخصیت اور مزاج کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ وہ شے نہیں جو ادھار لی جا سکے۔ اصولاً یہاں وہ قائل ہو جاتے ہیں تاہم اس پر مصر رہتے ہیں کہ جذبے کی زبان پیچیدہ نہیں ہونی چاہئے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ لوگ جن کی شاعری کا غالب عنصر جذبہ ہے مشکل پسند نہیں ہو سکتے

ایک روز میں نے اپنا ایک شعر سنایا — سن کے چپ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد اپنے مخصوص طنزیہ لہجے میں بولے "شعر کا مفہوم میرے ناقص خیال کی رو سے کچھ یوں ہے۔ ٹھیک ہے؟" میں نے جواب دیا "بجا" اس پر کہنے لگے "تو پھر اسی طرح صاف کیوں نہیں کہتے جس طرح معنی بیان ہوئے۔ اتنے پیچ کیوں ڈالے ہیں۔ مولانا گرامی مجھ سے یہی کہا کرتے تھے کہ شعر کو اپنے علم کا ترجمان بنانے کے بجائے جذبات کی زبان بناؤ۔ کبھی میں کسی شعر میں استادی دکھاتا تو مولانا پوچھتے "کہنا کیا چاہتے ہو" میں عرض کرتا "میرا مقصود تو یہ ہے" اس پر فرماتے "تو پھر اس طرح کیوں نہیں کہتے" وہ بارہا فرمایا کرتے تھے کہ بعض لوگ جذبات کی مدد سے شعر کہتے ہیں اور بعض علم کے زور پر — علامہ شبلی کی شاعری ملاحظہ ہو — ان کی شاعری جذبے سے زیادہ علم کی عطا ہے" میں نے کہا "مجھے اس مسئلہ میں آپ سے بھی جزواً اختلاف ہے اور مولانا گرامی سے بھی مولانا شبلی کی فارسی غزلیں علم کی عطیہ ہیں یا جذبے کا فیض؟"

حفیظ صاحب بولے "تم بھی علامہ شبلی کی طرح عربی الفاظ سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہو یعنی علم کے زور پر شاعر بننا چاہتے ہو اس لئے ان کی مدافعت پر ڈٹ گئے ہو"

اضطراب

حیرت ہے کہ اتنے بڑے شاعر ہونے کے باوصف حفیظ صاحب اپنے اوپر خواہ مخواہ کی بے نیازی طاری نہیں کرتے ورنہ دیکھا یہ ہے کہ جو عزیز یا بزرگ ذرا بھی شاعری میں مبتلا ہو گیا اس نے بہت سی رعایات اپنے لئے خود محفوظ کرلیں۔ وعدہ کرنا اور بھول جانا، خط کا جواب نہ دینا، کوئی کام اپنے ذمہ لینا تو ٹال جانا۔ اپنے دکھ کے گھمنڈ میں دوسرے کے غم میں شریک نہ ہونا۔ ہر دم نازک مزاجی کی ردا اوڑھے پھرنا، ہر دم تکلف کا پل صراط عبور کرتے دکھائی دینا وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ مگر حفیظ صاحب کا عالم یہ ہے کہ اگر وہ کسی عزیز یا بزرگ کی فرمائش پر کوئی ذمہ داری قبول کرلیں تو جب تک وہ انجام پذیر نہ ہو۔ انہیں ہرگز چین نہیں آتا۔ خط کہیں سے اور کسی کی طرف سے بھی آجائے جواب فوراً دیدیتے ہیں اور مفصل — کوئی ملاقاتی آکر دروازے پر آواز دے یا گھنٹی بجائے تو محاًبتہ لیتے ہیں۔ اگر کوئی ملازم یا عزیز پاس نہ ہو تو خود بھاگتے ہیں۔ واقعی بھاگتے ہیں۔ شیو بنا رہے ہوں تو برش ہاتھ میں ہوتا ہے، منہ پر جھاگ چپکی ہوتی ہے اور وہ اوپر سے جھانک کر فرماتے ہیں "آئیے۔ آجائیے" کھانا کھا رہے ہوں تو لقمہ منہ میں ہوتا ہے اور ملاقاتی کی اطلاع پاکر اٹھ بھاگتے ہیں

اب مصیبت یہ ہے کہ وہ جواباً ہر شخص سے اسی ذمہ داری اور شدت احساس کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان کے حکم کی تعمیل فوراً ہونی چاہیے خط کا جواب فوراً ملنا چاہیئے۔ وہ کسی کے گھر پر جائیں تو صاحب خانہ کو فوراً حاضر ہونا چاہیئے ورنہ حفیظ صاحب رنگ رنگ تو ہمات میں مبتلا ہو جایا کرتے ہیں۔

خاص طور پر اگر وہ کسی عزیز کے گھر پہونچیں اور وہاں للکار پکار یا گھنٹی کی جھنکار پر لبیک کی صدا میں دیر ہو جائے تو بگڑ کر چل دیتے ہیں بعض اوقات چلتے چلتے کچھ تبرکات بھی فی البدیہہ ارشاد کر دیتے ہیں مگر جو انہیں جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ یہ غصہ تیز ہوا کا جھونکا ہے ادھر آیا ادھر گیا۔ اور گالیوں کے بارے میں ان کا اپنا ارشاد ہے کہ "یہ کثرت استعمال کی وجہ سے بے معنی ہو گئی ہیں"

ایک روز ان کے ایک نہایت عزیز دوست نے جو پنجاب یونی ورسٹی میں ایک شعبے کے صدر ہیں، حفیظ صاحب کی موجودگی میں ذیل کا واقعہ سنایا۔

حفیظ صاحب گھر پر تشریف لائے۔ میں غسل خانے میں تھا۔ میری والدہ محترمہ نے دروازے پر جاکر کہا "ذرا سی دیر انتظار فرمائیں" چار پانچ منٹ گزر گئے۔ حفیظ صاحب نے تاؤ کھا کے للکارا "او ڈاکٹر۔ او ڈاکٹرا" میں غسل خانے سے نکلتا تو مجھے کوئی اطلاع دی جاتی۔ والدہ بیچاری پھر دروازے پر تشریف لے گئیں اور پھر کہا "آپ چند منٹ انتظار فرمائیں وہ ابھی آتے ہیں"

اب حفیظ صاحب کا پارہ چڑھ چکا تھا۔ لہٰذا بڑے طنزیہ لہجہ میں پورے ادب کے ساتھ میری والدہ سے کہا "اماں جان اگر اسے اندر ہی بٹھانا تھا تو بیٹی جن لینا تھی۔ بیٹا کاہے کو جنا تھا؟" — اور چلے گئے۔

چندہ اندوز انجمنیں

محفل گپ جمی تھی۔ حفیظ صاحب فرما رہے تھے کہ شاعری اور مشاعرہ بازی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص بڑا اچھا شاعر ہو مگر مشاعرہ باز نہ ہو۔ میں شاعر بھی ہوں اور مشاعرہ باز بھی — مگر یار بعض مشاعرہ کرانے والے بھی وہ شاعر باز دیکھے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ دعاؤں کا سارا محفوظ ذخیرہ نذر کرکے بلکہ اختراع "دعا" کی جملہ صلاحیت کام میں لا چکنے کے بعد بھی احساس یہی رہتا ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

بات چلتی رہی۔ اسی ضمن میں فرمایا کہ برعظیم پاک و ہند کی شاید ہی کوئی اہم انجمن اسلامیہ ہو جہاں مجھے نہ بلایا گیا ہو اور جس کے لئے میں نے چندہ جمع نہ کیا ہو — قوم نے میری اپیل پر لاکھوں روپے مختلف رفاہی اداروں کے لئے دیئے ہیں لیکن اس منزل میں بھی بعض اوقات عجیب لطیفے پیش آتے تھے مثلاً ایک بار قصور کی کسی اسلامی انجمن کے کوئی کرتا دھرتا میرے پاس لاہور آئے اور التجا کی کہ میں فلاں تاریخ کو ان کے ساتھ قصور جانے کے لئے تیار رہوں کوئی جلسہ چندہ اندوزی منعقد ہونے والا تھا۔

میں نوجوان تھا اور ابھی لاہور آئے زیادہ مدت بھی نہ گزری تھی تاہم میں خاصا مشہور ہو چکا تھا۔ آخر وقت مقررہ آن پہونچا اور میں نے اس شخص کے ہمراہ قصور کا رخ کیا۔ لاہور اسٹیشن پر اس بھلے مانس نے میرے لئے لاہور۔ قصور کا واپسی ٹکٹ خریدا اور میرے حوالے کر دیا۔ جب ہم قصور پہونچے تو شام ڈھل چکی تھی۔ خاصا ہجوم میرے استقبال کے لئے موجود تھا۔ میرے گلے میں ہار ڈالے گئے۔ میرا جلوس سا نکالا گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں تو تو بڑا آدمی ہوں مگر کسی نے نہ کچھ کھلایا نہ پلایا۔ بس ہاتھوں ہاتھ جلسہ گاہ میں پہنچا دیا۔

جلسہ آدھی رات تک جاری رہا۔ میرا بھوک کے باعث برا حال تھا مگر اس خیال سے بجوش و خروش نظمیں اور نعتیں سناتا رہا کہ جلسہ ختم ہوتے ہی بڑی معتبر ضیافت میں مجھے مہمان خصوصی ہونا ہے۔ میں بھوکے بٹیر کی طرح خوب لڑا۔ خوب چندہ جمع کرایا — بلا مبالغہ کئی ہزار روپے جمع ہو گئے۔ مگر جب جلسہ ختم ہوا تو کسی نے میز اٹھائی کسی نے میز پوش۔ کسی نے روپوں کی گٹھڑی سنبھالی اور کسی نے شیشے کا جگ اور گلاس قبضے میں لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پنڈال اور اسٹیج خالی ہو گیا — دری قنات والوں نے دریاں قناتیں تہ کرنا شروع کر دیں۔ میں اکیلا بے یار و مددگار کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ابھی مجھے کوئی لینے آئے گا۔ باہر میری سواری کا بندوبست ہو رہا ہوگا، مگر جب چند لمحے گزر گئے تو میں نے اسٹیج سے اترنا چاہا، دیکھوں تو جوتا غائب ہے — دری قنات والوں سے پوچھا کہ "جلسے کے منتظمین کہاں ہیں؟" جواب ملا "ہمیں کیا معلوم"

خیر ننگے پاؤں جلسہ گاہ سے بعد آن بان نکلا۔ مارے بھوک کے نڈھال ہو رہا تھا۔ جیب میں کل خزانہ ایک روپیہ اور چند آنوں پر مشتمل تھا — ایک شیر فروش کی دوکان پر پہونچا۔ وہ کڑاہ مانجھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا "کچھ کھلا پلا دو یار میں بھوکا ہوں۔" اس نے میری طرف دیکھا، پھر دیکھا اور کہا "وہاں اللہ تھوڑی دیر پہلے آپ ہی گا رہے تھے نا؟" میں نے اقبال جرم کر لیا "ہاں میں ہی گا رہا تھا مگر کوئی ڈبل روٹی دودھ کچھ ہے؟" اس نے دہی کے لئے جو دودھ ابھی کونڈوں میں جمایا تھا اس میں سے کچھ نکال دیا۔ میں نے زہر مار کیا۔ پیسے ادا کئے اور سوچنے لگا کہ کیا کروں، کہاں جاؤں؟ — شیر فروش ہی سے پوچھا کہ لاہور کو گاڑی کتنے بجے جاتی ہے اس نے بتایا کہ صبح پانچ بجے کے اردگرد جاتی ہے — گرمی کے دن تھے۔ میں ننگے پاؤں اسٹیشن پر پہنچ کر ایک بنچ پر لیٹ گیا۔ اپنی حالت پر ہنسنے بغیر کوئی چارہ نہ تھا مگر ہنسا بھی نہ جاتا تھا۔ چار بج گئے۔ صبح کاذب نے صبح صادق کا روپ دھارنا شروع کیا۔ گاڑی کا وقت ہو گیا۔ پلیٹ فارم پر چہل پہل شروع ہو گئی — دو نوجوان میرے پاس سے گزرے، مجھے بنچ پر بحال زار بیٹھے دیکھ کر ایک نے دوسرے سے کہا "یار یہ وہی تو نہیں جس کا کل شام جلوس نکلا تھا۔" دوسرا بولا "ہے تو وہی"

گاڑی آ گئی۔ میں ننگے پاؤں سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اہل قصور نے واپسی کا ٹکٹ لے دیا تھا۔

لاہور اسٹیشن پر اترا اور سب سے پہلے لنڈے بازار کا رخ کیا۔ وہاں سے چند آنوں میں سیکنڈ ہینڈ جوتا مل جانے کی توقع تھی

بحضور رسالت مآب

گزشتہ نومبر میں حفیظ صاحب اور میں لاہور میں ایک کرم فرمائے محترم سے مل کر ٹاؤن کی طرف لوٹے۔ رات کے دس بجے کا عمل ہوگا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ لاہور میں فروری اور نومبر کی چاندنی نا معی بے ایمان ہوتی ہے۔ حفیظ صاحب موڈ میں تھے۔ لہرا لہرا کر باتیں کر رہے تھے وجہ یہ تھی کہ ہم جن کرم فرما سے مل کر آ رہے تھے ان کا اسم گرامی جسٹس محمد رستم کیانی ہے۔ کیانی صاحب کی باغ و بہار باتیں دل و دماغ پر بدستور خوشبوئیں چھڑکائے جاری تھیں حفیظ صاحب خوش تھے بہت خوش۔

جب ہم حفیظ صاحب کی "اسٹیٹ" میں داخل ہوئے تو حفیظ صاحب چلتے چلتے رک گئے اور معاً سنجیدہ ہو کر مجھ سے کہنے لگے "منور یار غور تو کر و حفیظ کیا تھا کیا بن گیا۔"

حفیظ ساتویں جماعت سے بھاگ گیا مگر شاعر اسلام حسان الملک اور فردوسیٔ اسلام کہلایا۔ غریب تھا۔ ریلوے اسٹیشن سے باہر قلیوں کی طرح لوگوں کا سامان اٹھایا کرتا تھا اب ملا جلا کر دو ہزار تنخواہ پاتا ہے۔ مستقل وظیفہ الگ ہے — ابھی لڑکا تھا۔ گھر چھوڑنا پڑا۔ سر چھپانے کو جگہ نہ تھی۔ اب ایک کوٹھی یہ ہے ایک کوٹھی وہ ہے۔ ایک لان، دوسرا لان، یہ درخت، وہ پھول — حفیظ ایک گمنام بھگوڑا تھا مگر اس کی شہرت

برعظیم پاک و ہند کی حدود کو عبور کرکے بیرونی ممالک میں پہونچ گئی۔ اس کا کلام منبر پر پڑھا گیا۔ ریڈیو پر الاپا گیا۔ محفلوں میں گایا گیا۔ حفیظ کو خانقاہوں میں بلایا گیا۔ اس کو درباروں میں ممتاز مقام پر بٹھایا گیا — منور یار اللہ نے یہ سب مجھے کیوں عطا کردیا؟ اس کا سبب فقط ایک ہے اور وہ یہ کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیوا ہوں — اور لطف یہ ہے کہ یہ نام بھی گلے کے اوپر ہی اوپر سے نکلتا رہا۔ اگر یہ نام دل کی گہرائیوں سے نکلتا تو میں نہ جانے کیا ہوتا — اور پھر بڑے جذبے کے ساتھ نعرہ زن ہوئے ع

ہو جاؤں میں گم اور مجھے پائیں محمدؐ

کشمیر کشمیر حفیظ صاحب کی دکھتی رگ ہے۔ کشمیر کا ذکر آتے ہی اداس ہو جاتے ہیں۔ آہ کھینچتے ہیں اور کہتے ہیں "یار ہم نے یا شئے کھو دی۔ میں نے کشمیر کے فردوس کی ہمیشہ یوں سیر کی ہے جیسے کوئی ننھا بچہ اپنے باغ میں پھولوں کے تختے پر کود پھاند رہا ہو۔ کشمیر نے میرے کلام کی کس کس طرح پرورش فرمائی ہے میں کیا بتاؤں؟ کیا میری منظر نگاری کا بہت بڑا حصہ کشمیر سے متاثر نہیں معلوم ہوتا؟ — اور پھر کشمیر کی ہر تصویر کو اور تصویر کے ہر پہلو کو میری طرح کسی دوسرے نے کب اجاگر کیا ہے؟

ان کے لئے کشمیر کا نام سرد ہوا سی کی طرف سے گویا محبت کا پیام ہوتا ہے۔ انہیں وہ وارفتگی یاد آجاتی ہے جو گلمرگ کے برف بردوش تودوں میں مدتوں پہلے پانی میں غرق ہو چکی ہے۔ انہیں وہ شوق آوارہ یاد آجاتا ہے جو کبھی گلشن کشمیر کا بلبل خوش نوا تھا۔

ایک دن باتوں باتوں میں کہنے لگے "کشمیر کا جہاد باقی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میری زندگی ہی میں کشمیر آزاد ہو جائے۔ راہیں کھل جائیں اور میں وہاں پہونچ کر ایک بار پھر چہچہاؤں اور اگر خدانخواستہ میری قوم غافل رہے۔ اور میں آزادی کشمیر سے قبل فوت ہو جاؤں تو مجھے سرحد کشمیر پر لے جا کے دفن کر دیا جائے۔ کسی ایسی جگہ جہاں سے "وادی" قریب تر ہو۔ میری قبر کشمیر سے میری لازوال محبت کی نشانی ہوگی — میری قبر جہاد کشمیر کی نعرہ فانی للکار ہوگی — یہ میری وصیت ہے، یہ وصیت میرے سب دوستوں تک پہنچا دو۔"

"سب بچے گھروندے بناتے ہیں۔ اپنے ارد گرد جو کچھ دیکھتے ہیں، اپنے تخیل کی بساط پر ننھے ننھے ہاتھوں سے اپنی انفرادیت کو اپنے شوق میں سمو کر ریت، کنکر یا تنکوں کی تعمیریں اٹھاتے ہیں — ان تعمیروں کو اپنی تخلیق گردانتے ہیں۔ خود بار بار ان کو دیکھتے اور سنوارتے بناتے ہیں۔ دوسرے ہمجولیوں کو دکھاتے ہیں، بہیرا دیر بیٹھ رہتے ہیں، اور داد پر خوشی کے نعرے لگاتے ہیں۔ پھر — پھر بھول جاتے ہیں۔"

(حفیظ)

میجر سید ضمیر جعفری

حفیظ - ایک جھلک

حفیظ کا ایک شعر ہے ؎

تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے دوچار برس کی بات نہیں

ظاہر ہے کہ اس قصے میں شاعری ہی نہیں، شاعر بھی شامل ہے۔

میں نے اس "قصے" کو پہلی مرتبہ دُور سے انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسے میں دیکھا تھا۔ جو سنہ ۱۹۳۲-۱۹۳۳ء میں نواں کوٹ (لاہور) کے یتیم خانے میں منعقد ہوا تھا۔ بہت بڑا اجتماع تھا۔ جس میں لاہور کے بھی اور باہر سے آئے ہوئے بھی بڑے بڑے لوگ بہت بڑی تعداد میں موجود تھے۔ حفیظ ڈائس کے قلب میں بڑے لوگوں کی صف میں براجمان تھے۔ میں اپنے تین چار ہم سبق طلبائ کے ساتھ ڈائس کے میمنہ یا میسرہ میں ایستادہ۔ وہ جالندھر سے اشعار کا گلدستہ لائے تھے۔ اور میں گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم سے اسکاؤٹوں کا دستہ۔ وہ قوم کو شعر سنانے اور ہم قوم کی دریاں بچھانے کرسیاں جمانے، شامیانے اٹھانے کے لئے آئے تھے۔

حفیظ کی منظوم تاریخ ہند ان دنوں ہمارے مدرسے میں بڑی رغبت سے پڑھی جاتی تھی۔ کہانی کی کہانی، تاریخ کی تاریخ اور نغمے کا نغمہ۔ ہفتہ وار "پھول" لاہور کے ذریعے ہم ان کی رواں دواں، لہراتی گاتی ہوئی معصوم اور البیلی نظموں کی لذت سے بھی آشنا ہو چکے تھے۔ اور ان کی شاعری کے گرویدہ تھے، مگر ان کی صورت سے ناآشنا تھے۔

جلسے کی یہ صورت تھی کہ جب کوئی اچھا خطیب منبر سنبھالتا تو لوگ سنبھل کر بیٹھ جاتے ورنہ اونگھنے لگتے، یا باہر ٹہلنے کو نکل جاتے، پانی پینے لگتے، یا پھر کچھ ایسی بے دلی سے بیٹھے رہتے کہ ؏

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

چند تقریروں کے بعد جن میں چندے کی وصولی کا ہر وار صاف خالی چلا گیا تھا۔ سکریٹری صاحب نے ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری کا نام پکارا۔ ہم جہلم کے اسکاؤٹ ہمہ تن چشم نگراں بن گئے کہ دیکھئے کس طرف سے کس طرح کا حفیظ نکلتا ہے۔ مگر جب لمبوترے سے چہرے کا ایک دبلا پتلا جوان شخص جس نے بھورے رنگ کی پتلی سی

شیروانی کے ساتھ سر پر اونچی دیوار کی لال رومی ٹوپی جما رکھی تھی، دو کتابیں اٹھائے ہوئے کرسی سے اٹھا۔ سچ یہ ہے کہ ہم جہلم کے صورت ناآشنا اسکاؤٹوں پر اوس پڑ گئی۔

"اچھا تو یہ ہیں حفیظ صاحب،"

"لو دیکھ لو اپنا حفیظ جالندھری، ابو الاثر وغیرہ"

"بھئی یہ تو نہایت مایوس کن ہیں"

"کاش یہ حکیم مومن خاں مومن والی ٹوپی ہی پہن آتے"

"دور کے ڈھول سہاونے"

تاہم جی ہی جی میں ہم سب بہت خوش تھے کہ حفیظ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ تو لیا۔

ادھر حفیظ صاحب کا نام سنتے ہی لوگوں نے زور شور سے تالیاں بجائیں۔ تحسین و مسرت کے نعرے بھی لگائے۔ ٹہلنے والے دوڑ کر پنڈال میں واپس آگئے۔ اور پھر یک بارگی ہزاروں انسانوں کے ہجوم پر ایسا گہرا اور گمبھیر سناٹا طاری ہو گیا کہ اس سے پہلے ہم نے ایسا سناٹا نہ کبھی دیکھا تھا نہ کبھی سنا تھا۔ کرسی والے کرسی، اور دری والے گردنیں بڑھا کر یوں ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گئے کہ ہمارے کنگ اسکاؤٹ جمشید کے بقول اگر اس وقت تھالی پھینکی جاتی تو وہ انسانی سروں کے اوپر پھسلتی ہوئی مرزنگ میں جا گرتی۔

حفیظ نے شاہنامۂ اسلام سے جنگ، بدر کا پارہ سنانا شروع کیا۔ روح میں بھڑکتی ہوئی آگ تھی جو اس شخص کے شعلۂ آواز سے ٹوٹ ٹوٹ کر قلوب میں سوز و گداز، درد و جذب، عزم و عزیمت اور نور و سرور کی کیفیت بھر رہی تھی۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت حمزہ کے معرکۂ جہاد کی زندگی کی آنچ سے دہکتی ہوئی منظر کشی پر ہجوم کس طرح تڑپ اٹھا تھا۔ پورا جلسہ جب سمٹ کر حفیظ کی مٹھی میں آگیا تو یہ حضرت دفعتاً خاموش ہو گئے — چاروں طرف ایک خاص فاتحانہ انداز سے مسکراتے ہوئے دیکھا۔ پھر نظم چھوڑ کر نثر میں انجمن کی مالی امداد کی اپیل کی جو اپیل سے زیادہ دھمکی تھی کہ جب تک پچاس ہزار روپیہ جمع نہ کر دیا جائے گا، میں آگے نہ چلوں گا۔ یہ سن کر ہمارا کلیجہ دھک سے رہ گیا کہ حفیظ نے ناحق خود کو اور ایک غریب قوم کو آزمائش میں ڈال دیا۔ مگر ہوا یہ کہ چاروں طرف سے سیم و زر کی بارش شروع ہو گئی۔ عورتوں نے زیور اتار اتار کر اسٹیج پر ڈھیر کر دیئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے قوم نے حفیظ صاحب کی شرط پوری کر دی۔

یہ تھی اس "قصے" سے میری پہلی شناسائی۔ اور گذشتہ ربع صدی سے یہ قصہ برابر میرے سامنے ہے بلکہ پچھلے پندرہ سولہ برس سے تو گویا میں خود بھی اس قصے میں شامل ہوں کہ اس پورے دور میں کسی نہ کسی طرح ان کے قریب رہنے کا اتفاق مجھے ہمیشہ حاصل رہا ہے اور اس طرح حاصل رہا ہے کہ ع

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے!

حفیظ اس دور کی ایک اہم اور قیمتی شخصیت ہیں۔ ادب کے واسطے سے حفیظ نے زندگی کو اتنا کچھ دیا ہے کہ موت اب ان کو مار نہیں سکتی۔ ان کے فن و فکر کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی —

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت!

میں یہاں ان کی زندگی اور شخصیت کی دو ایک ان خصوصیات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں، جن سے اگرچہ حفیظ کی کی پوری شاعری روشن ہے۔ مگر عامۃ النّاس شاید پوری طرح واقف نہ ہوں۔ ظاہر ہے یہ تذکرہ بھی مختصر اور تشنہ ہوگا کیوں کہ حفیظ کی شخصیت ان کی شاعری کی طرح وسیع اور رنگا رنگ ہے۔ ع

سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لئے

شعر سے ان کا اخلاص بلکہ عشق اور فن پر محنت و جگر کاوی جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں، دو چیزیں حفیظ کی زندگی میں بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔ شاعری ان کو خاندان سے نہیں، فطرت سے ورثے میں ملی۔ اسی کے عشق میں وہ مدرسے سے بھاگ نکلے اور اسی کی لگن میں وہ زندگی بھر تحصیل علم میں کوشاں رہے۔ بظاہر وہ خواہ ہزار طرح کے علائق دنیوی میں الجھے ہوئے نظر آئیں، اندر خانے وہ ہر وقت کسی نہ کسی شعر میں الجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ لاکھ نفع ہو، کبھی کوئی ایسا کام کرنا پسند نہ کیا۔ جو مذاقِ سخن کی پرورش میں حائل ہو جائے۔ شاعری کے "کاروبار شوق" میں ایسے منہمک ہوئے کہ اپنا کاروبار چوپٹ ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی بعض ذاتی پریشانیوں کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ وہ گھر بار کے دھندوں کی طرف بہت ہی کم توجہ دیتے ہیں۔ ان کی طبیعت ادھر آتی ہی نہیں۔

زندگی بسر کرنے کے بارے میں ان کی دلی تمنّا جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں، وہ یہ ہے کہ ــــ

دامانِ کوہ میں اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

بلکہ پانچ چھ جھونپڑے ہوں۔ ایک میں حفیظ صاحب خود فروکش ہوں۔ ایک میں بال بچے۔ ایک دو چھپروں میں گھوڑی، بھینس، بکری وغیرہ اور باقیوں میں حلقۂ اربابِ ذوق یعنی احباب ہم مذاق و ہم جلیس۔ جھونپڑے دامانِ کوہ میں تو ہوں مگر سامنے کوئی خوب صورت زمرّدیں وادی بھی ضرور کھلنی چاہئے اور اتنی کھلتی چلی جائے کہ کسی قصبے یا شہر میں جا کر بند ہو۔ قرب و جوار میں شیریں چشمے جاری ہوں۔ چشموں پر گھنے شاخساروں کا ریشمیں سایہ ہو اور شاخساروں پر کشمیر و ایران کے خوش الحان پرندے ہوں جن میں سے ایک گروہ علی الصبح چہچہا کر ان کو بیدار کرے اور دوسرا دوپہر کو لوری دے۔ قریب ہی کوئی سڑک ہو تاکہ موٹر جھونپڑے تک آ سکے۔ "نو آبادی" کا انتظام کسی ایسے چاق و چوبند منتظم کے ہاتھ میں ہو جو ہاتھ کی ہتیلی پر سرسوں جما سکتا ہو۔

آپ بلبل، کوئل وغیرہ کی آواز پر جاگ کر ان کے سُر میں سُر ملاتے، احباب کے جھونپڑوں پر جا کر ان کو جگائیں، اور ان کو ہمراہ لے کر دامانِ کوہ سے قلۂ کوہ تک ایک لمبی سیر کو نکل جائیں۔ پھول لوں، جھاڑیوں اور پیڑوں کو اپنے پرانے اشعار سنائیں۔ اور تازہ اشعار کاریں دامن میں سمیٹ لائیں۔ واپسی پر کسی چشمے میں غسل کے بعد اپنے جھونپڑے میں لنگوٹا باندھ کر بیٹھ جائیں۔ احباب سے خوش گپیوں کا دَور چلے۔ لیکن جس وقت آپ فکرِ سخن میں غوطہ لگائیں، تو احباب یا تو انہیں کے ساتھ ڈوب جائیں یا اپنے اپنے جھونپڑوں میں جا کر ادب تخلیق کریں اور یہ نہیں کر سکتے، تو باہر کیاریوں میں گاجر مولی اگائیں۔ الغرض یونہی کام ہوتا رہے اور محفلیں جمتی رہیں۔

دوارکا داس شعلہ

میرا حفیظ

حفیظ صاحب میرے استاد بے اندازہ خوبیوں اور خرابیوں کے مالک ہیں۔ اُن کی شخصیت اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ سچ تو یہ ہے کہ ان میں یہ سب خوبیاں اور خرابیاں نہ ہوتیں تو وہ بھلا میرے استاد ہی کیوں کر ہوتے!

میں نے استاد تلاش کرنے کی کچھ کم کوشش نہیں کی تھی۔ شعر کی بیماری ہوئی تو سب سے پہلے لالہ لال چند فلک کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سنہ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں پنجاب میں اور کوئی شاعر ان کی سی شہرت نہیں رکھتا تھا۔ یہ وہی فلک ہیں جن کا مصرعہ

"تو بھی بدل فلک کہ زمانہ بدل گیا"

جب سے اب تک زبانِ زدِ خاص و عام ہے۔ ہاں تو ان کی خدمت میں حاضر ہوا، مؤدبانہ پرنام عرض کیا۔ آپ نے میری طرف دیکھا، بیٹھنے کا اشارا کیا اور پوچھا:

"کہو کیسے آئے؟"

میں نے حاضری کی غرض بیان کی تو وہ شاعر سے مصلحِ اخلاق بن گئے، فرمایا:

"شعر نہ کہا کرو، یہ کوئی اچھی چیز نہیں۔"

میں نے پوچھا: "آپ شعر کیوں کہتے ہیں؟"

فرمایا: "نتیجہ بھی تو دیکھ رہے ہو، برباد اور پریشان حال ہوں۔"

میں نے کہا: "یہ بربادی صرف آپ ہی سے منسلک نہیں، بے شمار کانگریسی جو شعر نہیں کہتے، وہ بھی تو پریشان حال ہیں۔ اس بربادی کا بظاہر شعر سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا ہے۔"

فلک صاحب کج بحثی پسند نہیں فرماتے تھے۔ جواب دیا: "خیر اگر تمہیں شعر کہنا ہی ہیں اور اصلاح بھی مجھی سے لینا ہے تو اپنے والد سے ایک خط اس مطلب کا لکھوا لاؤ کہ انہیں کوئی اعتراض نہیں۔"

بھلا باپ سے بیٹے کی بربادی کے تمسک پر منظوری کی مہر کیسے لگوائی جا سکتی تھی۔ ایسا خط ملنا مشکل، دوسرا استاد آسمان! انہی دنوں سیاسی دنیا سے ہٹ کر ایک صاحب ماسٹر رحمت تھے تو ضمیر کے ایڈیٹر، لیکن شاعر مشہور ہو رہے تھے ان کے نام سے یہ شعر مجھے آج تک یاد ہے ؎

سامنے بیٹھ کے دل کو جو چرائے کوئی
ایسی چوری کا پتہ خاک لگائے کوئی

ان کے حضور میں پہونچنے کے لئے پر تول رہا تھا جو یہ انکشاف ہوا کہ ایکٹر لوگ اوباش ہوتے ہیں اور یہ بھی سنا کہ رحمت کا کلام ان کا اپنا نہیں بلکہ کسی اور شاعر کی بیاض سے اڑایا ہوا ہے۔ یہ سن کر ان کے متعلق میرا جوش ٹھنڈا پڑ گیا کیوں کہ میں شاعری کے علاوہ کسی دوسری اوباشی کے لئے "ظرف" نہ رکھتا تھا اور نہ کسی دوسرے شاعر کی بیاض کے برتے پر شاعر کہلانا چاہتا تھا

ایک صاحب نے مشورہ دیا۔ مولانا تاجور نجیب آبادی سے رجوع کرو۔ بڑے بھاری بھرکم استاد ہیں۔ فن گھول کر پلا دیتے ہیں۔ جی میں آئی پہلوان ہی سے فیض حاصل کیا جائے مگر جب ایک مشاعرہ میں دیکھا کہ وہ ایک شاگرد کو فن کی جگہ ڈانٹ پلا رہے ہیں تو یہ دیکھ کر شاعری سے میرا جی... اچاٹ ہو گیا۔

چند دن بعد جذبہ پھر بیدار ہوا تو مشورے کے لئے پنڈت ہری چند اختر کے ہاں پہونچا۔ وہ مجھے حفیظ کی خدمت میں لے گئے۔

حفیظ صاحب نے میرا سر سے پاؤں تک کا جائزہ لیا۔ پھر پنڈت جی سے پوچھا۔ "یہ کسے پکڑ لائے"؟ اختر نے کہا: "شعر زدہ ہے" حفیظ بولے "ہاں شعر ہے تو آسیب" پنڈت جی نے کہا: "بلکہ اس سے بھی بدتر کہ آسیب زدہ کا علاج تو ہے شعر زدہ کا علاج ہی نہیں" حفیظ صاحب نے پھر میری طرف توجہ فرمائی۔ پوچھا: "شعر کہتے بھی ہو"؟ میں نے عرض کی "کوشش کرتا ہوں" فرمایا "کوشش کے نتیجے سے آگاہ کرو" میں نے چند شعر پڑھے۔ حفیظ نے کہا: "پنڈت! اڑ کا چل نکلے گا" پھر مجھ سے پوچھا "تمہارے والدین کو بھی تمہاری اس بیماری کا علم ہے"؟ میں نے عرض کی: "والدین سے مراد اگر ماں باپ ہیں تو ماں تو شعر و شاعری کو سمجھتی نہیں۔ والد سمجھتے ہیں اور خلاف بھی ہیں"

حفیظ یہ سن کر ذرا چونکے۔ تھوڑی دیر چپ رہے۔ آہ کی سی آواز میں بولے "کیا کیا جائے یہ سب ایسے ہی ہوتے ہیں"

میرے پاس تین غزلوں کے مسودے تھے۔ میں نے اصلاح کے لئے پیش کئے۔ دس دن کے بعد معلوم ہوا کہ وہ کہیں گم ہو گئے۔ یہ گم ہونے، مل جانے اور پھر نشان زدہ اشعار کو دوبارہ کہہ کر پیش کرنے کا سلسلہ تین برس چلا۔ میں نے انہیں اس طرح دق کرنا چھوڑ دیا۔ دوسرا طریق اختیار کیا۔ مشاعروں میں ان کے ساتھ جاتا کیونکہ شعر پڑھنا بھی ہوتا تھا۔ حفیظ بیٹھتے اٹھتے یا راستے میں چلتے چلتے شعر سنتے اور اصلاح فرما دیتے اگر پھر بھی کوئی قابل گرفت بات رہ جاتی اور کسی طرف سے اعتراض ہوتا تو وہ یہ کہہ کر تسلی دے دیتے: "میاں فکر نہ کرو۔ غلطی کس کے ہاں نہیں ہوتی، اور اعتراض کس پر نہیں ہوتے۔ طبیعت پر زور دیکر شعر کہتے جاؤ اور ان کو بار بار دیکھو اور غور کرو۔ زبان اور بیان خود بخود صاف ہوتے جائیں گے"

اور پھر شعر کہنے کے کئی گر اور قاعدے بتاتے مگر ان قاعدوں کا تعلق کسی کتابی نصاب سے نہیں تھا۔ اس لئے میں بھی انہیں ضبط تحریر میں لاکر نصابی نہیں بنانا چاہتا۔

(۱)

سب سے پہلے مجھے حفیظ صاحب کی خرابیاں بیان کرنی چاہیں کیونکہ خوبیاں تو ہر کوئی بیان کرسکتا ہے اور چونکہ عام انسانوں کی طرح حفیظ صاحب کی ذات بھی خوبیوں اور خرابیوں کا امتزاج ہے اس لئے خوبیوں کی بات چھوڑیے کہ شاگرد کی حیثیت سے مجھے ان کی خوبیاں تو نظر آئیں گی ہی اور میری سعادت مندی کا تقاضا بھی یہی ہے مگر استاد بے لاگ ہو تو شاگرد کو بھی لازماً نہیں تو بے لاگ ہو جانا چاہئے۔ اس "کلیئے" یا اخلاقی فرض کو نبا ہنے کے لئے ان کی [illegible] کیوں نہ کر ڈالوں۔

حفیظ صاحب میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ اگرچہ وہ اپنے آپ کو موجودہ دور کا بڑا شاعر جانتے ہیں لیکن منہ سے نہیں مانتے۔ ان کے چاہنے والوں نے شدت سے انہیں یقین دلایا کہ وہ بہت بڑے شاعر ہیں۔ ان کے شعر انہیں کو سنائے۔ ان کے محاسن بیان کئے اور انہیں یاد کرنے پر مجبور کر دیا کہ کوئی دوسرا

اس مرتبہ کا اس دور میں نہیں ہے۔ ان لوگوں میں ایک یہ نیاز مند بھی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میری رائے کاملاً غیر جانبداری اور ایمان داری پر مبنی ہے دوسروں کی نیتوں کا حساب جاننے والا صرف خدا ہے اور ان لوگوں کی گواہی دینے کو اب خدا زمین پر تھوڑی اتر آئے گا لہٰذا میرا خیال ہے کہ لوگوں کے کہتے سنتے سے حفیظ نے قدر پہچان لیا ہو گا وہ کہتا ہیں مگر مسکراتے رہتے ہیں۔ اس مسکراہٹ کے معنی لوگ یہ لیتے ہیں کہ وہ خود بھی خود کو بڑا شاعر سمجھنے لگے ہیں۔ خطرے کا پہلو اس سارے معاملے میں صرف اتنا ہے کہ چاہنے والوں کا اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ جانے وہ کب تک چاہتے رہیں اور کب یہ کار خیر چھوڑ دیں۔ دوسری صورت میں ہر خوبی عیب بن جاتی ہے کہ خوبی کا تعلق حسن نظر سے ہے۔ حسن نہ رہے تو نظر محض دھوکا رہ جاتی ہے (یہ بزرگوں کا ارشاد ہے میرا نہیں) حفیظ کو اس غلط فہمی یا صحیح فہمی میں مبتلا کرنے کے لئے عوام بھی کچھ کم ذمہ دار نہیں۔ ہر مشاعرے میں داد انہیں کے لئے مخصوص کر دی گئی۔ ان کی کتاب چھپی تو جھٹ خرید لی۔ کتب فروش چوری سے چھاپ چھاپ کر بھی فروخت کرنے لگے۔ لوگ ان کے گیت بازاروں میں گاتے پھرے۔ عوام کا معاملہ بھی چاہنے والوں سے مختلف نہیں کہ ان کا حافظہ قابل اعتبار نہیں ہوتا۔ "زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو" کا زمانہ شیخ ذوق کے ساتھ ختم ہو گیا۔ ان دنوں لوگ اصلی گھی کھاتے تھے۔ خالص دودھ پیتے تھے اس لئے ان کی یادداشت بھی قابل اعتبار تھی اور یہ کچھ دن قائم بھی رہتی تھی مگر اب زمانہ بدل گیا ہے۔ عوام اب ... جو بات کہتے ہیں ایک ہی مرتبہ کہتے ہیں اگر دوسری مرتبہ کہیں تو اس کے خلاف بھی کہہ دیتے ہیں یعنی نتیجہ اگر رائے کے خلاف بھی اخذ کر لیا جائے تو غلط ثابت ... ہونے کا امکان نہیں۔ حیرت ہے کہ عوام کی یادداشت کے بارے میں یہ کلیہ بھی حفیظ صاحب کے بارے میں غلط ثابت ہو گیا ہے کہ عوام چالیس برس میں بھی اپنی پہلی رائے نہیں بھولے اور بدستور انہیں بہترین شاعر مانتے گردانتے چلے جاتے ہیں

حفیظ بظاہر و بباطن شریف انسان ہیں۔ اپنے بارے میں لوگوں کی مخلصانہ رائے سے کب تک متاثر نہ ہوئے ہوں گے۔ آخر انہیں بھی مان لینا پڑے گا کہ میاں تم سب مل کر مجھے بڑا شاعر کہتے ہو تو چلو میں بڑا ہی سہی۔ یہ گویا ایک سمجھوتہ ہو گا جو انسان کبھی کبھی بحالت مجبوری کر لیتا ہے حفیظ ہی کا تو مصرعہ ہے ع

یہ نہ کرے تو آدمی آخر کار کیا کرے

البتہ میرے خیال میں یہ بات زیادہ مناسب ہے کہ وہ اپنے آپ کو گھٹیا شاعر ہی سمجھتے رہیں۔ عوام و خواص جو چاہیں کہیں اس سے ان کی اپنی انفرادیت تو قائم رہے گی۔ اگر حفیظ بھی عوام کی ہاں میں ہاں ملا کر انہیں میں سے ہو گئے یعنی عامیانہ مذاق کے حامل تو ظاہر ہے کہ یہ کوئی خوبی کی بات نہیں۔

دوسرا عیب میرے استاد نامدار میں یہ ہے کہ جسے ایک مرتبہ اچھا سمجھ لیا بس پھر اسے ہمیشہ اچھا ہی سمجھا کئے۔ حفیظ نسلاً چوہان ... راجپوت ہیں: "پران جائے پر نہ جائے" ان کی سرشت میں ہے۔ مگر راجپوت اگر دوست کے جان نثار دوست ہوتے ہیں تو دشمن کے جان لیوا دشمن بھی ہوتے ہیں۔ یہ دوسرا پہلو حفیظ کے ہاں بہت کمزور ہے کہ آپ ان سے جی بھر کے دشمنی کیجئے یہ ہمیشہ طرح ہی دیتے چلے جائیں گے۔ اور اگر کبھی ان کا راجپوتی خون کھولا بھی تو سارا غم و غصہ ایک آدھ اس قسم کا شعر کہہ کر غلط کر لیا۔

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

حفیظ کا فلسفہ دوستی کے متعلق بڑا سیدھا سادا یعنی راجپوتی ہے۔ جس طرح باپ پیار کرے یا مارے۔ پھر بھی ہمیشہ باپ ہی رہتا ہے اسی طرح دوست بھی دوستی نباہے یا دشمنی کرے۔ رہتا دوست ہی ہے۔ دوستوں کی طرف سے تیر آئے تو یہ انہیں بھی پیغام محبت اور دعوت... ملاقات ہی سمجھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں رائے کے معاملہ میں ضد ان کے مزاج کا اہم عنصر بن چکی ہے۔ خود میری مثال ہی لے لیجئے سنہ ۱۹۲۲ء میں مجھے اچھا سمجھا۔ اچھا کہہ دیا اور چالیس برس گزر جانے کے بعد بھی بدستور اچھا سمجھے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ مجھے اس دوران ہزاروں نے نہ سہی۔

بیسیوں نے میرے منہ پر اور سینکڑوں نے میری غیبت میں برا کہا۔ بحیثیت انسان اور بحیثیت شاعر برا سمجھا۔ اور اس امر کا اظہار اس شدت و خلوص سے کیا کہ خود مجھے بھی ان کا اعتبار کرنا پڑا۔ لیکن حفیظ اب تک اچھا ہی سمجھتے جا رہے ہیں تو گویا اب حفیظ کی مردم شناسی میرے نزدیک مشتبہ ہو گئی ہے کہ جب بیسیوں نے مجھے برا کہا تو وہ مجھے اچھا کہنے پر کیوں مصر ہیں؟ یہ ان کے ضدی ہونے کا بیّن ثبوت ہے اور ضد نیک آدمی کو زیب نہیں دیتی۔ اب یہ کیونکر کہوں کہ اس لحاظ سے ان کی نیکی بھی بحث طلب مسئلہ ہو گئی ہے۔ ضد کو خود سری اور خود بینی بھی کہتے ہیں۔ استاد مکرم میں یہ دونوں باتیں ہیں مگر یہ بھی نہیں کہ دوسرے کی بات یکسر نہ مانیں۔ کبھی کبھی نہ ماننے والی بات بھی مسکرا کر اور آنکھیں جھکا کر (جس میں اظہار تشکر بھی شامل ہوتا ہے) یوں مان لیتے ہیں کہ ان کی ذات مجموعہ اضداد معلوم ہونے لگتی ہے مثلاً اگر محکمے سے ان کی خدمات کی ستائش کے طور پر ان کی تنخواہ میں اضافہ کرانے کے لئے کوئی ان سے کہے کہ حضرت حکومت کو توجہ دلایئے تو وہ کسی کی بات نہیں مانیں گے لیکن حکومت ان کو تنخواہ میں ترقی کی جگہ بہت سا مزید کام ان کے سر ڈال دے تو وہ فوراً مان جائیں گے کیوں کہ دل شکنی ان کے مذہب میں عیب ہے اور اس حد تک کہ اپنے فرائض منصبی کے علاوہ دوسرے معاملات میں بھی بھاگ دوڑ کرتے وقت رسماً نہ کہیں گے کہ اس عزت افزائی کی ضرورت ہی کیا تھی۔

(۲)

اب رہی حفیظ صاحب کی وضع قطع اور چال چلن۔ تو ظاہر ہے کہ میرے حفیظ کی سیرت پیاری ہے مگر صورت کا حسن سے واسطہ نہیں ہے۔ سیدھے کم۔ ٹیڑھی بھی زیادہ مگر اس کے باوجود جب تین تین دلہنوں نے ان کے حسن کی تعریف کی تو کفر کیا کرتے۔ مان گئے اور موجودہ دور کے سائنس زدہ آئینہ سازوں کی بددیانتی پر مسکرائے کہ اچھے خاصے حسین اور خوش رو انسان کو ان کی تخلیق کم رو ثابت کرتی ہے۔ کم رو میں نے اس لئے کہا کہ بد صورت بھی تو نہیں ہیں۔ حفیظ کو اپنی خوبروئی کا احساس ہے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ کون کرے۔ چلیے مان لیجئے کہ وہ اپنے آپ کو بد صورت نہیں سمجھتے اور یہ "نہ سمجھنے" کا احساس کب سے ہے اس کا تعین بھی مشکل ہے۔ دلہنوں والے معاملے کا بھی اس سے ضرور تعلق ہو گا لیکن اصلی وجہ غالباً یہ ہے کہ جو شخص ایسے حسین شعر لکھ سکتا ہے وہ بد صورت کیسے ہو سکتا ہے۔

مگر یہ اپنے آپ کو بے ہنگم نہ سمجھنے کی بات بھی جب کی معلوم ہوتی ہے جب انہیں دنیائے شعر سے قبول عام کی سند مل چکی تھی۔ یوں تو وہ پہلے بھی احساس کمتری کو قریب نہ آنے دیتے تھے مثلاً شاگردی کی شرائط میں دو نہایت اہم تھیں۔ پہلی یہ کہ شاگرد ان سے بہتر شعر نہ کہہ سکتا ہو۔ دوسری ظاہری شکل صورت میں استاد سے کم تر ہو۔ ان دنوں حفیظ نے دو شاگرد قبول فرمائے۔ پہلے ہری چند اختر اور پھر یہ خاکسار۔ جہاں تک عمر کی کوئی بنائی رعنائی جس کا حسن سے تعلق ہو پنڈت جی کے نزدیک نہیں کھٹکی تھی اور یہ نیاز مند شاہکار حسن خدا داد ایسا کہ حسن پر سایہ بھی پڑ جائے تو آئینہ حلبی سے "حبش الگ" ہو جائے۔ ہری چند اختر کی صورت تو خیر کیا سنورتی، مذاق فن البتہ سنور گیا۔ شعر استاد کے سے کہنے لگے۔ حفیظ نے انہیں شاگرد سے ترقی دے کر دوست بنا لیا۔ پنڈت جی کا یہ حشر دیکھا تو میں نے دل میں طے کر لیا کہ کبھی اچھے شعر نہ کہوں گا۔ اس لئے میں آج بھی بدستور شاگرد ہوں اور مجھے اس پر فخر بھی ہے کہ حفیظ کو دوستوں سے تو کبھی کبھی شکایت ہو تو ہو شاگرد سے کبھی نہیں ہوئی۔

حفیظ کی عادات اور اعتقادات یہ ہیں کہ بزرگوں کے احکام کو وہ فرمان الٰہی سے کم نہیں سمجھتے اور بغیر حجت کے حق فرماں برداری ادا کرتے ہیں۔ ان کے استاد محترم جناب شیخ غلام قادر گرامی نے نغمہ زار کے زمانے میں ان کے کلام کی خوبی اور حسن نظم کی داد دی۔ آپ فارغ الاصلاح ہو لئے اس کے بعد استاد تو در کنار کسی شاگرد تک سے اصلاح نہ لی۔ آپ ہی فرمائیے تعریف استاد نے کی تھی بھلا شاگردوں کی کیا خطا تھی۔ شاگردوں سے اصلاح حاصل کرنے کا تو ان کو پورا حق تھا۔ ایسی ہی سعادت مندی کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ والد نے (حفیظ کے والد میرے نہیں) ایک مرتبہ ان سے کہا "گھر سے نکل جاؤ۔ یہاں شاعروں کی گنجائش نہیں"۔ میرا آقا جب سے اب تک بس گھر سے نکلا ہوا ہے اور اب تو جالندھر ہے ہی ہندوستان میں ان کی

واپسی کا امکان بھی کیا ہے؟

یہ ہے میرا استاد ۔ میرا حفیظ جس کی رہنمائی میری زندگی کی تاریک راہوں کو گزشتہ چالیس برس سے روشن کئے ہوئے ہے۔

میری نسبت میری پیدائش سے پہلے ہو چکی تھی شادی البتہ بعد میں ہوئی۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا ۔ ہے بھی تعجب کی بات مگر غلط نہیں میرے والد اور میرے خسر ہم عمر اور بڑے گہرے دوست تھے اور میری والدہ اور میری خوشدامن آپس میں سہیلیاں ۔ دونوں کی شادی قریب قریب ایک ہی زمانے میں ہوئی تھی ۔ رشتۂ اخلاص کو اور استوار کرنے کے لئے انہوں نے آپس میں عہد کیا کہ اگر ایک کے لڑکا ہوا اور دوسرے کے لڑکی تو دونوں کا رشتہ کر دیا جائے گا ۔ میری ساس کے لڑکا ہوا اور والدہ کے لڑکی مگر یہ لڑکی چند برس کی عمر میں انتقال کر گئی ۔ پھر میں نے اپنی ولادت سے دنیا کو رنگ و نور بخشا میری خوشدامن کے یہاں رضائے الٰہی سے اب کے پھر لڑکا ہوا ۔ ہمارے یہاں لڑکے کی سگائی لڑکے سے نہیں ہوتی ۔ اس لئے سہیلیوں کے قول و قرار شرمندۂ ایفا نہ ہو سکے مگر خدا کو ان کے عہد محبت کا پاس منظور تھا اس لئے اس نے تیسری مرتبہ میری خوشدامن کو لڑکی سے نوازا اور وعدے کے مطابق میں ... اپنی خوشدامن کی دختر بلند اختر سے منسوب کر دیا گیا ۔

یہ بات میں نے زیب داستان کے لئے نہیں کی بلکہ تحقیق شدہ ہے اور ثبوت موجود ہے ۔ میری اہلیہ میری خوشدامن ہی کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہیں ۔ اس سارے معاملے میں میری حیثیت اضافی تھی ۔ ایک کھلونے کی سی کہ جس نے گڑا اسی سے بیاہ بھی ڈالا ۔ خیر ذکر حفیظ میں یہ تمہید اس افسانے کی جان ہے جو میں اب مختصراً عرض کرنے والا ہوں ۔ استاد کی خدمت میں شعر کی اصلاح کم ہوئی تھی ذوقِ ادب اور طبیعت کی زیادہ کہ اس زمانے کے بڑے بڑے استادانِ علم و حکمت و ادب حفیظ کے گرد حلقہ لئے رہتے تھے ۔ میں ان کی بحثیں سنتا تھا ۔ لطیفے جو طنز و مزاح کی روح ہوتے تھے ۔ ان سے سبق لیتا تھا ۔ آزاد خیالی کے مظاہرے دیکھتا تھا ۔ غلط اور صحیح نتیجے بھی اخذ کرتا تھا ۔ حفیظ کی ان بے تکلف محفلوں کے اثر سے مجھ پر بھی بے تکلفی کے دورے پڑنے لگے ۔ ایک دن استاد اکیلے تھے میں نے موقع غنیمت جان کر اپنی شادی کا مسئلہ پیش کر دیا ۔ اب ذرا اندازِ گل افشانی گفتار ملاحظہ فرمائیے ۔

"حفیظ صاحب"

"ہاں بھئی"

میں "میرے والد میری شادی ایک جگہ طے کر رہے ہیں"

"تمہیں کیا اعتراض ہے ۔ کر لینے دو"

"میں نے لڑکی دیکھی تک نہیں"

"تم دیکھ کر کیا کر لو گے"

"سنتا ہوں ۔ وہ خوب صورت نہیں"

"اس میں کیا برائی ہے ۔ خوب صورت ہوتی تو زیب پیدا ہوتے"

"حضور وہ ان پڑھ ہے"

"تم کون سے پڑھے لکھے ہو"

"سنتا ہوں بد مزاج ہے"

"شریف بچے نیک زادیوں میں عیب نہیں ڈھونڈا کرتے"

"میں نے ایک اور لڑکی دیکھ رکھی ہے ۔ حسین ہے ۔ پڑھی لکھی ہے ۔ سلجھے ہوئے مذاق کی ہے ۔ نہایت اچھا گاتی ہے ۔ مجھ سے اکثر

ملتی ہے۔ مجھے چاہتی ہے

اب حفیظ نے پینترا بدلا "طوائف ہوگی۔"

میں نے عرض کی "نہیں حضور وہ شریف زادی ہے۔"

"کون ہے۔ کس کی بیٹی ہے؟"

"ہمارے پڑوس میں رہتی ہے ۔۔۔۔۔ صاحب کی صاحبزادی ہے۔"

"تم انکے یہاں جاتے آتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"وہ لڑکی بھی تمہارے یہاں آتی جاتی ہے؟"

"جی نہیں۔"

"لڑکی کے ماں باپ کو تمہاری ملاقاتوں کا علم ہے؟"

"غالباً نہیں۔ ہم اکثر شام کے وقت ملتے ہیں۔ جب وہ سیر کے لئے چلے جاتے ہیں۔"

"تمہارے والد کو بھی اس معاشقے کا علم ہے؟"

"میں نے حال ہی میں چچا مہر الٰہی[1] کی معرفت کہلوایا تھا کہ اگر شادی کرنا ہی ہے تو میری پسند کی لڑکی سے کیا جائے اور وہ فلاں بنت فلاں ہے اور ان خوبیوں کی مالک ہے۔"

"پھر والد نے کیا کہا۔؟" حفیظ نے پوچھا۔

میں نے عرض کیا "انہوں نے کہا کہ جہاں ایک مرتبہ 'ہاں' ہو چکی ہے رشتہ وہیں ہوگا اور پھر یہ بھی کہ مجھے شریف اور نیک بہو چاہیئے۔ قاصہ اور مغنیہ نہیں۔"

حفیظ صاحب نے یہ سن کر ایک لمبی سی ہوں کی۔ انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ بیزار ہو گئے ہیں۔ اتنے میں پنڈت ہری چند بھی آگئے اور۔۔ آداب عرض کر کے بیٹھ گئے۔ حفیظ صاحب نے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا

"اچھا۔ دوارکا داس جی۔ تو اب تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہیں کوئی ایسا گر بتاؤں کہ تمہاری شادی اس لڑکی سے ہو جائے۔ ٹھیک ہے نا۔ میں۔۔ استاد جو ہوا۔ تمہارا مستقبل اور کسی کا ناموس برباد نہ کروں تو استادی ہی کیا ہوئی۔ خیر اب تم جاؤ۔ اور سنو پھر یہاں تشریف لانے کی زحمت نہ کرنا۔"

یہ سخت گیری بڑی حیرت ناک تھی اور قطعی غیر متوقع کیوں کہ حفیظ کے دوست ان سے اکثر اپنے معاشقوں کا ذکر مزے لے لے کر کرتے تھے اور یہ بھی ان سے لطف اندوز ہوتے اور ان پر فقرے چست کرتے رہتے۔ بلکہ یہ افسانے سن کر ہی تو مجھے جرأت ہوئی تھی کہ میں بھی ان سے اپنا قصہ کہوں میرا خیال تھا کہ وہ خوش ہوں گے۔ یوں بھی عشق اردو اور فارسی شاعری کے سلسلے میں خوش فکری کی سند ہوتا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرا استاد عشق کی سیڑھی پر چڑھے بغیر ہی ثمر شعر جھپٹ لایا ہے۔ شراب کے معاملے میں بھی وہ زاہد خشک۔ غرض میں حیران کہ آج استاد کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اتنے میں پھر گرجے۔

"تو ابھی گیا نہیں۔ جلدی آنکھوں سے دور ہو جا اور یاد رکھ دوبارہ ادھر کا رخ کیا تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

---

[1] شیخ مہر الٰہی میرے والد کے نہایت عزیز دوست تھے۔ ان پر ایک علیحدہ مضمون "میرا شیخ" نظم و نثر کے مجموعے میں شامل ہے۔ شیخ صاحب موصوف خلوص و محبت، نیک دلی و صفائے باطن میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ وہ مجھ پر بے حد مہربان تھے۔ (دوارکا شعلہ)

میرا تو خون ہی خشک ہوگیا۔ پنڈت ہری چند اختر بھی گھبرا گئے۔ انہوں نے پوچھا "حفیظ صاحب آپ کو ایسا برافروختہ کبھی نہیں دیکھا۔ آج ایسی کیا بات ہوگئی؟"

حفیظ صاحب نے فرمایا "چپ کرا دے پنڈتا[1]۔ میرے یہ گرامی قدر دوست کسی ہمسائی کو ورغلا رہے ہیں۔ ان کے والدین نے قریبی رشتہ داروں سے ان کی شادی کے لئے وعدہ کر رکھا ہے مگر یہ نادر پدر آزاد انہیں بے وقوف اور غیر ذمہ دار سمجھ کر ایک ناچنے گانے والی سے بیاہ رچانا چاہتے ہیں۔ میں خود بیٹیوں کا باپ ہوں۔ وہ آج نہ سہی کل جوان ہوں گی۔ میں ایسے اوباش لڑکے کا اپنے یہاں آنا برداشت نہیں کرسکتا۔ اور پھر ہوسکتا ہے کہ جس صاحبزادے کو اپنے بزرگوں کی عزت اور عہد کا پاس نہیں وہ استاد کا کہا کیا خاک مانے گا۔ مجھے ایسے شاگردوں کی ضرورت نہیں۔ یہ ذات شریف تیرے دوست ہیں تجھے شرم آنی چاہیئے۔"

پنڈت جی نے مجھے ٹل جانے کے لئے اشارہ کیا۔ میں سخت مایوسی کے عالم میں واپس چلا آیا۔ والد پہلے سے ناراض تھے۔ حفیظ اب بگڑ گئے گویا کوئی پناہ کی جگہ باقی نہ رہی۔ پنڈت جی دوسرے دن میرے یہاں آئے۔ میں افسردہ و دل شکستہ اپنے کمرے میں پڑا تھا۔ انہیں کل کے واقعہ کا افسوس تھا۔ مجھ سے ہمدردی بھی تھی۔ کچھ دیر خاطر جمعی کی باتیں کرتے رہے پھر فرمایا "دوارکاداس جی حفیظ چوہان راجپوت ہیں۔ مسلمان سہی۔ خون تو وہی ہے۔ ان کے نزدیک عہد شکنی سب سے بڑا گناہ ہے۔ اور ناموس سب سے بڑی دولت۔ تم کو بہت عزیز رکھتے ہیں تو یہ کیوں کر پسند کریں گے کہ تم میں آوارگی کا شائبہ بھی ہو۔ تمہارے رشتہ ہی سے سہی۔ تمہارے والد کو بھائی سمجھتے ہیں اور ان کے عہد کو اپنا عہد۔ اور یہ جائز بھی ہے۔"

میں نے کہا "حفیظ اپنے والد کا حکم کہاں مانتے تھے۔ انہوں نے شعر کہنے کو منع کیا۔ یہ بدستور کہتے رہے۔" پنڈت جی نے فرمایا "مگر شادی تو ماں باپ کے کہنے سے کی۔ ہمسایوں کو خراب کرنے کی نیت تو نہیں باندھی۔ شعر کا معاملہ دوسرا ہے۔ موزونیٔ طبع فطری چیز ہے۔ شعر گوئی قدرت کی ودیعت۔ اس سے منع کرنا ایسا ہے جیسے کوئی کہے سانس نہ لیا کرو۔ پیاس لگے تو پانی نہ پیا کرو یا مثانہ بھرا ہو تو بول نہ کرو۔ یا کسی کی ناک ٹیڑھی ہو تو حکم ہو کہ اسے سیدھا کرو۔"

ہری چند بے مثل منطقی تھے۔ میں لاجواب ہوگیا اگرچہ قائل پھر بھی نہیں ہوا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر فرمایا "کیا ارادے ہیں دل ناپاک کے؟" میں نے کہا "آپ رائے دیجیئے"۔ فرمایا "استاد سے معافی مانگو۔" میں نے کہا "وہ ٹانگیں توڑ دیں گے۔" فرمایا "تجھے اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے ہیں تیرے چلے آنے سے خوش نہ ہوں گے۔ اگر کہو تو میں ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔" میں نے کہا "تو پھر چلئے۔" حفیظ ان دنوں اچھرے میں لاہور کے قریب رہتے تھے۔ دوپہر ڈھلتے ڈھلتے ہم وہاں پہونچ گئے۔ استاد فرشی دری پر تکیہ سے لگے بیٹھے تھے۔ حقے کی نے منہ میں اڑی ہوئی۔ کوئی مسودہ دیکھ رہے تھے۔ پنڈت جی نے بڑھ کر آداب عرض کیا۔ میں نے جھک کر سلام عرض کیا۔ حفیظ صاحب نے مشفقانہ جواب دیا اور کہا "بیٹھو"۔ پنڈت جی نے کہا "حفیظ صاحب دوارکاداس کو میں لایا ہوں۔ پانچ برس سے آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہے۔ خلاف مزاج کوئی بات نہ ہوئی۔ ماں کی محبت سے محروم ہے۔ آپ کی توجہ سے بھی محروم ہوگیا تو کہیں کا نہ رہے گا۔ آپ نے کل ایک دم اسے خارج از بحث کردیا۔ اسے سمجھا دیتے پھر حکم عدولی کرتا تو الگ بات تھی مجھ سے آج گفتگو ہوئی اپنی حماقت پر نادم ہے۔"

حفیظ آج راجپوتی تصویر کا دوسرا رخ پیش کر رہے تھے۔ میں نے آنکھیں جھکا کر قدم پکڑے تو مجھے کھینچ کر سینے سے لگا لیا شفقت سے

---

[1] حفیظ صاحب سے گفتگو ہمیشہ پنجابی میں ہوتی تھی۔ مجھے احساس ہے کہ مندرجہ بالا گفتگو کا ترجمہ ناقص ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک زبان کی بے تکلف۔ بے ساختہ اور جذباتی فقرے بازی کو اسی انداز سے دوسری زبان میں منتقل کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ (دوارکا شعلہ)

چوما اور فرمایا۔

"بھیا میرا مقصد تمہاری دل آزاری ہرگز نہیں کیونکہ تم مجھے اولاد یا چھوٹے بھائی کی طرح عزیز ہو۔ تمہاری بے راہ روی کیوں کر برداشت کرلوں۔ میں ان شاعروں میں سے نہیں ہوں جو اپنے دوست یا شاگرد کے خاندان کو برباد کرنے کے لئے صحبت بد مہیا کرتے ہیں۔ تمہارا خاندان عزت والوں کا گھرانا ہے۔ تمہارے والد انتہائی شریف آدمی ہیں۔ میں تمہارے چلن کو بے داغ سمجھتا تھا اور چاہتا ہوں کہ یہ ہمیشہ بے داغ رہے۔ جب سے تمہاری والدہ کا انتقال ہوا ہے۔ تم سے میری ہمدردی بڑھ گئی۔ تمہارے والد نے دوسری شادی کرلی تو تمہیں رحم کا مستحق بھی سمجھنے لگا۔ سوتیلی ماں کے آجانے سے باپ بھی سوتیلے ہو جاتے ہیں مگر تم سے ہمیشہ باپ کی تعریف ہی سنی۔ یہ بات میری تسکین کا باعث تھی۔ ایسے شفیق باپ اگر تمہاری شادی وہیں کرنا چاہتے ہیں جہاں تمہاری اماں زبان دے گئی ہیں تو گویا انہیں بدستور تمہاری ماں کی عزت کا پاس ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ تو مرنے والی کے عہد کو نباہنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور تمہاری سعادت مندی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ تم بھی اپنی حقیقی ماں کے وعدے پر پھول چڑھاؤ۔ اس کی روح کو سکون پہنچاؤ۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ تمہاری حیثیت اگر کچھ ہے تو والد کی نسبت سے ہے ورنہ تم خود کیا ہو؟ سترہ برس کے ناپختہ۔ ناتراشیدہ اور کوتہ اندیش نوجوان۔ تمہاری تعلیم تک مکمل نہیں ہو سکی۔ چپراسی کے سوا اور کسی ملازمت کی اہلیت نہیں رکھتے۔ خدا نہ کرے والد اگر آج تمہیں عاق کر دیں تو بتاؤ تمہارا ٹھکانا کہاں ہے؟ ہری چند کتنے دن نباہے گا۔ اور حفیظ جو خود دو دو روپیہ کی تلاش میں صبح سے شام تک جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے تمہاری کیا مدد کرے گا۔ بس اتنی ہی نا کہ آؤ میرے فاقے میں شریک ہو جاؤ۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہارے والد پر نئی بیوی کا ناخوشگوار اثر نہیں۔ یا وہ خاتون ہی نیک ہے۔ مگر یہ آج کی بات ہے۔ خدا جانے کل وہ اپنی اولاد کی خاطر کیا کیا نہ کرے گی۔ میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ تمہاری شادی بھی جلد ہو جائے۔ تمہاری سسرال والے باعزت، بااثر اور مالدار لوگ ہیں تمہیں جس قدر جلد ان کا سہارا مل جائے بہتر ہے۔ اور پھر وہ تمازہ آلودہ تیتری جس کے عاشق زار ہونے کا تمہیں دعویٰ ہے۔ اس کو حیا سے کیا تعلق اور وفا سے کیا کام۔ خدا جانے کس کس سے آنکھیں لڑا چکی ہے اور تم اس کی فہرست میں کس نمبر پر ہو۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی تم اس کے اہل نہیں کہ وہ دسویں پاس کر چکی ہے۔ کالج میں داخلہ لے رہی ہے۔ تم بفضل خدا آٹھویں پاس ہو اور مزید تعلیم کا امکان ہی ختم ہو گیا ہے۔" قدرح بشکست"۔ پھر پنڈت جی سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"پنڈتا اس لونڈے کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائی کہ استاد تو اپنے سے کم پڑھا لکھا قبول کر لیا مگر بیوی بی۔ اے بھی ہو تو مضائقہ نہیں"

پنڈت جی کے دلائل سے تو میں صرف لاجواب ہوا تھا۔ استاد محترم کی تقریر سے قائل ہو گیا۔ بڑے آدمی کی بڑی باتیں۔ حالانکہ اس وعظ کے وقت ان کی عمر ستائیس برس ہی کی ہو گی

اب حفیظ صاحب نے بجھے ہوئے حقے کے چند کش لئے اور پھر فرمایا" اگر واقعی مجھے خوش کرنا چاہتے ہو تو اس حیا کی معرفت والد سے کہلوا دو کہ ان کا ہر حکم تم ہمیشہ بسر و چشم قبول کرو گے"

اس سلسلے میں مجھ سے ایک اور حماقت ہو گئی۔ چچا مہر الٰہی کو میں نے اس واقعے کی تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ انہوں نے میری معذرت والد تک پہنچائی تو والد نے پوچھا کہ اس خود سر لڑکے کے رویہ میں تبدیلی کا کیا سبب ہے؟ انہوں نے حفیظ کی نصیحت کا ذکر کیا۔ اب کیا تھا۔ اس کے بعد والد میری ہر شکایت ان سے کرنے لگے۔ حفیظ پہلے تو یک آتشہ تھے اب دو آتشہ ہو گئے۔ پہلے صرف زبان سے بات کیا کرتے تھے اب ہاتھوں کا بھی استعمال ہونے لگا۔ دو تین مرتبہ ہلکی چپت بھی رسید فرما دی۔ کیا کرتا باپ سے کم تو نہ تھے۔ برداشت کر گیا۔ مگر شادی کے بعد تو میں باعزت اور باوقار ہو گیا تھا۔ اب تو یہ بے تکلفی ختم ہو جانا چاہئے تھی۔ اور حفیظ تھے بھی کیا۔ مجھ سے عمر میں صرف دس برس بڑے اور تن و توش میں آدھے۔ ایک مرتبہ والد نے ان سے شکایت کی کہ یہ بیوی سے بدسلوکی کرتا ہے۔ اس میں غلط فہمی زیادہ تھی اور حقیقت کم۔ کیونکہ بیوی سے تو میری روح فنا ہوتی تھی (بفضل ایزدی اب یہ روح فنا کی دستبرد سے آزاد ہو چکی ہے) مگر حفیظ نے یہ بات پلے باندھ لی۔ وہ اپنی بہو

کی تحقیر برداشت نہ کرسکتے تھے۔ مجھے یاد فرمایا۔ والد کے پاس بیٹھے تھے۔ میں حاضر ہوا تو سرا خیریت پوچھی۔ پھر والد سے رخصت چاہی اور مجھ سے ہمراہ چلنے کو کہا انہوں نے انہی دنوں ایک بائیسکل قسطوں پر خریدی تھی۔ ہم دکان سے نکلے۔ شام ہو چکی تھی۔ وہ بائیسکل تھامے ایک طرف اور میں دوسری طرف (یعنی بائیسکل میرے اور ان کے درمیان حد فاصل تھی) ہم ان کے گھر کی سمت آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ معمولی گھریلو باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ کپورتھلہ ہاؤس کے قریب پہونچ کر رک گئے کہ یہی معمول تھا۔ وہ وہاں سے سوار ہو کر اپنے گھر کی طرف راہی ہو جایا کرتے تھے۔ میں پلٹ آتا تھا۔ اس دن یہاں جو ہم رکے تو حفیظ نے مجھ سے کہا "تمہارے والد سے یہ سن کر مجھے تکلیف ہوئی کہ تم بیوی سے اچھا سلوک نہیں کرتے"۔ میں حیران ہوا اور کہا کہ یہ شکایت بے جا ہے بلکہ غلط ہے۔ حفیظ نے فرمایا "تمہارے والد جھوٹ کہتے ہیں" حفیظ نے جھٹ سے بھرے بازار اور راہ چلتے میں ایک زناٹے کی چپت مجھے رسید کر دی۔ میں بھنا گیا۔ یہ واقعہ شاید سنہ ۱۹۳۲ء کا ہے۔ ان دنوں میں صرف شوہر ہی نہ تھا بلکہ ایک بچی کا باپ بھی بن چکا تھا۔ مجھے استاد کی اس درازدستی سے سخت کوفت ہوئی اور اس سوءِ ظن سے تکلیف کہ ان کا یہ رویہ اپنے بارے میں میرے والد کی خوش فہمی اور اعتبار برقرار رکھنے کے لئے تھا۔ حفیظ ابھی میرے جواب کے منتظر ہی تھے کہ میں نے ایک جوتا اتارا اور دونوں ہتھیلیوں پر رکھ کر نذر کے طور پر پیش کیا۔ فرمایا "یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے کہا "ذرا پہن کر تو دیکھئے"۔ وہ اور متعجب ہوئے۔ فرمایا "یہ کیوں؟" میں نے عرض کی "حضور آج تک آپ کا ہر حکم مانا۔ آج میری خاطر صرف میرا جوتا پہن لیجئے"۔ انہوں نے پہن لیا۔ میں نے پوچھا "چھوٹا تو نہیں؟" فرمایا "بڑا ہے"۔ میں نے کہا "واپس کر دیجئے"۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اب میرا پاؤں آپ کے پاؤں سے بڑا ہو گیا ہے[1] ـــــــــــ حفیظ بات فوراً سمجھ گئے۔ مسکرائے۔ ہاتھ ملایا اور اس کے بعد مار پیٹ قطعاً غائب ہو گئی

(۴)

حفیظ سے ہم ایسوں کو خدا بچائے۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں ہماری دکان کی شاخ دہلی میں کھلی تو میں بھی دہلی آگیا۔ کئی دوست یہاں تھے۔ خان بہادر غلام مرتضٰے صاحب ان دنوں یہاں پولیس سپرنٹنڈنٹ تھے۔ میرے بھائی درگاداس کے ہمراہ اسٹیشن پر مجھے لینے پہونچے اور وہیں شام کے کھانے کے لئے مدعو کر لیا۔ میرے اکثر دوستوں کو وہ جانتے تھے ان کو بھی دعوت دی۔ حفیظ اور ہری چند ان دنوں دہلی میں تھے۔ حفیظ کے اردگرد جنگ کے دنوں حکومت نے ایک محکمہ بن دیا تھا۔ حفیظ ہندوستان بھر میں فاشسٹوں اور نازیوں کے خلاف مردانہ وار کھڑے ہوتے کی پبلسٹی کے ڈائرکٹر تھے اور پنڈت ہری چند ان کے اسسٹنٹ۔ یہ پبلسٹی حفیظ ہی کی اپج تھی جو گیت، ڈراموں اور موسیقی میں گندھے ہوئے الفاظ کے ذریعے ہندوستان بھر پر چھا گئی تھی۔ اس محکمہ کا نام سونگ پبلسٹی تھا۔ حفیظ کا دفتر انڈر ہل روڈ پر تھا۔ میں نے انہیں ٹیلی فون کیا۔ حکم ہوا فوراً چلے آؤ۔ میں حاضر ہو گیا۔ حفیظ کے پاس بیٹھا تھا کہ دور کے ایک کمرے سے گانے کی آواز آنے لگی۔ ان کی اجازت سے میں وہاں چلا گیا۔ پنڈت جی بیٹھے تھے۔ میں نے کہا کیوں حضور یہ اکیلے اکیلے مزے مار رہے ہو۔ کبھی ہمیں بھی تو نشاط کی محفلوں سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ دیا کیجئے۔ پنڈت نے فرمایا "بھئی یہ تو فرض منصبی کا سلسلہ ہے۔ عامیانہ قسم کے فنکار ہیں۔ ان سے پراپگنڈہ گیتوں کی دھنیں ساز سے ہم آہنگ کی جاتی ہیں۔ ان کا گانا سن کر کیا لوگے؟ میں نے کہا تو پھر کوئی بہتر انتظام فرما دیجئے کہ آج کل کی رنڈیاں اور سازندے بھی آپ کے فیض سے کماتے کھاتے ہیں۔ وہ ہنسنے لگے۔ اتنے میں حفیظ صاحب نے کمرے میں جھانکا۔ مجھے وہاں بیٹھے دیکھ کر بلا لیا اور کہا۔ میاں ہم لوگ تو جنگ کی پبلسٹی کے لئے مامور ہیں تم یہاں اپنا وقت اور عاقبت کیوں برباد کرتے ہو۔ میرے کمرے میں بیٹھو یا پنڈت جی کے دفتر میں۔ انہیں بھی ساتھ لے جاؤ۔ میں نے عرض کی قبلہ میں تو آپ کی اجازت سے یہاں آیا تھا۔ وہ کہنے لگے "تمہیں اجازت دے کر ہی سوچا کہ تم ہم سے

---

[1] یہ پنجابی مقولہ ہے کہ جب بیٹے کا پاؤں باپ کے پاؤں کے برابر ہو جائے تو بیٹے کو جسمانی سزا نہیں دینی چاہئے کہ برافروختگی میں وہ بھی شاید برابری اختیار کر جائے تو پھر معاملہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

ملنے آئے ہو رنڈیوں سے نہیں۔ خیر میں پنڈت جی کے دفتر میں جا بیٹھا اور طے پا گیا کہ رات کو خان بہادر کی دعوت کے بعد گانا سننے کے لئے چلیں گے یہ طعام رات گیارہ بجے ختم ہوا۔

میرے چھوٹے بھائی درگاہ داس[۱] بھی کھانے میں شامل تھے۔ میں نے ان کی گاڑی اپنے لئے مانگ لی اور ان سے کہا کہ تم حفیظ صاحب کی گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ حفیظ اس اہتمام پر چونکے۔ ہم ابھی میزبان کا شکریہ ہی ادا کر رہے تھے کہ وہ اطمینان سے آئے اور ہماری گاڑی میں بیٹھ بھی گئے۔ درگاداس سے کہہ دیا کہ تم میری موٹر لے جاؤ۔ میں دوارکا کے ساتھ جا رہا ہوں۔ پنڈت جی تو سہم گئے کہ وہ ضرورت سے زیادہ سعادت مند واقع ہوئے تھے۔ میں نے البتہ ہمت کر کے پوچھا "آپ کہاں جا رہے ہیں" فرمایا "جہاں تم جا رہے ہو۔ میں نے کہا "ہم تو گھر جا رہے ہیں۔ فرمایا "بدمعاشو جس گھر تم جا رہے ہو، میں خوب سمجھتا ہوں۔ تم میرے شاگرد ہو، استاد نہیں۔ خیر اب جہاں بھی تم جاؤ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ میں نے راز نہ رہنے دیا۔ اب راز رہ بھی کون سا گیا تھا — صاف صاف کہہ دیا کہ حضور کسی طوائف کا گانا سننے کے ارادے تھے اب آپ ساتھ ہو گئے ہیں تو خیر گھر ہی جانا پڑے گا۔ فرمایا "نہیں جی۔ چلو میں تمہیں خود گانا سنواتا ہوں۔" یہ کہہ کر ڈرائیور کو ایک رخ کا اشارہ کیا حتیٰ کہ وہ ہمیں اس فردوس ارضی میں لے گیا جس میں دوزخ کے پیوند بھی کم نہیں ہوتے۔

آج ہی صبح پنڈت جی نے بتایا تھا کہ دلی میں ایک ایسی چمن رنگ طوائف ہے۔ گفتگو اور حاضر جوابی میں جس کا کوئی ثانی نہیں۔ خوش شکل ہے۔ اچھا گاتی ہے۔ رقص بھی برا نہیں اور آداب نغل اور خوش سلیقگی میں تو ایسی کہ برسوں اس سے سبق لینے کو جی چاہے۔ اس قسم کی رنڈیاں پرانے وقتوں میں شرفاء کی اولاد کو مجلس آداب سکھایا کرتی تھیں۔ ہمارا وہیں جانے کا طے تھا مگر اب حفیظ سے کون کہے!

قصہ کوتاہ۔ وہ ہمیں ایک گلاب بائی کے کوٹھے پر لے چڑھے۔ فرمایا کہ دہلی بلکہ ہندوستان بھر میں اس سے بہتر گانے والیاں کم ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی بائی جی نے اٹھ کر آداب عرض کیا اور فرمایا کہ ان کے گھر حفیظ صاحب کا آنا گویا خوش بختی کا آنا ہے۔ حفیظ صاحب نے بھی مسکرا کر اظہار خوشنودی کیا اور فرمایا "پنڈت جی کو تو پہلے سے جانتی ہو جنگی پبلسٹی کے گراموفون ریکارڈ کی ریہرسلیں انہی کی نگرانی میں ہوتی ہیں اور یہ دوسرا میرا شاگرد ہے۔ اس کے متعلق تمہارے جاننے کی بات صرف یہ ہے کہ اس کے ال دار باپ کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔"

اب بائی جی کی خوشنودی کی باری تھی۔ مسکرا کے فرمایا "بڑی مسرت ہوئی" اب خدا جانے ہم سے مل کر انہیں مسرت ہوئی تھی یا میرے والد کے انتقال سے۔ باچھیں کھلیں تو کھلی کی کھلی ہی رہ گئیں۔ خیر حفیظ، پنڈت اور میں قالین پر جلوہ افروز ہوگئے اور اس شان سے کہ حفیظ درمیان میں، پنڈت اور میں ان کے دائیں بائیں۔ استاد نے (میرے استاد نے بائی جی کے نہیں) مال کونس کی فرمائش کی۔ طبلے کی سینہ کوبی کا آغاز ہوا۔ سارنگی بین کرنے لگی۔ بائی جی کی گمشدہ آواز الاپ کا روپ دھار کر ہمارے کانوں سے ٹکرانے لگی۔ حفیظ آواز کے زیر و بم پر داد دینے لگے۔ ہم چند مراقبے میں تھے اور میں اپنی کم مائگی سے ہراساں راگ ضرورت سے زیادہ پکا تھا۔ میرے پلے کچھ نہ پڑا۔ میں شاعر ہوتے کے باوجود غالب کے پکے شعر آج تک نہیں سمجھ سکا۔ راگ کیا خاک سمجھتا۔ ظاہری حسن کے صدقے یہ بدمزگی بھی برداشت کر لی جاتی مگر بائی جی صورت کے سلسلے میں ہر خوبی کی ضد تھیں۔ آبنوس رنگ۔ جسم ہڈیوں کا پنجر جس پر چمڑا کس کے منڈھا گیا تھا۔ گہرے جامنی رنگ کی ساری۔ سونے کی بے شمار چوڑیاں جو بتاوے میں کبھی کہنیوں کو پھاند کر بغل تک جا پہنچتی تھیں اور کبھی فرش پر ڈھیر ہو جاتی تھیں۔ گانے میں گلے کی رگیں پھول کر خربوزے کی سبز دھاریوں کا نقشہ پیش کرتی تھیں (بلکہ لہراتے ہوئے سنپولیوں کا)

میں نے سن رکھا تھا کہ رنڈی پان پیش کرے تو کچھ نذر دیتے ہیں۔ گانے کے دوران بھی نذر چلتی رہے۔ گانا پسند ہو یا ناپسند۔ اس سے تعلق نہیں پان پیش ہوئے تو حفیظ صاحب نے دو روپے طشتری میں رکھ دیئے۔ میں نے دینا چاہا تو منع کر دیا۔ گانا شروع ہوا تو استاد نے پہلی داد کو پانچ روپیہ

---

[۱] نارائن داس بھگوان داس تاجران ادویہ انگریزی۔ تقسیم ملک سے پہلے لاہور، انارکلی، شاہدرہ، کراچی، دہلی اور شملے میں بڑے پیمانہ پر دوائیوں کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ اب سلسلہ صرف دہلی میں محدود ہو گیا اور پھر یہ بھی گیا ہے۔ ارباب بست و کشاد کی تنگ نظری کا شکار۔

کے نوٹ سے موقر بنایا۔ میرا ہاتھ جیب کی طرف بڑھا۔ ارشاد ہوا۔ دوار کے میرے ہوتے تمہیں کچھ دینے کی ضرورت نہیں۔ اطمینان سے بیٹھے رہو۔ گانا سنو۔ مزہ لو (مزہ تو میں لے ہی رہا تھا) حفیظ دور رسی کے مالک ہیں اور انتہائی منصف مزاج۔ خیال کیا ہوگا کہ نوکر فنکار کے لئے ماحول کی بدمزگی۔ بے کیفی اور قید محض ہی کافی سزا ہے۔ نقد جرمانہ اس سے وصول نہ کیا جائے گر خود ادا فرما دیا کہ مجھ ایسے ذلیل کن شاگرد کا پالنا بھی تو جرم ہے۔ مالکوس گھنٹہ بھر چلا۔ سانس لینے کی مہلت ملی تو میں نے واپس چلنے کو کہا۔ فرمایا نہیں صاحب ابھی تو گانا شروع ہوا ہے اور یہ کہہ کر ایک فاتحانہ نظر سے پنڈت کی طرف دیکھا۔ پنڈت نے سر ہلا دیا۔ حفیظ مسکرائے۔

جگالی سے فرصت پا کر بائی جی نے پوچھا۔ حضور اب کیا پیش کروں۔ "حضور" نے درباری کی فرمائش داغ دی۔ درباری میری جانی پہچانی چیز تھی کہ استاد فیاض خان، اوڑے خان، عبدالکریم خان صاحب سے اکثر سن چکا تھا۔ اب بائی جی نے درباری کو مروڑنا شروع کیا۔ آواز بلند ہوتی تو خیر کچھ تھم جاتی لیکن جب ہلکی ہوتی تو ڈوبنے لگتی اور کھانسی آ جاتی۔ حفیظ نے پچیس روپیہ درباری پر بھی غارت کئے۔ اب رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی۔ کوئی ایک بجے کا عمل ہوگا ماحول شگفتہ ہو تو رات پھولوں پر بسر ہوتی ہے ورنہ آنکھوں میں کٹتی ہے۔ درباری کا تار ٹوٹا تو میں نے حفیظ سے کہا کہ سرکار پیٹ میں درد محسوس کرتا ہوں۔ اب چلنا چاہئے۔ مان گئے۔ درد والی بات نہ ہوتی تو شاید اور بھی سبق دیتے۔ ہم اٹھے تو حفیظ صاحب نے از راہ ہمدردی یا طوائف نوازی اس خاتون نغمہ نواز سے پوچھا۔ گلاب بائی کچھ کمزور نظر آ رہی ہو۔ اچھی تو ہو نا۔ اس نے جواب دیا۔ یوں تو اللہ کا فضل ہے۔ بس شام کو طبیعت گرنے لگتی ہے۔ کھانسی بے دم کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر سے مشورہ کیا تھا مچھلی کا تیل پینے کو کہا ہے۔ چلو اب ماحول میں مچھلی کے تیل کی بو بھی شامل ہو گئی۔

ہم گاڑی میں بیٹھے تو میرے استاد نے پوچھا۔ "کہو لطف آیا۔" میں نے کہا۔ جی بہت زیادہ" فرمایا۔ "زیادتی کی ایسی کیا بات تھی؟" میں نے کہا۔ "رات خراب ہوئی۔" فرمایا۔ "تم ہی تو گانا سننا چاہتے تھے۔" میں نے کہا۔ "گلاب بائی تو نہ ہوتی۔" فرمایا۔ "عجیب بدذوق آدمی ہو۔ یہ تو بہترین گویا ہے۔ اور پھر پنڈت جی سے پوچھا "کیوں اوپنڈتا ایہہ سب توں ودھیا اے کہ نہیں"؟ (یہ سب سے بڑھیا ہے کہ نہیں) پنڈت جی نے جواب دیا۔ "جی ہاں۔ باقی۔ تو اس سے بھی لیچڑ ہیں" حفیظ مجھ سے مخاطب ہوئے: "تجھے اتنا اچھا گانا سنوایا اور تو کہتا ہے کہ رات ضائع ہو گئی۔ خیر صبح کونسا تجھے دفتر جانا ہے۔ دیر تک سوتے رہنا" میں نے عرض کیا: "حضور اس کا تصور سونے کہاں دے گا۔" استاد "ہٹ بدمعاش" کہہ کر خاموش ہو گئے۔ اس سارے معاملے میں ان کی نیت اور مقصد کیا تھا اسے یا تو حفیظ جانتے یا ان کا خدا۔ لیکن مجھ پر یہ اثر ہوا کہ پہلے تو کبھی کبھی ریڈیو پر رنڈی کا گانا سن لیتا تھا اب یہ بھی ترک کر دیا۔ اس گانے میں تین حادثے ہوئے۔ توہینِ حسنِ نظر۔ استاد کی نیک کمائی کی بقدر پچاس روپیہ بربادی اور احساس گناہ بے لذت۔ شاید یہی سبق تھا جو استاد نے اس سلسلے میں بھی دیا۔

(۵)

میں بھی کبھی کبھی بدلے ہی لیتا ہوں۔ ایک مرتبہ حفیظ صاحب میرے یہاں تشریف فرما تھے۔ کچھ اور لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔ حسبِ معمول شعر و شاعری پر گفتگو ہو رہی تھی۔ بات کا رخ جو پلٹا تو دوستوں نے ان سے شعر سنانے کی فرمائش کی۔ حفیظ نے مجھ سے پوچھا "کونسی غزل پڑھوں۔ انہی دنوں ان کی غزل

جھگڑا دانے پانی کا ہے، دام و قفس کی بات نہیں

اپنے بس کی بات نہیں۔ صیاد کے بس کی بات نہیں

مشہور ہو رہی تھی۔ میں نے عرض کی "قبلہ وہ غزل سنائیے جس کا مقطع کچھ یوں ہے ؎

تجہیز و تکفین فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے

حفیظ ہنسے اور پھر فرمایا۔ "ہاں بیٹا تم فن شعر کو اسی قابل سمجھتے ہو اور استاد کو بھی" جب دوستوں نے اصل مقطع صر

تشکیل و تکمیل فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

سنا تو کھلکھلا کر ہنس دیے اور پھر جب غزل سناتے ہوئے مقطع پر آئے تو میری اصلاح کے ساتھ مقطع پڑھ کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

حفیظ نے "پیئے جا۔ اور پیتا ہوں میں چھپ کے ابر بہار میں" اور "جب وہ خود کہہ دے کہ پی تھوڑی سی پی میرے لئے" "پھر ابھی تو میں جوان ہوں" وغیرہ نظمیں ایسی ایسی ہی ہیں کہ انکو صوفیانہ رنگ دکھا ہے تقسیم ملک کے بعد حفیظ پہلی مرتبہ دہلی آئے تو بہت تھکے تھکے سے تھے قیام میرے یہاں لابدی تھا ورنہ ٹھائیں ٹھائیں ہو جاتی۔ دوپہر کو اس غرض سے لیٹے کہ دو گھنٹے اگر آرام فرمالیں تو شاید رات کے مشاعرے تک طبیعت بحال ہو جائے مگر نیند ہی نہ آئی۔ پانچ بجے کے قریب فرمایا "اودوارکے... بدن ٹوٹ رہا ہے۔ بستر سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ مشاعرے میں کیوں کر جانا ہو گا۔ غیر حاضر ہونا میں چاہتا نہیں کہ اس بہانے دہلی تک آپہونچا ہوں تو وہاں کیسے نہ جاؤں۔ تم دوافروش ہو طبیعت بحال کرنے کی کوئی ٹکیہ یا کوئی مسکچر بنواؤ اور پلاؤ جو کم از کم دو تین گھنٹے تک کے لئے توانائی بخش دے" میں نے عرض کی "حضور دوائی تو ایسی گھر میں موجود ہے جو پی لیجئے تو نہ صرف دو گھنٹے بلکہ رات کے دو بجے تک طبیعت میں جوانی کی لہر دوڑتی رہے"۔ فرمایا "جلد لاؤ"۔ میں دل میں خوش ہوا کہ آج استاد گرامی کو اصل معنوں میں شاعر بنانے اور جیتے جی جنت میں پہنچانے کا گر ہاتھ آگیا ہے۔ میں نے جھٹ دو سوڈے اور ڈبل اسکاچ کی بوتل حاضر کر دی فرمایا "لاحول ولا۔ تم غارت گر ایمان بن رہے ہو۔ میرے نزدیک یہ شئے حرام ہے"۔ میں نے بہت معصوم بن کر جواب دیا "ایسا نہ سمجھئے" پوچھا "پھر کیسا سمجھوں"۔ عرض کیا "میں اسے بطور شراب نہیں پیش کر رہا آپ بھی اسے شراب سمجھ کر نہ پیجئے۔ دوائی کی ضرورت ہے چند چمچے لے لیجئے۔ کسلمندی جاتی رہے گی" فرمایا "دوارکا یہ بہت بڑا عیب ہے" عرض کی "عیب کے بغیر زندگی کی تکمیل ممکن نہیں" فرمایا "یوں تو کئی عیب مجھ میں ہیں" میں نے کہا "ایک اور سہی" فرمایا "دوارکا جی۔ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ نئے گناہ کا بوجھ کیسے اٹھاؤں" عرض کی "حضور۔ تجربے اور گناہ کا عمر سے کیا تعلق ہے؟" میں نے بوتل ڈبے سے نکالی "دیکھئے کی بوتل بڑی پیاری ہوتی ہے" "آپ اگر شاعر ہیں تو لازماً حسن پرست ہیں۔ ایسی حسین چیز سے انکار کفر ہے۔ پھر ایک نکتہ اور بھی ہے" فرمایا "وہ کیا؟" میں نے کہا "آپ شاعری ہی میں نہیں ہر معاملے میں فکر نو اور اجتہاد کے علم بردار ہیں۔ اب تک یہ ہوتا رہا ہے کہ خوبی اور عیب۔ عادت کی صورت میں چھوٹوں کو بزرگوں سے ملتے رہے۔ اب اگر یہ عیب شاگرد سے استاد کو پہنچے تو کیسا رہے"۔ حفیظ اٹھ بیٹھے۔ خفگی سے نہیں بلکہ فیصلہ کن سنجیدگی سے بولے "بے معنی باتیں بند کر۔ لا اگر تو شراب پلا کر ہی خوش ہوتا ہے تو پلا دے"۔

میں حفیظ کی عادت اور فطرت سے خوب واقف ہوں اور جانتا ہوں کہ اکثر وہ محض امتحان کی غرض سے طرح دیتے جاتے ہیں۔ بحث کو طویل کر کے مزہ بھی لیتے ہیں اور جائزہ بھی کہ شاگرد ارتقائے خوب و زشت کی کس منزل پر ہے۔ یہی ان کی تربیت کا طریق کار ہے۔ صرف شعر کی اصلاح ہی مدنظر نہیں ہوتی وہ شاگرد کے پورے چلن کی اصلاح کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ حفیظ کو ان کے مزاج اور اصول کے خلاف کچھ کرنے پر مجبور کرنا ناممکن ہے

میں نے بھی بحث کو طول دینا پسند نہ کیا اور کارمنیٹو مکسچر کی بوتل منگوائی۔ یہ مرکب خوش ذائقہ اور خوش رنگ ہوتا ہے۔ میں نے ایک خوراک گلاس میں ڈال کر پیش کی اور اپنے گلاس میں حسب معمول وہسکی ڈال کر سوڈا ملایا۔ حفیظ نے کہا "میرے گلاس میں بھی سوڈا ڈالو"۔ میں نے کہا "دوا بد مزہ ہو جائے گی" فرمایا "تمہاری دوا کون سی خوش ذائقہ ہو گی"۔ میں وہسکی آہستہ آہستہ پیتا رہا۔ مگر حفیظ نے دوا کا گلاس ایک ہی دو سانسوں میں ختم کر دیا۔ میں نے پوچھا "قبلہ اگر یہ دوا بھی شراب ہو تو؟" فرمایا "میرا یقین ہے کہ تم دھوکا دینے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اور یہ یقین تجربے کی بنا پر ہے۔ بہر کیف اگر اس پر بھی تم نے کچھ کیا ہے تو میرا ضمیر صاف ہے"۔ قصہ مختصر۔ استاد کو ہم پیالہ بنانے کے لئے میرا یہ آخری... وار بھی خالی گیا۔

ایک اور واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ غالباً سنہ ۱۹۲۵ء میں حفیظ شاہ ابوالمعالی سے اچھرہ چلے گئے تھے۔ اس مکان میں حفیظ کی بیٹھک سڑک کے کنارے تھی۔ مسند ایک کھڑکی کے نیچے بچھی رہتی تھی۔ کھڑکی کے بالمقابل دیوار میں ایک الماری تھی۔ اس کے پٹ ہمیشہ کھلے رہتے تھے اس کے اوپر کے حصے میں ایک بوتل جن کی سربمہر پڑی رہتی تھی تین چار برس تو میں نے بھی اسے وہاں دیکھا پھر شاید کوئی اور دوست یہ کہہ کر لے گئے کہ اسلام میں تو بتوں تک کی پرستش حرام ہے اور تم جن کی بوتل کو پوجتے ہو۔ ہم سے یہ ذلیل قسم کا کفر برداشت نہیں ہوتا۔ یہ حرام شے آتش زدنی ہے اور ہم اسے آج ہی تنور شکم میں جھونک دیں گے چونکہ لیبل صاف نہیں تھا ایک مدت تک میں اسے تیل یا شربت کی بوتل سمجھتا رہا اور تعجب کرتا رہا کہ یہ استعمال میں کیوں نہیں آتی۔ آخر استاد نے بتایا کہ وہ شراب ہے۔ میں سمجھا شاید اسے دیکھ کر ہی نشہ حاصل کر لیتے ہونگے خیر میرے پوچھنے پر اتنی بوتل کی کہانی بیان کی کہ ایک دوست کو یہ بوتل کہیں سے مل گئی تھی۔ وہ پیتے نہیں تھے۔ میری نظم "پئے جا" اور "ابھی تو میں جوان ہوں" پڑھ کر سمجھے کہ میں پیتا ہوں۔ میری نذر کر گئے اب یہ مدتوں سے یہیں دھری تھی۔ آخر پینے والا آیا اور اصرار سے لے گیا۔

حفیظ کی دوستی کے سلسلے میں حفیظ کی سیرت کا ایک اور اہم پہلو موجودہ زمانے میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔۔۔۔

بدرالدین بدر میرے ایک نہایت مخلص دوست تھے۔ بے چارے سنہ ۱۹۴۸ء میں تپ دق کا شکار ہوگئے حفیظ صاحب کے ساتھ مخزن میں اسسٹنٹ ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ انگریزی ترجمہ اچھا کرتے تھے۔ خوش مزاجی اور خوش دلی کا یہ عالم تھا کہ مرض الموت میں بھی ہنستے ہنساتے رہے۔ میں آخری مرتبہ جب میو ہسپتال میں ان سے ملنے گیا تو وہ مسکراہٹ چہرہ پر کھیل رہی تھی جو عام ایام تندرستی میں ان کا طرہ امتیاز رہی ضعف سے یہ حال کہ غش پر غش آتے تھے مگر جب ہوش آتا اپنی روایتی خندہ پیشانی کو برقرار رکھتے ہوئے پوچھتے "شعلہ بھیا۔ ابھی بیٹھے ہو۔ معاف کرنا یار تمہارا وقت ضائع کر رہا ہوں۔ لیکن اور کتنا کرلوں گا" آہ۔ اس کے بعد وقت ضائع ہونے کا امکان ہی نہ رہا۔ ادھر میں دہلی پہنچا۔ ادھر میرے اس ایثار مجسم اور اخلاص شعار یار نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

حفیظ کا ایک خاص حلقۂ احباب تھا۔ بدر اس حلقے کے ایک باثر اور محبوب رکن تھے جو حفیظ، اختر، تاثیر، عباس، تبسم اور چغتائی سے عبارت تھا۔ اس آخری ملاقات میں بدر نے مجھ سے پوچھا "کیا آج کل حفیظ اور ہری چند اختر کے تعلقات کچھ کشیدہ ہوگئے ہیں؟ لوگ کہتے ہیں کہ حفیظ نے اختر کی مخالفت شروع کر دی ہے اور ہری چند کو ملازمت کے سلسلے میں حفیظ کے ہاتھوں نقصان پہنچا ہے۔ تم ان دونوں کے قریب ہو۔ تمہیں تو معلوم ہوگا کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ پہلے تو حفیظ ایسے کبھی نہیں تھے ان دو باہم فدائیوں کے ضرب المثل تعلقات میں تلخی کا پیدا ہونا تکلیف دہ بھی ہے اور حیرت کا باعث بھی" میں نے بدر کو بتایا کہ مجھے کسی شکر رنجی کا قطعاً کوئی علم نہیں۔ دونوں میں سے کسی نے کبھی ایک دوسرے کی مطلق شکایت نہیں کی۔ اور دونوں مجھ سے اکثر ملتے رہتے ہیں۔ بدر نے کہا ذرا پتہ تو لگاؤ۔ خدا کرے کوئی غلط فہمی نہ ہو کہ ایسے محبوب دوستوں میں غلط فہمی ہوئی تو اقدار دوستی ہی بے معنی ہو جائے گی۔ میں نے پتہ لگانے کا وعدہ کیا اور بادیدۂ نم رخصت ہوا۔ میں نے فوراً فوراً حفیظ اور اختر دونوں سے مناسب موقع محل دیکھ کر دریافت کیا۔ پنڈت کا جواب مختصر اور دافع تھا۔ "دوارکاداس تمہاری کج ادائی برداشت کرتا ہوں کہ تم مجھے عزیز ہو اور محبت سے مجبور ہوں کوئی اور میرے اور حفیظ کے تعلقات کے متعلق ایسا بے ہودہ سوال کرتا تو اسے عمر بھر منہ نہ لگاتا۔ بہر کیف اگر تمہیں معلوم نہ ہو تو اب بتا دوں کہ حفیظ میرا استاد، دوست، باپ اور بھائی ہے۔ اس کا ہر قدم میری بہتری کے لئے وقف ہے اور میں ایسا احسان فراموش اور محسن کش نہیں کہ مجھ سے کوئی ایسی بات پوچھے تو برا نہ مانوں۔ لو سنو۔ حفیظ نے بارہا مجھے برا بھلا کہا مگر میں نے جب ٹھنڈے دل سے غور کیا تو اپنی ہی حماقت کو اس کے لئے ذمہ دار پایا" اس کے بعد میں لاہور گیا تو حفیظ سے بھی پوچھ بیٹھا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہے پھر بس اتنا کہا "میرا اور پنڈت کا معاملہ باپ اور بیٹے کا ہے"[1]

---

[1] افسوس بدرالدین کی زندگی نے وفا نہ کی ورنہ وہ حفیظ اور ہری چند اختر کے یہ جواب سن کر بڑے خوش ہوتے کہ وہ دوستوں کے حقیقی خیر خواہ تھے۔

دونوں ہی کے درمیان رہنا چاہیئے البتہ تم سے میں نے کوئی برائی کی ہو تو کہو۔ غالباً تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں اور مت بھولو کہ ہری چند مجھے تم سے کہیں بڑھ کر عزیز ہے۔ میں نے یہ وضاحت بھی اس لئے کی ہے کہ تمہیں میں نے خود گستاخ رکھا ہے اور جوابدہی میرے ذمہ ہے ورنہ میرے اور میرے محبوب دوست کے معاملات میں دخل دینے کی جرأت کون کر سکتا ہے ؟"

میرے حفیظ کی آمدنی نہ جانے کتنی ہے کروڑوں نہیں تو لاکھوں کی تو ضرور ہونی چاہیئے۔ کیوں کہ جب ان کی شہرت ملک کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی ہے بلکہ نیم براعظم ہی نہیں افریقہ۔ یورپ۔ امریکہ اور روس جہاں بھی کوئی اردو جانتا ہے۔ حفیظ کو اپنے دل کا شاعر گردانتا ہے تو لازماً حفیظ کو ضرور دولت مند ہونا چاہیئے۔ نام بڑا درشن چھوٹے کی کہاوت موجود ہے لیکن کیا ضرور ہے کہ حفیظ بھی اس کہاوت کا حقدار ہو۔ لیکن یہ دولت کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔ وہ معاش بد کی بھی توفیق نہیں رکھتے۔ ادھار بھی نہیں مانگتے دیکھے گئے۔ پھر کیسے سمجھا جائے کہ وہ فارغ البال ہیں۔ اپنے کنبے کے متعلقات کے بھی کفیل ہیں۔ دوست احباب کی مدد بھی کر دیتے ہیں۔ آخر ایک مدت کے بعد میں یہ جاننے کے لئے مجبور ہو گیا کہ حفیظ جیسے صاحب طرز نظم نگار اور انشاپرداز کو نہ گھر میں تسکین میسر ہے نہ گھر سے باہر۔ مشہور ترین شاعر ایسا دکھی ہے کہ اس سے زیادہ دکھیا شاید کوئی نہ ہو۔ لیکن میں نے ان کو دکھ کی باتیں اس طرح ہنسی میں لپیٹتے دیکھا ہے جیسے خون کے قطروں کو پھول بنا رہے ہوں۔ ان کی شہرت غرض کے بندوں کا حلقہ ان کے گرد وسیع تر کرتی رہتی ہے جیسے چاند جتنا روشن اور مکمل ہو، ہالہ بھی اتنا ہی واضح اور گہرا ہوتا ہے۔ حفیظ کی بدنصیبی ہے کہ دوست تو خیر دوست ہے۔ دشمن بھی مدد مانگے تو وہ انکار نہیں کر سکتے۔

پھر جب اسے ایسی مالی مدد حاصل کرنے والوں سے گالی ملتی ہے تو کبھی کبھی بعد میں اپنا وقت اور اپنا پیسہ ضائع کرنے کا وقتی افسوس بھی ہوتا ہے۔ ہر مرتبہ عہد کرتے ہیں کہ اب ایسا نہیں کروں گا مگر یہ عہد جبھی تک استوار رہتا ہے جب تک کوئی اور مانگنے اور طلب کرنے والا نہ آجائے ان کی اس کمزوری کی حد یہ ہے کہ دوارکا داس شعلہ نے کبھی اچھی خاصی رقم مانگی تو حفیظ نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ شعلہ کی آمدنی ان کی آمدنی سے کہیں زیادہ ہے، فوراً انتظام کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ "دوارکے روپیہ لے لو۔ یہ تمہاری دولت اور تمہارا ورثہ ہے۔ لیکن، اسے اوباشی میں ضائع نہ کرنا ورنہ جواب دہ رہوگے اور میں نہیں چاہتا کہ تم کسی کے روبرو بھی جواب دینے پر مجبور ہو"

ساری دنیائے ادب میں مشہور ہے کہ حفیظ شادیاں کرتا چلا جاتا ہے اور بعض لوگ اسے دیکھتے ہی پوچھتے ہیں کہ حضرت نئی شادی کب ہو رہی ہے حفیظ۔ ابھی تو میں جوان ہوں کہہ کر ہنس دیتے ہیں۔ ہاں حفیظ نے تین شادیاں کی بھی ہیں۔ ہماری دنیا کی نزدیک یہ حفیظ کے چلن کی خوبی۔۔کی دلیل نہیں۔ دوسری شادی پہلی بیوی کی زندگی میں کی تھی۔ میرے نزدیک بھی یہ بات جائز نہیں تھی کیونکہ اس میں حق تلفی اور دل شکنی کے پہلو نکلتے ہیں۔ اور اس خرابی کا ناگوار اثر ایسی تلخی پیدا کرتا ہے جو اولاد تک پہنچ سکتی ہے لیکن جب مجھے اصل وجہ اور اصل صورت حالات معلوم ہوتی تو خود میرے آنسو نکل آئے۔ حفیظ شاعری کے سبب گھر سے نکال دیئے جانے یا نکل جانے کے بعد سے تن تنہا مرد اپنے گھر میں ہے پہلی بیوی سے آٹھ لڑکیاں ہی پیدا ہوئیں اور پھر بیماری کے بعد بیوی کو لڑکے کی آس نہ رہی۔ لہٰذا خود اس کی بیگم ہی نے اصرار کر کے حفیظ کو ایک اور بیوی کرنے اور اس طرح اپنی بیٹیوں کا بھائی حاصل کرنے کے لئے حفیظ کو مجبور کر دیا۔ لیکن اس دوسری بیوی سے بھی لڑکی ہی نصیب میں آئی۔ مجھے تعجب ہے کہ حفیظ نے اپنی بیوی کی یہ بات کیسے مان لی۔

میرا حفیظ ایک شفیق باپ کی طرح یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کی اولاد میں بھی وہ عیب ہوں جو اس میں ہیں جیسے کوئی شرابی باپ اپنے بیٹے کی ..... شراب نوشی کو پسند نہیں کر سکتا۔ میری شادی سنہ ۱۹۲۹ء میں ہوئی۔ دس برس تک اولاد نرینہ نہ ہوئی تو گھر میں میری دوسری شادی کی تجویزیں ہونے لگیں حتیٰ کہ میرے خسر تک نے اجازت دے دی۔ مگر جب میں نے حفیظ صاحب سے استفسار کیا تو فرمایا: "اگر لڑکے اس بیوی سے بیٹا نہ ہوا تو اس کا کیا یقین ہے کہ دوسری سے ضرور ہوگا۔ بیٹا ہوگا کہ نہیں ہوگا یہ تو خدا جانے مگر اس نیک طینت اور

نیک سرشت لڑکی کو کس درجہ ذہنی اذیت اور اذیت ہوگی۔ اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ گناہ ہے۔ میں ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ مجھے تمہارے والد اور تمہارے خسر کی رائے سے اتفاق نہیں کہ تمہاری خوشنودیٔ خاطر کے لئے ایک اور بے زبان خاتون کو قربانی کا بکرا بنانے میں کوئی دریغ نہیں۔ میں نے کہا والد اور خسر کی اجازت میں میری بیوی کی اجازت بھی شامل ہے۔ فرمایا بکری بھی مذبح میں اپنے پاؤں سے چل کر پہونچتی ہے۔ خیر تمہیں اجازت ہے کہ جو چاہو کرو مگر میری اجازت کو تمہاری دوسری شادی میں دخل نہ ہوگا۔ پھر پوچھا "مرزا[1] سے اجازت لے لی" میں نے کہا "جی نہیں" فرمایا "ان سے پوچھ لو اگر وہ رضامند ہوں تو میری اجازت بھی ان کی اجازت میں شامل سمجھو" یہ میرے استاد کی استادی تھی۔ وہ مرزا کے چلن سے خوب واقف تھے۔

مرزا تو اس درجے سخت گیر تھے کہ ذرا سی دل شکنی کی بھی اجازت نہ دیتے یہاں تو میری بیوی کی دل شکنی مستقل صورت اختیار کر جاتی۔ وہ تو یہ بھی روا نہ رکھتے تھے کہ کوئی شخص بیوی کے ہوتے عارضی تسکین کی خاطر طوائف ہی کا کوٹھا دیکھ لے اور پھر ایسی صورت میں جب کہ مرزا صاحب دوسرے کہاروں کے ساتھ دادی کی ڈولی کو میرے گھر تک دو میل اس لئے سہارا دیتے چلے آئے تھے کہ وہ ان کی بہو تھی اور اس کی عزت و توقیر ان کا فرض۔ وہ اسے کیوں کر گوارا کر لیتے کہ ان کی زندگی میں اس پر سوکن آجائے۔ بہر کیف میرے ازدواج ثانی کا معاملہ دب گیا۔ لیکن حفیظ نے اپنے والد، بہنوں اور عزیزوں کے اصرار کو رد کر دیا۔ لیکن اپنی پہلی بیوی کو یہ سمجھا سکے کہ بیٹے کی کیا ضرورت ہے۔ بات اصل میں یہ تھی کہ حفیظ کو خود بھی ایک بیٹے کی اپنے لئے نہ سہی اپنی بیٹیوں کے لئے بھائی کی ضرورت تھی۔ اس معاشرے میں یہ ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب کہ ان بے چاریوں کا اور کوئی بجز خدا کے نہو۔ تیسری بیوی تو خیر پہلی دولوں سے رنڈوا ہو جانے کے بعد تھی ہی لازم۔ تنہائی کے علاوہ کے علاوہ شاید ایک بیٹے کی طلب بھی اس میں شامل ہو۔ اور اللہ میاں نے شاید شرط باندھ رکھی ہے کہ اتنے زندہ و پائندہ اشعار جو معنوی اولاد نرینہ کی فوج در فوج کی صورت میں تم کو دیدیے ہوئے ہیں اور جو جوان اور تیری جوانی کے پاسبان رہنے والے ہیں پھر تجھ کو جسمانی اولاد نرینہ کی ... ضرورت کیوں ہے؟ اب اللہ سے کون جھگڑا کرے ... کہ حفیظ کو بیٹا نہیں، بہنوں کو بھائی کی ضرورت ہے اور معاشرہ جیسا کچھ ہے کیا اللہ اس سے واقف نہیں۔ اب جب حفیظ کی تیسری بیوی سے بھی بیٹی ہی نصیب ہوئی تو ایسا معلوم ہوتا ہے اس نے اس کا تمام رضا رکھ کر اللہ کی رضا کے سامنے سر ڈال دیا ہے

اپنے لئے شاید "بے وقوف" لیکن دوسروں کے حفیظ کس درجے دور اندیش کس جگہ دور رس کے مالک ہیں۔ ان کا مشورہ کس قدر قیمتی ہوتا ہے اس کا اندازہ ان واقعات سے کیجئے جو میں اب عرض کرنے والا ہوں۔

سنہ ۱۹۳۹ء میں میرے والد کا انتقال ہوا تو حفیظ کو بھی صدمہ ہوا کہ ان کے آپس میں نہایت مخلصانہ تعلقات تھے۔ کئی دن تک وہ روزانہ ہمارے یہاں آتے رہے ایک دن فرمایا، دیکھو وہ اثر اور ڈر جس نے تم بھائیوں کو یکجا باندھ رکھا تھا وہ اب نہیں رہا۔ چند دنوں میں خود سری سر اٹھائے گی۔ جھگڑے ہونے لگیں گے۔ اگر تم اس مشکل سے بچنا چاہتے ہو تو اپنے کاروبار کی شاخیں کھول دو۔ اور ایک ایک شاخ پر ایک ایک بھائی کو بھیج دو۔ شاخیں دوسرے شہروں میں ہوں تاکہ ایک ساتھ رہ بھی نہ سکو۔ دور رہنے سے محبت نہ صرف قائم رہے گی۔ بلکہ اور بڑھے گی۔ میں نے اس مفید اور سو فی صدی کار آمد مشورے پر توجہ نہ دی مبادا لوگ یہ سمجھیں کہ والد کے مرتے ہی بھائیوں کو گھر سے نکالنا شروع کر دیا۔ مگر چند ہی دن میں انکی پیشین گوئی حقیقت کا رنگ اختیار کرنے لگی۔ مجبوراً استاد کی رائے پر عمل کرنا پڑا۔ ایک شاخ سنہ ۱۹۴۰ء میں دہلی میں کھولی اور کچھ عرصے بعد دوسری کراچی میں۔ وہاں سے انہی بھائیوں کے جو جان کے لاگو ہو رہے تھے۔ محبت بھرے خط آنے لگے۔ تحفے تحائف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک بھائی نے تو اپنا لڑکا میرے پاس اس خیال سے بھجوا دیا کہ میرے پاس اس کی تربیت بہتر ہو سکے

---

[1] مرزا یگانہ لکھنوی۔ آپ ان دنوں دکن میں تھے۔ حفیظ صاحب کے بہت قدردان اور میرے بہت بڑے مہربان تھے۔

گی۔ میں جب کبھی دہلی آیا میری پرستش ہوئی اور جب وہ لوگ لاہور آتے تو قابل رشکِ محبت کے مظاہرے ہوتے۔ سنہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم ملک نے یہ ارضی جنت برباد کردی اور اب پھر پہلے کی سی دوزخ کی گرمی ہے اور گنگا جمنی ثقافت قصۂ پارینہ اور محض دل خوش کن خواب ہو کے رہ گئی ہے۔

شاعر حفیظ کی بصیرت کا عالم بھی حیران کن ہے۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں فسادات کا آغاز ہوا تو میں نے حفیظ سے رائے طلب کی۔ حفیظ نے کہا کلکتہ اور بمبئی میں تو فساد رک بھی جائیں گے۔ خدا نہ کرے پنجاب تک یہ وبا پہونچ جائے ورنہ بربادی نظر آتی ہے۔ یہاں یہ ختم نہ ہوں گے۔ میں نے ہنس کر کہا "قبلہ فسادات تو یہاں پہلے بھی کئی بار ہو چکے ہیں" حفیظ نے کہا۔ مجھے ہوا میں سے خون کی بو آتی ہے۔ میری رائے میں معاملہ بے ڈھب ہے"

لاہور میں سنہ ۴۷ء کے مارچ میں پہلا جھگڑا ہوا تو وہ دوڑے دوڑے پہونچے اور کہا "دوارکا داس، گھر والوں کو ابھی سے پہاڑ پر بھیج دو۔ تمہارے سوا اور کوئی لاہور میں نہ رہے اور دیکھو اس قدر سامان ہمراہ کر دو کہ برس بھر انہیں لاہور سے کچھ نہ منگوانا پڑے۔ کاروبار دہلی اور کراچی کی معرفت زیادہ کرو۔ ادھار دینا قطعی بند کردو" میں ہنس دیا اور ان کے مشوروں کو شاعرانہ اور عملی دنیا کے لئے بے معنی قرار دیا۔ مگر کچھ دن بعد حالات دگرگوں ہوگئے۔ بچوں کو ڈلہوزی تک پہنچوایا اور وہ بھی بے سروسامانی کی حالت میں۔ دکان کا مال دہلی بھیجنا چاہا مگر اب رسل و رسائل کے ذرائع مسدود ہو چکے تھے۔ کچھ کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اگست میں حالات ناقابل برداشت ہوگئے تو میں بھی دہلی پہونچا۔ جب تک لاہور میں رہا مسلمان دوست اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر میری حفاظت کرتے رہے۔ ان لوگوں نے میری خاطر کیا کیا قربانیاں کیں۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خدا نے توفیق دی تو کبھی عرض کردوں گا۔ میں دسمبر میں واپس لاہور گیا تو محلے کے محلے لٹ چکے تھے مگر میرا گھر، دکان اور شاہدرے کے گودام قطعی محفوظ تھے۔ کوئی چیز اپنی جگہ سے ہلی تک نہ تھی۔ حفیظ صاحب خود بھی روئے اور مجھے بھی رلایا۔ جب انہیں پتہ چلا کہ میں کاروبار شروع کرنے کے ارادے سے آیا ہوں تو بہت خوش ہوئے۔ اپنے پاس ماڈل ٹاؤن میں ٹھہرانا چاہا مگر میں مصلحتاً دکان سے قریب رہنا چاہتا تھا۔ ماڈل ٹاؤن دور تھا۔ جب دکان کھلی مال دھڑا دھڑ بکنا شروع ہوگیا۔ حفیظ آتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی یہ بھی پوچھتے "اس قدر تیزی سے مال کیوں بیچ رہے ہو؟" ان دنوں میں ہندو تھا بھلا مسلمان سے سچ کیوں کر کہتا۔ انہی دنوں استاد نے کہا: "بیوی بچوں کو بھی لے آؤ۔ اپنی جائداد واگزار کروالو اور اب واپس جانے کا خیال ترک کردو۔ یہاں جو آسانیاں میسر ہیں وہ دلی میں نہ ہوں گی" مگر میں ہندو ہو چکا تھا ایک مسلمان کا مشورہ کیسے قبول کرلیتا خیر اب نتیجہ بھگت رہا ہوں۔ ایسی کس مپرسی کی زندگی بسر کر رہا ہوں جس میں ذلت کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

(۶)

حفیظ کے ہاں میں تو ماڈل ٹاؤن میں نہیں ٹھہرا تھا لیکن سر سری رام کے ہاں مشاعرے کے بلاوے پر حفیظ کبھی دہلی آتے ہیں تو مشاعرے والے ان کو ان کی شان کے شایان ٹھہرانا چاہتے ہیں لیکن وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ سیدھے میرے یہاں پہونچنا ان کے لئے لازم ہے میری حالت دیکھ کر انہیں افسوس تو ہوتا ہے۔ اپنی رائے بھی یاد آتی ہے مگر یہ بھی جانتے ہیں کہ تقدیر کے مقابلے میں تدبیر کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ وہ خود ہی تو کہہ چکے ہیں ع

ایک ایک قدم پر ہے جہاں خندۂ تقدیر
تدبیر گزرتی اسی راہ گذر سے

سنہ ۱۹۴۵ء کے قریب دہلی والے بھائی نے چاہا تھا کہ دہلی میں اپنی جائداد بھی ہونی چاہیئے۔ اس مقصد کے پیش نظر ایک نہایت اچھی کوٹھی کی تجویز پیش کی تھی۔ یہ بھی لکھا تھا کہ کاروبار مستقل صورت اختیار کر چکا ہے۔ دکان کے لئے عمارت اپنی ہو تو اور بھی مناسب ہے اپنی مرضی سے قطع و برید کرسکیں گے۔ فوارے کے پاس ایک نہایت اچھی دکان بکاؤ تھی۔ دونوں کی قیمت تین لاکھ کے قریب

بتاتے تھے مجھے اپنے بھائی کی تجویز سے اتفاق نہ تھا کیوں کہ میرے خیال میں جائداد وطن ہی میں ہونی چاہئے۔ بہرحال بھائی کے اصرار سے متاثر ہو کر میں دہلی آیا۔ حفیظ ان دنوں یہاں جنگی پبلسٹی کے ڈائرکٹر تھے۔ ان سے مشورہ کیا تو فرمایا۔ دونوں خرید لو۔ کوٹھی بھی دوکان بھی بلکہ ایک دوکان رہنے کے مکان سمیت کناٹ پیلس میں بھی لے لو۔ وہ جانتے تھے کہ چار پانچ لاکھ میں صرف کر سکتا ہوں۔ دلی کا کاروبار منافع بخش ہے اور ایک بھائی کو یہاں ہمیشہ رہنا ہی پڑے گا۔ ان کے نزدیک اس تجویز میں ایک اور خوبی یہ تھی کہ اگر کبھی بھائیوں میں تنازع ہوا تو یہ جائداد دہلی والے بھائی کو دی جاسکے گی۔ حسب معمول میں نے ان کا مشورہ نہ مانا کیوں کہ میں ازلی احمق اور ضدی ہوں۔ لاہور میں تین ہزار گز زمین خرید کر کوٹھی بنوانا شروع کردی جو باقی جائداد کے ساتھ تقسیم ملک کے سلسلے میں لبسبب آزادی ہوگئی ورنہ اگر وہ جائداد دہلی میں لے لی ہوتی تو اب وہ پندرہ لاکھ کی ہوتی اور رہنے کے لئے ایک باوقار جگہ الگ۔

(۷)

حفیظ صاحب کی دور اندیشی کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ جن دنوں میرے والد مرض الموت میں گرفتار تھے ایک تو ان کی بیماری ہی سخت تکلیف دہ تھی۔ دوسرے لوگ اوپر سے بہت پریشان کرتے تھے۔ وصیت نصیحت کے لئے بڑی لے دے ہو رہی تھی۔ والد مرحوم کا بہت بڑا کاروبار تھا اور جائداد تھی۔ ایک قریبی رشتہ دار چاہتے تھے کہ وہ اختیارات انہیں سونپ جائیں اور کھلے بندوں فرماتے تھے کہ دوارکا داس نرا شاعر ہے یعنی بے کار محض گاؤدی خر۔ اگر املاک کی ذمہ داری اس پر چھوڑی گئی تو چند دن میں ٹھکانے لگا دے گا۔ وہ صاحب اثر تھے ہی اور اکثر رشتہ دار بھی ان کے ہم نوا۔ خاص کر میرے والدہ کے عزیز کہ میں اس والدہ کا سوتیلا بیٹا تھا۔ ہر روز نئی تجویزیں ہوتی تھیں اور والد کو گھنٹوں پریشان کیا جاتا تھا۔ حفیظ عیادت کو آتے رہتے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھتے تو بہت کڑھتے فرماتے۔ دولت بھی کیسی لعنت ہے کہ ایک بھلے مانس کو اطمینان سے مرنے بھی نہیں دیتی۔" ایک دن وہ بڑے دل گرفتہ تھے۔ مجھے اکیلے میں لے گئے اور کہا۔ دیکھو دوارکے۔ تمہارے پتا جانکنی کے عالم میں ہیں اور غرضمند انہیں اس درجہ پریشان کر رہے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ میرے پاس اگر دولت ہوتی تو میں تمہیں دیدیتا اور کہتا کہ یہ لے لو اور والد کو آرام سے مرجانے دو۔" میں نے کہا۔ "قبلہ میرا تو کوئی مطالبہ نہیں" پوچھا۔ "سچ کہتے ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ فرمایا۔ تمہارے بھائی تمہارے ساتھ ہیں" میں نے کہا "جی سب" فرمایا۔ "انہیں بلاؤ اور ایک بڑا سا سفید کاغذ بھی لاؤ۔" میں نے کاغذ حاضر کردیا۔ فرمایا۔ "اس پر نیچے دستخط کردو اور بھائیوں سے اس کے نیچے دستخط کرا لو" دو بھائیوں نے کہ صرف وہی بالغ تھے دستخط کردیئے پھر فرمایا۔ اچھا اب ذرا والد سے ملوادو۔" اتفاق سے والد کے کمرے میں اس وقت صرف نرس تھی۔ حفیظ صاحب اور دونوں بھائی والد کی خدمت میں پہونچے۔ حفیظ صاحب نے سلام کیا اور کہا کہ "انشاء اللہ آپ جلد تندرست ہو جائیں گے۔ لوگ خواہ مخواہ آپ کو تنگ کرتے ہیں۔ صحت مند نہیں ہونے دیتے۔ بہرکیف آپ کو میرے شاگرد اور اس کے جوان بھائیوں کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ انہیں آپ کی تندرستی سب سے زیادہ عزیز ہے۔" یہ کہہ کر وہ کاغذ والد کے حوالے کردیا اور کہا کہ "اطمینان سے ان کے متعلق جو حکم چاہیں صادر فرمادیں انہیں اعتراض نہیں ہوگا۔ آپ جلد اچھا ہونے کی کوشش فرمائیے کہ ان بچوں کی خوش بختی کا تعلق براہ راست آپ کی زندگی اور تندرستی سے ہے۔" میں نے والد کے قدم چھوئے اور ہم سب حفیظ صاحب کے اشارے پر باہر نکل آئے۔ ہم نے دیکھا کہ والد مرحوم کی آنکھوں میں کاغذ دیکھ کر آنسو تیر آئے تھے۔ حفیظ کچھ دیر رک کر اور ہمیں یہ نصیحت کرکے کہ "اگر تمہارے بہی خواہ۔ تمہیں اپنے حق کے مطالبے پر اکسائیں تو کسی کی نہ سننا۔" چلے گئے۔ شام کو وہی صاحب اقتدار جو مزید اقتدار چاہتے تھے۔ ڈاکٹر اور وکیل کو لے کر آگئے۔ وصیت لکھی جاچکی تھی۔ وکیل صاحب بطور گواہ اور نویسندہ کے آئے تھے اور ڈاکٹر صاحب یہ تصدیق فرمانے کے لئے کہ مریض نے تمسک پر دستخط بہ قائمی ہوش و حواس کئے ہیں۔

وہ پہونچے تو والد نے ہمیں بھی یاد فرمایا۔ یہ بات ان "کرم فرمائے جاہ طلب" کی خواہش اور توقع کے خلاف تھی۔ فرمایا۔ "ان کی کیا ضرورت ہے؟ آپ خود مالک ہیں۔ اپنی مرضی سے جو چاہیں کریں۔" والد نے کہا۔ "آخر یہ میرے بیٹے ہیں۔" غرض ہم حاضر ہوئے تو والد نے وصیت[1] مجھے دی اور کہا کہ ذرا بلند آواز سے پڑھتے جاؤ۔ میں نے چند سطریں ہی پڑھی ہوں گی کہ والد نے کاغذ واپس لے لیا اور ان سے کہا کہ میں کمزوری زیادہ محسوس کر رہا ہوں اور ایسی اہم دستاویز پر غور کرنا فی الحال میرے لئے ممکن نہیں۔ اس پر وہ صاحب جلد باز بڑے جز بز ہوئے اور کہا کہ پڑھنے والی تو اس میں کوئی بات نہیں کہ ہر تفصیل فیصلہ شدہ ہے۔ صرف دستخط کر دیجئے۔ اصل بس نقل آپ کے پاس رہے گی۔ اطمینان سے پڑھتے رہیے گا۔۔۔ وکیل اور ڈاکٹر صاحب کو خاص اہتمام سے لایا ہوں کہ کثیر المشاغل ہیں۔ دوبارہ آنے میں انہیں تکلیف ہوگی۔ والد نے مجھ سے کہا۔ "ان دونوں کی فیس جو یہ چاہیں ادا کر دو" اور ان سے کہا کہ آپ کی تشریف آوری کا شکریہ۔ ضرورت ہوئی تو میں آپ کو پھر زحمت دوں گا

والد خود اتنی دیر میں ضعف کے مارے نڈھال ہو گئے تھے فرمایا۔ "مجھ میں اب اور بات کرنے کی ہمت نہیں۔ آپ بار بار آنے کی زحمت نہ کریں۔ ذرا طبیعت بہتر ہوتی ہے تو میں خود پیغام بھیج کر بلوا لوں گا۔ انہوں نے کہا۔ "مگر آپ کی حالت ....." "ہاں ہاں میں خوب جانتا ہوں میری حالت تشویشناک ہے۔ تقدیر اگر فرصت نہ دے تو کیا چارہ ہے" والد نے فرمایا اور ذرا خفگی کے لہجہ میں مجھ سے کہا۔ "بیٹا میری حالت دیکھ رہے ہو۔ اب ٹلتے کیوں نہیں"۔ سب لوگ رخصت ہو چکے تو مجھے پھر یاد فرمایا اور اس تمسک کو جلانے کا حکم دیا۔ وہ جل چکا تو ہمارا دستخط شدہ کاغذ مجھے دیتے ہوئے کہا کہ اپنے استاد کی موجودگی میں اسے بھی تلف کر دینا اور پھر قریب بلا کر سینے سے لگایا پیار کیا اور فرمایا حفیظ کو تسلی دو اور جاؤ اب آرام کرو۔ حفیظ دوسرے دن تشریف لائے تو میں نے گذشتہ روز کے واقعات کی تفصیل عرض کی اور کاغذ نذر کیا۔ آپ نے فرمایا۔ "مجھے ایسی ہی امید تھی۔ کاغذ پھاڑ دو۔" اب اس واقعہ سے اندازہ فرمائیے کہ حفیظ مردم شناسی کی کتنی صلاحیت رکھتے ہیں اور انسانی نفسیات کی گہرائی تک پہونچنے کی کس قدر توفیق۔ ان کا مشاہدہ کتنا گہرا ہوگا اور تجربہ کیسا وسیع کہ معاملے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور اس کی تہہ تک پہونچ گئے۔ کاش وہ اپنے معاملات میں بھی ایسے ہی دانا ہوتے۔!

(۸)

حفیظ ۳۰ مارچ سنہ ۱۹۶۱ء کو دہلی پہونچے۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ وہ تشریف لا رہے ہیں مگر یہ کہ ہوائی جہاز سے آ رہے ہیں یا ریل گاڑی سے۔ یہ معلوم نہ تھا۔ بغیر اطلاع کے انہیں کہاں ڈھونڈوں۔ بہر کیف ۳۰ کی دوپہر کو ساڑھے بارہ بجے کے قریب میں حسب معمول اپنی میز پر سر جھکائے مشق خطوط نویسی فرما رہا تھا کہ وہ صاحب فیض جس کی راہ میں آنکھیں بچھانا میری خوش بختی کی دلیل ہے نہایت غیر رسمی طریقے سے آدھمکے اور اپنے روایتی لہجے میں فرمایا۔ "اوئے دوارکے۔ بچو توں ایتھے وی شاعری توں باز نئیں آوندا" میں اچک کر اٹھا۔ ان کے قدم چھونے کو جھکا تو انہوں نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے اور فرمایا "آؤ پیارے گلے تو ملو۔ دیکھو زندگی نے ایک اور موقع تم سے ملنے کا مہیا کر دیا۔ میں بہت خوش تھا اور کیوں کر نہ ہوتا کہ اب سارے طول و عرض، ہند و پاک میں واحد حفیظ کی ذات ایسی رہ گئی ہے جس کی محبت میرے لئے قطعی بے لوث ہے۔ ایک ایسا انسان جو صرف فیض پہونچانا جانتا ہے اور کسی صلے کا روادار نہیں۔

ان کے قیام دہلی کے زمانے میں اکثر میں ان کی خدمت میں رہتا ہوں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں بھی کچھ صرف کر دیتا ہوں۔ حفیظ اکیلے ہوں تو طرح دے جاتے ہیں اور اگر دوست احباب کو بھی ان سے ملنے کو بلا لوں تو ضرور فرمائیں گے۔ میرے عقّلنے سے دوارکے پر بڑا بوجھ پڑتا ہے مگر کیا کروں میں اس کے ہوتے ہوئے اور کہیں ٹھہر بھی تو نہیں سکتا۔" یہ اس بلند مرتبہ بزرگ کی ظاہرداری ہے ورنہ حقیقت

---

[1] والد نے وصیت نہ کی اور میں ان کے انتقال کے بعد رائج الوقت ہندو قانون وراثت کی رو سے خاندان کا سربراہ قرار پایا

یہ ہے کہ رخصت کے وقت جو جیب میں ہوتا ہے مجھے دے جاتے ہیں یا میرے نواسوں میں بٹ جاتا ہے۔

سنہ ۱۹۵۹ء میں آئے تو ایک فلمی مشاعرے سے کئی سو ملے۔ جاتے وقت تین سو مجھے مرحمت ہوئے۔ میں نے عرض کی حفیظ صاحب میں اس قدر نادار نہیں ہوں کہ آپ مالی امداد بھی فرمائیں۔ فرمایا، نہیں بھئی، مجھے معلوم ہے کہ تم بنیئے ہو۔ سو روپیہ کماؤ گے تو یقیناً ضرور پس انداز کرتے ہو گے اور میں دعا کرتا ہوں خدا تمہیں اور بھی دے۔ ہاں تو اب یہ کرو کہ ان تین سو کا بھی اس مال غنیمت میں اضافہ کر لو جو تمہاری تجوری میں بند ہے۔ میں نے پھر انکار کیا تو ذرا ڈانٹا اور فرمایا۔ تو خالص گدھا ہے، تنا نہیں سمجھتا کہ میں قانون کے مطابق پچاس روپے سے زیادہ اپنے ساتھ وہاں سے لا نہیں سکتا۔ یہاں جو کچھ ملے وہ میرا نہیں ہے۔ مجھے اسمگلر بھی بننا نہیں ہے۔ یوں بھی تو سرحد کے محررچوں سرکار ضبط کر لیں گے آوارگی میں صرف نہیں کر سکتا کہ ابھی تک کوئی آوارہ کن حسن نظر ہی نہیں آیا اور پھر میاں میں یہ کب کہتا ہوں کہ تم یہ رقم اپنے صرف میں لے آؤ۔ یہ تو امانت ہے، آتا رہتا ہوں جب کبھی یہاں عیش کو جی چاہا، ضرورت پڑے گی تو لے لونگا۔ اب کیا جواب دیتا، روپے رکھ لئے یا عنت ریود کر لئے اس عنت ریود میں اضافہ ہی ہوا۔ میں نے بھی شیر مادر نہیں شیر پدر سمجھ لیا۔ ہر مرتبہ اس امانت میں دو سو کا اضافہ کیا ہے۔ آخر ہم لوگ سود خوار ہیں۔ افسوس صرف یہ ہے کہ وہ ساری رقم مجھ ہی کو نہیں دیتے بعض دوسرے دوستوں کے بچوں میں تقسیم کر جاتے ہیں

خاص طور پر ہر سال وہ دہلی کلاتھ ملز کے سالانہ مشاعرے میں شرکت کے لئے آیا کرتے ہیں جہاں اپنے معزز مہمانوں کے قیام و طعام کا میزبانوں کی طرف سے نہایت شاندار اور حسب خواہ انتظام ہوتا ہے مگر حفیظ نوازتے مجھی کو ہیں۔ میرا گھر آسائشوں کے لحاظ سے سخت ناپسندیدہ علاقے میں واقع ہوا ہے اور بے سر و سامانی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ انہیں میرے یہاں ٹھہرنے سے یقیناً تکلیف ہوتی ہے مگر وہ اس تکلیف پر ہر ممکن آسائش قربان فرما دیتے ہیں۔

سنہ ۱۹۵۴ء میں شاید وہ پہلی مرتبہ تقسیم ملک کے بعد دہلی آئے۔ میرے یہاں قیام فرمایا۔ میں نے چاہا وہ کسی اچھے ہوٹل میں رہیں۔ ان کی وجہ سے میں بھی چند دن آرام سے بسر کر لوں گا۔ میری تجویز پر آپ نے پوچھا یہاں کونسا اچھا ہوٹل ہے۔ میں نے امپیریل کی تعریف کی۔ فرمایا مجھے معلوم نہ تھا کہ تو انگریز ہو گیا ہے۔ خیر تیرا جی چاہے تو ہوٹل میں اٹھ جائیں تو اپنے بچوں ہی میں رہوں گا۔ میں دہلی بچوں کی خاطر آتا ہوں کیمپرینے کے لئے نہیں آیا۔ انگریزی ہوٹلوں کے آرام اور آسائش کی خاطر نہیں۔ میں شرمندہ ہوا۔ ہم گھر آ گئے۔ میں ہر کمی کے لئے معذرت خواہ ہوتا تھا اور وہ حیران کہ دوارکے تیرا شاید دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مزاج بگڑ گیا ہے۔ گھر کی کوئی چیز پسند نہ رہی۔ میری بیوی سے پوچھا اسے گھر سے محبت نہیں رہی۔ بڑھاپے میں اوباش تو نہیں ہو گیا۔

ایک دن کے بعد دوسرے دن ان کی بندہ نوازی نے یہ شان اختیار کی کہ اگر کھانے میں تین سالن پکے ہیں تو دو کو ہاتھ نہ لگایا۔ اور پھر حکم کہ دیکھو شام کے کھانے میں صرف مونگ کی دال کھاؤں گا یا صرف روٹی سالن۔ نتیجہ یہ کہ ان کی مہمانی پر اگرچہ آنے یومیہ معمول سے زیادہ خرچ ہونا شروع ہو گئے تھے وہ بھی بچنے لگے۔ وہ دہلی کے قیام کے دنوں میں انتہائی مصروف رہتے ہیں۔ کھانے کی دعوتوں کا شمار نہیں ہوتا۔ وہ جاتے تو ہر ضروری جگہ پابندی سے ہیں مگر کھانا گھر ہی پر کھاتے ہیں۔ کریلے ان کا من بھاتا کھاجا ہے۔ ہمارا کھانا ہر قسم کی بے نمکی کا حامل ہوتا ہے۔ مگر یہ سب انہیں میری خاطر منظور ہے۔

اب کے حفیظ اپنی حکومت ہی کے ایماء سے کلچرل کانفرنس کے سلسلے میں آئے تھے (غالباً پاکستانی وفد کے رکن رکین تھے) جن پتہ ہوٹل میں ایک نہایت آرام دہ کمرہ انکے لئے مخصوص تھا نام وہاں کا رہا مگر وہ ٹھہرے میرے ہی پاس۔ ایک مرتبہ کسی کانفرنس سے نپٹ کر دن کے بارہ بجے میری دوکان کے اندر میرے دفتر میں پہنچے تو طبیعت نڈھال تھی۔ میں نے عرض کی کوئی دوا لے لیجئے۔ فرمایا، جاگتے رہنے کی سزا ہے کہ برسرِ راہ شغل بے شغلی کرنا پڑے گا۔ ایما کے سوا اضمحلال کا علاج نہیں کہ سخت قبض ہے۔ میں نے عرض کیا کہ فوراً گھر چلئے۔ کہنے لگے۔

نہیں جی ابھی ہونا چاہئے۔ انہا کا سامان تو نیا اطہر دکان پر موجود تھا مگر میرے دفتر یا دکان کے دوسرے کمروں میں کوئی گوشۂ عافیت نہیں کہ آمد ورفت کا مقام ہے اور پھر اطمینان سے لیٹنے کی تو جا ہی نہیں۔ میں نے کہا پندرہ منٹ میں گھر پہونچ جائیں گے۔ یہاں بچھانے کو چادر نہیں دروازوں میں کواڑ نہیں۔ فرمایا چادر کی کیا ضرورت ہے فرش جو ہے اور تمہارا دفتر نہایت مناسب جگہ ہے کہ صرف دو گزرگاہیں ہیں۔ ایک طرف کا راستہ تم روک لو اور دوسری طرف ملازم کھڑا ہو جائے گا۔ جب تک میں آرام کروں کسی کو داخل نہ ہونے دو۔ غرض کہ ایسا ہی ہوا

دوسرے دن شام کانفرنس سے ۵ بجے واپس آئے فرمایا موسم سے زیادہ مجالس ادب کے بلے ادبانہ ماحول کی گرمی نے بھون ڈالا ہے۔ میں نے کہا کوئی ٹھنڈی اور مفرح چیز پی لیجئے۔ فرمایا ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر میں پہلے نہانا چاہتا ہوں۔ ایسے ایسے لوگوں سے ذہنی معانقہ یا مباشرہ ہوا ہے کہ خود اپنے بدن سے بکرے کی ایسی بو آرہی ہے۔ میرے دفتر سے ملحقہ ایک معمولی سا غسل خانہ تو ہے مگر تنگ ہے اور قدرے غلیظ بھی۔ میں نے پھر گھر چلنے کو کہا۔ تنک کر بولے۔ ابے تیرا گھر کونسا شیش محل ہے کہ بات بات پر گھر کی راہ دکھاتا ہے۔ کھانے اور سونے کے لئے تو گھر کی ضرورت پڑتی ہے کہ اطمینان کے بغیر دونوں چیزیں ناممکن ہیں مگر میں تو نہانا چاہتا ہوں۔ تیرے یہاں غسل خانہ موجود ہے۔ میں نے کہا حضور وہ گندہ ہے، فرمایا ایک زمانے تک قصباتی مسجدوں کے سقاووں میں نہاتا رہا ہوں یہ غسل خانہ ان سے زیادہ گندہ نہ ہوگا۔ تولیہ۔ کے سوائے دوکان میں کیا تھا جو پیش کرتا۔ وہ حاضر کردیا۔ دفتر میں کئی لوگ پہلے سے ان کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ حفیظ نے ان سے معذرت چاہتے ہوئے پاجامے کے سوا سب کپڑے اتار کر ایک کرسی پر رکھ دیئے اور خود غسل کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ دس بارہ منٹ میں اسی تکلف۔ سے واپس آئے۔ کپڑے پہنے اور "ہاں صاحب فرمائیے۔ آپ کیسے ہیں" سے گفتگو شروع ہوگئی۔ وہ اپنے آپ کو ہر ماحول میں ڈھال لینے کی ایسی سگھڑانہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ پہلے پہل جو شخص انہیں کسی خاص ماحول میں رچا بسا دیکھے وہ یہی سمجھے گا ان کا اپنا اصلی ماحول یہی ہے۔ حفیظ کی مردم شناسی کی انتہا ہے کہ جس سے ملتے ہیں۔ پہلے چند فقروں ہی سے اس کی شخصیت کا اندازہ اور صحیح اندازہ لگا لیتے ہیں اور پھر اس کی حیثیت اور اہلیت اور اس کے دل کی چھپی ہوئی باتیں معلوم ہونے لگتی ہیں۔ یہ ہمہ گیری کس قدر وسعت مشاہدہ اور ظرف اخذ چاہتی ہے اہل نظر سے مخفی نہ ہوگا۔ تجربے کے لئے ایک عمر اور لمبی عمر چاہئے مگر یہ بھی خدا کی دین ہے کہ میں نے حفیظ کو گزشتہ برسوں میں ہمیشہ ایسا ہی پایا۔ رئیسوں میں رئیسوں سے زیادہ طمطراق سے مخاطب۔ شاعروں میں شاعر لیکن ہر جگہ بے تکلف۔ وہ لڑکپن اور نوجوانی میں بھی بڑے بڑے باوضع اور صاحب علم بزرگوں کی محفل میں بے تکلف بیٹھتے۔ ان کی سطح پر گفتگو کرتے اور مدارج دشنام کے پھول سمیٹتے ہوئے پلٹتے تھے اور آج تو خیر ان کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔

(۹)

دوست پروری کی ایک اور مثال سنیئے۔ سنہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم ملک کے بعد جب میں کچھ عرصے لاہور میں ٹھہرا تھا حفیظ بغیر ضرورت کے بھی سامان مجھ سے خریدتے اگرچہ میں دوائیوں کا کاروبار کرتا تھا مٹھائی کا نہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ میں لاہور سے بددل نہ ہو جاؤں۔ وہ دوسروں کو بھی میرے ہاں ادویہ خریدوانے لاتے۔ سنہ ۱۹۴۷ء سے پہلے میری آمدنی نہایت معقول تھی۔ بہت بڑا کاروبار تھا اور خاصی جائداد۔ زندگی کی ہر آسائش میسر تھی۔ دوا دارو سے دوستوں کی خدمت کرنا میرا معمول تھا کہ آخر اس میں اضافہ ہی کیا تھا۔ میرا اور حفیظ کا اکثر اس معاملے میں جھگڑا ہوا کہ وہ مجھ سے کوئی چیز مفت میں قبول نہ کرتے تھے اور میرا جی چاہتا تھا کہ استاد اور ایسے مہربان استاد کی کچھ خدمت تو ہو اور پھر ایسے میں کہ چند ہزار کا بھی خرچ میرے نزدیک ان دنوں کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اپنے محترم بزرگ کی خدمت کو جی کیوں نہ چاہتا مگر وہ ہمیشہ یہی کہتے کہ دوائی مفت نہ لوں گا اور اگر میری جھک جھک سے تنگ آکر دو چار روپیہ کی چیز لے بھی گئے تو آئندہ فرصت میں میرے بچی کو دس بیس روپے نقد دے گئے۔ میں نے استاد کے حق میں یہ خسارے کا سودا دیکھا تو ان سے اصرار اور کج بحثی کرنا چھوڑ دی۔ ان کی ضرورت کی دوائی

دے دیتا اور قیمت لے لیتا۔

حفیظ صدی ہیں۔ صرف شعر ہی کے سلسلے میں میرے استاد نہیں بلکہ ہر معاملے میں استاد ہیں۔ میں جب کبھی اور جس معاملے میں بھی ان سے الجھا ہمیشہ مات کھائی اور ہمیشہ ان کی برتری کا اعتراف کرنا پڑا۔ ان کی صحیح معاملہ فہمی، بات کی تہہ تک پہونچنے کی استعداد، حاضر جوابی اور مسکت حاضر جوابی۔ دوررس تدبر کم دیکھنے میں آتی ہے۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جن کے بل پر وہ اپنی متعین کردہ منزلیں طے کرتے چلے گئے اور دنیائے شعر و ادب کی شہرت کے آسمان پر آج ان سے درخشندہ و تابندہ ستارہ کوئی نہیں۔ لیکن شاید اپنے لئے ان کو سوائے شعر کو ہیرے کی طرح تراشنے سنوارنے کے اور کچھ دکھائی ہی نہیں دیا۔!

شاید اسی لئے "دکھیا سب سنسار" کے مصداق اس بلبل ہزار داستان کی چمن رنگ۔ زندگی درد و غم کے نغموں سے بھری ہے۔ یہ خان بہادر، یہ نواب حسان الملک بہادر۔ یہ ملک الشعراء، یہ نشان یافتہ ہلال امتیاز پاکستان، یہ نازش کار فرمائی۔ یہ اردو کا بانسری بجیا، یہ اسلام کا شہنائی نواز۔ یہ فردوسی اسلام، یہ ادب پرست بھلاوں کا منصور حق پرست یہ مجالس احباب کو اپنی لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے زعفران زار بنا دینے والا۔ شاعر نغمہ نواز۔ یہ حیات و ممات پر گہری نظر رکھنے والا دانائے راز۔ یہ غواص رموز فطرت، غم و الم کے بحر ناپید اکنار میں عام آدمیوں سے بھی زیادہ بہت ہی زیادہ گہرے غوطے کھا رہا ہے۔ اس کا غم بھی لازماً شدید تر ہے اور احساس غم بھی اس کی اہلیتوں اور صلاحیتوں کے پیش نظر عوام سے شدید تر ہے۔ اس کی گھریلو زندگی۔ عزیز بہنوں کی بیوگی اور ایک ذہین ترین بچی کی بدقسمتی اسے گھر میں پریشان رکھتی ہے تو گھر سے باہر وہ مطلب پرست دوست جنہیں حفیظ نے قدم قدم پر سہارا دیا۔ یہ دوست اس کی زندگی کو ضرورت سے زیادہ شیریں سمجھ کر اس میں تلخیاں گھولتے ہیں اور حفیظ اپنی طبیعت سے مجبور۔ مسکراتا رہتا ہے۔ ہائے

جس قدر غم شدید ہوتا ہے۔ اسی شدت سے مسکراتا ہوں

حفیظ کے مزاج کی سادگی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک مرتبہ تھکان اور کسلمندی کے باعث سہ پہر کو صرف اچکن اتار کر آرام کی غرض سے لیٹ گئے۔ پریشانی کی وجہ سے نیند نہ آسکی اور دو گھنٹے کروٹیں بدلنے میں گزر گئے۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ اٹھے۔ چند نوالے کھائے اور پھر لیٹ گئے۔ رات مشاعرے میں شامل ہونا تھا۔ ہم نے بدلنے کے لئے نیا جوڑا کپڑوں کا نکال رکھا تھا۔ رات نو بجے میں ان کے کمرے میں بیدار کرنے کے لئے گیا۔ وہ جاگ رہے تھے مگر ابھی بدستور لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا آپ سوئے نہیں۔ فرمایا کم بخت سے فرصت ملتی تو سوتا۔ میں نے کہا گھر والے بھی سب لوگ تیار ہیں آپ بھی کپڑے بدل لیجئے۔ جھٹ اٹھ بیٹھے۔ اچکن پہنی اور کہا چلئے۔ ان کے کپڑے یوں صاف ستھرے تھے میں نے پھر کہا۔ جلسے میں جانا ہے کپڑے بدل کیوں نہیں لئے جائیں۔ فرمایا کیا بات ہے۔ میں نے کہا سلوٹوں کے باعث پاجامہ ٹخنگا ہو گیا ہے۔ فرمایا۔ لوگ وہاں میرا کلام سننے آئیں گے یا پاجامہ دیکھنے۔ پھر مجھی سے بستہ اٹھانے کو کہا اور چل دیے۔!

پنڈت ہری چند اختر مرحوم حفیظ کے چہیتے شاگرد اور بہت ہی پیارے دوست تھے۔ یکم جنوری سنہ ۱۹۸۵ء کو اچانک انتقال فرما گئے۔ حفیظ کو ان کی موت سے سخت صدمہ پہونچا۔ ان کی رحلت پر جو حفیظ نے مجھے خط لکھا اس پر خشک شدہ آنسوؤں کے نشان ظاہر کرتے تھے کہ خط روتے روتے لکھا گیا ہے۔ پھر وہ مارچ میں دہلی آئے۔ میں ہوائی اڈے پر پیشوائی کے لئے حاضر تھا۔ محصول کے محکمے سے نکلے۔ مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔ میرا پنڈت کہاں ہے۔ وہ مجھے لینے کیوں نہیں آیا اور پھر مجھ سے بغلگیر ہو کر زار زار رونے لگے۔ وہاں سے سیدھے پنڈت جی کے گھر پہونچے۔ پنڈت مرحوم کے اہل خانہ سے ان کی ملاقات بڑی دلدوز اور روح فرسا تھی۔ روتے تھے۔ ہری چند کو پکارتے تھے آنکھیں ہری چند کی متلاشی تھیں جیسے وہ کہیں چھپے ہوئے ہیں اور حفیظ کی آواز سن کر حسب معمول دوڑے آئیں گے۔ پنڈت جی کی تصویر

کو بار بار حسرت سے دیکھتے اور "لو بنڈتا۔ او ہری چندا! او میرے یار" کہہ کہہ کر پکارتے رہے۔ ان دنوں پنڈت جی کے بچوں کی مالی حالت بہت پریشان کن تھی۔ اور یہ بات حفیظ کے لئے مزید افسردگی کا باعث تھی۔ اس کے بعد ان کی حالت سدھارنے میں حفیظ کی مساعی جمیلہ کا بھی بہت کچھ دخل ہے۔ وہاں سے وہ میرے ہاں آئے۔ یہاں بھی ہری چند! ان کے جذبات اور تصورات پر چھائے ہوئے تھے، پوچھا، ہاں پنڈت تمہارے گھر آتا تھا تو کہاں بیٹھتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ رات کو مشاعرے میں گئے تو فرمایا، پنڈت کے نہ ہونے سے مشاعرہ ویران ہے بلکہ میرے لئے پوری دلی اجاڑ ہے۔ جب یہ شعر پڑھا تو آنسو بہہ رہے تھے۔

اودل توڑ کے جانے والے دل کی بات بتلاجا
اب میں دل کو کیا سمجھاؤں مجھ کو بھی سمجھاتا جا

(۱۰)

سنہ ۱۹۶۰ء میں حفیظ نے پہلے تو لکھا کہ حسب معمول تشریف لا رہے ہیں اور پھر اطلاع دی کہ نہیں آئیں گے۔ یہ خط بڑا مایوس کن تھا کہ راجپوتی ہٹ کا مظہر تھا۔ نہ آنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کی صاحبزادی تسنیم بھی مشاعرے میں مدعو تھیں اور حفیظ باپ بیٹی کا ایک ہی نشست میں ایک ہی اسٹیج سے پڑھنا معیوب سمجھتے تھے۔ میں نے لکھا بھی کہ ایک خاندان سے دو افراد کا بیک وقت اپنے فن کا مظاہرہ کوئی بری بات نہیں مگر وہ چوہان کب ملنے والا تھا۔ انہی دنوں بمبئی میں ادبائے اردو کا ایک بہت بڑا اجتماع ہوا۔ حفیظ بھی آئے ہوئے تھے۔ ایک دن صبح ردی چوپڑا صاحب نے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ آج بمبئی سے حفیظ صاحب فلاں گاڑی سے فلاں وقت دہلی پہونچ رہے ہیں وہ تمہارے ہاں ٹھہریں گے انہیں لے جاؤ۔ میں نے عرض کی میں نہ آؤں گا۔ پوچھا کیوں؟ میں نے کہا مجھے کوئی اطلاع نہیں۔ فرمایا "مجھے تار جو مل گیا ہے کیا یہ اطلاع کافی نہیں اور پھر یہ بھی تو ممکن ہے کہ تمہیں تار دیا گیا ہو مگر پہونچا نہ ہو" میں نے کہا "خیر آپ تو جا ہی رہے ہیں۔ میں خواہ مخواہ مایوس کیوں ہوں" فرمایا "یہ کیوں کر؟" میں نے کہا "وہ نہیں پہنچیں گے کہ مجھے اطلاع ہونا لازم ہے اور آپ سے بھی پہلے" میں نہ گیا اور حفیظ بھی نہ آئے۔ دوسرے دن مجھے تار ملا۔ میں وقت پر حاضر ہوا۔ وہ آئے۔ بھلا اب کیوں کر نہ آتے۔ فرمایا "طے تو یہ تھا کہ بمبئی سے کراچی واپس چلا جاؤں گا مگر ہندوستان پہونچ کر تم سے نہ ملتا تو اس کا رنج عمر بھر رہتا اور عمر۔ سالی کچھ یقین نہیں کب ہنے بیچھے کو چھوڑ جائے۔ ابھی سرکاری اجازت کے مطابق کئی دن اور یہاں ٹھہر سکتا ہوں۔ اب کے مشاعروں کی مشکل بھی گلے کا ہار نہیں۔ اطمینان سے چار دن تمہارے پاس کاٹوں گا۔"

ہم گھر پہنچے ہی تھے کہ ردی صاحب کا فون آیا۔ حفیظ نے کہہ دیا کہ میں مشاعرے میں حاضر نہیں ہو سکوں گا۔ (مشاعرے میں ابھی دو دن باقی تھے) کچھ دیر میں ردی دوسرے کارکنوں کے ہمراہ میرے یہاں تشریف لے آئے۔ ان کی خواہش تھی کہ حفیظ ضرور مشاعرے میں شریک ہوں۔ بمبئی ہی سے واپس چلے جاتے تو خیر مجبوری تھی۔ اب جب کہ وہ دہلی میں ہیں اور ایام مشاعرہ بھی یہیں بسر ہوں گے تو وہ کرم ضرور فرمائیں۔ اس سلسلے میں استاد سے بات کرنے کی جرأت نہیں تھی کہ وہ ان کے مزاج اور ان کی افتاد سے واقف تھے۔ یہ سب باتیں مجھ سے ہوئیں میں نے کہہ دیا کہ ابھی کافی وقت پڑا ہے میں کوشش کروں گا۔ آپ کل دریافت فرما لیجئے۔ وہ لوگ گھنٹے بھر ٹھہر کر اور اپنی نیاز مندی کا ثبوت دے کر رخصت ہو گئے۔ شام کو میرے گلاس میں شراب ڈھلی تو جرأت رندانہ سے کام لے کر میں نے معاملہ پیش کیا۔

"اب آپ آ ہی گئے ہیں تو مشاعرے میں بھی شرکت فرما لیجئے۔ لوگ خوش ہو جائیں گے۔" بولے "دوارکاداس جی، اپنی چسکی لگاؤ۔ شعر بناؤ۔ مشاعرے کی بات چھوڑو۔ جو مجھے معلوم ہے وہ سب بے معنی ہے۔ مجھے آپ سے اتفاق نہیں ہے" "تیری حمیت اور غیرت معاملہ تیری نظر میں بے معنی ہے۔ گدھا کہیں کا۔" میں بھی پئے ہوئے تھے۔ میں نے کہا "مجھے اپنے گدھے پن کا اعتراف ہے۔ اب آپ بھی اعتراف فرمائیے کہ آپ نے مجھے انسان بنانے کی کوشش میں چالیس برس بھاڑ جھونکا" اس پر مسکرا دیے۔ میں نے لکچر جاری رکھا۔ "حضور، شعر و شاعری سے

یا شعر پڑھنے سے غیرت کیسے برباد ہوتی ہے اور حمیت کیوں کر تباہ۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئے گی۔ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ وقت تھا اور بحیثیت مسلمان بڑا صاحب ایمان اور بڑا سخت گیر۔ اس کی بیٹی زیب النسا مخفی شاعرہ تھی اور یہ بات بھی نہیں ہو سکتی کہ اس کے والد کو علم نہ ہو۔ اگر وہ اشارہ بھی کر دیتا تو شعر کہنا تو کجا۔ اس کے لئے شعر کا ذکر تک ناممکن ہو جاتا اور پھر اورنگ زیب[۱] کہ دادی کی طرف سے راجپوت بھی تھا۔ اسے اعتراض نہ تھا تو آپ کو اعتراض کیوں ہو؟

"مگر مخفی مشاعروں میں تو نہ جاتی تھی"

"وہ شہزادی تھی۔ مشاعروں میں کیوں کر جا سکتی تھی۔ محل میں عورتوں کی ادبی محافل میں ضرور شامل ہوتی ہوگی۔ بادشاہ خود مشاعروں میں کب جاتے تھے یا تو مشاعرے ہی ان کے یہاں آ جاتے تھے یا ان کی غزل چلی جاتی تھی۔ بہادر شاہ ظفر تک یہ حضور نظام تک تو معاملہ یوں ہی چلا۔ حفظ مراتب کے سوا پردے کی سختی جوان دنوں یہاں رائج تھی وہ اب کہاں ہے۔ آپ تو خواہ مخواہ ضد کرتے ہیں ورنہ یہ معاملہ اس قدر اہم نہیں۔" "خیر تو جو چاہے کہتا رہے میں ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ وہ میری موجودگی میں محفل میں شعر پڑھے نہ میں یہ ہی پسند کرتا ہوں کہ میں اس کی موجودگی میں غزل خوانی کروں۔"

"آپ نے بات مختصر کر دی۔ اس کا علاج بڑا آسان ہے۔ آپ گھر ہی سے گیارہ بجے چلیں اور تسنیم اس سے پہلے پڑھ کر رخصت ہو جائیں گی۔ کہیئے کیا خیال ہے۔"

حفیظ سوچتے رہے۔ "اگر یہ انتظام ہو جائے تو میں یہ کڑوا گھونٹ بھر لوں گا۔ بچی تمہاری بھی تو بہن ہے!"

دوسرے دن جب کارکنان مشاعرہ کو یہ نوید ملی تو وہ بہال ہو گئے۔ حفیظ مشاعرے میں نہ ہوں تو مشاعرہ کیسا۔ دوپہر کو حفیظ اور میں تسنیم سے ملنے گئے۔ باپ بیٹی گلے مل کر بہت روئے۔ حفیظ نے کہا۔ "بیٹی جو شعر تجھے پڑھنا ہیں مجھے دکھا لے۔ آخر تو میری بیٹی ہے۔ فنی سقم تو نہ رہنا چاہئے۔" تسنیم نے کہا۔ "شاعرات و شاعر اور نقاد تو پہلے ہی سے کہتے ہیں کہ باپ شعر کہہ کر دیتا ہوگا اور اب اصلاح لے لوں تو آپ کا رنگ پیدا ہو جائے گا۔" اس پر میں نے کہا۔ "لا مجھے دکھا دے کوئی خامی ہوئی تو مجھی کو صاف کرنے کو کہہ دوں گا۔" "وہ نہیں مانی۔ اتنا کہا۔ "بھائی جی میرے شعر سے آپ کو شرمندگی نہ ہوگی۔ میرے شعر میں انسانی غم کے سوا کیا ہے۔"[تسنیم بہن کانسٹی ٹیوشن کلب میں قیام پذیر تھی۔ میں نے جب بہت کہا کہ اپنا گھر ہوتے ہوئے تمہیں ہوٹل میں نہیں ٹھہرنا چاہئے تو اس نے آنے کا وعدہ کر لیا مگر افسوس کہ بیمار ہو گئی اور مشاعرے کے فوراً بعد لاہور چلی گئی اور یہ تسنیم۔ میری پیاری بچی، ذہین، خود دار اور خوش باطن بچی اپنے دکھ کی تاب نہ لا کر ذہنی توازن کھو بیٹھی ہے اور علاج کے لئے ان دنوں ہسپتال میں داخل ہے۔ تسنیم کی یہ بیماری حفیظ کی روح کا رستا ہوا ناسور ہے۔ انتہائی اذیت بخش اور سخت تکلیف دہ۔!

(۱۱)

روایت ہے کہ حفیظ سنہ ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ ممکن ہے یہ روایت صحیح ہو اور ممکن ہے کہ غلط ہو۔ میں تو صرف اس قدر جانتا ہوں کہ ان کی ظاہری شکل و صورت میں پچھلے چالیس برس میں کوئی فرق نہ آیا بجز اس کے کہ سر پر ان دنوں شاید دس بیس بال آج کے مقابلے میں زیادہ ہوں۔ بیمار ان دنوں بھی رہتے تھے۔ اب بھی رہتے ہیں۔ مزاج اور چال میں ان دنوں بھی آج کی سی تیزی تھی۔ ایک مرتبہ حفیظ کی عمر کے متعلق ان کے والد (حافظ شمس الدین صاحب) سے پوچھا۔ انہوں نے اس کا جواب ہی نہ دیا بعد کو پتہ چلا کہ وہ صرف معقول باتوں کا جواب دیا کرتے ہیں۔

غالباً سنہ ۱۹۲۴ء کا واقعہ ہے۔ حفیظ ان دنوں کہیں ملازم نہ تھے۔ مختلف اداروں کے لئے حق محنت پر کام کرتے تھے۔ عید

---

[۱] وہ یوں کہ شاہجہاں کی والدہ راجپوت تھیں جیسے جہانگیر کی۔

سے ایک دن پہلے شام کے چار بجے کے قریب میرے یہاں آئے۔ خلاف معمول ملازم کی معرفت مجھے باہر طلب فرمایا۔ میں گھر پر تھا۔ آیا تو وہ سڑک پر سائیکل تھامے کھڑے تھے گھبرائے گھبرائے سے تھے۔ میں نے پوچھا: خیر تو ہے آپ کمرے میں تشریف کیوں نہ لائے۔ فرمایا۔ مجھے جلد واپس جانا ہے۔ صبح کا نکلا ہوا ہوں۔ ایک سانحہ ہوگیا تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں نے عرض کیا، حکم کیجئے، فرمایا۔ بات یہ ہے کہ فلاں ادارے کے مسودوں کا پلندہ لے کر گھر سے نکلا تھا۔ پلندہ سائیکل کے کیریر پر بندھا تھا راہ میں خدا جانے کہاں گر گیا۔ اگر آج وہ مضمون ان لوگوں کو دیدیتا تو پچیس روپے مل جاتے مگر اب صورت باقی نہیں رہی۔ کل عید ہے۔ بچوں سے کہہ آیا ہوں جلد آؤں گا اور مٹھائی لاؤں گا۔ کل عیدی بھی دینا ہے۔ پچیس تو خیر نہیں اگر تم پندرہ کا انتظام کردو کام چل جائے گا۔ میں نے کہا آپ یہیں ٹھہریں میں کوشش کرتا ہوں۔ میں نے والدہ سے روپے مانگے۔ وہ اس وقت تک نہ حفیظ کو جانتے تھے اور نہ یہ کہ مجھ کو شاعری کی لت ہے۔ انہوں نے ضرورت دریافت کی۔ میں نے تفصیل عرض کی تو خالص لعن طعن سے تواضع فرمائی۔ شاعر ان کے نزدیک، اس لئے گردن زدنی تھے کہ یہ ذمہ دار ہوتے ہیں۔ حفیظ بھی ان کی زد سے نہ بچے۔ ان دنوں میں دس روپیہ ماہانہ بطور جیب خرچ پاتا تھا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ مجھے یہ دس روپے عنایت فرمادیجئے اگر پندرہ بیس دن میں یہ رقم واپس نہ ہوئی تو جیب خرچ میں سے کاٹ لیجئے گا۔ اس پر وہ اور بھی برسے "اپنے ساہوکار کے بچے مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ تیرے پاس کوڑی کیوں نہیں بچتی۔ یہ سب شاعر وائر کھا جاتے ہوں گے اور کیا؟" میں وہاں سے سرکا۔ اماں کے پاس گیا۔ وہ نیک خاتون میری باتیں سن کر آبدیدہ ہوگئیں اور مطلوبہ رقم حوالے کردی۔ حفیظ اگلے مہینے آئے اور روپے واپس کرگئے۔ میں والدہ کی خدمت میں یہ قرض حسنہ لوٹانے گیا تو انہوں نے فرمایا کہ رقم اپنے استاد کی نذر کردو اور کہو کہ یہ میری طرف سے بچوں کی عیدی ہے جب میں واپس حفیظ صاحب کے پاس پہونچا تو وہ یہ روپے قبول نہ کرتے تھے مگر میں اس خیال سے لے لئے کہ اماں تو اب لیں گی نہیں اور شعلہ خواہ مخواہ رقم ضائع کردے گا۔

یہ پندرہ روپے میرے استاد نے لے تو لئے مگر ان کے عوض جانے کتنے پندرہ سو مجھے دیئے۔ میرے جنیو کی تقریب پر۔ شادی پر۔ بچی۔۔ کی کی پیدائش پر۔ والدہ اور والد کے انتقال پر۔ بچی کی سگائی اور اس کی شادی پر بڑی معقول رقمیں صرف کیں۔ نرملا جب لاہور میں تھی دس پانچ ان سے ضرور پاتی۔ اب میرے نواسے ان کی توجہ اور فیاضی کا مرکز بن گئے ہیں۔ چند خاصی بڑی رقوم مجھے بھی مرحمت ہوئیں۔ بظاہر تو وہ امانت ہیں مگر ایسی امانت جو مستقل ہے اور غت ربود کی صنعت میں صرف ہوتی ہے اور اگر میں نے اس میں خیانت نہ بھی کی تو میرے بعد میرے نواسے اسے باوا کا مال سمجھ کر بے دریغ صرف کرلیں گے نواسوں کا ذکر آیا تو دو واقعے یاد آگئے۔ آپ بھی سن لیجئے۔

ایک دن میں نے کسی شرارت پر ناراض ہوکر چھوٹے نواسے صاحب سے کہا کہ معافی مانگو اور وعدہ کرو کہ آئندہ یہ حرکت نہیں کروں گا۔ اس کے انکار پر میں نے دھمکی دی "تمہارے ابا سے شکایت کرکے تمہیں خوب پٹواؤں گا" تو کہنے لگا "میں تمہارے ابا سے کہہ کر تمہیں گھر سے ... نکلوادوں گا" میں نے کہا۔ میرے ابا تو مرچکے ہیں تم کس سے کہو گے" اس نے کہا "جھوٹ نہ بولو وہ تو ابھی یہاں آئے ہوئے تھے۔ ہم سے پیار کرتے تھے۔ پیسے دیتے تھے اور تمہیں مارتے تھے" میں نے پوچھا "ارے وہ کون؟" "حفیظ صاحب"۔ ظالم نے سچ کہا تھا۔ میں کیا جواب دیتا۔

دوسرا واقعہ بھی اسی صاحب زادے سے متعلق ہے۔ ان دنوں اس کی عمر کوئی تین برس کی ہوگی۔ حفیظ تخت پر بیٹھے داڑھی بنانے کا شغل فرمارہے تھے۔ شغل یوں فرمارہے تھے کہ داڑھی کم بنتی تھی اور باتیں زیادہ۔ ان کے پاس ہی تخت پر یہ چھوٹا نواسہ بھی بیٹھا تھا۔ حفیظ استرا رکھ کر میری طرف متوجہ ہوتے تو یہ استرا اٹھا لیتا۔ حفیظ نے اسے سمجھایا کہ بیٹا اس سے مت کھیلو۔ ہاتھ کٹ جائے گا۔ دوسری مرتبہ سختی سے منع کیا تیسری مرتبہ اس نے پھر وہی حرکت کی تو اس کے ہاتھ سے تیزی سے استرا جھپٹ کر چھین لیا اور کہا "الو کے پٹھے تو کس مٹی کا بنا ہے اتنا ہی نہیں" بچہ گالی کو اذن بے تکلفی سمجھا اور جواب میں جتنی ماں بہن کی گالیاں اسے یاد تھیں صرف کردیں۔ حفیظ مجھے

بھر کے لئے منہ دیکھا کئے اور پھر گود کر اٹھے۔ بچے کو گود میں لیا بھینچ کر پیار کیا۔ اپنی شیروانی کو ٹٹولا جس قدر روپے پاس تھے بچے کو تھما دیے۔ میں نے حیرت سے پوچھا: حضرت یہ کیا؟ بولے یہ خدا کا شکر ہے۔ بزدل بنیوں کے گھر میں ایک بچہ تو ایسا پیدا ہوا جو باغیرت ہے جسے حمیت کا پاس ہے، اور ایک سن کر دس سنانے کی جرأت رکھتا ہے۔ بس یہی میرا بیٹا ہے: یہ انعام پا کر وہ اور بھی شیر ہو گیا اور اب خود سری اس کی سرشت میں داخل ہے۔

ایک مرتبہ حفیظ نے ایک غیر مجہول بات کہی۔ سننے والے نے کہا، تم نرے سکھ ہو: حفیظ نے کہا، میرے نہ بال ہیں نہ داڑھی۔ سکھ کیوں کر ہوا" نیاز مند نے عرض کیا، کچھ لوگ ذہنی طور پر بھی تو سکھ ہو سکتے ہیں"

نیاز مند نے ایک مجہول بات کہی۔ حفیظ صاحب نے ڈانٹ پلائی: "چپ رہ، الو کا پٹھا۔ نیاز مند نے مسرت کا اظہار کیا اور فرمایا، مجھے اس حقیقت پر فخر ہے کہ بڑے عالی مقام الو کا پٹھا ہوں"

حفیظ نے ایک شاگرد سے کہا۔ تو جس کا بچہ ہے۔ شاگرد نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے جواب دیا "جی ہاں، آپ کا بچہ ہوں"

حفیظ نے ایک اکھڑ شاگرد سے اس کے شعر سن کر فرمایا، تو بڑے بیہودہ شعر کہتا ہے۔ شاگرد نے کہا، حضور نے بہتر شعر کہنے کی توفیق ہی اب عطا فرمائی۔"

ایک مرتبہ حفیظ مشاعرے میں جانے والے تھے۔ ایک شاگرد خدمت میں حاضر تھا مشورہ طلب کیا، میاں تازہ غزل تو کوئی ہے نہیں پرانی چیز ہی پڑھنا پڑے گی: شاگرد نے کہا، یہ کوئی فکر آزما مسئلہ تو کوئی ہے نہیں ہے، میری سب غزلیں تازہ ہیں کوئی پسند فرما لیجئے اور پڑھ دیجئے۔ انہوں نے کہا، ابے تیری غزل اپنے نام سے کیوں کر پڑھوں، شاگرد نے کہا: تکلف کی کیا بات ہے ان سب پر آپ کی اصلاح اس قدر ہے کہ اصل صورت تو مسخ ہو چکی، موجودہ صورت میں ہر غزل پچھتر فی صدی آپ کی کہی ہوئی ہے اگر ہم انہیں فخر یہ پڑھ سکتے ہیں تو آپ کیوں نہ پڑھیں۔!"

ایک مرتبہ حفیظ دہلی آئے۔ میری دوکان پر تھے بٹوہ میرے گھر بھول آئے تھے۔ ایک احسان فراموش اور سراپا احتیاج سے پچاس روپے طلب فرمائے۔ شاگرد نے کہا، استاد آپ خواہ مخواہ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ مجھ سے تو قع ہی نہ کیجئے یہ البتہ فرمائیے کہ آپ کیا عنایت فرمائیے گا۔ حفیظ نے کہا، ابے تو مجھے منہ سے باپ کہتا ہے اور ایک پچاس روپے کے لئے انکار کر رہا ہے۔" شاگرد نے کہا۔ باپ سمجھتا ہوں جبھی تو حق جتاتا ہوں۔ مانگتا ہوں اور پاتا بھی ہوں۔ حفیظ نے کہا، اس کے بدلے میں خدمت کیا کرتے ہو: شاگرد نے کہا پاؤں دبوا لیجئے۔ کس کافر کو انکار ہو گا۔ مگر زری طلبی سخن درین است۔ حفیظ بولے۔ روپیہ نذر کرنا بھی تو اولاد پر لازم ہے۔ منطقی شاگرد نے کہا۔ جی ہاں لازم ہے مگر اس صورت میں کہ والد بے کار ہو اور پس انداز بھی نہ رکھتا ہو اور پھر یہ بھی کہ باپ کو تو قرض دینا ہی نہ چاہئے کہ غلط فہمی بلکہ شکر رنجی کا باعث بن سکتا ہے۔ حفیظ تو اس ڈھٹائی پر مزے کی چپت رسید کرنے والے تھے کہ نیک بخت شاگرد نے پچاس روپے حاضر کر دیے اور انہی کا فقرہ دہرا دیا لیجئے قبلہ مطلوبہ رقم مگر ادائیگی میں صرف نہ فرمائیے گا" حفیظ بولے۔ شیطان کہیں کا: ابھی یہیں بیٹھے تھے کہ ایک مشاعرہ والے پانچ سو پیشگی لے کر آئے اور نذر کر گئے۔ حفیظ نے اپنے شاگرد کا قرض لوٹانے میں جلد بازی دکھانا چاہی۔ شاگرد نے کہا۔ پورے پانچ سو (۵۰۰) لوں گا اور وہ بھی غیر مشروط۔ حفیظ نے پوچھا، اور اگر مجھے ضرورت پڑے تو، شاگرد نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا، تو ان پانچ سو میں سے آپ کو میں قرض دے دوں گا" حفیظ نے کہا، یار تو بڑا کمینہ ہے" شاگرد نے کہا۔ آپ تا حال مسلمان ہیں اور میں ہندو ہوں، تاجر یعنی بنیا بھی ہوں۔ گویا کمینگی میرا پیدائشی حق ہے۔ حفیظ نے کہا، سچ کہتے ہو یہ واقعی تمہارا حق ہے" یہ کہہ کر ۵۰ خوشی سے تھما دیے۔ اور مزہ یہ کہ شاگرد نے اس لئے سنبھالا کہ کسی اور جگہ دیا شی کیلئے نہ پھینک دیں۔

ایک مرتبہ حفیظ دلی کلاتھ ملز کے مشاعرے میں شامل ہونے کے لئے ذرا دیر سے پہنچے۔ میں جلو میں تھا اور ہمارے ہمراہ چند مرد عورتیں اور تھیں مشاعرہ سر سری رام کی کرزن روڈ والی کوٹھی میں ہو رہا تھا۔ بیرونی صحن کے دروازے بند تھے اور قریباً پانچ سو ۵۰۰ افراد باہر کھڑے دربانوں اور منتظمین مشاعرہ سے شامل ہونے کی اجازت بہ اصرار طلب کر رہے تھے۔ ان لوگوں میں بیشتر پنجابی تھے۔ حفیظ موٹر سے اترے تو ہجوم نے انہیں گھیر لیا اور کہا۔ "قبلہ دیکھئے ہم کس اشتیاق سے آپ کو سننے آئے ہیں مگر جبین سائی کے باوجود محبوب جان نواز کے دربان راہ روکے کھڑے ہیں۔ آپ ہمارے شاعر ہیں یا تو ہمراہ لے جائیے یا پھر سڑک ہی پر مشاعرہ ہو جائیے۔" حفیظ نے لمحہ بھر کے لئے سوچا اور پوچھا "جلسے کے نظم میں تو مخل نہیں ہو گے"؟ مجمع نے بیک آواز کہا۔ "ہم نشستی صفوں کی حد میں داخل نہ ہوں گے۔ دور کھڑے خاموشی سے سنتے رہیں گے۔ کہیئے تو داد بھی نہ دیں"۔ حفیظ نے اپنی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "داد تو دینا یا نہ دینا لیکن شاعر پر بیداد نہ کرنا۔ اچھا ذرا صبر کرو مجھے پوچھنے دو"۔ ہجوم نے انہیں راہ دیدی۔ وہ صدر دروازے پر پہونچے۔ تو دربانوں نے دروازہ کھولا۔ حفیظ نے کہا۔ "اس مرتبہ میں اکیلا داخل نہیں ہو سکتا۔ میرے اپنے کنبے کے چار پانچ سو افراد ساتھ ہیں"۔ دربان منتظم اعلیٰ کو بلا لایا یہ ساہنی صاحب تھے۔ ساہنی صاحب نے کہا "پنڈال میں گنجائش بالکل نہیں ورنہ آپ کے حکم میں مجال دم زدن کس کو ہے"؟ حفیظ نے کہا۔ "گھبرائیے نہیں۔ یہ لوگ قناتوں سے لگ کر کھڑے رہیں گے اور آپ کے انتظام میں ہرگز خلل انداز نہ ہوں گے۔ یہ میرے عزیز ہیں اگر میرا کہنا نہ مانیں گے تو سب کو عاق کر دوں گا"۔ منتظم نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "تو پھر ٹھیک ہے"۔ دروازہ پورا کھول دیا گیا حفیظ نے با آواز بلند دعوت دی "آؤ بھائی آرام سے چلے آؤ" اور خود دروازے سے باہر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ لوگوں نے کہا۔ "آپ بھی آئیے"۔ حفیظ نے فرمایا۔ "تم سب داخل ہو جاؤ تو میں بھی آ جاؤں گا"۔ لوگ بڑے سلیقے سے داخل ہوئے اور یہ مشاعرہ بڑا کامیاب رہا۔

(۱۲)

مجھے یہاں ایک ناخوشگوار فرض بھی ادا کرنا ہے۔ ناخوشگوار یوں کہ بحث طلب کوئی بات بھی میرے نزدیک یوں خوشگوار نہیں ہوتی کہ میں اس میدان کا مرد نہیں اور پھر بحث مباحثہ تحقیق سے متعلق ہو تو کچھ معنی بھی رکھتا ہے ورنہ محض تضیع اوقات۔ یہاں اگر میں خواہ مخواہ ایک بحث میں شامل ہو رہا ہوں تو ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لئے کہ اگر حقیقت پر روشنی نہ ڈالوں تو شاید اور کوئی اس کا اہل نہ ہوگا جیتے جی یہ فرض ادا ہو ہی جانا چاہیئے۔

ہاں بات یہ ہے کہ گزشتہ دنوں حفیظ کے کلام کے مجموعے از سر نو چھپے تو ان میں "بقلم خود" کے عنوان سے خود نوشت حالات بھی شامل تھے۔ سوز و ساز کے حصۂ مضمون میں انہوں نے اشارہ کیا ہے کہ سنہ ۲۴، ۲۵، ۱۹۲۶ء میں اکثر مبتدی شاگردوں کو وہ خود بھی کہہ دیا کرتے تھے۔ انہی فیض یافتگان میں یہ فقرہ بھی تھا "ہری چند اختر شعر بیں کیا تھا۔ خیال بلند، طبع ندرت پسند مگر مشق کے بغیر خالی — طبع ندرت بھلا کیسے سود مند ہوتی ایک دو شعر۔ ایک دو مفرد مصرع کہہ لیتا۔ میں غزل پوری دیتا۔ میرے کہتے سننے پر ترتیب الفاظ اور بندش پر غور کرنے تو لگا مگر خوش گپی اور ساتھ ہی ایم۔ اے کی تیاری شعر کے لئے مطلوبہ استغراق میں حائل تھی۔ ابھی شاعر بننے کے لئے بڑا وقت درکار تھا"

"آج کل" میں سوز و ساز پر تبصرہ ہوا تو مدیر جریدہ نے غالباً برا مان کر یہ لکھا کہ اگر حفیظ کے احسان پنڈت پر ہیں تو ان کے ان پر بھی کم نہ ہوں گے۔ ان الفاظ سے مدیر محترم کی کیا مراد ہے مجھے اس سے بحث نہیں مگر اس قدر عرض کر دوں کہ اگر پنڈت مرحوم زندہ ہوتے تو حفیظ کی تائید فرماتے۔ جہاں تک دوستوں کے باہمی احسان کا تعلق ہے پنڈت جی کے لئے حفیظ نے نغمہ زار کے بقلم خود میں یہاں تک لکھ دیا ہے "میری اس دکان کے آخری دنوں کی یافت پنڈت ہری چند اختر ہیں جن کی جنم تیری میں پروہتوں نے مجھ سے اصلاحِ سخن لینے کے بہانے میری دولت اور میری سیر بننا لکھ دیا تھا"۔ کاش "آج کل" کے مدیر ان الفاظ کو دیکھ لیتے۔

میرا حفیظ

میرے اور پنڈت جی کے مراسم سنہ ۱۹۲۲ء سے تھے۔ بارہا میں ان کے ساتھ حفیظ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پنڈت جی یقیناً شاعر تھے مگر نہایت کم گو۔ اس حقیقت کی گواہی ان کا مجموعہ کلام "کفر و ایمان" بھی دے گا۔ جس میں عمر بھر کا کلام چار سو کے قریب اشعار پر مشتمل ہے اور پانچ یا سات اشعار کی مکمل غزلیں تو بہت کم ہیں۔ سنہ ۱۹۲۴ء سے لاہور میں مشاعرے بازی کا بازار اس درجہ گرم ہوا کہ مشاعرے ہر چند روز بعد منعقد ہونے لگے۔ اس کے بعد مولانا تاجور اور حفیظ کے پیرو دو جتھوں میں بٹ گئے اور مشاعرے جواب الجواب ہونا شروع ہو گئے۔ اب معاملہ بازی لے جانے کا تھا۔ حفیظ کے دوستوں شاگردوں اور نیازمندوں کا گروہ خاصا وسیع تھا۔ اس میں سالک، بخاری، تبسم، تاثیر، بدر اختر، عارف، اعجاز، ارشاد، ممتاز وغیرہ اور یہ نیازمند بھی شامل تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ چند لوگ عین وقت پر حفیظ کے پاس آ بیٹھے۔ مصرع طرح پر شعر کہنا شروع ہوا۔ گھنٹہ بھر میں کئی غزلیں ترتیب پا گئیں۔ حفیظ جو انتہائی زود گو اور خوش گو تھے قافیہ سنتے اور شعر کہہ دیتے۔ شعر سنتے اور ضرورت کے مطابق صاف کر جاتے۔ پنڈت جی دو تین شعر خود کہتے حفیظ دو تین کا اضافہ کر کے غزل مکمل کر دیتے کہ وقت کی ضرورت کا تقاضا یہی تھا اور جس دور کا تذکرہ ہے صورت حال یہی تھی۔

مجھے چند ایسے نیازمندوں کا ذاتی طور پر علم ہے جو مشاعرہ لوٹ لے جاتے حالانکہ خود ایک مصرع موزوں نہ کر سکتے تھے۔ یہ فیض حضرت حفیظ سے متعلق تھا اور جب وہ ان سے دور ہوئے تو وہ چشمہ ہی بند ہو گیا جس سے شعر ابلتے تھے۔

اگرچہ حفیظ نے میرے متعلق یہ نہیں کہا ہے کہ وہ مجھے بھی شعر کہہ کر دیتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ کم از کم دو مشاعروں میں انہیں کی بخشی ہوئی غزلیں پڑھیں اور بعد میں وہ مخزن میں میرے ہی نام سے چھپیں۔ چونکہ وہ میری نہ تھیں، میرے مجموعے میں شامل نہیں اور چھپیں بھی شعلہ کے تخلص سے نہیں بلکہ آرزو کے تخلص سے۔ حفیظ کو شعلہ تخلص پسند نہ تھا۔ اس لئے آرزو دیا تھا مگر میں نے نہ پہلا تخلص ترک کیا نہ دوسرا اپنایا۔

اب یہ مضمون ختم ہونا چاہئے کہ آپ بھی پڑھتے پڑھتے تھک گئے ہوں گے ورنہ ذہن میں حفیظ اور اپنے سے متعلق اس قدر واقعات ہیں کہ یہ مضمون الف لیلہ کی معنوی صورت نہ بھی اختیار کرے جب بھی ضخامت تو ضرور حاصل کر سکتا ہے۔ ہاں صاحب یہ ہیں میرے حفیظ۔ میرے استاد۔

"۔۔۔ شاعری کے علاوہ مَیں ادب کی دوسری اصناف میں افسانہ اور ناول کو بہت اہم سمجھتا ہوں۔ لیکن پیشہ ور نقادوں کی تنقید نے مجھے کبھی متأثر نہیں کیا۔ میرے خیال میں سب سے بڑا ناقد خود ادیب یا شاعر ہوتا ہے۔ جیسا کہ میرے استاد (گرامی) نے مجھے بتایا ہے کہ لکھنے کے بعد اپنی تخلیق کی صحیح قدر و قیمت جاننے کے لئے اس پر اس طرح غور کرو جیسے وہ تمہاری نہیں کسی اور کی ہے۔"

(حفیظ)

شاہد احمد دہلوی

حفیظ۔ ایک پیاری عظیم شخصیت

یادش بخیر حفیظ جالندھری صاحب اُن چند نفوس میں سے ہیں جن کی قدر و قیمت میرے دل میں بہت زیادہ ہے۔ وہ تمامتر خود ساختہ پرداختہ "بڑے آدمی" ہیں۔ انہوں نے کبھی اس بات کو چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے مالی حالات ایسے نہیں تھے کہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرتے۔ اسکول کی ابتدائی جماعتوں ہی میں تھے کہ انہیں غمِ روزگار نے مار لیا۔ طبیعت شروع ہی سے شاعرانہ پائی تھی۔ چھوٹا موٹا کاروبار کیا، راس نہ آیا سو کان پر بیٹھے، نقصان اٹھایا۔ جسے ادب و شعر کا چسکا پڑ جائے وہ اور کسی کام کا نہیں رہتا۔ کہیں ہرن پر گھاس لادی جاتی ہے؟ جالندھر کی فضا میں چوکڑی بھول گئے۔ لاہور سدا سے ادب و شعر کی منڈی رہا ہے۔ خبر نہیں کس کے مشورے پر یا ع

شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے درکار نیست

لاہور پہونچ گئے۔ لاہور میں ان کا پہونچنا اور چوکڑیاں بھرنا۔ آناً فاناً میں کہیں سے کہیں پہونچے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، قدردانوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور سر آنکھوں پر بٹھایا۔ لو صاحب! جالندھر کا مارا بیڑا را لڑکا لاہور میں آ کر ابوالاثر حفیظ جالندھری بن گیا۔ سیزر کی طرح وہ آیا، اُس نے دیکھا اور فتح کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ورنہ اسی لاہور میں پچھلے سو سال میں ایک سے ایک جغادری شاعر آیا اور ٹہل ٹہلا کر چل دیا۔ کسی نے اُس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تیرے منہ میں کے دانت ہیں؟

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حفیظ صاحب کے عروج کا یہی وہ زمانہ تھا جب میں نے پہلے پہل انہیں دیکھا۔ میں اُس زمانے میں الیف، سی کالج میں پڑھتا تھا۔ یہ ذکر ہے سن ۲۳-۲۴ء کا۔ الیف، سی، کالج اُس وقت وائی۔ایم،سی، اے کے پہلو میں تھا، جہاں اب بڑی بڑی دکانیں اور دفتر بن گئے ہیں۔

یاد نہیں رہا کیا تقریب تھی۔ کالج کے ہال میں کوئی سولہ کا تین تھا، کالج کا پورا اسٹاف مع پرنسپل کو کس کے ڈائس پر سجا ہوا تھا۔ اتنے میں اعلان ہوا کہ ابوالاثر حفیظ جالندھری صاحب تشریف لاتے ہیں۔ اُس زمانے میں سابقوں میں

"ابو" کی ردیف چل رہی تھی ۔۔ ابوالکلام، ابوالکمال، ابوالمعانی، ابوالمکارم، ابوالخیر، ابوالمجاہد، اور خدا جانے کیا کیا "ابو"۔ اعلان کے ساتھ ہی ایک نوجوان ڈائس پر آ گیا۔ سر پر اودی مخمل کی ترکی ٹوپی، اچکن، اور چوڑی دار پاجامہ۔ وضع کسی طرف سے بھی جالندھری نہیں تھی۔ نہ سر پر کلاہ زریں اور مشہدی، نہ بر میں بانات کوٹ، نہ دھڑ میں شلوار۔ گیہواں رنگ، کھلی پیشانی، لمبوترا چہرہ، چمکدار آنکھیں، کتابی سی ناک، خشخشی مونچھیں، داڑھی صفاچٹ، بوٹا سا قد، نازک نازک ریشمین سے آدمی۔ بھلا ایسے ہوتے ہیں کہیں جالندھر والے؟

خیر تو ان صاحب نے پیچھے مڑ کر اجازت لی اور لہک کر آواز لگائی ۔۔۔

"کھاؤں، کھاؤں!"

یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے؟ اُس زمانے میں مائکروفون نہیں تھے۔ بارے انہوں نے دوبارہ اپنا مصرعہ پڑھا تو معلوم ہوا کہ کہہ رہے ہیں:

"ابھی تو میں جوان ہوں!"

اس کے بعد جو انہوں نے اپنے نئے انداز کی نظم سنانی شروع کی تو ہال میں جو چُر غم چُر غم ہو رہی تھی سب بند ہو گئی اور ایسا سناٹا چھایا کہ جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ مگر ادھر نظم کا ایک بند ختم ہوا اور ادھر واہ واہ سبحان اللہ کا شور برپا ہوا۔ نظم خاصی طویل تھی اور حفیظ صاحب اس کے مصرعے ایسے چبا چبا کر پڑھ رہے تھے جیسے شاعری کی جگالی کر رہے ہوں۔ مگر ان کے ترنم کی طرح ان کے پڑھنے کی یہ خاص ادا بھی بڑی دلبرانہ تھی۔ اس میں تقریباً آدھا گھنٹہ گذر گیا، مگر کسی کو وقت کا احساس نہیں ہوا۔

جب نظم ختم کر کے وہ جانے لگے تو بے تحاشا تالیاں بجنے لگیں اور "ایک اور۔ ایک اور" کی دبی دبی سی آوازیں چاروں طرف سے آنے لگیں۔

ڈاکٹر لوکس کا رعب سارے کالج پر اس قدر تھا کہ ان کے سامنے کسی کی مجال نہیں تھی کہ اونچی آواز میں بات کرلے۔ حفیظ صاحب نے ٹھٹک کر ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے مسکرا کر اپنے سر کو مثبت جنبش دی تو حفیظ صاحب نے واپس آکر جونپوری کی دھن میں

"بسا لے اپنے من میں پیت"

سُنانا شروع کیا۔ یہ بھی ہمارے لئے ایک نئے انداز کی شاعری تھی۔ کیوں کہ ہم نے اُس وقت تک شاعروں سے اردو میں غزلیں ہی سنی تھیں۔ حفیظ نے اس کے سُنانے کے دوران میں تانوں سے ملتی جُلتی آوازیں بھی نکالیں تو میرے کان کھڑے ہوئے ۔۔۔

"ارے، یہ شاعر تو گویا بھی ہے!"

کلام کی جدت و بے ساختگی اور ترنم کی موزونیت و دل آویزی نے میرا دل موہ لیا۔ اور اسی وقت سے میں حفیظ صاحب کے خاموش قدر دانوں میں شامل ہو گیا۔

سائنس کے طالب علم کو اتنی فرصت کہاں کہ شاعری اور شاعروں کے چکر میں پڑے۔ مگر بدقسمتی سے ادب و شعر کی

چینٹک مجھے بھی لگی ہوئی تھی۔ چور چوری سے جائے گا تو کیا ہیرا پھیری سے بھی جائے گا؟ کالج کی لائبریری میں اردو کے اخبار رسالے بھی آتے تھے۔ اب میں اکثر حفیظ صاحب کا کلام ان میں پڑھنے لگا۔ انہوں نے اردو شاعری کو ایک نئی صنف دی تھی، اور یہ صنف تھی گیت کی۔ حفیظ کی نقالی میں ہندوستان کے ہر گوشے سے گیت لکھے جانے لگے۔ اور ان کی ہیئت کے عجیب و غریب تجربے کئے جانے لگے۔ یعنی صورت یہ ہوگئی کہ آپ "پیمانہ" یا کسی ایسے ہی رسالے کو اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو اکثر صفحوں پر .... SNAKKES AND LADDERS
سانپ اور سیڑھیاں، بنی ہوئی دکھائی دیتیں۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا کہ خیر سے یہ گیت ہیں جن کی یہ ہیئت کذائی ہوگئی ہے۔ مگر حفیظ صاحب ہمیں بڑے خوب صورت گیت اور بڑی حسین نظمیں دیتے رہے۔ انہوں نے گیت کے وقار کو قائم رکھا۔

شمس العلماء میر ممتاز علی بہت پرانے تو یوپی کے رہنے والے۔ مگر پچاس سا ٹھ سال پہلے انہوں نے لاہور کو اپنا وطنِ ثانی بنا لیا تھا۔ میر صاحب اور ان کی اہلیہ محمدی بیگم مرحومہ نے مل کر عورتوں کا ہفتہ وار اخبار "تہذیبِ نسواں" لاہور سے جاری کیا تھا۔ یہ ادبی اخبار غیر منقسم ہندوستان کے ہر شریف خاندان میں آتا تھا اور اس قدر مقبول تھا کہ تہذیبی بہنوں اور تہذیبی بھائیوں کا ایک بہت بڑا حلقہ بن گیا تھا۔ محمدی بیگم اچھے معاشرتی اور اخلاقی مضامین اس میں لکھا کرتی تھیں۔

جب امتیاز علی تاج نے ہوش سنبھالا تو محمدی بیگم نے بچوں کے لئے بھی ایک ہفتہ وار اخبار "پھول" جاری کیا۔ مرحومہ بچوں کے لئے روایتی اور اخلاقی کہانیاں بھی لکھتی تھیں۔ جن میں سے بہت سی کتابی صورت میں چھاپ دی گئی تھیں۔

جب اخباروں اور کتابوں کا کاروبار بڑھا تو میر صاحب نے اخباروں کے لئے اڈیٹر ملازم رکھنے شروع کر دیئے ان اڈیٹروں کو آسان اردو لکھنے کی تربیت خود مولوی صاحب دیتے تھے۔ اس ادارے کے تربیت یافتہ اڈیٹروں میں بڑے بڑے نام دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً بیگم نذر سجاد حیدر، سید وجاہت حسین جھنجھانوی، مولانا عبدالمجید سالک، نشتر جالندھری، پنڈت ہری چند اختر، مولانا چراغ حسن حسرت، مشہور افسانہ نگار غلام عباس، اور آخر آخر میں حفیظ ہوشیار پوری، احمد ندیم قاسمی اور راجہ مہدی علی خاں۔ دورِ متوسط کے اڈیٹروں میں حفیظ جالندھری بھی شامل تھے۔

میر ممتاز علی صاحب سے میرے والد کے تعلقات مخلصانہ تھے، اور جب میں نے لاہور میں داخلہ لے لیا تو میں بھی کبھی کبھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ریلوے روڈ پر گھر اور دفتر ایک ہی جگہ تھا۔ یہیں میں نے امتیاز، پطرس، سالک، حفیظ جالندھری، غلام عباس اور چراغ حسن حسرت کو پہلی بار دیکھا۔ مگر یہ جلوہ دور ہی کا تھا۔ حفیظ صاحب کی شہرت اُس وقت پر تول رہی تھی۔ "نغمہ زار" وغیرہ دو ایک کتابیں بھی ان کی دارالاشاعت سے شائع ہو چکی تھیں۔ مگر اُن کا نام شہرت کے پَر لگا کر اُس وقت اُڑا جب انہوں نے "شاہنامۂ اسلام" لکھا، اور اس کے خاص خاص حصے انہوں نے ایک مخصوص دھن میں سنانے شروع کئے۔ اور ان کا "سلام"، "سلام اے آمنہ کے لال" تو اتنا مقبول

ہوا کہ گھر گھر پڑھا جانے لگا۔ اس شاہنامہ نے انہیں "فردوسیِ اسلام" بنا دیا۔

لاہور کے ادیب اور شاعر ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے، اور یہ ٹولیاں آپس میں ٹکراتی رہتی تھیں۔ اُن کی ٹکروں کی وجہ سے ادبی دنیا میں خاصہ ہنگامہ رہتا تھا۔ ایک بڑی ٹولی تو یہی تھی جس کے سرغنہ پطرس تھے۔ اور دارالاشاعت اس کا اڈہ تھا۔ انہیں حضرات نے آگے چل کر "نیاز مندانِ لاہور" کا روپ دھار لیا تھا۔ دوسری ٹولی شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی کی تھی۔ تاجور مرحوم ایک مقامی کالج میں پڑھاتے تھے، اس لیے ان کے سینکڑوں شاگرد تھے۔ خود تاجور بہت اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ ان دونوں ٹولیوں میں آئے دن ٹکر ہوتی رہتی تھی۔ تاجور کو نیچا دکھانے کے لئے ہفتہ وار اور ماہوار رسالے بھی نکالے گئے، جن میں سے بعض کی ادارت حفیظ صاحب کرتے تھے۔ تاجور ایک بجسم تخیم انسان تھے جنہیں دیکھنے کے بعد یہ تو کہا جا سکتا تھا کہ یہ گاما پہلوان کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر یہ کسی طرح نہیں سمجھا جا سکتا تھا کہ شاعر ہیں۔ مگر مولانا جس قدر گراں ڈیل تھے اُسی قدر گراں ڈیل اُن کا علم و فضل بھی تھا۔ وہ تنہا اپنی ذات سے اپنی حریف ٹولی پر بھاری تھے۔ حفیظ صاحب نے میدان کارزار گرم کر رکھا تھا، مگر تاجور در لرکی طرح اس میدان پر بھر جاتے تھے۔ عجب لوہے کا بنا ہوا آدمی تھا۔ جو کبھی لڑتا تھا، اور ڈٹ کر مقابلہ کرتا تھا۔ یہ لڑائیاں آج کل کی لڑائیوں کی طرح گھٹیا اور بیہودہ نہیں ہوتی تھیں۔ ان میں بھی ایک وقار اور لطف ہوتا تھا۔ ادب و شعر کے آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھا جاتیں، دھواں دھار مینہ پڑتا، کوہ پیکر بادل ٹکراتے، شورِ قیامت برپا ہوتا، بجلی کے کوڑے بجتے، کبھی کبھی جھڑی بھی لگ جاتی، مگر اکثر یہ ہوتا کہ برس کر کھل جاتا، اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے طبیعتیں فرحت پانے لگتیں۔ جب تک مولانا لاہور میں رہے، اور آخر وقت تک وہ لاہور ہی میں رہے، یہ مقابلے اور مجادلے ہوتے رہے اور لاہور کی ادبی رونق کو بڑھاتے رہے۔

حفیظ صاحب کی دیکھا دیکھی تقریباً سبھی شاعروں نے ترنم سے اپنا کلام سنانا شروع کر دیا تھا۔ شاعروں کی جان پر یہ اور غضب ٹوٹا۔ ایک سے ایک بے سُرا شاعر ہے کہ گا رہا ہے۔ اور میاں تان سین کی قبر پر لات مار رہا ہے۔ اس کا ردِعمل ہونا ہی تھا۔ ایس۔ پی۔ ایس۔ کے۔ ہال میں اکثر مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ ایک صاحب جو فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے اور گاتے بجاتے بھی خوب تھے۔ اور مولانا تاجور کی فوج میں شامل تھے ایک دفعہ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے ہال میں پہونچ گئے۔ یہ صاحب پوری طرح مسلح تھے۔ اس مشاعرے میں حفیظ صاحب بھی آنے والے تھے۔ آگئے۔ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے وہ صاحب اسٹیج پر آئے، اور انہوں نے اعلان کیا کہ ـــــ

"آج کے مشاعرے میں جو صاحب گا کر اپنا کلام سنانا چاہیں وہ باقاعدہ گا کر سنائیں۔ سازوں کا انتظام کر دیا گیا ہے"۔

یہ کہہ کر انہوں نے پردے کے پیچھے سے ہارمونیم اور طبلے کی جوڑی نکال کر سامنے اسٹیج پر رکھ دی، اور اسی کے ساتھ ساتھ ایک طبلہ نواز بھی آ کر بیٹھ گیا۔

مشاعرے میں ہڑبونگ مچ گئی۔

اُن صاحب نے دوبارہ اعلان کیا کہ:

"سب سے پہلے میں آپ کو اپنا کلام گا کر سناتا ہوں"

چنانچہ انہوں نے باجہ سنبھالا اور پورے تال سُر سے اپنی غزل سُنائی۔

جب انہوں نے گانا ختم کیا تو وہ تالیاں پٹیں اور وہ غوغا بلند ہوا کہ الامان الحفیظ۔ اور حفیظ حفیظ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ مگر حفیظ صاحب چپکے سے اٹھ کر پہلے ہی باہر نکل گئے تھے۔ بھلے آدمیوں کا ایسے مشاعرے میں کیا کام ہے؟

حفیظ صاحب کی شہرت میں اُن کی نظم "رقاصہ" کو بھی بہت دخل ہے۔ ایک ریاست کے نواب نے ایک مشہور طوائف کے پیچھے ریاست کو برباد کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ واقعہ بہت مشہور ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں ایک پنجابی گانا بھی بچے بچے کی زبان پر آ گیا تھا: "تو بنا دیدائی تا۔ تا رنا" وغیرہ۔ ایک جشن کے موقعے پر حفیظ صاحب بھی اُسی نواب کے دربار میں مدعو کئے گئے۔ حفیظ صاحب کی حق گوئی ویسے بالکل نے اُن سے نظم "رقاصہ" کہلوائی۔ اور بھرے دربار میں انہوں نے وہ نظم سُنائی۔ حاضرین کا تانا نکل گیا۔ وہ رنڈی بھی سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ حفیظ صاحب اُسی سے مخاطب ہو کر سُناتے رہے۔ نظم میں چونکہ اسی کو مخاطب بھی کیا گیا تھا اس لئے کریلا اور نیم چڑھا! نظم بے حد تلخ ہو گئی۔

نواب کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ پھر اس کے تیور بگڑ گئے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد حفیظ صاحب پر انعام و اکرام کی کیسی کیسی بارشیں نہ ہوئی ہوں گی!

یہ حفیظ صاحب کی ہمیشہ کی عادت ہے کہ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ منہ پھٹ آدمی ہیں۔ صاف کہنا اور سُکھی رہنا۔ اگر کوئی ناراض ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ راجہ روٹھے گا تو اپنی نگری لے گا۔ اور بے تکلف دوستوں کو تو ایسی کھری کھری سناتے ہیں کہ نہ دھری جائیں نہ اٹھائی جائیں۔ حال ہی میں پیاسے ساحلِ اہلِ ادب کے ڈنر میں ایک بہت بڑے سرکاری افسر نے حفیظ صاحب پر چند فقرے چُست کئے۔ پھر جو حفیظ صاحب نے مہاڑ کا اُس شریف آدمی کے پیچھے پڑے تو اس کے چھکے چھڑا دیے۔ وہ بار بار کھسیانی ہنسی ہنس کر ٹالتا رہا۔ مگر حفیظ صاحب نے لکھ پتی کی دو کوڑی کی کر دی۔

اتفاق سے میں اُن صاحب کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا وہ گھبرا کر مجھ سے مخاطب ہوئے:

"دیکھا آپ نے؟"

میں نے کہا:

"جی ہاں دیکھا۔ آپ نے اِس بھڑوں کے چھتے کو کیوں چھیڑا؟"

رونکھی مسکراہٹ سے بولے:

"بڑا پیارا آدمی ہے"

انگریزوں کا اصول تھا کہ مشہور آدمیوں کو خطاب دے کر اپنا آدمی بنا لیتے تھے۔ چنانچہ ہندوستان کے جتنے سر بہادر حضرات تھے سب کو انگریز نے خطابات سے نوازا دیا تھا۔ اس پالیسی کے تحت انہوں نے ڈاکٹر اقبال کو "سر" کا خطاب دیا تھا اور معتوب حفیظ جالندھری کو "خان بہادر" کا۔ مگر حفیظ صاحب کو صرف "خان صاحب"۔ حفیظ صاحب اس کم نظری پر افسردہ اور برہم تھے اور برہمی یوں اور بھی بڑھی کہ "خان صاحب" عموماً کلاونتوں اور ڈوم ڈھاڑیوں کو کہتے ہیں۔ ترنم سے پڑھنے کی وجہ سے "خاں صاحب" کا خطاب ان پر چپک کر رہ گیا، اور ان کے مخالفین اور بے تکلف دوست انہیں یہ کہہ کر چھیڑنے لگے کہ:

"حکومت نے تمہاری صحیح قدر دانی کی ہے"

یہ خطاب حفیظ صاحب کے لئے سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گیا کہ نگلے تو اندھا اور اُگلے تو کوڑھی۔ بارے آگے چل کر جب انہیں "خان بہادر" کا خطاب ملا تو ان کی کسی قدر اشک شوئی ہوئی۔ مگر اب ان کی شہرت اور خدمات کی وہ نوبت آ چکی تھی کہ انہیں "سر" کا خطاب ملنا چاہیے تھا۔ سر محمد اقبال کے اُٹھ جانے کے بعد حفیظ صاحب ہی کو "سر" کا خطاب ملنا چاہیے تھا۔ مگر ان کو "خان بہادری" ہی پر ٹرخا دیا۔ اور ادھر مولانا تاجور کو شمس العلماء بنا دیا! ع

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

حفیظ صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں۔ ہر رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور ہر قالب میں ڈھل جاتے ہیں، شاعر ہیں، نثر نگار ہیں، اڈیٹر ہیں، مصنف ہیں، نغمہ کار ہیں، پرچارک ہیں، ملازم سرکار ہیں، بلکہ سوچنا پڑتا ہے کہ وہ کیا نہیں ہیں۔ بڑی پہلودار شخصیت ہے حفیظ صاحب کی۔ جب پچھلی بڑی لڑائی نے زور پکڑا تو حکومت نے سانگ پبلسٹی کا محکمہ کھولا۔ اس محکمہ کا کام یہ تھا کہ گانوں اور ڈراموں وغیرہ کے ذریعے بھرتی ہونے کی ترغیب دلائی جائے۔ اور حکومت کا بول بالا کیا جائے۔ اس محکمے کے افسر اعلیٰ حفیظ صاحب مقرر ہوئے۔ حفیظ صاحب نے اس محکمے کے فرائض افسرانِ بالا کے اطمینان کے مطابق انجام دیئے۔ حفیظ صاحب گیت لکھتے اور سازندوں میں بیٹھ کر خود ہی گیتوں کی دُھنیں تجویز کرتے تھے۔

فرمایا کرتے تھے کہ:

"بھیا، تم تو راگ راگنیوں اور تالوں کو دیکھتے ہو۔ ہمارا کام دوسری قسم کا ہے۔ میرا معیار گانے کا جانتے ہو کیا ہے؟ وہ جو کشمیری دروازے کے بس اسٹینڈ پر ایک اندھا فقیر کھڑا صدا لگاتا رہتا ہے نا؟ بس مجھے تو ایسی دھنیں چاہئیں"

اور میں منہ پھیر کر اپنے ساتھی سے کہتا:

"ہاں، اندھوں کے لئے تو اندھوں ہی کی دھنیں چاہئیں"

حفیظ صاحب چونک کر کہتے:

"کیا کہہ رہے ہو پیارے؟"

تو میں کہتا:
"کچھ نہیں، ان سے بات کر رہا تھا۔"
پھر فرماتے:
"اب یہ وہ حفیظ نہیں ہے جسے تم رسالوں اور کتابوں میں دیکھتے آئے ہو۔ میں اب ایسے گیت لکھتا ہوں: 'میں تو چھورے کو بھرتی کرائی آئی رے'۔"
"بہت اچھا ہے حفیظ صاحب۔ ایں ہم اندر عاشقی ...... شاید آپ ہی کے محلّے کا ایک گیت مجھے کسی نے سنایا تھا۔ اچھا ہے ہریانہ بولی میں ہے

بھرتی ہو جا رے ترے باہر کھڑے رنگروٹ
یہاں تو پہنے پھٹا پُرانا　　　وہاں ملے گا سُوٹ
بھرتی ہو جا رے......
یہاں تو پہنے ٹری کا جوتا　　　وہاں ملے گا بُوٹ
بھرتی ہو جا رے......
یہاں تو لیوے لاٹھی ڈنڈا　　　وہاں ملے بندوک
بھرتی ہو جا رے......"

بولے، "نہیں نہیں، یہ گیت میرا نہیں ہے۔ کسی اور کا ہے۔"
حفیظ صاحب اس محکمے کے اُس وقت تک ڈائریکٹر رہے جب تک یہ محکمہ قائم رہا۔ حفیظ صاحب بڑی تن دہی سے کام کرتے ہیں اور آخر تک نباہے چلے جاتے ہیں۔ پاکستان میں اُن کی خدمات کے پیش نظر حکومت نے اُن کی پانسو روپے پنشن مقرر کر دی تھی۔ مگر کہیں اوسوں سے پیاس بجھتی ہے؟ یہ رقم اُونٹ کی داڑھ میں زیرا ہو گئی۔ مگر سونا ایک بار پھر اُس وقت معیار پر کسا گیا جب پاکستان میں دیہی امداد کا محکمہ قائم ہوا۔ حفیظ صاحب کو اس کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ معقول مشاہرہ ملنے لگا۔ مگر سکریٹریوں کو تو چار چار ہزار ملیں اور حفیظ صاحب کو صرف دو ہزار کی یافت ہو! ع

اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

لو صاحب، چند سال کی اُلٹ پلٹ میں یہ محکمہ بھی ختم ہو گیا۔ مگر شکر خورے کو شکر۔ اور موذی کو ٹکر۔ مارشل لا کا زمانہ آ گیا، اور حفیظ صاحب محکمۂ تعمیر نو میں ممبر مقرر ہو گئے۔ اب سُنا ہے کہ وہ محکمہ بھی ختم ہو رہا ہے۔ عارضی محکموں کی یہی تو خرابی ہے کہ وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ ع

جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی؟

اللہ بڑا مُسبب الاسباب ہے۔ ایک در بند ہوتا ہے تو ستر کھلتے ہیں۔ اور بحمداللہ، حفیظ صاحب تو بڑے نصیبہ ور آدمی ہیں۔ جیسے سانپ کو زمین جگہ دیتی ہے ویسے حفیظ صاحب کو حکومت جگہ دیتی ہے۔ یہ تو درزی کی

سُوئی ہے کہ ریشم اور مخمل میں بھی چلتی ہے اور گاڑھے اور گزی میں بھی۔

حفیظ صاحب میں شعر و موسیقی میں جو ربط ہے اس کا سب شاعروں سے بڑھ کر شعور ہے۔ اس کی ایک بیّن مثال "ترانۂ پاکستان" ہے۔ میں اس وقت ریڈیو پاکستان میں نگرانِ موسیقی تھا جب ترانۂ پاکستان کا غلغلہ اٹھا۔ اس ترانے کی دھن کے پانچ ہزار اور اس کے الفاظ کے پانچ ہزار مقرر کیے گئے تھے۔ صبح سے شام تک دھن بنانے والے اپنے سروں کو دُھنتے اور اپنی اپنی دُھنیں ریکارڈ کرا کے چلے جاتے۔ کراچی کے علاوہ اور شہروں سے بھی دھنوں کے ریکارڈ اس مقابلے میں شریک کیے گئے تھے۔ اور سیاد پوری ہو جانے پر اس وقت کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں مرحوم کو منتخب دُھنیں سُنائی گئی تھیں۔ چھاگلا مرحوم کی دھن سب میں بہتر سمجھی گئی تھی مگر اسے بھی لیاقت علی خاں مرحوم نے پوری طرح پسند نہیں کیا تھا۔ ان کے بعد جو وزیر اعظم صاحب تشریف لائے تھے انہوں نے مزید انتظار کیے بغیر چھاگلا کی دُھن منظور کر لی۔

اس کے بعد شاعروں کو اذنِ عام دیا گیا کہ اس دھن پر ترانۂ پاکستان کے بول بٹھاؤ۔ اب پھر شاعروں کی تاخت ریڈیو اسٹیشن پر ہونے لگی۔ بڑے بڑوں نے زور مارا۔ ان سب کے ریکارڈ بھی بھرے گئے۔ حفیظ صاحب نے بھی اپنا ترانہ ریکارڈ کرایا۔ پھر ان سب بولوں کی جانچ خدا جانے کن بڑے بڑے ماہروں نے کی، اور سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ حفیظ صاحب کا ترانہ سب سے بہتر ہے۔ میں نے بھی ریکارڈنگ کے دوران میں بعض نامی شاعروں کے بول دیکھے اور سُنے تھے۔ واقعی میں حفیظ کے ترانے سے بہتر تو کیا کوئی اس کا پاسنگ بھی نہیں تھا۔

یار لوگوں نے پہلے ہی سے شور مچا رکھا تھا کہ یہ کیسی اُلٹی کارروائی ہو رہی ہے۔ پہلے چیز لکھی جاتی ہے، اس کے بعد اس کی دھن بنائی جاتی ہے۔ یہاں پہلے دھن بنا دی گئی ہے۔ اور بعد میں اس پر بول کہلوائے جا رہے ہیں۔ بہتوں کو انگریزی میں غصہ آیا، اور انہوں نے انگریزی محاورہ 'PUTTING THE CART — BEFORE THE HORSE' دُہرایا۔ مگر جسے پیا چاہے وہ سہاگن۔ حفیظ صاحب سہاگن بنے اور پانچ ہزار رونمائی میں انہیں ملے۔ مگر روپیہ پیسہ کیا ہے؟ یہ تو ہاتھ کا میل ہے۔ پھر حفیظ جیسے صاحبِ ثروت کے نزدیک پانچ ہزار کی بھلا کیا حقیقت ہے۔ یہ کہتے بڑے اعزاز اور سرفرازی کی بات ہے کہ کسی شاعر کا لکھا ہوا ترانہ پوری قوم اور ملک کا ترانہ بن جائے۔ یہ افتخار حفیظ صاحب کو حاصل ہوا، اور وہی اس کے مستحق بھی تھے۔

اس کامیابی کا اعلان ہونا تھا کہ یار لوگ کوٹلوں پر لوٹ گئے۔ اور تو اور حفیظ صاحب کے قریب ترین دوست، قدر دان، مدّاح، سالک اور مجید لاہوری جیسے بھی تیقے سے اُکھڑ گئے۔ اور نہ صرف اس ترانے کی مخالفت ان دوستوں نے کی، بلکہ اس کا مذاق بھی اڑایا۔ اور اس کی پیروڈی بھی لکھی۔ بلکہ ان کے ایک دوست نے، جس سے چاننا چٹنوں کا مذاق ہوتا ہے اسی بحر اور اسی دھن میں ایک فحش پیروڈی لکھی، جسے وہ مزے لے لے کر حفیظ صاحب کی موجودگی میں دوستوں کو سنایا کرتے تھے۔ اور حفیظ صاحب کٹتے رہ جاتے تھے۔ دوستوں کا یہ دتیرہ ذرا کم دیکھنے میں آتا ہے۔

حفیظ صاحب کو میں نے سینکڑوں مشاعروں اور ادبی نشستوں میں پڑھتے سنا ہے۔ بڑے اعتماد سے پڑھتے ہیں۔ ان کا حافظہ بھی اچھا ہے، چالیس چالیس سال پہلے کی لکھی ہوئی طویل طویل چیزیں انہیں اب بھی ازبر ہیں۔ جب کبھی وہ کسی مشاعرے میں اپنا نیا کلام سناتے ہیں تو ان سے "رقاصہ" یا ؎

"بسا لے اپنے من میں پیت"

"ہائے سوزِ عشق جاگ"

یا ؎

سنانے کی ضرور فرمائش کی جاتی ہے۔ اب وہ سنانے سے پہلے ایک چھوٹی سی تقریر بھی ضرور کرتے ہیں۔ اور جب زیادہ لاڈ میں آتے ہیں تو غنغنا کر بولنے لگتے اور ان کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کے لائق ہوتے ہیں۔ یہ بھی ان کی ایک ادائے محبوبانہ ہے۔ اور جب انہیں کسی شعر کی بہت داد ملتی ہے تو وہ اس قدر بلک بلک کر اس شعر کو دہراتے اور تہراتے ہیں کہ مشاعرے کو سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ یہ اُن کا غمزۂ تُرکانہ ہے۔ ان کے قدردان ان کی انہی اداؤں پر لوٹ پوٹ ہیں۔

حفیظ صاحب شہرت کے اُس درجے پر اب پہونچ گئے ہیں کہ جب اُن سے پہلی بار کسی کا تعارف کرایا جاتا ہے تو صرف ہوں کر کے کھیسیں نکال دینے کو کافی سمجھتے ہیں۔ نئے آدمیوں سے بات کرنے میں اس قدر احتیاط برتتے ہیں کہ خاموش رہنے ہی کو بہتر سمجھتے ہیں۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان سے کئی کئی دفعہ تعارف ہو چکا ہے مگر پھر جب ملتے ہیں تو انجان بن جاتے ہیں۔ شاید تجاہلِ عارفانہ بھی بڑے آدمیوں کی ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ شاید نہ پہچاننے سے بزرگی و عظمت قائم ہوتی ہو؟ یہ حادثہ بار بار مجھے پیش آ چکا ہے کہ میں نے مؤدبانہ سلام کیا اور انہوں نے نہایت بے مروتی سے سر کو خفیف سی جنبش دے دی یا ہاتھ سے مکھی سی اڑا دی۔ جب کچھ دیر بعد پھر کسی نے تعارف کرایا تو پہلے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا، پھر چہرے پر حیرت کا تاثر پیدا کیا۔ پھر و فورِ مسرت کا۔ اور پھر "ارے تم ہو شاہد!" کہہ کر گلے لگا لیا ــــ اگلی دفعہ پھر اجنبی کے اجنبی دھرے ہوئے ہیں۔

اصل میں اس میں بناوٹ کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ انہیں ہزاروں آدمیوں سے ملنا ہوتا ہے۔ کہاں تک اور کس کس کو یاد رکھیں؟ لہٰذا اب میں انہیں یاد رکھتا ہوں، اور جب کبھی اور جہاں کہیں بھی اُن سے آمنا سامنا ہو جاتا ہے تو میں خود ہی "ہاؤ" کر کے اُن سے لپٹ جاتا ہوں۔ میں ان سے کئی سال چھوٹا ہوں۔ مگر وہ میری اس گستاخی کو گوارا فرما لیتے ہیں۔

حفیظ صاحب کو ان کے اسی تجاہلِ عارفانہ اور خاموشی کی وجہ سے لوگ مغرور اور اوچھا آدمی سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اُن کا دل کھرے سونے کا ہے۔ مگر اس دل کی گھنڈی وہ بڑی دیر میں کھولتے ہیں۔ اور جب وہ کھل جاتے ہیں تو پھر ان کے بے پایاں خلوص کو دیکھئے۔ ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔

سنہ ۵۰ء میں بے کاری و بے روزگاری کے باعث جب میرا سارا اندوختہ ختم ہو گیا، اور میں مقروض ہونا شروع ہو گیا تو چند بھلے آدمیوں نے مجھ سے کہا کہ میاں یوں کب تک گذر کرو گے؟ ہم نے تمہارے لئے بات کی ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب تم سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ تم سے واقف ہیں۔ تم ذرا ان سے مل تو لو۔ چنانچہ شیخ صاحب سے ملنے

دو ایک دن کے بعد اُن کے دفتر پہونچا۔ اطلاع کرائی، رسائی ہوئی، خوش اخلاقی سے ملے۔ کم گو آدمی ہیں مگر معاملہ فہم اور مردم شناس۔ بولے:

"آپ کو ہماری ضرورت نہیں ہے، مگر ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ آپ یا تو" ماہِ نَو "کی اڈیٹری قبول فرمالیجئے یا ریڈیو پاکستان میں آجایئے:"

میں نے کہا: "میں اپنا پرچہ" ساقی "نکالتا ہوں، اس لئے" ماہِ نَو "کا ایڈیٹر نہیں بن سکتا۔"

بولے۔ "تو ریڈیو پاکستان میں آجایئے۔ اور ہمارے سکریٹری جی، احمد صاحب سے بھی ملتے جایئے۔"

میں نے کہا: "کیا آپ سے مل لینا کافی نہیں ہے؟"

بولے: "رسماً مل لیجئے۔"

جی، احمد صاحب سے بھی ملا۔ اُنہوں نے فرمایا: "اکرام صاحب نے ابھی ابھی بتایا کہ آپ ریڈیو پاکستان میں آرہے ہیں۔ بہت خوشی کی بات ہے۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں۔"

فرمایا: "اسے آپ نوکری ہرگز نہ سمجھیں۔"

اُن کے کمرے سے باہر نکلا تو سامنے برآمدے میں اے۔ ڈی۔ اظہر اور حفیظ صاحب کھڑے نظر آئے۔ دونوں سے مصافحہ ہوا۔

حفیظ صاحب نے پوچھا:

"خیر تو ہے، آپ یہاں کہاں؟"

میں نے کہا:

"نوکری لینے آیا تھا۔"

پھر مختصر رُوداد انہیں بتائی تو بے حد اداس اور متاسف ہو کر اظہر صاحب سے بولے: "سنتے ہو اظہر، پاکستان میں شاہد نوکری کر رہا ہے!"

پھر اظہر صاحب مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ وہ اس وقت پاکستان ریلوے کے فنانشل ایڈوائزر تھے۔ دیر تک افسوس کرتے رہے۔ اور مجھے سمجھاتے رہے۔ حفیظ صاحب کو اُس دن میں نے دیکھا کہ واقعی انہیں اِس اطلاع سے صدمہ ہوا۔ یہ اگر اُن کا خلوص نہیں تو پھر کیا تھا؟

حفیظ صاحب نے ویسے تو دنیا بہت دیکھی اور زمانے کا سرد و گرم بھی چکھا ہے مگر ان میں چھل فریب اور مکاری نہیں ہے۔ کبھی کبھی بڑی بھولی بھولی باتیں کرتے ہیں تو اُن پر بڑا پیار آتا ہے۔

ایک دفعہ کہنے لگے کہ:

"میں تو سرکاری ملازمتوں اور اس کی زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر بیٹھ جاؤں۔ بس پھر میں یہ کروں گا کہ مسجدوں میں اور دیہاتوں میں جایا کروں گا اور مجمع سے کہوں گا: "لاؤ،

تم سب دو دو پیسے نکالو۔ میں "منتی" شاہنامۂ اسلام" سناؤں گا۔ میرے پاس اتنے پیسے آہی جائیں گے کہ دو وقت کی روٹی مجھے مل جائے۔ باقی وقت میں کتابیں لکھوں گا۔ تو م کا بھی بھلا ہوگا اور اپنا بھی"۔

حفیظ صاحب کے بھولپن کا ایک واقعہ اور یاد آ گیا:

دو ڈھائی سال ہوئے ایک خیر سگالی وفد دلی گیا تھا۔ اس میں حفیظ صاحب بھی تھے۔ امرتسر پر حکومتِ ہند کا ایک نمائندہ ہماری پذیرائی کے لئے موجود تھا۔ اسٹیشن کے رستوراں میں سب کو کھانا کھلایا گیا۔ اتنے میں ریل کے آنے کا وقت ہوگیا۔ سب کی سیٹیں فرسٹ کلاس میں بک تھیں۔ ہر ڈبے میں چار سیٹیں تھیں۔ ہم چار چار کی ٹولیوں میں بٹ گئے۔ ذوالفقار بخاری، شوکت تھانوی، سید محمد جعفری، اور میں ایک ڈبے میں داخل ہوگئے۔ قلی نے بستر کھول کر لگا دیئے۔

جب ہم اپنی اپنی سیٹوں کے ہوگئے تو بخاری صاحب نے کہا:

"ارے یار حفیظ کو لاؤ۔ ذرا گپ شپ رہے گی"۔

شوکت تھانوی ان کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ بڑی دیر ہوگئی۔ جب گاڑی چھوٹنے لگی تو وہ ڈگ بھرتے ہوئے آئے اور بولے:

"حفیظ صاحب تو ایرکنڈیشنڈ کوچ میں سو رہے ہیں۔ میں نے سارے فرسٹ کلاس دو دفعہ چھان ڈالے کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ پھر کنڈکٹر گارڈ سے میں نے کہا کہ: صاحب، ایک صاحب جن کا نام ابوالاثر حفیظ جالندھری ہے ہمارے ساتھ وفد میں آئے تھے۔ وہ کھو گئے ہیں کیا آپ اُن کی نشان دہی کر سکتے ہیں؟"

اُس نے لسٹ نکال کر دیکھی اور بولا:

"وہ دیکھئے ایرکنڈیشنڈ کوچ ہے۔ اُس کے فلاں خانے میں آپ کے دوست ہیں"۔

میں نے وہاں جاکر دیکھا تو حفیظ صاحب آرام سے پڑے سو رہے تھے۔

میں نے کہا: "حضرت ابھی سے سونے کا کیا موقع ہے؟"

تو بولے:

"یار لڑ لڑ کر تو یہ جگہ لی ہے اب تم چاہتے ہو کہ یہ مجھ سے چھن جائے؟ میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر مجھے اس میں جگہ نہ دی گئی تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ اور تم، تم تو ــــــ ہو۔ جسے تم فرسٹ کلاس سمجھ رہے ہو وہ دراصل سیکنڈ کلاس ہے۔ جاؤ بیٹا اسی میں مرو۔ بندہ تو اب سوتا ہے"۔

یہ کہہ کر انہوں نے کروٹ لے لی!"

بخاری صاحب نے اس اطلاع پر ہنس کر کہا:

"میاں تم تو کہتے تھے حفیظ بھولا آدمی ہے؟"

میں نے کہا:

"بھولا آدمی ہی ایسی بات کر سکتا ہے"۔

جب وفد کا کام ختم ہو گیا تو سب سے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کہہ دیا کہ کل صبح ہم سب کو ہوٹل چھوڑ دینا ہے جو صاحب دلّی میں ابھی اور ٹھیرنا چاہیں اپنا انتظام خود کریں۔ میں تو اسی شام کو ہوٹل سے اٹھ کر شہر میں اپنے ایک عزیز کے ہاں آ گیا۔ پانچ چھ دن اور دلّی میں ٹھیرا۔ واپسی ٹکٹ سب کے پاس تھے۔ جس رات کو واپسی تھی، میں اسٹیشن پہونچا تو فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس پر بہت بھیڑ تھی۔ ان میں جگن ناتھ آزاد اور کئی شاعر کھڑے دکھائی دیئے۔ ان سے تجدید ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ سب کے سب لائل پور جا رہے ہیں ایک مشاعرے میں۔ میں ان حضرات سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ ایک سردار جی گھبرائے ہوئے آئے۔ اور بولے :

"آپ حفیظ جالندھری ہیں؟"

میں نے کہا :

"نہیں تو۔ میرا نام شاہد احمد دہلوی ہے۔"

آزاد صاحب نے انہیں بتایا کہ :

"حفیظ صاحب تو صبح کی گاڑی سے لائل پور چلے گئے۔"

میں نے کہا :

"فرمایئے آپ کو حفیظ صاحب سے کیا کام ہے؟"

سردار جی بولے :

"جی میں یہاں کا بکنگ کلرک ہوں۔ حفیظ صاحب نے اپنا دلّی سے لاہور کا واپسی ٹکٹ واپس کر دیا تھا، اور میں نے اس کا پے منٹ کر دیا تھا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کچھ اس قسم کا سرکاری ٹکٹ تھا جو واپس نہیں کیا جا سکتا۔ اور جی میں تو غریب آدمی ہوں، مجھے اپنی جیب سے یہ پیسہ بھرنا پڑ جائے گا۔"

میں نے انہیں اطمینان دلایا کہ :

"آپ گھبرایئے نہیں، آپ کا پیسہ آپ کو واپس مل جائے گا۔"

سب شاعر کھڑے یہ باتیں سن رہے تھے۔

میں نے آزاد صاحب سے کہا کہ :

"آپ لائل پور پہونچ کر حفیظ صاحب سے ٹکٹ کے پیسے واپس لے لیں اور ان سردار جی کو واپسی پر دے دیں۔"

بیچارا سردار شکریہ ادا کر کے ریل کے چھوٹنے تک وہیں کھڑا رہا۔

ہوا یہ تھا کہ حفیظ صاحب کے پاس دو ٹکٹ پاکستان جانے کے ہو گئے تھے۔ ایک وفد کی واپسی تھی، اور دوسرا مشاعرے کا ٹکٹ۔ لہٰذا انہوں نے واپسی ٹکٹ واپس کر دیا۔ اور کسی نے واپس کرنے پر رد و کد بھی نہیں کی۔ لہٰذا انہوں نے پیسے جیب میں ڈالے اور پاکستان چل دیئے۔ مگر یار لوگ بعد میں یہی کہتے رہے کہ حفیظ صاحب کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ انہوں نے ہمیں ہندوستانیوں کی نظر میں ذلیل کرایا۔ میں کہتا ہوں کہ "حفیظ صاحب دو ٹکٹوں کا آخر کیا کرتے؟" وہ کہتے ہیں کہ "دوسرا ٹکٹ لیا ہی کیوں؟" یہ عجیب منطق ہے پیسہ آتا ہوا کس کو برا لگتا ہے؟

حفیظ صاحب اردو کے شیدائی اور شعر و ادب کے فدائی ہیں۔ یُوپی والوں نے ایک زمانے میں ان کے کلام پر بھی بڑی لے دے کی تھی۔ اہلِ زبان کو اگرچہ اس کا حق حاصل ہے کہ غیر اہلِ زبان کی غلطیوں سے انہیں آگاہ کریں مگر اس کا بھی ایک شائستہ پیرایہ ہوتا ہے۔ لکھنؤ والوں نے ایک باقاعدہ محاذ بنا رکھا تھا۔ اور اسے بڑی فوقیت سمجھتے تھے کہ دوسرے شہر والوں کی زبان پکڑتے رہیں۔ یہ ان کی پرانی خصلت ہے۔ اسی وجہ سے دلّی اور لکھنؤ کے دو دبستاں بنے اور ان میں بڑے بڑے معرکے ہوتے رہے۔ حفیظ تو حفیظ انہوں نے اقبال تک کو نہیں بخشا۔ مرحوم نے ایک آدھ بار تو جواب دیا۔ اس کے بعد خاموشی اختیار کر لی۔ مگر حفیظ صاحب لڑنے اور اَڑنے سے نہیں گھبرائے یہاں تک کہ ادب کے لٹھ بندوں نے ان کا لوہا مان لیا۔ چنانچہ ان کا ایک شعر ہے ؎

حفیظ اہلِ زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

لکھنؤ والوں کے منہ کو تو خون لگ گیا تھا، جب کوئی اور ہاتھ نہ آتا تو آپس ہی میں لڑتے مرتے تھے۔ آخری معرکہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا اثر اور فراق کا ہو چکا ہے۔ جس میں نوبت کھلی کھلی گالیوں تک پہونچی۔ اب آخر آخر میں ان کا کچھ دَم ہرا ہے، جب بھارت کی حکومت نے خود اُن کے صوبے میں اردو کو کوئی حیثیت نہیں دی اور ان کا بیس لاکھ دستخطوں کا محضر بھی ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا۔

حفیظ صاحب اس لحاظ سے بھی خوش نصیب ہیں کہ ان کی خانگی زندگی ہمیشہ خوش گوار گذری۔ بعض سطحی نظر رکھنے والے حضرات معترض ہوتے ہیں کہ انہوں نے ایک چھوڑ تین تین شادیاں کیوں کیں؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ حسبِ ضرورت کیں۔

جب وہ سر عبدالقادر کے ساتھ ولایت گئے تو وہاں سے ایک میم کر لائے۔ وہاں تو عورت ایک چھوتکی بیماری ہے۔ حفیظ صاحب شریف آدمی ہیں۔ کوئی وہاں گلے پڑگئی تو اسے اپنے ساتھ لانا ہی پڑا۔ ورنہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ یار لوگ بہتی گنگا میں ہاتھ دھو کر بیویاں یا داشتائیں وہیں چھوڑ آتے ہیں۔ قصہ زمین بر سرِ زمین۔ مگر شریف آدمی کی بڑی مشکل ہے کہ اپنی شرافت میں مارا جاتا ہے۔ حفیظ صاحب اپنی میم صاحب کو ساتھ لے آئے۔ کئی سال تک وہ ان کے ساتھ رہیں۔ اُن سے بچے بھی ہوئے۔ مگر اس قوم میں وفاداری کہاں؟ بڑی بے مروتی سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ اپنے بچوں کو لے کر میم صاحب اپنے وطن ہمیشہ کے لئے سدھار گئیں۔ کسی قسم کی انتقامی کارروائی کرنے میں شرافت مانع ہوئی اور حفیظ صاحب اپنا دل مسوس کر رہ گئے۔

اللہ نے انہیں اس صبر کا اجر یوں دیا کہ انہیں دلّی کے ایک شریف گھرانے کی خاتون اس سانحے کی تلافی کرنے کے لئے مل گئیں۔ اور حفیظ صاحب نے چپ چپاتے ان سے شادی کر لی۔ ان کے اکثر احباب کو بھی اس کا علم نہیں ہوا۔ ضرورت بھی کیا تھی اس کی تشہیر کرنے کی؟ مجھ پر بھی یہ بات یوں کھل گئی کہ چند سال پہلے میں جب ریڈیو پاکستان، لاہور، پر وگرام نشر کرنے گیا تو ڈیوٹی روم میں ایک جانی پہچانی خاتون کو بھی بیٹھے دیکھا۔ انہوں نے بھی مجھے پہچان کر سلام کیا۔

ڈپوٹی آفیسر نے حیران ہو کر باری باری سے ہم دونوں کو دیکھا اور مجھ سے پوچھا:
"آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟"
میں نے کہا:
"یہ آل انڈیا ریڈیو دلی سے ڈراموں میں شریک ہوا کرتی تھیں۔"
"اور قیام پاکستان کے بعد ہمارے اسٹیشن کے ڈراموں میں حصہ لیتی رہی ہیں۔"
"جی ہاں، مجھے یہ بھی معلوم ہے۔ کیوں کہ کبھی کبھی کراچی میں بھی ہم لاہور کے ڈرامے سُن لیتے ہیں۔"
"بس آپ کو اتنا ہی معلوم ہے؟"
"اس سے زیادہ معلوم کرنے کی ضرورت بھی مجھے کیا ہے؟"
"اجی صاحب، یہ مسز حفیظ ہیں!"
"ایں؟ — اچھا تو آپ ہیں مسز حفیظ! مسز حفیظ سلام علیکم!"

پھر ہم سب ہنس پڑے، اور چائے آ گئی، اور مسز حفیظ نے چائے بنا کر سب کو پیش کی۔ حفیظ صاحب واقعی خوش نصیب ہیں کہ انہیں اتنی اچھی بیوی مل گئی۔ اللہ تعالے جو کام کرتا ہے بہتری ہی کے لئے کرتا ہے۔ اگر میم صاحب روٹھ کر نہ چلی جاتیں تو یہ نیک بی بی حفیظ صاحب کو کہاں سے ملتی؟ ع

خدا شرّے برانگیزد کہ خیر ما در آں باشد

حفیظ صاحب علم و ادب یا ادیبوں کا کوئی کام ہو اس میں بے چُون و چرا شریک ہو جاتے ہیں۔ عجیب لوچدار طبیعت پائی ہے انہوں نے۔ بڈھوں میں بڈھے، جوانوں میں جوان، اور بچوں میں بچے بن جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو نے بھی انہیں ہر دل عزیز بنا رکھا ہے۔

جب ہم نے گلڈ کا پہلا جلسہ کیا تو کوئی سو ڈیڑھ سو پاکستان کے دونوں حصوں میں ادیبوں اور شاعروں کو بھیجے تھے، مجھے کنوینر بنایا گیا تھا۔ خدا کے فضل سے سبھی اس جلسے میں شریک ہو گئے تھے۔ اور جب اس کے ضوابط مرتب کئے گئے، تو ان پر خاصہ ہنگامہ ہوا تھا۔ حفیظ صاحب ایک ایک کو ٹھنڈا کرتے پھرتے تھے۔ کسی کو پیار سے راضی کرتے، کسی کو خوشامد درآمد سے اور کسی کو آنکھیں دکھا کر۔ اس سے زیادہ ہنگامہ اس وقت ہوا جب الیکشن ہوا۔ طے یہ ہوا کہ کراچی، لاہور اور ڈھاکہ اور مرکزی گلڈ کا الیکشن فی الحال کر لیا جائے۔ لاہور اور ڈھاکہ کے الیکشن میں کچھ پیچیدگیاں پڑیں مگر کراچی والوں نے یہ عجیب فیصلہ کیا کہ مجھے نامزد کر دیا کہ مرکز کے لئے کراچی کے ممبر میں نامزد کر دوں۔ ع

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

یہ ہفت خواں بھی بغیر کسی اختلاف کے بخیر و خوبی طے ہو گیا۔ حفیظ صاحب کا نام کسی فہرست میں شامل نہیں ہوا مگر اُن کی پیشانی پر شکن تک نہیں آئی۔ انہوں نے نہ تو اس وقت کسی سے شکایت کی اور نہ بعد میں کہ انہیں گلڈ میں کوئی عہدہ نہیں دیا گیا۔ بلکہ اب تک گلڈ کے ہر معاملے میں ہم اُن کے بزرگانہ مشوروں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور خود حفیظ صاحب اپنے آپ کو گلڈ کا ایک مستند سپاہی سمجھتے ہیں۔ جب بھی ہمیں ان کی ضرورت ہوتی ہے ہم انہیں بے تکلفی سے بلا لیتے

ہیں اور وہ اپنے دس کام چھوڑ کر آ جاتے ہیں۔ یہ کتنے بڑے ظرف کی بات ہے کہ بغیر کسی ذاتی مفاد کے حفیظ صاحب گلڈ کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ایک بہت بڑے شاعر اس بات پر مچلے ہوئے ہیں کہ مجھے گلڈ میں کوئی عہدہ دیا جاتا، تو میں ممبر بن جاتا۔ ان کے برعکس حفیظ جیسی عظیم شخصیت کا شاعر بلند پکارے کہتا رہتا ہے کہ مجھے گلڈ میں ہرگز کوئی عہدہ نہ دیا جائے۔ میں گلڈ کا ایک خادم ہوں، اور خادم ہی رہنا چاہتا ہوں۔ ؏

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا!

دو ڈھائی مہینے ہوئے کراچی کے گلڈ نے "یوم نذیر احمد" منایا تھا۔ اس میں شرکت کے لئے گلڈ کے تمام ممبروں اور غیر ممبروں کو بھی دعوت نامہ بھیج دیا گیا تھا۔ حفیظ صاحب اتفاق سے کراچی میں موجود تھے۔ ان کی بھلمنساہت دیکھئے کہ وہ نہ صرف اس تقریب میں شریک ہوئے بلکہ انہوں نے نذیر احمد کے ادب اور معاشرے پر اس کے اثرات پر ایک جامع تقریر بھی کی تھی۔ اور اس موقع کے لئے نذیر احمد پر ایک یادگار نظم بھی لکھی۔ وہ نظم آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

اے نذیر احمد، مرید ہر قلم ہے تیری یاد | لوحِ دل پہ جب سے تونے لکھ دیا حق العباد
تیری تحریروں سے پہلے کیا تھی حالت قوم کی | چھائی تھی بن کر مرض ہر سُو جہالت قوم کی
نبض تونے دیکھ لی بگڑا ہوا تھا ہر مزاج | اے مسیحائے قلم! تونے کیا اس کا علاج
دُور رس تھی عقل تیری اور روشن تھا دماغ | ملک میں روشن کیا تہذیب کا تُونے چراغ
تیری ہر تحریر ہے تصویر خورشید علُوم | کرتے ہیں کسبِ ضیا اس نور سے ماہ و نجوم
نور تیرے ہی قلم نے ملک میں پھیلا دیا | رات کو دن کر دیا کرنوں کا مینہ برسا دیا
دشمنِ اسلام کا منہ تونے کالا کر دیا | علم و فن کا روئے عالم میں اُجالا کر دیا

حفیظ صاحب جب ہماری دِل جُوئی کا اس قدر خیال رکھتے ہیں تو بھلا ہم انہیں اپنے دل میں جگہ کیوں نہ دیں؟

یہ حفیظ صاحب کی نیک نیتی اور نیک نفسی ہی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انہیں ہر قسم کا سُکھ دے رکھا ہے۔ شہرت، عزت، دولت، سبھی سے اللہ نے انہیں نوازا ہے۔ ماڈل ٹاؤن میں ان کی ایک چھوڑ دو دو کوٹھیاں ہیں۔ چلن کے آدمی ہیں۔ کوئی عیب ان کے پیچھے نہیں لگا ہے۔ اپنے آپ کو انہوں نے بڑی محنت سے بنایا ہے۔ اس لئے انہیں روپے پیسے کی بھی قدر ہے۔ جُزرس ہیں، بلکہ اُن کی جُزرسی کنجوسی کی حد تک پہونچی ہوئی ہے۔ کنجوس کہلانا مُصرف کہلانے سے بہرحال بہتر ہے۔ انہوں نے اپنی کار کبھی نہیں رکھی۔ حالانکہ وہ اگر چاہیں تو ایک نہیں دو دو کاریں رکھ سکتے ہیں۔ ان کا کوئی شوق یا مشغلہ ایسا نہیں ہے جس میں پیسہ خرچ ہوتا ہو۔ دولت لٹانا اور گھر پھونک تماشہ دیکھنا کوئی ہنر بھی تو نہیں ہے۔ انہوں نے ساری عُمر محنت سے پیسہ کمایا ہے، اس لئے انہیں اس کی قدر بھی ہے۔

آخر میں حفیظ صاحب کی ایک خصوصیت اور سن لیجیے ——

حفیظ صاحب کسی کو تکلیف نہیں دیتے۔ کان ادھر لایئے، چپکے سے اس سلسلے میں ایک بات سنئے: حفیظ صاحب اس قدر محتاط ہیں کہ انہوں نے کبھی کسی کو کھانے پر آنے کی تکلیف بھی آج تک نہیں دی۔

ظہیر الاسلام فاروقی

حفیظ پہلی مرتبہ علیگڑھ میں

میں نے پہلی مرتبہ غالباً سنہ ۱۹۲۲ء میں جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری کی ایک نظم "تاروں بھری رات" ایک رسالہ میں پڑھی۔ اگرچہ میں اس وقت دسویں جماعت کا طالب علم تھا لیکن گھر کا علمی و ادبی ماحول میرے دل و دماغ کی تربیت پر براہ راست اثر انداز تھا۔ ساتھ ہی تحریک خلافت و کانگریس کے انقلاب آفریں نعرے جلسے اور جلوس ہر حساس دل کو دعوت فکر و عمل دے رہے تھے۔ اس پیش منظر میں "تاروں بھری رات" کی شاعرانہ منظر کشی نے مجھے مبہوت و بے خود کر دیا اور ایسا محسوس ہوا کہ حفیظ میرا شاعر ہے۔ میرے جذبات کا ترجمان ہے۔ میں نے جوش فرحت میں یہ نظم داد طلب انداز میں اپنے برادر مکرم مولانا حافظ احمد اسلام رح کو دکھائی۔ موصوف نے نظم پڑھ کر فیاضانہ داد دی اور فرمایا۔ "یہ حفیظ معلوم تو ہوتا ہے کہ کوئی جواں عمر شاعر ہے لیکن ہے قادر الکلام نظم کا ہر بند نہایت چست اور سہل ممتنع کی مثال ہے۔ اس سے پہلے یہ نام کہیں دیکھنے سننے میں نہیں آیا لیکن میرا اندازہ یہ ہے کہ یہ شاعر انفرادیت کا مالک ہے اور دنیائے شعر سخن میں اپنا بلند مقام پیدا کرے گا"۔

اس کے بعد ہر رسالہ میں مجھے حفیظ صاحب کے کلام کی تلاش رہی حتیٰ کہ جالندھر جا کر ان سے شرف ملاقات حاصل کرنے کا اشتیاق بھی رہا کیونکہ ہمارے وطن شاہ آباد ضلع کرنال سے جالندھر تقریباً اسی (۸۰) میل تھا۔ ٹرین شاہ آباد سے سیدھی جالندھر جاتی تھی اور بذریعہ طوفان میل تین گھنٹے سے زیادہ کا سفر نہ تھا ان سہولتوں کے باوجود یہ آرزو پوری نہ ہو سکی اور بعد میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے جب میں لاہور اسلامیہ کالج میں آکر داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ حضرت حفیظ درحقیقت محض حادثہ پیدائش کی وجہ سے "جالندھری" ہیں ورنہ ان کی موجودہ رہائش اور حصول معاش کا دائرہ تنگ و تاریک لاہور کی ادب آفریں حدود میں محصور ہے۔

مجھے لاہور آئے ہوئے ابھی چار پانچ روز ہی گذرے تھے کہ ایک دن لاہور کے در و دیوار پر قد آدم پوسٹر چسپاں نظر آئے۔ عنوان تھا "عظیم الشان مشاعرہ"۔ تقریباً پچاس سے زائد شعراء کے نام پوسٹروں میں درج تھے۔ یہ مشاعرہ بروز اتوار ۶ بجے شام برکت علی محمڈن ہال میں ہو رہا تھا۔ داخلہ بذریعہ ٹکٹ قیمتی موازی چار آنے تھا۔ میں بمع ایک بزرگ دوست ڈاکٹر سید ریاض الحسن صاحب وقت مقررہ سے بہت پہلے مشاعرہ گاہ میں پہونچ گیا ٹکٹ ایک روز پہلے ہی خرید لئے تھے۔ تمام ہال سامعین سے اس قدر بھرپور ہو چکا تھا کہ کرسیوں کا تو ذکر ہی کیا کسی گوشہ میں کھڑے ہونے کی بھی گنجائش نہ رہی تھی۔ ٹکٹوں کی خرید و فروخت بند کر دی گئی تھی اور شائقین کا جم غفیر ہال کے باہر شور برپا کر رہا تھا کہ مشاعرہ باہر کھلی ہوئی ہوا میں کیا جائے جہاں سب لوگ بہ آسانی لطف اندوز ہو سکیں۔ ابھی مشاعرہ کا آغاز ہی ہوا تھا کہ باہر والے مجمع نے ہال پر حملہ بول دیا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشے توڑ ڈالے اور اندر گھس آئے۔ ایک شور برپا ہو گیا۔ ہال کے اندر والوں کی یہ کوشش کہ جان بچا کر کسی طرح باہر نکلیں اور باہر والوں کی یہ جد و جہد کہ وہ اندر داخل

ہو جائیں۔ ہم بصد مشکل ایک کھڑکی سے پھلانگ لگا کر باہر نکلنے میں کامیاب ہو سکے۔ آخر تنگ آکر صدر مشاعرہ علامہ عبداللہ یوسف علی مرحوم پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور نے اعلان کیا کہ مشاعرہ ہال کے سامنے لان پر ہوگا۔ چنانچہ یہ تبدیلی پروگرام جلد عمل میں آگئی۔ شعرا کے لئے کرسیاں لگا دی گئیں۔ ایک میز پر گیس رکھ دیا گیا اور کئی ہزار سامعین بہ طیب خاطر سبز گھاس پر بیٹھ گئے اور مشاعرہ باقاعدگی کے ساتھ شروع ہو گیا۔

دو تین گھنٹے تک معزز شعرا اپنے اپنے کلام سے نوازتے رہے اور خوب داد سخن پاتے رہے۔ میں بے تابی کے ساتھ حضرت حفیظ کا کلام سننے کے لئے چشم براہ تھا۔ مشاعرہ کے آخری حصے میں حفیظ صاحب کا نام پکارا گیا اور حاضرین نے تالیوں سے ان کا خیر مقدم کیا۔ موصوف نے اپنے مخصوص اور خود ساختہ دلچسپ آفریں ترنم کے ساتھ ایک نظم بعنوان "برسات" شروع کی:-

آئی ہے برسات
چھائی ہے برسات

کوہ و دمن پر　　دشت و چمن پر
شہر اور بن پر

دوشیزہ جوبن　　بے ساختہ پن
رنگین جوانی　　سبز اور دھانی
گل پوش جلوے　　مدہوش نغمے!
دلکش فضائیں
ٹھنڈی ہوائیں!

اودی گھٹائیں　　لائی ہے برسات
آئی ہے برسات　　چھائی ہے برسات

یہ ترنم ایک جادو تھا۔ حاضرین وجدانی کیفیت میں جھوم رہے تھے۔ داد کے پر شور نعروں نے تمام فضا کو معمور کر دیا تھا۔ حفیظ صاحب نے اس نظم کے دوسرے بند کا آغاز ہی کیا تھا:

گھر گھر کے آیا　　ہر سو پھر کے چھایا
تند اور دھواں دھار　　تاریک و بسیار
ابر گہر بار

کہ یکایک بساط آسمان پر بادل پھیلتے ہوئے نظر آئے۔ ساتھ ہی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنا شروع ہوئے اور پھر ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی جس نے طبیعتوں میں فرحت و تازگی کی لہر دوڑا دی۔ رنگ مشاعرہ دوبالا ہو گیا۔ اور حضرت حفیظ ایک نشہ آور کیف کے ساتھ سناتے رہے

ابر گہر بار

بجلی چمکنا　　آنکھیں جھپکنا
توبہ یہ کڑکا　　سینوں کا دھڑکا
بوندوں کی جھڑیاں　　مینہ موسلا دھار
ہر سمت یکدم　　جل تھل کا عالم

پرکیف موسم

حق نے دکھایا!

ان بوندوں کے بروقت تقاطر نے حضرت حفیظ کی پرسوز آواز میں زندگی کی ایسی لہر دوڑا دی جس نے تمام سامعین کے قلوب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ پرکیف موسم، یہ نشہ آور مشاعرہ، رسم تکلف سے بے نیاز، چھوٹے بڑے سب کے سب فرش سبزہ پر جلوہ آرا۔ یہ تمام سحر انگیز سماں میرے ذہن و دماغ پر آج قریباً اڑتیس سال گذر جانے کے بعد بھی اسی طرح مرتسم ہے جیسے یہ آج ہی کی بات ہے۔

اس کے ایک سال بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخل ہوگیا اور داخل ہوتے ہی بزم حدیقۃ الادب کی مجلس منتظمہ کا رکن بھی منتخب ہوگیا۔ حضرت احسن مارہروی مرحوم بزم کے صدر تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے آل انڈیا مشاعرے اکثر اسی بزم کے زیر اہتمام منعقد ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ حسب دستور سابق اس مرتبہ بھی آل انڈیا مشاعرے کا پروگرام مرتب ہوگیا اور ممتاز شعرا کے نام سکریٹری بزم نے دعوت نامے جاری کردیے۔ مشاعرے کے انعقاد سے چار پانچ روز پہلے مجھے پتہ چلا کہ پنجاب سے کسی شاعر کو نہیں بلایا گیا۔ میں نے حضرت احسن مارہروی صاحب کے پاس گیا اور ان سے عرض کی کہ یہ آل انڈیا مشاعرہ ہے اس میں پنجاب کے کسی شاعر کو مدعو نہیں کیا گیا حالانکہ لاہور میں بہت اچھے شعرا موجود ہیں۔ موصوف نے فرمایا کہ پنجاب میں سوائے علامہ اقبال کے کون شاعر ہے اور ان کو اکثر دعوت دی جاتی رہی ہے۔ وہ مشاعروں میں شرکت نہیں فرماتے۔ میں نے جواباً کہا کہ علامہ موصوف کے علاوہ وہاں اور بھی شعرا ہیں اور آج کل ابوالاثر حفیظ جالندھری لاہور میں مقبول عوام و خواص شاعر ہیں۔ ان کا انداز شاعری تمام شعرا سے بالکل جداگانہ ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی بحروں میں مناظر قدرت کی ایسی عکاسی کرتے ہیں کہ سننے والے پر نشہ طاری ہوجاتا ہے۔ غرض بہت مختصر سی بحث و تمحیص کے بعد جناب احسن نے مجھے ہدایت کی کہ میں اپنی طرف سے ان کو دعوت دے دوں۔ اگر انہوں نے مشاعرے میں شریک ہونا قبول کرلیا تو وہ بزم کے مہمان ہوں گے۔

چنانچہ میں نے اسی روز حفیظ صاحب کو ٹیلی گرام بھیجا اور ساتھ ہی تفصیلی خط بھی لکھ دیا اور تاکید کی کہ وہ ہر حالت میں شریک مشاعرہ ہوں لیکن خط میں مجھے مجوزہ مصرع طرح اور نظم کا عنوان لکھنا یاد نہ رہا۔ ان دنوں علی گڑھ کے مشاعرے میں صرف وہی شعرا اپنا کلام سنا سکتے تھے... جو مصرع طرح پر غزل لکھ کر لائے ہوں یا مجوزہ عنوان پر نظم کہی ہو۔ اس کے برعکس لاہور کے مشاعرے ان رسومات سے آزاد ہوچکے تھے یہاں اکثر ہر مشاعرے میں شاعر اپنا بہترین تازہ کلام سناتا تھا۔ بہر حال مشاعرے سے ایک روز پہلے حفیظ صاحب کی آمد کا ٹیلی گرام پہنچ گیا اور ہم مقررہ ٹرین پر ان کے خیر مقدم کے لئے اسٹیشن پر پہنچ گئے جہاں پیشتر سے بہت سے طلبا اپنی اپنی پسند کے شعرا کے استقبال کے لئے پلیٹ فارم پر کھڑے ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں بہت سے حضرات کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار بھی تھے۔ ہم نے ایک لمحہ کے لئے بھی اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا۔ اب اتنا وقت نہ تھا کہ ہم بھی ہاروں کا بندوبست کرسکیں۔ گاڑی کے آنے میں صرف چند منٹ باقی تھے۔ آخر ہم نے انہی میں سے چند احباب کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ حفیظ صاحب کے لئے چند ہار ہمیں دیدیں کیونکہ ہمیں اندیشہ تھا کہ اگر دیگر شعرا کو ہار پہنائے گئے اور حفیظ صاحب اس عزت افزائی سے محروم رہے تو وہ ناراض ہوکر کہیں اسٹیشن ہی سے واپسی کا پروگرام نہ بنالیں۔ آخر وہ شاعر ہیں اور شاعر کے معنی ہیں "دل حساس" "نازک مزاج"۔ شعرا اکثر منتظمین مشاعرہ کی معمولی غفلت و کوتاہی کو بھی اپنی ذاتی توہین تصور کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہماری یہ درخواست علیگ بھائیوں نے فراخ حوصلگی کے ساتھ قبول کرلی۔ چند منٹ میں ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچ گئی اور حسب توقع حفیظ صاحب کی گاڑی عین ہمارے سامنے آکر رکی۔ وہ شیروانی میں ملبوس اور ترکش کیپ زیب سر کئے اپنی گاڑی کے دروازے میں کھڑے ہوئے تھے۔ ہم دیوانہ وار ان کی طرف بڑھے۔ تمام صاحبان نے سب کے سب ہار حفیظ صاحب کے گلے میں ڈال دئے۔ حفیظ صاحب کے گرد طلبا اور شائقین کا ہجوم ہوگیا اور باہمی ابتدائی تعارفی گفتگو میں کچھ ایسے محو ہوگئے کہ دیگر شعرا... کے

استقبال کا دھیان تک نہ رہا اور نہایت شان و شوکت کے ساتھ موٹر میں سوار کر کے یونی ورسٹی میں لائے۔ اگرچہ ان کے قیام و طعام کا بندوبست بزم کی طرف سے تھا لیکن انہوں نے میرے کمرے میں قیام کرنا پسند کیا۔

اسی رات کو میرس ہوسٹل کے ہال میں مشاعرہ ہونا تھا۔ صدر مشاعرہ مسٹر اے۔ ایم قریشی پرنسپل انٹرمیڈیٹ کالج تھے۔ ہندوستان کے تقریباً تمام جلیل القدر شعرا آئے ہوئے تھے جن میں سے حسرت موہانی، حضرت فانی بدایونی، حضرت سیماب اکبرآبادی اور ساغر نظامی کے اسمائے گرامی بالخصوص قابل ذکر ہیں —

وقت مقررہ پر قریباً نو بجے شب مشاعرہ شروع ہوا۔ حسب توفیق ہر شاعر کو فیاضانہ داد ملتی رہی۔ جب دو تین گھنٹے تک ایک ہی ردیف قافیہ میں غزل سرائی ہوتی رہی تو اس اثنا میں رنگ مشاعرہ پر عروج و زوال کے کئی مرحلے آئے اور بعض اوقات یوں محسوس ہونے لگا جیسے مختلف شعرا ایک ہی غزل کو اپنے اپنے انداز میں دہرا رہے ہیں۔ اسی اثنا میں جب محفل مشاعرہ دور زوال سے ہم کنار تھی اور تمام فضا پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اچانک ایک ادھیڑ عمر شاعر المتخلص بہ ذرہ اسٹیج پر جلوہ آرا ہوئے۔ ان کا نقشہ آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ ورزشی جسم، ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا۔ ریش مبارک کے بال سفید کم اور سیاہ زیادہ، اس صوفے کو نظرانداز کر کے جس پر بیٹھ کر شعرا اپنا کلام سنا رہے تھے۔ اسٹیج کے عین درمیانی حصے میں آکر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور ڈنڈے کو اپنے آگے رکھ کر داڑھی اور مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ ان کے اس انداز اور ہیئت کذائی نے اداس محفل میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ تالیوں اور قہقہوں کے شور نے ساکن فضا میں تموج پیدا کیا اور پھر یکایک دیکھا کہ جناب ذرہ غزل کا مطلع فرماتے ہی اسٹیج پر مجروح کبوتر کی طرح لیٹے ہوئے تڑپ رہے ہیں۔ پھر کیا تھا۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ حاضرین خصوصاً طلبا کو ذرہ صاحب سے بھی زیادہ تڑپنے اور پھڑپھڑانے کا عارضہ ہو گیا۔ تالیوں سیٹیوں اور چیخوں کا ایسا سیلاب امڈا گویا کوئی شادی مرگ ہو گئی ہے۔ ادھر ذرہ صاحب بزعم خویش خراج تحسین وصول کر کے مکرر سہ مکرر مطلع پڑھتے جا رہے ہیں اور نئے نئے ڈھب سے قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ حاضرین میں سے کوئی متین سے متین فرد بھی ہنسی پر قابو پانے سے مجبور و معذور تھا۔ غرض ذرہ صاحب کی غزل کے اختتام تک جمناسٹک کا یہ عجیب و غریب مظاہرہ مسلسل جاری رہا۔ اور طلبا نے بھی ان کو داد دینے میں قطعاً بخل سے کام نہ لیا۔

ذرہ صاحب کے بعد فضائے بزم کو سطح متانت پر لانا آسان کام نہ تھا تاہم گرامی قدر شعرا کے موثر کلام نے بمشکل پھر سنجیدگی اور ادب نوازی کی طرف مائل کیا۔ رات کے دو بج گئے تھے اور صرف تین چار شعرا باقی رہ گئے تھے کہ یکایک حاضرین نے بیک آواز شور برپا کیا "حفیظ صاحب اپنا کلام سنائیں" سکریٹری بزم نے حاضرین کو مطلع کیا کہ حفیظ صاحب کے پاس چونکہ مصرع طرح پر غزل نہیں ہے اس لئے مشاعرے کی روایات کے مطابق وہ آج آپ کو اپنے کلام سے محظوظ نہیں کر سکیں گے۔ سامعین نے احتجاجاً زور دیا "مشاعرہ ختم کر دیجئے تاکہ ہم آج ہی بلکہ ابھی حفیظ صاحب کو سن سکیں" عین اسی وقت حفیظ صاحب نے کھڑے ہو کر اعلان کیا "مجوزہ عنوان پر میرے پاس نظم ہے چونکہ مصرع طرح میرے پاس بھیجا ہی نہیں گیا اس لئے طرحی غزل نہیں کہی جا سکی" یہ سن کر سکریٹری بزم نے حفیظ صاحب سے معذرت چاہی اور ان سے درخواست کی کہ وہ نظم بہ عنوان.... "شاعر کا نصب العین" سنائیں۔

جناب حفیظ مشاعرے کے اس آخری مرحلے پر سامعین کے سامنے آئے جب رنگ مشاعرہ درحقیقت بے رنگ ہو چکا تھا۔ پانچ چھ گھنٹے کی مسلسل نشست سے حاضرین پر تھکن اور نیند ہر دو کا غلبہ ہو چکا تھا۔ حضرت حفیظ جن کی انقلاب انگیز شاعری اپنی طفولیت کے دور سے گذر کر عنفوان شباب کی حدود میں گامزن تھی، آج پہلی مرتبہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی اس اسٹیج پر جلوہ افروز تھے جس کے در و دیوار سرسید و حالی کی ایمان افروز تحریروں کے نغمہ سرا ہیں۔ یہ غیر منقسم ہند کے کل مسلمانوں کا واحد مرکز علم و ثقافت تھا۔ یہاں داد سخن بھی حاصل کرنا صرف انہی خوش بختوں کا حصہ تھا جنہیں شان ایزدی نے اپنے خوان نعما سے بہرہ یاب کیا ہو۔

حضرت حفیظ نے اپنی نظم کا اس طرح تعارف کرایا: "میری نظم کا عنوان دراصل "فرشتے کا گیت" ہے۔ میں شاعر ہوں۔ یہ نظم میرا نصب العین ہے لہٰذا آج یہ نظم بہ عنوان "شاعر کا نصب العین" آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں"۔ اس تمہید کے بعد حفیظ صاحب نے اپنے تمام جذبات واحساسات کو قلب و نظر میں مرکوز کر کے اپنے مخصوص وجد آفریں ترنم کے ساتھ نظم کا آغاز کیا:

دیکھ اس دنیا کا نظارا

میرے ساز کے تاروں میں　　رنگیں نغمہ زاروں میں

نیندوں کے دریاؤں میں ہے اک خیالی دنیا　　اس دنیا کو دنیا کہہ دیتی ہے جیالی دنیا

دیکھ اس دنیا کا نظارا　　ہلکا ہلکا پیارا پیارا

میرے ساز کے تاروں میں　　رنگیں نغمہ زاروں میں

ہستی کیا ہے؟ میٹھا سپنا

سپنا کیا ہے؟ میٹھی پریت　　میٹھی پریت ہے میرا گیت

میرے میٹھے گیتوں میں مستی ہے ساری ہستی۔　　ساری ہستی گیت میں میرے نیند ہے میری مستی

ہستی کیا ہے؟ میٹھا سپنا

دل میں رہنا آنکھ سے چھپنا

سپنا کیا ہے؟ میٹھی پریت　　میٹھی پریت ہے میرا گیت

جناب حفیظ وجدانی کیفیت کے ساتھ یہ نظم سنا رہے تھے اور بلا مبالغہ سامعین پر ایک سحر طاری تھا ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آسمان سے نور کی بارش ہو رہی ہے جو مضطرب دلوں کو کیف آور سکون مہیا کر رہی ہے۔ پہلے بند پر سامعین مبہوت ہو کر گوش بر آواز تھے۔ یہ بالکل نئی آواز تھی۔ نئی طرز تھی۔ نیا خیال تھا۔

یہ پرانی شاعری کے پامال راستے سے ہٹ کر ایک نئی راہ تھی۔ درحقیقت یہ شاعر کے قلب کی عمیق گہرائیوں سے نکل کر زندگی کا پیغام دے رہی تھی۔ آج مردہ دلوں سے خود زندگی ہم کلام تھی۔ حفیظ بحیثیت شاعر نہیں بلکہ ایک ساحر کی طرح سامعین پر چھائے ہوئے تھے۔ حاضرین پر ان کا سحر اثر انداز ہو چکا تھا۔ اب حفیظ ان کا شاعر تھا اور وہ مسحور حفیظ۔ حفیظ صاحب کے بعد غالباً دو تین شعرا کو اپنا کلام سنانا تھا۔ بعد ازاں اس دلچسپ محفل کا اختتام تھا لیکن اب سامعین سوائے حفیظ کے کسی اور کو سننے کے متحمل نہ تھے۔ ہال میں سقف شگاف نعروں کا شور برپا ہو گیا۔ حفیظ صاحب اور سنائیں۔ ہم صرف حفیظ کو سنیں گے اور صبح تک سناتے رہیں۔ اس شور انگیز مطالبے پر صدر مشاعرہ نے حکمت عملی کے ساتھ اس وعدے پر قابو پایا کہ مہمان شعرا کی یہ توہین ہوگی کہ ان کا کلام نہ سنا جائے اور اس طرح علی گڑھ کی روایات کی بھی سخت توہین ہے۔ میں خود حفیظ صاحب کے کلام سے مزید محظوظ ہونا چاہتا ہوں لیکن اس وقت نہیں اور میں اعلان کرتا ہوں کہ کل صبح سٹریچی ہال میں صرف حفیظ صاحب کے اعزاز میں ایک نشست ہوگی جس میں دل بھر کر حفیظ صاحب کا کلام سنا جائے گا۔ اس کے بعد دو چار شعرا کا کلام با دل نخواستہ سننے کے بعد مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔

دوسرے روز اسٹریچی ہال میں بہ اعزاز حفیظ صاحب ایک نشست سخن منعقد ہوئی جس میں گزشتہ شب کے مشاعرے سے بہت زیادہ سامعین شامل ہوئے۔ حفیظ صاحب نے دو تین گھنٹے تک متواتر اپنا مختلف کلام سنایا اور سامعین کو مسلسل مبہوت و مسحور کئے رکھا۔ اس

کے بعد حفیظ صاحب علی گڑھ میں قریباً تین ہفتے مہمان رہے ۔ اساتذہ اور طلبا روزانہ انہیں مدعو کرتے رہے اور ان کے کلام سے لطف اندوز ہوتے رہے ۔

سنہ ۱۹۲۷ء کا یہ آل انڈیا مشاعرہ علی گڑھ میرے نزدیک حفیظ صاحب کی بحیثیت شاعر فتح اول تھی ۔ اس کے بعد ان کے ہم عصروں میں رقابت و حسد کی تخم ریزی کا بھی یہیں سے آغاز ہوتا ہے ۔ یہ دور جناب حفیظ کی شاعری کے آغاز شباب کا تھا اور علی گڑھ کے سخن فہم حلقے نے اس آغاز کی عظمت و ندرت کو بھانپ لیا تھا کہ یہ جواں سال شاعر اردو ادب کا انقلابی شاعر ہے اور آج یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ حضرت حفیظ مناظر قدرت کی تصویر کشی اور چھوٹی چھوٹی مترنم بحروں کے مخترع ہیں اور ان کا یہ مقام کسی دیگر شاعر کے لئے ناقابل تسخیر ہے ۔ وہ شاہنامہ اسلام کے مصنف ہیں اور ترانۂ پاکستان کے موجد ۔ ان کی طرز نو ، کے تتبع کی جھلک آج اکثر مبتدی اور کہنہ مشق شعرا کے کلام میں نظر آرہی ہے ۔ اس مختصر تحریر میں ان کی مختلف النوع اصناف شاعری پر روشنی ڈالنا میرا مقصود نہیں ہے ۔ مجھے آج کی فرصت میں صرف یہ دکھانا مقصود تھا ۔ کہ یگانہ روزگار شخصیتیں کس طرح اپنی ہستی کو خود تسلیم کراتی ہیں ۔ کھوٹا سکہ پروپیگنڈا کے زور پر رواج عام کا درجہ حاصل نہیں کرسکتا اور جھوٹے پروپیگنڈے سے ماہیت زر میں کوئی خفت پیدا نہیں ہوسکتی ۔ حاسد ہزار ناک بھوں چڑھاتے رہیں وہ جناب حفیظ کو اس نعمت سے محروم نہیں کرسکتے جو مشیت ایزدی نے ان کو ودیعت کی ہے ۔ ان ناک بھوں چڑھانے والوں پر خود جناب حفیظ کو غصے کے بجائے ہنسی آجاتی ہے ۔ اسی سلسلے میں انہوں نے فرمایا ہے

عرض ہنر بھی وجہ شکایات ہوگئی
چھوٹا سا منہ تھا ۔ مجھ سے بڑی بات ہوگئی
دشنام کا جواب نہ سوجھا بجز سلام
یہ مجھ سے ایک اور بری بات ہوگئی

ایک اور جگہ اپنی شاعری پر کامل اعتماد اور اس کے قبول عام کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں

حفیظ اہل سخن کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں ۔

"۔۔۔ موجودہ اردو ادب ہرگز جمود کا شکار نہیں ۔ بلکہ اس میں زیادہ حرکت ہے کہ اس پر جمود کا دھوکا ہوتا ہے ۔ جمود کی شکایت کاغذ کے پھول بنانے والے ان چند بندوں کو ہے ، جو تحسین باہمی یا تضحیک باہمی کو ادب کی امواج سمجھتے ہیں ۔۔۔"

(حفیظ)

عزیز ملک

حفیظ میری نظر میں

بارہا تعجب اور تحسین کے ملے جلے جذبات میرے دل میں پیدا ہوئے کہ کس طرح یہ سوکھا ساکھا نحیف و نزار انسان اپنے سحر کلام کی بدولت ہزارہا نفوس کے دل و دماغ پر چھا جانے کی قدرت رکھتا ہے اور ہاں اس کا آرٹ ہر لحاظ سے مکمل بھی ہے اور لطیف نغمہ بھی! نظم میں تو خیر وہ خود ایک نئے دور کا بانی ہے لیکن نثر بھی تو ایک خاصی شگفتہ سکھ لیتا ہے اور تقریریں —— وہ اس کی نظموں کا مقدمہ الجیش ہوتی ہیں کبھی چٹکلوں اور لطیفوں کی کشت زعفران۔ کبھی ملی جوش سے معمور کر دینے والا نشۂ ایمان۔

پھر یہ خیال بھی بارہا میرے ذہن میں گزرا کہ اقبال کے دیس میں خود اقبال کے دور میں ہی یہ اُمّی شاعر جو ساتویں کلاس سے بھاگ نکلا تھا کیوں کر ادبی افق پر آج سے تیس برس پہلے صبح کا ستارہ بن کر نمودار ہوا اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے ہونہار باغبان کی طرح خوش رنگ اور دلآویز پھولوں کی کیاریوں سے گلشن شعر کو سجا دیا اور کمال فن کے ساتھ شاعری کو مصوری اور موسیقی میں سمو کر ایک انوکھے امتزاج کا رنگ بخشا اور طلسم ہوشربا کی طرح سامعین کے ذہن و ضمیر —— پر مسلط کر دیا اور یہ بھی ایک ایسے نازک زمانے میں جب کہ پیام اقبال کی گہرائی اور گیرائی نے اہل سخن کے تمام حلقوں میں زلزلہ بپا کر دیا تھا اور اس پیام کی شاعرانہ زمین سے نغمہ و آہنگ کے وہ سوتے پھوٹ نکلے جس نے بہت سے سخن وروں کو ترک سخن پر مائل کر دیا تھا غلام بھیک نیرنگ خوشی محمد ناظر اور احمد حسین بی۔ اے۔ اسی بساط وقت کے بیٹے ہوئے مہرے تھے اور بھی بہت سے نام ہیں جن کا تذکرہ خواہ مخواہ لے دے کا باعث بنے گا۔ لیکن ان تمام حالات کے باوجود حفیظ نے اپنا الگ راستہ نکال لیا اور ایک مرتبہ و مقام پیدا کر کے جھنڈے گاڑ دیے اور ایسے جھنڈے کہ اس کے پیچھے قدم بڑھانے والوں نے صریحاً حفیظ کے تجربات سے استفادہ کیا۔ مجھے یہاں اس بات سے بحث مقصود نہیں کہ حفیظ کے درد کے ٹیسیں ہمارے کتنے ہی نوجوان شعرا کے قلب و جگر سے اٹھتی نظر آتی ہیں اور کتنے ہیں جنہوں نے اس چراغ سے اپنی مشعلیں روشن کی ہیں۔

حفیظ بیک وقت ایک رنگین نوا شاعر ہے اور مسلمانوں کے شاندار ماضی اور درخشندہ روایات کا خطیب بھی۔ اس نے گیت بھی لکھے ہیں اور غزلیں بھی کہی ہیں۔ ایسے ایسے گیت جن سے سوز عشق جگانے کا کام لیا جا رہا ہے اور ایسی غزلیں جن میں " یہ ہماری زبان ہے پیارے [illegible] " بھی۔ اس نے منظریہ نظمیں بھی کہی ہیں اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے نام درود اور سلام بھی —— ان میں سے کوئی ایک صنف نہ تو مٹ سکتی ہے اور نہ ہی ان غیر فانی تخلیقات کا مصنف حسد و بغض کے مہمل سیلاب میں بہایا جا سکتا ہے

لوگ کہتے ہیں کہ حفیظ کا ابوالاثر ہونا اس کی آواز کا نغمہ ہے۔ ہم بپاس خاطر اس مفروضے کو صحیح تصور کر لیتے ہیں تاکہ بعض آشفتہ حال شاہدان نازک خیال اور بزعم خود اہل رائے کا دل نہ ٹوٹ جائے لیکن شاید آپ کو بھی یاد ہو جب لاہور کے ایک مشاعرہ باز شاعر نے حفیظ کو نیچا دکھانے کے لئے اپنے شاگرد

کی آواز کو ساز تک پر لہرا کر تماشا دیکھ لیا تھا کہ سامعین نے ان کی اور ان کے سازوں کی گیا درگت کر کے رکھ دی تھی۔

ہاں اس وقت ہمارے سامنے مرد حفیظ ہے جسے ہم بارہا اسٹیج پر دیکھ چکے ہیں وہ جس کی بھرپور قوت گویائی نے سب کی شہنائیاں گنگ کر دی ہیں اور جس نے شعر و سخن کی بیشتر محفلیں الٹ کر رکھ دی ہیں۔ وہ محفلیں جہاں سامعین کے ہجوم اس کے جنبش لب کے منتظر رہا کئے ہیں لیکن ہمارے سامنے وہ حفیظ بھی ہے جس کا کلام کاغذ پر ہے اور اہل قلب و نظر سر دھن رہے ہیں۔

وہ محض گیتوں کا خالق اور اسلام کا بانسری بجیا ہی نہیں بلکہ اس نے سیاسات میں بھی حصہ لیا ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد کانگریس اور خلافت کے ان میلی اور بے جوڑ ملاپ سے جو سیاسی کانفرنسیں ہوئیں ان میں سب سے پہلی کانفرنس میں ڈاکٹر کچلو نے حفیظ کو پکارا اور حفیظ نے ایک باغیانہ نظم پڑھی۔ پھر شہرہ آفاق رقاصہ لکھنے اور ایک دربار رئیسانہ نیں سنا ڈالنے کے جرمانہ میں قید و بند کی صعوبت کے بعد دوسری مرتبہ جیل کی ہوا کھائی لیکن جلد ہی سستا چھوٹ گیا۔ تحریک خلافت میں بھی اس نے نمایاں حصہ لیا۔ زمیندار کی پرانی فائیلوں میں وہ تاریخی نظمیں آج بھی مدفون ہوں گی۔

اس حوالہ سے میں اس کی بے پناہ جرأت اور بے باکی کے متعلق کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کیونکہ بے شمار اہل اقتدار کو اس نے ایک سے زیادہ موقعوں پر تازیانے مار مار کر ہوش میں لانے کی کوشش کی ہے۔ غالباً پہلی مرتبہ قریب آزادی والی نظم سر سکندر آنجہانی کی صدارت اور ان کے سیاسی حامیوں کی موجودگی میں سنا کر اس نے اپنی قلندرانہ اور نڈر طبیعت کا لوہا منوا لیا تھا۔ تقسیم کے بعد ممدوٹ منسٹری کے تابوت میں آخری میخ بھی حفیظ کی جرأت اظہار نے لگائی تھی۔ اس نظم میں ایم ایل اے کا قافیہ "پیشہ ور" "دلے" تجویز کیا گیا تھا۔

اسلامی انجمنوں، اداروں اور یتیم خانوں کو مدتوں حفیظ نے اپنے خون سے سینچا ہے، ان انجمنوں کے سالانہ جلسوں میں، چندوں اور عطیوں کے فتوحات حفیظ کی سحر بیانی کے مرہون منت ہوتے رہے۔ یہ ادارے شاید آج بھی قائم ہیں اور ان کے منتظمین کے وہ مکانات بھی سلامت ہوں گے جن پر جلی حروف میں "ھٰذا مِن فضلِ ربّی" لکھا پایا جاتا ہے۔

حفیظ کی شخصیت کا روشن پہلو ادبی مشاعرے، مذہبی اور ادبی ہنگامے رہے ہیں۔ انہیں اکھاڑوں میں اس نے بہت سے نامی اور نامور پہلوانوں کو بارہا پچھاڑا ہے۔ یہیں شاہنامہ اسلام کو لوگوں نے سنا اور اس کے مصنف پر والہانہ عقیدت کے ڈونگرے برسائے ہیں لیکن یہی گرم بازاری اس کے لئے مصائب کا پیش خیمہ بھی رہی ہے۔ یہیں سے وہ لوگ بھی جنم لیتے رہے ہیں جنہیں اپنے آرٹ کی ناکامی نے بلا وجہ حفیظ سے دشمنی مول لینے پر آمادہ کیا ہے۔ اس فضا سے وہ مسخرے بھی پیدا ہوتے رہے ہیں جو بزعم خویش ادیب بنتے ہیں اور مدعی قسم کے شاعر ہیں اور آج کل محفلوں میں حفیظ کا منہ چڑانے کے لئے بھانڈپن کرنے پر اتر آئے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کی اسی افتاد میں حفیظ کی ذات اور اس کے آرٹ کی عظمت کا صحیح اعتراف جلوہ گر نظر آتا ہے آخر حفیظ بھی تو اپنے ماحول اور جیتی جاگتی سوسائٹی کا ایک فرد ہے اس کے دوست ہیں اور دشمن بھی — لیکن حفیظ کو اپنے اصلی مقام پر دیکھنے اور سمجھنے کے لئے دوستوں کو نہیں بلکہ دشمنوں کے سینوں میں پلتے ہوئے کینوں کو کریدنے کی ضرورت ہے۔ حفیظ میں انسان ہونے... کی حیثیت سے بہت سی کمزوریاں ہیں اور ضرور ہونی چاہئیں۔ معصومیت کا داعیہ دار کون ہے۔ حفیظ کو فرشتہ ثابت کرنا میرا مقصود نہیں اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔ حفیظ انسان ہے اور انسان ہونا ہی اس کا شرف ہے

اس کے دشمنوں کے دو گروہ ہیں ایک تو طبقہ حاسدین ہے جو فطرتاً مجبور اور کسی حد تک قابل معافی ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جنہوں نے حفیظ سے دشمنی کا کوئی نہ کوئی فرضی عنوان پیدا کر لیا ہے اور قلعہ بند ہو کر تیر آزمائی میں مصروف ہیں لیکن حفیظ ان سب پر ایک کامیاب طنز کافی سمجھتا ہے ؎

نہیں عتابِ زمانہ خطاب کے قابل

ترا جواب یہی ہے کہ مسکرائے جا

اور اس کی مسکراہٹ نے ہر گام پر علمی ثبوت پیش کیا ہے اب اس عالی ظرفی کا اس کے ان بدترین دشمنوں کو بھی اعتراف ہوتا جا رہا ہے جو کبھی اسکے دستر خوان

ے بس خوردگان میں شامل تھے - اور اب نیرنگیٔ زمانہ کی بدولت بہت کچھ نگار بن گئے ہیں۔

بہت دنوں کی بات ہے - ایک شام میں حفیظ کے ساتھ سیر میں شریک تھا۔ اس دن موٹر کار بنوانے کے سلسلہ میں ایکمہاد شخص سے جھگڑا ہوا تھا اس نے معاملہ میں صریح بددیانتی کے علاوہ گستاخانہ الفاظ بھی کہے تھے میں اس شخص کی بدطینتی سے پہلے بھی واقف تھا۔ دوران گفتگو میں نے اس کو نقصان پہونچانے کی ایک ترکیب کا ذکر کیا حفیظ چلتے چلتے ٹھہر گیا اور حیرت سے میری طرف دیکھ کر کہا "عزیز بھلائی کرنا سیکھو، کینہ وری شیوۂ مردانگی نہیں" حفیظ دوستوں کے لئے سراپا نیاز اور ہمہ تن خلوص ہے ـــــ لیکن اس کا یہ خلوص اور نیاز بہت سے دوستوں کے تازگی عمر دراز کر دیتا ہے۔ اگرچہ اب اس کے دوستوں کا حلقۂ خلوص بہت مختصر ہوتا جا رہا ہے تاہم وہ ان سب کے لئے ہر ممکن ایثار سے کام لیتا ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ کوئی سرمایہ دار ہے جو دوستوں میں اشرفیاں بانٹتا پھرتا ہے بلکہ یہ کہ دوستوں کے لئے کلمۂ خیر کہتا اور ان کو نیک مشورہ دیتا ہی نہیں بلکہ ان کے لئے بھاگ دوڑ کرنا اور اپنی جیب و داماں سے کام لینا بھی ہے۔

دسمبر سنہ ۱۹۴۶ کا واقعہ ہے میں ایک دن دوپہر کے وقت حفیظ کے ہاں گیا۔ دستک دینے پر معلوم ہوا کہ طبیعت علیل ہے۔ میں پلٹ آنے کو تھا کہ گھر کے ایک فرد نے بتایا تمہارے لئے ان کا حکم یہ ہے کہ وہ کسی حالت میں ہوں تم آؤ تو ان سے ملے بغیر نہ جاؤ میں ان کے کمرے میں پہنچا۔ وہ بعارضہ بخار علیل تھے کمرے میں خلاف معمول گہری اداسی چھا رہی تھی چند سے سکوت رہا۔ میں نے کہا وہ جو آب حیات میں مولوی آزاد نے "انشا" کے متعلق لکھا ہے آج اس تنہائی اور اداس فضا میں حفیظ پر بھی صادق آ رہا ہے کہا "ہاں، سب دن ایک سے نہیں ہوتے اور بقول غالب ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اور یہ سن کر دفعتہً میرے تصور میں یہ نقشہ پھر گیا کہ یہ شاعر اسلام مصنف ترانۂ پاکستان جس کے دم سے شعر و سخن کی ہر محفل چراغاں ہے ایک شمع جس کی روشنی چاروں طرف پھیلتی ہے مگر کسے معلوم شمع خود کس غم میں ہر لحظہ گھل رہی ہوتی ہے۔

"جب تک یہ طلسم ہستی قائم ہے انسانی دنیا کی کوئی چیز ضائع نہیں ہو سکتی۔ ایک کتاب، ایک فقرہ، ایک لفظ، کبھی فراموش یا گم نہیں ہوتا۔ ہم غلطی کا ارتکاب فرما کر بھول جاتے ہیں اور کچھ دیر بعد سمجھ لیتے ہیں کہ بات آئی گئی ہو گئی ـــــ لیکن غلطی کی پاداش ہمارے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ جب ہم اخلاق کی زنجیروں کو توڑتے ہیں تو اس شکست کی آواز دنیا میں گونجتی ہے ـــــ باتیں، اعمال بلکہ خیالات کتنے ہی خفیف اور بے حقیقت کیوں نہ سمجھے جائیں لیکن وہ عارضی نہیں بلکہ ابدی ہیں ـــــ خراب لفظ کبھی معدوم نہیں ہوتا۔ بلکہ سوگنا قوت کے ساتھ صدائے بازگشت بن کر ہم کو اور ہماری نسل کو سزا دینے آ جاتا ہے۔"

(حفیظ)

اے۔ ڈی۔ اظہر

پاک سرزمین کا نظام

پاکستان کا قومی ترانہ حفیظ جالندھری نے لکھا، اور راقم الحروف نے لکھوایا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے۔ اور یہ تفصیل اس لئے ضروری ہے کہ ترانے پر لے دے بہت ہو چکی ہے۔ تقریباً تیرہ چودہ سال ادھر کی بات ہے ——

—— غالباً اواخر سنہ ۴۸ء کا زمانہ تھا۔ میں مغربی پنجاب کا فنانس سکریٹری تھا، خواجہ شہاب الدین وزیر اطلاعات ان کے جائنٹ سکریٹری اور میرے دوست ایس ایم اکرام اور میں ایک سرکاری وفد پر ہوائی جہاز سے دلی جا رہے تھے۔

میں نے اکرام سے کہا، آپ نے قومی ترانے کے لئے پانچ سو روپے انعام رکھ کر اپنے ملی شوق کا مظاہرہ کر لیا، مگر ترانے یوں تو نہیں لکھے جاتے۔

کہنے لگے۔ تو پھر آپ بتائیے

میں نے کہا، اگر فرانسیسی ترانے کی طرح یہ کسی کے دل کی گہرائیوں سے خود نکلی ہوئی آواز نہیں ہو سکتی۔ تو اس کی انتظامی ترکیب یہ بہتر ہوگی کہ ایک کمیٹی مقرر کر دی جائے۔ جس میں ملک کی بہترین صلاحیتیں بروئے کار لائی جائیں۔

کہنے لگے: خیال تو اچھا ہے۔

دلی پہونچ کر انہوں نے مژدہ سنایا کہ خواجہ صاحب اس تجویز کو بہت پسند کرتے ہیں اور کمیٹی بنانے کے لئے مشتاق ہیں۔ اب آپ ہمیں اس کمیٹی کے ارکان کے متعلق بھی مشورہ دیجئے۔

میں نے کہا کہ میرے خیال میں اس میں اس قسم کے لوگ آنے چاہئیں۔ ادیب، شاعر، نقاد، علمائے اسلام، اہل نشر و اشاعت، سیاست داں اور آپ۔

کہنے لگے، نام؟

میں نے اپنے اندازے کی ادبی، دینوی، اور انتظامی سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے، مختلف طبقوں کے نمائندوں کے یہ نام لکھوائے۔ تاثیر، حفیظ جالندھری، ممتاز حسن، ذوالفقار بخاری، جسیم الدین، عبدالرب نشتر، نذیر احمد چودھری اور ایس ایم اکرام۔

ممتاز حسن کے نام پر اکرام نے کہا کہ، خواجہ صاحب کہتے ہیں فنانس کے محکمے سے صرف ایک نام کافی ہے۔

میں نے پوچھا: وہ کون ہے؟
بولے: آپ!
میں نے کہا: مجھے جانے دیجئے۔ اس کمیٹی میں فنانس کا کیا کام؟
کہنے لگے، آپ دونوں ہی تو فنانس کے آدمی۔
میں نے کہا: اس کمیٹی میں میری موجودگی تو خارج از بحث ہونی چاہیئے۔ اور ممتاز کا نام میں نے فنانس افسر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ان کی ادب دوستی، علم دوستی اور اسلام دوستی کے سبب سے بتایا تھا۔
کہنے لگے: جو کچھ بھی ہو، خواجہ صاحب چاہتے ہیں کہ آپ ضرور ہوں، اور آپ ہی کافی ہیں، وغیرہ۔
دلی سے واپس آنے کے چند دن بعد اکرام کی طرف سے اطلاع نامہ آیا، جس میں باقی نام تو قریب قریب وہی تھے تاثیر کا نام نہ تھا۔
میں نے فون پر دریافت کیا۔
کہنے لگے: تاثیر کے نام پر اعتراض کریں، وہ کمیٹی میں نہیں رکھے جائیں گے۔
بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ان کے مشاعرے میں انہوں نے ایک ملحدانہ، اشتراکیت انگیز نظم پڑھی تھی۔ اپنے دوست ماہیر اور اس کے رفقاء کی اعتقادی دنیا میں یہ میری پہلی جھلکی تھی۔ اس سے پہلے میں ان لوگوں کے کلام کو شاعرانہ تعلیاں سمجھ کر اپنے آپ کو تسلیاں دے لیا کرتا تھا۔ یہ جملہ معترضہ تو نہیں محض گذارش احوال واقعی ہے۔ آپ نے خود ہی دیکھ لیا ہوگا کہ اس جمہوری دور میں ہمارے حاکم اپنے دینی اور آئینی معاملات میں کتنے حساس تھے!
ترانہ کمیٹی بننے کے تھوڑے دنوں بعد میں چاٹ گام تعینات ہوگیا، اور کمیٹی کے سب جلسوں میں وہیں سے شریک ہوا۔
پہلا جلسہ غالباً ۲۸ فروری سنہ ۴۹ ء کو ہوا۔ بہرکیف میری ڈائری میں اسی تاریخ کو " ترانۂ ملّی " کے تحت ذیل کا اندراج ہے:

"—— چاٹ گام سے کراچی کے ہوائی سفر میں

۱ - موضوع
۲ - موسیقی
۳ - وزن، بحر
۴ - شوکت الفاظ، زبان
۵ - بین الاقوامیت

۱۔ **موضوع** —— فخر، اسلامی مساوات و اخوت، دعائے بقا۔
۲۔ **موسیقی** —— قومی دھمک، بین الاقوامی اپیل، مشرقیت مگر وہ جس میں مغربیت کی چاشنی ہو مشرقی بنگالی یہ نہ سمجھے کہ یہ پنجابی ہے۔ اور پنجابی یہ نہ جانے کہ بنگالی ہے بہتر ہو کہ

لے کا مسئلہ کسی ایسے مغربی موسیقار کے حوالے کیا جائے جو مشرقی موسیقی سے عملی طور پر واقف ہو۔ لے میں افیون نہ ہو۔

۳ - وزن ویرعسکری ہو۔ مگر Jazzy نہ ہو۔ چھوٹا وزن ہو۔

۴ - شوکتِ الفاظ بھی ہو، اور زبان عام فہم اور آسان بھی ہو۔ لفظوں میں ترنم اور ارتعاش ہو۔

۵ - ملّی ترانہ ایک مغربی اختراع ہے، مگر اچھی رسم ہے۔ اس بات کا خیال ضرور رہے کہ بین الاقوامی فضا میں اس کا کیا اثر ہوگا۔ یہاں یہ بات نہ بھولنی چاہیئے کہ مشرقی موسیقی کی اپیل مغربی کانوں کے لئے افیون کا درجہ رکھتی ہے۔ یا موسیقی کم، موسیقی کی گرہ بر زیادہ! ـــــ۔

(اس اندراج کے "جزیروں" سے آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا، یہ اُس زمانے کی یادگار رہے جیسے وطن کی تعمیر میں مغربیت کا شوق جھلکتا تھا جس شوق کو خود مغرب کی چیرہ دستیوں نے پامال کر دیا!)

سردار عبدالرب نشتر مرحوم اس کمیٹی کے صدر تھے۔ اور اس وقت تک ایک مشرقی پاکستانی ہندو ایم ایل اے صاحب بھی کمیٹی کے رکن بنائے جا چکے تھے، میں نام بھول گیا ہوں۔ جلسے کے قریب قریب تمام ارکان بالکل صاف اور کوری ذہنی سلیٹیں لے کر آئے تھے۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ترانے کا حدود اربعہ اور قافیہ کیا ہونا چاہیئے۔

میں نے سوال اٹھایا کہ اقبال سے کوئی موزوں اقتباس کیوں نہ لے لیا جائے؟ اس تجویز پر فوراً ایک سب کمیٹی بنا دی گئی جو چوہدری نذیر احمد (وزیر صنعت) اور مجھ پر مشتمل تھی۔

کمیٹی کے دوسرے اجلاس میں چوہدری نذیر احمد اور میں نے اقبال کے کلام سے غالباً سات مختلف ٹکڑے پیش کئے لیکن ساتوں ہی اس بنا پر رد کر دیئے گئے کہ ان میں بقول ہندو رکن کے کہیں نہ کہیں قابلِ اعتراض الفاظ موجود تھے مثلاً توحید، اخوت، مومن، ایمان، وغیرہ، چونکہ اس لحاظ سے سارے کا سارا "اقبال" ملوث ہے، اس لئے پاکستان کے ملی ترانے کے لئے بانیٔ پاکستان کو ترک کر دیا گیا!

اسی سلسلے میں ایک لطیفہ بھی ہو گیا، جسے درج کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

کمیٹی کے ایک رکن جو بزعمِ خود اس ملک کے بہت بڑے، بلکہ سب سے بڑے ادیب و شاعر ہیں، اسی اجلاس کی صبح حفیظ جالندھری سے الجھ پڑے تھے۔ میں چاٹگام سے اجلاس کی سہ پہر کو آ سکا تھا، اس لئے صبح کے واقعہ کا چشم دید گواہ نہیں ہوں۔

سہ پہر کے اجلاس میں جب اقبال کے لفظ "مومن" پر اعتراض ہوا تو اُن ادیب صاحب نے نہایت ادب نوازی کے لہجے میں فرمایا! مومن کی جگہ کوئی اور لفظ بھی آ سکتا ہے۔

میں نے عرض کی "مومن" کے ساتھ لگا کھاتا لفظ تو صرف "کافر" ہے۔ پھر کسی حکیم نے نسخے میں بھی نہیں لکھا کہ شعر اقبال کا ہو مگر ہو تصرف سے۔ اقبال سُن پائے تو کیا کہے۔

چنانچہ اقبال کو دل آزاری جان کر ترک ہی کر دیا گیا۔

اس سے اگلی محفل میں میں نہ آسکا، اور جب چوتھے اجلاس میں آیا تو معلوم ہوا کہ ترانے کی لَے بن کر کمیٹی میں پاس ہوچکی ہے۔

تیسرے اجلاس سے کچھ پہلے نشتر مرحوم پنجاب کے گورنر ہوکر جاچکے تھے، اور اب صدر پیرزادہ عبدالستار تھے۔ لَے کا مسئلہ انہی کی پہلی صدارت میں (جس سے میں مستفید نہ ہوسکا تھا) طے ہوا تھا۔ یہ بات میری سمجھ سے کچھ بالاتھی کہ لَے ترانے سے پہلے ہی منظور ہوجائے۔ اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میں نے اس سلسلے میں گھوڑے کے آگے گاڑی جوتنے کا محاورہ استعمال کیا تھا، لیکن مجھے یہ کہہ کر چپ کرا دیا گیا، کہ لَے نہ صرف کمیٹی میں پاس ہوچکی ہے، بلکہ کیبنٹ نے بھی اسے منظور فرما لیا ہے۔ اور اس لئے یہ مسئلہ اب دوبارہ زیرِ غور نہیں آسکتا۔ کیبنٹ کا نام ایک سرکاری ملازم کو مرعوب کرنے کے لئے کافی تھا۔ پھر مسئلہ کمیٹی کی حدود سے بھی باہر ہوگیا تھا۔

اب یہ طے پایا کہ ملک کے مشہور ادیبوں کو لَے سے واقف کرا کر ان سے مقابلۃً ترانہ لکھوایا جائے اور کمیٹی بہترین ترانے کا انتخاب کرے۔

پانچواں اجلاس خصوصی حیثیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اس میں ترانے کا انتخاب ہوا۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ من جملہ دیگر اصحاب کے ذیل میں درج شدہ ادیبوں نے ترانے لکھ کر بھیجے تھے ۔۔

- آرزو لکھنوی
- حکیم احمد شجاع
- حفیظ جالندھری (کمیٹی کا رکن ہونا مقابلے میں لکھنے کے منافی نہ تھا)
- اور زیڈ اے بخاری

ترانے کی لَے چھاگلا مرحوم نے وضع کی تھی۔ اس وقت اس لَے کے متعلق یہی گمان تھا کہ یہ نہ مشرقی ہے نہ مغربی، کئی اصحاب اس کے متعلق آدھا تیتر آدھا بٹیر کہتے ہوئے بھی سنے گئے۔ اس کی کوئی خاص بحر بھی نہ تھی، حتیٰ کہ نئی شاعری بھی اس کی خفیہ بحر کے سامنے کان پکڑتی تھی۔ نئی شاعری میں مصرعوں کے ارکان کم و بیش ہوتے ہیں۔ بحر قریب قریب وہی رہتی ہے، اِلّا آں کہ شاعر بالکل ہی آزاد ہوجائے۔

اس لَے کی یا تو کوئی بحر تھی ہی نہیں یا پھر کئی بحریں تھیں، بلکہ ایک ہی مصرع میں بحر بدل جاتی تھی۔ چنانچہ لَے کے ساتھ کسی ایک ترانے کو چھوڑ کر (جس کا ذکر ابھی آتا ہے) کسی ترانے کا جوڑ نہ بیٹھتا تھا۔ لَے کی لامکانی نے اچھے اچھے شعراء کو جن میں آرزو لکھنوی جیسے اہلِ کمال شامل تھے، اس طرح کی شاعری پر مجبور کر دیا تھا، جیسے عیسائیوں کی کتابوں میں زبورِ داؤد کی اردو شاعری ہے۔ جس کی مثال میں نے یوں دی تھی:

"جب یسوع مسیح آیا"
بروزنِ مَفْعُولُ فِعْلُ فِعْلُ فِعْ .....

عیسائیوں نے نثر میں تو ترجمے خوب کروائے، جب نظم کی باری آئی تو غالباً اردو کے انگریزی شاعر بلوالئے ہوں گے ہر زبان کی اپنی رُوح ہوتی ہے، اور اپنا آہنگ، انہیں بے ڈھب بدلیں تو زبان کی رُوح مجروح ہوتی ہے۔

میں کچھ اسی قسم کی باتیں کر رہا ہوں گا کہ نقوی صاحب جو وزارتِ دفاع کے جائنٹ سکریٹری تھے اور کمیٹی میں ایک شاہد کی حیثیت سے موجود تھے، آرزو لکھنوی کے دفاع میں بول اٹھے۔

میں نے کہا: اس میں حضرت آرزو کی کوئی خطا نہیں ہے، ان کے شعر یا مانوس بحروں میں ہیں یا ان سے ملتی جلتی بحروں میں۔ اور حضرت آرزو جیسے استاد سے یہ دونوں باتیں متوقع بھی ہیں، قصور تو سارا اس کا ہے، جو پہلے بن جانے کے علاوہ غیر ملکی نہ بھی ہو، ملکی ہرگز نہیں۔ اساتذہ کو سانچے میں ڈھالنے والے ہم ہیں۔ اس میں اساتذہ کا کیا قصور!

جب اس پر بھی نقوی صاحب مصر رہے، تو مجھے ان کے ذوقِ شعری کا واسطہ دے کر انہیں اپنے اصرار سے باز رکھنا پڑا۔

اہلِ فن کے لئے ایسی الگ بھی کہ ان کے استعمال شدہ الفاظ چیستاں بن کر رہ گئے تھے۔ حد یہ تھی کہ جس پاکستان کے لئے اتنی محنت سے ملی ترانہ تیار ہو رہا تھا، خود وہ (ایک ترانے کو چھوڑ کر) پاکستان (مفعولان) ہے سے "پاکیستان" (فاعلن فعول) بنا جا رہا تھا۔

صرف ایک حفیظ جالندھری کا لکھا ہوا ترانہ تھا جو لے کی بحر پر ٹھیک بیٹھتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ حفیظ کے ہاتھ میں کوئی غیر ملکی جھرلو تھا۔ جس سے اس نے اس بے بہاری لے پر قابو پا لیا تھا۔ اس کی وجہ حفیظ کی وہ ان تھک کوشش شاعرانہ ذوق، اور استادانہ سوجھ بوجھ تھی، جس کو کام میں لا کر اس نے بالآخر ایک نئی بحر ایجاد کی اور اس نئی بحر کو لے کی منظور شدہ اور غیر مبدل آہنگ کی سان پر چڑھایا۔

جو ہمارے عروض اور انگریزی پراسوڈی (Prosody) کی شُدبُد رکھتے تھے۔ انہوں نے کافی جہاد کے بعد بالآخر یہ بات مان لی کہ اس طے شدہ درآمدی برآمدی لے کے بعد اساتذہ سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اس سے اپنی مانوس آہنگ ملائیں، ان اساتذہ سے سخت ناانصافی کرنا ہوگا۔ اور کہ ان حالات میں صرف حفیظ جالندھری کا ترانہ قابلِ غور ہے۔

مگر جناب صدر یعنی پیرزادہ عبدالستار نے ایک نیا راگ الاپنا شروع کیا، یعنی یہ کہ دوسرے شعرا میں سے ایک شاعر کے ترانے کو انتخاب کیا جائے۔ میں اس شاعر کا نام یہاں مصلحتاً نہیں لے رہا ہوں۔ لیکن مجھے تعجب یہ ہوا کہ ساری رات تو یوسف زلیخا سنتے رہے صبح ہوئی تو پوچھتے ہیں کہ زلیخا عورت تھی یا مرد!

جب میرے ہر طرح کے عجز و انکسار اور سمجھانے پر بھی وہ نہ مانے تو میں نے دست بستہ عرض کی کہ حضور جس طرح گانے بجانے پر آپ کو عبور ہے، کچھ اسی نوع کی شدبد اس خاکسار کو عروض کے سلسلے میں ہے۔ گستاخی نہ ہو تو آپ مان ہی جائیں اس میں بہنوں کا بھلا ہوگا۔ ورنہ پھر میرا اختلافی نوٹ اپنی سفارش کے ساتھ شامل کر کے کیبنٹ کو پیش کر دیجئے۔

جب وہ اس پر بھی نہ مانے، تو چوہدری نذیر احمد نے، جن کا میں مہمان بھی تھا، ایک رازِ مملکت میرے کان میں کہا۔

میں نے کہا: چوہدری صاحب، رموزِ مملکتِ خویش تو ضرور خسرواں ہی جانتے ہیں، مگر مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ جب یہ بے سُرا (اگرچہ بے سر ہیں ہو لو) ترانہ ملک میں گایا جائے گا تو لوگ کہیں گے، یہ اظہر اُس وقت کہاں تھا، یہ

کیوں منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھا تھا! اور مجھ غریب کو خواہ مخواہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ چوہدری صاحب اگر حفیظ کا ترانہ آپ لوگ انتخاب نہیں کرتے، تو آپ صاحبِ اختیار ہیں، مجھے اختلافی نوٹ لکھ لینے دیجئے۔ کہ میری سرخروئی کا بھی کچھ سامان تو ہو جائے، آخر لے کو پہلے مقرر کرنے والے بھی تو آپ ہی ہیں۔

آخر کار چوہدری نذیر احمد کی زیرکی اور مصلحت شناسی سے معاملے نے قدرے سلجھنے کا رخ اختیار کیا، انہوں نے پہلے تو یہ تجویز کی کہ اُن شاعر کا ترانہ اول نمبر پر اور حفیظ کا دوم نمبر پر رکھ لیا جائے۔ جب میں نے کہا کہ میں غلط چیز کو کیسے پیش کرنے کا مشورہ دوں۔ تو پھر چوہدری صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ حفیظ کا ترانہ اول نمبر اور دوسرے شاعر کا دوم نمبر پہ رکھ کر پیش کیا جائے۔

جب اس پر بھی میں نے اپنی پہلی معذرت دہرائی، تو چوہدری صاحب نے پنجابی میں کہا: "بھائیا ہُن من وی جا (بھائی اب مان بھی جاؤ)۔

میں نے یہ تجویز اس شرط اور یقین دہانی پر منظور کی کہ دوسرا ترانہ کیبنٹ میں منظور نہیں ہوگا۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ دوسرا ترانہ منظور نہ ہونے میں کس کا ہاتھ تھا۔

جو لوگ حفیظ کے ترانے کو فارسی زدہ کہتے ہیں، وہ ان حقائق کو سامنے رکھیں تو بہت ممکن ہے، انہیں اپنے اعتراضوں کا کچھ جواب مل جائے۔ گاڑی کو گھوڑے کے آگے جوتنے کی کوشش گاڑی کو گڑھوں میں جا گرائے تو تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ تعجب تو اس بات کا ہے کہ یہ گاڑی بخیر و خوبی چلتی رہی اور آخر کار گھوڑا اپنے آپ ہی گاڑی کے آگے آ جتا!

حفیظ کا ایسے کڑے امتحان میں پاس ہونا جس میں نیشنل اینتھم کمیٹی نے اسے ڈالا تھا، ایک معجزہ ہے۔ ساتھ ہی میں بھی بچ نکلا۔ یعنی نہ گیہوں پسے نہ گھن۔

"— ہر ذرہ جو نیکی سے مزین اور بدی سے آلودہ کیا گیا ہو — دنیا اس کو مستقل طور پر قائم رکھتی ہے — زمین و آسمان کی درمیانی فضا ایک وسیع صفحہ ہے — جس پر انسان کی ہر بات نقش ہو جاتی ہے۔ خواہ وہ بلند آواز سے کہی گئی ہو، سرگوشی کے انداز میں ہو یا ارادے اور خیال میں مرکوز رہے۔

خیالات، الفاظ اور اعمال کا اثر انسان اور اس کے ہم جنسوں کی تقدیر پر پڑتا ہے — ہر ایک زندگی جس طرح بھی گذاری جائے — نتائج کا ایک لامتناہی سلسلہ بناتی ہے — یہ سلسلہ اُن نسلوں تک پھیلتا رہتا ہے جو ہمارے بعد پے در پے ہماری قائم مقام بنتی ہیں۔" (حفیظ)

ایم - اسلم

شاعرِ پاکستان

افکار والوں کا ارشاد ہے کہ میں شاعرِ پاکستان ابوالاثر حفیظ جالندھری کے متعلق کچھ لکھوں شاید وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں اس متحمل سے دوست نواز شاعر کے متعلق اپنے تاثرات سپردِ قلم کروں (جن کے پڑھنے سے شاید کسی کا بھلا ہو ہی جائے)

بحیثیت ایک شریف انسان کے اور بحیثیت ایک شاعر کے حفیظ اتنی بلند ہستی ہے جس کے نام سے ہند و پاک کا ہر پڑھا لکھا آدمی واقف ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ میں حفیظ کو دونوں حیثیتوں سے جانتا ہوں اور مجھے شاعرِ پاکستان کا نیاز مند ہونے کا فخر بھی حاصل ہے سوال یہ ہے کہ میں حفیظ کے متعلق کس نقطہ نگاہ سے لکھوں۔ صرف ایک شاعر یا صرف ایک شریف انسان؟

میرا خیال ہے کہ دنیا حفیظ کو صرف یا زیادہ تر — ایک شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے۔ ایک ایسا شاعر جس نے فنِ شاعری کو ایک انوکھا بڑا موثر اور دلچسپ اسلوب بخشا ہے، جس کی شاعرانہ عظمت کسی دور میں بھی کسی عامیانہ پراپیگنڈے کی محتاج نہیں رہی۔ جس نے شاعرانہ اکھاڑبازی کو ہمیشہ کم ظرفوں کا سستا حربہ سمجھ کر حقارت سے دیکھا ہے۔ حفیظ کبھی سستی اور بازاری قسم کی شہرت کا کبھی جویا نہیں ہوا۔ حفیظ نے ایشیا کا عظیم شاعر کہلانے کے لئے کبھی پاپڑ نہیں بیلے۔ اس نے خودداری کو ہمیشہ ہر چیز پر ترجیح دی ہے اور وضعداری کو ہمیشہ مقدم سمجھا ہے۔ ملک کی تقسیم سے پہلے بھی ابوالاثر حفیظ جالندھری کی شہرت کا ڈنکا ہندوستان کے کونے کونے میں بجتا تھا اور تقسیم کے بعد بھی وہ گھاٹے میں نہیں رہا۔ پاکستان والوں نے اسے شاعرِ پاکستان کہہ کر ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔ شاعرِ پاکستان بنانے کی ذمہ دار اس کی شاعرانہ عظمت ہے۔ جہاں تک اس کی شاعری کا تعلق ہے وہ سادگی کا دلدادہ ہے اس کے ہاں شعرا کی خیالات کی بازی گری بالکل مفقود ہے۔ اس کی شاعری ایک سبک خرام اور نرم رو آب جو ہے جس کی پیاری پیاری روانیوں میں جوانی گاتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ ان دل کش اور روح پرور نغموں میں کبھی درد کی کسک سے دل میں ہوک سی اٹھتی ہے اور کبھی قلب و جگر گداز ہوتا محسوس ہوتا ہے یہ وہی چیز ہے جو شعر کا حسن کہلاتی ہے۔ اس کے پڑھنے کا انداز اتنا پیارا ہوتا ہے کہ سننے والے مسحور ہو جاتے ہیں اور سامعین پر یہ کیفیت صرف اسی وقت طاری ہوتی ہے جب شاعر اپنا مفہوم پوری سادہ پرکاری اور سوز کے ساتھ بیان کرنے پر قادر ہو۔ حفیظ کی شاعری آج کی وہ منہ زور اور بے لگام شاعری نہیں جس کی اکاڑی پچھاڑی کی شاید.. شاعر کو خود بھی تہ نہیں ہوتی اور جس کا مفہوم اور معنی صرف شاعر کے دماغ میں چھپا ہوتا ہے اور سننے والے بے چارے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ وہ حمام بادگرد کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں جلدی جان چھڑانے کے لئے واہ وا کا ورد شروع کر دیتے ہیں

جہاں تک حفیظ کی شاعری کا تعلق ہے شاعری نے حفیظ کو عظمت نہیں دی بلکہ حفیظ نے شاعری کو باعظمت بنا دیا ہے۔ اس کا شعری شعور بیدار ہو کر جب "جاگ سوزِ عشق جاگ" کا نعرہ لگاتا ہے تو وہ گل و بلبل کے عشق کے ترانے نہیں گاتا بلکہ وہ ہمارے لئے "میرا اسلام لے جا" لکھتا ہے۔ اس تلب

دل و جگر کو گداز کر دینے والی نظم ہے جسے اگر کسی کوئل کی کوک کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو اس محبت، والہانہ محبت کا اظہار ہوتا ہے جو حفیظ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ مبارک سے ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ حفیظ نے اگر "شاہنامۂ اسلام" نہ لکھا ہوتا تو شاید حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرتِ مبارک کو بھی "شاہنامۂ اسلام" کے رنگ میں پیش نہ کر سکتا۔ شاہنامۂ اسلام "حفیظ کا ایک ایسا شاندار کارنامہ ہے جس پر پاکستان والوں کو ہمیشہ ناز رہے گا

حفیظ خوش قسمت ہے کہ قدرت نے اس کو پاکستان کا قومی ترانہ لکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ یہ پاکستان کا وہ قومی ترانہ ہے جو پاکستان والوں کے دل میں جب وطن کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور اندرونِ ملک اور بیرونِ پاکستان سرکاری تقاریب پر جب بجایا جاتا ہے اور سننے والوں کے دلوں پر پاکستان کی عظمت، سطوت اور اہمیت کا سکہ بٹھا دیتا ہے لیکن اسے بھی قدرت کی ایک ستم ظریفی ہی سمجھنا چاہئے کہ اس قومی ترانے کی جن لوگوں نے شدید مخالفت کی وہ وہی تھے جو حفیظ کے یارِ غار اور بڑے مداح سمجھے جاتے تھے۔ اب اگر بے چارا حفیظ ٹھنڈی آہ بھر کر یہ کہے کہ ؎

حفیظ از دستِ دوستان فریاد!

تو کون اسے الزام دے سکتا ہے لیکن اس شریف انسان نے تو آہ تک بھی نہ کی شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام!

حفیظ کی شاعری کے متعلق کچھ ایسے ہی میرے تاثرات ہیں لیکن شاعر ہونے کے علاوہ حفیظ ایک دوست پرور انسان بھی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے اکثر دوستوں کے ہاتھوں نالاں رہا لیکن جہاں تک میرا خیال ہے اس نے اپنی کسی نظم میں شکایتِ دوستاں کا مضمون نہیں باندھا۔ اس نے اپنی ابتدائی زندگی میں گردشِ زمانہ کے کئی رنگ دیکھے ہیں لیکن اس نے کبھی ہمت نہیں ہاری چونکہ اسے مسکراتے رہنے کی عادت ہے۔ اس نے ہر مصیبت کا مسکرا کر مقابلہ کیا ہے اور ہمیشہ سرخرو ہو کر نکلا ہے۔ زندہ دلی اس کی سرشت میں ہے۔ وہ اگر مجبور ہو کر کبھی شکوہ بھی کرتا ہے تو اس کی زبان شکوہ میں بھی ایک ایسا حسن ہوتا ہے جس سے تلخی کی شدت محسوس نہیں ہوتی۔ حفیظ کے سب سے زیادہ گہرے مراسم ڈاکٹر محمد دین تاثیر مرحوم اور جناب احمد شاہ بخاری پطرس مرحوم سے تھے۔ میرا مکان ملاقات کا اڈہ تھا خصوصیت سے اتوار کے روز۔ بخاری اور تاثیر دونوں منچلے مرنج قسم کے آدمی تھے پھبتی اور مذاق ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ دونوں غریب حفیظ کا بہت مذاق اڑایا کرتے تھے لیکن اس مذاق کی شان بھی پوری پوری ادیبانہ ہوتی تھی۔ دونوں طرف سے خوب نوک جھونک ہوتی تھی۔ میری حیثیت محض ایک "مہذب تماشائی" کی ہوتی لیکن دو اور ایک کا مقابلہ کیا اور وہ بھی ادبی اور تعلیمی نقطۂ نگاہ سے ایسے کائیاں کہ اگر ابلیس کو بھی ادبی ذوق ہوتا تو دونوں کے سامنے پانی بھرتا۔ جب حفیظ بے چارے کو کوئی راہِ نجات نظر نہ آتی تو وہ اچانک اپنی شکر فشانیوں کی آڑ لیتا اور پریشان کرنے والوں کو اپنے کلام اور آواز کے جادو سے خاموش کر دیتا۔ حفیظ آج بھی جب تاثیر اور بخاری کا ذکر کرتا ہے تو خود بھی روتا ہے اور دوسروں کو بھی رلا دیتا ہے

حفیظ ایک سادہ مزاج انسان ہے۔ اس کی شاعری کا انداز بھی سادہ۔ اس کی عادت بھی سادہ۔ اس کا اخلاق بھی تصنع سے پاک۔ اس کی گفتگو کا انداز بھی سادگی کے حسن سے مزین۔ نیک خصلت انسان اور بامروت دوست ۔۔۔ میں وہ وقت آج تک نہیں بھولا جب ایک روز میری ننھی معصوم اصغری کی موت پر میرے غم و الم سے متاثر ہو کر حفیظ نے میرے پاس بیٹھے بیٹھے کچھ اشعار لکھے پھر اپنے مخصوص انداز سے پڑھ کر مجھے سنائے۔ وہ خود بھی رویا اور مجھے بھی رلایا (یہ نظم "معصوم اصغری" کے نام سے حفیظ کے مجموعۂ کلام میں شامل ہے)

آج کی ادبی فضا سے شاعرِ پاکستان ابو الاثر حفیظ جالندھری کا یہ امتیاز نظر آتا ہے کہ اس نے منقار زیرِ پر کر رکھی ہے۔ اب وہ کسی کے تقاضے سے ہی کسی مجلس میں کچھ سناتا ہے۔ اسے آج کے ادبی اکھاڑوں اور گروہ بندیوں سے سخت نفرت ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قسم کے اکھاڑوں اور گروہ بندیوں نے ادب کو نفع پہونچانے کی بجائے بڑا نقصان پہونچایا ہے

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حفیظ کی عمر میں برکت دے۔ آمین۔

احسان دانش

نغمہ زار کا حفیظ

جناب تہمیا السلام علیکم۔ آپ کا یہ دوسرا خط آیا ہے جس میں مجھے حفیظ صاحب کی شاعری پر کچھ لکھنے کو کہا جا رہا ہے۔ بھائی میں تو معمولی سا شاعر ہوں۔ یہ کام تو کسی ادیب یا نقاد کا ہے اور اگر میں کچھ کہنے کی کوشش بھی کروں تو اتنے عرصہ میں کیا ہو سکتا ہے۔ نہ حفیظ کی تمام کتابیں میرے پاس نہ مجھے یہ معلوم کہ حفیظ صاحب کے متعلق کس شخص نے کیا لکھا ہے اور جس نے لکھا ہے وہ موجودہ دور کے نقادوں یا تبصرہ نگاروں میں کیا مقام رکھتا ہے اگر میں کچھ بازیگری کروں بھی تو اس سے حفیظ کی ذات کو کیا فائدہ ہو گا سوائے اس کے کہ ایک اعتراف! اور میرے لئے یہ فراخ دلی ہر شاعر کے لئے موجود ہے اس کے علاوہ اگر مواد مہیا بھی ہو تو حفیظ صاحب کی شاعری پر لکھنے کے لئے کم از کم چھ ماہ درکار ہیں۔ اس دور میں اتنی فرصت کسے نصیب ہے؟ میں تو حیران ہوں کہ جو لوگ اس قلیل عرصہ میں مضامین لکھیں گے وہ کہاں تک صحیح ترجمانی کر سکیں گے۔

ہما شما کو تو حفیظ ہمیشہ اس مقام پر ہی دکھائی دیا ہے جہاں نشیب نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں اور بلندی سے نقارے کی آواز سنائی دیتی ہے اس صورت میں حفیظ کے ادب پر آپ کو نامکمل اور تشنہ مضامین تو دستیاب ہو جائیں گے لیکن ان کی شخصیت پر بہت کم مضامین ملیں گے اور جو لکھ سکتے ہیں وہ ہچکچائیں گے کیونکہ بلندی سے پستیوں کا جائزہ لیتے ہوئے عموماً ڈر لگتا ہے البتہ خاک نشینوں کی نظر بلندیوں پر ضرور پڑتی رہتی ہے۔ میں نے ہی نہیں جس نے بھی حفیظ کو دیکھا ہے وہ یہی کہے گا کہ حفیظ قادر الکلام شاعر ہے اور اگر ہم ذرا غور سے کام لیں تو حفیظ بلا کا فضا شناس انسان ہے وہ زمانے کے رخ کو پہچانتا ہے اور ایک نگاہ میں مجمع کا اندازہ لگا لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک حفیظ پر مشاعرے میں عوام کی طرف سے داد و تحسین کے دونگڑے پڑتے ہیں۔

اس کے علاوہ عوام حفیظ کو حکومت وقت کا ایک اعلیٰ رکن جانتے ہیں اور اعلیٰ افسروں کو اس کی جڑوں کے ریشے عوام میں دکھائی دیتے ہیں گویا حفیظ پستی اور بلندی دونوں پر اس طرح چھایا ہوا ہے کہ اس کی شخصیت پر مشکل ہی سے کوئی قلم اٹھائے گا۔ کیونکہ آج تک بلند طبقہ پس ماندگان سے بے خبر ہے اور پس ماندگان بلند طبقے کے خد و خال کو نہیں دیکھ سکتے۔

عرصہ ہوا میں نے حفیظ کی کتاب نغمہ زار پڑھی تھی۔ اس کے متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ حفیظ کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو ناظرین کو اس کی شاعرانہ عظمت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ میرے خیال سے تو حفیظ صرف گیت ہی کے شاعر رہتے تو اب تک نہ جانے کہاں تک پہونچتے۔ ادب میں انہیں زندہ رکھنے کے لئے تو "نغمہ زار" کے گیت ہی کافی ہیں (ان کا مزید لٹریچر اس کے علاوہ ہے) نہ معلوم انہوں نے اس صنف کی طرف توجہ کیوں ہٹالی۔ "نغمہ زار" کے بعد حفیظ نے جو گیت لکھے ہیں اور جو سننے میں آئے ہیں وہ اتنے موثر نہیں۔ شاید اس لئے کہ میری نظر میں "نغمہ

زار" ہی کا معیار ہے یا شاید اس وجہ سے کہ مشاعرہ میں "ابھی تو میں جوان ہوں" اور "رقاصہ" کی فرمائشیں کچھ اور سننے کا موقع ہی نہیں دیتیں اور مشاعرے میں سے پچاس فی صد حاضرین کا مطالبہ انہیں پر آ کر دم لیتا ہے۔ حفیظ صاحب اپنے سامعین کی دل شکنی نہیں کرتے اور وہ موقع بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر کبھی حفیظ صاحب قصد کر کے اپنا کوئی دوسرا شہ پارہ سناتے ہیں تو سماعت سے دبے پاؤں گزر جاتا ہے کیوں کہ "رقاصہ" کی نغمگی سے سماعت لبریز ہوتی ہے اور اس وقت دوسرے خیالات و احساسات دل میں ڈوبنے نہیں پاتے۔

"نغمہ زار" کی غزلیں بھی معمولی نہیں۔ ان میں حفیظ صاحب کا تغزل ان کو بڑا شاعر بتاتا ہے لیکن اب وہ جو کوئی غزل سناتے ہیں، میں اس سے چونکتا نہیں لطف اندوز ہوتا ہوں۔ میرے لئے ان کی نغمہ زار ایک معیار بن کر رہ گئی ہے اور میں انہیں وہیں تلاش کرتا رہ جاتا ہوں۔ حفیظ صاحب "نغمہ زار" سے کوسوں آگے نکل چکے ہیں لیکن میں اسے اپنی کم فہمی پر محمول کرتے ہوئے یہی کہوں گا کہ میں تو صرف نغمہ زار والے حفیظ کو پسند کرتا ہوں اور وہی اصل شاعر ہے۔ کئی بار ان کے دوسرے مجموعے بھی پڑھنے کو اٹھائے لیکن تھوڑی دور چل کر پلٹ آیا۔

رہا شاہنامہ وہ ایک مذہبی چیز ہے اور اس کی پاکیزگی سے کیسے انکار ہو سکتا ہے اس لئے میں اسے تنقیدی آلات سے آلودہ کرنا اچھا خیال نہیں کرتا۔ ہاں اس کی منظر نگاری پر تبصرہ ہو سکتا ہے اور اس میں شاعر وہیں نظر آتا ہے جہاں ایک تجربہ کار ماہر اور گرگ باراں دیدہ انسان کو ہونا چاہئے

حفیظ صاحب کی شخصیت کے متعلق خیال آرائی کیسے ہو جب کہ حفیظ صاحب کی بے نیازی اور میری مصروفیاتِ حیات دونوں نے اس قدر فاصلے روا رکھے ہیں کہ آپس میں روزمرہ کے معمولات اور دن رات کے مشغلوں کے دھندلے سے آثار بھی دکھائی نہیں دے سکتے۔ ہاں ایک پیمانہ میرے سامنے ضرور ہے اور اس پر ہر شاعر کو پرکھا جا سکتا ہے کہ:

اچھا شاعر اچھا انسان بھی ہوتا ہے اور بس!

اس کے لئے ان کے حلقے میں رہنے والے، ان کے ساتھ کام کرنے والے، ان کے ماتحت اور ان کے افسروں کے علاوہ وہ لوگ اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں جنہیں ان سے زیادہ واسطہ رہا ہو یا ہے۔ ادب اور شاعری پر تنقید و تبصرہ کے لئے ادیبوں کی کمی نہیں۔ شخصیت پر کچھ لکھنا بہت مشکل بات ہے اس میں میں نے اچھے اچھے لوگوں کو ناکام دیکھا ہے۔ اگر کبھی موقع ملا تو بڑے بڑے دبیز نقابات اٹھاؤں گا۔

نہ توڑو دوستو رشتہ وفا کا
میں دل کا زخم سینا چاہتا ہوں

حفیظ

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

(حفیظ)

بُوبا

حفیظ جالندھری صاحب میرے ہم وطن ہی نہیں ہم سن۔ ہمجولی۔ ہم مسجد اور ساتویں کلاس تک ہم جماعت بھی رہ چکے ہیں۔

وہ آج بھی اور آنے والے دور کے لئے بھی ایک اہم شخصیت ہیں۔ جس کا ان کو شاید خود بھی اندازہ نہ ہو۔ اور میں ہوں محض ایک غیر اہم شخص۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوں۔ زندگی سے ریٹائر ہونے کی تاریخ قریب ہے۔ اپنی کارگذاری کے ذریعے کلرکوں اور چپراسیوں سے صاحب بہادر کہلانے کے لئے جان ماری تھی۔ اب وہ ماتحت کام کرنے والے کلرک صاحبان جن کو میں نے ملازمت دلوائی تھی اور پھر کام بھی سکھایا تھا اب چھوٹے صاحب سے بڑے صاحب بن چکے اور بنتے جارہے ہیں اگرچہ مجھے ریٹائر ہوئے کوئی بہت زمانہ نہیں ہوا، لیکن وہ مجھے بھول چکے ہیں۔ ہاں چند ایک پرانے میری ہی طرح کے "فارغ البال" کبھی کبھار نظر آجاتے ہیں تو یا د اللہ کے ساتھ چند یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن ایسی یادیں بہت ہی دھندلی ہوتی ہیں —

'ہاں بھئی کیا حال ہے۔ اچھے تو ہو؟'

'جی ہاں شکر ہے اللہ کا جس حال میں رکھے!'

کہتے ہوئے یہ یادیں بھی اُڑتے ہوئے پرندے کے سائے کی طرح اڑنچھو ہو جاتی ہیں۔

البتہ یہ شخصیت یہ حفیظ جالندھری صاحب بر سر راہ ہی سہی۔ خواہ میری توجہ کسی اور طرف بھی ہو۔ مجھے دیکھ لیتے ہیں تو دوڑ کر اسی اپنی اسی اسکولی شوخی کے ساتھ آتے ہیں اور بعض اوقات اسی طرح پیچھے سے بازو پھیلا کر دونوں ہاتھوں سے میری آنکھیں ڈھانپ کر میرا وہی نام لے کر پکارتے ہیں۔ جس نام سے گلی محلے کی عورتیں۔ مائیں، چاچیاں، نانیاں دادیاں پیار سے پکارا کرتی تھیں یا جس نام سے ابا یا دادا پکارا کرتے تھے —

"اوئے بوبیا — وے بوبیا —" (یہ محبوب ... کا گھریلو خطاب ہے)

پہلے پہل سکندرآباد چھاؤنی حیدرآباد دکن کے بھرے بازار میں جب یہ حرکت ہوئی تو میں نہ صرف بھنا گیا تھا، بلکہ قدرے طیش میں بھی آگیا تھا۔ میں سمجھا کوئی میرے ہی دفتر کا بے وقوف برابر کا افسر ہے۔ بھلا دیکھئے تو۔ یہ بھی کوئی تُک

ہے کہ ایک معزز ہیڈ کلرک کے ساتھ جب وہ کھڑا بازاری کنجڑوں سے سبزی کا بھاؤ چکا رہا ہو، ایسی گستاخانہ بے تکلفی کرے۔ میں نے جھنجلا کر ذرا زور کے ساتھ آنکھوں پر سے یہ ہاتھ ہٹا دیئے۔ غصے میں مڑ کر دیکھا تو حفیظ ——

حیدرآباد کے دو نہایت ہی معتبر قسم کے معزز آدمی شیروانیاں پہنے، حیدرآبادی پگڑیاں سروں پر جمائے ہوئے حفیظ کی اس طفلانہ حرکت کا مزا لے رہے تھے۔

میں نے حیدرآباد کے ایک اخبار میں یہ خبر تو پڑھی تھی کہ حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری آج کل حیدرآباد میں وارد ہیں۔ لیکن میں تو ان دنوں انگریزی فوجی دفتر میں ہیڈ کلرک تھا۔ مجھے یہ بھی خبر نہ تھی کہ ان کا قیام کس ریاستی گیسٹ ہاؤس یا کون سے "یار جنگ" کے یہاں ہے —— اس لئے ملنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ سر بازار حفیظ نے مجھے پہچان لیا تھا اپنے ساتھیوں سے موٹر رکوائی اور اتر کر پیچھے آ لیا تھا۔

میں نے جب یہ اندازِ ملاقات دیکھا تو کھسیانا ہو گیا۔

"حفیظ صاحب ....." کہہ کر منہ تکنے لگا۔

اب چٹکارا کیسا!

آپ نے پنجابی میں دو کھری اور ستھری جالندھری گالیاں دیں، اور مجھے پکڑ کر موٹر کار میں دھر لیا۔ اور ان دونوں ساتھیوں سے میرا تعارف کرایا ——

"یہ ہیں میرے لنگوٹیئے۔ بولے صاحب۔ یہ بی اے ہیں۔ بڑے شریف ہیں۔ ان کے والد بھی بڑے شریف آدمی تھے جنہوں نے ان کو بی اے کرایا تھا۔ آج کل انگریزی سلطنت کو سنبھال رہے ہیں۔ پچھلے دنوں یہ لاہور تھے۔ پھر میرٹھ، لکھنو، کلکتے اور نہ جانے کہاں کہاں دھاوا بولتے رہے۔ آج یہاں نظر آئے ہیں۔ اور دیکھو بھئی ... بھلے ..... اور پنجابی گالی ...... یعنی وہی پرانا بچپن کا نام لے کر —— یہ ہیں نواب یار جنگ اور یہ ہیں قاضی عبدالغفار اخبار "پیام" کے ایڈیٹر۔ اور میں ہوں —— ابے بول میں کون ہوں —— ؟"

حفیظ کو محلے کی عورتیں پھیج کہا کرتی تھیں۔ وے پھیج۔ وے بھیجا۔ او دیکھ نی "بھیجا" جاندا ای۔ یہ ان پڑھ پنجابی عورتیں حفیظ کا صحیح تلفظ نہ کر سکتی تھیں۔ مجھے بھی اب پرانا زمانہ یاد آ گیا۔

میں نے جھٹ کہا "بھیجا"

یہ سننا تھا کہ حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری نے مجھے زور سے لپٹا لیا اور کہا "بھیا میں یہی سننا چاہتا تھا۔ کاش کوئی اور بھی ہوتا جو مجھے میرے بچپن کے نام سے پکارتا ——"

میں نے دیکھا تو حفیظ کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ حفیظ کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے اور گلی محلے کی بوڑھی عورتیں بھی قبریں بسا چکی تھیں۔ حفیظ نے لاہور ہی کو مستقر بنا لیا تھا۔ جالندھر آنا جانا ضرور تھا لیکن اب بے تکلفی بھی جناب حفیظ یا حفیظ صاحب سے نیچے نہیں اترتی تھی۔

یہ واقعہ سنہ ۱۹۴۰ء کا ہے۔ اس سال حفیظ صاحب کے والد کا انتقال ہوا تھا۔ میں بھی چھٹی پر ان دنوں جالندھر ہی میں تھا، اور فاتحہ خوانی کے لئے گیا تھا۔ حفیظ اس وقت بھی مجھ سے گلے لپٹ کر روئے تھے —— جالندھر سے باہر

کی پہلی بہت سی ملاقاتوں میں حفیظ نے مجھے میرے بچپن کے نام کی اور میں نے حفیظ کو پھیا نام کی یاد نہیں دلائی تھی لیکن آج وہ بچپن کے حفیظ تھے یعنی "پھیا"

عرض مجھے یہ کرنا ہے کہ اس وقت دنیا میں صرف حفیظ صاحب ہیں جو اپنے پرانے ساتھ کے کھیلے ہوئے کو اسی نظر اسی دل سے ملتے ہیں۔ لہٰذا میں بھی اگر آج اس تحریر میں ان کو حضرت مولانا نواب حسان الملک بہادر وغیرہ یا ہلال امتیاز پاکستان ابوالاثر حفیظ جالندھری وغیرہ وغیرہ نہ لکھوں۔ پھیا ہی کہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس تحریر کے پڑھنے والے مجھے گستاخ نہیں سمجھیں گے۔ اور سمجھ بھی لیں تو کیا کرلیں گے۔ میں اپنا پورا نام اور پتہ تو لکھنے ہی کا نہیں۔ یہ بات طے ہو چکی ہے۔ لہٰذا اگر یہ تحریر افکار میں شائع ہو گئی تو اس گستاخی کے مرتکب سے صرف حفیظ ہی واقف ہوں گے۔ کسی دوسرے کو مجھے سرزنش کرنے کی راہ نہ ملے گی۔ زیادہ سے زیادہ حفیظ کے سچے دوست یا حفیظ سے لکھوا کر شعر پڑھنے والے جالندھری کلاس فیلو جو حفیظ کا لکھا ہوا اپنے نام سے سنایا کرتے تھے یا حفیظ سے کبھی بلند مرتبت شاعر مضمون گھسیٹ دیں یا حفیظ کے لنگوٹیے یوبا حفیظ کوے ڈویا کی ہجو کہہ ڈالیں۔ اور شائع کردیں گے تو واللہ مزا آ جائے گا۔ اور یہ مزا لینے والے راقم الحروف اور حفیظ عرف پھیا ہی ہوں گے۔ کیوں پھیا جی۔۔!

ـــ کوئی انشا پرداز، کوئی شاعر، کوئی افسانہ نگار ایسا نہیں جس کا آغاز گھروندے بنانے سے نہ ہوا ہو۔ ان گھروندوں میں طفلانہ نظر کے ساتھ ساتھ اُپج بھی ہوتی ہے۔ نقل اور اُپج دونوں کچھ اس طرح آمیز ہوتے ہیں کہ ان گھروندوں کے قریب سے گذرنے والے بالغ نظر لوگ مسکرائے بغیر یا کوئی فقرہ چُست کئے بغیر نہیں گذر سکتے۔

(حفیظ)

انشورنس پیراشوٹ کی مانند ہے
مستقبل کے تحفظ کا آج ہی سے بچاؤ کیجئے
زندگی
آگ
بحری
اور حادثاتی
بیمہ کے لئے
یاد رکھئے
دی ایسٹرن انشورنس کمپنی لمیٹڈ
(پاکستان میں تشکیل شدہ)
ہیڈ آفس:-
اصفہانی بلڈنگ آگرآباد
چٹاگانگ
پوسٹ بکس نمبر ۳۲۰
فون نمبر:- ۴۱۲۵
ٹیلیگرام:- گارنٹی
علاقائی دفتر:-
ایمی جی چیمبرز
کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی
پوسٹ بکس نمبر ۱۳۲
فون نمبر:-
۸۱۳۰۵ اور ۳۲۲۷۱
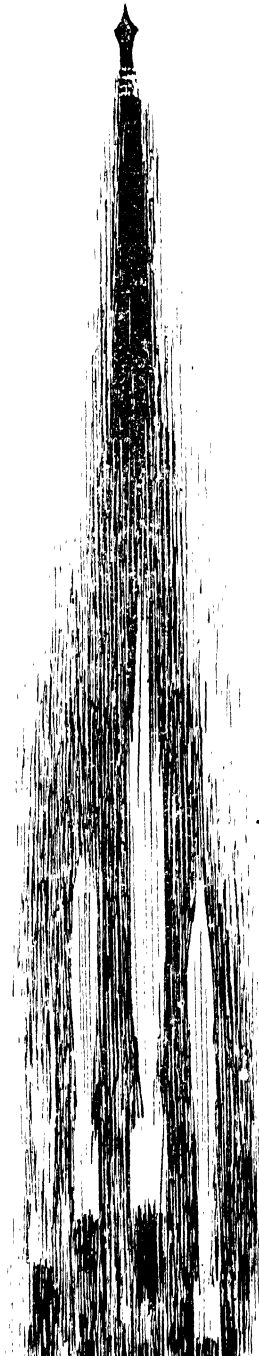
۴

بہترین

کتابیں
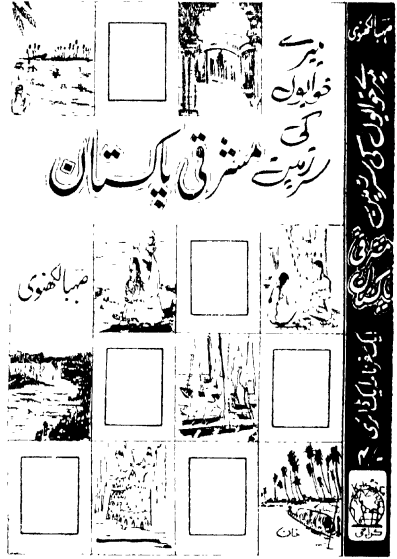
لاکھوں روپے کے قیمتی انعامات
سب سے بڑھکر
ایک بیش بہا قیمتی انعام
انسان کی اپنی صحت و تندرستی ہے
• چنانچہ جو لوگ تندرستی کی قدر و قیمت سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ مال و دولت پر صحت کو ترجیح دیتے ہیں اور حصول صحت کی خاطر ہی لیورفیکس پسند کرتے ہیں.
لیورفیکس کی پسند اور مقبولیت کا راز
• موٹر کار - کوٹھی - بنگلہ یا لاکھوں روپے نقد انعام کا لالچ ہرگز نہیں. بلکہ لیورفیکس کی افادیت ہی اس کی مقبولیت کی دلیل ہے -
• چنانچہ لاکھوں روپے کا انعام تو لاکھوں میں صرف ایک ہی کو ملتا ہے مگر صحت و عافیت کا یہ بیش بہا قیمتی انعام لیورفیکس کے لاکھوں خریداروں کو ہمیشہ اور یقیناً برابر ملتا ہے.
خاندان بھر کی صحت و عافیت کیلئے سب کی پسند
لیورفیکس
اور پیٹ کی لاکھ بیماریوں کی ایک دوا
قیمت ایک شیشی .. ۱ ٹکیاں دو روپے
میڈیکل اور جنرل اسٹورز سے خریدیئے
نصرتی دواخانہ اینڈ نرسنگ ہوم. لارنس روڈ. کراچی ۲
LIVEF
LIVERFE
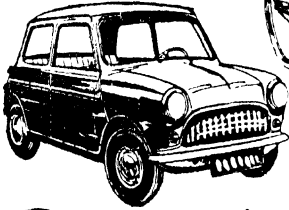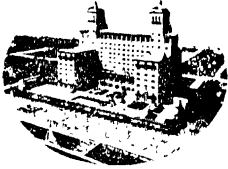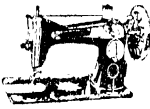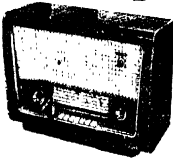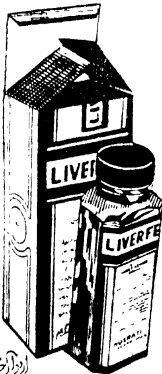
ABC
ہاتھ سے بننے کا
ہر لحاظ سے
بہترین اُون
اے۔بی۔سی
اُون کی انمول خوبیاں
★ مِتن کے ذریعہ کیڑا لگنے سے محفوظ
★ پختہ رنگ
★ دُھلنے پر سُکڑنے سے محفوظ
★ ہر طبیعت کے لئے بے شمار خوشنما رنگ
★ متفرق ضروریات کے لئے
چودہ مختلف اقسام
★ نرم اور ہلکی
ABC
hand knitting wool
Regd Trade Mark
Mothproof
MITIN
تیار کنندہ :۔ ایس۔ایم۔یوسف اینڈ برادرز
ڈی/۱۲۳۔ ایس۔آئی۔ٹی۔ای۔ کراچی
NATIONAL 281 B
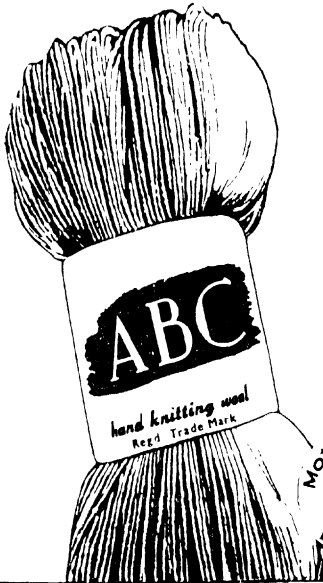
بقلم خود

- حفیظ۔ بقلم خود
- کچھ شاہنامۂ اسلام کے بارے میں
- حالی
- خودکشی
- آوارگی
- مِلمع
- حیاتِ تازہ
- افسانہ در افسانہ

حفیظ

نغمہ زار میرے شعر و سخن کا اولین مجموعہ ہے۔ اس کی پہلی کتابت سنہ ۱۹۲۴ء میں اور طباعت و اشاعت سنہ ۱۹۲۵ء میں ہوئی تھی۔ ان دنوں میں چوبیس پچیس برس کا جوان تھا۔ آج ستاون اٹھاون برس کا بوڑھا ہوں ؎

جب عشق ترانہ تھا اب عشق فسانہ ہے
وہ اور زمانہ تھا۔ یہ اور زمانہ ہے

میری اپنی نگرانی میں اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ موجودہ اشاعت کے لئے فیصلہ ہے کہ نثر میں چند سطور اپنے قلم سے بھی شامل کر دوں۔ اپنی جسمانی اور ذہنی افتاد کے پیش نظر میرا خیال ہے کہ شاید ہی آئندہ زندگی میں مجھے اس کتاب کی اور کوئی نئی اشاعت دیکھنا نصیب ہو اور ہو بھی تو غالباً ہوش و حواس اس قابل نہ رہیں کہ جو چاہوں لکھ سکوں ؎

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

اردو شاعری کو اب خرید کر پڑھنے والے کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ انگریز سے پیچھا چھڑانے کے بعد، کماد؟ لوگ جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں انگریزی کے اور بھی زیادہ تابع دار ہیں۔ ذوقِ ادب کے لحاظ سے اوپر کا طبقہ خلا ہی خلا ہے اور اس کے نقوشِ قدم پر چل کر بلندیوں تک پہنچنے کا تمنائی ہجوم اپنی اولاد تک پر اردو کا دھبا لگنے نہیں دے رہا۔ اکثر ڈرائنگ روم جھانکنے کا اتفاق ہوا کتابوں کی الماری ہوتی ضرور ہے۔ اردو کتاب شاذ ہی نظر آتی ہے۔ اس شاذ کا بھی ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ ان حسین نازنین الماریوں کے نچلے خانے میں اردو کتب کہیں کہیں اس لئے جگہ پا گئی ہیں کہ ان کے گرد و پیش قدرے دیدہ زیب اور نظر فریب ہیں اور یہ کتابیں خریدی بھی نہیں گئیں۔ اکثر و بیشتر کاروبار میں سہولت حاصل کرنے کے لئے تاجرانِ کتب کی طرف سے بطور نذر پیش کی گئی ہیں۔ الماریوں کے ان اچھوت درجوں میں رکھی ہوئی اردو مجلدات پر دست درازی نہیں کی گئی جب تک ھٰذا من فضلِ ربی کے زور سے یہ الماریاں قائم ہیں۔ یہ مطبوعات نئی نکور ہی پڑی رہیں گی تا آنکہ عمارت نو ساختہ والے ان کو نکال باہر کریں اور کباڑیوں کے ہاتھ سے یہ دل دکھے ہوئے یہ ڈھیر نسیاً منسیاً ہو جائیں۔ یہ صورت ہے ہمارے وطن کے اس حصے کی جہاں اردو کے لئے کٹ مرنے کے دعووں کے ساتھ اسے قومی زبان تسلیم کیا گیا ہے۔ اردو بولنے اور پڑھنے والے روز بروز گھٹ رہے ہیں۔ اس کے باوجود میرا ایک بھتیجا علاؤالدین مظہر جو میرے خاندان بھر میں میرے کلام میں دلچسپی لینے والا اولیں تنہا فرد ہے یقین دلاتا ہے کہ نغمہ زار کی مانگ موجود ہے اور اصرار کے ساتھ اسے نئی وضع سے چھاپ رہا ہے۔ میں مجبور ہوں چند سطور لکھ رہا ہوں

آپ نے دیکھا نثر میں ذرا سی بات کہنے پر کتنا کاغذ خرچ کرنا پڑ گیا۔ نظم ہوتی تو میرے اپنے ہی ایک شعر میں کام چل جاتا ؎

بازار نیا گاہک بھی نئے اب جنس وفا کی قدر نہیں

بے سود نمائش رہنے دے اے دل یہ مال پرانا ہے

مشکل یہ آ پڑی ہے کہ جو کچھ کہنا ہے اس کے لئے نثر ہی موزوں ہے۔ کہنے کی بات صرف اتنی ہے کہ آپ جو اس کتاب کو مطالعے کا شرف دے رہے ہیں یہ توقع نہ رکھیئے گا کہ الفاظ اوزان۔ بحور۔ ردیف قافیے میں پکڑے اور جکڑے ہوئے خیالات و احساسات کے اس مجموعے کی حیثیت بازیچۂ اطفال سے کچھ زیادہ ہوگی۔ اطفال کا بازیچہ بھی تو نہیں محض ایک طفل کے ذہنی و فکری گھروندے ہیں۔ اس ایک طفل کے جو شعر و شاعری کا کھیل میراث میں حاصل شدہ بالغ نظری کے ساتھ کھیلنے والے بزرگ نشن اطفال سے بہت دور کھیلنے پر مجبور رہا۔ تنہا اس لئے کہ میرے گھرانے۔ گلی محلے۔ شہر میں کوئی ایسا پکا کھلاڑی نہ تھا جو مجھے اس کھیل کے ضابطے سکھا دیتا۔

کتنی مختصر اور سادہ سی بات ہے کس بے تکلفی سے عرض کر دی گئی ہے لیکن چونکہ سادہ سی مختصر باتیں بالخصوص شعر کے بارے میں سمجھنے سمجھانے کے لئے کد و کاوش بھی لازمی فن بن چکا ہے۔ اس لئے میں کتاب میں درج شدہ غزلوں اور نظموں کا پس منظر آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔

دیکھئے یہ مجموعہ ہے میری غزلوں اور نظموں کا جو اردو میں ہیں اور میں ہوں خالص پنجابی۔ اور پنجابی ہونے سے شرمندہ بھی نہیں۔ اماں۔ ابا اور خاندان کے کسی رشتے سے بھی مجھے اہل زبان ہونے کا فخر حاصل نہیں۔ ولادت کا شرف اسی زمانے میں پایا جب اردو میرے ہاں ابھی میری طرح طفلی کی حالت میں تھی۔ آج کون ہے جو پچاس پچپن برس پیشتر کے پنجاب اور پنجاب کے ایک دیہاتی قصبہ جالندھر کے معاشرے کا اندازہ کر سکے جہاں پنجابیوں کے لئے اس زبان میں کسی شاعرانہ فضا۔ زبان دانوں یا اہل زبان سے اصلاح لئے بغیر شعر کہنا ہنوز دلی دور کا معاملہ تھا۔ اگرچہ فارسی کی جگہ اونچے درجوں کے لئے انگریزی اور نیچے درجوں کے لئے اردو کو دفتری زبان قرار دیا جا چکا تھا۔ اگرچہ سرکاری مدارس میں زباندانی کی نصابی کتابیں رائج کی جا چکی تھیں۔ اگرچہ لاہور میں اردو کا چرچا ترقی پر تھا لیکن میری بستی میں اس نئے سورج کی کرنیں صرف کسی خاص اونچی مٹی ہی پر چمکی ہوں گی۔ عام مسلمان۔ ہندو۔ سکھ۔ عیسائی۔ چوہڑے۔ چمار جتنے بھی جو مذہبی طور پر ایک دوسرے سے الگ لیکن معاشرتی بنت میں ایک دوسرے میں بنے اور گتھے رہتے تھے۔ سب پنجابی بولتے اور پنجابی ہی کے گیت گاتے تھے

یہ دور تھا جب مجھ پر اردو کا پہلا دورہ پڑا۔ میرا مبلغ زباندانی اردو نصاب کی پہلی دوسری کتاب کی نثر۔ ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ باپ حقہ پی رہا ہے" اور۔ مولوی صاحب کا گھوڑا پنڈت جی کی پہلی تک اور نظم سے

یہ کہتی اڑی پڑے فاختہ

ارکی چیونٹی مرحبا مرحبا!

یا شیر آیا شیر آیا دوڑنا۔ تک محدود تھا۔

میں سات برس کا تھا۔ اردو شعر کی رنگا رنگی میرے کانوں تک ابھی صرف اسی قدر آسکی تھی کہ مدرسہ آتے جاتے ایک بازار سے لازماً گزرتے ہوئے مہین سروں میں ایسے بول سننے پڑتے تھے

آیا کرو ادھر بھی مری جان کبھی کبھی

نکلیں ہمارے دل کے ارمان کبھی کبھی

اور ع یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ صورت کیوں بنی غم کی

اور ع نہ جا غیر کے گھر زمانہ برا ہے۔

ہمارے شہر میں آریہ سماج والے نگر کیرتن کیا کرتے تھے۔ ویاکھیان دیتی ہوئی دوسرے مذاہب کا کھنڈن کرتی ہوئی ہندی پنجابی بھجنوں اور گیتوں کے

ساتھ ساتھ بزبان اردو بھی کچھ ملاحیاں سناتی گاتی بجاتی ٹولیاں بازاروں میں سے گزرتیں۔ مجھے اب تک ایک بول خدا جانے کیوں یاد ہے جسے میں نے ایک دن منڈے ہوئے سر کے پیچھے اوپر سے نیچے کو لٹکی ہوئی چٹیا اور کھنچی ہوئی ٹھوڑی پر جھکی ہوئی "باجا رتما" "موچھوں" والے بھجنیک سے سنا ۔

گرو کل سے جب برہم چاری آئیں گے
مکے میں جاکے آریہ مندر بنائیں گے

مسلمان میلاد شریف کی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ بزرگ حصول ثواب اور بچے شیرینی وصول کرنے۔ ادھم مچانے اور گھر کے جانے کے موجود رہا کرتے عربی فارسی پنجابی کے ساتھ اردو نعت خوانی بھی شروع ہو گئی تھی۔ ان نعتوں کے چند مصرعے مجھے یاد ہیں

ع یہ امت تمہیں بخشوانی پڑے گی۔
ع احد سے ہو گیا احمد جو باندھا میم کا ٹیکا
ع محمد سر وحدت ہے کوئی رمز اس کی کیا جانے
اور ع نوح کا بیڑا پار لگایا کھیون ہار محمد نے

یا مشہور مناجات

تری شان ہے اکبری سروری — مری بارکیوں اب یہ راحتی کری

باتیں میری سمجھ سے بلند تھیں۔ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میرے نصاب کی نظمیں یا دوسرے موزوں بول جو سمجھ میں آئے بغیر کانوں کو بھلے لگتے تھے ان کو مجھ ایسے انسان ہی گھڑتے ہیں۔ یہ بھید مجھ پر اچانک کھلا۔ اس طرح کہ ایک دن میں مجولی لڑکوں کے ساتھ گیند بلا کھیل کر گھر پلٹ رہا تھا۔ سر راہ ایک حویلی کے صحن میں بہت لوگ جمع پائے۔ شور سن کر ہم بھی جا گھسے۔ محفل کے درمیان ایک مرد معقول "کریما بہ بخشا" کی بولی میں (جو مجھے مسجد میں رٹائی جا چکی تھی) ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ سنا رہا تھا۔ سننے والے بھی واہ۔ سبحان اللہ خوش گفتی دو غنی کہتے تھے۔ سر ہلاتے زانوؤں پر ہاتھ مارتے اور لوٹن کبوتر ہوئے جاتے تھے ۔۔۔ بے اختیار ہنسی چھوٹی۔ میں اور میرے ساتھی بیچ میدان کو دکر وہی حرکتیں کرنے لگے جو دوسرے بڑے بوڑھے کر رہے تھے لیکن فوراً چلتائے اور دھکیلائے گئے۔ جھڑپ سے میری نکسیر پھوٹ گئی مگر اس پٹائی کے باوجود ہم اپنے گھروں تک "کریما بخشا" کی ڈرستی" کی مہارانی سے باز نہ آئے۔ گھر پر والد نے سوجا ہوا منہ دیکھ کر جبر غصہ کیا ہوتا لیکن دادا آڑے آ گئے اور دادا ہی کی تقریر سے پتہ چلا کہ وہ "کریما بہ بخشا" کی بولی بولنے والا فارسی کا ایک بڑا شاعر ہے۔ جالندھر ہی کا رہنے والا ہے۔ ہمارے دوست شیخ سکندر بخش کا لڑکا ہے۔ بچپن میں سب اسے مست کہتے تھے۔ تکیں جوڑا کرتا تھا۔ اب دیوان حافظ کی ٹکر کا ہے۔ ماں باپ نے غلام قادر نام رکھا تھا گرامی خود بن گیا ہے تمہارے ماں باپ کا ہم مسجد تھا۔ اب دکن کے بادشاہ کے دربار میں رہتا ہے۔ کبھی کبھی جالندھر آتا ہے۔ بے فکرے، وکیل وکلا اور فارسی کے علما محفل جاتے ہیں۔ اس کی فارسی سن کر واہ واہ کرتے ہیں۔ دیکھا دیکھی اور لوگ بھی تکیں جوڑنے لگے مگر توبہ جی۔ کہاں راجہ بھوج کہاں گنگا تیلی۔ (دادا نے لمبی گفتگو خالص پنجابی میں فرمائی تھی جس کا بھونڈا خلاصہ میں نے اردو میں دے دیا ہے)

سندر ہے کہ یہ عرفان زیاں جو مجھے سنہ ۱۹۰۷ء میں اپنی عمر کے ساتویں برس کسی پیڑ کے تلے آنکھیں بند کر کے سمادھی لگانے سے نہیں محض ایک محفل مشاعرہ میں پہلی مرتبہ بغیر اذن جا گھسنے، سمجھ میں نہ آنے والی بولی پر داد دینے والوں کی نقل اتارنے، اور تھپڑ کھا کر پھوٹی ہوئی نکسیر لئے ہوئے نکالے جانے پر ہوا ۔۔۔ اس عرفان کے دوسرے تیسرے دن گھر کے ایک گوشے میں بیٹھے کاٹھ کی تختی مشق اور خوش خطی کی کاپی پر میری پہلی نظم منصۂ شہود پر جلوہ آرا ہوئی جسے میں دوسرے دن مدرسے لے گیا۔ ہم جماعتوں کو بڑے فخر سے سناتا ہوا پکڑا گیا۔ مولوی فتح دین سے چانٹے کھائے اور اپنی شاعری کی پہلی دادیوں پائی: اوئے کھوتیا کتھوں نقل کر لیا اِیں۔ تیرے پیو نے وی کدی شیری کیتی سی۔ (او گدھے کہاں سے نقل کر لایا ہے۔ کیا تیرے باپ نے بھی کبھی شاعری کی تھی۔)

یہ نظم اردو نصاب کی اکثر نظموں کی طرز پر اچھی خاصی لمبی تھی اور اس میں وہ تمام خیالات و جذبات تھے جو میری طفلی نے اب تک اخذ کئے تھے۔ نظم چند ہی دن میں گم ہوگئی۔ مزید لکھنے کا شوق بھی پٹائی کے خوف سے دم سادھ گیا۔ صرف دو بیت یاد ہیں۔ الفاظ غلط سلط ہیں تو کیا ہوا۔ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے میری منزل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

محمدؐ کی کشتی میں ہوں گا سوار — تو لگ جائے گا میرا بیڑا بھی پار

محمدؐ حفیظ نے بنائی غزل — خدا کا ہے اس وقت اس پر فضل

سات برس کی عمر میں یہ خیالات اور ان کے اظہار کے لئے اردو لفظوں آموجود ہوئی۔ ان امور پر اس عہد کے بسرے معاشرے میں پنجاب کے مسلمانوں کی نفسیات سے باخبر نقاد کے سوا کون روشنی ڈال سکتا ہے۔ میں تو واقعے کے بیان پر اکتفا کرتا ہوا آگے بڑھتا ہوں۔ چار پانچ سال تک شعر گوئی نے بہ خوف سرزنش سر نہ اٹھایا۔ البتہ نظم ہو یا نثر جو کچھ ہاتھ میں آیا سمجھ میں آئے نہ آئے میں اسے پی جانے لگا۔ میلوں ٹھیلوں اور شادی بیاہ کی تقریبوں پر دوسرے قصبات میں بھی جانا ہوتا تھا۔ میں نے چھپی ہوئی اردو کہاں کہاں سے کس کس طرح حاصل کی یہ کہانی طویل ہے۔ مختصر یہ کہ پڑیاں باندھنے والے کاغذ تک کو بغیر پڑھے نہ چھوڑا — کہیں سے ایک پھٹی ہوئی جلد طلسم ہوشربا مل گئی۔ چھپا کر چھتی لایا۔ مدرسے کا سبق پڑھنا پڑھانا خیال سے کھسکا۔ بستے میں باندھ کر گھر سے اسکول کے لئے نکلتا اور ایک تالاب کے کنارے امیر حمزہ کے کارنامے اور عمر عیار کی عیاریاں پڑھا کرتا۔ اس دفتر بے پایاں کی اور جلدیں بھی گھر سے پیسے چرا کر منگائیں۔ مسدس حالی مل گئی تھی۔ پڑھتا اور خوامخواہ روتا۔ اسکول میں اردو کے سوا سب مضامین میں صفر ہوتے چلے جانے کے سبب پٹتا۔ غیر حاضری کا پتہ چلنے پر ابا۔ اماں کے ہاتھوں مرمت ہوتی۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں چھٹی جماعت میں تھا کہ عشق کا پہلا اور شعر گوئی کا دوسرا وار مجھ پر ہوا — اب سنبھل نہ سکا۔ بت ہرجائی پر بس نہیں چلا۔ اپنی جان پر اور غزل پر مشق ستم جاری ہوئی۔ اصلاح کے لئے جالندھر میں اپنے سے بہتر نہ پایا۔ دیوان داغ اور دیوان مینائی حاصل کئے گئے — گھر کی جمع جتھا اڑا کر لا ہور امرتسر ہی نہیں۔ دہلی۔ میرٹھ۔ مراد آباد بلکہ بمبئی تک بھاگ دوڑ شروع ہوگئی۔ اکثر رستے بدستے پلٹتا چلتا ہوا مدرسے کی سمت چلتا نظر آتا۔ آخر بھاگ جانا غالب آگیا ساتویں کا امتحان دے کر نتیجہ سننے نہیں گیا۔ سنا ہے پاس ہوگیا تھا۔!

" بے استاد کہلانے کے خوف سے استاد پکڑنا ضروری تھا — حضرت گرامی کا پتہ دریافت کرکے دو غزلیں طفلانہ درخواست کے ساتھ دکن ارسال کیں۔ جواب آیا۔ گرامی فارسی کا شاعر ہے۔ اردو سے بہرہ ور نہیں۔ حفیظ گرامی کے وطن کا جوہر قابل معلوم ہوتا ہے۔ حفیظ کو چاہیئے کہ اپنا کلام اپنی ہی ناقدانہ نظر سے بار بار دیکھے۔ استادی۔ شاگردی کے پھیر میں نہ پڑے "

میں نے اس ارشاد پر عمل کیا (اب تک کر رہا ہوں) آب حیات کا ایک نسخہ لاہور سے خرید منگوایا۔ بار بار پڑھا۔ کچھ اور شاعر بھی پڑھے۔ چند دوستوں سے مل کر جالندھر میں اردو مشاعرے کی بزم قائم کی۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ جناب کبیر خان رسا اور غازی آباد میں مدرس رہ چکنے والے سید محمد آزر بھی شامل ہوا کرتے میاں محمد جان کی حویلی میں مشاعرے ہوتے۔ لدھیانہ سے خیاؔمی ہریانوی۔ کپورتھلہ سے مسرور صاحب آتے۔ اپنے والد رنجور تلمیذ داغ کا کلام بھی سنانے میں اب کسی کا شاگرد ہونے کے بجائے اب جالندھر میں بہتوں کا بھلا کرنے کے لئے استاد بن گیا تھا اسکول کے چند طالب علم اصلاح لیا کرتے۔ مولوی اصغر علی احسن ایم اے (مرحوم) اور مولوی فخر الدین ناطقؔ (مرحوم) مجھے کلام دکھائے بغیر مشاعرے میں نہ سناتے۔

پہلی جنگ عظیم جاری تھی۔ لاہور سے اردو اخبار آنے لگے تھے۔ میرے والد ایک اخبار وطن منگانے لگے۔ ارگرد کے لوگ بیٹھ کر پڑھتے اور سنتے اور انگریزوں کے خلاف گپ ہانکتے۔ پاداش میں گندھک اور قلمی شورے کے فروخت کے لائسنس اور ہزاروں کا مال بھی ضبط ہوگیا۔ پولیس اور فوج میں وردیوں کے ٹھیکے بھی منسوخ ہوگئے۔ ہیضہ پلیگ سے میرے بھائیوں بہنوں کی جوانا مرگیاں۔ گھر میں بیوہ بہنوں اور بھاوجوں کی بے چارگیاں اب یہ ضرب کاری —! والد شکستہ۔ گھرانا برباد لیکن میں قافیہ ردیف کی دنیا میں آباد۔

یہ نہیں کہ مجھے کھانے ساتھ کمانے کا احساس نہ تھا لیکن ساتویں جماعت تک تعلیم کمسنی اور ردیف و قافیہ ملازمت کے سفارشی نہ بنے۔ تجارت کی سوجھی ایک دادی اماں کا دم جس نے متبنّیٰ بنا رکھا تھا، آخری زیور فروخت کیا۔ عطر اور خوشبویات کی دکان کھولی۔ جو عشق و محبت کی دکان ثابت ہوئی۔ اصلاح لینے والوں کا ہجوم اور شاعروں کا جمگھٹ رہنے لگا۔ رنگ رنگ کے حسین صورت لوگ عطر اور لونڈر کی قیمتی شیشیاں مسکرا مسکرا کر اٹھا لے جانے لگے۔ گرمی بازار ایسی بڑھی کہ دکان بڑھانی پڑی۔ میری اس دکان کے آخری دنوں کی یادگار "پنڈت ہری چند شرما اختر" ہیں جن کی جنم پتری میں پروہتوں نے مجھ سے اصلاح سخن لینے کے بہانے میرا دوست اور میری سیر بننا لکھ دیا تھا۔

دکان اجڑ گئی۔ اپنے پرائے سب مجھ سے مایوس ہو گئے لیکن میری ماں کو نہ جانے کیوں میرا علاج سوجھ گیا اس نے مجھے میری خالہ کی لڑکی سے بیاہ دیا اور شادی کے تیسرے دن میرے والد نے نئی دلہن سمیت مجھے گھر سے نکال دیا۔ میں والدہ۔ دو سگی بہنوں اور اپنی دلہن کو ساتھ لے کر کرایے کے مکان میں اٹھ گیا اور اسی دن سے شاعری کے ساتھ روزی کمانے کی دھن بھی لگ گئی۔ میری ماں نے مجھے احساس ذمہ داری کے کھونٹے سے باندھ دیا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن ہے کہ برابر معیشت کی چکی پیس رہا ہوں۔

میں جسمانی محنت مزدوری میں لگا ہوا تھا کہ شہر میں ایک دنگل ہوا۔ کمشنری جالندھر کے پانچ ضلعوں سے شاعر کشتی لڑنے آئے۔ آریہ اینگلو ورنیکلر اسکول کے ماسٹر گوپال داس کی انگیخت پر طرحی غزل اور متعین مضمون پر ایک نظم راتوں رات میں نے لکھی — ماسٹر جی مجھے میرے گھر سے اپنے ساتھ دنگل میں لے گئے۔ بھاری بھرکم شاعروں کے مقابلے میں اکھاڑے اندر اترتے وقت میری عمر اور وضع پر سب ہنسے لیکن میں "فسانہ آزاد" کا صف شکن بٹیر ثابت ہوا۔ اول انعام سونے کا تمغہ دوسرا انعام سو روپے دونوں مجھی کو مل گئے۔ گوپال داس جی کی قیادت میں پنڈت ہری چند کے ساتھی طلبہ مجھے کندھوں پر اٹھا کر شہر کے بازاروں میں دہائی دیتے پھرے

اب میں تمغہ یافتہ شاعر ہو گیا مگر شاعر برادری بے استاد کہتی تھی۔ خوش قسمتی سے حضرت گرامی دربار دکن سے وظیفہ لے کر وطن میں آ گئے اور میں غازی رحمت اللہ و حمید جالندھری مالک کتب کارواں کے مرحوم ماموجان کی معیت میں مٹھائی اور پیازی رنگ کی ایک پگڑی پر پانچ روپے رکھ کر ملک الشعراء فارسی کے حضور دو زانو ہوا۔ اب "بے استاد" نہ رہا۔ مرحوم اصلاح کی بجائے شعر کو سہل ممتنع بنانے اور بار بار غور کرنے پر زور دیتے رہے — فرماتے، میاں تقلید نہ کرو اپنی ذات کو باہر لاؤ۔

جنگ ختم ہو گئی۔ خلافت اور کانگرس کا زور ہوا۔ میں نے ایک نظم ڈاکٹر سیف الدین صاحب کچلو کی فرمائش پر جالندھر کے ایک بہت بڑے جلسے میں پڑھ ڈالی تیسرے دن امرتسر میں جلیاں والے باغ کا سانحہ پیش آیا۔ یہاں بھی پکڑ دھکڑ ہوئی۔ پولیس نے مجھے تین دن حوالات میں رکھ کر کمسنی اور شاعری کے الزام میں چھوڑ دیا ؎

محشر والوں نے بھی مجھ کو شاعر کہہ کر چھوڑ دیا

میری فرد عمل کو سمجھے مجموعہ افسانوں کا

تنگ دستی کے سبب سنگر مشین بیچنے کی نوکری کر لی۔ اوکاڑہ چلا گیا۔ منٹگمری قریب تھا وہاں مشاعرے ہوتے تھے میں بھی سو کام چھوڑ کر پہنچتا۔ یہیں پہلی ملاقات جناب نشتر جالندھری سے ہوئی۔ وہ منٹگمری میں گوروں کو ہندوستانی پڑھاتے تھے۔ مشاعروں میں تھلی بجی غزلوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر اقبال اور آغا شاعر لکھنوی کے کلام پر لکھی ہوئی تنقیدوں سے ہم نو مشقوں کو مرعوب کیا کرتے تھے۔ لاہور سسرال ہونے کی وجہ سے آنا جانا رہتا۔ ایک مشترک دوست قیام گاہ پلیزنٹ ہاؤس پر جناب سالک بٹالوی سے نیاز کا شرف ملا۔ وہ پھول اور تہذیب نسواں سے منسلک تھے۔ اس وقت ایک شمع کے دو پروانوں کی مت بھیڑ تھی مقابلے میں ڈٹ رہنے کے لئے میں نے دو تین غزلیں سنائیں۔ اس طرح دیرپا مراسم کی داغ بیل پڑ گئی۔ بقول داغ ؎

تم سے تو کوئی واسطہ نہ رہا

اب طبیعت رقیب پر آئی

سید امتیاز علی تاج کی ادارت میں بہ تعاون سالک صاحب ایک ادبی رسالہ کہکشاں نکلتا تھا۔ میں نے اسے ادا کارہ میں اپنے نام جاری کرالیا۔ یہ بہترین صحیفہ تھا مگر افسوس جلد بند ہوگیا۔ سالک صاحب کو حضرت مولانا ظفر علی خان نے زمیندار کے لئے چن لیا تعلقِ شعر کے شوق نے مشین سے بہت جلد بے دل کردیا۔ نوکری چھوڑ دی۔ جالندھر سے ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کی دھن سمائی۔ مرحوم دادی اماں سے وراثت میں ملے ہوئے مکانوں میں سے ایک پہلے سے گروی کردیا۔

گرامی صاحب سے حکیم اجمل خان (مرحوم) مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم و مغفور کے نام تعارفی چھٹیاں لے کر دہلی لکھنؤ اور شعر و ادب کے دوسرے مراکز میں مشاہیر سے تعاون حاصل کرنے نکلا۔ مضامین اور وعدوں کے بوجھ سے لدا ہوا پلٹا لاہور علامہ اقبال کی خدمت میں حضرت گرامی کی سفارش لے کر گیا۔ سرور مشرق جناب چغتائی سے بھی شناسائی ہوئی۔ میرے لنگوٹیے دوست چودھری سلطان علی کھوسٹ جو ان دنوں میو اسکول آف آرٹس میں مصوری سیکھتے تھے وسیلہ بنے۔

مارچ سنہ ۱۹۲۱ء میں رسالہ اعجاز جالندھر سے جاری ہوگیا لیکن ایک مہمان شاعر پنڈت سوہانوی جو میری امداد کو آئے تھے۔ میرے صندوقچے کو ردی کی کتاصت سے پاک صاف کر کے غائب ہوگئے اس لئے اعجاز نے تین مہینے کے بعد دم توڑ دیا تاہم میرے دم میں یہ اعجاز ہی تھا لیکن کہ اس کے طفیل مجھے بہت سے مشاہیر اردو حضرات شرر۔ سفی۔ عزیز۔ یگانہ۔ شوق قدوائی۔ ہوش بلگرامی۔ اثر۔ جگر۔ جوش۔ بیخود۔ ناصر۔ نذیر۔ فراق کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

مکان کا گروی رکھنا کب تک مخفی رہتا۔ والد نے میری بیوی اور شیر خوار بچی ـــــ کے سامنے میرے سر کو جوتوں سے نوازا اور میری والدہ کو شوہریت کے دعوے سے واپس گھر لے گئے۔ اب کے بہت شرم آئی۔ اپنی بیوی کو اس کے میکے میں لاہور چھوڑ کر پیدل کشمیر چلا گیا۔ وہاں حکیم فیروز طغرائی مل گئے۔ چند روز غزل خوانیاں رہیں۔ جیب خالی مگر نگاہ حسن فطرت سے لبریز۔ لاہور آیا۔ فاخرہ بانوی جو میری شاگردی کا دم بھرتے تھے اور جالندھر سے آکر یہاں کالج کے طالب علم تھے۔ ایک مشاعرے میں لے گئے۔ لاہور میں شعر سنانے کے خیال سے مجھ پر کپکپی طاری تھی۔ پروفیسر اور ایڈیٹر شاعروں کا مجھ پر بڑا رعب تھا۔
صدر میلارام اور ان کے ساتھ ایک بہت بڑے شاعر تشریف فرما تھے۔ مجھے عین پیچھے سٹیج پر جگہ ملی سامنے زیادہ تر کالجوں کے طلبہ تھے۔ اردو کے پنجابی نو مشقوں میں میرا نام بھی پکارا گیا۔ جی کڑا کر کے ایک غزل۔ تحت اللفظ سنائی اور سٹیج پر دبک گیا۔ ایک اور ایک اور کا شور ہوا۔ میں نے ان بڑے شاعر صاحب کو یہ فقرہ دفعتاً کے کان میں کہتے سنا۔ "چھا گیا ہے" یہ ایک نامور شاعر کی داد سخن تھی۔ مجھ پر چھایا ہوا سارا رعب اتر گیا۔ دل نے کہا۔ "حفیظ یہ لوگ تو کچھ بھی نہیں ہیں ـــ"

گالی کے ساتھ۔ "چھا جانے کی داد" مجھے وہیں ختم کر دیتی اگر شیخ عبدالقادر صاحب، حکیم احمد شجاع اور جناب چغتائی ایسے مربی شروع ہی میں نہ مل جاتے۔ سید امتیاز علی تاج حضرت سالک و مہر۔ نشتر و دلکش مجھے بزم خاصان ادب کا رکن نہ بنا لیتے۔ سید احمد شاہ بخاری پطرس اور ان کے برادر خرد ذوالفقار علی بخاری میرے یاران دلنواز نہ بنتے۔ ان سب کا مذاق سخن حوصلہ افزائی اور نقادانہ نگاہ میری ترقی کا باعث ہے

ان مراسم کے بعد میں نے اپنے دل سے پوچھا۔ کیا مشاعرے پر محض پرانی غزل سے چھا جانا کافی ہے؟" دل نے کہا ہرگز نہیں اب تو سخن فہموں میں باریاب ہوگیا ہے اب "کچھ اور چاہیئے وسعت" "ترے بیان کے لئے۔ گرامی کی تلقین یاد آئی۔ تقلید نہ کرا پنی ذات کو باہر نکال"

سوگوار، منمناتی اور بسورتی ہوئی بے ثبات ترسودگی کے بجائے میں نے شگفتگی کو اپنا فن بنانے کی ٹھانی۔ لاہور میں جم گیا۔ شباب اردو۔ ہزار داستان۔ نونہال تہذیب نسواں اور پھول کے علاوہ بہت سے اور اداروں میں قلم کی چکی پیستا ہوا میں ارباب علم کے مشاعروں اور لاہور کے سخن سنج فہم حلقوں میں در آیا۔ "ابھی تو میں جوان ہوں" اور "پکڑیو جانے نہ دیجیو" کا شور اٹھا اس لئے کہ ان دنوں زندہ دلی کی اس سرزمین پر "آشیاں جلتا رہا ہم ناتواں دیکھا کئے" کا تسلط تھا اور جب تک ناتواں دیکھا کئے" والوں کی غلامی کا حلقہ کان میں نہ ڈال لے۔ پنجاب کا کوئی اردو شاعر یا ادیب ملک کے شہر سخن کا معزز شہری کہلانے کا حق دار نہ تھا۔ (باقی صفحہ ۲۶۲ پر)

حفیظ

بقلمِ خود

نغمہ زار کے تیسرے ایڈیشن میں کوئی پچپن برس پیشتر اپنے وطن جالندھر کے خالص پنجابی معاشرے کا حال بیان کر چکا ہوں۔ [illegible] اردو زبان پر اپنے [illegible] کی مشقِ طفلانہ کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے۔

آج سوز و ساز میں "حسبِ وعدہ" یہ کہنا ہے کہ جب میں گیارہ بارہ برس کی عمر سے اکیس برس تک کی مشقِ غزل جھولی میں ڈالے دیہاتی قصباتی مشاعروں میں بڑے بوڑھے پنجابیوں سے واہ بھئی منڈیا واہ (واہ رے لڑکے واہ) سنتا اور دلدہی کے پھول چنتا ہوا اپنی غلط روی سے اس دور کے شہرِ سخن لاہور میں داخل ہوا تو لیجیو۔ پکڑیو۔ جانے نہ دیجیو کا شور اٹھا اس لئے کہ میرے کان میں کسی استاد یا جانشین استاد کی غلامی کا حلقہ نہ تھا۔ معززو معتبر نہ تھی۔ کشورِ سخن وری کے ایک عام شہری کا حق حاصل کرنے کے لئے جو جد و جہد مجھے کرنی پڑی اگر میں بہ ہوش و حواس ذرا فرصت سے زندہ رہا تو اپنی حیات خود لکھنے کی تمنا رکھتا ہوں یہاں صرف اس پس منظر کی ایک جھلک دکھا رہا ہوں جس سے میری موت کے بعد میرے فن پر حکم لگانے والے بالغ نظر نقادانِ فن محض قیاس و ظن سے کام لینے کی مصیبت سے بچ جائیں گے۔

بہت سے شاہدانِ عادل تو چل بسے ——— باقی میری طرح پا بہ رکاب ہیں میرے دورِ شعر کے چشم دید واقعات کون بیان کرے گا۔ کس کو فرصت ملے گی ——— لہٰذا اپنی صلیب آپ ہی اٹھائے ہوئے ہوں۔

انتہائی طور پر مختصر چند متعین صفحوں کے اندر محدود نفسوں، لکیروں، سطروں کے ناپ تول گنتی شمار کے ساتھ آپ بیتی لکھنا کوئی آسان بات نہیں ——— خصوصاً اپنے ہم عصروں کی زندگی میں خود زندہ رہتے ہوئے ایسی باتیں لکھنا بہت مشکل ہیں جن میں دوسروں کے مقابل اپنی کامیابی کا پہلو بھی نمایاں ہو! میں کہ اکثر و بیشتر نظم ہی کے ذریعے اظہارِ خیال کرتا رہا یہاں ایسے واقعات کی طرف نثر کے ذریعے اشارہ کر رہا ہوں جن کا تعلق شاعرانہ تخیلات و تصورات کی کہانی سناتے وقت ایسے افراد سے ہے جن کی حسیات دوسرے انسانوں سے زیادہ ذکی ہیں اور جن کے مزاج کی شعلگی کے پیشِ نظر معصوم ——— سی معصوم لغزشِ قلم سے بھی انتہائی احتیاط لازم ہے۔

سخن وری کے چوگان میں جتھا بندی۔ صف آرائی۔ سازش۔ حیلہ و ترکیب، اکھاڑ پچھاڑ افسانہ نہیں حقیقت ہیں۔ میں نے شاعروں کی نبرد آزمائی اور ایک دوسرے کے خلاف لام بندی کے قصے آزاد کی "آبِ حیات" میں پڑھے تو تھے لیکن یہ گمان تک نہ تھا کہ اپنی آنکھوں سے نہ صرف یہ دنگل دیکھوں گا بلکہ "ہل من مبارز" کہنے والے مجھے بھی گھسیٹ لیں گے۔ میں تو شعر و شاعری کو دل لگی سمجھا تھا لیکن یہ دل کی لگی بن گئی۔ بڑی سخت پٹائی کے بعد "مار کھائی حکمت آئی" پتہ چلا کہ سیاسی مذہبی، ملکی، ملی معاملات پر جدال و قتال کی خاطر میدان میں اترنے والے قسمت آزماؤں کی نسبت زبان و بیان کے لندھور

بن سعد ان فتح و شکست کے بارے میں بہت زیادہ سریع الحس ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ سائیکالوجی والے جانیں لیکن ایسا ہے۔

اور مجھے ــــــ حدِ ادب کو ملحوظ رکھنا ہے۔ میری زندگی کا کھیل ابھی الجھا ہوا ہے۔ مجھے اس بڑھاپے میں "نوسکھوں" کے دھول بیٹھ موں سے بھی بچنا ہے ؎

وہ اور تھے جو عشق کو اک کھیل جان کر
کھیلے بھی اور چل بھی دیئے جیت ہار کے

کھیلنا ہی نہیں۔ کھیلتے چلے جانے کے ساتھ کھیلی ہوئی بازیوں کا حساب بھی چکانا ہے۔ اپنے مربیوں کا شکر اپنے مقابل معرکہ آرائی کا ذکر ان کا بھی جو تشریف لے جا چکے اور ان کا بھی جو اب قطعاً استاد ہو چکے ہیں اور اپنے پٹھوں کو بگلا پکڑنے کے داؤ پیچ بتا رہے ہیں۔

لیکن یہ سب کچھ ان صفحات میں نہیں سما سکتا۔ اس کے لئے آپ کو میری درازیٔ عمر کی دعا کرنی پڑیگی۔ یہاں تو چند مختصر باتوں کے بعد مختصر ہو جاؤنگا شبِ فردا کے لئے چھوڑی ہوئی یہ داستان گذشتہ سے یوں پیوستہ ہے کہ میں سنہ ۱۹۲۱ء میں لاہور میں نہ تو قیام کے لئے آیا تھا نہ سخن وری اور شاعری کے لئے۔ مجھے تو اس عادتِ بد" کے ہاتھوں اپنوں کی آہیں ناکارہ بیگانوں کی نگاہیں آوارہ قرار دے چکی تھیں۔ اپنی املاک اور جمع جتھا کو میری دست برد سے محفوظ رکھنے کے لئے شاعری پر کامیابی کی تہمت رکھ کر گھر والوں نے مجھے جالندھر سے نکال دیا تھا۔ لاہور میں میری بیوی کا میکہ تھا۔ بیوی اور شیر خوار بچی کو چند روز ان کے سر ڈال کر اپنی تعلیم کے بل پر کہیں دور ریل کی دیہاتی پٹڑی پر ایک پھاٹک کھولنے بند کرنے کی نوکری فرمانے کا ارادہ تھا۔ ایک چھوٹے سے کوٹھے "کوارٹر" پر قناعت کر لینا۔ ایک بکری دو تین مرغیاں پال لینا۔ سارا دن بکائن نیم یا شیشم کی چھاؤں تلے مونج کی چارپائی پر بیٹھے لیٹے حقہ سے ہمدمی کا دم بھرنا اور "بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کا درد ادر" آیا کرو ادھر بھی مری جاں کبھی کبھی" کے تتبع میں فکرِ سخن کرنا۔ یہ تھی دھن۔

مگر پہلی ہی لب کشائی پر "ــــــ زادہ چھا گیا" کی استادانہ داد اور پھر ہر تیسرے چوتھے دن کسی نہ کسی کالج کے مشاعرے کسی کنسرٹ کی واہ واہ نے ایسا نشہ چڑھا دیا کہ ریل کی پٹڑی۔ پھاٹک، بکری، بکائن نیم اور شیشم تلے مونج کی چارپائی۔ ساتھ ہی حقہ و قدسب غائب اور بندہ لاہور میں حاضر رہ گیا۔

والدین کا نالائق بیٹا تو ثابت ہو ہی چکا تھا اب سسرال کا نکھٹو داماد بننے ہی والا تھا کہ میری شرمِ دامنگیر کی نوشتہ تقدیر نے لاج رکھ لی۔ جس شاعری نے مشکل میں ڈالا تھا اسی کو مشکل کشائی کا حکم ملا۔ ایک نعتیہ مشاعرہ اندرون بھاٹی دروازہ زیرِ صدارت خان احمد حسین خان (مشہور ناولسٹ) مالک و مدیر "شباب اردو" منعقد ہوا۔ مصرع طرح پر میری سادی سی نعت کچھ زیادہ ہی پسند کی گئی اور میں ساٹھ روپے ماہوار کے "وعدے" پر دوسرے روز "شباب اردو" کا نائب مدیر بن گیا۔ وعدہ اس لیے لکھا گیا ہے کہ یہ وعدہ ہی تھا۔

یہ خبر سسرال آکر میں نے اس طرح سنائی جیسے پنجاب کا لفٹنٹ گورنر بن گیا ہوں۔

اب ہر صبح آٹھ بجے انارکلی سے پیدل چلتا۔ مسجد شاہ محمد غوث کے مقابل بالا خانے پر "شباب اردو" کے دفتر پہونچتا۔ صبح نو بجے سے چار پانچ بجے تک مسودوں کی اصلاح بلکہ از سرِ نو تشکیل و تکمیل۔ کتابت اور پروفوں کی تصحیح کے علاوہ خریداروں کے پتے بھی چٹوں پر لکھتا۔ خان صاحب کوئی مصرع دیتے غزل کہہ دیتا کوئی موضوع بتاتے مضمون دھر گھسیٹتا۔ میری یہ تحریریں "شباب اردو" کے صفحوں پر کسی ایسے خریدار کے نام سے شائع ہوتیں جو اپنا نام شاعر یا مضمون نگار کی صورت میں دیکھنے کے لئے "خان صاحب" کو کچھ نقد نذرانہ پیش کر چکے ہوتے۔ نیز میرا کام یہ بھی تھا کہ بہت سے قرض خواہوں کو دھتا بتا دیا کروں۔ "شباب اردو" کے رنگین ٹائیٹل پر اپنا نام "نائب ایڈیٹر" دیکھ کر پھولا نہ سماتا تھا

ان دنوں دوپہر کو بھوک بھی لگتی تھی۔ سامنے کبابی تھا۔ ایک آنے کا نان ایک آنے کے دو کباب۔ مولی پیاز کا تراشا املی کے زلال میں سینچا ہوا اور دفتر کے پھپھوندی لگے ہوئے گھڑے کا پانی، دو نوں مفت۔ "ریڈ لیمپ" سگریٹ ایک پیسے میں چھ ملتے تھے۔ چار پانچ بجے یہاں سے نکلتا۔ پنڈت ہری چند سے ملنے مشن کالج کے مولچند ہوسٹل پہنچتا۔ پنڈت نہ ہوتا تو اس کے بند کمرے کے سامنے ایک بے ادوائن چھلنگے میں جھولتا۔ دو چار شعر، ایک آدھ غزل برآمد

کرلیتا۔ پنڈت کا ایک دوست دیوی دیال جو گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ ڈیمانسٹریٹر تھا، آجاتا۔ کھوسٹ بھی دوسرے تیسرے مل جاتا۔ ہم کبھی انار کلی کبھی مال روڈ کبھی اندرون شہر مٹرگشت کیا کرتے۔ کھوسٹ لوگوں کو چھیڑ کر ہمیں بھی گالیاں کھلواتا۔ ہم قہقہے لگاتے، بھاگ نکلتے۔ جالندھر کے چند اور بھی پرانے یار دوست اب کالجوں میں آ چکے تھے۔ فاخر لدھیانوی، ارشاد احمد خاں۔ عطاء الرحمن ممتاز میرے "شاگردانِ رشید" بنے ہوئے تھے۔ صاحبزادہ ابونعیم عبدالحکیم نشتر اس وقت بھی ایک پختہ شاعر اور ناقد تھے۔ منٹگمری سے انگریزوں کی اردو پڑھائی ختم کر کے اب تصنیف و تالیف کے شعبوں کو تنقید اور اصلاح سے فیض یاب کرنے کے لئے یہاں وارد تھے۔ مرتضیٰ احمد خاں میکش بھی یہاں اعلیٰ تعلیم کے لئے موجود تھے۔ ان کے توسّل سے مولانا غلام علی رسول مہر سے تعارف ہو گیا جو حضرت مولانا ظفر علی خان اور سالک صاحب کے قید فرنگ میں چلے جانے کے بعد سے زمیندار کے مدیر اعلیٰ تھے۔

حکیم فقیر محمد چشتی جو اگرچہ تھے تو پنجابی لیکن دہلی کی اردو اور اس کی رنگارنگی پر استادانہ عبور رکھتے تھے۔ مجھ پر نہ جانے کیوں شفقت فرمانے لگے۔ حکیم احمد شجاع صاحب سے بھی ان ہی دنوں نیاز حاصل ہوا۔ ساتھ ہی مولانا سہا سے بھی جو قدیس ہونے کے گر فن میں اس زمانے کے جن تھے۔ حکیم صاحب نے ہزار داستان اور نونہال کے علاوہ دارالاشاعت ادب لطیف قائم فرما کر افسانہ و ادب کا ایک بلند معیار قائم کر رکھا تھا۔ مولانا سہا ان سے منسلک تھے۔ سید عابد علی عابد سے بھی ان ہی دنوں شناسائی ہوئی۔ وہ مجھے شباب کے دفتر میں اپنا لکھا ہوا تازہ طبع شدہ ڈراما برائے تبصرہ عطا فرمانے آئے تھے۔ قبول صورت اور شگفتہ مزاج تھے منشی فاضل کا مرحلہ طے کر کے آگے بڑھ رہے تھے۔ اثر صہبائی صاحب کا تعارف بھی انہی دنوں مشاعروں میں ہوا جو شاید وکالت کے طالب علم تھے۔

علامہ اقبال کے حضور تو حضرت گرامی کے سبب پہلے ہی سے باریابی تھی۔ جناب عبدالرحمن چغتائی سے بھی پہلے کا نیاز حاصل تھا۔ البتہ شیخ عبدالقادر صاحب سے رسم نیاز مندی ایک مشاعرے میں ہوئی۔ جو ایس پی ایس کے ہال میں شیخ صاحب کی صدارت میں انجمن ارباب علم کی جانب سے ہر ماہ ہوا کرتا تھا جس میں حضرت علامہ اقبال کے سوا سبھی نامی نامور" شعرا شریک ہوتے تھے۔ یہ انجمن مولانا (جو علامہ کہلاتے تھے) تاجور نجیب آبادی کے دامن سے وابستہ اور ایسے اہل زبان شعرا اور ان کے چند بے زبان پنجابی ہندو مسلمان اور سکھ شاگردوں اور چند سخن سازی و ادب نوازی کرنے والوں پر مشتمل تھی۔ جسٹس شیخ عبدالقادر کا نام نامی اردو کے مبلغ اعظم ہونے کی وجہ سے بطور صدر استعمال ہوا کرتا تھا اس لئے مقتدر حکام اور اہل ثروت ہر لحاظ سے بڑے آدمی سب اس کے سرپرست تھے محکمہ تعلیم کے افسروں کے ذریعے کتب فروشی کرنے والوں کی بھی مدد حاصل تھی لہٰذا لاہور میں بجنوری استادی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ پنجاب کے اردو لکھنے والے حوصلہ افزائی کے لئے انجمن کے محتاج تھے۔ اس کے مشاعروں میں مجھے بھی حاضری کی دعوت ملی اور میں کیوں نہ حاضر ہوتا انجمن ارباب علم ایک خانہ باغ تھا جو رنگارنگ کے بڑے چھوٹے گملوں کے اندر کاشتہ پودوں سے پر بہار تھا جس کو مولانا تاجور بطور ہیڈ مالی اور ان کے لگے بندھے نائب مالیوں کی صورت میں سینچتے اور کانٹ چھانٹ کے ساتھ دیدہ زیب و منظر فریب بنائے رکھتے تھے۔ لاہور میں آئے ہوئے اہل زبان اور پنجابی بے زبان حوصلہ افزائی اور سخن سرائی کے لئے مولانا اور ان کے جتھے کے محتاج تھے۔

بس ایک میں تھا کہ اپنی حوصلہ افزائی آپ خود ہی کر رہا تھا۔ میری صورت حال یہ تھی کہ میں کسی گملے میں نہیں ایک کنارے خالی زمین پر "بس یونہی" خود بخود اگ آیا تھا، اگ ہی نہیں آیا تھا پھیل بھی رہا تھا۔ لہٰذا گملوں میں پھولنے والے پودوں کو میری چھاؤں سے بچانے کے لئے مجھے اکھاڑ پھینکنا لازم گردانا گیا یہ اکھاڑ پچھاڑ مشاعروں سے نکل کر اخباروں، حکومت اور کونسلوں تک پہونچی۔ ہیڈ مالی اور اس کے نائب آج موجود نہیں ہیں اور جو ہیں وہ آریاں کلہاڑے چلا کر تھک چکے ہیں لیکن میرا سمندِ شوق اگرچہ درماندہ ہے مگر ان کے تازیانہ ہائے ناز کا تہ دل سے ممنون احسان ہے اور رہے گا۔ اکھاڑ پھینکنے کاٹ ڈالنے کی کوششیں ہی تھیں جن کے خوف نے مجھے اپنے ننھے سے ناتراشیدہ کندۂ فن کو بنانے سنوارنے پر آمادہ اور بلا شرکت غیرے اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کا دلدادہ بنا دیا۔

میرا ان سے کوئی ذاتی جھگڑا ہو ہی نہیں سکتا تھا وہ عالم فاضل، ایڈیٹر، پروفیسر، وکیل وکلاء، جتھا بند اور یوں بھی "مردانِ معتبر" ـــــ میں تھا ہی کیا۔؟ ساتویں جماعت سے بھاگا ہوا ایک متعنی، کمزور سوکھا ساکھا بے حیثیت کم مایہ پنجابی قصباتی۔ میری شعر گوئی، غزل خوانی کی لن ترانی مجہولیت کی نشانی تھی۔ میرا

دوسرے ... شباب سے مفارقت ہوئی۔ وجہ یہ ہوئی کہ مرتضیٰ احمد خاں میکش اور ان کے ایک اور دوست ڈاکٹر ابراہیم ادہم بھی ... اسلامیہ کالج میں بیٹھے شعر بازی کر رہے تھے۔ یہ ایک چودھری محمد علی (جو ان دنوں ایف اے ... کر چکے تھے اور پاکستان کے سکرٹری ... وزیرِ خزانہ اور وزیرِ اعظم ... رہ چکے ہیں) ... کے تفننِ طبع سے ذرا مزے میں جو آئے تو دوسرے ہی دن ... کشمیر کی سیاحت کو چل کھڑے ہوئے۔ ... کے پاس مجموعی طور پر ... زیادہ ... کی یاد گار تجمل خواری، کے بعد پلٹے تو خان صاحب نے میرے وہ دو روپے دہاڑی بھی بند کر دیے۔ ... مزدوری لینے کیلئے ... کام ... پر ... کا یقین دلانا آسان نہ رہا۔

... صاحب جو تید ... رہا ہو کر اب مہر صاحب کے ساتھ زمیندار کے ... تھے۔ مجھے پینتیس روپے ماہوار پر "پارٹ ٹائم" ... کے بھیجے ہوئے مسودات کی اصلاح اور کاپیاں پڑھنے کے لئے "پارٹ ٹائم" ایک جگہ مل گئی جو دو ماہ رہی۔ "پارٹ ٹائم" ہی رسالہ تبلیغ میں بھی ان ہی دنوں کام کیا

کشمیر کی اس سیاحت کے بعد خیالات کے ساتھ حالات بھی بہت نازک اور پتلے ہو گئے تھے البتہ میرے شوق فضول کی بڑھتی ہوئی مانگ ترقی پذیر تھی — مشاعروں کے علاوہ اب لاہور ہی میں نہیں دوسرے شہروں کی اسلامی انجمنوں کے جلسوں میں بھی چندہ جمع کرنے کے لئے حفیظ جالندھری اچھا خاصا ذریعہ تھا بڑی دوڑ دھوپ کا زمانہ تھا لیکن نہ مشاعروں ... ٹکٹ کی فروخت میں نہ انجمنوں کے چندے میں کہیں بھی میرا حصہ نجو ... تھا۔ مجھے خبر ہی نہ تھی کہ ع

یہ بھی ہوتا ہے زمانے میں

اب بجائے ایک کے دو بیٹیوں کا باپ بن چکا تھا۔ بیوی جس کو زچگی کے لئے میری والدہ جالندھر ... چند مہینے خرچ نہ پاکر لاہور واپس آگئی ہیں ... موری دروازے کے اندر لاہور کی شاندار شاہی بدررو کے عین کنارے دوسری منزل پر ایک نہایت چھوٹا سا ڈربا کرایہ پر لیا۔ کمرے میں دو چارپائیوں پر ہم چاروں بمشکل سما سکتے تھے۔ البتہ کپڑوں کا ٹرنک برتن اور بستر ان چارپائیوں کے نیچے سمجھی سوچی ہوئی ... کے ساتھ ... گیا تھا۔ ملنے جلنے والے، شعر لکھنے لکھانے میرے شکار اور شکاری آتے تو سامنے بدررو کے اس پار ریزی ہوئی گھاس پر لے کر بیٹھ جاتا۔ ارب علم اور کالج کے مشاعرے اسلامی جلسے میرے ... ہی منعقد ہوتے تھے۔ مشاعروں میں اگرچہ میرے خلاف محاذ تھا لیکن میں زیر نہیں کیا جاتا۔ میری ... کا جواب دینے کے لئے ان دنوں محض ... والوں کو نہ ... سے لیا جاتا تھا۔ میری غزل کے بارے میں مشہور کیا جاتا کسی استاد کا لکھا ہاتھ آگیا ہے۔ اخباروں میں مشاعروں کی روداد میں مجھے ڈوم مراثی لکھا جاتا۔ میں جھلاتا لیکن شیخ عبدالقادر دلجوئی کرتے اور میں ... خیالات وجذبات کی رنگا رنگی میں دل اور زبان کی ہم آہنگی پر ... مشاعرے کے آغاز پر میرا دل زور زور سے دھڑکتا لیکن کرنا خدا کا یہ ہوتا ... کہ عام سامعین کا ذوقِ آوازہ کسنے والوں پر غالب رہتا۔ میں تحسین کے پھولوں سے لدا ہوا نکلتا یہ پھول سیج کے لئے کام نہ آتے۔ بیوی کے لئے موتیے کے پھول خریدنے کی ان دنوں توفیق کہاں تھی۔ بیوی اپنا زیور بھی ... کے صندوق میں رکھ آئی تھی۔ کنبے کے اندر اس سلسلے میں میرا اعتبار ... پہلے ہی اٹھ چکا ہوا تھا

فکر شعر کے انہماک کے خاص دنوں میں ہنڈیا پکنے میں ... رہتی۔ بسا اوقات ایک بنڈی پہن چھوٹی سی تہمدی باندھ ریلوے اسٹیشن پر جاتا کسی کے ہاتھ میں سوٹ کیس یا چھوٹا ٹرنک دیکھتا تو اصرار کے ساتھ اٹھا لیتا۔ تانگے کے اڈے تک یا جہاں کہیں لیجانا ہوتا لیجاتا۔ باضابطہ لائسنس والے قلیوں نے مجھے بارہا ڈانٹا۔ مارپیٹ کا بھی خوف رہتا۔ اس طرح دو چار پھیرے کرتا اور اپنی دن کی آمدنی میں چونی، دونی کا اضافہ ذرا کر کے پلٹتا بیوی بچوں کو کھلا، پلا اور سلا کر خود لکھنے بیٹھ جاتا۔ میری نظم "فرصت کی تلاش" ان ہی دنوں کی ہے۔ مہر صاحب نے زمیندار کے پہلے صفحے پر شائع کر دی۔ اہلِ زبان نے لکھنؤ سے اسے بے تکی تک ... عنوان عطا کیا اور اس کی پیروڈیاں لکھیں اور لاہور میں پھبتیاں کسی جانے لگیں۔ ایک دن علامہ اقبال کے حضور ... بیٹھا تھا کہ حضرت لکھنؤ کے اودھ پنچ میں میری نظم اور اس کی پیروڈی پڑھ کر ہنسے۔ فرمایا "جینئس" پر بے تکے پن کے آوازے کسے جاتے رہے ہیں۔ جواب نہ دینا چاہئے۔ مجھے اس لفظ جینئس کے معنی معلوم نہ تھے تاہم جی خوش ہوا کہ حضرت فرماتے ہیں تو کوئی اچھی بات ہی ہوگی۔

عجیب زمانہ تھا۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی۔ سب الگ الگ اور مل جل کر ہر رنگ سے جوش و خروش میں تھے۔ ایک دیگ جس میں ہر جنس ...

مدتوں "حلیم" کی طرح مل جل کر پک رہی تھی اور ایک دوسرے کی خوبو سے لت پت تھی اب ایک دوسری سے جدا ہونا چاہتی تھی۔ ساتھ ہی حکومت انگریزی کے خلاف تحریک عدم تعاون بھی زوروں پر تھی۔ اللہ اکبر۔ بندے ماترم اور ٹوڈی بچہ ہائے ہائے کے نعرے ہر چہار طرف سنے جاتے تھے۔

خلافت اور کانگریس کے جلسے جلوس گرفتاریاں سزایابیاں آئے دن کا معمول تھیں۔ اخباروں کے ایڈیٹر دھڑا دھڑ گرفتار ہو رہے تھے۔ اخبار کے مالکوں نے ڈمی ایڈیٹر رکھنے شروع کر دیئے تھے جن کو محض قید ہو جانے کے لئے پیسے دیئے جاتے تھے۔

میری فلاکت کے پیش نظر اس سعادت کے لئے میرے سامنے بھی تجویز پیش ہوئی شاید اس دور میں یہ بھی کر گزرتا لیکن اتفاقاً شیخ عبدالقادر نے مجھے کھانے پر بلایا اور میرا یہ ارادہ سن کر پدرانہ شفقت سے فرمایا۔ اپنا مقصد متعین کرلو۔ تمہارا مقصود شاعری ہے یا سیاسیات۔ ادھر بیوی کی پکار پر والدہ نے طعن و تشنیع کا خط اور پانسو روپے بھیجے۔ کہ کوئی کام دھندا اختیار کروں۔ روپیہ میں نے غصے کے ساتھ پلٹا دیا لیکن بیوی کی کم فہمی سے پرکا ہے کرنا پڑا۔ جیل جانے سے باز رہا۔ ورنہ میرا رخ شاعری سے لیڈری کی طرف پلٹ جاتا اور ایک آدھ جلوس تو میرا بھی کسی نہ کسی وقت نکل ہی جاتا۔

جالندھر سے والد مجھے عاق کر دینے کی دھمکیاں دیتے تھے اور میں تھا کہ اینٹھا ہوا تھا۔ گرامی مرحوم کے خط سے تسلیاں بلکہ تجلیاں ملتی رہتی تھیں لیکن سنہ ۱۹۲۴ء کے آغاز میں شہرت کے ساتھ عسرت کا یہ زمانہ تھا کہ قلم اور زبان دونوں چکیاں تو چل رہی تھیں مگر اس چھوٹے سے کنبے کے لئے پیٹ بھرنا بمشکل میسر ہوتا تھا۔ اچانک رسالہ نونہال اور ہزار داستان کی چیف ایڈیٹری ساٹھ روپے ماہوار نقد اور ساتھ ہی میری اقامت کے لئے دفتر کے ساتھ دالان لئے ہوئے سامنے آئی۔ میں نے جھٹ منظور کرلی۔ بیوی نے دفتر کے ساتھ کمرے کو پسند نہ کیا۔ وہ لاہور کی بدرو کو چھوڑ جالندھر کی حویلی کو آباد اور میری والدہ کو شاد کرنے چلی گئی۔ دونوں ننھی بچیوں کو بھی ساتھ لے گئی۔ میں ہزار داستان اور نونہال میں اٹھ آیا۔

عرض کر چکا ہوں یہ ادبی رسالے ایسے تھے جن کا معیار حکیم احمد شجاع ایسے طباع کے ہاتھوں قائم ہوا تھا۔ یہ مجلے اور دارالاشاعت ادب لطیف بھی ممدوح نے بعض دوسری مصروفیات کی وجہ سے اہل ثروت پراچہ خاندان کے ایک نونہال جناب نعیم کے سپرد فرما دیے تھے میرے لئے ان رسالوں کی ادارت بڑی جسارت تھی۔ ہزار داستان افسانوی اور نونہال بچوں کے لئے بہترین تفریحی تعلیمی ادب پیش کرتے تھے اور افسانے ان دنوں زیادہ تر انگریزی سے ترجمے کئے جاتے تھے یا انگریزی ناولوں سے (بغیر نام ظاہر کئے) ماخوذ ہوتے تھے۔ نعیم صاحب نے بہت سے الجھے ہوئے ترجموں کے ڈھیر میرے سامنے رکھ دیے جن کی اصلاح لازم تھی "سنگ آمد و سخت آمد" یا "ذوق سلیم مدد دے" کہہ کر میں نے ان کے اندر سے کہانیاں ڈھونڈنا شروع کیں اور کتر بیونت کے ساتھ الجھا ہوا ترجمہ کرنے والوں کو افسانہ نویس کا نام دے کر اور ایڈیٹری کے مربیانہ الفاظ ساتھ لکھ کر شائع کرنے کا تہیہ کرلیا

پہلی اشاعت تیار ہو رہی تھی۔ میرے حریفوں نے ایک اخبار میں چھپوایا: جالندھر کی ایک "کلچڑی گنجی" نے لاہور میں بلبل ہزار داستان کا بہروپ بھر لیا ہے "میرے دل نے مجھ سے کہا۔ اوشاعر نامدار اسکول سے بھاگ نکلنے کی سزا ملنے ہی والی ہے۔ "کلچڑی" انگریزی پڑھ لیتی تو گنجی کیوں کہلاتی۔ میں نے کہا یار حوصلہ نہ ہار۔ دوسروں کے ترجموں میں انگریزی جانے بغیر اپنے ذوق سلیم کی قینچی سے کتر بیونت کرتا رہ۔ کسی پہ ظاہر نہ ہونے دے کہ تو بی۔ اے پاس نہیں ہے۔ ذرا مشفقانہ مدح سرائی سے یہ ترجمے ان کے اسمائے گرامی کے ساتھ چھاپ دیا کر۔ کوئی نہ بولے گا۔ دل نے کہا تیرا طبعزاد افسانہ بھی ہونا چاہئے۔ میں نے کہا ع

دیکھ خدا کیا کرتا ہے

ناول اور افسانے پڑھنے کی دھت تو لڑکپن سے تھی ہی لیکن افسانہ لکھنے کی طرف کبھی دھیان ہی نہ دیا تھا اور اسے شعر کے مقابلے میں بہت گھٹیا صنف گردانتا تھا۔ اسی تردد نے ایسی شدت اختیار کی کہ ایک رات نیند نہ آئی۔ دو بجے اٹھا قلم اٹھایا۔ گرمی کا موسم۔ اگر د مچھر اور پروانے میری صورت پر نہیں بازار کے کھمبے پر لٹکے ہوئے بجلی کے قمقمے پر قربان ہو رہے تھے۔ میں نے افسانہ صبح تک گھسیٹ ڈالا اور نظر ثانی کے بغیر ہی اسے کاتب کے سپرد کر دیا۔ یہ افسانہ "آوارگی" اور ایک ترانہ "پئے جا" اور ایک تازہ غزل ہزار داستان کی پہلی اشاعت میں، نیز نونہال میں بچوں

کے لئے ایک طبعزاد کہانی اور ایک نظم۔ دونوں رسالے جناب چیف ایڈیٹر ابوالاثر جالندھری کی ادارت صفحہ اول پر لئے میرے سامنے آئے تو ایسا معلوم ہوا جیسے تخت سلیمان پر سوار اقطار السماوات سے بھی اوپر اڑا جا رہا ہوں۔ شاید ان ہی دنوں کہا تھا ؂

آ تجھ کو دکھا دوں کہ ستاروں سے بھی آگے
انسان کے نقشِ کفِ پا ہیں کہ نہیں ہیں

ان دنوں سید امتیاز علی تاج کے ہاں چند واقعی اہل ذوق محض ادبی خوش گپی کے لئے جمع ہوتے تھے میں بھی حاضری دیتا۔ ہزار داستان میں افسانہ اچانک جو نکلا تو یہاں تعجب سے دیکھا گیا۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ میں انگریزی نہیں جانتا تھا انکی داد آفرین تحسین سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اگر یہ باون گزے" میرا تخلیق کردہ افسانہ پسند کر رہے ہیں تو بھرم قائم ہو گیا ہے ـــــ دوسرے مال ہی کیا ہیں بات یہی تھی۔ اگر یہ لوگ ناپسند کر دیتے تو اس دور میں کوئی بھی اور نہ تھا جو میری پناہ بن سکتا۔ اب تو میں شیر ہو گیا۔ غزل گیت، نغمے ترانے زمزمے افسانے بیک وقت میرے چشمہ طبع سے ابلنے لگے۔ یہ سب پیدا وار خودرو تھی۔ باران شوق نے رنگا رنگ کے گل بوٹے زمین شعر و ادب سے پیدا و ہویدا کر دیئے تھے

ہری چند نے بی۔ اے کر لیا تھا۔ میں نے اسے فارسی میں ایم۔ اے کرنے کا مشورہ دیا ـــ وہ ہوسٹل چھوڑ میرے پاس دفتر کے ساتھ والے کمرے میں آگیا۔ میں نے اس کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا شوق بھی دلایا۔ ابھی شعر میں کچا تھا۔ خیال بلند طبع ندرت پسند مگر مشق کے بغیر خالی خیالی۔ طبع ندرت پسند کیسے سود مند ہوتی۔ ایک دو شعر ایک دو منفرد مصرعے کہہ لیتا۔ میں غزل پوری کر دیتا۔ میرے کہنے سننے پر ترتیب الفاظ اور بندش پر غور کرنے لگا لیکن خوش گپی اور ساتھ ہی ایم۔ اے کی تیاری فکر و استغراق کی راہ میں حائل تھے۔ بھی شاعر بننے کے لئے بڑا وقت درکار ـــ اس طرح فاخر لدھیانوی اور موہن لال ساحر تھے۔ مولانا سید اصغر علی احسن ایم۔ اے کی غزل جالندھر ... کے لئے آتی۔ فخرالدین ناطق ملتان سے مشورہ لیتے۔ میں اچھا خاصا استاد بن گیا تھا لیکن یہ پیری مریدی نہیں تھی۔

کالجوں کے اور بھی ہندو مسلمان نوجوان شاعری کا زکام لے کر آتے۔ کچھ انٹ سنٹ کہہ لاتے۔ میں بات بنا دیتا۔ وہ چھپواتے پھولے نہ سماتے یہ اخبار رسالے خرید کر دوستوں یاروں کو بہم پہنچاتے۔ مشاعروں کنسرٹوں میں بھی پڑھتے اور داد ہی نہیں انعام بھی اینٹھ لاتے۔ رحیم بخش اخگر (اب حیرت شاہ وارثی) جو اسلامیہ کالج کا طالب علم اور دل پھینک تھا۔ ایسے ہی استفادہ کے لئے میرے ہاں بہت آتا جاتا۔ نوجوان طالب علموں کو شاعری کا شوق دلا کر میرے پاس شاگرد کرانے لاتا کر تاہرف ایک شاگرد خود کہتا تھا ـــ دوار کا داس شعلہ!

میں نے قلب و نگاہ و زبان کو رنگا رنگ نغمگی سے ہم آہنگ کرنے کے لئے (طفلانہ ہی سہی) جو نئے نئے تجربے کئے وہ زبان زد عام ہو رہے تھے جوان ہی نہیں۔ بوڑھے بھی ان کو الاپتے اور نئے لکھنے والے ہی نہیں روایات پرست استاد شاعر بھی اپنی طبع کو ان نئے پیمانوں سے ناپنے لگے۔ ہر رہگذر میں مجھ پر انگلیاں اٹھتیں۔ بازاروں میں میرے دائیں بائیں سے "ابھی تو میں جوان ہوں" "پیئے جا" اور "دیکھتا چلا گیا" کے آوازے سنائی دیتے۔ ان نظموں کی پیروڈیاں بھی ہوتیں۔ اور تتبیع بھی کیا جاتا۔ بسنت، برسات، تاروں بھری رات، طوفانی کشتی، دیکھتا چلا گیا۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔ فرصت کی تلاش کرشن کنہیا، پیئے جا، وغیرہ نظمیں، نغمے اور ترانے سب اسی دور کے ہیں۔ لاہور ان دنوں واقعی شہر سخن تھا۔ آج کون اندازہ کر سکتا ہے کہ سامعین اور شعرا پر میری اس اپج نے کیسے متضاد اثرات وارد کئے۔ سامعین میرے شعر اور ترانے گنگناتے ہوئے اور اساتذہ خاص الخاص ٹکسالی زبان میں ملاحیاں سناتے ہوئے نکلتے اور پھر اسی طرح کہنے کی کوشش فرماتے۔

سات ماہ بعد ہزار داستان اور نونہال کے مالک سے بگڑ گئی۔ میرا اٹھنا بیٹھنا سید امتیاز علی تاج کے ہاں زیادہ تھا۔ نعیم صاحب دارالاشاعت پنجاب کو دارالاشاعت ادب لطیف کا رقیب سمجھ بیٹھے تھے۔ ایک دن میرے وہاں آنے جانے کا تذکرہ فرماتے ہوئے تلخ نوائی پر اتر آئے۔ میں نے قلم رکھ دیا بقیہ پیسے کبھی طلب نہ کئے۔ سلام بھی نہ کیا۔ اپنا بستر اور چند کپڑے اٹھا کر نکل کھڑا ہوا۔ سسرال جانے کی بجائے شفیع کی سرائے میں رات گذاری

پنڈت کچھ روز پہلے ہی اپنی بہن بہنوئی کے ساتھ رہنے کے لئے اکبری دروازے جا چکا تھا۔

دوسرے روز ساٹھ روپے ماہوار پر میں دارالاشاعت پنجاب ریلوے روڈ لاہور میں اس پرانی کرسی پر بیٹھا تھا جس پر سالک صاحب مدتوں تشریف رکھ چکے تھے۔ اس روشنائی زدہ کھردرے میز پر جہاں وہ مدتوں قلم فرسا رہے تھے میں بھی قلم چلانے لگا۔ یہاں مجھے واقعی بہت بڑا ذہنی اور فنی فائدہ ہوا۔ سید امتیاز علی صاحب مرحوم ایسے فاضل، مصلح کا قرب اور استفادہ میری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی فرمائش پر اپنی اپج اور روش کے علاوہ حالیؔ کی کھری نظم گوئی کی مشق بھی میں نے بہم پہنچائی۔ میرے دور کے دوسرے شعراء کی لفظی شوکت اور میری سادگی و پرکاری سے سید صاحب کو کوئی سروکار نہ تھا۔ مرحوم اس معاملے میں کسی رواداری کے قائل نہ تھے۔ وہ تو اپنے فرزند ارجمند امتیاز کی ادبی روش کو بھی تہذیب نسواں کے معاملے میں گوارا نہ کرتے تھے۔

اس جگہ کام سے مجھے ادب و شعر کی افادیت کے چند مدارج کو سمجھنے کا موقع ملا۔ یہاں مقاصد متعین اور قوانین سخت تھے۔ شعر و شاعری میں بھی اپنی مرضی کی کوئی چیز نہ تھی۔ تہذیب اور پھول کے علاوہ دارالاشاعت سے نئی نئی کتب کی اشاعت ہوتی تھی اور مجھے ہر صنف میں کچھ نہ کچھ کام کرنا پڑتا تھا۔ پھول میں نظم و نثر لکھنے کی مشق سے سادہ الفاظ میں اظہار خیال کی مہارت ہوگئی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ قوت شعرگوئی میں اپنی انفرادیت کے سبب ایک ایسے حلقے میں شامل ہوگیا جو چند روز بعد نیاز مندان لاہور کہلانے والا تھا۔ نیاز مندان لاہور کون تھے عرض کر چکا کہ امتیاز علی کے ہاں چند اہل ذوق از بہر تفنن جمع ہوا کرتے تھے۔ پروفیسر سید احمد شاہ پطرس اس بزم کی جان تھے۔ شیخ عبداللطیف تپش مشکل پسند شاعر حضرت مولانا سالک، اخبار نویسی، شعر و شاعری کے علاوہ لطیفہ گو بذلہ سنج اور سب سے بھاری بھرکم۔ ان کو ہم سب حضرت تاجور کے مقابلے میں استاد کہتے تھے۔ چنگل کشور مہر (ابو احمد سلمان) اگرچہ ادیب و شاعر نہ تھے لیکن سخن فہمی، تنقید، نکتہ رسی اور پیسرودی کرنے میں بے پناہ۔

پنجابیوں کے اردو ادب و شعر پر ان دنوں لکھنؤ، دہلی، علی گڑھ میں بہت کچھ کہا جا رہا تھا۔ پطرس کی نکتہ رسی، سالک کی زبان دانی اور مجید عاجز کا رنگ تو میاں سے ان سب کا مسکت جواب ہوتا تھا۔ میرے یہ سب دوست میرے فن کے سنور نے کا باعث بنے۔ اس محفل میں شعر سنانے سے پہلے خیال اسلوب اور بندش کی نوک پلک سنوار لینا میرے لئے بہت ضروری تھا۔ ان کے فقروں اور ضلع جگت سے خدا بچائے۔ میں بہت کوشش کرتا۔ کہیں نہ کہیں بھرتی پکڑی جاتی۔ کسی جگہ بندش ڈھیلی ثابت ہوتی۔ یہ لوگ ایسی پھبتی کستے کہ میرے کان گرم ہو جاتے۔

امتیاز اس محفل کی شمع تھے، اور ہم سب پروانے۔ یہ پروانے عصر کے قریب آتے اور شام کی شمع جلنے سے پہلے منتشر ہو جاتے۔ یہاں لطائف و ظرائف تفنن و مزاح نوک جھونک... سب کچھ ادب آموز اور سخن افروز تھا۔ دارالاشاعت پنجاب کے مہتمم سید حمید علی امتیاز علی کے بڑے بھائی کاروباری اور عملی آدمی تھے ہم سب کو نکھٹو گردانتے تاہم وہ ایک مرتبہ مسکراتے ہوئے جھلک دکھا جاتے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے امتیاز ایک دوشیزہ ہے۔ لڑکوں کو اس کے گرد بیٹھنے تو دیا جاتا ہے لیکن بوڑھے بزرگ شاید اس کی نگرانی بھی کرتے رہتے ہیں۔

فرائض منصبی کے علاوہ اس دور میں میں نے بچوں کے لئے ایسی نظمیں بھی لکھیں جو نوعمروں کے اپنے احساسات کی تصویریں ان کی اپنی ہی زبان اور اپنے طرز بیان کو لئے ہوئے تھیں۔ یہ نظمیں شاعروں میں تو کام نہ آئی تھیں البتہ نئی پود کے دلوں میں ہمیشہ کے لئے میرا گھر بنا گئیں۔

ان ہی دنوں پطرس کے چھوٹے بھائی ذوالفقار علی بخاری سے میرا یارانہ ہوگیا۔ خود پطرس سادہ پرکار مزاحیہ نثر لکھنے میں اپنی نظیر آپ تھے۔ کبھی کبھار فارسی میں شعر بھی کہتے۔ ان کے والد پرانے دور کے وضعدار نکتہ سنج اور باغ و بہار بزرگ تھے۔ بڑے بھائی رفعت بخاری بھی اچھے خاصے شاعر تھے لہٰذا ذوالفقار نے شاعر بننا لازم گردانا۔ طبع انتہائی شوخ۔ ذہن بلا کا رسا۔ معیار سخن بلند لیکن معیار کی بلندی کے ساتھ شعر کہنا محنت اور جگر کاوی چاہتا ہے اور لطیفہ باز آدمی، کو محنت سے کیا کام۔ پہلے پہل ذوالفقار ہی مجھے پشاور لے گیا۔ پشاور کے شعراء جو رفعت کے حریف تھے۔ چھریاں لے کر آئے لیکن خیریت گذری۔ پشاور کے لوگ مہمان نواز ہیں۔ میں نے بھی نئی رنگ کی نظموں سے ان کو ایسا رجھایا کہ خون خرابے کی گھڑیاں ٹل گئیں۔ چھری مار شعراء ہنستے بولتے مجھے کھانے کی دعوت دیتے اپنے گھروں کو چل دیے

محشر والوں نے بھی مجھ کو شاعر کہہ کر چھوڑ دیا
میری فردِ عمل کو سمجھے دعویٰ اف ... ل کا

ذوالفقار نے مجھ سے اصلاح لینی شروع کر دی — پطرس فریاد کرنے لگا کہ دیکھو میرے چھوٹے بھائی کو بھی اس ان پڑھ نے پھانس لیا ہے لیکن یہ تو شعر شاعری کی بات تھی۔ اس میں پروفیسری نہیں چلتی۔

لوگ میرا مجموعۂ کلام طلب کرنے لگے۔ میں نے نغمہ زار مرتب کیا۔ ان دنوں فاخر موہنی روڈ پر میرے ساتھ رہتا تھا۔ میری شاگردی کا دم بھرنے کے باوجود سخن فہمی کے بارے میں فلسفیانہ باتیں کرتا۔ اور وقت پسندی کی دعویداری پر بضد تھا۔ مجھے استادِ گرامی نے سہل ممتنع کی تلقین کر رکھی تھی۔ لیکن مجموعہ مرتب کرتے وقت میں نے ہار مان لی۔ استاد نے اپنا سارا کلام شاگرد کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے بیدردی کی چھری سے بہت کچھ کاٹ دیا۔ چھانٹا ہوا بہت سا ایسا حصہ ضائع ہو گیا جس میں عاشق معشوق کے معاملات کچھ زیادہ تھے۔ کچھ میرے ساتھیوں نے اپنے نام سے شائع کر لیا۔ ہری چند ملتے آ۔ میرے اشعار کے قتل عام پر جھلاتا لیکن ہم دونوں فاخر کے بھنچے ہوئے لب دیکھ کر چپ سادھ جاتے۔ مجموعہ کا نام فاخر نے زمزمہ تجویز کیا۔ پنڈت نے اس پر بھنگیوں کی توپ کی پھبتی کسی۔ بھنگیوں کی توپ لاہور کے عجائب گھر کے سامنے احمد شاہ ابدالی کی ایک دیدار کی یادگار ہے۔ سالک صاحب نے نغمہ زار تجویز کر دیا۔ دیباچہ احمد شاہ بخاری پطرس نے لکھا۔ کتابت ہو گئی۔ کاغذ کی خرید کے لئے پورے پیسے نہ تھے۔ سید حمید علی نے ڈیڑھ سو روپے ادھار دینے اور تنخواہ میں سے قسط وار کاٹ کر وصول کر لینے کی عرضی نامنظور کر دی۔ فرمایا "جو مصنف اپنی کتاب خود چھاپے تاجر پر اس کی مدد اصول کے خلاف ہے" بات واہی تھی۔ امتیاز نیوٹرل رہا۔

دو اڑھائی سو کی بات تھی لیکن یہ بات کیسے بنتی۔ اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ اچانک مولانا سہائے کے توسل سے ایک ریاست میں شاعر دربار کے عہدے کے لئے تین سو پچاس روپے ماہوار پر بلا دا گیا۔ آہا — حفیظ جالندھری شاعر دربار . . . . پرانے زمانے کے بڑے بڑے شاعروں کے منجاروں نے اس نابتجر کو فی البدیہہ شکار کر لیا۔ "نغمہ زار" کی کتابت دھری کی دھری رہی۔ پھول تہذیب چھوڑ مچھاڑ یہ جا وہ جا۔

تین مہینے شاعر دربار کی حیثیت سے ریاست میں رہا۔ یہاں کیا بیتی۔ اس کا ذکر آپ بیتی ہی میں مناسب ہے۔ یہاں اتنا ہی کافی ہے کہ ادھر میں دربار میں پہونچا ادھر چند ہی روز بعد میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ سوز و ساز میں میرا غم و الم ایک سادہ سے مرثیے کی صورت میں درج ہے میں غم زدہ گھر لٹنا چاہتا تھا۔ درباری لوگ مجھے کوکین سے غم غلط کرنے کا مشورہ دیتے۔ وہسکی سوڈا پیش کرتے۔ وہاں لاہور سے گئی ہوئی ایک رقاصہ اور اس کے ڈھوم ڈھاڑی ریاست پر چھائے ہوئے تھے۔ ریاست کی رعایا مجھے بھی ان ہی میں گردان کر اٹھ اٹھ کر سلام کرنے لگی۔ میرا انگلھڑ پن اس ماحول سے باغی ہو گیا۔ یہ صورت حال میری جبلت کے خلاف تھی میں نے ان حالات سے متاثر ہو کر "رقاصہ" لکھی۔ نتیجہ حراست حوالات۔ پھر بیک بینی و دو گوش۔ خیر سے بدھو اپنے گھر۔

جالندھر پہنچا۔ اپنی والدہ کی قبر سے لپٹ کر رو دیا۔ چیخا چلایا۔ صدائے برنخاست — "نیندوں کی وادی" میری نظم سوز و ساز میں اسی عالم کی یادگار ہے مٹی کی ایک چھوٹی سی ڈھیری کے قریب بیٹھے ہوئے میں نے اپنا جائزہ لیا۔

پہلی مرتبہ اپنی ذات میں آغاز سے اب تک مسلسل چلتے چلتے جانے والا ایک تنہا فرد نظر آیا۔ ایک راہی — نہیں راہی نہیں۔ مجھے تو آج تک یہ احساس تک نہ تھا کہ چل بھی رہا ہوں تاہم چل بھی تو رہا تھا لیکن اس چلتے چلے جانے کا کوئی مقصد — میری کوئی منزل نہ تھی۔ میں راہی مسافر نہ تھا۔ ایک آوارہ کبھی ادھر جاتا تھا کبھی ادھر — غزل زمزمہ، گیت، نغمہ زار۔ افسانہ محض ہنگ۔ اس پر دوسروں سے دور رہنے، سبقت لے جانے کی ترنگ۔ یہ خیالی خوش وقتی محض ذہنی عیاشی — منزل اور مقصد کیا ہے۔ نگاہ اٹھائی۔ چاروں طرف گہرے دھند لکے۔ دھندلکوں سے بہت آگے محکم بلندیوں کی موجودگی کا تصور یا گمان۔ پیدا کم پنہاں زیادہ۔

شاید دھندلکوں میں چھپی ہوئی پگڈنڈیاں اور گذرگاہیں موجود ہوں۔ شاید غاریں ہوں۔ چٹانیں ہوں۔ کانٹے ہوں۔ شاید شیر، چیتے، بھیڑیے، سانپ . . . اژدہے ہوں۔ شاید۔ پھل، پھول، بہار، سبزہ زار، جوئبار ہوں — ان دھندلکوں کے پیچھے کیا ہے۔ کس سے پوچھوں۔ کون بتائے۔ کیا وہ تصوری بلندیاں

واقعی محکم ہیں جیسے کشمیر کی راہوں اور کشمیر کے ارد گرد سلسلہ ہائے کوہسار لیکن ایسے جمے ہوئے دھندلکوں کی گھاٹیاں طے کرنے کا حوصلہ کسے اور پھر کسی ٹیلے کوہ پہ تنہا جا کھڑے ہونے سے کیا حاصل۔ بجز نظارگی و بیچارگی — کیا یہی بیچارگی و نظارگی مقصد و منزل ہیں —!

والدہ کی موت اور میرا آخری وقت موجود نہ ہونا میرے لئے احساس کا ایک نیا رخ پیدا کر رہا تھا۔ مجھے کہاں سے کہاں پہونچا رہا تھا۔ فرزندوں میں دو جواں مرگ ہو چکے تھے۔ ایک میں ہی آوارہ اس کی ممتا کا سہارا تھا۔ نکما ناکارہ کہ اس کے بستر مرگ کے قریب بھی نہ رہ سکا۔ وہ عزت والوں کی بیٹی اور بہو تھی۔ اس کے پاس زیور اور روپیہ بھی تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں کوئی کام کاج کر دوں۔ بس جاؤں۔ اس کی تمنا تھی میرا بیٹا کماؤ بن جائے۔ سربلند نظر آئے۔ میری بیوی نے مجھے وہ زیور اور روپیے سے بھرا ہوا صندوقچہ دکھایا جو وہ مرنے والی میرے لئے اس کے سپرد کر گئی تھی۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ یہ ترکہ اب میرے کسی کام کا نہ تھا۔ میں نے اسے ترک کیا۔ ہارے ہوئے جواری کی طرح پھر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اپنی بیوی بچیوں اور بیوہ بہن کو بوڑھے اور شکستہ دل والد کی نگرانی میں جالندھر چھوڑا اور ایک مبہم سا نیا احساس سینے میں چھپائے ہوئے لاہور پہونچا۔

وہی لاہور تھا وہی در و بام — وہی ہنگامہ خواص و عام۔

اگرچہ قلب و نظر اب کسی اور پہلو کروٹ لینا چاہتے تھے لیکن شعر و شاعری سے الگ رہنا مجھ ایسے کے لئے ممکن نہ تھا۔ میں عامی تھا۔ مجھے عام بھیڑ بھاڑ ہی سے گذرنا تھا۔ میرا ہی تو شعر ہے ؎

میری کیا پوچھتے ہو۔ قافلے کے ساتھ میں بھی ہوں
نہ رہرو ہوں کہ جس کا اک ہجوم غول رہبر ہو

لاہور میں رقاصہ اور رقاصہ کی شان نزول میری بازگشت سے پہلے ہی وارد تھے۔ ادبی حلقوں، مشاعروں، محفلوں اور اسلامی جلسوں میں روداد کے ساتھ رقاصہ سنی جانے لگی۔ لوگ خود بخود دھڑا دھڑ چھاپے اور بیچنے اور مفت تقسیم کرنے لگے حتیٰ کہ رقاصاؤں کے نقیبوں نے اس کے جواب بھی لکھ کر چھاپ دیئے۔ رقاصہ میری چھیڑ کیا چڑھ بن گئی — آج بوڑھا ہوں لیکن "ابھی تو میں جوان ہوں" کے ساتھ رقاصہ نے اب تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔

یہ سنہ ۱۹۲۵ء کے واقعات ہیں میں نے ایک مکان کرایہ پر لیا۔ اسلامیہ کالج کے چند طالب علم بھی اس مکان کے کمروں میں اپنے اپنے حصے کا کرایہ ادا کر کے اپنی اپنی روٹی کا انتظام خود کرتے تھے۔ میں ڈیوڑھی کے ساتھ والے بڑے کمرے میں گویا ان سب کا پاسبان تھا۔ کھوسٹ " میرا مہمان اور ان بھولے بھالے قبول صورت نوجوانوں کو غنڈوں سے محفوظ رکھنے کے لئے پہلوان تھا۔ میں اپنی ہنڈیا خود پکاتا روٹی تنور سے آتی۔ حقہ گڑگڑاتا۔ اہل زبان آتے تو ان کے لئے زردے والے پان بھی منگاتا۔ اس گھونسلے کا نام ہم نے "سدابہار" (EVER GREEN) رکھا تھا۔

اب کسی ادارے یا کسی رسالے میں نوکری کون دیتا۔ کون ہر روز بھاگ نکلنے والے غلام کا آقا بنتا۔ تیر تکّے پر گذر اوقات ہونے لگی۔ بچوں کے لئے اردو کی تعلیمی کتب اور رسالے چھاپنے والے لاہور میں میرے گاہک تھے۔ فرمائش پر رنگا رنگ سبق۔ بھانت بھانت کے رسالوں اور جلدوں کے لئے نظمیں لکھتا۔ جسے وہ اپنے یا کسی مشہور آدمی کے نام سے چھاپتے جو ان کی فروخت کتب میں ساعی اور نفع میں حصہ دار ہوتا۔

میرا قلم اور زبان دونوں مصروف کار و وقف بیکار رہتے۔ کالجوں کے طالب علم اور پرانے دوست احباب آتے میں فکر شعر بھی کرتا۔ ان سے بھی مجلس رہتی۔ والدہ کے داغِ مفارقت کو ہنسی اور دھوم دھام سے چھپاتا۔ دوسرے تیسرے پنڈت آجاتا۔ چوتھی درجے میں ہم سینما دیکھتے۔ ہفتہ عشرہ، مشاعرہ یا کنسرٹ میں دادِ سخن دیتے جاتے۔ بھولیوں واہ واہ سمیٹ لاتے۔ پنڈت ان دنوں اپنے بہن بہنوئی کے ساتھ اکبری دروازے کے باہر فصیل پر بدررو کے کنارے رہنے لگا تھا۔ پھول اور تہذیب میں بدستور کام کرتا تھا — غالباً یہی دن تھے جب حجاز پر شاہ ابن سعود قابض ہو گیا تھا۔ مدینہ منورہ پر گولیاں چلانے کی افواہوں کے سبب یہاں مظاہرے ہو رہے تھے۔ مولانا محمد علی مرحوم کی سرکردگی میں ایک وفد حجاز گیا۔ مہر صاحب بطور سکریٹری ساتھ گئے۔ احباب نے نظمیں لکھیں۔ میں نے "میرا سلام لیجا" کے عنوان سے ایک ترانہ لکھا جس بڑی قبولیت حاصل ہوئی۔

لاہور آتے ہی میرا پہلا مجموعہ نغمہ زار بھی چھپ گیا تھا۔ یہ ننھی سی گٹھری بڑا رنگ لائی۔ دہلی، لکھنؤ، الہ آباد بلکہ حیدرآباد تک نئی گورمنٹ کی اس نئی شاعری پر تبصرے اور تنقیدیں ہونے لگیں۔ مضحکہ بھی اڑایا گیا آفریں کی آوازیں بھی اٹھیں۔ لاہور میں رسالہ نیرنگ خیال میں تاثیر کے قلم سے ایک سیر حاصل مضمون شائع ہوا۔ تاثیر سے مجھے ذاتی تعارف نہ تھا۔ اس "ماہ رخ" کے لئے میری یہ مصوّری ملاقات کی تصویر بن گئی۔

پہلی ملاقات شملے میں ہوئی جس کا تذکرہ دلچسپ بھی ہے اور میری شعر و شاعری کی مہم کا ایک دلچسپ باب بھی۔ غالباً سنہ ۱۹۲۵ء کا اگست تھا کہ سہانی بہار میں ایک دن مولانا تاجور مجھ سے پہلی مرتبہ ملنے آئے۔ ایک خط لائے۔ شیخ عبدالقادر نے جو ان دنوں پنجاب کے وزیر تعلیم تھے۔ شملے سے لکھا کہ ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ ارباب علم والوں کے ساتھ تم بھی شملے ضرور آؤ۔ یہاں تمہارے بہت سے مداح ہیں۔ اپنے دو تین ساتھی شاعروں کو بھی لاؤ۔

چنانچہ پنڈت اختر، سوہن لال ساحر اور شمس عارف کو ساتھ لے کر میں تاجور صاحب کے اہل زبان، ہندو سکھ، تلامذہ اور حلقے کے دوسرے شعراء کے ساتھ تھرڈ کلاس میں شملہ پہنچا۔ تلوک چند محروم میانوالی سے آئے۔

شملے کا یہ مشاعرہ تھا جس کو آل انڈیا کا نام دیا گیا تھا۔ میں نے اس سے پہلے یا اس کے بعد کبھی ایسا معتبر اجتماع نہیں دیکھا۔ اس مشاعرے میں ہندوستان بھر کے اہل علم اور اہل اقتدار بڑے بڑے سرکاری اہل کار ہی نہیں، ہندوستانی آزادی کے بڑے بڑے علم بردار جوق در جوق آئے تھے۔

حتیٰ کہ مولانا محمد علی (مرحوم) خواجہ حسن نظامی (مرحوم)، پنڈت مدن موہن مالویہ۔ سر سپرو، پنڈت کرشن کانت مالویہ۔ راجہ نریندر ناتھ، سر سید راس مسعود راس۔ سر ضیاء الدین ایسے مشاہیر بطور سامعین موجود تھے۔ ہز ہائی نس نواب امیر الدین احمد خان والی ریاست لوہارو صدر تھے۔ ہم لاہور سے انجمن ارباب علم اور خود تاجور صاحب کے جھنڈے تلے شمار کئے گئے تھے لیکن نجانے مولانا کو کیا سوجھی کہ ہم چاروں کو اپنے حلقے کے مقابل اسٹیج کے نیچے دائیں بازو پر بٹھا دیا۔

شملہ کی راہ میں ایک ناگوار واقعہ ہو چکا تھا۔ مولانا نے فرمایا تھا۔ کبھی وہاں دوسرے شعرا کے مقابلے میں میر تقی بن جانا۔ اپنے حلقے کے سوا کسی کو داد نہ دینا۔ میں نے قہقہہ لگا کر اس روش کے ساتھ میر تقی بننے سے صاف انکار کر دیا تھا اور وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے مایوس ہو گئے تھے۔ راہ میں ایک اور بات بھی ہوئی تھی وہ یہ کہ مجھے پے در پے خاصے کی گلوریاں کھلائی گئی تھیں جن سے میری آواز قطعاً بیٹھ گئی تھی۔ میں جب شملہ گیا تو قطعاً بول ہی نہ سکتا تھا۔ شیخ صاحب نے میرا حال دیکھ کر برات حاضر دولہا غائب کی پھبتی کہی۔ پھر ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئے اس نے میرا منہ کھلوا کر گلا خوب خوب دیکھا: ارے یہ تو سیندور کھا گیا ہے۔ اس نے تشخیص فرمائی۔ پھر کچھ گولیاں چوسنے کے لئے دیں جو میں خاصے کی گولیوں کے جواب میں چوستا رہا۔

ابھی مشاعرہ شروع نہ ہوا تھا کہ میرے عقب سے کسی نے میرے کندھے کو بھاری ہاتھ سے دبایا۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک جوان شایانِ جوانی، سادہ رو کشادہ پیشانی۔ ترکی ٹوپی، سفید قمیص نکٹائی، اور کھلے کوٹ کے ساتھ شلوار پہنے مجھ سے مخاطب تھا۔ میں نے اسکو کبھی پہلے نہ دیکھا تھا، میری نگاہ میں استفسار کی جھلک پاتے ہی جھک کر اس نے میرے کان میں کہا "میں تاثیر ہوں" ساتھ ہی ایک خالی کرسی کھینچ کر میرے اور پنڈت کے درمیان ڈٹ گیا۔ مشاعرہ شروع ہوا بڑے شاعروں کے لئے فضا پیدا کرنے کی خاطر ہم چھوٹے شاعروں سے آغاز کیا گیا۔ میرے ساتھیوں میں شمس عارف کا نام پکارا گیا۔ شمس عارف اسٹیج پر لاہور کے دستور کے مطابق صدر کی کرسی کے قریب کھڑا ہونے کے لئے بڑھا لیکن، جانے کیا سوجھی، مولانا تاجور نے جو مشاعرے کے "کنڈکٹر" بنے ہوئے اسٹیج پر ڈٹے ہوئے تھے۔ شمس کو اسٹیج کے ایک کونے تک دھکیل کر لے گئے۔ صدر کی میز سے بہت دور کھڑا کر دیا۔ شاعر کا یہ مقام ایک توہین تھی۔ شمس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اشارہ کیا، وہ پلٹ آیا۔ تاثیر نے میرے ایما پر اٹھ کر بلند آواز سے بہ ادب عرض کیا: شاعر کوئی بھی ہو اس محفل کا اصل مقصود ہے لہٰذا وہ صدر کے دائیں یا بائیں استادہ ہو کر کلام سنائے گا۔ کوئی وجہ نہیں کہ شاعر کو صدر کی مسند عزت کے قریب تک نہ آنے دیا جائے۔ تاثیر کی بات پسند کی گئی تالیاں پٹ گئیں۔ مولانا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ شیخ صاحب نے اٹھ کر معذرت کے ساتھ شمس کو پیار سے بلایا۔ اس چھوٹے سے واقعہ نے سامعین کی توقعات اور بڑھا دیں۔ شمس نے غزل شروع کی۔ شمس کے پڑھنے کا انداز نہایت دل کش تھا۔ غزل نے بقول اہل

زبان چٹختی اُڑا دیں اور ٹکسال باہر والوں کی ابتدا ہی سے دھاک بیٹھ گئی ہے۔

جمع ہیں احباب بالیں پر مرے
موت کتنی خوب صورت بن گئی

اب تک بعض لوگوں کو یاد ہے۔ ایک مدت تک شمس کو دیکھتے ہی یار دوست "خوب صورت موت" کہہ اٹھتے تھے۔

اب دنگل شروع ہوا۔ شمس کی غزل کے بعد ایسے شعرا جو مشاعرہ باز دنیا کے نزدیک سب سے آخر پڑھنے والے ہوا کرتے ہیں، بلائے جانے لگے۔ ادھر سے سوہن لال ساحر، ہری چند اختر نے تحت اللفظ ایسا سماں باندھا کہ "ارباب علم" نے اپنے بہترین خوش آواز کو اس اعلان کے ساتھ بلایا کہ مقام تو آپ کا سب سے بعد میں ہے محض "بانگی" دکھانے کے لئے تشریف لائیے۔ آپ آئے۔ برسات پر ایک نظم آغاز کی۔ "ٹپ ٹپ ٹپا ٹپ" مینہ موسلادھار برسات کا سماں باندھنے لگے۔ یکایک شور اٹھا۔ حفیظ، حفیظ، حفیظ، حفیظ۔ معلوم ہوتا تھا سامعین میں کچھ لوگ لاہور میں نظم "برسات" سن چکے ہوئے تھے ٹپ ٹپ کے ساتھ میری یاد دفعتاً ٹپک پڑی۔

اب ایک حرکت اور ہوئی۔ مولانا نے لوگوں کے مسلسل شور سے مجبور ہو کر اور جھنجھلا کر فرمایا۔ حفیظ جالندھری کا گلا بیٹھا ہوا ہے۔ اگر گلے کے بغیر شعر سنا سکیں تو بسم اللہ، تشریف لائیں۔ یہ طرزِ تخاطب اس محفل میں مناسب نہ تھا۔ اس کا اثر اچھا نہ ہوا۔ میں سیندور کا اثر دور کرنے والی گولیاں بھی چوس رہا تھا۔ شاید عذر کر دیتا لیکن تائید نے جسے میرا حال قطعاً معلوم نہ تھا مجھے اسٹیج کی طرف دھکیل دیا۔ میں نے حاضرین سے معذرت کی۔ ریاض کا شعر پڑھا ؎

گلا بیٹھا ہوا، خدمت اذاں کی وہ بھی لیتے ہیں
بہت سے ہم وبالائے تھے ناقوس برہمن بھی[1]

یا ایہا السامعین، میری شاعری محض میرا گلا ہے۔ لیکن آج یہ گلا دب گیا ہے۔ تعمیلِ ارشاد کر رہا ہوں۔ گلے بازی نہ ہو سکی تو تحت اللفظ۔ اس سے واہ رہا تو آپ کو ہنستے ہنستے چھوڑ کر بیٹھ جاؤں گا۔ مجھے اس وقت مولانا کے علانیہ طنز کا بڑا غصہ تھا۔ میں نے ایک غزل آغاز کی۔ کھولے ہوئے خون کی گرمی یا چوسی ہوئی ٹکیوں کا اثر تھا کہ آپ رفتہ بازو کا تمرین ہو گیا — آواز کھل گئی — یہ اشعار بار بار سنے گئے

مجھ کو ان مجبوریوں پر بھی ہے اتنا اختیار — آہ بھر لیتا ہوں میں، فریاد کر لیتا ہوں میں
حسن بے چارہ تو ہو جاتا ہے اکثر مہرباں — پھر اسے آمادۂ بیداد کر لیتا ہوں میں
ہاں یہ ویرانہ یہ دل، یہ آرزوؤں کا مزار — تم کہو تو پھر اسے آباد کر لیتا ہوں میں
جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے خدا — ایک عادت ہے کہ تجھ کو یاد کر لیتا ہوں میں

مجھے بار بار سنانا اور جھک جھک کر سلام کرنا پڑا۔ بے جان روایتی شاعری کے مہرے پٹتے گئے۔ "نغمہ زار" کی بہت سی نظمیں "ابھی تو میں جوان ہوں" "بسنت" "چاند کی سیر" "برسات" "فرصت کی تلاش" اور بہت سی غزلیں لوگوں نے شملے کے ایک ہی مشاعرے میں سن ڈالیں جو بعد میں "نغمہ زار" کی قدردانی اور میری تنگ حالی کے دنوں میں مددگار بن گئیں۔ مشاعرہ دن کے دو بجے شروع ہوا تھا۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے ختم ہوا۔ خواجہ حسن نظامی نے خاتمے کی تقریر میں حفیظ جالندھری کو ہندوستان گیر شہرت کا دولہا قرار دیا!

ایک مدت سے کسی بات پر ہنسی نہیں آئی تھی۔ آج بیٹھے بیٹھے اوپر کے حروف لکھتے ہوئے عہدِ جاہلیت کی اس یادداشت پر بے اختیار ہنسا۔ آپ

---

(۱) اصل شعر میں "کو" ہے جسے میں نے "بھی" سے بدل دیا ہے۔ حفیظ

دیوانہ سمجھیں گے۔ اگر میں یہ بھی بتادوں کہ ہنسی کے بعد آنسو بھی نکل آئے ہیں جن کو میرے بائیں ہاتھ نے پونچھ ڈالا ہے۔ ہنسنے میں آپ کو میں نے عمر بھر شریک غالب رکھا ہے لیکن اپنے آنسو خود ہی پونچھتا رہا ہوں۔ معاف کیجئے گا یہ ایک اور کہانی ہے ——— میں نے دولہا دلہن کے اس گٹھ بندھن پر بہت کچھ لکھ کر کاٹ ڈالا ہے۔ صرف یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اپنی منکوحہ یعنی اس ہندوستان گیر" دلہن" کی شہرت کا راج سہاگ قائم رکھنے کے لئے مجھے بڑے بڑے صدمے اٹھانے پڑے ہیں۔ اگر میں یہ واقعات بیان کردوں تو شاید آپ اتنا ہنسیں کہ آنسو نکل آئیں۔

شملے کے ان چند روزہ قیام کے دوران ارکان ارباب علم نے محفلوں اور ٹی پارٹیوں کو جو رنگ دیا جو یہ اختیار فرمایا کہیں تو کیا تسنیخ صاحب ایسے ضابط کے چہرہ پر بھی ملال اور انقباض کے آثار پیدا ہو گئے۔ میں اپنی شاعر برادری کی بعض گھٹیا باتیں بیان کرنے سے قطع نظر کرتا ہوں البتہ یہ تذکرہ لازمی ہے کہ چوتھے دن تاثیر میرے ہوٹل کے کمرے میں وہ اخبار لایا تو مشاعرے کی روداد سے بھرے ہوئے چار کالم نظر آئے۔ یہ "سکریٹری کی طرف سے پریس" رپورٹ تھی۔ ان کالموں میں وہ شعرا نام بنام اپنے کلام کے ساتھ "بہاڑا مع گر" تھے جو اسٹیج پر تشریف تو لائے تھے مگر سنے نہ گئے تھے۔ آخری سطروں میں یہ فقرہ تھا "ایک پنجابی موسیقار حفیظ جالندھری نے بھی ترنم ریزی سے محفل کو محظوظ کیا۔"

میرے ساتھیوں میں کسی کا نام تک نہ تھا۔ پنڈت اور تاثیر مسکراتے اخبار پڑھتے ہوئے فقرہ بازی کر رہے تھے۔ کہ سوہن لال ساحر بھی اخبار لئے ہوئے آگیا بہت غصہ میں تھا یہ غصہ بہت جوان اور دست دراز تھا۔ بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا گیا ورنہ مسلم ہوٹل کی نچلی منزل میں "جواب آں غزل" کی نوبت آجاتی۔

پنڈت اور تاثیر اٹھ کر شملے کے اسکینڈل پوائنٹ کی بہار دیکھنے کے بہانے چل دیے۔ واپس آئے تو ارباب علم کے مقابلے میں بزم ادب پنجاب کا منصوبہ لائے۔ میں نے یہ تجویز سن کر اپنی علمی بے بضاعتی اور کم مائگی کے سبب پہلو تہی کرنی چاہی لیکن آج ہمیشہ کے لئے کان ہو گئے کہ اس شخص تاثیر سے بحث میں الجھنے کے بجائے کان پکڑ لینا بہتر ہے پھر جب پنڈت بھی اس کے ساتھ شامل ہو۔

دو دن ہم تینوں شملے کے پست و بلند کو اپنے پاؤں کے پیمانوں سے ناپتے۔ اردو شعر و ادب کے ... ہمارے ... تھی ہوئی استادانہ دھونس کو ہمیشہ کے لئے ... کے لئے حسن اظہار خیال کے لئے آزادی سے پھلنے پھولنے کی فضا پیدا کرنے کے لئے موثر قدم اٹھانے کا مشورہ کرتے رہے۔

صدر کسے بنائیں۔ گرامی بہت دور، اقبال بہت بلند، تسنیخ عبدالقادر صاحب کا تمثیل ناممکن۔ میں نے سالک کا نام پیش کیا۔ تاثیر نے کہا۔ تاجور کے یہ بھائی ہیں۔ دونوں رسا کے شاگرد جو کہ از جانشینان داغ ہیں۔ پنڈت بولا سالک صاحب میں علامہ تاجور کے مقابلے کی ذہنی تو نہیں مگر ماشاء اللہ تو ندیلے ہیں۔ رہی شاگردی، ڈاکٹر اقبال بھی تو داغ کے شاگرد کہلاتے ہیں۔ میں نے کہا اس سے کیا ہوتا ہے "رتبہ شاگردی من نیست استاد مرا" سالک سے بہتر صدر نہیں۔ نثر و نظم دونوں میں باغ و بہار، خوش مذاق، خوش گفتار، مدیر زمیندار، افکار و حوادث نگار اور پھر یاروں کے یار۔

مجھے سکریٹری بننے کے لئے کہا گیا تو پنڈت نے سالک اور حفیظ کی جسامت پر نقد فروش اور ادھار فروش کی پھبتی کسی۔ پنڈت میرا نائب مقرر ہوا۔ تاثیر برات پر تیار لیکن کوئی عملی عہدہ قبول کرنے سے انکار۔

کاغذ پر بزم جم گئی۔ ہم لاہور آگئے۔ سالک صاحب نے صدارت مان لی۔ اب وہ ہنگامہ شروع ہوا۔ وہ اودھم مچا جس سے لاہور کے سیاسی، مذہبی دھرمی، ادھرمی جلسے جلوس مدھم نظر آنے لگے۔ اُدھر پورا ہنگامہ یہی مشغلہ سخن سازی و مشاعرہ بازی بطور کاروبار۔ ادھر روٹی فرد سر کوئی فکر معیشت کے پیچھے میں گرفتار لیکن بھی سوجھی۔ ارباب علم میں مرتبہ، اقتدار، ثروت و وجاہت و دولت سب کچھ ہمارے یہاں آئے دن اشتہار چھاپنے کی بھی توفیق نہ تھی وہ تو "نغمہ زار" کی مانگ اور فروخت نے بات بنا دی۔ ہفتے، عشرے دونوں طرف سے بڑے بڑے اشتہارات، پوسٹر لاہور کی دیواروں پر نظر آنے لگے "فلاں روز ایس۔ پی۔ ایس کے ہال میں مشاعرہ ہوگا۔ حفیظ جالندھری نیا کلام سنائے گا۔" دوسرا اشتہار لگتا "مشاعرہ فلاں روز نہیں فلاں روز ایس پی ایس میں نہیں بلکہ فلاں مقام پر ہوگا۔ ارباب علم کے فلاں فلاں بہترین شاعر داد سخن دیں گے" تیسرا اشتہار لگتا "مشاعرہ فلاں تاریخ اور ایس۔ پی۔ ایس ہال ہی میں ہوگا

دسوم دھامی مشاعرہ ہوگا، سادہ عوامی مشاعرہ ہوگا" وغیرہ وغیرہ

اکثر و بیشتر میں اور پنڈت خود اشتہار چسپاں کرنے والے کے ساتھ جاتے۔ وہ اجرت زیادہ مانگتا یا سستی دکھاتا تو یہ مرحلہ اپنے چست ہاتھوں سے طے کر لیتے اس آغاز میں ۔ سننے، تو بہت ساتھ تھے۔ دم یا قدمے کوئی ہمارے ساتھ نہ چلتا۔ مجھ سے اصلاح لینے والوں یا میرا لکھا ہوا اپنے نام سے پڑھنے والوں میں سے ۔ نامی نام ور" ہمیں اس مہم میں فرومایہ اور غیر اہم سمجھ کر دو گھڑی بلی بن گئے۔ یا ساتھ چھوڑ کر غنیم کے کیمپ میں چلے گئے۔ وہاں آؤ بھگت۔ کے ساتھ توقعات بھی تھیں۔ یہاں تھی خالی۔ ہو حق " وہاں وکیل، پروفیسر، ہیڈ ماسٹر، ادبی رسالوں اور روزناموں اور ہفتہ وار اخباروں کے ایڈیٹر مثلاً پنجابیوں میں میلا رام وفا، دستہ پرشاد فدا، اودھے سنگھ شائق۔ اثر صہبائی۔ عابد علی عابد۔ امام علی نازش وغیرہ اور ستلج پار والوں میں عندلیب شادانی۔ شاد رامپوری۔ فہیم بیگ چغتائی۔ اختر شیرانی۔ اظہر دہلوی ہمارے ہاں بس ڈھاک کے تین پات۔ میں، تاثیر اور پنڈت۔ جبار سالک کو فرصت کم تھی مہر کسی وجہ سے بے تعلق ہو گئے تھے۔ نقشہ سادہ دلی سے دونوں جانب شامل تھے۔ ہمارے مشاعروں کی رونق وہ کیسے اور ادھر کیسے تھے۔ جن کو ہم تیار کرتے تھے۔ شیخ عبدالقادر مجھ پر بہت مہربان تھے۔ سب کے دوست اردو کے پھلنے پھولنے سے خوش۔ ہم سب کے سرپرست وہی تھے۔

ہمارے صدر تھے سالک صاحب، خوش مذاقی، بذلہ سنجی اور ان کے خاص اپنے رنگ تغزل کے ساتھ طرز نظم خوانی بھی خاص تھی مگر کم فرصت تھے۔ روزنامے کی ادارات میں ہماری فضولیات کے لئے وقت کہاں۔

ہم نے ایک بزم خاصان ادب بھی بنائی تھی جس میں سالک مہر، نشتر، پنڈت اور ایک دو اور بھی دوست شریک تھے۔ ہم جو کچھ اس بزم میں سناتے اس پر اعتراض کئے جاتے اور مباحثہ ہوتا لیکن یہ بزم چل نہ سکی۔ اس دور کا لاہور سخن فہمی کے معاملے میں بہت ہی بلند تھا حتیٰ کہ ارباب علم والے مشاعرے میں طبلہ سارنگیاں لے آئے تو کسی نے اسے پسند نہ کیا۔ اہل علم ذوق نے اس طرز کے مشاعرے سے نفرت کا اظہار کیا تو بعد۔ ماجھوں، کبھی اٹھے۔ طبلے پھاڑ ڈالے۔ سارنگیاں توڑ دیں یہ کہہ کر کہ بھائی صاحب ہم پیسے دے کر شعر سننے آئے ہیں کہ تھیٹر دیکھنے۔

یوں مشاعرے امن و امان سے ہوتے تھے۔ ہمارے ہاں سامعین بڑھتے جا رہے تھے۔ اخبار میں کام کرنے والے ایڈیٹر اور رپورٹر۔ ارباب علمیوں نے جھلا کر اخباری مورچہ زیادہ گرم کر دیا۔ سارا پریس پل پڑا۔ میرے ساتھ پنڈت اور تاثیر کو بھی بے بھاؤ کی پڑنے لگیں۔ میں نے گالی کا جواب کبھی نہیں دیا البتہ پنڈت اور تاثیر کو چھیڑ کر کوئی جائے ہاں۔ اگر ہفتہ وار پارس کے فائل کھود ے جائیں تو ان دونوں کے لکھے ہوئے اس دور کے بہترین ادب پارے مل سکتے ہیں پنڈت نے ان دنوں وورتی تخلص بھی کر لیا تھا ـــ اور تاثیر نظامی اور قدوی نہ جانے کیا کیا تھا۔ میں نے بہت سی سیاسی مزاحیہ نظمیں اور غزلیں مولانا قدوسی مدظلہ العالی کے نام سے شائع کیں۔

نکمی باتیں ـــ یہ فن دہتہ ہی ترقی و تنزل کے جھگڑے، بھانجے، شعر و شاعری۔ موسیقی و مصوری ادب و ثقافت، طرز و اسلوب، خیال و اظہار خیال کیا ہے۔ بچوں کی سی نکمی باتیں " پریکٹیکل" دنیا میں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس ترقی یافتہ اور سنجیدہ دور ادب میں اس تیس مار خانی تذکرے کی اجازت کیوں دی جائے ـــ اور پھر جو لوگ شعر اپنے مقامی محاورے اور بنے بنائے سانچے لے کر دوسروں کو ان ہی سانچوں میں ڈھال دینے اردو کی خدمت کرنے نکلے تھے وہ ملک گیری و کشور کشائی کا حق رکھتے تھے۔ ان سے بغاوت اور بغاوت بھی ایسی کہ قلعہ معلی کی کوثر میں دھلی ہوئی زبان بزم ہائے خاص الخاص سے نکالی جا کر عوام الناس کے ذہن و جذبات کے گلی کوچوں بازاروں کے بھڑ بھڑکے میں سرگرداں کر دی جائے۔ بھلا پنجاب والوں کو یہ حق کون دے سکتا ہے کہ اظہار خیال کے لئے نئی گھڑنت کے محاورے نئے سانچے، نئی تصویریں۔ اور نئے چوکھٹے بے تکلف بنائیں اور بناتے چلے جائیں پھر اس بے راہروی کو آج تک مدت کے بعد کارنامہ بھی بتائیں ـــ یہ سب باتیں قصیدہ در مدح خود ہیں۔ خودستائی ہے۔ نکمی باتیں ہیں ہاں۔ آج یہ باتیں نکمی نظر آتی ہیں۔ آج اردو شاعری کی فضا شاید ترقی کر کے ان نکمی باتوں سے پاک ہو چکی ہے۔ لیکن مجھے یہ پوچھنا ہے کہ آج اردو شعر کو جو نئے اسلوب و اظہار خیال کی نئی راہیں ملی ہیں۔ کیا خود بخود خلا سے پیدا ہو گئے ہیں۔ نہیں جناب۔ والا اس دور میں میری ہی یہ بیہودہ کوشش اور بھی جنگ رنگ تھی

جس نے سخن وری کی پری کو فضاؤں میں اڑنے کے لئے آزاد کر دیا جسے چولی چلی کے علمبرداروں نے جکڑ بند کر کے زنان خانوں میں ڈال دیا تھا۔ آج یہ باتیں آپ کو نکمی اور بے ہودہ نظر آتی ہیں تو لیجئے۔ آئیے اس زندگی کے دوسرے کام کے لوگوں کی باتیں کریں۔

پورے بر اعظم ہند میں مسلمان ہر جگہ ہر مقام پر مشاعروں کے مقابل عملی زندگی کا مظاہرہ کر رہے تھے غیر ملکی حکومت سے آزادی کے لئے اتحاد کی تحریک مدہم پڑتے پڑتے غائب ہو چلی تھی۔ ذاتی مفاد دست و گریبان تھے۔ بیرونی حکومت نے نفرت کے جو بیج بوئے تھے بار آور تھے۔ خلافت کے نام سے کانگرس کا ساتھ دینے والے زعما اپنے اتحادیوں کی مرتب کردہ نہرو رپورٹ کا منہ تک رہے تھے۔ آریہ سماجیوں نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں اس طرح اٹھائی تھیں کہ سارا ملک فسادات کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ ادھر تبلیغ و تنظیم کی آواز اٹھ رہی تھی تاآنکہ سنہ ۱۹۲۷ء کے آغاز میں ستلج پار سے آکر یہ فسادی بادل لاہور پر بھی پھٹ پڑا۔ اور شہر قتل و غارت آتش زنی کی بسنت منانے لگا۔ چھرے چل رہے تھے غریب، کمزور، بوڑھے اور بچے قتل ہو رہے تھے۔ عورتیں اغوا کی جا رہی تھیں!

اجی جانے دیجئے یہ تذکرہ تو ہولناک بلکہ شرمناک ہے۔ اس سے تو وہی شعر و شاعری کی باتیں ہی بھلی تھیں ـــ اچھا تو آئیے اس داستان کو نتیجہ تک پہنچائیں۔ وہ باتیں کریں جو ادب اور ثقافت سے بے نیاز اور پریکٹیکل ہیں۔ لیجئے سنیئے میں ان دنوں پنجاب بھر کی اسلامی انجمنوں کے جلسوں میں مسلمانوں کی تعلیم کے لئے چندہ جمع کرانے کا کام بھی ساتھ ساتھ ادا کر رہا تھا اس لئے ہندو پریس مجھے کچھ اچھی نظر سے نہ دیکھتا تھا حالانکہ ان دنوں میرے باہمی اتحاد کے نئے لکھے ہوئے گیت اور نظمیں ہر جگہ لوگوں کی زبان پر تھیں۔ کرشن بنسری مندروں تک کے بھجنوں میں شامل تھی ـــ لیکن چونکہ مدینے والے کے نام "میرا سلام لیجا" بہت مشہور ہو گیا تھا اس لئے برادرانِ وطن کے اخباروں میں آئے دن میری مرمت کر دی جاتی تھی۔ ارباب علم والے اس سلسلے میں دہلی سے ایک بڑی توپ لائے۔ یہ حکیم راج نارائن ارمان تھے۔ وہ آتے ہی ایک ہندو روزنامے کے ایڈیٹر ہو گئے اور پہلے ہی دن اداریہ میں میرے خلاف لکھا چند ہی روز بعد دیال سنگھ کالج کے مشاعرے میں صدر کی حیثیت سے گئے ان کی مونچھیں بہت لانبی تھیں۔ غزل پڑھنا آغاز کیا ؎

ہم نے دیکھی ہی نہیں ایسی فسوں گر آنکھیں

ارمان صاحب نے مصرع دہرایا ـــ ہم نے دیکھی ہی نہیں ایسی فسوں گر ـــ فسوں گر پر رکے ـــ ابھی آنکھیں کہنے نہ پائے تھے کہ سامعین چلا اٹھے "مونچھیں" اب ان کا اصرار ہے کہ آنکھیں۔ سامنے سے شور اٹھتا ہے "مونچھیں" "نہیں مونچھیں نہیں آنکھیں" "نہیں آنکھیں نہیں مونچھیں" بہت خفا ہوئے۔ محفل سے نکل گئے۔ سمجھے کہ مونچھوں پر حفیظ کا ہاتھ ہے حالانکہ میں وہاں موجود نہ تھا اور نہ کسی شاعر کو ہوٹ کرانے کے حق میں ہوں اب آئی میری شامت۔ اب کے شعر و سخن میں نہیں بلکہ ہندو دیو مالا کی توہین کا الزام لگا کر حفیظ کو کرشن کنہیا کی توہین کا مجرم ٹھہرایا گیا۔ فرمایا گیا کہ نرنکار کے اوتار کو اس پنچھ نے ایک "امرد" کے طور پر پیش کیا ہے اور "بنارس کے گھاٹ پر" میری نظم کے ایک بند کو پوری ہندو جاتی کی ہتک ثابت کر دیا۔ کونسلوں میں سوال ہوئے۔ شاہ عالمی دروازے کے اندر ایک جلسہ ہوا جس کے صدر راج نارائن ارمان تھے اور موضوع "حفیظ جالندھری کی دیدہ دہنی"۔ حفیظ بیچارہ نئے رنگ کی شاعری کے طفیل اس نئے رنگ کی بپتا میں پھنس گیا۔ میں تو جل تو جلال تو ہی کا ورد کر رہا تھا کہ آئی ہوئی یہ بلا ٹل گئی۔ پنڈت رتن، لالہ کرم چند (ایڈیٹر "پارس") اور ان کے چند ہندو دوست خود بخود جلسے میں پہنچ گئے اور حفیظ کی کوتا ان ہندو بیوپاریوں کو سنائی جو وہاں کے ایک ڈسٹرکٹ مسئلے کے خلاف اس دھرم یدھ میں دھن بلیدان کرنے آئے تھے۔ ارمان صاحب کے ذلی ارمان بھی بتائے گئے تو سمجھدار بیوپاریوں نے دھن دان کرنے کی بجائے حکیم جی کے نیچے سے کرسی کھینچ لی۔ کونسل میں سوالات کو مسٹر منوہر لال وزیر تعلیمات نے سوال کرنے والے کی جہالت قرار دیا۔

استادی کی دھونس کو دور کرنے کی مہم میں میرے ساتھ محض تاثیر اور پنڈت تھے۔ تاثیر اردو فارسی عربی کے علاوہ دوسری غیر ملکی زبانوں کے ادب و فن کے دریاؤں کا غواص و تیراک تھا۔ یہ محاربہ اس کی صلاحیتِ نقادانہ کے لئے میدان پیدا کر رہا تھا۔ پنڈت کو فارسی میں ایم اے کی ڈگری لینے کے ساتھ ساتھ اردو نظم و نثر کی مہارت حاصل ہو رہی تھی۔ اس کے لئے بہترین شاعروں میں اور صاحب طرز نثر نگاروں میں عزت کا مقام بنا رہی تھی۔ ہر جگہ آزادہ روی سے لکھنے والوں کی امنگیں جاگ اٹھی تھیں۔ مختلف مقامات اردو میں بھی اور دوسری زبانوں میں بھی اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق ہماری اس تحریک

آزادی اسلوب اظہار سے متاثر ہو رہے تھے۔ یہ دیکھ کر جامد روایات نے دنیا کے مشہور ترین جرنیلوں کو محاذ پر بلا لیا۔ جن میں جید غزل گو مرزا یاس یگانہ اور سید المتغزلین کہلانے والے غزل طراز جگر مراد آبادی کے علاوہ اصغر گونڈوی اپنے تمام ضبط اور تحمل صوفی منشی بھی اپنے واردات کے ساتھ لاہور میں وارد ہو گئے حالانکہ یہ ان سب کے نیاز مندوں میں تھا۔ اور بھی بہت سے بزرگ لاہور میں جمع ہو گئے۔ ان سب کے آزوقے کے لئے رسد کا سامان بھی کر دیا گیا۔ عطر چند کپور تاجران کتب کی فرم کو لالہ لگا۔ "مرکز اردو" کے نام سے ایک عظیم الشان ادارہ بنا پرانے "دواوین" سے غزلیں انتخاب ہونے لگیں۔ محکمہ تعلیمات کے ایک ڈائرکٹر "تعلمی قطعی" کہتے ہوئے ان کتب کی فروخت میں حصہ دار قرار پائے۔ آگرہ سے جناب ساغر و سیماب بھی آئے۔ اور لاہور میں "بزم ادب پنجاب" کے ساتھ پنجاب ہی کو بنیادوں تک دعا دینے کے لئے ہر گلی کوچے میں مطلع و مقطع کی دونالیوں سے ردیفوں قافیوں کے گولے برسنے لگے۔

ادھر بھی ڈٹے ہوئے تھے۔ حفیظ۔ پنڈت اور تاثیر۔ ہمارا قلعہ "مینہ وار پارس" ہماری فوج وہ یودھ جس کو آگے چل کر زبان کشا ہونا تھا اور جیسے اسلوب واظہار خیال کے لئے آزادی بننے والی تھی۔ رسالے اور اخبارات کی پلٹنیں سب کے سب غنیم ہی کی صفوں میں تھے۔ ان سب کے نعرہ ہائے رجز کا جواب دینے کے لئے غیب سے ایک غیر معروف جرنلسٹ نازل ہو گیا جس نے حملہ آوروں کے دھرّے اڑا کر رکھ دیے۔ یا اللہ یہ کون ہے؟ مدتوں بعد پتہ چلا کہ یہ لالہ رتن چند تھے جو ہمیں اخبارات میں پٹتے دیکھ کر خدا خوفی کے حد سے سے مدد پر آ گئے تھے۔ میں نئے نئے شاعر بناتا۔ نئی نئی نظمیں اور غزلیں لکھ کر دیتا۔ ان میں سے چونکہ بہت سے ایسے ہیں جو مشہور شعراء میں شمار ہوتے ہیں اور خود لکھتے ہیں اس لئے وہ سب کچھ ان کا مال ہے۔ مقتدر، دست اور موید اپنے مراتب کو نگاہ رکھتے ہوئے عملی طور پر دونوں سے الگ تھلگ تھے۔ سالک صاحب ہماری بزم کے صدر اور بزم میں مطلع بدر تھے مگر کچھ زیادہ ہی مرنجان مرنج ہو گئے تھے۔ امتیاز کے ہاں نیاز مندان لاہور باہم گپ ہانکتے۔ سالک صاحب استادوں کی پیری مریدی پر پھبتیاں کستے۔ ہم ان کو چھیڑ چھیڑ کر استاد کہتے اور وہ کہلواتے۔ لیکن مدمقابل توپ خانہ تھا توپ کے منہ پر نہ آتے۔

عرض کر چکا ہوں کہ ملک سخن میں تخصی اقتدار کے خلاف ہم لوگ زبانی اور قلمی آویزش کی نکمی باتوں میں الجھے ہوئے تھے ادھر ملک بھر کے عملی خاص و عام اور ہی دھوم دھام دکھا رہے تھے۔ جو زبر تھے وہ زیر کو زیر رکھنا چاہتے تھے اور جو بیچارے زیر تھے کم از کم ایک مرتبہ زبر کی سطح پر ابھر آنے کے لئے لوٹنیاں لگا رہے تھے۔ ہم شاعر لوگ اس زیر و زبر میں بھی زیر و زبر تھے۔

اب ہمارا محاذ لاہور ہی ... نہ رہا تھا۔ بات بہت بڑھ گئی تھی۔ کانپور، لکھنؤ، دہلی، حیدر آباد دکن، بھوپال، بنارس، الہ آباد حتٰی کہ کلکتہ، بمبئی اور رنگون تک سے آزادی اسلوب خیال کی نئی تحریک کے خلاف نعرے بلند ہو رہے تھے دل نے کہا حفیظ جی استادی کے مراکز پر دھاوا بول دو۔ ان بیسز (BASES) پر جا پڑو جہاں سے لانگ رینج (LONG RANGE) کی توپوں سے گولے آ رہے ہیں — باہر نکلنے اور بار بار ان مراکز میں داخل ہونے کی صورت پیدا ہو گئی۔

لیکن اس صورت نے مجھے ٹھنڈا کر کے رکھ دیا مدراس میں انڈین کانگریس کا عظیم الشان سالانہ اجلاس تھا۔ صدر ڈاکٹر انصاری تھے۔ ایجوکیشنل کانفرنس لیگ کے دو اجلاس مدراس ہی میں ہو رہے تھے۔ جلسہ اول کے صدر شیخ عبد القادر اور دوم کے جسٹس سر سلیمان تھے۔ ساتھ ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی ہو رہا تھا جس کی صدارت کیلئے حضرت ابو الاثر حفیظ جالندھری کو شیخ صاحب کے ایما پر دعوت دی تھی۔ اخراجات کے لئے رقم بھی — شیخ اور مرید ہم سفر تھے۔ حیدر آباد سے شیخ الاسلام مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی بھی مدراس وارد ہوئے۔ میں نے ایجوکیشنل پریس کے دونوں بڑے اجلاسوں میں بقول شخصے دھواں دھار نظمیں سنائیں اور جب مشاعرے کی صدارت پر متمکن ہوا تو سامنے صدر کانگریس ڈاکٹر انصاری۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دونوں صدر سر عبد القادر اور سر سلیمان کے علاوہ مولانا محمد علی جوہر بھی موجود تھے۔ بلبل ہند سروجنی نائیڈو میرے قریب ہی اسٹیج پر جلوہ فرما اور میری شان بڑھا رہی تھیں اور میں دل ہی دل میں واہ رے میں کہہ رہا تھا۔

یہ سنہ ۱۹۲۷ء کے دسمبر کی آخری تاریخوں کا واقعہ ہے۔ مشاعرے میں مصرع طرح کی غزلوں سے "بور" ہو کر ان بزرگوں نے مجھ سے میرے انداز نو کا کلام سننے کی فرمائش کی۔ میں نے "پریت کا گیت"، "میرا اسلام لیجا"، "کرشن بنسری"، اور "راوی میں کشتی" نظمیں اور ترانے سنا دیے۔ جن کو سن کر محترمہ سروجنی دیوی

اٹھیں۔ انگریزی میں تقریریں جس کا ماحصل یہ تھا کہ ہندو مسلمان تو بیرونی اقتدار کو ملک سے دور کرتے کرتے اپنے اپنے جماعتی اقتدار کے لئے دست و گریبان ہو گئے ہیں اور آج ان کے لئے کوئی قاعدہ اسٹیج نہیں جہاں مل بیٹھیں۔ الا شعر و شاعری کا اسٹیج جہاں آج ہم سب جمع ہیں۔ آج گاندھی جی سے بھی زیادہ سوکھے ہوئے اس پنجابی شاعر نے ہمیں پریت گیت سنا کر جو راہ سجھائی ہے، اے کاش ہم اسے اختیار کر سکیں۔ ہم کو چاہئے کہ سیاسی لوگ جو کام نہیں کر سکے۔ شاعروں کے ذمے ڈال دیں۔ میں اس جوان مرد شاعر کو اس رہنمائی کے لئے مبارکباد دیتی ہوں وغیرہ وغیرہ

شاعرہ کا حال تو کیا چھپتا۔ سروجنی کے یہ الفاظ اور ان کے ساتھ حفیظ جالندھری کا فوٹو مدراس کے انگریزی اخباروں میں دوسرے ہی روز شائع ہو گیا ہوٹل بسوٹو مدراس میں ناشتے پر بیٹھے انگریزی اخبار کے پہلے صفحے پر زندگی میں پہلی مرتبہ تصویر دیکھ کر اور شیخ صاحب قبلہ کی زبان سے سروجنی دیوی کے الفاظ کا ترجمہ سن کر غالباً خوشی میری باچھوں سے ٹپکی جا رہی ہوگی کہ شیخ صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ حفیظ صاحب آپ بہت اہم مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ آپ کو شاعروں سے معرکہ آرائی چھوڑ کر اپنی خداداد صلاحیت کسی ٹھوس کام میں لگانی چاہئے"

میں نے استفساری نگاہ اٹھائی۔ میرے محسن کا خلوص جو بات الفاظ میں کہنے سے مجتنب تھا وہ ایک نگاہ نے میرے قلب کی گہرائی میں اتار دی اور میری طفلانہ معرکہ آرائی کی خواہش دفتی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

میں اور اہم مقام —— کوئی ٹھوس کام۔

میرے دو ... بڑے بڑے نامی نامور کس کشمکش میں ہیں۔ میرے ارد گرد کروڑوں ہندو مسلمان کیا کرنا چاہتے ہیں۔ جنگ عظیم۔ علیا نوالہ باغ ترکی اور ممالک اسلامی۔ خلافت اور کانگریس ہندو مسلم اتحاد ایک بار۔ پانی پانی۔ شدھی اور سنگھٹن۔ فسادی طغیانی ٹیگور کی راگنی اقبال کا پیغام آزادی سے پیشتر آزادی کے بعد کے لئے شرطیں۔ بہرو پیوں کے تھیٹے اور مدراس کے مشاعرے، خواجہ حسن نظامی اور شیخ یعقوب سروجنی نائیڈو کے تحسین آمیز کلمات پریت گیت میرا اسلام سے جا کرشن یا نہ کی۔ حفیظ جالندھری مبارک باد —— میں سوچتا رہا سوچتا رہا۔

واپسی پر حیدرآباد میں مہاراجہ سرکشن پرشاد نے مجھے دس بارہ دن مہمان رکھا۔ بیسیوں محفلیں منعقد ہوئیں۔ قدردانی کا ایک نیا عالم دکھائی دیا۔ وہ جو مجھے اردو کا برباد کنندہ سمجھتے تھے۔ آئندہ کے لئے میرے مربی اور موید بن گئے۔ مولانا سلیم پانی پتی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ۔ ہوش بلگرامی۔ استاد جلیل۔ شیخ الاسلام حبیب الرحمٰن شیروانی۔ اور ایسے ہی دوسرے مشاہیر نے مجھے اس طرح نوازا کہ لاہور میں مجھ سے متخاصم شعرا کی وجہ سے تمام اہل زبان کے بارے میں جو غلط فہمی میرے قلب کو رنجور کئے ہوئے تھی کافور ہونے لگی۔ سرسید کے پوتے سر راس مسعود نے یہ دل میرا کلام سنا اور حالی کے مماثل مجھ سے کچھ ایسی توقعات وابستہ کر لیں کہ میں اندر ہی اندر ... لمحاتی پژمردہ سا ہو کر رہ گیا۔ لاہور پلٹا تو میں کچھ اور بن رہا تھا۔ سر در گریبان تھا۔ سوچ رہا تھا۔ میں کیا ہوں۔ میں کیا کروں؟ آخر میرے قلب نے فیصلے کا اعلان کر دیا۔

مغنی بن کے آیا نہ راوی بن کے آیا ہے　　　یہ دنیا رزم گہ ہے تو سپاہی بن کے آیا ہے

ترے شایاں نہ دنیادار کا جامہ نہ زاہد کا　　　ملا ہے درگہِ حق سے تجھے عہدہ مجاہد کا

تجھے فرصت کہاں ہے محوِ نادِ نوش ہونے کی　　　گھڑی سر پر کھڑی ہے اب کفن بردوش ہونے کی

یہ اعلان قطب الدین ایبک کے مزار پر مراقبہ کی حالت میں ہوا۔ میں نے شاہنامہ اسلام لکھنا آغاز کر دیا جس کے تذکرے کی گنجائش یہاں نہیں ہے۔

میں ان دنوں "مخزن" کا ایڈیٹر تھا۔ ان ہی دنوں مجید ملک سے بھی یاد اللہ ہوئی۔ ان یاروں کے باہمی راز و نیاز کی ایک داستان ہے جس کا بیان طویل یہاں ممکن نہیں۔

عرض کر چکا ہوں کہ مدراس سے واپسی پر میں کچھ اور بن رہا تھا۔ میں نے معرکہ آرائی سے اجتناب کرنا شروع کر دیا۔ پرانی آویزش کے الجھاؤ سے نکلنے میں اگرچہ دقت پیش آئی لیکن ارادہ نیک ہو تو اللہ مدد کرتا ہے۔ وہ صفیں جو لاہور ... میں در آمدہ شاعروں نے جما رکھی تھیں۔ ان شاعروں کی اپنی ہی

باہمی پھوٹ کے سبب لُوٹ گئیں۔ یاسؔ یگانہ لکھنوی۔ جگرؔ مرادآبادی۔ اصغرؔ گونڈوی ایسے بڑے بڑے کمان دار کمان چھوڑ کر چل دیے۔ سیمابؔ و ساغرؔ نے بھی راوی کا پانی قدرے ثقیل پایا اور سیر جمنا کے کنارے ڈیرہ جا لگایا۔ عطر چند کپور اینڈ سنز کا بہت سا روپیہ پرانی غزلوں اور اردو شاعری کے پرانے دواوین کے انتخاب کی اشاعت سے زیادہ انتخاب کرنے والوں پر ضائع ہو چکا تھا۔ محکمہ تعلیم خریداری میں گرم جوش نظر نہ آیا۔ اربابِ علم کے متاثر شعرا سے زیادہ سامعین کو ملے حاضر پا کر غائب ہو گئے۔

بزمِ ادبِ پنجاب۔ کو بھی اب مشاعرہ بازی کی ضرورت نہ رہی۔ پنڈت ہری چند اخترؔ نے پنجاب کونسل کی اسمبلی میں ترجمان کی ملازمت کر لی۔ تاثیرؔ پروفیسری کے ساتھ ساتھ اردو شعر و فن پر نقادی کی داد دینے لگے۔ مجھے دنیائے اردو کے ہر مرکز میں حاضر ہونے کی دعوت ملنے لگی۔ میں حاضر ہوا اور یہ پایا کہ دہلی ہو یا لکھنؤ علی گڑھ ہو یا حیدر آباد۔ آگرہ ہو یا الہ آباد۔ وہ جو ذاتی اہل ذوق اور نقاد نظر ہیں کسی کو پنجابی ہونے کی وجہ سے ماخوذ نہیں کرتے۔ میرا دل کدورت سے پاک ہو گیا نظر آیا کہ اردو کی دنیا میں نیاز فتحپوری اور رشید صدیقی جیسے آفتاب بھی موجود ہیں۔ بات ع

مستی بلبل کلام مست گرید

سے بڑھ گئی ہے سخن سے خوگر ہونے کی جو مجبوری ہے کچھ نہ کچھ لکھتا چلا گیا اس عرصہ کے دوران میں پنڈت ہری چند اختر سدھار گئے مہاشہ دیوی دن بیت گئے۔ پروفیسر احمد شاہ بخاری کی سنائی آئی۔ مولانا گرامی۔ سر عبد القادر۔ میر اس ... اور تاثیر پہلے ہی جا چکے ہیں۔ مجھے علم نہیں خود میں اپنے ان بزرگوں اور دوستوں کے ہمراہ ہوں یا وہاں سے ملنے کے لئے کب تک۔ اذن یا اذان کا منتظر رہوں گا۔ میں نے اس دور میں بہت کچھ لکھا لیکن ایک جانب رزق کی تنگی کے لئے ہاتھ گھسائی تھی۔ دوسری جانب چند ساتھیوں کی ضرورت برائے ہنگامہ آرائی تھی۔ لہٰذا دوسروں کے ہاتھ سے لکھا ہوا کاغذ چھوڑ دیتے۔ جو میرے پاس ہے حالات و خیالات کی رو سے اصلاح طلب ہے۔ رسالوں کے اداریوں کے علاوہ اس دور میں جو خوبصورت کتاب شائع ہوا۔ اس میں بچوں کے لئے "بہار کے پھول" "ہمارا ہندوستان" (منظوم تاریخ ہند) اور نثر میں بچوں کے لیے بہت سی کہانیاں تھیں دو مجلدات میں "شاہنامۂ اسلام" کے تقریباً چھ ہزار اشعار اور نثر میں طبع زاد افسانوں کا مجموعہ "ہفت پیکر" چند اسلامی نظمیں۔ نیز یہ حفیظ کی کتابچی سوز و ساز جسے اس زمانے میں ایک کارنامہ خیال کیا گیا تھا آج یہ کیا ہے۔ کون جانے ہے۔ "شاہنامۂ اسلام" کے دو مزید مجلدات اور تلخابۂ شیریں وغیرہ۔ سوز و ساز اور مقبوضہ کے گیت اور نظمیں۔ بعد کی باتیں ہیں۔ اب رخصت ہوتا ہوں۔ زندگی رہی تو پھر سہی —!

اللہ اللہ کیا ہوا انجامِ کارِ آرزو
توبہ توبہ کس قدر ہنگامہ آرائی ہوئی

(سوز و ساز سنہ ۱۹۵۸ء)

بقلمِ خود (صفحہ ۲۴۴ سے ۲۴۷ تک)

اس طرح لاہور میں سنہ ۱۹۲۲ء کی آخری سہ ماہی سے میری شاعری کا دوسرا دور شروع ہوا۔ آپ کو نغمہ زار میں میری عمر کے بارہ برس سے بائیس برس تک کی مشق غزل کے نمونے ملیں گے۔ سنہ ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء کی بھی نظموں اور غزلوں کو بھی آپ دیکھیں گے میں نے پس منظر بیان کر دیا ہے۔ ساتھ ہی ہر غزل ہر نظم کے نیچے اس کا سن پیدائش درج ہے تاکہ میری موت کے بعد قلم اٹھانے والے ناقدوں کو میرا آغاز و انجام بتاتے وقت الجھن نہ ہو۔

تاثیرؔ صاحب سے میری ملاقات نغمہ زار کی اشاعت کے بعد ہوئی جب اہل زبان نے باقاعدہ لاہوری پنجابی اور اعلانِ جنگ کے ساتھ مجھ پر دھاوا بول دیا تھا۔ چونکہ یہ معاصرانہ معرکہ آرائی نغمہ زار کے بعد کا واقعہ ہے اس لئے اس کا تذکرہ نغمہ زار کی بجائے سوز و ساز کی تازہ اشاعت میں "بقلم خود" کے زیر عنوان کر رہا ہوں لیکن صرف اسی قدر جس سے میری کاوشوں سے اردو شعر میں جو ترقی یا تنزل اس دور میں ہوا اس کا پس منظر آپ دیکھ لیں گے۔ یہ میرے قلم سے ہو گا۔

(نغمہ زار۔ نیا ایڈیشن بہ ترمیم و اضافہ سنہ ۱۹۵۷ء)

حفیظ

بقلم خود

کسی دوست کو تکلیف دینے کی بجائے میں نے اپنے ہی قلم سے دیباچے کے طور پر یہ سطور درج کتاب کرنا پسند کیں اس لئے کہ نثر میں دوسرا کوئی بھی یہ طرز تحریر اختیار نہ کرے گا۔ میرا کوئی دوست ہی سہی بقائمی ہوش و حواس پریشان نگاری کا مرتکب کون ہو۔ پھر میں ایسا نادر دلچسپ موقع ہاتھ سے کیوں جانے دوں!

یہ تلخابہ جسے کہنے کو میں نے شیریں بھی کہہ دیا ہے، میری چند ایسی غزلوں، گیتوں، تھوڑی سی نظمیں اور بہت سی طویل نظموں کا مجموعہ ہے جو میں نے نغمہ زار و سوز و ساز کی اشاعتوں کے بعد اپنی دوسری مصروفیات کے باوصف لکھیں۔ مختلف رسائل میں شائع ہوئیں اور جن کو بے شمار مجالس و فن شعر میں لوگوں نے مجھ سے بھی سنا۔

مندرجات کی شیرازہ بندی کے لحاظ سے پہلے دونوں ایسے ہی مجموعے "نغمہ زار" سنہ ۱۹۲۵ء میں اور "سوز و ساز" سنہ ۱۹۳۲ء میں پیش کئے گئے تھے۔ یہ تلخابۂ شیریں تیسرا مجموعہ ہے۔ اتنی مدت یعنی تیرہ برس کے بعد یہ چھوٹا سا کتابچہ کوئی قابل قدر کارنامہ نہیں جس پر سینہ تان کر فخر کیا جا سکے۔ "نغمہ زار" اور "سوز و ساز" بھی کوئی عظیم "زینت البحر" نہ تھیں۔

تاہم اس وقت میرے لئے یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ رسالہ "مخزن" کی ادارت کے ساتھ میں نے شاہنامہ اسلام کی پہلی جلد لکھی اور خود ہی شائع بھی کی۔ خود شائع کرنا میرے لئے زیادہ پر معنی ہے۔ بچوں کے لئے بھی لکھتا رہا۔ نثر میں چند افسانے بھی مرتب کئے۔ پھر "مخزن" کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر "شاہنامۂ اسلام" کی دوسری جلد بھی مکمل کر ڈالی۔ مجموعہ "سوز و ساز" اس دوسری جلد کے ساتھ ایک ہی سنہ میں شائع ہوا تھا۔

لیکن سنہ ۱۹۳۲ء سے سنہ ۱۹۴۵ء تک [illegible] زیادہ فقط ہے۔ اس عرصہ دراز میں "شاہنامۂ اسلام" کی صرف تیسری جلد مکمل اور شائع ہو سکی۔ اب چوتھی جلد اس کتاب کے ساتھ ہی طباعت کے لئے مطبع میں جا رہی ہے۔ چند عنوانات کی دو ملی نظمیں "پردہ اور تعلیم" اور "یہ ہماری انجمن" چھاپی گئیں۔ یہ ہنگامی ... اجتماعات کے لئے تھیں۔ ایک لمبی اور مستقل نظم "تصویر کشمیر" بھی کتابی صورت میں نکلی۔ نیز بچوں کے لئے گیت اور نظمیں جمع کی گئیں۔ ان میں سے بہت کچھ میں سنہ ۱۹۲۵ء تک لکھ چکا تھا۔ اب چند اور لکھی گئیں اور چار چھوٹے چھوٹے مجموعے مرتب اور شائع ہو گئے۔ خیر یہ ایک دوسرا موضوع ہے

کہنا یہ ہے کہ چھوٹی سی کتاب تیرہ برس کی کاوشوں کا انتخاب ہے۔ مجھ سے پہلے گزر جانے والے شعرائے متقدمین کا ذکر کیوں کیجئے کہ وہ تو سبھی بڑے اور عظیم۔ لہٰذا ان کے دواوین اور کارناموں کو تو کچھ ذخار ہونا ہی چاہئے تھا لیکن اس کا جواب کیا ہے کہ میرے ہم عصر جو اپنے کلام کو جھوٹ سے الگ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے زیادہ نوواردان سخن جو مجھ ایسوں کو "آپ تو ہمارے بزرگ ہیں" کہنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ ان کا خرمن در خرمن انبار ہے کے سامنے میری ان ننھی منی ڈھیریوں کی حیثیت کچھ بھی نہیں

بقلم خود

مجھ سے یہ توقع تو ہونا ہی چاہئے — ہونا بھی چاہئے — میرے کلام کی قدر کرنے والے محاسبہ کر سکتے ہیں کہ کوئی بھی کسی کے سامنے جوابدہ نہ بھی ہو جب بھی ندامت کسی کا خود کرنے والے کی محتاج نہیں ہوتی کیا اعتراف کے لئے لازمی طور پر اپنے سے الگ کسی ہستی کی ضرورت ہے؟ کیا آدمی خود اپنی ذات پر حکم نہیں لگا سکتا؟ سرِ ندامت اپنے سامنے بھی تو جھک سکتا ہے!

میں خود اپنی ذات پر فردِ جرم عائد کر چکا ہوں۔ میں نے نثر اہلِ ادب میں وہ جوہر نہیں دکھائے جن کی مجھ سے توقع تھی۔ میں اپنی اختیار کردہ راہ کا سست گام راہرو ثابت ہوا ہوں۔

آج کیا کسی زمانے میں بھی آرٹ نے اپنے غلاموں کے تساہل کو گوارا نہیں کیا۔ تخلیقی صلاحیت وہ معشوقہ ہے جو اپنے چاہنے والے اہلِ نظر کی پلک تک جھپکنا ناپسند نہیں کرتی۔ بقول غالب ؂

رندِ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نبود
لیک صنم بہ سجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

تاہم اے میری محبوبہ! اے میری زندگی! اے میرے فن! جتنا بھی چاہے مجھ سے خفا ہو لے ... لیکن عتاب کر تا ہے کہ مجھ سے چہرہ نہ چھپا۔ میں کام چور نہیں۔ محتاط ہو چکا ہوں۔ شاید ضرورت سے زیادہ محتاط ـــ!

میرا عذر یہ ہے کہ تیرے ہی جمالِ جہاں آرا کی دید و دید کے اشتیاق میں اپنی نگاہوں کو ادھر ادھر دوڑا دینے کے لئے سراپا انتظار رہا ہوں۔۔

یہی تو چشمِ حقیقت نگر کا مرہم ہے
نزاعِ کافر و دیندار دیکھتے جاؤ

جہاں بھی تھا جس حال میں تھا آنکھیں تجھی پر لگی تھیں۔ میری آوارگی غفلت نہ تھی۔ فرار گریز نہ تھا۔ ہجرت تھی پلٹ آنے کے لئے ـــ!
دیکھ تو سہی تیرے ہی حریمِ ناز تیرے ہی خانہ باغ کی تزئین و آرائش کے لئے نوادر جمع کر لایا ہوں۔ میرے احساسات میرے تجربات، پھولوں سے بھرے کانٹے ـــ!

ہاں میں ان ہی کے لئے سرگرداں رہا ہوں شاہراہوں سے گزرتا ہوا۔ شاہراہوں سے دور دور۔ پگڈنڈیوں سے بھی دور ـــ!
پگڈنڈیاں شاہراہوں سے جا ملتی ہیں اور شاہراہیں تیرے دربارِ عام کی سیڑھیوں تک پہنچا تو دیتی ہیں لیکن پلٹا بھی دیتی ہیں۔ آج کل ان پر بڑا ہجوم ہے آنے جانے والوں کا۔ آنے والے۔ جانے والے ـــ! اور ان دونوں پر پھول برسانے والے۔ ڈھیلے پھینکنے والے بھی ـــ!
یہ آنے جانے والے بہت جوش میں ہیں۔ شور ہے۔ ہنگامہ ہے۔ ہر ایک دعویدار ہے کہ اس نے تیری اصل صورت دیکھی ہے۔ ہر ایک دعویدار تیرے خد و خال کا حال عالمانہ اندازِ تکلم سے بیان کرتا ہے۔ ان بیان کرنے والوں میں بڑا اختلاف ہے۔ مشاہدے کا اختلاف!
جھگڑتے ہیں۔ مونہوں میں کف بھر لاتے ہیں۔ دست و گریباں ہوتے ہیں ان کی عالمانہ زبانوں سے ایسی ایسی آوازیں نکلتی ہیں جیسے سڑک کوٹنے والے انجن۔ تو سنے تو یقین نہ کرے کہ یہ تیری گفتگو ہے۔ تیرا تذکرہ ہے!
عینکیں فروخت ہو رہی ہیں۔ وہ دیدہ ور جو تیری جلوہ گاہ کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ دھڑا دھڑ خرید رہے ہیں۔
رنگین رنگین عینکیں۔ دبیز شیشوں والی خوردبینیں۔ دوربینیں بھی بک رہی ہیں۔ فوٹو کیمرے بھی بک رہے ہیں۔ رنگا رنگ تصویروں کی بڑی مانگ ہے اس بڑھتی ہوئی گرم بازاری نے تصویریں ارزاں کر دی ہیں ـــ!
میں نے یہ تصویریں دیکھی ہیں اور جانتا پہچانتا ہوں جن کی یہ تصویریں ہیں۔ اے محبوبۂ فن! ان ناقدینِ فن نے تیری ذاکرانیوں کی جھلک دیکھ لی ہے کیا تجھے یاد نہیں۔ تیری پہرہ دارنیاں اور دربارِ عام کی سیڑھیوں کو گرد و غبار سے پاک رکھنے والیاں تیرے محل سرا کی حوالی میں بیرونی صدر دروازے سے باہر بھی

رہی ہیں —

یہ تیری جمالِ جاں سوز سے مالا مال ہو کر پلٹنے والے اہلِ نظر روایت فرماتے ہیں کہ تو بوڑھی ہو گئی ہے تیرے نقاب پر جھرّیاں پائی گئی ہیں اور تو کچھ نہیں سے صرف پرانی غزل!

مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ رو بھی دیتا ہوں۔ مجھے ان پر رحم آتا ہے۔ غریب بے چارے تیری جلوہ گاہ تک نہ پہنچ سکے۔ تجھے دیکھ نہیں پائے۔ ان کو پلٹنے کی جلدی تھی۔ جہاں ان کا منتظر تھا —!

میں ان سے تعرض کیوں کروں کہہ چکا ہوں مجھے ان پر رحم آتا ہے۔ ہاں تجھ سے کہتا ہوں اے نازک مزاج! تیری شاہراہیں ان لڑنے جھگڑنے والوں کی نابدلوی سے پامال ہو گئی ہیں۔ پگڈنڈیاں بھی شاہراہیں سی جاتی ہیں۔

مجھے یاد ہو کا جب میں پہلے پہل تیری طلب میں چل نکلا تھا گیت لیے سہانے تھے۔ میں ان کی پہاڑوں پر سے گنگناتا ہوا گزرا تیری وادیاں تنہا دیاں تھیں اور کہسار کا دھونا دامن بہار اندر بہار۔ نکہتِ گل اندر گل —!

تخلیقِ حسن کی کشش گھاٹیاں پتھروں پر پڑے ٹمٹماتے مشکلات کی ابھری ہوئی چٹانیں ان کی دھاروں اور نوکوں پر اپنی آنکھوں کو تواتر تکلا کر رکھنا کتنا بھلا تھا۔ میرا عزم مجھے ہر آن بلند کر رہا تھا۔ میرے عزم کو بڑھانے والا کون تھا تیرے جلوۂ منتظر کے سوا۔

اپنے ہی چلن پر چلنے اور کامیابی کی پہلی چوٹی تک پہنچ جانے پر تیری اولین مسرت کے وہ گرم گرم آنسو جن کی نمکینی اب تک میرے لبوں پر ہے اور وہ عالم جب تو نے پہلے پہل نزولِ اجلال فرمایا تھا۔ نصیر کا توصلہ بڑھانے کے لئے خیمے اور آگے اور آگے چلانے کے لئے

مجھے یاد ہے تیرے ارشاد پر میں نے پلٹ کر اپنی نگاہ ان وادیوں پر ڈالی تھی جن سے ہوتا ہوا تا م آیا تھا۔ نیچے دور دور تک تیرے حسن نے پر توسے ملو بچھی ہوئی بستیوں کی بساط اور اس بساط پر بنے ہوئے مہرے — ! ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی ایک دوسری کے متوازی ہموار راہیں اور ان پر دوڑ دوڑ کر رینگنے والے —!

مجھے کیا خبر تھی۔ میرا اس طرح چلنا بھی پگڈنڈیاں بنائے گا اور میرے پیچھے پیچھے میرے نقوشِ قدم کو مٹانے کے لئے چلنے راہوں کی گراں نرمی ہمولو کے ساتھ ساتھ ان پتھروں کو اور ان کانٹوں کو بھی کوٹ پیس ڈالے گی جن کی دھاروں اور نوکوں پر میری تنہا لوں کی رنگینیاں نثار تھیں۔

مجھے ان سے شکایت کیوں ہو۔ ایک طرح سے ان کے حوصلے قابلِ داد ہیں۔ یہ آسانی چاہتے ہیں۔ بے خدشہ سفر!

لیکن ان کو چاہئے کہ ان راہوں کو پاکیزہ رکھیں۔ اے ملکۂ فن مجھے کچھ سیاست دکھانی پڑے گی یہ ہیں اس لئے کہتا ہوں تاکہ تیرے ہاں میں بسنے والوں کے دماغ پراگندہ نہ ہو جائیں۔ نجاست بیماری پیدا کرتی ہے

اب میں بڑے ہیر پھیر کے بعد اپنی پرانی روش پر ایک دوسری سے کٹتی ہوئی اور ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی راہوں سے لڑتا بھڑتا تا اپنی نگاہ کی پدھ پر تیرے خانہ باغ میں آگیا ہوں۔ اپنی سیرگاہوں کی چمن بندی کے لئے مجھے کام کرنے دے!

ہاں دیکھ! میرے شباب کی رنگین اور سادہ کلیوں اور جوانی کے شاداب و رنگین پھولوں اور سد بہار گل لوٹوں کی بہاریں دیکھنے کے ساتھ اتھ میرے تازہ تازہ تجربوں کے کانٹے بھی دیکھ۔ جن کو سمیٹ کر میں بڑی حفاظت سے لایا ہوں اور جن کے منہ میرے اپنے ہی خونِ آرزو سے رنگین ہیں۔ دیکھ، میں ان سے باڑیں سجائے دیتا ہوں۔ رنگین پھولوں اور معصوم کلیوں کی حفاظت کے لئے۔

اے روحِ زندگی! اے ملکۂ سخن۔ تو نے خود ہی تو مجھے اپنے باغ کا مالی بننے کے لئے منتخب کیا تھا۔ میں تجھی سے تو سیکھتا ہوں اور کون تھا میرا سکھانے والا —!

آ۔ میں تیری مانگ سنوار دوں۔ اگرچہ باہر تنقید کی آندھیاں زوروں پر ہیں لیکن اب تجھے سادگی اور خوشی کی دولت تقسیم کرنے کے لئے باہر نکلنا

ہے۔ ایوان پہلے سے آئے پڑے ہیں۔ مجھے ان مقبروں سے پرے ان جھونپڑیوں تک جانا ہے جن میں بسنے والوں کے پاس دلوں کی آنکھیں موجود ہیں جن پر ٹیکس نہیں لگایا جا سکا۔ یعنی ان دلوں پر اپنا پرتو تو ڈال لگا ہوں بلانے کا وقت آگیا ہے۔

خیر ——— تیرا درشن تجھ کو دائمی بند نہیں ہو سکتا۔ سرمیوں کے سامنے پھر ایک ہجوم موجود ہے۔ یہ لوگ بھی تیری دید کے تمنائی ہیں۔ جلوۂ سنعار کے شیدائی ہیں۔ یہاں آنکھیں ڈالے رکھو۔ دو لہریں تھا یہ یہ ہر ایک کا لشان مان کر بھاگتے ہیں۔ تیرا جلوہ بے حجاب ان کی عینکوں پر گراں گزرے گا

یہ اولین مجموعہ نغمۂ زار سنہ ۱۹۲۲ء میں کاتب کے ہاتھ سے نکلا اور سنہ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں جو کچھ درج ہے میری چوبیس برس کی اولین گزشتہ حیات میں سے تیرہ چودہ برس کی محنت کا انتخاب ہے یک ہی برس کی سال نہیں اسی طرح سوز و ساز کے ۲ نظمیں نظامت سے منظور نہ ہوا تھا۔

یہ بیہ قدر نہ تھا لیکن مجھے شک ہے کہ عام مطالعہ کرنے والے ہی ہیں یہ اور تذکرہ فرمانے والے بھی کتاب پر درج شدہ سن طباعت سے آگے نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے حالانکہ خود اس کا قول ہے کہ نقاد کو اس کے با عام تاثرات سے آگے نظر رکھنا چاہیے۔

میں نے گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تھا میری عمر اب چھیالیس برس ہو گئی ہے۔ میں ۱۴ جنوری ۱۹۰۰ء کو پنجاب کے ایک پرانے قصبے جالندھر میں پیدا ہوا تھا۔ موجودہ صدی اور میں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو اسی بنا پر شاعری سے جی بھر کر کوئی اور دعویٰ کر دیتا۔ یہ میرا احسان ہے کہ میں شاعر ہونے کا بھی دبی زبان سے ذکر کرتا ہوں!

دبی زبان سے اس لئے نہیں کہ مجھے اپنے ہم عصروں کی پیش گفتاروں سے بلند پرواز کے نکلنے کی تمنا یا توقع ہے۔ نہیں یہ بات مجھے دیکھے بھالے ہیں جو کچھ کہہ سکتے تھے کر سکتے تھے کہہ چکے کر چکے۔ اس سے زیادہ کی توقع ان کی ہمت اور توفیق پر سوءِ ظن ہوگا۔ الا یہ کہ دنیا آخر ختم کچھ دھرا دیں جس کی گردان پر خادم زبان اور ہر صاحب قلم نے ہمیشہ زبان کے قلم اور زبان سے ہوتی رہی ہے۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں جب میں نے پہلے پہل روایتی انداز سخن سے ہٹ کر اپنے خاص انداز سے لکھنا شروع کیا تھا اسی وقت سے میرا ان سے سابقہ ہے اس وقت میں تازہ وارد ایسا لگ رہا ہوں تو دل میں ست تھا۔ خود سخن گوئی شست ہیں کہ آزاد سے نہ باشد کے یقین پر داخل ہوا تھا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ یہاں جنگل کا قانون ہے۔

لیکن یہاں بھی ایسی مخلوق کی بھرمار ہے ——— زبان نکالتی پڑی جس کا شعور ابھی تک دیوں پینے تک ڈالنے اور کھا جانے سے آگے نہیں بڑھا۔ باغ ادب ان کی شکارگاہ ہے۔ مجھے ان سے کہہ دینے سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ ٹولیاں کبھی مجھ پر لپکیں۔ جھپٹیں۔

پہلے پہل یہ گیدڑ بھبکی دیتے ہیں۔ کوئی سہم جانے یا الجھ جائے تو ہجوم کرتے ہیں۔ ان سے بچنے کے لئے صرف ایک ہتھیار درکار ہے۔ بے پرواہ مسکراہٹ ان کو قتل کرنے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ یہ خود ایک دوسرے کے قاتل ہیں۔ جس کو مسکرا دینے کی توفیق ہو اس سے یہ دور بھاگتے ہیں غراتے ہوئے۔ ایک بار کر دانت دکھاتے ہوئے۔

ان کے سامنے کم از کم ہڈی بھی نہ پھینکی جائے۔ اس طرح یہ ایک دوسرے ہی پر پل پڑتے ہیں اور یہ منظر کچھ ایسا خوش گوار نہیں ہوتا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی سے خائف ہے۔ نہ جانے کس وقت جھنجھوڑ کر بھنبھوڑ ڈالے۔

ان کی باتیں۔ گروہ بندی دائمی اتفاق کے لئے۔ ان کا مل بیٹھنا ہمیشہ کے لئے جدا ہونے کی تمہید۔ ان کی خوش وقتی مناقشت اور منافقت!

اے زائر ادب۔ اے مسافرِ شعر و سخن۔ اگر تیرے پاس بے پرواہ مسکراہٹ کا زبردست عصا نہیں تو اس باغ میں داخل نہ ہونا۔ اس جنگل سے نہ گزرنا ——

نہیں عتاب زمانہ خطاب کے قابل
ترا جواب یہی ہے کہ مسکرائے جا

میں نے سنہ ۱۹۱۱ء میں اپنے ارادے سے شعر کہنا شروع کیا تھا۔ غزل۔ کیونکہ یہی سکہ رائج الوقت مجھ تک پہنچا تھا اور ابتدا میں مشق کے لئے تھا بھی مناسب اور آسان لیکن انتہا میں دیکھا تو یہی غزل سخن کی دشوار ترین صنف پائی۔

میرے گھرانے میں دور دور تک شوق علم تھا نہ ذوق ادب — شاعری ورثہ میں نہیں ملی — لاگ نہیں لگی — بیماری ہوا پر سوار آئی — مجھے اس نے آلیا!

بچپن میں رسم و رسوم کے ہنگامے، میلے ٹھیلے اور ان کے ساتھ ساتھ مذہبی غلو اور بحث مباحثوں کے نظارے۔ لڑکپن میں جنگ عالمگیر اور اس کی ہولناکیوں کی آوازیں اور ان کے تاثرات عنفوان شباب کے ولولوں سے گتھے ہوئے اس جنگ کے بعد ہندوستان میں تحریک آزادی کا عمل اور ردعمل۔ ترکی اور خلافت کے لئے عام اضطراب۔ وطن اور آزادی۔ شدھی اور تنظیم۔ یہ سب کچھ اور ایسا ہی بہت کچھ۔ میرے دماغ پر مبہم مگر میرے قلب کی گہرائیوں تک سادہ تاثر چھوڑتے ہوئے گزرے۔ ان بیجوں کو اپنے اپنے وقت پر اگنا تھا۔ زمین اور وقت کی آب و ہوا سے غذا لیتے ہوئے۔

میرے گھرانے پر موت وارد تھی اندھیری جان پر نزول غم۔ میرے بھائیوں کو پلیگ، ہیضے نے چار بچے تنہا [illegible] اور یتیم۔ زندگی میرے سر پر ہر قدم تازہ ذمہ داریوں کا پہاڑ لادتی اور شاعری مجھے بلاتی تھی۔

اے مصوّر ایک تصویر اس طرح کی کھینچ دے
بار دوش بے کسی کوہ گران زندگی

انہی دنوں ایک مرد با صفا۔ ایک شاعر۔ صحیح معنوں میں شاعر یعنی ایک انسان فرشتہ رحمت کی طرح نازل ہوا۔ یہ گرامی تھا۔ روایات قوم کی پابندی کے لئے میں اس کے حضور گیا۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ فرمایا اے میری خاک وطن کے ذرے۔ تقلید سے درگزر۔ وہ زمانہ لد گیا! اسال عمر اسیر ہونے سے کیا حاصل ذرہ آفتاب آرزو کرے تو آفتاب بن جاتا ہے!

شاگردی، رنگ پیروی اور تقلید ان کے لئے رہنے دے جن کے پاس اپنی ذات نہیں۔ توانائی کی روح کو اپنے قالب سے باہر نکال۔ اپنا ہی سینہ چیر ڈال۔ دل ابل پڑے گا۔ جگنوؤں کے پیچھے نہ دوڑ۔ خود روشنی بن۔ اپنی آنکھوں کے لئے بھی اور جن کو روشنی کی ضرورت ہے ان کے لئے بھی!

صاحب نظر کی ایک نگاہ کافی ہوتی ہے۔ وہ یہ نوک بھی روایتی غزل کے شعر میں تھا۔ روایتی شاعر کا یہ ذیل ہے [illegible] لئے صداقت کا سرچشمہ بن گیا۔ میں نے اس وقت سے اپنا مقصد حیات شعر و ادب کو قرار دے لیا اور مستحکم ارادے کے ساتھ وہ تمام راہیں بند کر دیں جو نگاہ و دل میں حائل تھیں۔

ان دنوں میرا خیال تھا کہ روایتی ہو یا واقعی۔ شاعر وہ ہو سکتا ہے جس کا دل نرم۔ روح گرم ہو۔ دل آلائش جس کی سرشت میں نہ ہو جس کا ظاہر و باطن ایک ہو کسی سے بھی کینہ و حسد نہ رکھے۔ جس کو فطرت کی طرف سے نیک نفسی ودیعت ہو۔ حسن اور صداقت جس کا نصب العین ہو۔ خدائی مخلوق کا سچا دوست ہو۔ سب سے محبت کرے۔ سب کا بھلا چاہے۔ گرے ہوؤں، مظلوموں ستم رسیدوں کے لئے اس کا قلم سہارا بنے۔ زیردستوں کو اس کے شعر کی روح تازہ خون بنے اور سوئے ہوؤں کو بیدار۔ ظالم اور زبردست اس کی آواز سے لرزیں اور پست ہو جائیں۔ اس کے نغمے قطعی زندگی آمیز ہوں ذاتی غرض، ذاتی کینہ و حسد کا دخل نہ ہو

یہ اور اسی قسم کے دوسرے خیالات ہر شاعر کے متعلق گرامی کی دیدہ عالی کی تشنید۔ اقبال اور شیخ عبدالقادر کی زندہ مثالیں سامنے [illegible] تھے۔ مجھے یقین کامل تھا کہ میں ایسی خاص الخاص برادری میں شامل ہو گیا ہوں جس کا ہر فرد پیکر لطف و اخلاص ہو گا اور کیوں نہ ہو مادی سربلندی کی تمام امنگوں۔ دنیوی جاہ و ثروت کی تمام خواہشوں کو تج کر شاعر خدمت فن کو اوڑھنا بچھونا بناتا ہے۔ وہ مشہور ہو جائے یا غیر معروف۔ کامیاب ہو یا ناکام۔ اپنے ارادے اور اپنے فن کی توجہ سے دنیا بھر کا محسن ہے۔ اس کی سینہ کاوی اور دل فگاری لوریاں اور [illegible] شفقت ہے [illegible] کائنات حیات پر بیداری اور [illegible] دانساہ کی بجلیاں برساتی ہے۔

لہٰذا مجھے سخن وروں اور سخن سنجوں سے اس اخلاص کی توقع نہ ہوتی تو کس سے ہوتی۔ لیکن اسے بسا آرزو کہ خاک شدہ میرے ماحول نے ان طفلانہ خیالات کی نامبارکی [illegible]

دیکھیے مگر بہت کم ۔ اساذ کا سنہ زم ۔۔۔!

کہانیوں میں وہ بہادر جو شاہ کا طاقت اتحاد تسلیم کیا گیا ہے خود کہانی بن کر رہ گیا ہے اور جن بزرگوں نے اپنی تحریر و تقاریر سے یہ توقعات میرے دل میں جاگزیں کیں اور چلتے بنے ۔ یہ تو قعیں اپنے ساتھ ہی لے گئے ۔ ممکن ہے اب یہ احساس ان نوجوانوں کی وجہ سے ظہور میں آئے جن کو مادرِ زندگی نے دردِ اجتماعی کے نئے سانچوں میں ڈھالا ۔ اور اخوتِ انسانی کے ماحول میں پالا ہے ۔ شاید صداقت و یقین کو ان کا قلم کچھ کر دے ۔ فن پر ہویدا کر دے بشرطیکہ یہ نوجوان میرے زمانے والوں کے سانچے سے بچ نکلیں ۔۔!

پرانی تہذیب اور پرانی صدی کے باقیات صالحات میں وہ کہنہ سال بزرگ جن کو آگے زمنوں نے کہہ کر مٹایا اور شہ پایا جا رہا ہے ۔ ان کی بات کون سنے وہ چراغ سحری ہیں ۔

میں گوشہ نشین نہیں ہوں ۔ مجھے اپنے عصر کے سخن وروں سے شرفِ ملاقات کے مواقع بخت اور اتفاق نے سب سے زیادہ اور بار بار بہم پہنچائے ہیں ۔ نامی ناموروں سے نیاز حاصل رہا ہے اور ان سے کبھی واقف ہوں جو نام اور ناموری کے لئے تحسین باہمی کے چھتے بنا کر لمبے لمبے ڈگ بڑھاتے اسی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں ۔ اسی ایک منزل کی طرف جہاں یک و دو ہے نفرت ایک دوسرے کا قتل مقصدِ زندگی سمجھ لیا گیا ہے ۔

ایک طرف سیاست زمانہ کی تلوار زبان اردو اور اس بات پر جو کچھ ہے سب کا کلا کاٹ رہی ہے دوسری طرف اسی زبان کے سب سے بڑے دعویدار اور محافظ ایک دوسرے کی گردن مار رہے ہیں ۔ یہ ہے احوال میرے وقت کی اردو شاعری کا

فلک بے مہر و سالہ دشمن و معشوق بے پروا
ہر ایں آزردہ جانے تلخی غمِ دیدہ می آید

کون کہتا ہے کہ ذہین ان میں موجود نہیں ۔ چاہیں ۔ ارادہ کر لیں ۔ ذرا سی محنت برداشت کریں ۔ ذرا سا اخلاص اپنی ہی محنت کے لئے برتیں تو اپنے کردار و گفتار سے اپنے وطن اور اس میں بسنے والوں کے لئے صحیح امید بن سکتے ہیں ۔ فن شعر کے دعوی دار تھوڑے سے نہیں ہیں ۔ دھاڑے کا دھاڑا ہے ۔ ہر گلی ۔ ہر موڑ ہر نکڑ پر ۔۔!

ملک میں سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ شعر کی ضرورت اور اہمیت بڑھ گئی ہے ۔ آج ملک بہت سے ٹیگور ، حالی ، بہت سے اقبال ڈھونڈتا ہے اب شعر و شاعری چند خاص الخاص محفلوں میں ایک دوسرے کو سنا دینے اور داد واہ سن لینے تک محدود نہیں رہی ۔ آج شاعر محض کتاب میں نہیں ۔ بہ نفس نفیس عام و خاص کے اجتماع میں مطلوب ہے ۔ نئے نئے اجتماعی سوالات اور مہمات کے حل میں تعاون کے لئے شہر و دیہہ کے لوگ اپنے وقت کے شاعروں اپنے زمانے کے سخن وروں کو دعوت دیتے ہیں آنکھوں پر بٹھاتے ہیں ۔ مرغِ بلند پر کی پرواز دیکھتے ۔۔۔ نہیں ۔ زندگی تازہ ۔ حیاتِ نو کا نغمہ بیداری ان کی زبانوں سے سننے ۔۔۔ لئے ۔ گفتار کی جھلک کردار میں دیکھ کر ان کی راہوں پر چلنے کے لئے تاکہ خواب بیداری کی تعبیر ہو سکے ۔

پوچھو ۔ ان میں بلوں سے پہنے شاعروں کے افسانے ۔ دیکھو ان کی شرمناک بے باک نگاہی ۔ سلونوں کی واہی تباہی ۔

انفرادی عیوب سے کون خالی ہے لیکن اپنے عیوب کی نمائش ۔ اپنی کمزوریوں کی تبلیغ اور اس فخر و ناز کے ساتھ ۔۔!

کیا شاعر کے لئے یہ بڑا یا ہونا ضروری ہے ؟ یہ ایک سوال ہے جو شاعروں کو مدعو کرنے والے پوچھتے ہیں ۔ اس دور کے عوام کیا خواص بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ شاعر لازماً بد اخلاق ہوتا ہے ۔ حتی الوسع اس کے سائے سے بچنا چاہئے ۔ آزاد خیال شرفا بھی اپنی ماؤں بہنوں بیٹیوں اور بیویوں کو ان کی موجودگی میں پردے کی تاکید کرتے پائے گئے ہیں ۔

اب کون دبی زبان سے بھی اپنے آپ کو شاعر کہہ سکے گا ۔

جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے یہ ہے کہ تا ۔۔۔ [illegible]

کم و بیش اسی میں رہ کر "نغمہ زار" "سوز و ساز" مرتب ہوئیں۔ شاہنامۂ اسلام لکھنے کا خیال و احساس پیدا ہوا جس کی چار جلدیں شائع کی گئیں۔ باقی زیر تکمیل[1] ہیں۔ اور آج یہ تلخابۂ شیریں پیش کیا جا رہا ہے۔

کیسے کہوں میں نے یا میری شاعری نے ماحول سے اثر نہیں لیا لیکن "نغمہ زار" کا دور لڑکپن سے عنفوانِ شباب تک کا زمانہ تھا۔ سلسلہ مشق اور اظہار ان تاثرات اور احساسات کا تھا جن کی ہر بات انوکھی سہانی اور خوشگوار تھی۔ خوشی حاصل ہو جانے پر خوشی۔ رنج و غم سے دوچار ہونے پر رنج و غم۔ کراہٹ آنسو۔ کبھی طلب و تلاش۔ کبھی بے نیازی اور استغنا۔ انانیت۔ غمِ عشق کی جستجو۔ فکرِ روزگار سے گریز۔ ساتھ ہی زندگی کی اخلاقی ذمہ داریاں نباہنے کے لیے یہ نالہ — کہ:

فرصت ہی نہیں دیتے افکار معیشت کے

بے فکری۔ خود نظری۔ لطافت۔ نزاکت۔ رقص۔ آنچل۔ باغ و بہار۔ کہسار۔ ٹھنڈی ہوائیں۔ کالی گھٹائیں۔ بجلیاں۔ زلفیں۔ رخسار۔ تمنائے دید۔ سب ذاتی انفرادی خود فریبیاں "ابھی تو میں جوان ہوں" کا جلوس۔ غزلیں۔ حادثات کے خلاف غم و اندوہ ڈھالیں۔ آرزوئیں۔ امنگیں۔ تمناؤں اور ترنگوں کے افسانے۔ اپنی زبانی جوانی کی کہانی۔ سازِ حیات پر محبت کے نغمے ماحول کے روایتی پن کے سبب کچھ بے محل زیادہ برمحل کچھ۔ مفید کچھ غیر مفید مبہم مبہم۔ واضح واضح۔ شعور و امتیاز اور لاشعوری کا درمیانی برزخ۔ یہ تھا نغمہ زار۔

"سوز و ساز" کے ڈانڈے بھی اسی سے ملتے جلتے۔ یہاں جیسے گرد و پیش کے دھندلے پن سے یکایک ایک شعلہ بھڑکے۔ پردے اٹھ جائیں۔ ہر منظر پیشِ نظر ہو۔ زشت بھی خوب بھی۔ ایک خوش گوار یقین۔ کسی بات کو جاننے پہچاننے کا۔ پا لینے اور سمجھ لینے کا۔ اپنی نگاہ پر اعتماد اپنی قوتِ اظہار پر اطمینان۔ رگوں میں حرکتِ حیات اس خیال سے تیز کہ دنیا اپنی ہے۔ سب کچھ اپنا ہے۔ سمیٹ لو غم بھی۔ خوشی بھی

نظر اور ذوقِ نظر دینے والے

عجب شے بنا دی ہے ذیلے ذاتی

لیکن یہ "تلخابۂ شیریں" کیفیات میں "نغمہ زار" اور "سوز و ساز" دونوں سے الگ ہے۔ اس میں انفرادی اور نظری انانیت کا نشہ اتر چکا ہے۔ ایک نرالی دھن۔ تازہ منصوبہ۔ وہ منزل درپیش ہے۔ وہ بیج اُگے اور بار آور ہو گئے ہیں جو ابتدائی ماحول نے بوئے۔ تجربے نے جن کو ہوا و غذا پہنچائی۔ سنہ ۱۹۴۳ء کے بعد ہندوستان[2] اور اس میں بسنے والے ہم تم اور سب بڑے چھوٹے اب وہ نہیں جو پہلے تھے۔ ملکی سیاسیات اور معاشیات کے عام اور معمولی مد و جزر کا دور گزر چکا تلاطم و طوفان کا زمانہ ہے۔

فرد کی انفرادیت اگرچہ ختم نہیں ہو گئی لیکن اجتماعیت کا زندہ و بیدار اور خوش گوار شعور پیدا ہو چکا۔ جہاں ہم آغوش کے لئے چاروں طرف بارود پھیلا رہا ہے اب حسن و عشق سے زیادہ مہلک حادثے۔ زیادہ مہلک کشمکشیں ہر قدم پر ہر لحظہ رونما ہیں ؎

چناں قحط سالی شد اندر دمشق

کہ یاران فراموش کردند عشق

سارے جہاں میں جماعتی احساس کی آگ بھڑکی اور بھڑک رہی ہے۔ ہم تک اس کی گرمی ہی نہیں شعلے اور پٹیں پہنچ گئی ہیں۔ دوسری جنگِ عالمگیر کی بھٹی نے بالواسطہ ہی سہی یہاں بھی کارفرمائی کی ہے۔ یہاں بھی اجارہ داری اور مختاری کی زنجیریں پگھلنے لگی ہیں — محکوم و مجبور۔ کسان و مزدور۔ قوتِ سرمایہ

---

[1] چوتھی جلد بھی سنہ ۱۹۴۷ء میں شائع کی جا چکی ہے

[2] آج بھارت اور پاکستان۔ یہ دیباچہ آغاز سنہ ۴۷ء میں لکھا گیا تھا تقسیم سے پیشتر

(باقی صفحہ ۲۸۵ پر)

حفیظ

کچھ شاہنامۂ اسلام کے بارے میں

خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان ہے کہ شاہنامۂ اسلام کی جلد چہارم بھی مکمل ہوگئی۔ جس خلوص و محبت سے میں نے اس کو لکھا ہے اسی جذبے سے قوم کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اس پیش کش کے ساتھ چند بہت ہی اہم امور عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

پہلی تین جلدوں کے مطالعے سے ہر شخص پر واضح ہو چکا ہے کہ میرا مقصد کیا ہے اور یہ کہ میں نے یہ سلسلۂ واقعات ایک خیالی رومان یا محیر العقول رزمیہ کے طور پر پیش نہیں کیا۔

نہ یہ ہے زال کا قصہ نہ رستم کی کہانی ہے
پر سیمرغ ہے اس میں نہ رازِ ہفت خوانی ہے

تاہم میری تمنا ہے کہ یہ کتاب انتہائی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے۔ مطالعہ کرنے والے ایسے متاثر ہوں کہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو بھی سنائیں۔

لیکن میری یہ بھی کوشش رہی ہے کہ ان واقعات کے بیان میں کوئی بھی ایسی بات نہ ہو جس سے یہ اثر ایسی صورت اختیار کرے جو الف لیلہ بوستان خیال رستم داستان یا طلسم ہوشربا، ہیر رانجھا، ناٹک، ناول سینما وغیرہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسے تاثرات نہ مجھے درکار ہیں نہ میرا مقصود۔

دلچسپی پیدا کرنے اور مرد و زن کی توجہ کھینچنے کے لئے حسن و عشق۔ وصال و فراق کی کوئی جھلک ناز و کرشمہ کا کوئی نظارہ اس کتاب میں داخل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا بلکہ خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ پڑھنے یا سننے والے کی توجہ اصل مقصود سے ہٹ کر شعر و شاعری کی ظاہری اور بناوٹی مرصع کاری کی طرف نہ جائے کیونکہ نوجہ کا اس طرح بٹنا خصوصاً ایسی تصانیف کے لئے موزوں نظر نہیں آیا جو قوموں کی احیا و صلاح کے لئے لکھی جاتی ہیں۔

اور تو اور ایسی روایات تک سے پرہیز کیا گیا ہے جو کافی سند کے بغیر مولود شریف کی عام کتابوں اور بعض کتب سیر میں درج کر دی گئی ہیں یا عوام کی محافل میں گرمیٔ محفل کے لئے بیان کی جاتی ہیں۔

عوام الناس کے متعلق خواہ مخواہ یہ خیال کر لیا گیا ہے کہ وہ پست خیال ہیں اور مذکورہ بالا طرز کا عنصر کتاب میں موجود نہ ہو تو توجہ نہیں کرتے۔ میرے شاہنامۂ اسلام نے ان تمام دلچسپیوں، رنگینیوں اور گرمیٔ محفل کے ساز و سامان سے معرا ہونے کے باوجود اس خیال کو باطل ثابت کر دیا ہے۔ ہزارہا مرد و زن، بوڑھوں بچوں جوانوں نے اس کتاب کو بہ ذوق و شوق حاصل کیا۔ لاکھوں نے اس کو پڑھا۔ پڑھایا۔ سنا اور دوسروں کو سنایا اور یہ فیض جاری روز افزوں ترقی پذیر ہے

ہزارہا خطوط پاکستان و ہندوستان کے ہر گوشے بلکہ ان ممالک سے بھی جہاں کسی نہ کسی طرح تھوڑی بہت اردو جاننے والے مسلمان موجود ہیں مصنف کو موصول ہوئے ہیں اور اس امر کے شاہد ہیں کہ جس طبقے کے لئے یہ کام کیا جا رہا ہے وہ طبقہ اس کتاب سے اثر پذیر ہے۔

یہی نہیں بہت سے نئے اور پرانے شاعروں نے اس طرزِ سخن کو موثر پایا اور متعدد کتابیں اور بے شمار نظمیں اسی طرز پر لکھی گئیں اور لکھی جا رہی ہیں۔

ہاں ایک چھوٹا سا طبقہ ضرور ہے جس کو شاہنامہ اسلام سے چڑ ہے اس طبقے میں مصنف کے بعض ایسے ہم عصر شاعر لوگ ہیں جن کو شاہنامہ اسلام کی کامیابی میں اپنے فن کی ناکامی کا غلط احساس نہ جانے کیوں پیدا ہو گیا ہے۔ ان جو زیادہ آزادی نواز ہیں فرماتے ہیں کہ اس قسم کا لٹریچر جو شاہنامہ اسلام پیش کر رہا ہے اور جو صرف مسلمانوں کے لئے ہی مفید ہو سکتا ہے ہندوستان کی متحدہ قومیت اور خالص پرستش وطن کے لئے خطرناک ہے۔ ان سچے وطن پرستوں کا مطالبہ یہ ہے کہ ترقی پسند لوگ اسلام کو رجعت سمجھتے ہیں لہٰذا موجودہ دور میں اسلامی روایات کا تمسخر اڑانے اور ہندوستان میں رہنے والی مسلم آبادی کو اپنے ماضی سے بیزار کرنے کے سلسلے میں ان کی تقلید کرنا ہر شاعر کا فرض ہے۔ ان کا بیان ہے کہ اس طرح عوامی دنیا میں انقلاب آ جائے گا اور ان کی لوحِ مزار پر شاعرِ انقلاب کچھ ایسے حروف میں لکھا جائے گا جس کے پڑھنے والے شاعر اور انقلاب دونوں سے بے خبر ہوں گے۔

میں نے اپنے ان کرم فرما شاعر لوگوں کی زبان و قلم سے بہت کچھ سنا اور برداشت کیا ہے اور میں نے اپنی ذات کو تلقین کی ہے کہ ؎

نہیں عتابِ زمانہ خطاب کے قابل
ترا جواب یہی ہے کہ مسکرائے جا

البتہ بعض لوگ ایسے ہیں جن کا قول ہے کہ ہم حفیظ سے بہتر توقعات رکھتے تھے۔ یہ شاکی ہیں۔ شاہنامۂ اسلام میں وہ دلچسپیاں کیوں نہیں جو حفیظ کے دوسرے کلام میں نظر آتی ہیں۔ ان کو تعجب ہے کہ حفیظ کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ پوچھتے ہیں کہ وہ حفیظ کہاں ہے جس کے ابتدائی کلام پر یہ رائے دی گئی تھی کہ

"حفیظ کے قلم کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں تصویریں بن بن کر سامنے آتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں۔ لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہیں۔ ساون رت گھنگھور گھٹاؤں میں کھیلتی ہوئی بجلی، موروں کی جھنکار، پپیہوں کی پکار، برسات کی ٹھنڈی ہوا۔ ہوا میں اڑتے ہوئے آنچل، آنکھوں میں تمنائے دید اور فراق کے آنسو۔ دل کا انتظار کی دھڑکن یہ ایک مست کیف شاعری کی وہ دنیا ہے جس میں حفیظ گاتا پھرتا ہے۔"

میرے نقاد شاہنامہ اسلام میں اس رنگ کو تلاش کرتے ہیں نہیں پاتے تو چرچا فرماتے اور چہچہاتے ہیں کہ حفیظ بطور شاعر ختم ہو گیا۔ چونکہ یہ لوگ میرے خیر خواہ ہیں شاید یہ چرچا اور چہچہانا نیک نیتی پر مبنی ہے اس لئے زندگی میں پہلی مرتبہ اس توضیح پر مجبور ہوں۔

مذکورہ بالا رائے میرے اولین مجموعۂ کلام نغمہ زار پر دوسری بے شمار غلغلہ آرا تحسین و آفرین کی تحریروں میں سے چنی نہیں گئی بلکہ ایک محتاط ترین ناقد کی رائے ہے یعنی ۱۹۲۵ء میں یہ رائے پروفیسر احمد شاہ المخلص بہ پطرس نے دی تھی۔ یاد رہے کہ میں نے شاہنامۂ اسلام کا آغاز سنہ ۱۹۲۶ء میں کر دیا تھا۔ گویا ایک سال ہی میں میرا جامِ سخن رنگینیوں کی شرابِ مشک کی بو سے خالی ہو چکا تھا۔ اور گویا وہ کوئی اور ہے جس نے نغمہ زار کے بعد سوز و ساز اور تلخابۂ شیریں کی غزلیں، گیت، نظمیں لکھ کر میرے نام سے شائع کر دیں۔

شاہنامۂ اسلام جلد اول کے دیباچے میں شیخ سر عبدالقادر صاحب فرماتے ہیں:

"اکثر شعراء نے اس شاہنامۂ اسلام قسم کے بڑے کام بڑھاپے میں اپنے ذمے لئے ہیں۔ حفیظ کے جاننے والوں میں جن کی نظر سے ان کی وہ نظم گزری ہے جس کا عنوان ہے "ابھی تو میں جوان ہوں" انہیں شاید حفیظ کی شاعری کو اس شانِ بزرگی اور تقدس میں جلوہ گر دیکھ کر تعجب ہو لیکن جو شخص ان کے تخیل کی بلند پروازی سے آگاہ ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ جست حفیظ کے لئے دشوار نہ تھی۔ حفیظ عمر میں جوان ہے لیکن شاعری میں بوڑھوں کی صف میں جلوہ گر ہے۔ زودِ طبع، ہر بسنت اور بہار پر ایسی نظمیں لکھتا ہے جس سے معلوم ہو کوئی شخص جو رنگین مزاجی کے سب مرحلوں سے گزر چکا ہے۔ آپ بیتی باتیں لکھ رہا ہے اور جوانی کو مست اور دیوانی دکھانے میں اپنی کہانی بیان کر رہا ہے مگر یہ صرف اس کی خداداد

ذہانت کے رتھ میں ورنہ زمانے نے اس کو اتنی فرصت ہی نہیں دی کہ دنیا کی رنگینیوں کو قریب سے دیکھے یا اس کے مزے لے"

یہ اس لیے نقل نہیں کیں کہ ان سے میں مدح و ثنا کا کوئی پہلو پیدا کروں۔ شاعر ہونے کے باوجود مجھ میں اتنی عقل ضرور ہے کہ ثنائے خود بخود گفتن کا مصداق نہ بنوں۔ ان اقتباسات سے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ "اگرچہ ابھی تو میں جوان ہوں" بسنت اور بہار کی نظمیں رنگین مزاجی کے عملی مراحل سے گزرے بغیر بھی لکھی جا سکتی ہیں۔ اگر جوانی کی مستی دردِ دیوانہ پن حفیظ کی آپ بیتی نہیں تخیل کی پرواز ہے اور اگر بقول سر عبد القادر صاحب حفیظ دنیا کی رنگینیوں کے مزے لئے بغیر بھی ایسی نظمیں لکھ دیتا رہا ہے تو اس سے اتنا ضرور ثابت ہے کہ مصنف اگر چاہتا تو عامۃ الناس میں اس کتاب کو اور زیادہ مقبول کرنے کے لئے کہیں نہ کہیں (ذوقی ہی سہی) عشق و محبت، حسن و ادا یا محرّالعقول شان و شکوہ کا اظہار کر کے اپنا کمال منوا سکتا تھا۔

پھر حفیظ نے ایسا کیوں نہیں کیا۔؟

یوپی کے مشہور ناقد اور شاعر پروفیسر رگھوپتی فراق نے اگست سنہ ۱۹۴۱ء میں ایک تقریر براڈکاسٹ کرتے ہوئے کہا:۔

سنہ ۱۹۲۵ء سے اب تک سولہ برس کے اندر حفیظ جالندھری نے لگاتار اپنے کلام کے مجموعے ملک کے سامنے پیش کئے۔ نغمہ زار، سوز و ساز، شاہنامۂ اسلام پہلی جلد، دوسری جلد، تیسری جلد اور مختلف رسالوں میں نئی غزلیں اور نظمیں۔ لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ ہمارے گذشتہ پندرہ برسوں کے مشہور شعرا کے کس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں یا بحیثیت مجموعی کون شعرا ان سے متعلق ہیں۔ یا نمایاں طور پر ان سے متاثر ہیں۔ بات جو کچھ بھی ہو لیکن حفیظ کی بہت سی نظمیں ملک میں اس قدر مقبول ہو چکی ہیں۔ زبانوں پر اتنی چڑھی ہوئی ہیں اور کانوں اور دلوں میں اس طرح گونج چکی ہیں کہ حفیظ کو اس دور کی شاعری سے غیر متعلق ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اس دور سے ان کا گھنا سمبندھ اور جیتا جاگتا تعلق ماننا پڑتا ہے

حفیظ کی شاعری نے جن خوبیوں کی وجہ سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا ان میں سب سے زیادہ نمایاں ان گیتوں کا سنگیت یا ترنم تھا یہ چیز اکبر، چکبست، اقبال اور جوش ملیح آبادی۔ یوں کہنا چاہئے کہ حفیظ سے پہلے کسی شاعر کے یہاں اس رنگ اور اس شکل سے ہمیں نہیں ملتی۔ موسیقی اور شاعری۔ گیت اور نظم۔ ترانہ اور ادب کا ایسا میل دیکھنے میں نہ آیا تھا ـــ شاعر نے ان نظموں کو موزوں کرنے میں۔ ان کو رچنے میں۔ نکھارنے اور سنوارنے میں ظاہر ہے کہ حالی آزاد اکبر چکبست درگا سہائے سرور اقبال بلکہ انیس اور نظیر اکبر آبادی تک کسی نظم گو یا غزل گو شاعر سے اثر نہیں لیا ہے ـــ!

دوسرے شعرا نے گیت لکھنے کی بالارادہ کوشش کی وہ گیت کی اسپرٹ میں نہیں ڈوب سکے۔ وہ ہندی گیت کی سادگی میں ہندی گیت کا ٹھوس پن نہ لا سکے۔ اس لئے ان کے گیت پھسپھسے۔ بے مغز۔ پھیکے ہلکے اور کمزور رہے۔ برعکس اس کے حفیظ جالندھری کے گیتوں اور ترانوں کے مصرعے اور ٹکڑے پُر مغز اور بامعنی ہوتے ہیں۔ رومانی منظریہ اور ہر طرح کے گیتوں میں حفیظ جالندھری نے سہل ممتنع کی بے لاگ مثالیں دی ہیں۔ کوئی ایسی نظموں کے لکھنے کی کوشش کرے تو معلوم ہو ـــ!

یہ تیاری یہ ابلتی ہوئی دراٹھلاتی ہوئی جوانی یہ بے تکلف اور بے لاگ رچاؤ اور نکھار۔ یہ شوخ اور نکیلی رنگینی یہ دھن یہ سریلا پن۔ یہ رنگ۔ یہ رس یہ کسک اور یہ انگڑائیاں ہم کو آج تک کسی اردو شاعر میں اور کہیں نہیں ملتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصرعے اور اشعار کہے نہیں گئے ہیں بلکہ چھلکا پڑتے ہیں:

حفیظ کی منظر نگاری خاص توجہ کی مستحق ہے۔ موسیقی اور مصوری۔ سنگیت اور چتر کاری کا جو میل حفیظ کی منظریہ نظموں میں ہمیں ملتا ہے وہ کم سے کم مجھے تو اور کہیں نہیں ملا۔ یہ لے اور جھلکیاں۔ مناظر کے احساس میں یہ ابھار۔ یہ کسک اور مقامی

رنگ (خاص) چیزیں ہیں۔!

حفیظؔ کی غزلوں میں بھی یہی چلتی ہوئی اور ابھرتی ہوئی جوانی نظر آتی ہے جس میں البیلے پن کے ساتھ وہ حلاوت اور معصومی ہے

وہ متوازن اثر چھپن ہے وہ جذباتی کیفیتیں ہیں وہ تیور اور مردانہ انداز ہیں جو میں اور شعراء میں نہیں ملتے۔!"

فراقؔ صاحب نہ میرے ہم مذہب ہیں نہ ہم وطن۔ میرا ان سے دوستانہ میل جول بھی نہیں خط و کتابت ہے۔ یہ سچ ہے کہ جب میری نظر سے یہ تحریر گذری تو مجھے تعجب ہوا اس لئے کہ جہاں تک اردو شعر و شاعری کے موجودہ دور کا تعلق ہے۔ صوبجاتی اور طبقاتی تعصب انتہا پر ہے۔ پارٹیاں بنی ہوئی ہیں اور جو شاعر کسی پارٹی میں نہ ہو اور ہو بھی "ٹکسال باہر" اس کی کسی خوبی کا اعتراف ذرا غور کرنے کی بات ہے

رسالہ آواز سے یہ طولانی اقتباس اسلئے لیا گیا ہے کہ یہ ایک بے لاگ ہندو ادیب و نقاد و شاعر کی رائے ہے جو حفیظ سے حسن ظن رکھنے کی وجہ سے حق رکھتا ہے کہ حفیظ اس کے اعتراض یا استفسار کا ٹھنڈے دل سے جواب دے۔ کیونکہ اس تحریر کے آخری حصے میں رگھوپتی فراقؔ فرماتے ہیں:

"جہاں تک شاہنامۂ اسلام کا تعلق ہے مجھے اور شاید بہتوں کو حفیظ کی شاعری کے اس خاص رنگ اور خاص انداز سے شاہنامۂ اسلام بالکل بے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ اگر کوئی اسے بے اختیار ہو کر سر اپنے پر تلا ہوا ہو تو وہ اسے جھوم جھوم کر پڑھ سکتا ہے اور اگر حفیظ کی دوسری شاعری کے مقابلے میں شاہنامۂ اسلام کسی کو پسند نہ آئے تو وہ یہ سمجھ لے کہ ملٹن نے فردوسِ گمشدہ لکھنے کے بعد کئی ایسی چیزیں لکھیں جنہیں شعریت سے زیادہ نثریت ہے۔ ایک فطری شاعر کی زندگی میں کبھی نثریت کا دور بھی آتا ہے۔"

یہ فتویٰ صادر کرنے کے بعد موصوف دریافت کرتے ہیں

"کہیں ایسا تو نہیں کہ شاعرانہ جذبے کی جگہ ملّی جذبے نے لے لی ہو؟"

شاہنامۂ اسلام کے بارے میں محترم ناقد نے جس طرح سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے مجھے اس صاف بیانی سے بجائے ملال کے انتہائی مسرت ہوئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اس بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری سمجھا ہے تاکہ اگر کسی قسم کی غلط فہمی شاہنامۂ اسلام کے بارے میں ایسی آرا کی وجہ سے پھیل سکتی ہے تو اس کا ازالہ ہو جائے۔

شاہنامہ اسلام شعریت ہے یا نثریت اور یہ نثریت و شعریت میں کیا فرق ہے۔ یہ صفحات اس بحث کے متحمل نہیں ہو سکتے البتہ اندازہ کرنا چاہئے کہ ہزارہا عوام الناس کا اجتماع بیک وقت سات سات گھنٹے شاہنامۂ اسلام کو ذوق و شوق سے سنتے دیکھا جا رہا ہے۔ آپ فرمائیں گے کہ حفیظ کے پڑھنے کا انداز ہی ایسا ہے۔ بجا۔ لیکن حفیظ سے بہتر انداز سے پڑھنے اور سنانے والوں کے لئے دو تین غزلوں یا ایک ہی نظم کے دوران میں لوگوں کو کھانسی کیوں شروع ہو جاتی ہے؟ یہ درست! یہ حفیظ یا کسی اور کے پڑھنے کا انداز نہیں بلکہ شاہنامہ کے بین السطور ایک خاص تاثر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ آپ اس کو نثریت کہئے یا شعریت وہ مقصد حاصل ہے جس کے حصول کے لئے اکیس برس سے یہ محنت شاقہ جاری ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے جلد اول کے آغاز میں شاہنامہ کے مقصد پر نظر نہیں ڈالی

تمنا ہے کہ پھر لہو ان کا اک بار گرماؤں　　　　دلِ سنگیں سخن کو آتشیں تیروں سے برماؤں

سناؤں ان کو ایسے ولولہ انگیز افسانے　　　　کرے تائید جن کی عقل بھی۔ تاریخ بھی مانے

کیا فردوسیؔ مرحوم نے ایران کو زندہ

خدا توفیق دے تو میں کروں ایمان کو زندہ

بہرصورت یہ نثریت بھی ہو تو میں آپ کو یہ اطلاع بہم پہنچا دینا چاہتا ہوں کہ اس کے لئے میری حیاتِ سخن پر کوئی الگ دور نہیں آیا جاگ سوزِ عشق، اگر شن بنسری وغیرہ گیت منظر بنتے نہیں۔ وہ تمام غزلیں جن کو آپ نے رومان بھری وغیرہ کہا ہے اور جن کے حوالے اپنی براڈکاسٹ میں دیئے ہیں یعنی وہ سب کچھ جو سوز و ساز اور تلخابۂ شیریں

میں درج ہے۔ سن ۱۹۲۵ سے سن ۱۹۴۷ کے درمیانی دور کا کلام ہے۔ اس دور کا جس میں شاہنامۂ اسلام کی چار جلدیں بھی ظہور میں آئیں۔ یہ کہ "ایک فطری شاعر کی زندگی میں کبھی کبھی نثریت کا دور بھی آ جاتا ہے" چونکہ بیک وقت ایک شاعر اور نقاد کا قول ہے اس لئے ضرور تجربے اور تحقیق پر مبنی ہوگا لیکن کسی فطری شاعر کی صلاحیت ان دونوں طرز کے ذریعہ اظہارِ سخن پر بھی بیک وقت حاوی ہو سکتی ہے۔

کیا آپ کسی ایسے باغبان سے واقف نہیں جو اپنے باغ میں رنگ رنگ کے پھول بھی کھلاتا ہے اور پھل دار درخت بھی لگاتا ہے کیا آپ یہ کہتے ہیں کہ پھولوں کے بنانے سنوارنے یا آپ کی زبان میں رچنے اور نکھارنے میں تو باغبان کا فن قابلِ تحسین ہے لیکن ثمرآور درختوں کو پروان چڑھانے میں کوئی ہنر نہیں۔ للعجب!

رہا آپ کا یہ سوال کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ شاہنامہ اسلام کے لکھنے میں شاعرانہ جذبے کی جگہ ملی جذبے نے لے لی ہو۔؟

جناب پروفیسر رگھوپتی فراق اور اسی قسم کا سوال کرنے والے ان تمام بزرگوں اور دوستوں کی تسلی کے لئے میری جانب سے گزارش ہے کہ ہاں بے شک شاہنامہ اسلام ملی جذبے ہی سے لکھا جا رہا ہے اور اگر یہ جذبہ ملی حبِ انسانیت کے منافی و متضاد نہ ہو تو کسی کے لئے اندیشہ کی وجہ نہیں

لیکن یہ کہنا کہ ملی جذبہ نے شاعرانہ جذبہ کی جگہ لے لی ہے چست فقرہ نہیں۔ یوں کہنا چاہئے تھا کہ شاعر نے اپنے جذبہ ملی کی تسکین کے لئے شعر سے کام لیا ہے۔ باغبان نے ضرورت سمجھی ہے کہ اپنے باغ میں محض پھول اور سبزہ ہی نہیں بلکہ درخت بھی لگائے جو سایہ دار بھی ہوں اور پھل بھی دیں۔ آپ کو صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ مقصد پورا ہو رہا ہے یا نہیں۔ آنکھ اٹھا کر دیکھئے کہ اس کڑی دھوپ میں کتنی مخلوق ہے جو شاہنامۂ اسلام کا ورد کرتی ہوئی سرگرم ہے اور شکستہ نہیں رہی۔

اور کتنے بے شمار کام و دہن ہیں جو شاہنامہ اسلام کے اثمار سے لذت یاب ہیں! بے شک شاہنامہ اسلام میرے دوسرے کلام سے بہت مختلف ہے یہ اختلاف گیا ہے یہی ناگن سی موہن صورتیں۔ کلیوں سے کے گجرے۔ نازک رسیلی تانیں۔ شوخیاں ناز و انداز۔ اٹھلاتی ہوئی جوانیوں کی انگڑائیاں۔ اڑتے ہوئے آنچل۔ بسنت۔ ساون۔ ٹھنڈی ہوائیں۔ اودی گھٹائیں۔ زلفیں اور ان میں جھلکتی ہوئی بجلیاں۔ آنکھوں میں تمنائے دید اور فراق کے آنسو یا وصال و بغل گیری کی چٹکیاں شاہنامۂ اسلام میں نہیں ہیں۔ ہاں نہیں ہیں یقیناً نہیں ہیں۔ اس لئے نہیں ہیں کہ ان کو یہاں نہیں لایا گیا۔ میری اجازت کے بغیر یہ مسخرے یہاں کیسے گھس سکتے تھے۔؟

شاہنامہ اسلام معرکۂ حیات ہے بازیچۂ اطفال نہیں۔ آپ یہاں کھیل کود کا تصور ہی کیوں کریں۔ دنیائے شعر میں ابھی اتنی وسعت موجود ہے کہ تفریح گھر اور عبادت خانہ الگ الگ تعمیر ہو سکیں۔ دونوں کے خلط ملط کی مجھے تو فی الحال کوئی ضرورت نظر نہیں آتی۔ یہ اصرار کیوں ہے کہ تفریح گھر کی تعمیر اور آرائش میں جو ساز و سامان استعمال کیا گیا ہے وہ معبد میں کیوں نظر نہیں آتا۔ دونوں ایک ہی ڈیزائن پر کاریگر نے نہیں بنائے۔ مسجد میں محراب و منبر کیوں ہے آرکسٹرا کا اسٹیج کیوں نہیں۔ دیواروں پر آیاتِ قرآنی کیوں درج ہیں حسین حسین تصویریں کیوں نہیں۔ لوٹے اور مصلے بھلے معلوم نہیں ہوتے۔ قطار در قطار شراب کے کنٹر آراستہ کئے جانے چاہئیں۔!

اگر آپ اس قسم کے سوال کریں گے تو میں بپاس احترام ہنسوں گا تو نہیں البتہ سر جھکا کر یہ عرض کروں گا کہ یہ مسجد ہے حضور والا!

میں بے خبر نہیں ہوں ایسے خیال کی ملتیں موجود ہیں جن کے عبادت خانے ہی میں سامان تفریح بھی مہیا ہو سکتا ہے لیکن ملت اسلام ابھی ترقی کی اس حد تک نہیں پہنچی۔ وہ خدا کی مسجد کو بازیگاہ نہیں بنانا چاہتی اور شاہنامۂ اسلام اسی ملت کے لئے لکھا جا رہا ہے۔

شاہنامۂ اسلام ایک قلعہ ہے جو فولادی اور سنگلاخ بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے۔ اس کی دیواریں پھول پتی سے نہیں اٹھائی گئیں۔ اس کے برج کو غنیم حوادث کا مقابلہ کرنے کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔ ان بھاری پتھروں کی تراش اور ان کے محلِ مناسب پر جمانے کے لئے جو صنعت اور مہارت استعمال کی گئی ہے۔ وہ فن گچینہ گری سے الگ ہے اس قلعہ کا حسن اس کے رعب ہیبت اور وقار میں ہے۔ نازکی لچک یہاں نہیں کیوں یہاں نازکی اور لچک کمزوری پر دلالت کریں گی۔ اس قلعہ میں تفریح کا سامان قلعہ کے اندر رہنے اور بسنے والوں کے ضبط و نظم اور قوائد و قوانین کی پابندی میں ہے

گلزار پر بہاروں میں نرم رو جوئبار کی دل کشی سے کسے انکار ہے لیکن فلک آشنا پہاڑوں کا خاموش رعب و وقار اور دریاؤں کے فراٹے میں بھی تو حسن اور نغمہ ہے شاعر کی چشم تصور جب گوکل کا درشن کرتی ہے تو کانوں میں جمنا کنارے بنسری کی سریلی تانیں بھی آتی ہیں۔ معصوم گوپیوں کے رنگین جھرمٹ میں برجنا تھ کا رقص بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہیں شاعر کا دل بھی رقص کرتا ہے اور بے اختیار "بنسری بجائے جا کاہن مرلی والے نند کے لال" کا الاپ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر یہی

چشمِ تصور جب درہ خیبر کا نظارہ کرتی ہے تو مہیب ناہموار چٹیل پہاڑوں کے دامن پر پگڈنڈیاں قسمت اقوام کی خونی لکیریں دکھاتی ہیں اور زبانِ حال سے ؎

یہ بے آباد دہشت ناک دہشت خیز ویرانہ
ہے لاتعداد شور انگیز تہذیبوں کا افسانہ

سنانا آغاز کر دیتا ہے۔ آریوں کے دل بادل راہ کی دشواریوں سے بے نیاز یہاں سے گزرتے اور زمین ہند پر آسمان بن کر چھائے نظر آتے ہیں۔ آتش قدم قافلے قدموں کو روندتے ا۔ جھلساتے ہوئے رواں دواں محسوس ہوتے ہیں۔ یہاں گوکل کی پھوار اور ننھی بوندیں نہیں بلکہ آئینہ خیال میں یہاں کا گرد و غبار فوج سکندری کی آندھی کا بقیہ معلوم ہوتا ہے۔ فولادی چٹانوں پر سورج کی کرنیں مسلمانوں کی تلواروں کی طرح چمکتی ہیں۔ اس چمک سے رعد کا تصور ہوتے ہی نعرۂ تکبیر کی گونج سے چٹانیں کے سینے لرزتے ہیں۔ غزنوی اور غوری۔ تیمور و بابر کے لشکر گزرتے ہیں۔ اور گزر جاتے ہیں۔ سب گزر جاتے ہیں۔ شکوہ نادری بھی۔ اقبال ابدالی بھی۔ لیکن شاعر دیکھتا ہے کہ اس درے کے پتھر اور کانٹے جن کے منہ راہروؤں کے آبلہ ہائے پا سے سرخ ہیں اسی شان و وقار سے قائم و دائم ہیں۔

درہ خیبر میں شاعر گوکل کی برسات کی پھوار نہیں دیکھتا۔ آموں میں پڑے ہوئے جھولے۔ وہ جھولنے والیوں کی رسیلی تانیں نہیں سنتا۔ یہاں کی فضا اور ہے اس لئے تاثرات بھی مختلف ہیں اور ان کے اظہار کے لئے تکنیک بھی الگ۔ یہاں کی فضا ہمہ تن انتظار ہے کہ دیکھیں کہ اب کون رہوارِ دہشت پر سوار اس درے کا رخ کرتا ہے ہاں یہ درہ خیبر کہ:

نہ اس میں گھاس اگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں　　　مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں
گرجتی بجلیوں کی اس جگہ چھاتی دہلتی ہے　　　گھسا پٹ کر نکلتی ہے ہوا تھرا کے چلتی ہے

یہ ہیں ایک ہی شاعر کے آرٹ کی دو مختلف تصویریں۔ کیا اپنے اپنے محل وقوع پر دونوں وقیع نہیں۔؟

شاید میرے نقادوں میں سے کوئی صاحب میری جگہ ہوتے تو گوکل میں کھڑے ہو کر نعرہ اللہ اکبر بلند فرماتے یا درۂ خیبر سے گزرتے ہوئے حملہ آوروں میں شامل ہو کر بنسری کی تان اڑاتے۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میرا آرٹ یہ نہیں ہے۔

آگے چل کر فراق صاحب فرماتے ہیں:-

"مجموعی حیثیت سے حفیظ کی شاعری کا کیا مرتبہ ہے اس کے متعلق پھر کہوں گا کہ سنہ ۱۹۲۵ء کا ہندوستان اور اس وقت کے نوجوانوں کی جیتی جاگتی اور رچائی اور سنواری ہوئی تصویر اپنے اسی کرن منتر کے ساتھ نظر آتی ہے جیسے وندصیاچل کی دیوی کی تیسرے پہر کی جھانکی یا کرشن لیلا کی جھانکی۔ حفیظ نے اپنی ایک نظم میں جس کا نام ہے تین نغمے۔ ٹیگور اور اقبال دونوں کی شاعری سے کترا کر نکل جانے کی جو راہ نکالی تھی اس کا ذکر بہت اچھے انداز میں کیا ہے۔

لیکن سنہ ۱۹۲۵ء اور اس کے بعد کا ہندوستان جوانی کی اس بے فکری۔ اس امنگ اور اس دلفریب انفرادیت سے ۔۔ یا اجتماعیت۔ کے قدیم نظریوں سے گزر گیا جس کی ترجمانی حفیظ نے کی ہے اور خوب خوب کی ہے۔ اب اس جوانی کے نظری جذبات غور و فکر کے اس بلوغت سے گزر رہے ہیں۔ اجتماعیت کے وہ نئے نظریے جن سے آج سے چھ سات برس پہلے ۔۔ کا ہندوستان بے خبر تھا۔ دوسری حسرتیں۔ دوسری ناکامیاں۔ دوسرے خواب ہندوستان پر آج چھائے ہوئے ہیں۔ اس دور کی ترجمانی اگر حفیظ جالندھری اپنی شاعری میں کریں گے تو وہ چیز نغمہ زار سوز و ساز اور شاہنامہ اسلام سے بھی ذرا مختلف ہوگی۔ پرانی دنیا مر رہی ہے۔ نئی دنیا جنم لینے کی کوشش کر رہی ہے۔ حفیظ کی شاعری کا دور اگر ختم نہیں ہو گیا تو اسے ایک نیا جنم لینا پڑے گا۔"

سنہ ۱۹۲۵ء کے بعد کا ہندوستان جس کے نئے تجربے اور نئے خوابوں کا ذکر نقاد نے کیا ہے ان خوابوں کی تعبیر کے طور پر۔ وہ نئی دنیا جو مدت سے

(باقی صفحہ ۲۹۶ پر)

حفیظ

حالی

زباں پہ ارے خسروا یا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کے لئے

مرزا غالب نے یہ شعر کسی تجمل حسین خان کی مدح سرائی میں "ادائے خاص سے نکتہ سرائی" کے دعوے کے ساتھ "یاران نکتہ داں" کو "صلائے عام" دیتے ہوئے فرمایا تھا۔ وہ دور گردشِ دوراں کا تھا۔ ہندی زمینوں پر آفتاب سلطنتِ اسلام غروب ہو چکا تھا۔ بزم دہلی کی آخری شمع بھی بجھ گئی تھی، دھواں اٹھ رہا تھا اور ملک و ملت پر ماتم کی چادر چھائی ہوئی تھی۔ تاہم غالب کا یہ ممدوح اس عالم میں بھی "نصیر دولت و دین اور معینِ ملک و ملت" کہلواتے چلے جانے کے باوجود عیش کے وہ مزے لوٹ رہا تھا کہ غالب ایسا شاعرِ اعظم بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ ؎

ملا ہے خلق کو کیوں تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

شعر و شاعری اس عہدِ پر آشوب تک زیادہ تر امیروں، وزیروں، سرکاروں ہی سے وابستہ اور اسی عیش و عشرت کی پروردہ تھی اور ان ہی تجمل حسین خانوں کی مدح طرازیاں نکتہ سرائیاں بنتی رہی تھیں۔ اس دور پر تعریض میری مجال نہیں۔ میں تو شکر گزار ہوں کہ اسی روش سخن نے غالب ایسے لاثانی شاعر کا ایک ایسا شعر مجھے بھی مہیا کر دیا جسے میں کسی عیش ربودہ ممدوح "امیر" کے حضور زیبائش کرنے کے لئے نہیں، ایک درد کے مارے ہوئے غریب شاعر کے لئے استعمال کر رہا ہوں جو حسن اتفاق سے غالب ہی کا شاگرد رشید بھی ہے جس کا نام آتے ہی میرا نطق بصد احترام میری زبان کو ایسی عقیدت سے چومتا ہے جیسے لوگ مقدس تعویذ کو چوما کرتے ہیں اور یہ نام ہے حالی

حالی جس نے ابدالی سے بڑھ کر معرکہ مارا
تکلم سے مسخر کر لیا ہندوستاں سارا

حالی، شاعر کی حیثیت سے ان ہی روایات میں پلا اور پھولا پھلا تھا جو غالب تک پہنچی تھیں اور آج بھی ہزاروں اردو شاعروں کی نکتہ سرائی کا باعث ہیں اس دور میں زوالِ ملک و ملت اور انگریزی فوجوں اور لٹیروں کے ہاتھوں دہلی اور بعض دوسرے مقامات پر مسلمان مردوں اور عورتوں کی بربادی کے وہ ہولناک مناظر ہزاروں شاعروں نے بھی دیکھے تھے جو حالی کے ہم عصر تھے عین اسی طرح جیسے آج تقسیم ہند کے وقت ہم سب نے بہت بڑے پیمانہ پر دیکھے ہیں۔ آج ہم شاعر لوگوں میں کتنے ہیں جو اپنے پرانے خیالی محبوب کی بیداد پر دہائی دینے کے بجائے خون کے دریاؤں میں ڈوبنے والوں کی

یاد اور آزادی کنارے آ لگنے والی ملت مظلومہ کی ہمت پر جوش مبارک باد بن گئے ہوں — چند — معدودے چند — لیکن سنہ ۱۸۵۷ء کی افتاد کے بعد تو ایسے معدودے چند بھی نہیں تھے یعنی شاعر تو بے شمار تھے شاعروں کی کمی نہ تھی لیکن ملت کی صورت حال اور وہاں سے متاثر محض حالی ہی تھا جس نے اس اجڑے ہوئے چمن میں تازہ بہار لانے کے آغاز کا فریضہ انجام دیا۔

چند ایک شعر گو چند ایک مرثیے کہہ دینے کے بعد اپنی پرانی روش پر قائم رہے۔ فقط حالی نے سخن سازی کی پرانی روش کو عیش و عشرت کی خالی خیالی لذت یابی کی تبلیغ کو بے ہودہ گوئی اور نفس پروری کے لئے بہانہ جوئی گردانا یہی نہیں بلکہ حالی ہی نے شاعری کی ... ان لذت یابیوں کو مسلمانوں کی معاشری دینی، سیاسی و اخلاقی پستی کا سبب اور ذمہ دار بھی مانا اور حالی ہی تھا جس نے اس روش کو یکسر ترک کر دیا۔

ترک کر دینا۔ پرانی روش سے توبہ کر لینا۔ دیک کر گوشے میں بیٹھ جانا اور اللہ اللہ یا توبہ تلا کرنا شاید آسان ہو لیکن حالی نے شاعری کے ملکۂ خداداد کو شرف انسانیت کی بلندی اور اسی کے ذریعے ذہنی افیم خوردگی کا اثر زائل کرنے کی وہ راہ نکالی جس کی آج بھی ہم کو ضرورت ہے بلکہ آج یہ ضرورت زیادہ ہے جب کہ ہم از سر نو شوکتِ ملت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے ایک ایسے مقام پر کھڑے ہیں جہاں چاروں طرف سے ہمارے ذہنوں کو مسموم کرنے والی ہوائیں امڈی ہوئی ہیں۔

سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد اگر حالی زبان بن کر ترجمان نہ ہو جاتا تو سرسید جو مدہوش، غفلت کوش اور دست و پا شکستہ ملت کے سینہ کا ایک واحد دھڑکتا ہوا دل تھا۔ حریت، بیداری اور حوصلہ بخش کارگذاری کی وہ روح کروڑوں انسانوں کے قالبِ مردہ میں نہ پھونک سکتا جس کے نتیجے کا ظہور ہماری موجودہ حیات ثانیہ اور فردوس گم گشتہ کے ایک حصہ کی بازیافتگی سے معمور ہے۔

حالی نے حسن گفتار سے کردار کو صراطِ مستقیم پر لانے کی جو ایک راہ نکالی اس پر خود بھی چلا اور اپنے نقوشِ قدم ہمارے لئے بھی چھوڑ گیا۔ اب ہمارے لئے کہ شاعر بنے پھرتے ہیں لیکن منزل مقصود کی طرف قافلہ کو "حدی را تیز تری خواں" کی تاکید پر عمل کرتے ہوئے آگے بڑھانے والے اور حالی کی پگڈنڈی کو شاہراہ بنانے والے کتنے اور کون کون شاعر اور سخن ور ہیں۔؟ نام اور مقام بتانے کا کام ادب و شعر کے ناقد اور مورخ انجام دیں گے۔ آج نہیں تو کل سہی۔ میں تو یہاں محض یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ برِ اعظم ہند پر فرنگی تسلط کے دن سے آج تک شعر و سخن کے جتنے بھی ترقی یافتہ اسلوب ہیں اگر مقصود حسنِ اخلاقِ انسانی یا جذباتِ ایمانی کی ترجمانی ہے تو ایسے ہر پردۂ ساز کے نقطۂ آغاز میں حالی ہی کی آواز نغمہ طراز ہے۔

کوئی اور مانے یا نہ مانے۔ میں — کہ گذشتہ نصف صدی سے اظہارِ جذبات و احساسات کے لئے نئی سے نئی دھن الاپنے کا مجرم ہوں، اعتراف کرتا ہوں کہ میری کج مج بیانی کا جو بھی تعلق اسلام اور ملتِ بیضا سے ہے اور یہ شجر جو کسی حد تک بار آور دکھائی دیتا ہے اس کا بیج اس اثر کا ممنون ہے جو میرے لڑکپن میں حالی کی مسدس نے میری سرشت میں بو دیا تھا۔

کہانی قدرے طولانی ہے لیکن جس مقصد سے میں نے آج باسٹھ برس کی عمر میں قلم اٹھایا ہے اس تک خود پہنچنے اور آپ کو پہنچانے کے لئے یہ آپ بیتی سنانی اور سننی ہی پڑے گی۔

میں آپ سے رخصت ہونے اور جلد تشریف لے جانے والوں میں ہوں۔ موجودہ نسل اور اس نسل کے بعد آنے والے کتنی بھی ترقی کریں شعر و شاعری کے اثر سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ شاعر بلبل ہو یا جھینگر اپنے ماحول کو متوجہ کرتے ہی رہیں گے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنی سمجھ کے مطابق آپ کو سم آلود ہواؤں سے بچ نکلنے کا وہ تریاق بتا دوں جس نے مجھے ہلاکت سے نکالا تھا۔

آج آپ تعلیم و تعلّم۔ ذوق و نظر کے معاملے میں ہم لوگوں کے مقابلہ میں ترقی یافتہ ہیں اور آئندہ نسلیں مزید ترقی سے آراستہ ہوں گی انہی توقعات کے پیش نظر یہ سطور لکھ رہا ہوں کہ اگر آپ کو اپنی گذشتہ تاریخ کو جاننے سے پہلے احتراز نہیں تو آپ کو ماننا چاہئے کہ آپ کی یہ ترقی اور آئندہ ... کی امیدیں خلا سے پیدا ہو یدا نہیں ہیں۔ سلطنت مغلیہ اور برِ اعظم ہند کے مسلمانوں پر زوال شوکت کی صد ہا تمیس جو بیتی اور پھر فرنگی حکومت اور ہندوستان

میں بسنے والی غیر مسلم اکثریت نے بین منصوبوں کے ساتھ مسلمانوں سے ایسے معاملات روا رکھے جن کے پیش نظر آخر تقسیم ہند ہی کی صورت میں مسلمانوں کو اپنی بقا نظر آئی۔ اس کو جان لینے کے ساتھ یہ جاننا بھی آپ کے لئے بہت ہی فائدہ رساں اور ضروری ہے کہ وہ کون لوگ تھے جو فرنگی سیاست اور غیر ملکی اکثریت کے چنگل سے نکال کر آپ کو اپنی مرضی کے مطابق جینے سنورنے کے قابل بنا گئے۔ اور اس کارگذاری میں شاعروں کا اگر کوئی حصہ ہے تو وہ کون کون تھے اور کیسی کیسی گمراہ کن آندھیوں کے درمیان ع

به مصطفیٰ برساں خویش را که دیں همه اوست

کا چراغ روشن رکھتے چلے گئے۔ آپ کو یہ کیوں جاننا چاہیے؟ اس لئے کہ ابھی قافلہ مصطفیٰ تک نہیں پہنچا ــــ اس راہ کی طرف رخ کرتے اور پاکستان کی دھرتی پر پہلا قدم دھرتے ہی دنیا بھر کے سبز باغ دکھانے والے مصطفیٰ کی راہ سے برگشتہ کرنے کے لئے رنگ رنگ کے چولے دھارے ہوئے رہزن قافلہ میں شامل ہو گئے ہیں اور ذہنی تفرقے کے درپے ہیں تاکہ وحدت عمل پیدا نہ ہونے دیں اور قافلہ راہ کے پہلے ہی مرحلہ پر پھر تتر بتر ہو جائے۔ شاید میں اس بات کا اہل نہیں ہوں کہ گذشتہ تاریخ کے سمندر میں آپ کو تیراکی کا کوئی گر سکھاؤں۔ یہ کام مجھ سے بہتر لوگوں کا ہے البتہ میں کہ خود منتشر افراد کارواں میں سے ایک تھا جس کو حالیؔ نے سیدھی راہ دکھائی۔ مختصر طور پر آپ بیتی سنائے دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس پر غور فرمائیں گے اور مفید معلوم ہو تو کام میں لائیں گے۔

میری ولادت سنہ ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔ پرانے دور میں ایک صوبہ پنجاب نام کا ہوا کرتا تھا۔ اس صوبہ میں دوآبہ بست یعنی دو دریاؤں بیاس اور ستلج کے اندر محدود زمین میں جالندھر ایک شہر تھا۔ اس شہر میں سکھ، ہندو، عیسائی، چوہڑے چمار اور مسلمان سب ہی آباد تھے۔ ایک متوسط درجہ کے مسلمان گھرانے میں اللہ نے میرا بھی اضافہ کیا تھا۔ اس گھرانے میں قرآن کے حافظ اور مکہ معظمہ کے حاجی تو تھے لیکن تعلیمی شعور یا شعر و شاعری کا ذوق دور دور تک نہ تھا۔ ان دنوں مسلمان بچے مسجدوں میں بغدادی قاعدہ پڑھ کر قرآن شریف کو بغیر ترجمہ یا معنی جانے پڑھتے اور ان میں سے بعض حفظ بھی کیا کرتے تھے چنانچہ چھ برس کی عمر میں مجھے بھی مسجد میں ناظرہ قرآن پڑھا کر ساتھ ہی کریا مقیماں ٹاکر مشن اسکول کی پہلی دوسری پرائمری کا طالب علم بنا دیا گیا۔ آج اس وقت کا تصور یہ بتاتا ہے کہ ان دنوں جالندھر آریہ سماج کا بہت بڑا گڑھ تھا۔ آپ کو شاید یہ بھی معلوم نہ ہو کہ آریہ سماج کسے کہتے ہیں۔ آریہ سماج ہندوؤں کے بے شمار فرقوں میں سے ایک ایسا سرگرم دھرمی فرقہ تھا (اور اب بھی بھارت میں موجود ہے) جو ہندو ادھرمی عیسائی یا ڈشٹ مسلمان ہو جانے سے روکنے کے لئے قائم ہوا تھا۔ پراچین ویدوں کے یہ پرچارک آریہ سماجی مہاشے لوگ خاص طور پر اسلام ہی کو لوگوں کو ہندو دھرم سے منحرف کر کے مسلمان بناتے چلے جانے والا دین سمجھتے تھے اور یہ بات تھی بھی سچ۔ لہٰذا وہ نہایت دریدہ دہنی، گستاخی اور بے باکی سے اسلام کا کھنڈن ... علی الاعلان کرتے۔ منصوبہ یہ تھا کہ ان مسلمانوں کو جو عرب یا اسلامی ملکوں سے آکر یہاں قابض ہو گئے تھے اور سات آٹھ سو سال تک فرماں روا بنے رہنے کے بعد چونکہ ان کی اولادیں اپنی قوت کھو بیٹھی ہیں، ان کو بھارت ورش کی پوتر بھومی سے یا تو ہانک کر نکال دیا جائے یا اگنی دیوی کے قہر میں بھسم کر ڈالا جائے اور ان لاتعداد مسلمانوں کو جو ہندوؤں ہی سے مسلمان ہو چکے ہیں اور جو کروڑہا کی تعداد میں اس ملک کے ہر گوشہ میں رہتے بستے ہیں سب کو "گئو موتری" پلا کر شدھ فرما کر شودروں اور چنڈالوں میں شامل کر لیا جائے اس طرح رام راج قائم ہو جائے گا۔

ان دنوں آریہ سماجیوں کی دو بڑی درس گاہیں تھیں "گروکل" اور جالندھر۔ جالندھر میں آریہ سماجیوں کے نگر کیرتن ہر ششماہی ہوا کرتے تھے پرچارک اور بھجنیک مہاشے تقریروں کے ذریعہ دین اسلام کا کھنڈن فرماتے اور ہارمونیم پر اپنے کھنڈنی بھجن گاتے ہوئے بازاروں سے گزرا کرتے مجھے ایک منڈی ڈاڑھی والے، لمبی لمبی مونچھوں والے، منڈے ہوئے سر پر سے موٹی لٹکتی ہوئی چوٹی والے، بھجنیک کے بولوں کا گیت ابتک یاد ہے

گروکل سے جب برہم چاری آئیں گے
مکہ میں جا کے آریہ مندر بنائیں گے

اسی طرح ہمارے عیسائی بھائی بھی جن کے غیر ملکی مشن ہر جگہ قائم تھے، ہم مسلمانوں کو توحید سے ہٹانے اور ایک کی جگہ تین خداؤں کی آسمانی بادشاہت کی بشارت قبول کر کے عیسائی ہو جانے کی تلقین کرتے تھے۔ ان کو بھی مسلمانوں ہی سے خاص اندیشہ تھا۔ شاید یہ انگریزی راج کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لئے لوگوں کے عیسائی بننے میں اسلام ہی کو حائل پاتے تھے۔

اور ہم تھے مسلمان، ہر طرف سے ہم کو متعصب ہونے کا الزام دیا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ عامۃ المسلمین کو ہرگز معلوم نہ تھا کہ یہ منظم تحریک یہ اشتعال انگیزی اور زبانوں کی یہ تیزی کیوں ہے۔ اس منصوبے کی غرض و غایت کیا ہے؟

زوال حکومت کے بعد سے مسلمانوں کے معاشرے میں کوئی دینی یا معاشری و سیاسی تنظیم موجود نہ تھی۔ علی گڑھ تحریک ابھی ذہنوں کا انجماد نہ توڑ سکی تھی میں اپنے جالندھر کا ذکر کر رہا ہوں۔ میرا تصور اپنے لڑکپن کے دور کا جو مرقع سامنے لاتا ہے وہ یہ ہے کہ بیساکھی، دیوالی، ہولی، لوھڑی، بسنت پنچمی اور رام لیلا کے میلوں، ٹھیلوں میں مسلمان، ہندوؤں اور سکھوں کے برابر کے شریک رہتے تھے لیکن عید، بقر عید اور محرم میں فساد کے خطرات لاحق بیان کئے جاتے تھے۔ ہندوؤں کی ایک مثل تھی کہ مسلمانوں کے تہوار چار ہیں۔

کاٹا — پیٹی — پھوکا — بھاکی۔

"کاٹا" قربانی والی عید — "پیٹی"، محرم کہ لوگ روتے پیٹتے "پھوکا" شبرات جس میں آتش بازی بھی ہوتی اور "بھاکی" یعنی فاقہ زدگی، رمضان اور اس کی عید۔ اس کو تمسخر کے طور پر ضرب المثل بنا لیا گیا تھا۔

مسلمانوں کی دینی تقاریب، عید، بقر عید، شبرات، اور محرم کے علاوہ مسلمانوں کے دلچسپ اور دلکش اجتماع بزرگوں کے مزارات کے عرس تھے۔ یہ میلے عام تھے۔ یہاں قوالیاں خاص کشش رکھتی تھیں۔ ہجوم اندر ہجوم مسلمان قوالوں کے گرد بیٹھتے۔ دور دور تک گھیرے ڈال کر کھڑے کھڑے شوقین بھی پرے جاتے۔ بہت لوگ جمع ہو جاتے۔ صوفیوں اور ملنگوں کے علاوہ ایسے بھی بہت تھے جو مرغ اور بٹیر لڑاتے۔ کنکوے اڑاتے۔ کباب اور تکے کھاتے۔ جا بجا حقہ کشی ہی نہیں بلکہ سائیں لوگوں کے ساتھ چرس کا دم بھی لگا لیتے۔ بھنگ کے پیالے بھی چڑھا لیتے۔ بہت اودھم ہوتا اور قوالوں کی ٹولیاں طبلے سارنگیوں کے ساتھ دھمڑ دھڑا دکھاتیں۔ بھانت بھانت کی دھنوں میں گاتیں اور دنیا سے بیزاری کو خدا تک پہونچنے کا ذریعہ بتاتیں

علموں بس کریں او یار

اکو الف ترے درکار

(اے دوست تحصیل علم سے کنارا کر لے۔ ارے تجھے تو بس ایک الف ہی کی ضرورت ہے)

اس پر سب لوگ سر ہلاتے اور بعض سائیں لوگ بیچ کھیت ہُو حق کرتے ہوئے ایسا حال کھیلتے۔ ایسے وجد میں آتے کہ مسلمان اس میلے سے ایک "ا" یعنی خدا تک پہونچ جانے کا گر سیکھ کر ہر راہ علم و عمل سے فرار کرتے ہوئے گھروں کو واپس لوٹتے۔

یہ عرس اور ان میں قوالیاں شہروں، قصبوں اور دیہات میں پنجاب ہی کیا نیم براعظم ہند کے ہر علاقے میں جہاں بھی مسلمان آباد تھے ان دنوں کی عام دھوم دھام تھیں۔ بعض مزاروں پر تو رنڈیوں کے ناچ بھی ہوتے تھے بلکہ چند مزار اس کے لئے اچھی خاصی شہرت رکھتے تھے (حال ہی میں شاہ بری لطیف راولپنڈی میں اس اخلاق سوز دل کشی کو روکا گیا ہے) مزاروں کے علاوہ رنڈیوں کے ناچ مجرموں کی غیر اسلامی تفریحات نے سرکاروں، درباروں اور امیروں وزیروں کو اجاڑ چکنے کے بعد مسلمانوں کے گھروں کو آ لیا تھا یعنی شادی بیاہ کی خوشی کے لباس میں۔ خانۂ خالی را بوئی گیرد فرمالیں، حالانکہ راجہ اندر کے دھرمی پجاریوں نے ان اپسراؤں سے قطع تعلق کر لیا تھا شاید اسی سبب یہ دیوداسیاں مسلمانوں کے دلوں کو صنم کدہ بنانے پر مجبور تھیں۔ میری ایک نظم "رقاصہ" اسی خانماں برباد نظارے کے خلاف ایک یادگار فریاد ہے۔

بہرحال تفریحی دلچسپیاں کچھ ایسی ہی تھیں جن کا ہم سب شکار تھے۔ گویا بادشاہی اور سلطنت کی تباہی کے بعد پوری قوم یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ ہاں ع

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

تاہم دینداری بھی موجود تھی۔ مسجدوں سے آذانیں گونجتی تھیں — بچوں کو مسجدوں میں قرآن شریف پڑھائے جاتے تھے۔ مولوی بھی جمعہ کے خطبہ میں بعض دوسری رنگا رنگ روایات کے بل پر ہیر رانجھا اور یوسف زلیخا اپنی خاص طرزِ خطابت کے ساتھ غریبی اور مسکینی کو حتمی طور پر بہشت، حور و غلمان اور چشمۂ کوثر کا مژدہ بھی سناتے رہتے تھے اور دوزخ سے بھی ڈراتے رہتے تھے۔

لیکن دینداری میں مدہوش مولوی صاحبان زیادہ تر فرقہ انگیزی کے جوش و خروش کو ہوا دیتے نظر آتے تھے۔ میرے لڑکپن نے آئے دن اپنے دیندار بزرگوں کی معیت میں حنفی، وہابی، اہل حدیث، اہل قرآن، احمدی، محمدی، پیر پرست اور تکفیر بدست پہلوانان دین و ملت کے ہنگامہ آرا بحث مباحثوں اور مناظروں کے ایسے اکھاڑے دیکھے جن میں مسلمان گروہا گروہ اور انبوہا انبوہ شامل ہوتے۔ مجھے یاد ہے کہ

ایک سوئی کے ناکے میں سے بیک وقت کتنے فرشتے گزر سکتے ہیں؟

کی بحث مولویوں اور عالموں میں چھڑی اور ان کو ماننے والوں کے مجادلے سے دنگے فساد کی صورت ہند و مجسٹریٹوں کی عدالتوں تک پہونچی اور مدتوں شہرت پذیر رہی۔ آج آپ ان باتوں پر مشکل ہی سے یقین کریں گے لیکن میں ان مراحل سے ہو کر نکلا ہوں اور اس کے نتائج سے بیزاری کے احساسات کا نقش میرا اپنا ہی ایک شعر ہے جو اس بیتی ہوئی پر روشنی ڈال سکتا ہے۔

میں کہ اب دربدرِ میکدہ و میکدہ ہوں
اہلِ مسجد کا ستایا ہوا آفت زدہ ہوں

کہنا یہ ہے کہ جس دور کا تذکرہ کیا جا رہا ہے مسلمانوں کی تفریحات ہوں یا دینداری ایک دوسرے میں گتھے ہوئے اعمال و خیالات کی ایک عجیب کھچڑی سی تھی۔ اور ہم مسلمان بے خبر تھے کہ اس کے علاوہ بھی کوئی اور زندگی ہے۔ اپنی ہی عظمت گذشتہ کا اصل سبب یعنی دین مبین ہم سے روپوش تھا اور چونکہ احیائے دین کو ایک خاص رخ پر عمل پیرا ہونے کے لئے ناچ رنگ یا سب و شتم کی لذتوں کا تجنا اور پرانے دور کی مجاہدانہ سخت کوشیاں ضروری تھیں اس لئے ہم نے خواب خرگوش کی مدہوشیوں کے ماحول ہی کی درندگی کا شکار ہو جانا اختیار کر لیا تھا۔

یہ تھا زمانہ جب میں نے پہلے پہل حالی کا نام اور کلام سنا۔

مسلمانوں کے گھرانوں میں رفتگاں کو ثواب ہی نہیں بلکہ گرسنہ روحوں کو بھوک کے عذاب سے بچانے اور اچھی اچھی غذا پہونچانے کے لئے مساجد کے بینا اور نابینا اماموں اور ملاؤں اور درویشوں کی ضیافتیں، درختم و درود روزمرہ کی باتیں تھیں اور حصول ثواب ہی کے شوق میں مسجدوں کے صحنوں یا گلی محلے کے کھلے مقامات پر میلاد شریف کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ عورتیں گھروں کی چار دیواریوں کے اندرونی صحنوں یا حویلیوں کے دالانوں میں مولود شریف سے ثواب حاصل کرتی تھیں۔ یہ محفلیں میرے خیال میں بہت مبارک تھیں۔ ان سے حب رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا نقش دلوں پر بیٹھتا تھا۔

البتہ نعت گوئی ان دنوں جیسی بھی کچھ تھی اس پر مجھے اس کے سوا اور کچھ کہنا نہیں ہے کہ نعت گو شعرائے اردو اپنے عام مجازی اور ملت اسلام کے مطلوب حقیقی کے درمیان کوئی حد فاصل قائم نہیں کر پائے تھے۔

ہم بچے لوگ۔ میں اور میرے ہم سن لڑکے لڑکیاں نعت خوانی اور خوش الحانی کی نقل اتارنے اور اپنے ساتھیوں کی حرکات پر کھلکھلانے کی وجہ سے دھتکارے اور دھکیائے جانے یا ایک آدھ تھپڑ کھانے کے باوجود محفل کے خاتمہ پر شیرینی سے مٹھیاں اور گلے بھر لانے کے لئے موجود رہا کرتے تھے

غالباً یہ سنہ ۱۹۰۷ء کا واقعہ ہے۔ میری عمر سات برس کی ہوگی۔ ایک بہت بڑی محفل میلاد میں مختلف نعت خواں ٹولیوں کی خوش الحانی سے سارا مجمع وجد میں تھا کہ لاہور سے بلائے ہوئے ایک نعت خواں کی زبان سے ؎

ہوئی پہلوئے آمنہؓ سے ہویدا
دعائے خلیلؑ و نوید مسیحا

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ
مفاسد کو زیر و زبر کرنے والا — قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اشعار سنے اور ساتھ ہی اسی شخص کو ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسلؐ وقتِ دعا ہے — امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے — پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

سناتے اور مسلمانوں کے اس مجمع کو وجد میں سر ہلانے کے بجائے حیرت یا عبرت میں گم سم ہو جاتے اور آنسو پونچھنے کے لئے اپنی پگڑیوں کے گوشوں کو آنکھوں تک لے جاتے میں نے دیکھا۔ مجھے یاد ہے، میں بھی اپنے باپ اور دادا کے ساتھ اداس ہو کر گھر پلٹتا۔ میں نے اپنی والدہ سے اس نئے طرز کی نعت شریف کا ذکر کیا۔ گھرانے کی عورتوں میں میری والدہ ہی مسئلے مسائل کی اردو پنجابی کی کتابیں مطالعہ کرتی رہتی تھی۔ میرے تحصیل دار نانا نے اپنی بیٹی کو پڑھنا تو سکھا دیا تھا، لکھنا نہیں سکھایا تھا۔ مجھے نعت خوانی کا شوقین پا کر میری والدہ نے مسدس حالیؔ منگوا دی تھی۔ (میرا لحن بچپن میں سریلا تھا، یہ لحن مدتوں سریلا رہ چکا ہے۔ ترنم سے اپنا کلام سنانے کے انعام میں اپنے شاعر بھائیوں سے اب تک ڈوم میراثی کی پھبتیاں سنتا ہوں)

والدہ ہی نے ؏

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا۔

حصہ مجھے زبانی یاد کرا دیا۔ مناجات حالی بھی میں نے معنی و مفہوم جانے بغیر ازبر کر لی۔ پہلے پہل میں یہ نعت اور مناجات عورتوں کی محافل میلاد شریف میں سنانے لگا۔ جالندھر کی مولود خواں بیبیاں مجھے چمکارتیں۔ اپنے ذہین بیٹے پر فخر کرنے کے جذبات میری والدہ پھوپھیوں اور دادیوں کے دلوں میں ابھارتیں اور آئے دن مجھے اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرتیں۔

مردانہ محفلوں میں بھی میرا شہرہ ہو گیا۔ میں نے اور بھی نعتیں یاد کر لیں اور نعت کی کتابوں میں سے پڑھ کر سنانے لگا لیکن مسدس حالی اور مناجات حالیؔ کا جو اثر عورتوں اور مردوں پر میں نے پایا وہ دوسرے نعتیہ کلام سے قطعاً مختلف نوعیت کا منظر آیا۔ اگرچہ یہ اثر ان کے دوسرے مشاغل میں گم ہو جاتا تھا۔

"دعائے خلیلؑ و نوید مسیحا" کے معنی کیا ہے؟
"خاصانِ رسل" کا مفہوم کیا ہے؟
"اُمت" کسے کہتے ہیں؟
"اُمت پر برا وقت آ پڑنا" کیا ہوتا ہے؟

یہ باتیں اس دور میں سات آٹھ سال کے بچے کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ خیر۔ اسی طرح گیارہ بارہ برس کی عمر ہو گئی تو مجھے مسدس حالیؔ کے بہت

سے مقامات یاد ہو گئے تھے اور کچھ باتیں سمجھ میں بھی آنے لگی تھیں۔

ہاں میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ سات برس کی عمر میں مجھ پر شاعری کا پہلا دورہ بھی پڑا تھا۔ اب کوئی کچھ ہی کہے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ یہ پہلا دورہ نعمتِ شفا تھا جو آنے والی بیماری سے پہلے میرے لئے تجویز کر دیا گیا تھا۔ اس دورے کے دو اشعار اب انہیں اشعار ہی کہہ لیجئے دیکھئے، مجھے یاد ہیں۔

جب سے محمد کی کشتی میں ہوں میں سوار
تو لگ جائے گا میرا بیڑا بھی پار
سنتے ہیں حفیظ نے بنائی غزل
ہے اس وقت اس پر خدا کا فضل

میرے طفلانہ اہتمامِ لفظی پر ہنستے ہوئے آپ کو یہ بھی غور کرنا ہے کہ یہ محمدؐ کی کشتی میں سوار ہونے کا تصور اور اس طرح اپنا بیڑا پار ہو جانے کا یقین یہ اس بچپن میں میرے سر کے اندر کہاں سے سمایا تھا؟ میں نے بار بار اس پر غور کیا ہے اور اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ حالی کی مسدس کا اثر تھا اور سے

… بیڑے کو موجِ بلا کا
اُدھر سے اِدھر پھر گیا رخ ہوا کا

اس تاثر کی اصل وجہ یہ ہے۔

مجھ پر شعر گوئی کا یہ دورہ اچانک پڑا تھا جو سیلیؔ استاد کے خوف سے چند برس دبا رہا۔ پھر دفعتاً ابھرا لیکن اب واقعی مجھے بیمار رہنا تھا۔ تعلیم و تعلّم چھوڑ چھاڑ میں روایتی غزل گوئی اور قافیہ پیمائی کی مشق میں کھو گیا۔ مسدس حالی نے مجھ سے کنارہ کر لیا۔ پرانی غزل کی لذت نے نغمہ و رنگ بن کر مجھے جذب کر لیا۔ آزاد کی آبِ حیات نے متقدمین شعرا کی تقلید میں شاعروں کے اندر اپنے ہم عصروں ہی سے نہیں بلکہ قدما کے کئی ناموروں سے مسابقت اور معرکہ آرائی کی راہ دی۔ مشاہیر شعرا میرؔ، ناسخؔ، آتشؔ، داغؔ، امیرؔ سے اپنے ذوق کی لذت پائی اور چونکہ اس وقت دہلی اور لکھنؤ سے حالیؔ کو خالی ہی خالی بیان کیا جا رہا تھا لہٰذا متفرقات، غزلیات و رباعیاتِ حالیؔ جو کبھی نظر آئیں ان کو اپنی امنگ و ترنگ کا ہم آواز نہ پا کر ٹال دیا۔ یہ دور بھی رفتہ رفتہ بیت ہی گیا تھا۔ لیکن اس زمانہ میری سخن طرازی پر جوانی کا دور تھا دنیائے اسلام پر بلیّاتِ ناگہانی اور فرنگیوں کا پنجۂ ہوس رانی دراز تھا۔ اولین جنگِ عالمگیر۔ ترکی خلافت۔ سلطنت اور شوکت کی کی شکست۔ افریقی ممالکِ اسلامیہ کے بعد شام و عراق و فلسطین اور دوسرے ایشیائی ملکوں پر فرنگیوں کا تسلط۔ یہ دل آزار سنسنی ہر لمحہ سہی جاتی تھی۔

ہندوستان بھر میں اپنے بھائیوں کی بِنا پر غلام مسلمان رونے پیٹنے پر بھی قابلِ تعزیر گردانے جاتے تھے۔ خلافت اور کانگریس کی تحریکیں پھر شدھی اور سنگھٹن۔ یہ سب میرے اور میرے ساتھی مشاعرہ باز شاعروں کے اردگرد ہو رہا تھا۔ دوسروں کے متعلق کچھ کہنے کا حق مجھے نہیں ہے۔ میں اپنے احوال سے بے پرواہ ہو کر اپنی شاعرانہ لن ترانیوں میں مگن نہ رہ سکا کیونکہ اپنی ملت کے دکھ سے دکھی ہونے کی دہائی میری زبان پر بھی آنے لگی تھی۔ اس سوال کا جواب پھر یہی ہے۔ حالیؔ!

پنجاب میں حکیم الامت اقبالؔ اور مولانا ظفر علی خان۔ بیرون پنجاب سے اکبرؔ اور محمد علی جوہرؔ کے حریت انگیز تاثرات وارد تھے۔ یہ ایسے ناوک تھے جو مجھ ایسے کو ہدف بنائے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ قوم و ملت کشمکشِ حیات کے تلاطم میں تھی۔ میں تھا ہی کیا۔ ایک تنکا۔ ان لہروں نے مجھے آسانی سے کھینچ لیا اور چھپی ہوئی حرارتِ ایمانی مجھ سے اپنی ترجمانی چاہنے لگی۔ ملی تعلیمی سیاسی اور معاشرتی مجالس میں میری طلب روز مرہ کا معمول بنتی گئی۔ مسلمانوں کی تعلیمی درس گاہیں سرمایہ چاہتی تھیں اور سیاسی و معاشرتی وحدت کے لئے معرکہ آرا اسلامی جماعتیں نظمِ گراں پایہ۔

فرنگی تسلط سے برِاعظم کے اندر تحریک آزادی کا سیلاب بھی امڈ چکا تھا۔ ساتھ ہی رام راج کا ہندو منصوبہ مسلمانوں سے جنگ مغلوبہ دہرا رہا تھا۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا کہ "ابھی تو میں جوان ہوں" اور "کسی کی پروا نہ کیجئے" سے میری غیرت نے اِبا کیا۔ فرموداتِ اقبالؔ کو سمجھنے سمجھانے

کے لئے ابھی ع

"بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے"

کی مہلت درکار تھی۔ تعلیم مدت چاہتی تھی اور سیاست شدت۔ جو افیم ہم شاعر لوگ اپنی ملت کی رگوں میں رچا چکے تھے اس کی پینک توڑنے کے لئے تریاق شعر ہی کی ضرورت تھی اور میرے لئے عراق دور تھا۔ عوام کو مخاطب کرنے اور رگوں میں از سرِ نو بیداری کا جذبہ بھرنے کے لئے پرکار سادگی کی ضرورت لاحق تھی۔ اس فکر نے بھولی ہوئی مسدس کی یاد دلائی۔ یہی یاد مشعل بن گئی۔ اسی نے منزل دکھائی۔

سادہ گوئی یعنی سہل ممتنع شعر کہنا دہ بھی ذہنی تفرقے میں مبتلا بھیڑوں کو شیر بنانے کے لئے کوئی آسان بات نہیں۔ آسانی سے دلوں میں اتر جانے والی سادہ گوئی بہت دشوار کام ہے۔ دماغ کو الجھائے بغیر شعر کے اثر کو دلوں کی گہرائی میں اتار دینا اور ذوق شعر فہمی سے مبرا ہزاروں لاکھوں انسانوں کو بیک وقت متاثر کرنا کسی دوسرے کے لئے آسان ہو تو ہو مجھے تو اپنے قلب و جگر کے قطرہ ہائے خون کو زبان پر لانا پڑا۔ سچ کہا تھا کسی نے ؎

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

اب حالی کی اہمیت نظر آئی۔ صدق مقالی کی اثر اندازی کا راز اب کھلا۔ میں نے کہ غزل، گیت، نغمہ و ترانہ کا رسیا تھا اب جو ایک خاص مقصد سامنے رکھ کر شعر کو دماغ میں الجھائے بغیر سیدھا دل تک۔ پہونچنے کے قابل بنانا چاہا تو حالی کی سادہ نگاری کے رنگ میں حالی کے قلب و جگر کا لہو مجھے شرمانے لگا اور ثابت ہو گیا کہ الجھن، تصنع، شوکت الفاظ اور ایچ پیچ کی تراکیب کا اہتمام عجزِ کلام کے سوا اور کچھ نہیں۔

خاکساری کی آڑ میں اظہارِ تفاخر کی مجھے قطعاً ضرورت نہیں۔ میں نے شعر کو مؤثر بنانے کے لئے اچھی خاصی محنت کی ہے اور کہہ چکا ہوں کہ ؎

سخنورانِ وطن سب ہیں آفتابِ کمال
تو کیوں کہوں کہ میں ذرہ ہوں آفتاب نہیں

تاہم ملی مقاصد کے لئے میری فکر شعر نے جو کچھ بھی اب تک کیا ہے اس کا نقطۂ آغاز وہی اثر تھا جو لڑکپن میں مجھے حالی کی مسدس سے حاصل ہوا تھا اور جب میں نے اس راہ پر چلنے کے لئے قدم اٹھایا تو کامیابی کے لئے بھی میری حوصلہ افزائی حالی کی مسدس ہی کی مشعل لے کر میرے سامنے آئی۔ شعر میں سیدھی بات بڑی ٹیڑھی کھیر ہے لیکن میں نے آنکھیں کھول کر اس کو پرکھا اور کام میں لایا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہنامہ اسلام کی چاروں جلدیں بچے بچیاں حفظ کر لیتے ہیں۔

آپ پوچھیں گے۔ اور میں اس مقام پر خود بھی آ گیا ہوں اور آپ کو بھی لے آیا ہوں کہ اس تمہید یا ساری تمہیدی رام کہانی کا اصل مقصود بیان کر دوں!

مقصود یہ ہے کہ اگر آپ شعر کا ذوق رکھتے ہیں تو حالی کا کلام بار بار مطالعہ کرنے کی تلقین کروں اور اگر آپ شاعری کے دلدادہ ہیں تو حالی کی پیروی کر لے کا مشورہ دوں — یکایک یہ خیال مجھے کیوں پیدا ہوا اس کی وجہ بھی سن لیجئے۔ چند ماہ پیشتر دیوانِ حالی میں اپنے پسندیدہ اشعار پر نشان لگا دینے کی میرے بھتیجے علاؤالدین مظہر نے فرمائش کی تھی۔ اس کا ارادہ ہے کہ وہ اس انتخاب کو کتابی صورت میں چھاپے گا بھی۔ چنانچہ میں نے دیوان حالی کا مطالعہ انتخاب کی غرض سے شروع کر دیا

اب یہاں ایک مزے کی بات اور سن لیجئے اور حیران ہو جائیے کہ جب مظہر نے یہ فرمائش کی اور میں نے دیوان حالی اٹھایا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے تو فقط مشہور اشعار حالی کی غزلوں کے سنے یا کسی مضمون میں پڑھے تھے۔ پھر حالی کی بعض مشہور نظمیں جو دیوان حالی سے الگ مجموعوں میں طبع شدہ ہیں میری نظر سے آغاز شعر و شاعری کے زمانہ ہی میں گزر چکی تھیں۔ آپ میری ندامت کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ مسدس حالی کے بعض حصے آج بھی مجھے ازبر ہیں۔ برکھا رت اب بھی ساون بھادوں میں چٹکی لیتی ہے۔ "اے ماؤں، بہنوں، بیٹیو" کی آواز اب بھی میرے ذہن و روح کی زینت ہے — لیکن دیوان حالی کو میں نے کبھی ہاتھ بھی نہ لگایا تھا۔ حالی کے اصل کمال کا نمونہ تو میرے سامنے آیا ہی نہیں تھا۔ کیوں؟ اس کیوں کا جواب بغلیں جھانکتا ہے اور سچ کہہ دینے کے سوا چارہ نہیں۔ بات یہ تھی کہ حالی کی بعض نظمیات ملی جذبات پیدا کرنے کے بعد مجھے اپنی ذات سے کچھ کام لینے کی راہوں پر ڈال کر میری فکر شعر کی رنگا رنگی کے ہجوم میں مجھ سے یکسر بچھڑ گئی تھیں

میں نے غزل وزل کی زبان جاننے کے لئے داغ و امیر کانی سمجھ رکھے تھے۔ میر و غالب کے مشہور اشعار کے مزے لے ہی چکا تھا۔ گیت۔ ترانہ وغیرہ کے لئے مجھے اپنی راہ آپ نکالنا تھی۔ اقبال کو سمجھنے کے لئے قلب و نظر اور تمیز کی ترقی تدریجی بات تھی لہٰذا میری اپنی گرہ میں جو کچھ مہیا تھا اسی سے کام لینے لگا تھا اپنی ہی اپج میں غرق رہا تھا۔ مسدس کو حالی کا شاہکار جان لینے کے بعد حالی کی غزلیات اور دیوان کی دوسری نظمیات کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے

تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے مقرر جہاں نیک و بد کی جزا ہے

گنہ گار واں چھوٹ جائیں گے سارے

جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

کا فتویٰ دے دینے والے حالی سے معشوق کے ناز نخرے اور عاشق کے عجز و نیاز، وصل و ہجر کی معاملہ بندیوں اور شراب و کباب کی ترقی پسندیوں کی طلب اور توقع نہ بھی سہی۔ مجھے ندامت اس بات پر ہے کہ آخر میری غزل بھی تو نفسانی کیڑوں سے اتنی آلودہ نہیں۔ میں بھی تو سوقیانہ پن سے حذر ہی کر رہا ہوں پھر کیوں مجھے خیال نہ آیا کہ حالی کی غزل سے بھی استفادہ کروں۔ حالی انسانی معاشرے کی تزئین و تہذیب کے لئے جذبات و حسیات کے ہر پہلو کو پاکیزہ بنانے کی سعی کر رہا تھا۔ مجھے کیوں یہ بات نہ سوجھی کہ اس نے غزل کے اشعار میں بھی ایک نئی روح پھونک دی ہوگی۔

بہرحال اُسنٹھ برس کی عمر میں حالی کا دیوان میرے مطالعہ میں آیا ہے۔ میں نے اپنے ذوق سخن فہمی کے سہارے خصوصاً غزل پر ایسی ناقدانہ نظر ڈالنے کی جرأت کی ہے جس سے ہر شاعر (چھوٹا ہو یا بڑا) دوسرے شاعر کے کلام کو پرکھتا ہے اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں کہ حالی کی غزل اردو کے کسی بڑے سے بڑے شاعر سے کسی صورت میں بھی کم رتبہ نہیں۔ بلکہ بڑے سے بڑے شاعر کی غزل میں تو بھرتی کے اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ حالی کی غزل میں قطعاً ایسا کوئی شعر نظر نہیں آتا البتہ فسق و فجور اور نفسانی جذبات کی آلودگی سے لذت یاب ہونے والے حالی کی غزلیات سے حظ نہیں اٹھا سکتے۔ حالی نے تو انسانی معاشرے کو ذہنی آلودگیوں سے پاک کرنے کے لئے اپنی غزل کے ہر شعر میں انجکشن رکھ دیئے ہیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ وہ مریض جو بیماریوں ہی کو زندگی سمجھ بیٹھے ہیں، ان اشعار کو چبھتی ہوئی سوئی جان کر ان سے دور ہی رہنے کی سوچتے ہیں۔ اپنے مرض کو بڑھانے اور لاعلاج بناتے چلے جانے میں مزا لیتے ہیں حالی کی غزلوں میں مسلمانوں کے معاشرے کو خاص طور پر سامنے رکھا گیا ہے اور مریض معاشرے کے پیٹ میں جو کیڑے بھرے ہوئے ہیں ان کا قلع قمع حالی کا مقصود ہے۔ اب جو بھی تندرست ہونا چاہے، یہ نسخہ استعمال کرے۔

بیماری کا احساس علاج کا ارادہ پیدا کرتا ہے اور معاشری صحت مندی غیرت ملّی کی آگ میں کٹھالی کی طرح رہ کر تپنے کے بغیر ممکن نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے لئے یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ حالی کی غزلیات اور رباعیات اور دیوان میں درج شدہ نظمیں اس مرحلہ عمر میں میرے سامنے آئیں۔ میرا اپنا ہی تو ایک شعر ہے کہ ؎

یہ عجیب مرحلۂ عمر ہے یارب کہ مجھے

ہر بری بات بری بات نظر آتی ہے

آج میں ان تمام مراحل سے گزر کر حالی کا دیوان سامنے رکھے ہوئے اس قابل ہوں کہ شفا کا نسخہ معلوم ہو جانے پر آب حیات کے اس چشمے کی طرف آپ سب کو بلاؤں۔ اپنے اس شعر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ ؎

دوستوں کو بھی ملے درد کی دولت یارب

میرا اپنا ہی بھلا ہو مجھے منظور نہیں

میں نے غزلوں کے چند اشعار پر، چند رباعیوں پر اور دیوان حالی میں درج شدہ چند نظموں کے بعض حصوں پر نشان کر دیے ہیں لیکن اس

کے معنی یہ نہیں کہ حالی کے دیوان میں قابل توجہ یہی کچھ ہے۔ حاشا یہ انتخاب تو محض میری اپنی افتادِ طبع کا مظہر ہے۔ کسی کے لئے بھی یہ ضروری نہیں کہ میری پسند کا پابند ہو بلکہ میرے اس انتخاب کا مقصود تو یہ ہے کہ اگر اس انتخاب نے کسی حیثیت سے بھی حالی کے سارے کلام کا مطالعہ کا شوق آپ میں سے کسی کے دل میں بھر دیا تو میں سمجھوں گا کہ میں نے بہت بڑا کام کر دیا۔

اب مناسب یہ ہے کہ آپ انتخاب پر نظر ڈالنے سے پہلے خود حالی مغفور کے اپنے لکھے ہوئے دیباچہ کی چند سطور ضرور پڑھ لیں تاکہ آپ کو حالی کے چشمۂ حیات تک پہونچنے کے لئے حالی ہی سے مدد ملے۔

حالی اپنے دیوان کے دیباچے میں رقم طراز ہے :-

• ـــ ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی تھی اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضائقہ ہوتا تھا۔

• ـــ وہ تمام سیمیائی جلوے جو خواب غفلت میں حقائق سے زیادہ دلفریب نظر آتے تھے رفتہ رفتہ کافور ہونے لگے جس شاعری پر ناز تھا اس سے شرم آنے لگی ـــ"

• ـــ (آپ) طرز ادا میں بہت کم فرق پائیں گے مگر خیالات پر غور فرمائیں گے تو ایک دوسرا عالم نظر آئے گا محمل نہیں بدلے۔ محمل نشیں بدل گئے ہیں۔ پیالے وہی ہیں، شراب اور ہے ـــ"

• ـــ جس طرح توپ خانہ کا گھوڑا توپ کی آواز سے کبھی کان نہیں ہلاتا اسی طرح مصنف نکتہ چینوں کے شور و غل کی پروا نہیں کرتے۔

میں نے بھی نکتہ چینوں سے بے پروا ہو کر آپ کو ثقافت کے نام پر ملنے والی زہریلی لذتِ ذہنی سے محفوظ رکھنے کے لئے یہ دیباچہ لکھ دیا اور یہ سطور حالی کے دیباچے میں سے چن کر یہاں آپ کے سامنے رکھ دی ہیں۔ اب حالی کے انبار جواہرات سخن سے اپنی پسند کے چند گوہر پیش کر دینے کا مقصد واضح ہے۔ میں نے یہ انتخاب کسی مادی صلہ یا داد کے لئے نہیں کیا ہے

نہیں ثواب کی پابند بندگی میری
یہ اک نشہ ہے جو آلودۂ شراب نہیں

بقلم خود ـــــــــ (صفحہ ۲۶۹ سے آگے)

اور ساماں کے مقابل اپنی فاقہ زدہ ہڈیوں کو آراستہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ نئی آرزوئیں جو پوری ہو کر رہیں گی۔ نئے جماعتی احساس بیداری کا شعور کہیں رفتہ رفتہ کہیں بہ سرعت حسب حالات دلوں کی پنہائیوں تک پہونچ رہا ہے۔ زندگی بن کر ابھر رہا ہے۔ یہ نئی زندگی کہیں بر سرکار ہے کہیں برسرپیکار اس کے مقابل بھی وہ سب کچھ ہو رہا ہے اور ہو گا جو دوسرے ملکوں میں ان ہی حالات کے اندر ہو چکا ہے لیکن جد و جہد کی بار بار ناکامی اور نامرادی اب پیچھے ہٹنے کی تلقین نہیں کرتی۔ زندگی آگے بڑھنے میں ہے رہنما جو آگے بڑھ رہے تھے پیچھے رہے جاتے ہیں ـــ رہنماؤں کی اپنی اپنی منزلیں ہیں۔ رہنما حیران ہیں کہ زندگی کی منزل اور آگے اور آگے کیوں ہے۔ یہ بزرگ بے بال و پری کی ایسی اڑان دیکھنے کے متوقع نہ تھے ـــ اب یہ بے بال و پری ان کے روکے نہیں رکتی۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ احساس حیات تازہ خود ہی بال و پر ہے۔ یہ احساس۔ یہ یقین اب جذباتی اور خیالی نہیں حقیقی اور واقعاتی ہے۔ انفرادی نہیں اجتماعی ہے۔

"تلخابۂ شیریں" اس زندگی تازہ سے خالی نہیں۔ چھوٹی چھوٹی غزلیں بھی ہیں۔ لمبی لمبی نظمیں بھی۔ ہلکے پھلکے گیت بھی۔ شاید سب میں اپنے وقتوں کے میووں کا رس ہے۔ میرے تجربوں کی ہلکی تلخی لئے ہوئے شیریں۔

("تلخابۂ شیریں" ۱۹۴۷ء)

حفیظ

خودکشی

مکتب سے گیارہ بجے چھٹی ہوئی۔ میں حسبِ معمول گھر پہونچا۔ خلافِ توقع میرا باپ اس وقت گھر میں بیٹھا حقّہ پی رہا تھا۔ میری ماں ایک طرف چپ چاپ بیٹھی تھی اور گھر کا غمگین سکوت کہہ رہا تھا کہ آج بھی کوئی ناخوشگوار واقعہ ہوا ہے۔

میں سہم گیا۔ کتابیں چارپائی پر رکھ دیں۔ والدہ کے زرد اور اترے ہوئے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے لیکن معلوم ہوتا تھا حد سے زیادہ رو چکی ہے میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے باپ کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس کی شعلہ بار نگاہیں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کے درشت بُشرے سے طیش ٹپک رہا تھا۔

میرا سر خود بخود جھک گیا اور میں چپ چاپ مڑکر آہستہ آہستہ ان سیڑھیوں پر چڑھنے لگا جو ہمارے مکان کی تیسری منزل کو جاتی تھیں۔ میرے پاؤں خوف سے کانپ رہے تھے۔ اسی وقت مجھے اپنے باپ کی گرج سنائی دی۔

"ادھر کہاں چلا؟"

میرے آگے بڑھنے کی قوت سلب ہوگئی۔ اور میں کچھ بولے بغیر نیچے اتر آیا اور گم سم کھڑا ہوگیا۔ میری ماں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی فکرمند نگاہوں میں بے بسی کی جھلک تھی۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ شاید وہ کچھ کہتے ہوئے ڈرتی تھی۔ میرے باپ نے پھر کہا:

"گھُنّے کھڑا دیکھتا کیا ہے۔ کھانا کھالیا؟"

"کھالیتا ہوں"۔ یہ کہہ کر میں جلد جلد باورچی خانے کی جانب چلا۔ میں نے چنگیر کو دیکھا اس میں روٹی کے دو تین باسی ٹکڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

"آج کچھ پکا نہیں"

طرح طرح کے وسوسوں سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے وہی سوکھے ٹکڑے اٹھا لئے اور دروازے کی طرف پشت کرکے کھانے کا بہانہ کرلیا نہ جانے کیوں میں اپنے باپ سے یہ بات پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا کہ روٹی نہیں ہے۔

"اٹھ کر اسے کھانا کیوں نہیں دیتی ——— سنتی ہے ——— میں کیا بک رہا ہوں۔"

میں نے بے اختیار مڑکر جھانکا۔

"روٹی صرف تمہارے لئے پکائی گئی تھی"۔

میں نے پہلی مرتبہ ماں کے چہرے پر خفیف سا غصّہ دیکھا لیکن وہ بدستور خاموش ہوگئی۔

میرا باپ اٹھ کھڑا ہوا اور یہ کہہ کر چلایا:
"ابھی سے سوگ منا رکھا ہے۔ ابھی مر تو نہیں گیا۔"
میں نے دیکھا۔ ماں ملامت آمیز نظروں سے میرے باپ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بولی "نہیں مرا تو شام تک مر جائے گا۔"
"یا اللہ یہ کیا معاملہ ہے؟" کوئی میرے دل میں بیٹھا بیتابی سے کہہ رہا تھا۔
میرے باپ نے حقے کی نے نکالی اور میری ماں کو دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔ قسموں اور گالیوں کے ساتھ وہ کہتا جاتا تھا "میری بلا سے مر جائے تم سب مر جاؤ۔ نکلو میرے گھر سے باہر جا کر مرو۔ تم نے میرا ستیاناس کر دیا۔"
میں ایک عجیب جوش سے لرز اٹھا۔ سوکھا ٹکڑا میرے ہاتھ سے گر گیا۔ میں ابھی بچہ تھا صرف گیارہ سال کا بچہ۔ لیکن میں جھپٹا۔ اٹھ کر بھاگا اور اپنی ماں سے لپٹ کر گلے میں باہیں ڈال دیں۔ وہ اب بھی خاموش تھی۔ میں نے بچپن کی ملامت آمیز نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا۔ میری بساط ہی کیا تھی۔ مگر میری اس ناگہانی جسارت سے وہ ششدر سا رہ گیا اور سمجھ نہ سکا کہ کیا کرے۔ اس کی غضب ناک آنکھوں میں کھسیانے پن کی علامتیں پیدا ہو گئیں۔ اس کا ہاتھ رک گیا وہ میری طرف کچھ دیر تک خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر حقے کی نے چھوڑ سیڑھیوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔
"خبردار! اگر اوپر گیا تو کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔"
اب وہ جلد جلد سیڑھیاں نیچے اتر گیا۔ میں نے اسے صحن سے گزرتے دیکھا جہاں میرا دادا اور میری سوتیلی ماں اور سوتیلا بھائی کھڑے مسکرا مسکرا کر سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میں نے خیال کیا۔ وہ میری ماں کی اذیت سے خوش ہو رہے ہیں۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے اپنے بھائی کو یہ کہتے سنا "اس کی سزا یہی ہے۔ یہ مرتی بھی نہیں فساد کی جڑ۔"
ماں نیم بیہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔ میں برتن میں پانی لے آیا۔ اور اس کے رخساروں سے خون کے دھبے دھوئے۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے دو تین گھونٹ پی لئے۔ پہلے تھکی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر اٹھی — اور آہستہ آہستہ تیسری منزل کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ کسی نے میرے دل سے پوچھا "اوپر کیا ہے؟"
میں نہ رہ سکا۔ میں نے کہا "اماں جان اوپر نہ جاؤ۔ وہ پھر خفا ہوں گے۔"
اس نے مڑ کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے اپنے پیچھے پیچھے آنے کو کہا۔
"شام تک مر جائے گا" یہ الفاظ ابھی تک فضا میں آوارہ تھے۔ میں بے اختیار ماں کے پیچھے پیچھے تیسری منزل پر چڑھ گیا اور وہاں کمرے میں داخل ہوا۔
مجھے ایک دھچکا سا لگا۔
ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر میرا چچیرا بھائی مجید۔ میری ماں کا بیٹا اس کے پہلے مرحوم شوہر کی یادگار۔ میرے باپ کا حقیقی یتیم بھتیجا اور داماد نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا کراہ رہا تھا۔

(۲)

وہ خطرناک طور پر بیمار معلوم ہوتا تھا۔ اس کی نیم وا آنکھیں ڈراؤنی تھیں اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ اس کا رنگ جو کبھی سرخ و سپید تھا نیلا پڑ گیا تھا۔
ایک ہلکی سی چیخ میرے ہونٹوں سے نکل گئی۔ یہ میرا بھائی تھا مجھے اس سے بے انتہا محبت تھی۔ وہ بھی گھر میں صرف مجھ ہی سے محبت کرتا تھا اس نے مجھے ہاتھوں میں کھلایا تھا۔ وہ میرا گھوڑا بنا کرتا تھا۔ میں اس کی شادی پر شہ بالا بنا تھا۔ اس کی شادی کو تین سال گزر چکے — لڑائی جھگڑے کے

تین سال۔

اس کی بیوی میری سوتیلی بہن تھی جس کو ہم تینوں سے نفرت کرنا سکھایا گیا تھا

مجید کا باپ مرچکا تھا جو میرا چچا تھا مگر دادا زندہ تھا جو میرا بھی دادا تھا۔

لیکن وہ بھی میرے باپ کی طرح اسے نفرت سے دیکھتا تھا کیونکہ مجید برسر روزگار نہ تھا۔

وہ بہت بیمار معلوم ہوتا تھا اور والدہ جھک کر اس کی تپتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

میں نے پوچھا "اماں جان بھائی جان کیوں بیمار ہیں"

ماں نے میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

میں نے پھر پوچھا "اسے کیا ہوا ہے؟"

آنسو اس کے زرد رخساروں پر بہہ نکلے۔ اس نے آنچل سے آنکھیں پونچھتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔

"اس نے زہر کھا لیا ہے"

کسی نے مجھے دو قدم پیچھے دھکیل کر سائیں سائیں کرتے ہوئے اندھیرے میں چھوڑ دیا۔

"تم نے ابا کو کیوں نہیں بتایا۔ میں جاتا ہوں۔ دادا جی کو خبر دیتا ہوں" یہ کہہ کر میں جانے لگا تھا کہ ماں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا

"ان کو سب کچھ معلوم ہے وہ اسے بہانہ سمجھتے ہیں۔ ان کو اس کی زندگی کی پرواہ نہیں۔ وہ خوش ہیں۔ سب خوش ہیں۔"

مجھے یاد آگیا کہ ابا نے مجھے اوپر آنے سے روکا تھا ایک زبردست غصے کا احساس میرے سینے سے پیدا ہوا۔ میری نگاہ بھائی کے نیم مردہ چہرے پر تھی اور مجھے معلوم نہ تھا میں کہاں کھڑا ہوں۔ میں نے والدہ کی آواز سنی "بیٹا

"یہ تیرا بھائی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بدنصیب"

میری چیخ نکل گئی۔ اور اگر والدہ کی نگاہ مجھے نہ روک دیتی تو میں شاید دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا۔

"کیا تو کسی حکیم کو جانتا ہے"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بھاگ کر جا اور اسے لے آ۔ ہاں اسے لے آ۔ کہنا میرا بھائی بیمار ہے۔ زہر کا حال نہ بتانا۔"

میں جلد جلد سیڑھیوں سے اتر کر صحن میں سے گزرا۔ دالان میں میری سوتیلی ماں اور سوتیلی ہمشیرہ یعنی مجید کی بیوی آپس میں مسکرا مسکرا کر سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

میں اندر ہی اندر لہو کا گھونٹ پی کر بھاگتا ہوا حکیم کے گھر کی طرف چلا۔ میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا در و دیوار سے بین اور ماتم کی صدائیں آ رہی ہیں۔

گلی کے موڑ پر پہنچ کر میں حکیم کے گھر کی طرف مڑنا چاہتا تھا کہ پیچھے سے ایک آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ہمارے محلے کی ایک نوجوان لڑکی عزیزہ اپنے گھر کے کواڑ کی اوٹ سے سر نکالے نام لے کر مجھے پکار رہی تھی۔

میں نے چلا کر کہا "مجھے کام ہے" اس نے زور زور سے بازو ہلا ہلا کر زیادہ اصرار کے ساتھ اشارہ کیا۔ میں بادلِ ناخواستہ واپس پلٹا۔ وہ مجھے اپنی ڈیوڑھی میں لے گئی اور پوچھنے لگی۔

"تمہارے بھائی کا کیا حال ہے؟"

میں نے تعجب سے اس کے حسین چہرے کی طرف دیکھا " وہ بیمار ہے "

"اس نے زہر کھالیا ہے"

"میں حیرت سے اُچھل پڑا "تمہیں کس نے بتایا؟"

"تم کسی کو بتاؤ گے تو نہیں؟"

کچھ سوچے اور یہ جانے بغیر کہ یہ کیا کہنے والی ہے۔ میرے منہ سے نکلا "نہیں"

اس نے ایک کاغذ نکالا اور مجھے دے دیا۔ "اسے پڑھو"

یہ میرے بھائی کے لکھے ہوئے چند لفظ تھے ـــــ "دادا جان نے منظور نہیں کیا۔ اب کوئی چارہ نہیں۔ میں زہر کھا رہا ہوں ــ للہ مجھے معاف کر دینا"

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ "اس کا کیا مطلب ہے ؟"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے نو بجے سے پہلے زہر نہیں کھایا تھا۔ اس کا بچ جانا ممکن ہے۔ تم کہاں جاتے ہو۔؟"

"حکیم کو بلانے"

جلد جاؤ ـــــ یہ کہہ کر اس نے کاغذ میرے ہاتھ سے لے لیا اور پھاڑ ڈالا۔ میں حیران کھڑا اس کا منہ تک رہا تھا۔ یکایک اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور التجا کے لہجے میں کہا "بھیا تنہائی میں اگر تمہارے بھائی کو ہوش آئے تو اس کے کان میں میرا نام لے کر یہ کہہ دینا۔ میں تیار ہوں ـــ ضرور کہنا ـــ کہوگے ـــ میں ہاتھ جوڑتی ہوں ـــ کسی اور سے ذکر نہ کرنا لو اب جاؤ"

دراصل میں کچھ بھی نہ تھا میں اس کے مغموم چہرے کو دیکھ رہا تھا اور چونکہ اس نے میرے بھائی کی بیماری میں ایک قسم کی ہمدردی ظاہر کی تھی اس لئے میں نے ایسا محسوس کیا گویا میں اسے پسند کرتا ہوں۔

پھر میں حکیم کے گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ ابھی تک دروازے کی اوٹ سے جھانک رہی تھی۔ سورج کی شعاعیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ سفید اوڑھنی اوڑھے وہ اس وقت فرشتہ معلوم ہو رہی تھی

(۳)

بوڑھے حکیم نے معائنے کے بعد پسینہ پونچھا۔ اور کہا "اس نے کوئی زہریلی چیز کھائی ہے؛ زہر اثر کر گیا ہے۔ اگر فوراً تدبیر نہ کی گئی تو امید بہت کم ہے۔ یہ بے ہوش کب سے ہے؟

والدہ نے پردے کے پیچھے سے کہا۔ ۹ بجے یہ باہر سے گھر آیا تھا۔ مجھ سے پانی کا گلاس لیا۔ اوپر چلا آیا۔ ایک گھنٹہ بعد میں کسی کام کے لئے اوپر آئی۔ یہ چارپائی پر تڑپ رہا تھا۔ اس کی ٹوپی اور تکیہ زمین پر پڑا تھا جب میں نے تکیہ اٹھایا تو اس کی تہہ میں مجھے یہ کاغذ ملا۔

میں نے والدہ کے ہاتھ سے کاغذ لے کر حکیم کو دیا۔ یہ اسی طرز کی تحریر تھی جو میں نے عزیزہ کے پاس آدھ گھنٹہ ہوا دیکھی تھی۔

پیاری ماں

افیم کے ست کی گیارہ بوندیں جو میں نے اپنے ہاتھ سے پانی میں حل کر کے پی ہیں۔ مجھے ہر روز کی بے عزتی سے نجات دلادیں گی۔ پیاری ماں تم فکر نہ کرنا۔ بھیا کو میری طرف سے بہت بہت پیار دینا۔ خدا کرے ..... وہ تمہارے زخمی دل پر پھاہا رکھنے کے قابل ہو ... تمہارا بدنصیب یتیم

مجید

۹ بجے صبح مورخہ ....

بوڑھے حکیم کے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی آہ نکل گئی اس نے یہ کہتے ہوئے کاغذ مجھے دے دیا۔ اب اس بات کا چرچا نہ ہونا چاہئے۔ دوڑ دھوپ لازمی ہے۔ خدا مالک ہے۔

یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک ڈبیہ نکالا۔ اور اس میں خاکستری رنگ کا سفوف لے کر پانی کے گلاس میں حل کیا۔ اور "یا شافی" کہہ کر پہلے ایک ہاتھ سے مجید کے بھنچے ہوئے دانت کھولے پھر دوسرے سے گلاس کا پانی آہستہ آہستہ منہ میں ڈال دیا۔ میں نے بھائی کا پھنکتا ہوا سر پکڑ رکھا تھا مگر میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں وہ دعائیں جو مجھے والدہ نے حفظ کرا دی تھیں پڑھ رہا تھا۔

حکیم نے گھڑی دیکھی اور اسی سفوف کی تین پڑیاں تاتے ہوئے بولا "اگر دو گھنٹے کے اندر اندر اسے تین دستیں آگئیں اور زہر معدے سے خارج ہو گیا تو امید رکھنی چاہئے ہر پندرہ منٹ کے بعد یہ دوائی پلاتے جاؤ۔ اللہ شافی ہے"

یہ کہہ کر حکیم اٹھ کھڑا ہوا۔

ماں نے کان سے سونے کی بالی اتاری اور پردے کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر مجھے دے دی اور کہا۔ نیچے جا کر تنہائی میں حکیم صاحب کو دے دینا اور کہنا یہ بلاؤ آہ بچاری ماں! اس کے پاس دوائی کے روپیہ بھی نہ تھا

میں حکیم سے کوست کرنیچے اترا صحن میں دادا صاحب کھڑے تھے۔ انہوں نے حکیم ... سے پوچھا "کیوں واقعی بیمار ہے ؟"

"جناب اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں"

دادا کے منہ پر مردنی چھاگئی۔" یہ نامراد ہمیں اس بڑھاپے میں پولیس کے شکنجے میں کسوائے گا۔"

حکیم نے حقارت سے لب سکیڑتے ہوئے جواب دیا۔ "اب ذرا اس بات کو شہرت نہ دیجئے ورنہ پولیس آدھمکے گی اور سارا گھر ایک مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا" یہ کہہ کر حکیم صاحب چل دیئے۔

عزیزہ کے گھر کے قریب تنہائی تھی۔ وہاں میں نے حکیم کو بالی پیش کی اور کہا کہ "اماں بہت غریب ہیں۔ ان کے پاس روپیہ نہیں"

"نہیں نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ خدا تمہارے بھائی کو تندرست کر دے بس یہی میرا معاوضہ ہے۔"

حکیم صاحب یہ کہہ ہی رہے تھے کہ کسی نے پیچھے سے آکر میرے ہاتھ سے بالی چھین لی۔ میں نے حیرت سے مڑ کر دیکھا تو یہ میرا سوتیلا بھائی تھا جو نہایت شرارت آمیز نگاہوں سے حکیم صاحب کو تک رہا تھا۔

"تم کو یہ چیز لینے کا کیا حق ہے۔ یہ ہماری ملکیت ہے"

میں اور حکیم صاحب دونوں اس کا منہ تکتے رہ گئے اور وہ بالی لے کر کتا جھکتا چلا گیا۔

حکیم صاحب نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا "کیا یہ تمہارا سوتیلا بھائی ہے ؟"

میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اسی وقت عزیزہ نے کواڑ کی اوٹ سے سر نکالا "ہاں یہ سوتیلا بھائی ہے۔ سب کانٹے اسی کے بوئے ہوئے ہیں"

حکیم نے معاذ اللہ کہتے ہوئے ادھر دیکھا۔ عزیزہ سفید آنچل سے منہ چھپائے ہوئے تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دس روپیہ کا نوٹ چپکے سے ان کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

"خدا کے لئے اسے بچا لو" یہ کہتے ہوئے اس نے جلدی سے کواڑ بند کر لئے۔

حکیم تعجب سے نوٹ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ لڑکی کون ہے ؟"

نہ جانے کیوں میرے منہ سے نکلا۔ "میری بہن"

"اچھا۔ اچھا۔ اب تم جاؤ اور دوا کا خیال کرو۔ میں بھی ایک گھنٹہ تک آجاؤں گا۔"

میں چپ چاپ گھر کی طرف پلٹا۔ عزیزہ کی صورت میری نظروں کے سامنے تھی۔ وہ کیوں اس قدر ہمدرد ہے؟ کیا وہ ہماری رشتہ دار ہے۔ مجید بھائی سے اسے کیوں دلچسپی ہے؟ اس نے دس روپے کا نوٹ کیوں دیا ہے؟ اتنے میں میرے خیالات اپنے سوتیلے بھائی کی اس حرکت کی طرف منتقل ہو گئے۔ اور میری آنکھیں غصہ سے خون کبوتر ہو گئیں۔ میں نے دل ہی دل میں اس کو برا سمجھنے کی قسم کھا ئی۔

(۴)

میں پھر مجید کے کمرے میں پہونچا تو والدہ گلاس میں دوا حل کر رہی تھیں۔ میں نے مستفسر نگاہوں سے اسے دیکھا۔ آہ وہ کتنی بدل گئی تھی۔ بے بس بے کس پرسکون۔ صبر کی تصویر

"کیا اب تک کوئی قے نہیں ہوئی؟"

"کوئی نہیں" یہ کہہ کر اس نے اشارہ کیا۔ میں نے بھائی کا منہ کھولا۔ والدہ نے حل کی ہوئی دوا چمچہ سے اس کے منہ میں ڈال دی۔

اب اس کے ساکت جسم میں حرکت شروع ہوئی۔ دیکھتے دیکھتے بے چینی بہت بڑھ گئی۔ مجید نے تڑپنا شروع کیا۔ اور زور سے کراہنے لگا۔ اس نے آنکھیں کھولنے اور اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے اور والدہ نے مل کر اس کو اٹھایا۔ اس نے زور سے اچھل کر قے کی۔ میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔

طشت گہرے سیاہی مائل خون سے لبریز ہو گیا تھا۔ میں نے حیرت سے والدہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بدستور پُرسکون تھا۔ ہونٹ آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے۔ شاید وہ دعا پڑھ رہی تھی۔ پانی لے کر اس نے مجید کا منہ صاف کیا اور پھر لٹا دیا۔

وہ خون سے بھرا ہوا طشت اٹھا کر چلی۔ دروازے میں طشت اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔

میں نے نظر اٹھائی۔ میرا باپ، دادا اور سوتیلا بھائی سیڑھیوں پر چڑھ کر کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ خون کی چھینٹیں ان کے کپڑوں پر پڑیں۔ میرے سوتیلے بھائی کے منہ سے کوئی سخت کلمہ نکلا۔ والدہ نے اس کی طرف ملتجیانہ دیکھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ بوڑھے دادا کے منہ سے نکلا "ہاں ..."

لیکن وہ رک گیا۔ شاید اس نے حالت کی اہمیت کا اندازہ کر لیا تھا۔ والدہ ایک کپڑے سے دہلیز اور زمین صاف کرنے لگی اور وہ تینوں اندر آ گئے۔ میں نے اپنے دل میں غصہ [illegible] لہراتا ہوا محسوس کیا مگر میں خاموش رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ والدہ کی آنکھوں میں غم اور رحم کے جذبات جھلک رہے تھے اور میرے سوتیلے بھائی کی آنکھوں میں شرارت کا تبسم۔

میرے باپ نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "یہ تو سب بچ نکلا"

سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دادا بولا "پھر اب کیا ہو سکتا ہے"

میرے باپ نے غصہ کی نظر سے دادا کی طرف دیکھا "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آپ نے اب تک مجھے اندھیرے میں رکھا جب شرع اجازت دیتی ہے تو اس میں کیا قباحت تھی ... آج آپ ہی نے مجھ سے کہا تھا یہ محض دھمکی ہے۔" پھر میرے سوتیلے بھائی کی طرف مخاطب ہوا۔ "جاؤ ڈاکٹر تیرتھ رام کو لے آؤ۔ فوراً جاؤ۔"

وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا

سنگ دل دادا بھی یہ کہتے ہوئے چلے گئے "یہ پیدا ہوتے ہی مر جاتا تو بہتر تھا"

میں ان بزرگوں کی ان قاتلانہ روش پر حیران تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میرے باپ کے دل پر سے پردہ اٹھ گیا۔ اس وقت وہ شاید محسوس کر رہا تھا کہ دادا بھی بزرگی اور کہن سالی کے باوجود خاندان کے ذلیل اور پست جھگڑوں میں بعض افراد سے دلی بغض و عناد کے جذبات رکھتا ہے۔

شاید اس کے دل میں خیال آیا۔ میں بھی تو اپنے بچے پر بار ہا سختیاں کر چکا ہوں۔ اگر باپ بیٹے پر ظلم کر سکتا ہے تو دادا پوتے کا دشمن کیوں نہیں ہو سکتا۔ میں نے خیال کیا کہ میرے باپ کا دل حسرت و پشیمانی کے جذبات سے ٹوٹ رہا تھا

مجید نے آنکھیں کھولیں۔ ایک انگڑائی لی۔ میرے باپ نے شاید پہلی مرتبہ شفقت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ کیوں مجید بیٹا ـــ مجھ سے خوف نہ کرو ـــ میں اب کچھ نہ کہوں گا۔ جہاں تم کہتے ہو تمہاری شادی کروں گا۔ میں اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہوں۔ میری آنکھوں پر پردے ڈال دیئے گئے تھے۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ مجید کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ وہ بول نہیں سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر سینے پر رکھ لیا۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو بہہ نکلے۔

"بیٹا تم پر بہت سختیاں ہوئیں۔ معاف کردو۔ اب تم اچھے ہو جاؤ گے۔"

مجید کے چہرے پر پھر بے چینی کی علامات پیدا ہوئیں اور وہ زور سے تڑپا۔ میں نے اور والدہ نے سہارا دے کر اٹھایا۔ دوبارہ قے ہوئی اور زمین پر رکھا ہوا طشت پھر خون سے بھر گیا۔ پھر اس پر پہلے ہوتی طاری ہوگئی۔ اس کا رنگ جو سیاہ ہوگیا تھا۔ اب سبز ہو کر ہلدی کی طرح پیلا پڑگیا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو گئے۔

میرے باپ کی مایوس نگاہیں جھک گئیں۔ والدہ طشت اٹھا کر باہر صاف کرنے لے گئی۔ میں نے دوا کی پڑیا گلاس میں ڈالی۔ تھراتے ہوئے ہاتھوں سے اس کو ہلایا اور باپ سے کہا۔

ابا ڈاکٹر کی طرف آپ خود کیوں نہیں جاتے۔ بھیا کبھی نہ جائیں گے۔ انہوں نے میرے ہاتھ سے بالی چھین لی تھی"

"کونسی بالی؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ اماں کی سونے کی بالی جو میں حکیم کو دے رہا تھا۔ اس نے مجھے اور حکیم کو گالیاں بھی دی تھیں۔"

میرے باپ نے غم ناک انداز سے سر جھکالیا۔ "یہ سب میری بیوقوفیوں کا نتیجہ ہے۔ میں جاتا ہوں اور خود ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میرے دل سے ایک آواز اٹھی۔ "اس کا دل اتنا برا نہیں ہے"

اس وقت کمرے میں میرے اور مریض کے سوا کوئی نہ تھا۔ اچانک مجید کو پھر ہوش آنے لگا اور اس نے آنکھیں کھولیں۔ مجھے عزیزہ کا پیغام یاد آگیا اگرچہ میں اس کا مطلب پوری طرح نہیں سمجھا تھا۔

میں نے کہا۔ "بھائی جان ہوش سنبھالو" اس نے میری طرف دیکھا اس کی بصارت کمزور ہوگئی تھی ـــ میں نے کہا "عزیزہ"

مجید کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ میں نے پھر کہا۔ "عزیزہ کہتی تھی جس طرح تم کہو میں تیار ہوں"

میں نے دیکھا۔ اس کے زرد چہرے پر ہلکی سی سرخی آگئی۔ اس کے ہونٹ ہلے:

"کہہ دے ـــ خو ـــ خوش مرگیا۔" وہ تھک گیا اور ایک سانس اس کے کانپتے ہونٹوں سے نکل گیا۔ میں نے کہا

"اور عزیزہ نے حکیم کو دس روپے دیئے تھے" اس نے پھر بولنے کی کوشش کی مگر بول نہ سکا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آہستہ آہستہ اسے ہونٹوں سے لگایا۔ اس کی شکرگزار آنکھیں میرے چہرے کو محبت سے تک رہی تھیں۔

والدہ پانی لے کر آگئی۔ میں عزیزہ کی باتوں میں دوا دینا بھول گیا تھا۔ والدہ نے مجید کو ہوش میں دیکھ کر کہا "بیٹا مجید ـ کیوں"

اس کے لب مسکرائے۔ وہ بولنے کی کوشش کرنے لگا۔ ماں ـــ ا ـــ اللہ۔ اس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ آنکھیں ماں کے چہرے پر تھیں۔ یکایک اس کے جسم میں ایک حرکت سی ہوئی اور اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

ـــ اماں نے اس کی آنکھیں دونوں ہاتھوں سے بند کردیں۔

میں نے والدہ کے سفید اور خاموش چہرے پر نظر ڈالی۔

پھر کسی نے مجھے اندھیرے خلا میں پھینک دیا۔

حفیظ

آوارگی

(۱)

شام ہی سے آسمان پر سیاہ بادل گھرے ہوئے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا بازار کے چراغ ایک ایک کرکے خاموش ہوتے گئے۔ خوانچے والے، تمباکو فروش، تنبولی۔ نصف شب تک "نہ لابرا کو گرما گرم چائے" کی صدا لگانے والے آج دس بجے ہی اپنے بچے کھچے سودے سمیٹ سمٹا گھروں کو جا چکے تھے۔ اکا دکا مسافر۔ بہکے ہوئے شرابی آوارہ مزاج سیلانی۔ تماش بینوں کے گروہ طوفان کی آمد آمد دیکھ کر اپنے اڈوں کی خیر منا رہے تھے۔

میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ آج معمول سے پیشتر اپنی ویران کوٹھری کی خیال آذیں تنہائی میں چلا جاؤں۔

سرائے جس میں بارہ بجے شب تک خاصی چہل پہل رہا کرتی تھی آج سنسان نظر آتی تھی۔ مسافروں کی کوٹھڑیاں بند ہو چکی تھیں۔ بھٹیاریاں اپنی لڑائی دوسرے دن پر ملتوی کرکے قبل از وقت نیند کی آغوش میں خراٹے لے رہی تھیں۔ درختوں کی سائیں سائیں، اور کتوں کی چیخ پکار کے سوا کسی جاندار کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

میں اپنی کوٹھری کی ماحول تاریکی میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ باد و باراں کی آمد آمد میری روح پر ایک بار سا بن رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ میرا تخیل بھی طوفان کی تیرہ دستیوں سے پریشان ہو کر آج فضا میں مصروف پرواز نہ ہو سکتا تھا۔ اور تنگ و تاریک کوٹھری اور سہمے سمٹے دماغ میں محدود رہنے پر مجبور تھا میرے رونگٹیں رونگٹیں پر افسردگی ایک بوجھ کی طرح رکھی ہوئی تھی۔ سینے سے ایک لرزتا ہوا غبار اٹھنا چاہتا تھا مگر نہ اٹھ سکتا تھا۔ میں رونا چاہتا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔

میں نے دیا سلائی کی ڈبیہ سے جس میں دن بھر کی سگرٹ نوشی کے سبب چند دیا سلائیاں باقی تھیں۔ ایک دیا سلائی جلائی اور موم بتی کا ٹکڑا جو چارپائی کے داہنے پائے پر چسپاں تھا روشن کر دیا اور ایک چھچھلتی ہوئی نگاہ اپنی کوٹھری اور اس کے سامان پر ڈالی۔

ایک فرسودہ چارپائی تھی جس پر نامکمل بستر تھا۔ دو کمبل ایک تکیہ۔ چند پرانے ادبی رسائل جو کباڑی کی دکان سے خریدے گئے تھے۔ دو کتابیں۔ چارپائی کے دونوں طرف سینکڑوں سگریٹوں کے جلے ہوئے ٹکڑے۔ سوختہ دیا سلائیاں۔ سگرٹ کے خالی بکس۔ دو تین ملے دلے کاغذ جن پر میرے تازہ نتائج افکار یعنی وہ اشعار درج تھے جو مجھے ہر شب نیند کو بلانے کے لئے موزوں کرنے پڑتے تھے۔

تنگ کوٹھری کی دیواریں چونے پکی کی تھیں۔ ان میں جا بجا گرد سے اٹے ہوئے طاقچے۔ دیواروں کا رنگ کئی برس پیشتر شاید کسی خاص نام سے موسوم ہو سکتا ہو۔ لیکن اب پان کی پیک کے دھبوں۔ چراغ کے دھوئیں۔ بہے ہوئے تیل۔ اکھڑے ہوئے پلستر نے مل کر ان کی رنگت کو بے شمار

رنگوں کا ایک موثر مجموعہ بنا دیا تھا۔

ایک کونے میں میرا سفری ٹین کا لوٹا دھرا تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک لکڑی کی کھونٹی پر میری گرم پتلون لٹک رہی تھی۔ جس کا رنگ کثرتِ استعمال سے خاکستری ہو چلا تھا۔ اور جو ایک مہینے سے استری کی گرم جوشی سے محروم تھی۔

کوٹھڑی کا فرش پختہ مگر اکثر جگہ سے اینٹیں اکھڑی ہوئیں جس پر مدت سے جھاڑو نے عنایت نہ فرمائی تھی۔ اور آتشی خاک کے چھوٹے چھوٹے تودے۔ کوڑا کرکٹ مونگ پھلی کے چھلکے اور دوسری ایسی ہی چیزوں کا فرش ہو رہا تھا۔

(۲)

"ہونہہ" کی ایک گلوگیر صدا میرے سینے سے نکلی۔ جو شرمندۂ لب نہ ہوئی اور میرے چہرے پر زہر خندہ آ گیا۔ میں اوورکوٹ دونوں ہاتھوں سے اتارتے ہوئے اپنے کمرے اور اس کے سامانِ آرائش سے بے توجہی سی اختیار کر لی اور کواڑ بند کر کے لباس کھونٹی کے سپرد کر دیا۔

"فُل بُوٹ" کو جو صبح سات بجے سے اس وقت تک میری آوارہ گردی کا معاون رہا تھا چند گھنٹوں کے لئے رخصت آرام دی اور میں ریشم کے کیڑے کی طرح اپنے خول میں گھس گیا۔

"خول" اس لئے کہ پانچ راتوں سے بستر کو تہ کرنے یا از سرِ نو بچھانے کی تکلیف گوارا نہ کی گئی تھی جس طرح صبح کو اس سے رخصت ہوتا رات کو پھر اس میں داخل ہو جاتا۔ موم بتی کی مدھم اور کانپتی ہوئی روشنی میں کمرے کی ہر ایک چیز بھیانک اور اداس نظر آتی تھی۔ میں نے ایک پرانا رسالہ اٹھایا اور روشنی کے رخ کروٹ لے کر لیٹے لیٹے کچھ دیر ورق گردانی کرتا رہا۔ میرا یہ دلچسپ مطالعہ نیند کے لئے معین وقت سے پیشتر کی گھڑیوں کو دلچسپ بنانے کا معمولی حیلہ تھا۔

کوئی عنوان، کوئی مضمون ایسا نہ تھا جو اکتا دینے والی نگاہ سے بچ سکے مگر موم بتی کا ٹکڑا میرے تلونِ مطالعہ کی تاب نہ لا سکا اور اس کی روشنی اپنی بساط کا آخری سنبھالا لے کر خاموش ہو گئی۔

میری آنکھیں کتاب کے صفحۂ تاریک پر کچھ دیر تک جمی رہیں۔ بالآخر احساسِ ظلمت سے مغلوب ہو کر میں نے تکیہ کے نیچے ہاتھ ڈالا مگر مجھے یاد آ گیا کہ اکثر مرتبہ ارادہ کرنے کے باوجود میں اپنی فطری سہل انگاری کے سبب نئی موم بتیاں خریدنے سے آج بھی قاصر رہا تھا۔

میں نے ایک روکھی پھیکی ہنسی ہنس کر کتاب کو ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور دونوں ہاتھ کمبلوں کے اندر کر لئے اور نیند کے دیوتا کو دھوکا دینے کی ناکام کوشش شروع کی۔ باہر ہوا فراٹے بھر رہی تھی اور چھپروں کے ٹین کھڑکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میرا دماغ ایک ایسی چکی کی طرح جو آٹا پیسنے کے بجائے دانوں کو جوں کا توں گرا دیتی ہے گردشِ بے سود میں مصروف تھا۔ میرے غیر مسلسل خیالات ایک شکستہ جہاز کے تختوں کی طرح ماضی و حال کے طوفانی سمندروں میں غوطے کھا رہے تھے۔ ایک غیر معلوم خوف۔ ایک موہوم ہراس آہستہ آہستہ میرے قلب کی حرکت کو تیز کر رہا تھا۔

(۳)

آج مجھے گھر سے نکلے پورے اکیس دن ہو چکے تھے۔ وہ "گھر" جس میں میں نے اپنی زندگی کے تئیس سال خوشی اور ہر طرح کی بے پروائی میں بسر کئے تھے اب صرف ایک دھندلا سا خیال بن کر باقی تھا۔ سیاہ بادل اسے گھیرے ہوئے تھے اور اس پر حسرت کے آنسو بہا رہے تھے۔

"میں نے گھر کو چھوڑ دیا" یہ الفاظ میرے کانوں میں کوئی آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے ایک گہرا سانس لیا اور کوشش کی کہ ماضی کی ناگوار یاد میرے حافظے سے محو ہو جائے۔

مگر ایک متوسط درجے کے مکان میں ایک معمر بزرگ کی مظلوم صورت بیکسانہ انداز سے مجھے گھور رہی تھی۔ اس کے آنسو اس کی سفید داڑھی کو تر کر رہے تھے۔

"آہ میرا باپ، وہ باپ جس نے اپنی زندگی کی تمام آسائشیں میری ترقی و بہبود کی امید کے ہاتھ فروخت کر رکھی تھی۔ جس نے مجھ پر بھروسہ کرنے میں پدرانہ شفقت کے ساتھ قدرے سادہ لوحی کا ثبوت بھی دیا تھا۔

اس کی آنکھیں مجھے اس خاموش تاریکی میں ملامت سے گھور رہی تھیں۔ اور کالے کوسوں دور میں اپنی، ماں کے غمناک چہرے کو دیکھ رہا تھا عین اسی بے بسی کی حالت میں جس طرح سے میں نے اسے چھوڑا تھا

افسوس ایک خوش باش گھرانا افلاس اور نکبت کی انتہائی پستی میں گرفتار تھا۔

شاید میرے ہی ہونٹوں سے نکلا "خداوندا! صرف میری وجہ سے"

یہ الفاظ اندھیری کوٹھڑی کی فضائے تاریک میں ایک سکوت افزا تھرتھراہٹ کے ساتھ گونجے "نہیں، میرا قصور نہیں، میں اس سے بری الذمہ ہوں دونوں وہی دونوں میرے ماں اور باپ اس کے ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے میری تربیت میں بے پروائی سے کام لیا۔ مجھے کھلے بند دل چھوڑ دیا۔

میرا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ سانس کی آواز ہوا کی چیخوں اور موسلادھار بارش کے طوفان میں صاف سنائی دے رہی تھی۔

"تربیت میں بے پروائی"۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ سینے کے پوشیدہ جھروکے سے کوئی جوان عورت میری اس دلیل کے بودے پن پر مسکرا رہی ہے میرا دل میرے حلق میں اٹک گیا اور میں نے لیٹے لیٹے اپنا سر اور کانپتا ہوا ہاتھ آنکھوں پر پھیرا گویا میں آنے والے خیال کی ملامت آمیز اذیت سے بچنے کے لئے انتہائی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنی روح میں ایک بزدلانہ لرزش محسوس کی "کیا میں اپنی بیوی کے تصور سے بھی تغافل اختیار کرنا چاہتا تھا"

ایک غم دیدہ بار الم سے دبی ہوئی نازنین کا حسن افسردہ میرے روبرو تھا جس کی آنکھیں اس اتھاہ تاریکی ایک ادائے مجبور سے میری طرف نگراں تھیں۔ ان میں شکایت کے بجائے معصومیت اور رضا و تسلیم کے جذبات جھلک رہے تھے۔

میں ایک مجرم کی طرح اپنی بے بس بیوی کی خیالی مورت کے سامنے کانپ گیا: ہاں یہ میری بیوی تھی جس پر انتہائی ظلم ہوا تھا۔ انتہائی ظلم۔ خدا کی پناہ" ایک گلوگیر صدا بے اختیار میرے منہ سے نکل گئی۔

تین برس۔ پورے تین برس، میں نے اس کے صبر کا بڑا کڑا امتحان لیا تھا۔

اس عالم خیال میں مجھے اپنی بیوی کی غم ناک آنکھوں سے دو آنسو بہتے نظر آئے۔ میرا دل سینے کے اندر بیٹھ گیا۔ میرے دماغ کے سامنے گزشتہ واقعات متحرک تصاویر کی طرح سے گزرنے لگے

(۴)

میں نے دیکھا کہ میں اپنی ذمہ داریوں سے بے پرواہ "تعیش" کے ذلیل راستے پر قدم زن ہوں۔ میرے خیالات مجھے پھر اسی صحبت میں لے گئے جو میں نے باوجود متاہل ہونے کے اختیار کر رکھی تھی۔

"وہی شوق آزما مکان" جس کا دروازہ اس دولت کے لئے ہمیشہ کھلا تھا جو میں نے اپنے باپ سے حاصل کی تھی۔ "وہی عورت" جس کو مجھ سے زیادہ میری دولت سے عشق تھا۔ مصنوعی بناؤ سنگار کئے میرے لئے چشم براہ تھی۔ اس کے ہاتھوں، اس کے کانوں، اس کے سینے پر میری "بیوی" کے زیورات چمک رہے تھے۔ وہ زیورات جو میرے باپ نے میری شادی پر قرض لے کر بنوائے تھے۔ "آہ ــــ!"

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری چارپائی زلزلے سے کانپ رہی ہے کیونکہ میرے سامنے یہی بے وفا عورت ایک دوسرے دولت مند "مرد" کے لئے بے تاب محبت نظر آ رہی تھی۔ اس لئے کہ اب میرے باپ کا کل اثاثہ "میرے ہاتھوں" اس کی بے پناہ خواہش زر کی نذر ہو چکا تھا۔

اور میں سر جھکائے ہارے ہوئے قمار باز کی طرح اس کے مکان سے نکل رہا تھا۔ میرے قدم اپنے افسردہ گھر کی طرف نہیں۔ جہاں والدین اور ، بیوی میری "تباہ حال" واپسی کے منتظر تھے بلکہ پردیس اور مسافری کی طرف میری رہنمائی کر رہے تھے۔ میری شرم میرے گھر

واپس جانے میں مانع تھی۔

اس مدہوشیٔ خیال کے عالم میں واقعاتِ گزشتہ کی حقیقت بجلی کی طرح میرے تاریک دماغ میں چمکی۔ وہ جانکاہ حقیقت جس نے میرے بوڑھے والدین اور جوان بیوی کے لئے دنیا کی راحتوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔

میں نے کیا کیا؟ میرے دل میں افسوس اور ندامت کے جذبات ابھرے۔

"کیا مجھے گھر واپس جانا چاہئے۔ نہیں مجھ میں ایسی جرأت نہیں! موقع گزر گیا۔ مجھے بھول جانا چاہئے کہ میرا کوئی گھر تھا"

ایک بار پھر ماں باپ کے حسرت ناک چہرے میرے سامنے آ گئے جن پر بڑھاپا اور ماندگی برس رہی تھی۔ آہ جن کو میں برباد اور مفلس چھوڑ کر آوارہ گردی کرنے نکل آیا تھا۔ اور جو صرف میری امید ہی کے سہارے زندہ تھے۔

پھر ایک بار میری بیوی کی غم زدہ آنکھیں میری طرف بے بسی سے تک رہی تھیں۔ اس کی مسرور گھڑیاں صرف میرے دم سے وابستہ تھیں، اس نے اپنی تمام جوانی میرے تغافل کی نذر کر دی تھی۔

آگ کی طرح جلتے ہوئے آنسو میری آنکھوں سے بہہ نکلے۔ میں رویا۔ میرا حلق خشک ہو گیا۔

میری ذلیل کوٹھڑی سے باہر سرائے کے کشادہ صحن میں ہوا اور پانی میں زور آزمائی ہو رہی تھی۔ درختوں میں ہوا چیخیں مار رہی تھی۔ بجلی تڑپ رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ طوفان نے ایک طوفان قیامت برپا کر رکھا تھا

یک لخت میری تمام روح کا بوجھ آنسو بن گیا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

(۵)

صبح کو بادل چھٹ چکے تھے اور سرد ہوا کے لطیف جھونکے آہستہ آہستہ سرسرا رہے تھے۔ سورج اُفق پر نیا نیا نظر آ رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ سحر کسی عظیم راز کا انکشاف کر رہی ہے اس وقت میرا دل سبک تھا اور خوشی سے دھڑک رہا تھا۔

اور جب صبح کی روشنی میری تاریک کوٹھری میں حیاتِ تازہ کا پیغام لائی تو میں اپنا اسباب باندھ چکا تھا۔ اور اپنے چھوٹے ہوئے گھر اور بچھڑے ہوئے عزیزوں کے پاس جانے کو تیار تھا۔　　　　(ہفت پیکر)

کچھ شاہنامۂ اسلام کے بارے میں (صفحہ ۲۷۵ سے آگے)

جنم لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ آج سنہ ۱۹۴۷ء میں اس جنم کے درد کی چیخیں ہندوستان کے گوشے گوشے سے سنائی دے رہی ہیں۔

جیسا کہ واضح کر دیا گیا ہے شاہنامۂ اسلام جذبہ ہی سے لکھا جا رہا ہے لہٰذا وہ لوگ جو اس کتاب کے مخاطب ہیں ہندوستان کے ان نئے خوابوں کی تعبیر اور اس نئی دنیا کے جنم کے درد و کرب میں اپنے لئے اپنے پیشوایان ملت ہی کی حیات مبارکہ کے واقعات سے شاہنامۂ اسلام ہی کے ذریعے انشاء اللہ وہ راستہ پا لیں گے جس کی ان کو اس پر آشوب عالم میں ضرورت ہے۔ ان کو معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ آج پیش آ رہا ہے ایسا ہی کچھ بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ سرمایہ و اقتدار کی طاقتوں کی طرف سے پونے چودہ سو برس پیشتر دنیا کے ہادیٔ اعظم اور آپ کے صحابۂ اکرام کو بھی پیش آ چکا ہے۔ بہت ہی سادہ الفاظ میں شاعرانہ الجھاوے کے بغیر محض اپنے خون دل کی رنگینی کے ساتھ وہ واقعات نظم کر دیئے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے ایسے موقعہ پر زندہ قومیں مشکلات پر غالب آ جایا کرتی ہیں۔ خواہ وہ بے سر و سامانی اور اقلیت ہی میں کیوں نہ ہوں۔

البتہ حفیظ دوسرے جنم کا قائل نہیں۔ اسی جنم میں جو نئے نئے نظارے پیش نظر ہوئے اور جو تاثرات اس کے قلب پر وارد ہوئے۔ ان کی صورت گری میں اس نے کوتاہی نہیں کی۔ تلخابۂ شیریں شائع ہو چکا ہے۔ شاید ہندوستان اس کو موجودہ حالت کے مطابق پائے لیکن شاہنامہ اسلام — تو میں عرض کر چکا ہوں ایک قلعہ ہے اور قلعے بہت مدت تک قائم رہنے کے لئے تعمیر کئے جاتے ہیں۔　　　　(دیباچہ شاہنامۂ اسلام جلد چہارم)

حفیظ

(۱)

خوب صورت تارا دیکھنے والوں کو اٹھارہ سال کی جوان لڑکی معلوم ہوتی تھی مگر اس کی عمر سولہ برس سے بھی چند مہینے کم تھی۔ ایک ایسا شگفتہ پھول معلوم ہوتی تھی جس کو کھلے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ حسین تھی مگر اس کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ حسن دلوں پر بجلیاں بھی گرا سکتا ہے۔ الڑھ، مٹھائی اور کھلونوں سے بہل جانے والی۔ بچوں کی طرح کھیل کود کی شائق۔ وہ عام پارسی لڑکیوں کی طرح دیدہ دلیر اور چالاک نہ تھی۔ اس میں ملنساری اور بے تکلفی کا میلان قدرے زیادہ تھا۔

وہ ابھی ابھی اسکول سے تعلیم حاصل کر کے نکلی تھی۔ اور اس خوشی میں اس کے دولت مند باپ مسٹر رستم جی نے اپنے چند بے تکلف دوستوں کو مختصر سی دعوت دی۔ اس دعوت میں نریمان بھی مدعو کیا گیا اور اس کا باپ بھی جو بمبئی کا کروڑپتی مہاجن تھا۔

کھانا کھانے کے دوران میں تارا مہمانوں سے نہایت بے تکلفی سے گفتگو کرتی رہی۔ اس کی گفتگو کا موضوع اسکول کی دلچسپیاں، ہم جولیوں کے تذکرے اور قدرتی مناظر کا ذکر تھا مگر اس کی پیاری پیاری باتوں میں لطف یہ تھا کہ ہر چیز کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتی تھی۔

کھانے کے بعد اس نے پیانو بجایا۔ موسیقی کے اثر سے تمام مکان گونج اٹھا۔ ریشمی گلابی ساڑھی باندھے تارا اس وقت پری نظر آتی تھی۔

بس اسی دن سے نریمان کو معلوم ہو گیا کہ وہ تارا پر جان دیتا ہے۔ فدا ہے۔ باتوں باتوں میں عشق اس کی ہستی پر حاوی ہو گیا۔ جوش و خروش کی حدوں سے گزر گیا۔ کم سن تارا کا بے پناہ حسن اس کے دل پر اثر کر گیا۔ وہ اس کی تقدیر کے فیصلے پر حاکم ہو گئی۔

رفتہ رفتہ اس کی آمد و رفت اس مکان میں بہت بڑھ گئی۔

تارا کے والدین نے بھی اس ارادے کو غیر مناسب نہ سمجھا۔ اس لئے کہ دولت مند ہونے کے علاوہ نریمان صورت و سیرت کے لحاظ سے بھی اپنے ہم عصر نوجوانوں میں ممتاز تھا۔ اکیس سال کی عمر میں اس نے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر لی تھی۔ اب دو سال سے اپنے باپ کے مہاجنی کاروبار میں شریک تھا وہ ہر روز اپنی محبوبہ کے مکان پر حاضری دیتا اور اس کے لئے پھول اور مٹھائی لے جاتا۔ وہ اکثر پائیں باغ کے ایک پھولوں سے بھرے ہوئے کنج میں بنچ پر بیٹھ کر تارا کو کوئی دلچسپ کتاب سناتا۔ پیانو اس کا ہم آہنگ بنتا۔ وہ شام کے کھانے پر اس خاندان کی میز کا ایک ضروری رکن ہو گیا تھا غرض کہ نریمان کی آرزوؤں کے بر آنے میں کوئی امر مانع نہ تھا مگر اسے اپنی کم سن محبوبہ سے عرض مدعا کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

شاید وہ عشق کے جذبات کو سمجھ نہ سکے۔ شاید اسے محبت کا مفہوم معلوم نہ ہو کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ شاید وہ اپنے میلان کا اندازہ نہ کر سکے

یہ خیالات اس کے بڑھتے ہوئے خیال کو پسپا کر دیتے اور وہ اس کے سامنے دوزانو ہوتے ہوتے رک جاتا تھا پھر وہ خیال کرتا ابھی جلدی کیا ہے۔ انتظار کا لطف چند روزہ ہے۔ وصال کے بعد امید وبیم کے لمحے ہوا ہو جائیں گے۔ وہ انتظار کی غم انگیز گھڑیوں میں ایک قسم کی لذت محسوس کرتا تھا۔

مگر آخرکار عشق جنون کے درجے تک پہونچ گیا۔ اس کی راتیں ہجوم خیالات میں کروٹیں بدلتے گزر جاتی تھیں۔ وہ آدھی رات کو بستر استراحت سے اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے حسین تخیل میں ڈوبا ہوا کمرے میں ادھر ادھر ٹہلتا حتیٰ کہ صبح ہو جاتی۔ وہ حرف مدعا کی ہزاروں صورتیں صفحۂ دل پر بناتا اور بگاڑ دیتا تھا دفورِ شوق سے مجبور ہو کر ایک دن اس نے تارا کی والدہ سے تخلیہ میں ملاقات کی۔ وہ حسب توقع محبت سے پیش آئیں اور نہایت مسرت سے اس کی درخواست منظور کر لی اور اجازت دیدی کہ وہ جس وقت چاہے تارا سے اپنی تمنا کا اظہار کر سکتا ہے۔

یہ موقع بھی اسے اسی شام حاصل ہو گیا۔ تارا اپنے کمرے میں ایک صوفے پر بیٹھی تھی۔ نریمان اس کے دونوں ہاتھ تھامے ہمہ تن گویائی بنا ہوا تھا۔ پہلے پہل تو وہ کانپ سی گئی۔ شرم سے اس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ پھر نہایت بھولے پن کے ساتھ حیرت سے نریمان کا منہ تکنے لگی۔ جب وہ اپنی بے تابی کا حال بیان کر چکا تو ہنس کر بولی۔ "تو کیا آپ واقعی مجھ سے بہت جلد شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں اگر تمہاری مرضی بھی ہو"

تارا کچھ سوچنے لگی۔ نریمان امید وبیم کی تصویر بن گیا۔ اس کی نبض تیز تیز چل رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ دل میں ہزاروں وسوسے گزر رہے تھے۔ کیا اس نے ابھی تک دل سے فیصلہ نہیں کیا۔ کیا اسے ابھی تک محبت کا احساس نہیں ہوا۔ کیا میں جلد بازی کر رہا ہوں۔ کیا یہ میرے دل کی اصلی حالت کو سمجھ بھی سکتی ہے۔؟"

لیکن یک لخت اس کے یہ خیالات مسرتِ بے پایاں سے بدل گئے کیوں کہ تارا کھلکھلا کر ہنسی، اور دونوں ہاتھ نریمان کے شانوں پر رکھ دیے "ارے تم مجھے پیار کرتے ہو۔ تم بہت نیک ہو۔ ابا جان تم کو نیک سمجھتے ہیں۔ اماں جان بھی تمہاری لیاقت کی تعریف کرتی ہیں"

نریمان نے پوچھا۔ کیا تم بھی ــــ"

"ہاں میں بھی تم کو بہت اچھا بہت نیک جانتی ہوں۔ تم میرے لئے پھول لاتے ہو۔ تم مجھے کہانیاں سناتے ہو۔ تم بہت اچھے ہو"

نریمان نے دل کڑا کر کے مکرر کہا۔ کیا تم مجھ سے شادی کرنے کو تیار ہو؟"

تارا بولی اچھی بات ہے"

نریمان مسرت کی بے خودی میں غرق ہو گیا۔

(۲)

اس باہمی رضامندی کے بعد تارا کے والد نے ان دونوں کی منگنی کا اعلان کرنے کے لئے ایک پرتکلف دعوت دینے کا سامان کیا اور دوستوں اور رشتہ داروں کو خطوط لکھے۔

دعوت سے ایک دن پیشتر نریمان کا ایک دوست جو کالج میں اس کا ہم جماعت تھا اور بیرسٹری پاس کرنے ولائت چلا گیا تھا، واپس لوٹا۔ اس کا نام فرامرز تھا۔ پونا کا رہنے والا تھا۔ ولایت کے دورانِ قیام میں اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا اور اب وہ بمبئی میں وکالت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے بشرے سے غیر معمولی ذہانت کے آثار ہویدا تھے۔ وہ بہت خوب صورت تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں ایک ایسا مقناطیسی اثر تھا کہ جو دیکھتا تھا اس کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ نریمان کو اس کی دوستی پر حد سے زیادہ ناز تھا۔ دعوت کے روز وہ اسے بھی اپنی محبوبہ کے مکان پر لے گیا اور تارا کے خاندان کے لوگوں سے اس کا تعارف کرا دیا۔

دعوت بہت پرتکلف اور پرلطف تھی۔ نریمان کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی کیوں کہ مسٹر رستم جی نے مہمانوں کے سامنے اس کے ساتھ اپنی

دختر کی نسبت کا اعلان کر دیا اور تین ماہ بعد شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی۔

اس جلسہ میں فرامرز پر خاص نگاہیں پڑ رہی تھیں۔ اس کی گفتگو، اس کی معلومات جریدہ اس کے نظر فریب جمال کی وجہ سے ہر شخص اس سے بہت جلد مانوس ہو گیا۔ فرامرز کی بات بات سے ذہانت اور علمیت کا اظہار ہوتا تھا۔ مسٹر رستم جی تو اس کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ ملاقات باز دید کے لئے اصرار کرنے لگے۔

کھانے کے بعد نریمان، فرامرز، تارا تینوں باتیں باغ میں سیر کرنے لگے۔ گو کچھ زیادہ گفتگو نہیں ہوئی کیونکہ تارا اس اجنبی کے سامنے کچھ جھینپی ہوئی غیر معمولی طور پر کچھ خاموش معلوم ہوتی تھی۔ اور جب رخصت ہوتے وقت وہ نریمان کے کوٹ میں گلاب کا پھول لگا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے لیکن نریمان اس کی دل فریب اداؤں میں محو تھا۔

دونوں دوست رخصت ہو کر گھر کی طرف چلے۔ راستے میں فرامرز نے تارا کی بہت تعریف کی: "آپ کی منسوبہ بالکل فرشتہ ہے۔ اس کے سراپا میں حسن اور عصمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بے شک آپ خوش نصیب ہیں، میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں"

نریمان نے اس کے جوش تعریف کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا اور گفتگو منگنی اور شادی سے گزر کر تارا کے والدین کے تموّل اور [illegible] جائداد اور مکانوں کی کثرت تک پہونچ گئی۔

اس وقت مسٹر فرامرز کو یاد آیا کہ اسے اپنے دفتر وکالت کے لئے ایک مکان کی ضرورت ہے۔ نریمان نے وعدہ کیا کہ وہ رستم جی سے دریافت کر کے اگر کوئی اچھا مکان خالی ہوا تو اسے دلوا دے گا۔

اب تارا کے گھر میں نریمان ایک امتیازی نشان رکھتا تھا۔ دوسرے دن شام کے وقت تارا اور وہ باغ کے ایک گوشے میں بیٹھے تھے۔ نریمان دنور شوق سے رازونیاز کی باتوں میں مشغول ہو گیا لیکن اس نے دیکھا کہ اس کی منگیتر طول کلام سے اُکتا رہی ہے۔ وہ گرم جوشی اور تعجب سے پوچھنے لگا: "کیا تم کچھ تھکی ہوئی ہو؟"

تارا دلفریب ادا سے مسکرائی۔ اس نے ایک انگڑائی لی "نہیں مجھے تمہاری باتوں سے ہول آتا ہے۔ اس طرح کی چاہت خوفناک ہے"

نریمان اس بھولے پن پر مٹ گیا اور اس نے گفتگو کو طول دینے کے لئے ہنس کر پوچھا "محبت سے ہول۔ ہول کیسا؟"

اس نے کچھ کھسیانی سی ہو کر آنکھیں جھکالیں اور پھر اپنی ساڑھی سر پر درست کرتے ہوئے بولی، "میں نے ایک کتاب میں پڑھا کہ عورتیں بھی مردوں سے بے انتہا محبت کرتی ہیں"

نریمان کو جیسے بہانہ ہاتھ آگیا۔ "کیا تم بھی ایسا نہ کرو گی کیا تم نہ چاہو گی تارا؟"

تارا کے چہرے پر ایک خفیف سی غم انگیز زردی چھائی۔ وہ سوچنے لگی۔ پھر مسکرائی "کیوں نہ چاہوں گی۔ شوہر کی پرستش تو فرض ہے اور تم تو بہت ہی مہربان ہو"

یہ گفتگو یہیں ختم ہو گئی کیونکہ تارا کا باپ اور مسٹر فرامرز نزدیک ہی ایک دوسرے سے باتیں کرتے اس طرف آ رہے تھے۔

دونوں اٹھ کر اس طرف بڑھے۔ مسٹر رستم جی نے مشفقانہ اور بزرگانہ انداز سے کہا "دیکھئے آپ کے دوست آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں"

فرامرز نے تارا سے ہاتھ ملانے کے بعد نریمان سے مخاطب ہو کر کہا "میں سمندر کی سیر سے واپس آ رہا تھا۔ خیال آیا کہ آپ کو ساتھ لیتا چلوں۔ مکان کے متعلق بھی دریافت کرنا ضروری تھا"

نریمان رازونیاز میں مکان دریافت کرنا بھول گیا تھا اب اسے یاد آیا۔ "مجھے یاد ہی نہ رہا۔ میرے خیال میں اگر کوئی مکان ہو تو مسٹر رستم جی کو آپ سے بہتر کرایہ دار نہیں مل سکتا"

رستم جی اپنے بھاری شانوں کو ہلا کر ہنسے۔ "میں سمجھا آپ کو وکالت کے لئے دفتر کی ضرورت ہے ٹھہرئیے"

پھر سوچ کر بولے، "تارا بیٹی کونسا مکان خالی ہے؟"

تارا نہ جانے اس وقت کس خیال میں محو تھی۔ وہ اس سوال پر چونک اٹھی "ابا خالی مکان
رستم جی نے جلدی سے کہا، مجھے یاد آگیا۔ لیجئے کل آپ کو مکان مل جائے گا۔ یہاں سے بالکل نزدیک ہے۔ دو سو گز کے فاصلے پر۔ کل تارا آپ کو مکان دکھا دے گی۔

(۳)

شادی کے دن قریب آتے گئے۔ انواع و اقسام کی ریشمی اور زردوز ساڑھیاں، نئے ملبوس، جواہر، زیورات، خریدے جانے لگے۔ دھوم دھام کی تیاریاں ہونے لگیں۔ دوستوں کی طرف سے تحفے آئے۔

مسٹر فرامرز کی وکالت کا کام کچھ ایسا نہیں چلا۔ اول تو نیا نیا کام دوسرے ان کو مسٹر رستم جی کی محبت نے اپنی طرف مشغول کرلیا اور صبح و شام تارا کے گھر میں جانا ان کا روزانہ معمول ہو گیا۔ نریمان کا مکان زیادہ فاصلے پر تھا اس لئے مسٹر فرامرز تیسرے چوتھے روز وہاں جاتے تھے۔ وہ بھی گھڑی بھر کے لئے۔

نریمان کو اپنی محبوبہ کے سوا اور کسی کا خیال ہی نہ تھا۔ وہ اپنی تقدیر پر نازاں تھا۔ جوں جوں شادی کا دن قریب آتا گیا اس کے شوق و وارفتگی میں ترقی ہوتی گئی۔ وہ خوشی کی بلندیوں پر پرواز کر رہا تھا

لیکن تارا کی حالت کچھ اور تھی۔ کھیل کود، ہنسی، بھولا پن کی تمام حالتیں، خموشی، متانت اور سنجیدگی میں تبدیل ہو گئیں۔ اگلی بشاشت اور چہک دمک پر اداسی کا بادل چھا گیا۔

نریمان نے اکثر دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے لیکن اس نے زیادہ پرواہ نہ کی۔ وہ خیال کرتا تھا کہ والدین سے جدائی پر لڑکیوں کو قدرے رنج ہوا ہی کرتا ہے۔

اتفاق سے ایک دن وہ صبح صبح کسی کام کے لئے فرامرز کے ہاں جاتے ہوئے تارا کے مکان کے قریب سے گزرا۔ سورج نکلے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی اس نے دیکھا کہ قرمزی ساڑھی پہنے اس کی محبوبہ دوسری طرف سے اپنے مکان کی طرف جھپٹی چلی آرہی ہے۔ اس کا چہرہ بشاش معلوم ہوتا تھا اور اپنے خیال میں محو بغیر نریمان کو دیکھے اس کے پاس سے گزر ہی چلی تھی کہ اس نے اسے مخاطب کرلیا۔

"یہ صبح صبح کہاں کی سیر ہو رہی ہے میرا تو خیال تھا آپ خواب نوشیں سے بیدار بھی نہیں ہوئی ہوں گی"

تارا چونک اٹھی۔ اس کے چہرے کا رنگ یک لخت زرد پڑ گیا۔ منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"نہیں میں تو ہمیشہ صبح اٹھنے کی عادی ہوں اور کچھ دنوں سے تو ۴ بجے ہی آنکھ کھل جاتی ہے"

نریمان کو اس کی اس کیفیت سے تعجب سا ہوا اس نے کہا، "خوب، مجھے معلوم ہی نہیں ہوا ورنہ میں بھی اس صبح کی پُرلطف سیر میں شامل ہوا کرتا، کیا تم کچھ بیمار ہو۔ تم کانپ رہی ہو"

واقعی تارا بیمار معلوم ہوتی تھی مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا، "نہیں معمولی سی تکان ہے۔ پھر بات ٹالنے کے انداز سے پوچھا، "کہاں جا رہے ہو؟"

"ذرا فرامرز کی طرف جا رہا ہوں"

تارا ہنسی، "دوستی بھی جی کا جنجال ہے۔ بہرحال ہو آئیے۔ واپس آکر چائے پیتے جائیے گا۔"

نریمان یہاں سے چلا تو دور سے فرامرز صاحب کے برآمدے پر نگاہ جا پڑی۔ فرامرز اس وقت برآمدے میں ٹہل رہے تھے اور آہستہ آہستہ کچھ گنگنا رہے تھے۔ ہاتھ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا یا کوئی تصویر تھی جسے بار بار دیکھتے جاتے تھے۔ نریمان پر نظر پڑتے ہی کاغذ کا ٹکڑا جیب میں ڈال لیا۔ اور

مسکراتے ہوئے چبوترے سے اُتر کر مصافحہ کرنے کو بڑھے اور تپاک سے بولے "اہا صبح صبح کہاں کے ارادے ہیں"

آپ نظر ہی نہیں آتے۔ وہ تو شکر ہے کہ آپ پیاری تارا کے مکان کے قریب ہی رہتے ہیں ورنہ ملاقات ہی نہ ہوتی۔

یہ کہتے ہوئے نریمان فرامرز کے ساتھ برآمدے کے چبوترے پر چڑھ گیا۔ برآمدے میں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دونوں بیٹھ گئے۔

فرامرز نے ہنستے ہوئے جواب دیا، غرض تو ملاقات ہی سے ہے آپ کے مکان پر نہ سہی آپ کی محبوبہ کے مکان پر سہی۔ اور سچ پوچھو تو مجھ ایسے نکمے اور عشق و محبت سے بے بہرہ آدمی سے آپ کو ملاقات کا لطف کیا خاک ملتا ہوگا؟"

نریمان نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں وہ اس وقت غور سے زمین پر پڑی ہوئی ایک جڑاؤ آلپین کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اسی طرح کی جڑاؤ آلپین کچھ دن گزرے نریمان نے اپنی منسوبہ کی نذر کی تھی جسے تارا ہمیشہ اپنے خوش نما سیاہ بالوں میں لگائے رہتی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر آلپین کو اٹھا لیا اور اپنے دوست سے پوچھنے لگا، "یہ آلپین تارا کی معلوم ہوتی ہے"

فرامرز نے جلدی سے آلپین اس کے ہاتھ سے لے لی اور تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔

"شاید اسی کی ہو۔ کل دوپہر وہ یہاں اس کرسی پر بیٹھی تھی جہاں تم بیٹھے ہو۔ بہرحال میں نے اسے دیکھا نہیں۔ اچھا ہوا آپ نے دیکھ لیا۔ میرا بہت خوب صورت ہے۔"

نریمان اس وقت سوچ رہا تھا کہ شام کے وقت آلپین اس کے بالوں میں چمک رہی تھی پھر اس نے خیال کیا۔ شاید کوئی دوسری ہو اور گم ہو جانے کا زیادہ پرواہ نہ کر کے تارا نے اس کا ذکر نہ کیا ہو۔

وہ اسی خیال میں غلطاں تھا کہ فرامرز کے قہقہے نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا، کہئے آپ کی شادی میں کتنے دن باقی ہیں۔ یار بہر خوش نصیب تارا جیسی بیوی قسمت سے ملتی ہے۔

نریمان نے مسرت سے اپنے دوست کا ہاتھ دباتے ہوئے جواب دیا، بھائی میں واقعی خوش نصیب ہوں۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں۔ اب تو صرف دس دن باقی رہ گئے ہیں۔"

" دس دن یاد ہوں" فرامرز نے اس تعجب سے کہا کہ نریمان اس کے لہجے سے بہت حیران ہوا۔

پھر ہنس کر بولا" یار معاف کرنا۔ ہم وکالت پیشہ لوگوں کو نسیان کا عارضہ لاحق ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ کی شادی میں ابھی ایک مہینہ باقی ہے میں نے اب تک کوئی تحفہ بھی تمہاری حسین دلہن کے لئے نہیں خریدا۔

نریمان کو اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ فرامرز دنیاداری کی باتیں کر رہا ہے مگر اس نے دل ہی دل میں اپنے خیال پر نفرین کی اور جڑاؤ آلپین اٹھاتے ہوئے جو فرامرز نے کرسی کے بازو پر رکھ دی تھی، بولا" دن یاد رکھنا۔ لو اب میں جانا چاہتا ہوں۔ بابا کئی دن سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ کل وہ آنے والے ہیں اور ان کے آنے سے پیشتر مجھے دفتر کا کام ختم کر دینا چاہئے۔ کیونکہ پھر مجھے کئی ہفتہ کے لئے کام سے علیحدہ رہنا پڑے گا۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے دوست سے ہاتھ ملا کر تارا کے گھر کی طرف واپس لوٹا۔

سورج نکل آیا تھا اور تارا اپنے کمرے میں تنہا تھی۔ وہ بہت تپاک سے ملی۔ اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلائی آلپین کے ذکر پر بہت ہنسی اور کہا، یہ کل سے گم تھی۔ شاید آپ کے دوست کے ہاں گر گئی ہو۔ میں اکثر جب یہاں سے اُکتا جاتی ہوں تو ان سے ملنے چلی جایا کرتی ہوں

نریمان کو بالکل تسلی ہو گئی۔ اور وہ ہنسی خوشی وہاں سے رخصت ہو کر اپنے گھر آیا

(۴)

اسی دن شام سے کچھ پہلے بہت زور کی گھٹا اٹھی اور موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ نریمان کچھ تو کام کی کثرت کے سبب جو باپ کی غیر حاضری کے

سبب اسے انجام دینا تھا اور کچھ بارش کے سبب تارا کے ہاں نہ جا سکا۔ پانچ بجے جب دفتر بند ہو گیا اور کلرک سب چلے گئے تو وہ چپراسی سے ہی کھانا منگوا کر اپنے کمرے میں لے گیا اور حساب کی پڑتال میں مصروف ہو گیا۔ پھولوں اور بیلوں سے لدے ہوئے برآمدے سے باہر ہوا اور پانی باہم جنگ و جدل میں مصروف تھے۔ ہولناک رات تھی۔ رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی اور چمک کے ساتھ رعد کی دل ہلا دینے والی گرج سنائی دیتی تھی۔ نریمان کا دل نہ جانے کیوں خود بخود بیٹھا جاتا تھا۔ وہ کام کی کثرت سے بار بار اکتا جاتا اور سگرٹ سلگا کر عناصر کے بھوتوں کی چیخ و پکار سننے لگ جاتا۔ اسی عالم میں کلاک نے ۹ بجائے۔ اب اس کا دماغ تھک گیا تھا۔ ہندسے اور حروف رجسٹر کے صفحے پر ناچتے دکھائی دیتے۔ اس نے مجبور ہو کر قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور سستانے کے لئے کرسی سے ٹیک کر آنکھیں بند کرلیں۔ مگر وہ تعجب سے چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے دروازے پر کوئی شخص آہستہ آہستہ دستک دے رہا تھا۔ سوچنے کے بغیر کہ ایسے وقت میں دستک دینے والا کون ہو سکتا ہے اس نے جلدی سے کواڑ کھولا۔ سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس کے ساتھ ایک صدا اس کے کان میں آئی "نریمان" اور دو کانپتے ہوئے نازک ہاتھ اس کی طرف بڑھے۔

"ارے تارا" اور وہ دیوانہ وار گویا اسے گود میں اٹھا کر کمرے کے اندر لے آیا۔

تارا سردی سے کانپ رہی تھی۔ اس کے کپڑے پانی میں شرابور ہو رہے تھے۔

نریمان نے دونوں ہاتھوں سے اس کا بھیگا ہوا کوٹ اتارتے ہوئے محبت سے پوچھا۔

"جانِ من! ایسے وقت میں اتنی دُور تکلیف کرنے کی جرأت کیوں کی۔ میں تو صبح خود ہی حاضر ہو جاتا اور تم تو بالکل ٹھٹھر رہی ہو"

سادہ لوح عاشق سمجھا کہ میں آج شام حسب معمول حاضر نہ ہو سکا تھا اس لئے میری یاد میں معشوقہ خود ۔۔ آگئی ہے۔ اس کا دل خوشی اور تفاخر کے جذبات سے لبریز تھا۔

لیکن تمہارا چہرہ کتنا اُترا ہوا ہے۔ تم ضرور بیمار ہو۔ یہ کہہ کر وہ اپنا گرم کوٹ اُسے اوڑھانے کے لئے کھونٹی سے اتارنے لگا۔

تارا نے کانپتی ہوئی آواز سے اسے روک دیا اور کہا "آپ تکلیف نہ کیجئے۔ میں اچھی ہوں، بہت اچھی ہوں۔ میں آپ سے چند ضروری باتیں کہنے آئی ہوں"

یہ کہہ کر اس نے لمبا اور ٹھنڈا سانس لیا اس کا چہرہ بالکل زرد تھا۔ کیا وہ بیمار تھی۔؟

نریمان کے دل میں ایک مبہم سا وسوسہ گزرا "نہ جانے کیوں آئی ہے؟" اس کا دل اس کے حلق میں اٹک گیا اور وہ چپ چاپ سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کا منہ تکنے لگا۔

اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا "یہ کیا کہنے والی ہے"

تارا وحشی ہرنی کی طرح اس کو تک رہی تھی۔ شاید لفظ اس کے خشک گلے میں پھنس رہے تھے

نریمان جی کڑا کر کے بولا۔ کہو۔ کہو۔ وہ کونسی ایسی بات ہے جس کے لئے تم نے اس طوفان میں اتنی دُور آنے کی تکلیف گوارا کی۔ کہہ دو۔ کہہ دو۔ مجھ سے کیا پردہ ہے۔ کیا گھر میں کسی سے جھگڑا ہو گیا۔ کوئی تم پر خفا ہوا۔

تارا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

نریمان کا طائرِ دل سینے میں پھڑپھڑایا "تم رو رہی ہو۔ وہ کونسی ایسی بات ہے۔ سب کچھ کہہ دو۔ صرف یہ نہ کہنا کہ میں تمہیں پیار نہیں کرتی"

"آہ یہی تو میں کہنا چاہتی ہوں۔ تم کو معلوم ہو جانا چاہیئے تھا۔ افسوس میں نے پہلے کیوں نہ کہہ دیا"

نریمان کو ایسا معلوم ہوا کہ زمین اس کے پاؤں تلے سے نکل گئی۔۔ وہ بالکل ساکت اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا

پھر وہ بولی "نریمان میں نے تمہیں کبھی نہیں چاہا۔ مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ چاہت کیا ہوتی ہے"

نریمان یکایک کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اس کے پاؤں لڑکھڑائے۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ تارا کی کرسی پر ٹیک دیا اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا

تارا کا چہرہ بالکل سفید تھا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کی صورت پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔

نریمان گلوگیر آواز سے بولا "کیا یہ سب خواب تھا تارا۔ یہ نئی بات ہے۔ کیا یہ سب مذاق تھا یا اب تم مذاق کر رہی ہو"

تارا نے ملتجی نگاہیں اس کے چہرے پر ڈالیں۔

"کچھ کبھی سمجھو۔ میں صاف صاف کہہ دینا چاہتی ہوں۔ میرے دل میں کبھی تمہارے لئے وہ محبت پیدا نہیں ہوئی جو عورت کو مرد سے ہوتی ہے اب مجھے اس کا حال معلوم ہوا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ میں نادانستہ طور پر تم کو دھوکا دے رہی ہوں۔ میری محبت تم سے نہیں۔ بلکہ..... "

یکایک ایک شبہہ نریمان کے دل میں ابھرا۔ اس نے مجسس نگاہیں ڈال کر تارا سے پوچھا۔ "خوب، اب تم کسی اور کو چاہتی ہو۔ وہ کون ہے؟"

تارا کے چہرے پر ہلکی سی سرخی آگئی

"کیا تم مجھے معاف کردو گے۔ کیا تم نسبت توڑنے پر رضامند ہو؟"

نریمان کو غصہ آگیا "تارا تم ظلم کر رہی ہو۔ تم کو اپنی چاہت کا حال بتانا پڑے گا۔ ہاں تم کو بتانا پڑے گا کہ وہ کون ہے؟"

اس نے اپنا پاؤں زور سے اس طرح زمین پر مارا کہ تارا کانپ گئی۔

"تمہیں اس کا نام جاننے کی کیا ضرورت ہے۔ تم سمجھ لو کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ تمہیں رنج ہوگا۔ نہیں نہیں میں نہیں بتا سکتی"

نریمان ہنسا۔ "دیکھو تارا تم میری محبت کو نہیں سمجھیں۔ تم نہیں جانتیں کہ میں تمہیں کس دل سے چاہتا ہوں"

پھر تھوڑی دیر ٹھہر کر اس نے پوچھا "وہ کون ہے جس نے تم کو میری آغوشِ محبت سے جدا کرنے کی جرأت کی ہے؟ تم کو بتانا پڑے گا"

تم اس طرح نسبت کو نہیں توڑ سکتیں۔ یہ مقدس عہد ہے۔ نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔؟"

"مجھے اس کا نام جاننا چاہیئے؟"

یکایک اس کے دل میں ایک خیال آیا۔ اور اس خیال نے اس کے اندرونی جذبات کی گہرائیوں میں ہلچل ڈال دی۔

"کیا وہ فرامز ہے؟"

یہ نام اس طرح اس کی زبان سے نکلا کہ تارا لرز گئی۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ اس کے منہ سے بے ساختہ "آہ" نکل گئی۔

اب نریمان سب کچھ سمجھ گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ زمین گھوم رہی ہے۔ کمرے کی ہر ایک چیز اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر خلا میں گردش کر رہی ہے اب اس پر تارا کی افسردگی غمگینی کا سب حال ظاہر ہو گیا۔ اسے آپیین کے واقعہ کے معنی معلوم ہو گئے۔

(۵)

وہ سیدھا کھڑا ہو گیا پھر یکایک اس نے میز کی دراز کھولی۔ اس میں سے پستول نکالا۔ تارا کی طرف بھیانک نگاہ سے دیکھا اور دفعتاً دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا وہ غیظ و غضب میں اندھا ہو رہا تھا۔

"نریمان۔ نریمان۔ تم کیا کرنے چلے ہو۔ اپنے آپ کو سنبھالو" تارا بے کار پکارتی رہ گئی۔ اور نریمان بارش اور اندھیرے میں غائب ہو گیا

تارا بھی اس اندھیری رات میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگی۔ بارش کی بوچھاڑ متواتر پڑ رہی تھی۔ ہوا اڑائے لئے جاتی تھی۔ بجلی کی چمک میں دور سے نریمان بھاگتا ہوا جاتا دکھائی دے رہا تھا اور تارا گرتی پڑتی اس کے پیچھے پیچھے چلی جاتی تھی۔ فاصلہ جیسے تھوڑی ہی دیر میں طے ہو گیا۔ اپنے مکان کے دروازے پر اس نے نریمان کو جا لیا۔ وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔

"نریمان رحم کرو" اس کا سانس اس کے پیٹ میں نہ سماتا تھا "تم کیا کرنے لگے ہو۔ کیا تم دیوانے ہو گئے ہو۔ جاؤ۔ تم اپنے گھر جاؤ"
نریمان نے زور سے اپنا دامن چھڑایا اور پھر جوش میں بھرا ہوا فرامرز کے مکان کی طرف بھاگا۔ تارا بھی پیچھے پیچھے بھاگتی ہوئی چلی گئی۔
بجلی چمکی۔ اس کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ نریمان فرامرز کے برآمدے کے چبوترے پر چڑھ گیا۔ وہ چلائی۔ "خدا کے لئے میری بات سن لو" یہ کہتے کہتے وہ بھی چبوترے پر چڑھ کر برآمدے میں داخل ہو گئی۔ نریمان نے جوش میں اپنے پاؤں کی ٹھوکر لگائی۔ دروازہ کھل گیا
لیکن کمرہ خالی تھا اور دوسرے کمرے میں سے روشنی شیشوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ تارا نریمان کے بازو میں لپٹ گئی۔ اس نے اپنے کمزور لرزاں ہاتھوں سے پستول چھیننے کی ناکام کوشش کی۔
"اس کو نہ مارو، قصور میرا ہے۔ میرا کام تمام کر دو"
نریمان نے پروا نہ کی اور زور سے دروازے پر دستک دی۔
اندر سے کسی نے انگریزی زبان میں کہا "کون ہے؟"
مگر یہ آواز فرامرز کی نہ تھی بلکہ کسی عورت کی معلوم ہوتی تھی۔
نریمان نے پھر پکارا "دروازہ کھول دو"
چٹخنی کے اٹھنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔
تارا اور نریمان یکایک دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ یہ ایک انگریز خاتون تھی جو حیرت سے ان دونوں کا منہ تک رہی تھی۔
"آپ کون ہیں؟ میرے شوہر مسٹر فرامرز آج شام سے کسی نامعلوم جگہ چلے گئے ہیں وہ بتا کر بھی نہیں گئے"
نریمان اور تارا دونوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا "آپ کے شوہر"
"ہاں انہوں نے ولایت میں مجھ سے شادی کی تھی۔ پھر وہ مجھے چھوڑ کر بغیر اطلاع دیے وہاں سے چلے آئے ہیں۔ میں آج شام ہی یہاں پہنچی ہوں"
عورت کی آنکھوں سے غمگینی اور حسرت ٹپک رہی تھی۔
تارا کے سینے سے ہلکی سی آہ نکلی اور وہ بے ہوش ہو کر گر گئی۔
نریمان نے پستول جیب میں ڈال لیا اور تارا کو سنبھالتے ہوئے اس نے انگریز خاتون سے کہا:
"معاف کیجئے گا، ہمیں آپ کی شادی کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔ میرا نام نریمان ہے — کیا آپ مجھے مدد دیں گی۔ میں آپ کو حیرت انگیز افسانہ سناؤں گا"

(۶)

دو دن کے بعد حالات بالکل متغیر نظر آئے۔ فرامرز فیشن اور جذبات کا بندہ فرامرز اپنی انگریز بیوی کے اثر سے مرعوب ہو کر کہیں چلا گیا تھا۔ تارا کی آنکھوں کے آگے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا تھا۔ فرامرز کی ظاہری درخشانی کا ملمع اتر جانے سے نریمان کی فطری نیکی اور خالص محبت زیادہ روشن نظر آنے لگی تھی۔
مقررہ تاریخ پر تارا اور نریمان کی شادی ہو گئی۔

(ہفت پیکر)

حفیظ

حیاتِ تازہ

ریاض نے اپنی زندگی میں مصائب اور ناکامیوں کے سوا کچھ نہ دیکھا تھا۔ شادی ہونے کے بعد اس کے ماں باپ ایک سال کے اندر اندر راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے اور ضروریاتِ حیات کا بار آغازِ شباب ہی میں اس کے سر پر رکھ دیا گیا۔ ناتجربہ کاری سے زر و مال تجارتی ڈاکوؤں کی نذر ہو گیا اور وہ خیال کرنے لگا کہ دنیا نے مجھے لوٹ لیا۔ رہی سہی پونجی اس کی بیوی تھی جس کو وہ اپنے بدنصیب ہاتھوں سے آج دو ماہ ہوئے سپردِ خاک کر چکا تھا۔

بازارِ حیات میں قسمت آزمائی کی حوصلہ شکن ناکامیوں کے بعد یہ ایسا صدمہ تھا جس نے اس کے حوصلے پست کر دیے اور وہ صحرائے ہستی میں اس خشک لکڑی کی طرح رہ گیا جسے آگ لگا کر قافلے والے روانہ ہو جاتے ہیں۔

اب اسے کوئی ہمدرد نظر نہ آتا تھا۔ دنیا دار اہلِ رشتہ اور منہ دیکھے کے یار آشنا تعزیت کے لیے آئے اور اس کی بدبختی کا رونا رو گئے۔ تسلی کے عوض اس کو ان کی ماتم داری میں ایک قسم کا اندازِ استہزا نظر آیا۔

دو ماہ سے وہ اپنے فرسودہ مکان میں تنہا تھا۔ کئی مرتبہ جب اس کی بیوی کچھ دنوں کے لئے میکے چلی جاتی وہ تنہا رہا کرتا تھا۔ اس وقت اس کی راتیں امید افزا انتظاریں کروٹیں بدلتے کٹتی تھیں۔ ایک پُر لطف بے چینی اس کے دل کو بہلائے رکھتی تھی۔ اس کی ولولہ انگیز بیٹھکوں میں گھر کی ہر ایک چیز ڈوب جاتی تھی۔ ان دنوں اس کی بیداریاں لطیف امیدوں سے لبریز اور اس کی نیندیں خوش گوار خوابوں سے معمور رہا کرتی تھیں

لیکن آہ! موجودہ تنہائی بالکل برباد اور ویران تھی۔ اس سے پیشتر اسے اس قسم کی خاموش اور سنسان راتیں بسر کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اب اس کی زندگی بالکل بے مقصد معلوم ہوتی تھی۔ وہ حیران نگاہوں سے در و دیوار کو تکتا اور گم ہو جاتا۔ وہ اپنے آپ کو اس عظیم شان تمدن میں بالکل بے مصرف اور ناکارہ چیز سمجھ رہا تھا۔ اس کی کیفیت زا سیٹیاں دم بخود تھیں اور اس کا انتظار ختم ہو چکا تھا۔

ابھی آدھی رات کا گجر نہیں بجا تھا اور وہ اپنے گھر کے صحن میں چارپائی پر لیٹا ہوا آسمان کو تک رہا تھا۔ ہوا کی تھکی ہوئی رفتار گرد و پیش کی اداسی میں اضافہ کر رہی تھی۔ چودھویں کا چاند اس کے زرد چہرے پر طعن آمیز ہنسی ہنس رہا تھا۔ ستاروں کا درماندہ قافلہ اندوہ فزا خاموشی کے چلا جا رہا تھا۔

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست

شاد باید زیستن، ناشاد باید زیستن!

اس کے لبوں سے ایک ہلکی آہ کے ساتھ یہ شعر نکلا اور وہ ایک افسردہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے تخیل نے دنیا والوں کے ظاہری اور خشک برتاؤ کی وجہ سے اسے اس جگہ کی ہر چیز سے بالکل متنفر کر دیا تھا۔ اس نے بے بس نگاہیں اپنے گھر کے در و دیوار پر ڈالیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو کا

ایک آخری قطرہ ڈھلک گیا۔

وہ بہت رو چکا تھا۔ اس نے دو ماہ گذرے اپنی بیوی کے بالینِ مرگ سے اٹھ کر تنہائی میں خدا کے حضور دعائیں مانگی تھیں۔ آنسو بہائے تھے گڑگڑایا تھا مگر بے سود۔ موت نے اس کی مسرت کا خزانہ چھین لیا اور اس کی آنکھوں کے سوتے خشک کر دئے۔

وہ اپنے سوچے ہوئے منصوبے کو تکمیل تک پہونچانے کے لئے آدھی رات کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا مختصر سامانِ سفر ایک کمبل اور ایک سیڑے تھیلے کی شکل میں چارپائی کے قریب دھرا تھا۔

• ترکِ تعلق، ترکِ تمدن، ترکِ دنیا۔

تصور نے پہاڑوں اور جنگلوں کی غیر آباد، جھونپڑیوں میں رہنے والے راہبوں کی ویران زندگی کے نقشے اس کی آنکھوں کے سامنے لا رکھے تھے اور انسانوں کی سرد مہری نے ایک تند اور جوشیلی نفرت کی فصیل اس کے گرد کھینچ دی تھی اور وہ ظاہرداروں کی بستی چھوڑنے کے لئے بالکل تیار تھا۔

(۲)

اس کا سفر عظیم الشان اور اس کی ہمت کے لحاظ سے پُرشکوہ تھا۔ اب وہ دنیائے خود غرض کے ہنگاموں سے بہت دُور کوہستانِ کشمیر سے بھی پرے سر بفلک پہاڑوں سے گھری ہوئی چھوٹی سی وادی میں مقیم تھا۔ اس وادی تک پہونچنے کے لئے وہ کسی شاہراہ یا کسی پگڈنڈی کا مرہونِ منت نہ تھا بلکہ وہ یہاں پہونچنے کو ایک معجزہ خیال کرتا تھا۔

اس نے کوہستان کا چپہ چپہ روند ڈالا مگر اس وادی سے زیادہ آرام دہ پُرفضا اور انسانی آلائشوں سے پاک اس نے کوئی جگہ نہ دیکھی اور اسے اپنے رہنے کے لئے منتخب کر لیا۔ اس نے بڑی محنت کے ساتھ ایک چٹان کی آڑ میں پتھروں اور درختوں کو ملا کر ایک خوش نما اور پُرامن جھونپڑی بنالی اس کو عطر بیز اور گل پوش بیلوں سے سجایا اور اس میں رہنے لگا۔

جب صبح کا دھندلکا منتشر ہو جاتا اور آفتاب برفانی چوٹیوں کو تاجِ زریں پہنا دیتا۔ وہ فریضۂ صبح ادا کرنے کے بعد ایک خود مختار بادشاہ کی طرح اپنی جھونپڑی سے نکل کھڑا ہوتا اور وادی کے درمیان نہایت متانت سے بہنے والے شفاف چشمے کے کنارے کنارے آہستہ آہستہ ٹہلتا۔

خوشبودار پھولوں سے پٹا ہوا دامنِ کوہ اس کی آنکھوں میں اطمینان کا نور بھر دیتا اور جواہرات کی طرح پھلوں سے لدے ہوئے درختوں میں چڑیوں کے لطیف نغمے اس کے تلخ خیالات دل سے محو کر ڈالتے۔ اس کا سارا سارا دن مچھلیاں پکڑنے، اپنے خود ساختہ غلیل سے پرندوں کا شکار کرنے اور بھوننے، درختوں سے پکے ہوئے پھل توڑنے اور ان کو بارش اور برف باری کے دنوں کے لئے سکھانے میں صرف ہو جاتا۔

اناج نہ یہاں مل سکتا تھا اور نہ فطرت کی طرف سے پھلوں، پرندوں اور خرگوشوں کی وسیع بخشش کے باعث اسے اس کی احتیاج تھی۔

ایندھن بے شمار ادھر ادھر پڑا تھا۔ وہ اسے جمع کرتا اور برفباری کے دنوں کے لئے اپنے جھونپڑے کے ساتھ کی پہاڑی کھوہ میں انبار لگا دیتا۔

کبھی کبھی جب وہ اپنی تنہائی سے اکتا جاتا اور ہم جنس کی یاد اس کے دل کو پریشان کرتی تو وہ اپنے خود غرض دوستوں کی یاد سے اپنے گرد اس وادی کے پہاڑوں سے بھی زیادہ بلند ایک دیوار قائم کر لیتا تھا۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر ایک حقارت آمیز تبسم آجاتا تھا۔

وہ گرمی کے دنوں میں کئی کئی مرتبہ سرد اور آئینہ کی طرح صاف ندی میں اتر جاتا۔ پہروں اس کی ہلکی اور رواں لہروں اور تہہ میں چمکنے والے کنکروں سے کھیلتا اور پھر داڑھی اور سر کے بڑے بڑے ہونے سیاہ بالوں کو نچوڑتا ہوا باہر نکل کر اپنا کھال کا لباس پہن لیتا۔ شکاری چھرا اپنی کمر میں لگاتا اور اپنی غلیل لے کر پہاڑوں اور چٹانوں پر پھلانگتا پھرتا۔

شام کے وقت جب مغرب کی جانب سے ایک نورانی شعاع تمام پہاڑوں اور ندی کے نالوں کو ارغوانی رنگ میں رنگ دیتی۔ اس وقت وہ فریضۂ مغرب کے لئے کھڑا ہو جاتا۔ اور اس سچے دل سے خداوندِ قدوس کی تعریف و تسبیح کرتا کہ اس کا دل خوشی سے معمور ہو جاتا تھا۔

پھر وہ دن بھر کی چھوٹی ہوئی حلال اور پاکیزہ چڑیوں، اور خوش ذائقہ پھلوں کو شکریے اور رغبت کے ساتھ کھانے بیٹھ جاتا اور جب سیاہی اس وادی کو اپنے دامن میں چھپا لیتی تو وہ آہستہ آہستہ اپنی خوشنما جھونپڑی میں داخل ہوتا جہاں شبنم اور ہوا کی خنکی اسے کوئی ضرر نہ پہونچاتی۔

اس طرح تین سال گذر گئے اور اس نے انسان تو کیا حشرات الارض اور درندوں کا نشان بھی اس جنت نشان وادی میں نہ دیکھا۔

اسے کسی حوا کی غیر موجودگی اتنا مضطرب نہ کرتی تھی کہ وہ اسے چھوڑنے کے لئے بے تاب ہو جاتا۔

(۳)

اسے یقین ہو گیا تھا کہ انسان اپنی حواو ہوس چھوڑ کر کبھی اس غیر آباد خطے کی طرف قدم نہیں اٹھا سکتے۔ علاوہ بریں سینکڑوں کوس کے کوہستانی سلسلے کی دشوار گزار صعوبتیں جن کا اس کو خود تجربہ تھا اسے مطمئن رکھتی تھیں۔ اگرچہ کبھی کبھی کسی ہم جنس کے دیکھنے کا شوق اور کبھی دانہ گندم کی کشش تھوڑی دیر کے لئے اسے وادی سے نکلنے پر اکساتی مگر وہ ان خواہشوں کو بہ زور دبا دیتا تھا اور اپنی شہنشاہی چھوڑ کر کہیں جانے کے خیال پر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگتا تھا۔

ایک روز شام کو وہ اپنے جھولے میں کچھ اور دن بھر کے بھونے ہوئے شکار لے کر اپنے وسیع جھونپڑے کی طرف لوٹ رہا تھا تو اس کے دل میں انسانی دنیا کے خیالات کے ہجوم نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس نے ان خیالات کو دبانے کے لئے دشوار گزار بلندیوں پر نظر ڈالی۔ وہ ٹھہر گیا اس نے دور افق پر دو شکلیں متحرک دیکھیں۔ حیرت اور شوق کے ملے جلے جذبات نے اس کے قدموں کو زمین میں گاڑ دیا اور وہ غور سے دیکھنے لگا۔ ارغوانی بادلوں میں مبہم سی دو صورتیں نظر آئیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ بڑھتی ہوئی تاریکی میں ڈوب گئیں۔ وہ اپنے دا ہمے پر ہنسا اور جھونپڑی کی طرف چل دیا۔ چڑیاں درختوں کو لوریاں دے رہی تھیں اور فضا میں ایک تحیر تھا اور تذبذب!

نماز کے بعد وہ اپنے خشک گھاس کے گدگدے اور آرام دہ بستر پر لیٹ گیا اور موجودہ آزاد اور پاکیزہ زندگی پر خدا کا شکر کرتا ہوا سو گیا کیوں کہ وہ بہت جلد سو جانے کا عادی تھا۔

وہ ایک پُر لطف خواب دیکھ رہا تھا کہ ایک غیر متوقع انسانی آواز نے اسے بیدار کر دیا اور وہ ایک پُر شوق گھبراہٹ میں گھرا ہوا اپنے جنگلی بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے جلد جلد لباس پہنا اور احتیاطاً چھرا کمر سے لگا کر جھونپڑی سے باہر نکلا۔

نکھری ہوئی چاندنی نے وادی کا حسن دوبالا کر رکھا تھا۔ ندی پگھلی ہوئی چاندی کی ایک سفید چادر معلوم ہوتی تھی۔ سبزے پر شبنم کے موتی اور درختوں کے پتے چاند کی کرنوں میں درخشاں نظر آتے تھے۔ اس نے تشویش اور اضطراب کی نظریں چاروں طرف دوڑائیں۔ جھونپڑی سے چند گز کے فاصلے پر ایک چوڑی چٹان کے اوپر ایک شخص لیٹا ہوا تھا۔ اور اس کے سر پر ایک جھکی ہوئی صورت صاف نظر آ رہی تھی اور ساتھ ہی کراہنے کی ہلکی مگر دردناک آواز اس کے کانوں میں آئی۔

ایکا ایکی ہم جنس کے شوقِ ملاقات اور فطری نیکی نے نفرت کے تمام خیالات اس کے دل سے دُور کر دیے اور ان کی جگہ ہمدردی نے لے لی!

وہ ضرور بھٹکے ہوئے مسافر ہیں اور ان اونچے پہاڑوں کو عبور کرتے وقت انہیں ضرور چوٹیں آئی ہوں گی۔

یہ سوچتا ہوا وہ جلد جلد شبنم آلود گھاس کو روندتا ہوا ان کی طرف بڑھا لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ جھکی ہوئی نوعمر نازنین لڑکی نے اس کے قدموں کی آواز سن کر سر اٹھایا اور خوف سے چیخ اٹھی۔

لیٹے ہوئے بوڑھے نے کراہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی اور وہ بھاری پستول کا نشانہ باندھ ہی رہا تھا کہ ریاض زور سے بول اٹھا:

"میں دشمن نہیں ہوں۔ مدت سے تنہا اس وادی میں رہتا ہوں۔ وہ دیکھو میری جھونپڑی قریب ہے"

وہ انگلی سے جھونپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کے قریب پہونچ گیا۔ ان الفاظ سے نازنین کو تسلی ہو گئی اور اس نے جھپٹ کر بوڑھے

میاں سے پستول لے لیا اور اس کے پٹیوں سے بندھے ہوئے سر کو اپنے درماندہ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تھامنے لگی۔ اس نے رحم طلب نگاہوں سے ریاض کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اور بوڑھے آدمی کو جو زخموں اور چوٹوں سے بالکل چور ہو گیا تھا اور جس کا لباس قریب قریب ہر جگہ سے پھٹ گیا تھا اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس نے دیکھا کہ بوڑھے کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ اس کا ہونٹ کسی نوکدار پتھر پر گرنے کے سبب آدھے سے زیادہ پھٹ گیا تھا اور اس پر خون جم رہا تھا۔ اور وہ اب تک تشویش ناک نگاہوں سے ریاض کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گو اس کا خوف فی الجملہ کم ہو چکا تھا اور جب ریاض نے شفقت سے اس کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا تو بوڑھے کو بالکل تسکین ہو گئی۔ اس کے خون آلود ہونٹوں پر ہنسی کھیلنے لگی۔ اور اس نے ضعیف آواز سے بولنے کی کوشش کی:۔

"میں چور چور ہو رہا ہوں ——— پانچ دن رات کا خطرناک سفر۔ جوئیں۔ نادان بچی —"

یہ کہہ کر وہ تھک گیا اور ریاض نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور شفقت بھری سوالیہ نگاہ نازنین پر ڈالی۔ جو اس عرصہ میں چٹان کے ایک کونے پر اپنے بیٹھے ہوئے پیروں کو چھپائے اور اپنے نازک جسم کی چوٹوں کے درد کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چاند کی روشنی میں اس کا سفید چہرہ نور کی قندیل تھا۔

"تم بھی بہت تھکی ہوئی اور زخمی معلوم ہوتی ہو۔ ذرا اور ہمت کرو تو بڑے میاں کو جھونپڑی میں لے چلیں۔ وہاں تمہیں آرام ملے گا"

نازنین نے جھینپتی ہوئی نظروں سے رضامندی کا اظہار کیا اور لڑکھڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں نے بوڑھے آدمی اور دو ہلکی ہلکی گٹھڑیوں کو جھونپڑی تک لے جانے کے لئے مستعد ہو گئے۔ ریاض نے بوڑھے کو سہارا دیا جو ہلکے ہلکے کراہتا ہوا اپنے پاؤں پر اس کے ساتھ چل نکلا۔ خوشبودار ہوا کے جھونکے وادی میں آزادی کے ساتھ سرسراتے تھے۔ اگرچہ لڑکی کے پاؤں بھی بہت زخمی تھے لیکن وہ اپنی ٹوٹی ہوئی چپل کو گھسیٹتی ہوئی دونوں گٹھڑیوں سمیت ریاض کے پیچھے پیچھے جھونپڑی میں داخل ہو گئی۔

ریاض نے گھاس کے بستر پر بوڑھے کو لٹا دیا اور خود جھونپڑی کے دوسرے حصے میں پتھر رگڑ کر آگ روشن کی اور دن کا بھنا ہوا گوشت اور پھل دونوں کے آگے رکھ دیئے۔ لیکن معلوم ہوا کہ ہونٹ کی سوجن کے سبب بوڑھا کچھ نہیں کھا سکتا تھا۔ ریاض نے جلد جلد اسی گوشت کی یخنی بنائی اور گرم گرم بوڑھے کو پلائی اور بوڑھے کے زخم دھونے کے لئے لڑکی کو گرم پانی دیا۔ خود جھونپڑی سے باہر ایک چٹان کے سائے میں خشک گھاس پر اپنا پھٹا ہوا کمبل بچھا کر انسان کے مصائب پر غور کرتا ہوا سو گیا۔

(۴)

آفتاب نے مشرق کی پہاڑیوں سے سر نکالا اور وادی پھر ایک دفعہ نور سے معمور ہو گئی۔ ریاض ذرا دیر سے اٹھا۔ نماز پڑھی اور اپنے زخمی مہمانوں کی خیریت و عافیت دریافت کرنے کے لئے جھونپڑی میں داخل ہوا۔

لڑکی نے بوڑھے آدمی کو گٹھڑیوں کے سہارے بٹھا دیا تھا اور خود اس کے زخموں کو دیکھ رہی تھی۔ بوڑھا اس وقت رات کی نسبت بہت زیادہ اچھی حالت میں ہو گیا تھا۔ اس نے ریاض کے سلام کا جواب نہایت شستہ زبانی اور تپاک سے دیا۔ نازنین نے شرمگیں اور شکر گزار نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور آنکھیں جھکا لیں۔

ریاض نے سوال کیا "بڑے میاں اگر تکلیف نہ ہو تو اپنے اس ناگوار سفر کا حال مجھے بتائیے۔ میرا خیال ہے کہ آپ راستہ بھول کر اس طرف آ نکلے ہیں"

بوڑھا افسردہ تبسم سے بولا "بیٹا تو نے میرے اور میری بچی کے ساتھ جو مہربانی کا سلوک کیا ہے اس سے مجھے معلوم ہو گیا کہ تو کسی شریف شخص کا فرزند ہے"

پھر اس نے اپنی سفید اور لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "میں اپنے محسن سے اپنا حال چھپانا نہیں چاہتا۔"

ریاض اس فقرے سے بہت متعجب ہوا اور اس کے ضعیف چہرے کی طرف تشویش ناک نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

بوڑھا بولا "بیٹا دراصل میں پنجاب کا رہنے والا ہوں اور ان بلند اور ویران پہاڑوں سے مجھے کچھ مناسبت نہیں۔ بدقسمتی اور صحبتِ بد کی وجہ سے اوائل عمری میں مجھے چوری کی عادت پڑ گئی اور بالآخر میں ڈاکو بن گیا۔"

پھر اس نے ریاض کو پریشان دیکھ کر کہا "تمہیں نہیں ڈرنا نہیں۔ میں جوانی کا ذکر کر رہا ہوں۔ میں نے کئی ڈاکے مارے۔ میری گرفتاری کے لئے انعام مقرر ہو گئے اور میں وہاں سے بھاگ کر ان پہاڑوں میں آ گیا اور ایک افتادہ گاؤں میں زمین خرید کر مکان بنا لیا۔ پھر میں نے ایک پہاڑی زمیندار کی لڑکی سے شادی کر لی اور ڈاکے اور رہزنی کے پیشے سے تائب ہو گیا۔ آج پندرہ سال ہوئے میرے گھر میں یہ لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام میں نے زینب رکھا مگر افسوس!

اب اس کی آواز بھرا گئی۔ ریاض نے دردمندی کی نگاہوں سے لڑکی کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں دو آنسو تھے۔"

بوڑھے نے دم لے کر پھر اپنی داستان کو جاری رکھا

"ہاں تو اس کی پیدائش کے وقت اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ میں نے خود اسے پالنا شروع کیا۔ یہ جوان ہو گئی میں نے اسے سارا حال بتا دیا تھا۔ اس نے میرے لئے دعائیں کرنے اور مجھے تسلی دینے کے لئے اپنا خواب و خور حرام کر دیا۔ آج سات دن ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ پنجاب کی پولیس نے میرا کھوج لگا لیا ہے اور میں عنقریب گرفتار ہو کر پھانسی پر چڑھا دیا جاؤں گا۔ میں گھبرا گیا۔ مجھے اپنی جان کی کوئی پرواہ نہ تھی مگر اس پیاری بیٹی کے خیال سے میری پریشانی بہت بڑھ گئی۔ میں نے قیمتی اور ضرورت کی اشیا ان چھوٹی چھوٹی گٹھڑیوں میں باندھ لیں اور ہم دونوں بھاگ نکلے۔ زینب نے مجھے جان بچانے اور بھاگ نکلنے کی ترغیب دی تھی اور میرے ساتھ ان دور دراز پہاڑوں میں ٹھوکریں کھاتی ہوئی۔ قدم قدم پر مجھے موت سے بچاتی ہوئی کل شام تمہاری وادی کے سربفلک برفانی پہاڑوں کی چوٹیوں سے گزار لائی۔ اس سفر میں ہم نے دن اور رات کچھ نہیں دیکھا۔ میں کئی جگہ گر گر کر بچا اور اس سعادت مند بیٹی نے مجھ راندۂ درگاہ کو ہر طرح آفات سے بچا کر یہاں تک پہنچایا۔ میں زخمی ہو گیا تھا۔ اگرچہ یہ بھی زخمی اور تھکی ہوئی تھی۔ لیکن اس باہمت نے میری ہر طرح خبرگیری کی۔ پھر تم آ گئے۔ بیٹا یہ ہے میری رام کہانی۔ کیا تم ڈر گئے ہو؟"

"ہاں بڑے میاں میں آپ کے مصائب سے گھبرا گیا ہوں مگر اب آپ کچھ فکر نہ کریں۔ مجھے اپنا خادم سمجھیں۔ اس وادی میں کوئی نہ آنے پائے گا میں کئی سال سے یہاں رہتا ہوں۔"

پھر وہ ان دونوں کو اٹھا کر ندی کے کنارے لے گیا اور خود ان کے ناشتے کا سامان کرنے کے لئے درختوں کے پھل توڑنے میں مصروف ہو گیا آفتاب بلند ہو چکا تھا اور وادی کی ہر ایک چیز رات کی کلفت دور کر کے تر و تازہ ہو گئی تھی۔ لڑکی نے اپنی گٹھڑی میں سے نیا لباس نکالا اور ایک چٹان کی آڑ میں بیٹھ کر نہانے لگی۔ پھر اس نے پھٹے ہوئے لباس کی جگہ سادہ پہاڑی لڑکیوں کا لباس پہن لیا اور اپنے باپ کے زخموں کو دھونے اور ان پر پٹیاں باندھنے میں مصروف ہوئی اور جب ریاض پھل لے کر واپس آیا تو اس کی نظر اس نازنین لڑکی پر پڑی۔ اس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ دل ہی دل میں شرم سے کانپ اٹھا۔

(۵)

ریاض نے سرگرمی سے اپنے تھکے ہوئے مہمانوں کی دلجوئی اور میزبانی کا حق ادا کیا۔

اس نے پہلی مرتبہ اپنی تباہی کی داستان اپنے مہمانوں کے سامنے بیان کی جسے سن کر بوڑھا بہت دیر تک اس کی بے بلوغ جوانی پر افسوس کرتا رہا۔

چند دن کی تیمارداری نے بوڑھے کی صحت کو بحال کر دیا۔ اس عرصے میں حسین زینب نے جس کے پاؤں کے زخم بھر چکے تھے کھانا پکانے اور جھونپڑی کو صاف ستھرا رکھنے کا کام اپنے ذمے لے لیا تھا۔

وادی میں شاید پہلی مرتبہ ایک پُراسراری رونق اور چہل پہل پیدا ہوگئی تھی۔

جب بوڑھا بالکل تندرست ہوگیا تو اس نے وہاں سے بھی آگے جانے کا ارادہ کیا۔ ایک دن باپ بیٹی نے اپنی گٹھڑیاں باندھیں اور ریاض سے رخصت ہونے کے لئے جھونپڑی سے باہر نکلے لیکن ان کے دل بھی اس وادی کے دامنِ پناہ سے محروم ہونے پر افسردہ تھے۔

ریاض اس وقت صبح صبح نماز سے فارغ ہوکر ندی کے کنارے خیالات میں محو تھا۔ اس کی طبیعت اتنی ہی مدت میں تبدیل ہونے لگی تھی اور قسمت نے اتفاقاً پھر ایک بار اس کے مایوس دل میں غیر معلوم اور مبہم امیدوں کی لرزشیں پیدا کردی تھیں۔

اس نے مدت کے بعد انسانوں کی صورتیں دیکھیں اور ان کی صدائیں سنی تھیں۔

بوڑھے کو جانے پر آمادہ دیکھ کر وہ پھر تنہا رہ جانے کے اندوہناک تصور سے مغموم ہوگیا اور اس کی حسرت ناک نگاہیں بوڑھے آدمی اور حسین لڑکی کے چہرے پر جم کر رہ گئیں اور صرف یہ الفاظ گھبرائی ہوئی آواز میں اس کی زبان سے نکلے۔

"اچھا آپ نے کہیں جانے کا ارادہ کرلیا ..... میں تو سمجھا تھا کہ میری تنہائی ختم ہوگئی۔"

بوڑھے نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور زینب کی نگاہیں دفور ہمدردی سے اشک آلود تھیں۔

کچھ دیر خموشی رہی۔ بوڑھا سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ اس نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا جو کسی غم ناک خیال میں محو ہوگئی تھی۔

اس نے وادی اور اس کے محافظ پہاڑوں پر متفکر نگاہیں ڈالیں۔ پھر وہ ریاض کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

بوڑھے کے دل کو خدا جانے کن جذبات نے متاثر کردیا۔ وہ اپنے ارادے سے لڑکھڑا گیا آخر اس نے ریاض سے پوچھا۔ "بیٹا کیا تمہیں میرے یہاں رہنے میں تکلیف تو نہ ہوگی۔ کیا تمہیں اپنی اختیار کی ہوئی تنہائی میں خلل تو نہ آئے گا۔"

ریاض کے چہرے پر مسرت کی تمتماہٹ دوڑ گئی۔

"نہیں بابا اب مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ میں آپ کو اپنا باپ سمجھوں گا۔" لوٹ لینے والوں کی ملاقات سے انکاری اب مطمئن تھا۔

بوڑھے نے گٹھڑی زمین پر رکھ دی اور کہا۔ "بے شک یہ وادی آسودگی اور حفاظت کا مقام ہے اور میں تم پر بھروسہ کرتا ہوں۔"

پھر زینب کی طرف مخاطب ہوکر بولا۔ "بیٹی آؤ ہم اس شریف آدمی کو اپنی قسمت کا شریک بنالیں کیونکہ میرے لئے اب انسانوں کی کسی بستی میں جاکر رہنا خطرناک ہے۔ جاؤ سامان کھول ڈالو اور اسی وادی کو اپنا گھر سمجھو۔" لوٹنے کی پاداش سے فراری بھی مطمئن تھا۔

دھوپ پھیلنے لگی۔ ندی کی گرم جوش لہریں کناروں سے گلے ملیں۔ سوسن اور بنفشے کی کلیاں مسکرائیں۔ وادی کی ہر چیز متبسم نظر آتی تھی۔ گویا کہ جوان اور بوڑھا نئی زندگی کا جھونپڑا بنانے کی تجویز کر رہے تھے۔

(۶)

پرانی جھونپڑی کے پہلو میں ایک اور وسیع کاشانہ بنایا گیا جس میں ایک عورت کے سلیقہ شعار ہاتھوں نے بہت سی آرائشی دلچسپیاں پیدا کردیں اب اس وادی کی فضا میں ایک کے بجائے تین انسانوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

ایک سال اور گزر گیا۔

ریاض اپنی گزری ہوئی مصیبتوں اور تلخ کامیوں کی یاد کو یکسر فراموش کر چکا تھا اور اپنی طبیعت میں ایک خوش گوار روح نواز تبدیلی محسوس کر رہا تھا وہ نفرت جو اسے انسانوں سے پیدا ہو چکی تھی۔ تقریباً دور ہوگئی۔ اب وہ شہر کے ہنگاموں کی کہانیاں شوق سے سنتا اور بوڑھے کے پاس بیٹھ کر متمدن دنیا اور اس میں بسنے والوں پر رائے زنی کرتا۔ اسے جوانی کی ولولہ انگیز داستانوں میں پھر لطف آنے لگا۔ اس کی مردہ امنگوں میں از سرِ نو زندگی حیات پیدا ہوئی اور اس کی نیندیں دلآویز اور لطیف خوابوں سے پھر آباد ہوگئیں۔

شفاف چشمے کی سرد اور نرم خیز لہریں اسے شباب کے مستانہ جوش نغمے سنانے لگیں۔ پھولوں کے رنگ پہلے سے زیادہ شوخ ہو گئے اور ان کی نکہت میں پہلے سے زیادہ لطافت اور مستی محسوس ہونے لگی۔

اس کو کئی قسم کی نئی نئی چڑیاں نظر آئیں جو اس وادی میں کسی اور جگہ سے ہجرت کر کے آ گئی تھیں اور اس کے غلیل کے شکاروں کی تعداد تین گنا ہو گئی تھی یہ سب اس اسرار انگیز محبتِ پنہاں کا نتیجہ تھا۔ اسے اس ڈاکو کی نوخیز لڑکی سے پیدا ہو گئی تھی۔

اگرچہ اس لڑکی کا آسمانی حسن فرشتوں سے خراج تحسین وصول کرتا تھا لیکن اس کے اطوار بالکل سادہ اور فطرت کے حقیقی رنگ میں ڈوبے ہوئے جب ریاض اور بوڑھا اپنے اپنے غلیل لے کر شکار کو نکل جاتے تو زینب کبھی اس جنتِ ارضی کی پھولوں سے لدی ہوئی جھاڑیوں میں گھومنے چلی جاتی اور کبھی صاف شفاف چشمے میں نہانے کے بعد اپنے کاشانوں کو سجانے اور ان کو زیادہ آرام دہ بنانے میں مشغول ہو جاتی۔ وہ بے محابا اس وادی میں جس سمت چاہتی چلی جاتی اور رنگ برنگ کے پھولوں سے ہار بدھیاں اور چمپا کلیاں بنا کر خود ہی پہنتی اور خود ہی شرما کر ان کو توڑ ڈالتی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ریاض اسے اس حال میں دیکھ لیتا اس وقت وہ شرما جاتی اور نظر بچا کر چھپ جانے کی کوشش کرنے لگتی۔ ریاض وہاں سے ٹل جاتا۔

اس نے کبھی تنہائی میں اس سے کوئی غیر معمولی گفتگو نہ کی۔

لیکن بوڑھا ان دونوں کی دلی کیفیتوں کا حال جانتا تھا۔ ایک دن تیسرے پہر پہاڑیوں سے اترتے وقت وہ ایک چٹان پر بیٹھ گیا اور ریاض کی طرف دیکھنے لگا۔

ان کی پشت پر ایک درخت کی جھکی ہوئی شاخوں پر دو بلبلیں نغمہ سرائی کر رہی تھیں۔ بوڑھے نے شفقت بھرے انداز سے کہا

"بیٹا ریاض میں تجھے اپنا بیٹا سمجھتا ہوں"

ریاض اس غیر معمولی شفقت سے شرما گیا۔ اس نے جواب دیا "میں آپ کا بیٹا ہوں"

اس کا دل دھڑک رہا تھا

بوڑھے نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا

"نہیں شرماؤ نہیں۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔ میرا ارادہ ہے کل شام سے پہلے پہلے زمین و آسمان اور خدا کو گواہ قرار دے کر زینب کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دیا جائے"

ریاض زبان سے کچھ نہ بول سکا۔ اس کا سر جھک گیا اور شکریے کے طور پر اس نے بوڑھے کا ہاتھ آہستہ سے دبایا۔

پھر وہ دونوں اپنا اپنا شکار اٹھا کر جھونپڑوں کی طرف چل دیے۔

وادی پر چاروں طرف مسرت کی شادابی برس رہی تھی۔ ہوا سے عطر سہاگ کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ لڑکی گمنام جھاڑیوں کی معطر ٹھنڈک میں پھولوں سے کھیل رہی تھی اور سرخ پھول اس کے نرم رخساروں پر قربان ہو رہے تھے اور جب وہ شرم سے سر جھکائے ان کا خیر مقدم کرنے کو کنج سے باہر نکل آئی تو اس چھوٹی سی جنت کی تنہائی معدوم ہو رہی تھی۔

(۷)

ریاض کی شادی کے ایک سال بعد بڑے میاں کا انتقال ہو گیا۔ جس سے دونوں میاں بیوی افسردہ رہنے لگے۔

لیکن جلد ہی خدا نے انہیں ایک خوب صورت بیٹا عطا فرمایا۔ جس کا نام اقبال رکھا گیا۔ اقبال کی ولادت نے بوڑھے کی جدائی کا قلق ایک حد تک دور کر دیا

ریاض کو موجودہ زندگی ایک مسلسل اور دلآویز خواب معلوم ہوتی تھی۔ دنیا ہی بنا لینا کیا ان کی بات تھی۔

لیکن سچ مچ وہ دنیا سے دور پہنچ گیا۔ بیوی کا شوہر اور ایک بچے کا باپ تھا۔ وادی اس کی سلطنت تھی جس کا وہ مختارِ کل تھا۔

اس کے پاس ہزاروں روپے، اشرفیاں اور نوٹ تھے۔ یہ تمام اسے زینب کے جہیز میں ملی تھیں لیکن وہ اسے بے مصرف خیال کرتا تھا۔ اس کی بیوی حسین، نیک اور محبت کرنے والی تھی۔ ان کی ازدواجی زندگی عام مناقشاتِ زندگی سے قطعاً پاک تھی۔ اس کے لیل و نہار وفورِ مسرت کے سبب گزرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے۔

آفتاب مشرق کے پہاڑوں سے اُبھرتا اور وادی میں مسرت اور شادمانی بکھیرتا ہوا چلا جاتا تھا۔

چاند نکلتا اور ان کی جھونپڑی کے اردگرد راحت ہی راحت پھیلا دیتا۔

وادی کی آبادی میں اور اضافہ ہو گیا یعنی اقبال کی ولادت کے تین سال بعد شوکت پیدا ہوا گویا اب وہ دو سے چار ہو گئے۔ بوڑھے کی موت کو آٹھ سال گذر گئے۔ اقبال آٹھ برس کا اور شوکت پانچ برس کا ہو گیا۔

اور ان دونوں کو وادی کی چٹانوں پر کودتے پھاندتے، درختوں پر چڑھتے اترتے چشمے میں نہاتے دیکھ کر زینب کے دل میں ان کی تعلیم اور آئندہ زندگی کے تفکرات نے اپنا نشیمن بنا لیا۔

اب وہ گاؤں اور ننھیال کی یاد میں اداس رہنے لگی اور اسے جب کبھی ریاض سے بات چیت کا موقعہ ملتا وہ دنیا اور اپنے اعزّا و اقارب کے طول طویل قصے لے بیٹھتی۔ جنہیں سن کر ریاض شستدر رہ جاتا۔ اور کچھ نہ سمجھتا۔ اگرچہ دشوار گزار سلسلۂ کوہسار حوصلوں کو پست کر دیتا تھا مگر آخرکار دونوں نے اولاد کی آئندہ زندگی کے خیال سے اس سدا بہار جنت کو چھوڑ کر متمدن دنیا میں چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک صبح جب وادی پر چھائے ہوئے آسمان کے ستاروں کی چمک مدہم ہو رہی تھی اور مشرق سے آنے والا قافلہ سفیدۂ سحر کا غبار اڑا رہا تھا ریاض اور اس کی بیوی چھوٹی چھوٹی گٹھڑیاں پشت پر سنبھالے دونوں بچوں کے ساتھ ایک پھولوں سے ڈھکی ہوئی قبر پر فاتحہ پڑھ رہے تھے وہ فاتحہ پڑھ کر تیزی سے چل نکلے اور بلند پہاڑیوں پر چڑھنے لگے۔ کچھ فاصلہ طے کر کے وہ چاروں سستانے کے لئے ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔ ریاض خاموش تھا۔ اس نے آخری نگاہ وادی پر ڈالی۔ اس کی جھونپڑی کے کھلے ہوئے دروازے کے قریب چشمے کا سفید پانی ایک بہتا ہوا آنسو معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے قریب کی جھاڑیوں میں بلبل وداعی ترانہ گا رہی تھی۔

ریاض نے پرنم آنکھوں سے زینب کی طرف دیکھا تو اس کے بھی آنسو رواں تھے۔

(ہفت پیکر)

حفیظ

افسانہ در افسانہ

میری بیوی نے دوا پلائی اور اس خیال سے کہ مکھیاں اور روشنی مجھے تکلیف دے رہی ہوں گی، دروازہ بند کر کے ساتھ کے کمرے میں جا بیٹھی۔ ننھی ننھی بچیاں شاید میرے مزاج کی غیر معمولی اور نئی چڑچڑاہٹ سے روٹھ کر کھیلنے، لڑنے، جھگڑنے اور رونے کے لئے نیچے صحن میں چلی گئی تھیں۔

شدت کا بخار تھا۔ بدن پھنک رہا تھا۔ میں اس تنہا کوٹھڑی میں کمبل اوڑھے خاموش لیٹا ہوا اپنے سانس کی آوازوں میں کھو گیا تھا۔ یہ اٹھتی اور بیٹھتی ہوئی آوازیں فرش سے چھت تک مسلسل گونج پیدا کر رہی تھیں۔

شاید میں اپنے سانسوں کے گننے میں محو تھا کہ یہ سلسلہ بوڑھی دایہ کی کرخت آواز سے ٹوٹ گیا۔ وہ ساتھ کے کمرے میں میری بیوی سے میری صحت کے متعلق پوچھ رہی تھی۔

یہ باتونی بڑھیا میری تیسری بچی کی پیدائش کے وقت سے ہمارے گھر میں آنے جانے لگی تھی۔ مجھے اس سے نفرت تھی۔ اس نے اب کے بھی لڑکی پیدا ہونے پر اظہارِ افسوس سے میری بیوی کو اور زیادہ غم ناک بنا دیا تھا۔ محض بہت زیادہ انعام نہ ملنے کے اندیشے سے اس نے مجھے زچہ خانے کے اندر داخل ہوتے دیکھ کر منہ بسورتے ہوئے کہا تھا:

"کم بخت لڑکیاں! ہائے ہائے۔ اللہ کی مرضی، بیٹا رنج نہ کرنا۔ اللہ میاں لڑکا بھی دے گا۔"

بے وقوف بڑھیا! کیا وہ مجھے بھی ان شوہروں جیسا سمجھتی تھی جو اپنی بیوی سے محض اس لئے نفرت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیٹی کے بجائے بیٹا کیوں نہیں جنا۔

میں نے اسی وقت اسے جھڑک دیا تھا۔ میں نے تاکید کر دی تھی کہ وہ آئندہ میری بیوی کے روبرو اس قسم کی باتیں نہ کیا کرے۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ ہمارے گھر میں بیٹے بیٹیاں برابر ہیں بلکہ بیٹیاں برکت اور خدا کی رحمت سمجھی جاتی ہیں۔ میرے اس کہنے پر میری بیوی کی آنکھوں سے اطمینان کے دو آنسو پھوٹ نکلے تھے۔

یہی لالچی اس وقت دوسرے کمرے میں میری بیماری کا حال پوچھ رہی تھی۔ میں اس کی کرخت آواز سے چڑ ہی رہا تھا کہ میری بیوی نے اسے آہستہ بولنے کے لئے کہہ دیا اور یہ سن کر کہ میں ساتھ کے کمرے میں لیٹا ہوا ہوں، بڑھیا نے حتی المقدور اپنے لہجے کو پست اور ملائم کر لیا۔ اور میرے بخار کی شدت کا حال سن کر "موئی تپ" کو کوستی ہوئی بیٹھ گئی۔ پھر اس نے کئی ٹونے ٹوٹکے بتائے۔ ایک پیر جی کا ذکر کیا جس کے تعویذ سے بخار تیسرے دن اتر جاتا تھا۔

اور اس دل سوزی کے اظہار میں اس کی آواز بتدریج بلند ہوتی گئی۔

میری بیوی نے اسے پھر آہستہ بولنے کی تاکید کی اور اپنی کوشش کو بے نتیجہ سمجھ کر اس نے دروازے کو ذرا سا کھولا اور درزمیں سے جھانکا یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ بڑھیا کے شور سے میں کہیں بے آرام تو نہیں ہوگیا۔

میں نے غالباً اس خیال سے آنکھیں بند کر لی تھیں کہ مجھے سوتا سمجھ کر شاید بڑھیا اپنی باتوں کو کسی اور وقت کے لئے ملتوی کر دے۔

میری بیوی نے مجھے نیند کی حالت میں دیکھ کر قدرے اطمینان کا سانس لیا۔ دروازہ آہستگی کے ساتھ بند کر کے سرگوشی جیسی آواز میں بڑھیا سے کہا "سو گئے ہیں، اونچا بولنے سے بے آرام نہ ہو جائیں"؟

"سونا اچھا ہے، پسینہ آجائے گا۔ پسینہ آیا بخار ٹوٹا۔ میری نواسی کا بخار پسینہ آتے ہی اتر گیا تھا"

مجھے ہنسی آگئی کیونکہ خاموش رکھنے اور خاموش رہنے کی انتہائی کوشش کے باوجود میری بیوی نسائیت کے فطری تجسس سے باز نہ رہ سکی تھی — وہ بڑھیا سے اس کے لڑکے لڑکیوں کے متعلق سوال کرنے لگی۔ اتنا سہارا بہت تھا۔ بڑھیا کو اپنی اولادوں کے طولانی تذکرے چھیڑنے کا موقعہ مل گیا۔

میری نفرت رحم سے بدل رہی تھی۔ بدنصیبی نے موت کو بڑھیا کے کنبے پر مسلّط کر دیا تھا۔ ایک اندھی نواسی کے سوا اب دنیا میں اس کا کوئی نہ تھا۔ دو بیٹے، اور پانچ بیٹیاں بے پناہ طاعون کی نذر ہو چکے تھے۔

آہ موت!

میرا تصوّر بڑھیا کی بدنصیبی سے گزر کر اپنے بھائیوں، بہنوئیوں کی جوانا مرگی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ وہ بھی وبائے طاعون کا شکار ہو گئے تھے اور انہوں نے مجھے اس وسیع دنیا میں تنہا چھوڑ دیا تھا۔

موت کی کہانی اور مرنے والے عزیزوں کی یاد کتابِ حیات کا خیال انگیز باب ہے۔ دوسرے کمرے میں بڑھیا اپنی بدنصیبی کی داستان دہرا رہی تھی۔ میری بیوی مجھے دوا دینا بھول گئی تھی۔ میں بھی اپنے بخار کی نازک مزاجی کو فراموش کر کے بڑھیا کے بیٹے بیٹیوں کی رودادِ مرگ کے سلسلے کو اپنے خاندان کی برباد کہانی میں باندھ رہا تھا۔

میں ان سیمیائی نظاروں ہی میں محو تھا کہ بڑھیا کا افسانہ حیات کہیں سے کہیں پہونچ گیا۔ وہ اپنے دامادوں اور بیٹوں بیٹیوں کی موت سے ان کی شادی بیاہوں پر پہونچ گئی اور اس کے بعد اپنے خاوند کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے بیاہ اور سونے چاندی کے زیوروں، گوٹے والے جوڑوں کے فراہم کرنے میں اپنی ماں کی سرگرمیوں کا ذکر کرنے لگی۔ پھر اپنی کم سنی کا قصہ لے بیٹھی۔

مجھے پھر بخار کی شدت محسوس ہونے لگی کیوں کہ موت کی داستان ختم ہو چکی تھی۔ اور میرے عزیزوں کی روحیں جو شاید بڑھیا کی باتوں سے کھنچ کر میرے کمرے میں جمع ہو گئی تھیں پھر اپنی دنیائے فراموش میں روپوش ہو گئی تھیں

میں نے کروٹ بدلی اور ارادہ کرنے لگا کہ بخار کی بے چینی کا بہانہ کر کے شادی بیاہ کے اس بے ہنگم ہنگامے کو خاموش کر دوں جو دوسرے کمرے میں برپا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اپنی بیوی کو بلا کر تنبیہ کر دوں کیوں کہ وہ بڑھیا کی داستانوں میں ڈوب کر مجھے دوا پلانا بھول گئی تھی لیکن میرے ارادہ کرتے کرتے بڑھیا کے قہقہے نے پلٹا کھایا۔ شاید سب عورتوں میں تجسس کا مرض ہوتا ہے۔ میں نے سنا میری بیوی بڑھیا سے پوچھ رہی تھی۔ "اچھا اماں تمہارا بیاہ بھی اتنی چھوٹی سی عمر میں ہو گیا تھا؟"

نہ جانے کیوں مجھے بڑھیا کا جواب سننے کا شوق پیدا ہوا؟

بڑھیا کہہ رہی تھی۔

یہ میرے دادا کی ضد تھی۔ وہ رات دن میرے باپ کو مجھے بیاہ دینے کی تاکید کرتا رہتا تھا۔ میں ان دنوں شاید پورے دس برس کی بھی نہ تھی۔ وہ جب بھی رات کا کھانا کھا کر حقّہ لے کر بیٹھتا۔ میرے ماں باپ کو اپنے پاس بلا لیتا۔ پھر تینوں باتیں کرتے اور ان باتوں کا خاتمہ ہمیشہ میری "دن بدن۔ بڑھتے جاتے اور میرے شادی بیاہ کی سوچ پر ہوتا۔

ہمارا گاؤں یہاں سے بہت دُور چالیس کوس کے فاصلہ پر ہے۔ میری دادی مر چکی تھی۔ میرا دادا گاؤں کا چرواہا تھا۔ وہ بچپن سے مجھے بہت پیار کرتا تھا اٹھائے اٹھائے پھرتا لیکن جیسے جیسے میں بڑی ہوتی گئی اس کی نرمی سختی سے بدل گئی۔ وہ میری شادی کے بعد کتنی ہی مدت زندہ رہا۔ میری ماں کہتی تھی۔ مرنے سے پہلے اس کے اُکھڑے ہوئے دانت پھر اُگنے لگے تھے کیونکہ اس کی عمر سو سال سے زیادہ ہو گئی تھی۔

اب بھی اس کی سفید برّاق سی داڑھی اور لٹکی ہوئی سفید بھویں اور دھوپ میں تمتمایا ہوا چہرہ اور لال لال آنکھیں یاد آتی ہیں تو ڈر جاتی ہوں گاؤں کی سب لڑکیاں اس سے ڈرتی تھیں۔ جب شام کے وقت وہ بکریوں کا ریوڑ لئے ہوئے جنگل سے گاؤں میں داخل ہوتا تو سب چھوٹی بڑی لڑکیاں اپنی گلیاں چھوڑ کر گھروں میں بھاگ جاتیں۔ وہ ہمیشہ ان کو گاؤں سے باہر کھیلنے کو منع کیا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے میں اپنی پڑوسن سہیلیوں کے ساتھ شام کے وقت گھر سے کچھ فاصلے پر میدان میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ میں چور تھی اور میری ململی اوڑھنی میری آنکھوں پر بندھی تھی۔ لڑکیاں کھکھلاتی تھیں۔ مجھے چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگ جاتی تھیں اور میں ان میں سے کسی ایک کو پکڑ لینے کے لئے ہاتھ پھیلا پھیلا کر گھومتی جاتی تھی۔

ایکا ایکی میں گر پڑی۔ لڑکیاں ادھر ادھر بھاگ کر اپنے اپنے گھروں میں چلی گئیں۔ میں نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے اوڑھنی کو اپنی آنکھوں پر سے کھینچ لیا۔ دیکھا تو بکریاں میرے اوپر سے گزر رہی تھیں میرا دادا میرے سر پر موجود تھا۔ میں اٹھ کر بھاگی اور گھر میں آکر چپ چاپ اپنے لحاف میں چھپ گئی۔

میری ماں چولہے کے پاس بیٹھی مکئی کی روٹیاں پکا رہی تھی۔ میں نے لحاف کے ایک کونے کو سرکا کر دیکھا تو وہ گھونگٹ نکال رہی تھی۔ وہ میرے دادا کے سامنے ہمیشہ گھونگٹ نکال کر بیٹھا کرتی تھی۔

اب میں جان بوجھ کر ایسی بن گئی جیسے سو رہی ہوں۔

تھوڑی دیر بعد میرا باپ بھی کھیت میں کام کر کے آگیا۔ ماں نے روٹیوں کی چنگیر اور ساگ کی رکابی دونوں کے سامنے رکھ دی جب دونوں کھا چکے تو ماں نے میرا نام لے کر آواز دی۔ میں بولنا نہیں چاہتی تھی۔ ماں نے آپ ہی کہا۔ "سو گئی ہے۔ صبح کھائے گی" پھر آپ بھی روٹی کھانے میں مصروف ہو گئی۔

اُنگنائی کے چھپر میں دادا کے حقّے کی آواز گونج رہی تھی۔ میں سُن رہی تھی۔ اس نے کھانستے ہوئے میرے باپ کو مخاطب کر کے کہا:

"چھوکری کا بیاہ کر دے"

میرا باپ شاید ہر روز کی رٹ سے تنگ آچکا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ "بھاگی تو نہیں جاتی"

دادا نے خاموش رہ کر پھر کہا۔ "زمانہ اچھا نہیں۔ جوان لڑکی کو بٹھا رکھنے سے آبرو اُتر جائے گی"

میری ماں دادا کے سامنے کم بولتی تھی مگر یہ سن کر وہ بھی نہ رہ سکی۔ روٹی کھاتے کھاتے دور ہی سے بول اٹھی۔ "آبرو اُترے دشمنوں کی۔ چھوکری جوان کاہے سے ہو گئی۔ پورے نو سال کی بھی نہیں"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ صرف حقّہ زور زور سے بول رہا تھا۔ دادا کو کھانسی اٹھی۔ پھر بولا۔ "دن اچھے نہیں۔ تُو نے ان دونوں بھائیوں کا ذکر سنا ہے جن کو پھانسی کا حکم ہوا تھا۔ پھر بڑی عدالت نے رحم کر کے کالے پانی بھیج دیا تھا"

میرے باپ نے کہا۔ "میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کی بات ہے۔ سنا ہے انہوں نے ذیلدار کے لڑکے کو مار ڈالا تھا"

دادا نے بڑے جوش سے کہا۔ "ہاں مار ڈالا تھا۔ مار ہی ڈالنا چاہئے تھا"

میں لحاف کے اندر سہم گئی۔

میرا دادا کہہ رہا تھا:

"ڈگو چودھری اس گاؤں کا نمبردار تھا۔ وہ دو لڑکے اور ایک چھوٹی سی لڑکی چھوڑ کر مر گیا۔ ان کی ماں خاوند کے غم میں یا کسی بیماری سے اندھی ہو گئی تھی۔ بیچاری بڑی اچھی تھی۔ بڑی نیک تھی۔ پچھم کی پٹی میں ساری زمینیں ان لڑکوں کی تھیں۔ ڈگو کے مرجانے پر ذیلدار نے لڑکوں کو اکسا اکسا کر اور روپیہ دے کر ان سے باپ کے مرنے کی بڑی بھاری ضیافت کرائی اردگرد کے سب گاؤں کھانے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ پھر مقدمے میں پھنسا کر ساری زمین ہڑپ کر لی۔

اسی طرح لوگ بڑے زمیندار بن جاتے ہیں۔

لڑکے باپ کی طرح بڑی آن والے تھے۔ محنت مزدوری کرتے اور اپنی اندھی ماں اور بہن کا پیٹ پالتے مگر ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ پر ہائے! یہ لڑکیاں دشمن کے گھر بھی پیدا نہ ہوں۔ رہیں تو کنگال کی رہ جائیں۔ نہ رہیں تو بادشاہ کی نہ رہیں۔!"

میرا باپ بولا: قتل میں اس لڑکی کا بھی دخل تھا؟

دادا نے کہا: "قتل ایسی ہی باتوں پر ہوا کرتے ہیں ـــــــــــ زن، زر، زمین"

چودھری ڈگو مرا ہے تو میں نے اس کو دیکھا تھا۔ ذرا سی تھی۔ مگر لڑکیوں کو جوان ہوتے دیر نہیں لگتی۔ لڑکپن ہی میں بیاہ کر دیتے تو اچھا ہوتا مگر باپ مر چکا تھا۔ ماں بیمار تھی۔ بھائی کم سمجھ تھے۔ غریب اپنی مصیبت اور محنت میں پھنسے ہوئے تھے۔ کسی کا خوف نہ رہا۔

اور ذیلدار کا لڑکا ـــ! اچھا ہوا قتل ہو گیا۔ لچھن ہی ایسے تھے۔ بڑا بنا ٹھنا رہتا تھا۔ گلیوں میں گھوما کرتا۔ سر پر طرّے والی پگڑی باندھتا۔ بہو بیٹیوں کو بری نگاہ سے تکتا تھا پاجی ـــ"

میرا دادا غصّہ میں گالیاں بہت دیا کرتا تھا۔ اب اس نے ذیلدار اور اس کے خاندان کو گالیاں دینی شروع کیں۔ تھک گیا تو حقہ پینے اور کھانسنے لگا

میرے باپ نے کہا: "اچھا تو یہ بات تھی۔"؟

"ہاں یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب تیری ماں مر گئی تھی۔ تو ابھی ڈیڑھ سال کا تھا۔ تیری نانی تجھے اپنے گاؤں میں لے گئی تھی۔ میں ندی کے قریب کھجوروں والے بیہڑ کے سرے پر سارا دن بیہڑ میں بکریاں چراتا۔ شام کو بکریاں گاؤں میں چھوڑ کر اسی کوٹھے میں آ جاتا۔ ان دنوں مجھے ایک فقیر نے وِرد کرنا بتایا تھا۔ میں آدھی رات تک وِرد کیا کرتا تھا۔ یہی اللہ رسول کا نام!"

گرمیوں میں ایک رات چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ کوٹھے سے باہر میری کھاٹ بچھی تھی۔ چاند سر پر آ گیا۔ میں وِرد ختم کر کے سونے کے لئے لیٹا۔ ہوا بند تھی نیند نہیں آئی۔ گرمی تھی۔ مچھر کاٹنے لگے۔ میں نے سوچا نہا لینا چاہئے نیند آ جائے گی۔ میں اٹھا۔ سانپوں کے ڈر سے لٹھ ہاتھ میں لے کر ندی ـــــ کی طرف چلا۔ داہنے ہاتھ کھجوروں کے جھنڈ جھکے ہوئے اللہ میاں کی بندگی کر رہے تھے۔

"دس بارہ قدم ہی چلا تھا کہ آہٹ سی معلوم ہوئی جیسے کوئی باتیں کر رہا ہو۔ میں ٹھہر گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا"

"جڑواں کھجوروں کی جڑ میں دو سائے لپٹے ہوئے تھے۔"

میرے دل نے کہا "چور"

"نہانا بھول کر میں نے ڈنڈے کو مضبوط تھام لیا۔ جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا دبے پاؤں چلا۔ اب وہ صاف نظر آتے تھے۔ میں کھجوروں کے ایک چھوٹے سے جھنڈ کے پیچھے ان سے دس قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ ان کی پیٹھ میری طرف تھی۔ میں سمجھا یہ گاؤں میں کسی کا گھر لوٹنے کی تجویزیں سوچ رہے ہیں"

"مگر دونوں بڑی فکر میں ہوں۔ کبھی کبھی ٹھنڈی سانسیں لیتے۔ کبھی سسکیاں بھرتے۔ پھر باتیں کرنے لگتے۔ باتیں اچھی طرح سنائی نہ دیتی تھیں، رفتہ رفتہ وہ بہت جوش میں آ گئے۔ اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگے۔ ان باتوں سے میں سوچ میں پڑ گیا:

"وہ بار بار اپنی چھوٹی بہن کا ذکر کرتے۔ پھر ذیلدار کے لڑکے کو گالیاں دینے لگتے"۔

ذیلدار کا لڑکا دہی حرامی پلا" میں اسے جانتا تھا:

"جوان کنواری لڑکی، میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ آوازیں جانی پہچانی تھیں، دونوں بھائی تھے، مرے ہوئے نمبردار ڈوگر کے بیٹے ۔ میں جیسے پالے کے مارے سُن ہو گیا"۔

سمندرے نے کہا "آبرو اتر گئی تو ناک کٹ جائے گی"۔

بلندرے نے کہا "میں تو پہلے ہی مر جاؤں گا"۔

دونوں پھر گہری سوچ میں پڑ گئے۔ میں کھڑا رہا۔ ذیلدار کے لڑکے پر میرا غصہ بڑھنے لگا۔ وہ تھوڑی دیر تک اسی طرح آہیں بھرتے رہے۔ پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اپنی پگڑیاں اتار لیں اور کھجور کے جھکے ہوئے تنے پر کمندوں کی طرح ڈال دیں۔ یہ کیا کریں گے" میں پتوں میں سے جھانکنے لگا۔ پھیکی پھیکی چاندنی میں ان کے پیلے اور اترے ہوئے چہرے مصنوعی سے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی پھانسیاں بنا رہے تھے۔

میرے گھٹنے کانپنے لگے۔ وہ گلے مل رہے تھے اور اداس خاموشی میں آہوں اور دبی ہوئی سسکیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر وہ درخت پر چڑھنے لگے۔ میں جیسے خواب دیکھ رہا تھا۔ "یہ کیا کریں گے۔ پھانسیاں اپنی گردنوں میں ڈال لیں گے پھر لٹک جائیں گے"۔ میں نے سن رکھا تھا ایسے بہتیرے قصے سنے تھے۔

کسی فرشتے نے یک لخت مجھے ان کے سامنے جا کھڑا کیا۔ وہ بہت ڈر گئے۔ ان کے منہ سے ہلکی ہلکی چیخیں نکل گئیں۔ پھر انہوں نے مجھے پہچان لیا۔ درخت سے نیچے اتر آئے۔ میں نے کچھ بھی نہ کہا ہی تسلی کی بات۔

وہ میرے ساتھ جھلار والے کوٹھے پر آئے۔ چپ چپ تھے۔ چارپائی پر بیٹھ گئے۔ میں نے حقہ بھرا۔ پیتے رہے آخر میں نے ان کی کہانی سن لی۔

ٹھنڈا پانی پلاتے ہوئے میں نے کہا، "اپنی جان کیوں دیتے ہو، مردانگی کرو"۔

وہ دونوں چپ رہے پھر بلندا بولا "گاؤں میں ہمارے کنبے کی بدنامی ہو جائے گی"۔

میں نے کہا "لڑکی کو کہیں باہر چھوڑ آؤ۔ دُور سو پچاس کوس پرے۔ اپنی نانی کے گھر"۔

سمندرے نے جواب دیا: "ماں کو کچھ خبر نہیں۔ اس سے کیا کہیں"۔

میں نے کہا، "اس کو ساری کہانی بتا دو۔ غیرت والی ہے۔ خاوند کی عزت پر مر مٹے گی"۔

میں نے دیکھا دونوں کے چہرے چمک اٹھے۔ بلندرے کی آنکھوں کی چمک مجھے اب تک یاد ہے۔ حقہ بجھ گیا۔ خبر نہیں انہوں نے کیا سوچا۔ کھڑے ہو گئے۔ مجھ سے قسمیں لینے لگے۔ پھر چلے گئے۔

دوسرے دن دوپہر سے پہلے میں بکریاں لے کر اس کچی سڑک کے کنارے گیا جو ندی سے گزر کر بیہڑیں سے ہوتی ہوئی کالے جنگل میں سے ڈھائے والے گھاٹ جاتی ہے۔

بکریاں ادھر اُدھر پھیل گئیں۔ کچھ اگلے گھٹنے ٹیک کر جھڑبیریوں کے پتے کھانے لگیں۔ سورج سر پر چلا آ رہا تھا۔ میں ایک وَن کے نیچے بیٹھا تھا کہ وہ آ گئے

چادر میں لپٹی ہوئی وہ لڑکی ایک چھوٹے سے گھوڑے پر سوار تھی۔ دونوں بھائی ساتھ ساتھ پیدل جا رہے تھے۔ ہاتھوں میں ڈانگیں تھیں جن پر لوہا چڑھا ہوا تھا۔

میں نے جان بوجھ کر صاحب سلامت کی۔

بلندے نے کہا، بہن کو ننھیال چھوڑنے جا رہے ہیں۔ دریا پار"

میں نے کہا "کب لوٹو گے؟"

سمندے نے کہا "دیکھئے!"

وہ گزر گئے میں دیکھتا رہ گیا۔ لڑکی، مجھے یاد ہے، مڑ مڑ کر تکتی جاتی تھی۔ چپ تھی۔ آدھا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ آدھا میں نے دیکھا تھا بالکل زرد پھر اُسے کسی نے نہ دیکھا۔

میں نے سارا دن یہیں گزار دیا۔ بار بار طرح طرح کے خیال آتے "لڑکوں کو بتا پڑ گئی ہے۔ ہا! گاؤں میں پہلے تو ایسی باتیں نہیں ہوئیں۔ یہ ذیلدار کے گھر میں کیا پیدا ہو گیا۔

شام ہونے لگی۔ میں بکریوں کو گاؤں کی طرف لے جا رہا تھا۔ بیریوں کے پاس ذیلدار کا لڑکا اور گاموں نائی گھوڑوں پر سوار ملے۔ گاموں کے پاس کلہاڑی تھی۔ ذیلدار والے کے پاس ڈانگ تھی۔ دونوں اُڑے ہوئے جا رہے تھے۔ میری طرف دیکھا بھی نہیں۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔ گاموں بڑا نامی بدمعاش تھا۔ چوری میں پکڑا گیا تھا قید بھگت چکا تھا۔ ذیلدار نے ہی اسے قید کرایا تھا۔ اسی نے ذیلدار کے لڑکے کو بدراہ کیا تھا۔ کس نے اڑانے کے لئے۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ بکریوں کو گاؤں میں لایا۔ پھر دُولو کی حویلی پر گیا۔ بلندے کا نام لے کر آواز دی۔ بڑھیا کی آواز آئی "گھر نہیں ہے" میں جانتا تھا نہیں ہے۔ پھر آواز آئی "دونوں بھائی بہن کو ننھیال چھوڑنے گئے ہیں" میں سمجھ گیا۔۔۔ بڑھیا نے صبر کر لیا ہے

سورج چھپ چکا تھا۔ بادلوں کی سرخ دھاریاں کالی پڑ چکی تھیں۔ گھروں میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں گاؤں سے نکل آیا۔ خیالوں میں الجھا ہوا سر جھکائے جہلادار والے کو ٹھے پر گیا۔ آگ جلائی، روٹی پکائی۔ حلق سے نہ اترتی تھی۔ حقہ پینے لگا پھر وضو کر کے درد کرنے بیٹھ گیا۔ یہ پہلی بار تھی کہ میں بھول بھول جاتا تھا۔ میرا خیال کالے جنگل میں ان بہن بھائیوں کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا

ذیلدار والا اُن کے پیچھے گیا ہے!

مجھے بڑی فکر لگی ہوئی تھی۔ بیٹھا نہ گیا۔ اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنا لٹھ سنبھال کر چل پڑا۔ نہر میں سے ہوتا ہوا اسی کچی سڑک پر چلنے لگا جو کالے جنگل کو جاتی ہے ان دنوں میں بڑی ہمت والا تھا۔

چاند نکلا ہوا تھا۔ بادل کے ٹکڑے بھی کہیں کہیں بھٹک رہے تھے۔ ادھر ادھر کھیتوں کے درخت جھڑ بیریاں اور کریر کے جھنڈ تھے۔ کہیں کہیں گیدڑوں کی دہکتی ہوئی آنکھیں نظر آتی تھیں جو میرے ڈنڈے کے زمین پر بار بار کھڑکنے سے بھاگ جاتیں۔ میں سے نکل کر بھاگ جانے اور دور جا کر دوسرے گیدڑوں کے ساتھ مل کر چلانے لگتے تھے کبھی کبھی چاند بادلوں میں چھپ جاتا اور بہتر پر اداس اور بھیانک تاریکی چھا جاتی۔ میں دیر تک چلتا رہا۔ کھیت ختم ہو گئے۔ اب راستہ جنگل میں سے ہو کر گیا تھا۔

میں ٹھہر گیا۔ سوچنے لگا۔ وہ دوپہر سے پہلے چلے تھے، شام سے پہلے جنگل سے گزر کر دریا پار ہو گئے ہوں گے۔

میں نے چاند کی طرف دیکھا۔ آدھی رات کا سماں تھا۔ وہ ضرور دریا گزر کر پار ہو گئے ہوں گے"

پھر ذیلدار کے لڑکے اور گاموں نائی کا خیال آیا۔ میں تھک گیا تھا۔ دس میل چل چکا تھا۔ ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ کر خیالوں میں ڈوب گیا۔

وہ اُن کے پیچھے گئے ہیں۔ بہت تیز گھوڑوں پر۔ اُن کے پاس ہتھیار ہے۔ راہ میں جا پکڑا تو لڑکی چھین لیں گے۔ پھر لڑائی ہوگی۔ خون خرابا ــــ !۔

اب میں پھر اٹھا اور جنگل میں گھس گیا۔ کوئی مجھے لئے جا رہا ہے۔ میں نے اُن کو راہ سمجھائی تھی کہ لڑکی کو ننھیال چھوڑ آئیں۔

جنگل میں گھپ اندھیرا تھا۔ چاند بھی بدلی میں چھپ گیا تھا۔ ہوا بند تھی درخت کی گہری سوچ میں چپ چاپ کھڑے تھے۔ صرف گیدڑ کبھی کبھی بول اُٹھتے یا دور سے اُلو کی منحوس فریاد سنائی دے جاتی تھی۔"

مردوں کا دل سخت ہوتا ہے پر اُس رات ہول نے میرا خون جما دیا تھا۔ کئی مرتبہ سانپ میرے پاؤں کے پاس سرسرا گئے اور میں اُچک اُچک کر پرے ہٹ گیا۔ میں نے اپنے ورد کو دُہرانا شروع کیا۔ اللہ رسولؐ کے نام سے جی ٹھہر جاتا ہے۔

چاند پھر نکل آیا تھا مگر یہ کالا جنگل تھا۔ اندھا اور ویران اور ڈراؤنا۔ میں چلتا رہا۔ مارا مار کرتا ہوا چلتا رہا۔ چلتا جا رہا تھا کہ بڑے زور کی آہٹ ہوئی۔ گھوڑے کی ٹاپ میں بھاگ کر ایک طرف ہٹ گیا جیسے کسی نے اٹھا کر سڑک سے پرے پھینک دیا ہو۔ ایک جھڑبیری کے پیچھے سے دیکھنے لگا۔ گھوڑے کی ٹاپ نزدیک آتی گئی۔ ٹاپوں کے ساتھ ایک اور آواز بھی ملی ہوئی تھی۔ میں نے سنا کوئی زور زور سے چیخ رہا تھا۔ "مار ڈالا خون کر دیا"

میرے دیکھتے دیکھتے گھوڑا بجلی کی طرح میرے سامنے سے گزر گیا۔ میں نے دیکھ لیا۔ گاموں نائی اس کی گردن سے لپٹا ہوا چیخ رہا تھا۔ "مار ڈالا۔ خون کر دیا۔"

میری زبان پر خون کا سا ذائقہ آگیا۔ آنکھوں میں لال لال لکیریں چمکنے لگیں۔ میں وہیں جم گیا۔

گھوڑا غائب ہوگیا۔ ٹاپیں دور ہوتی جاتی تھیں اور وہ آواز بھی۔ "مار ڈالا خون کر دیا۔" اور اس آواز کے ساتھ رات کی تاریکی اور جنگل کی خاموشی بھی پکار پکار کر کہہ رہی تھی۔ "مار ڈالا۔ خون کر دیا" آخر اسی طرح خاموشی ہوگئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جنگل پہلے سے بھی زیادہ ڈراؤنا ہوگیا تھا میں نے کہا۔ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ ہونی اس کو گھیر کر ان کے پیچھے لے گئی۔"

میں سوچ رہا کیا کرنا چاہیئے۔ آگے چلوں یا پلٹ جاؤں۔ ایسی جگہ ٹھہرنا اچھا نہ تھا۔ مگر پاؤں مَن مَن بھر کے ہو گئے تھے۔ میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا اتنے میں پھر گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ اسی طرف سے مگر نرم۔

یہ بلند تھا۔ ذیلدار والے کے گھوڑے پر سوار۔ آگے زین پر چھوٹے بھائی کو سنبھالے ہوئے۔ ممندا زخمی تھا۔ بے ہوش۔

میں جلدی سے نکلا اور گھوڑے کے آگے جا کھڑا ہوا۔ چاند کی روشنی میں اس نے مجھے بے پردا آنکھوں سے دیکھا۔ پہچان لیا۔ اس کا قد پہلے سے بڑا معلوم ہوتا تھا ــــ چہرہ بھیانک تھا۔ وہ مسکرایا۔

وہ پکارا "ہوگیا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا ــ؟"

اس نے زور سے کہا۔ "ہوگیا۔ سب کچھ ہوگیا۔ وہاں پڑا ہے ریت پر ــ مُردہ ــــ لہو میں نہایا ہوا ابلکا .... نائی بھاگ گیا ــــ یہ یہ ہمارے پیچھے آئے تھے !!!

میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "لڑکی؟"

اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "دریا میں! ہم وہیں سے لوٹے ہوئے آ رہے تھے۔ راہ میں یہ مل گئے۔

میرے منہ سے نکلا "بُرا ہوا"

وہ زور سے ہنسا۔ "وہ سیدھی ننھیال پہونچ جائے گی۔ پھر ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ جنگل نے بھی اس کے ساتھ قہقہہ لگایا ــ پھر وہ بولا۔ "عزت کے بدلے ــ۔

میں کچھ کہنے ہی کو تھا کہ اُس نے کہا "پلٹ جاؤ — تم کیوں آئے ہو — وہاں خون ہے — پلٹ جاؤ۔ گاموں بھاگا ہوا گیا ہے — میں اس کے پیچھے جا رہا ہوں یلا"۔

یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو دوڑا دیا۔ میں کہتا رہ گیا، ٹھہر جاؤ۔ بتاتے جاؤ۔ گاؤں میں نہ جانا، مگر اس نے نہ سنا۔ جوان آدمی کسی کی نہیں سنتا۔ میں بھی اسکے پیچھے پیچھے دوڑا — دوڑا نہ جاتا تھا۔ میرے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ خون کے خیال نے میرے لہو میں برف بھر دی تھی۔ خبر نہیں میں کب جنگل اور بیہڑ سے نکلا۔ جس وقت میں جھلار والے کو ٹھے پر پہونچا تو پو پھٹ رہی تھی۔

ذرا دن چڑھے میں گاؤں گیا جس وقت روز بکریاں لانے جایا کرتا تھا۔ میں نے دیکھا دُولو چودھری کے دروازے پر تھانہ اترا ہوا ہے۔ سارا گاؤں جمع تھا۔ دونوں بھائیوں کے ہاتھ پیر باندھے ہوئے تھے۔ گاموں نائی راتوں رات پولیس والوں کو لے آیا تھا اور اب بڈھا ذیلدار اپنے بیٹے کی لاش لانے کے لئے سپاہیوں کے ساتھ کالے جنگل کی طرف جا رہا تھا۔ میں وہاں تھوڑی دیر ٹھہرا۔ دونوں بھائی چپ چاپ بیٹھے تھے۔ مجھے انہوں نے ایسی نظر سے دیکھا۔ جس سے فتح مندی ظاہر ہوتی تھی۔ ان کی ماں دروازے کی اوٹ میں بین کر رہی تھی۔ میں بکریاں لے کر چلا آیا۔

بیچاری بڑھیا تھوڑے دن زندہ رہی۔ جس دن دونوں بھائیوں کو کالے پانی کی سزا ہوئی میں نے اپنے ہاتھ سے اس کو قبر میں اتارا تھا۔

یہ گھر ایک جوان لڑکی کے بٹھار کھنے سے اجڑ گیا"

"دیکھا جوان لڑکی کے نہ بیاہنے کا نتیجہ، بڑھیا دایہ نے میری بیوی کو بڑے وثوق سے کہا "اپنے دادا سے یہ کہانی سن کر میں کانپتے کانپتے سوگئی۔ پھر میرے باپ نے تیسرے مہینے میری شادی کردی اور —"

خبر نہیں بڑھیا نے اور کیا کیا کہا۔ میں اپنی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور کالے جنگل میں اس رات کے قتل کا بھیانک اور ہیبت ناک نظارہ دیکھ رہا تھا۔ تصور مجھے اس جگہ لے گیا جہاں ذیلدار کے اوباش لڑکے کا ناپاک جسم خون میں نہایا پڑا تھا۔ وہ جسم وہ چہرہ جسے وہ بنائے سنوارے رکھتا تھا زخموں اور موت کے کرب سے ڈراؤنا ہو گیا تھا۔ وہ آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ وہ ڈھیلے باہر نکلے ہوئے تھے جن سے وہ لوگوں کی بہو بیٹیوں پر نگاہیں ڈالتا تھا

پھر میں نے تصوّر ہی تصوّر میں ان دونوں بھائیوں کو کالے پانی میں دیکھا جن کی آنکھوں میں سے غیرت کی آگ چنگاریاں بن کر نکل رہی تھی۔

اور وہ بدنصیب لڑکی — جس کو سگے بھائیوں نے اپنے ہاتھوں سے گہرے پانی کی ہولناک موجوں میں دھکیل دیا تھا۔

میری چارپائی گویا بھونچال سے کانپ رہی تھی۔

اسی وقت ان دہشت ناک خیالوں میں مجھے ایک نازک سے قہقہے کی آواز سنائی دی۔ نیچے کی منزل میں میری ننھی لڑکی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ مجھے اس کی آواز سنائی دی اور ایک شیریں راحت نے میری پلکیں ملا دیں۔ مجھے اپنے گوشۂ چشم پر آنسوؤں کی ہلکی ہلکی حرارت محسوس ہو رہی تھی خبر نہیں بڑھیا آپ بیتیاں ختم کر کے کب چلی گئی۔ جب بیوی نے مجھے دوا پلانے کے لئے اٹھایا تو میں پسینے میں نہایا ہوا تھا"

(ہفت پیکر)

محشر والوں نے بھی مجھ کو شاعر کہہ کر چھوڑ دیا

میری فردِ عمل کو سمجھے مجموعہ افسانوں کا!

(حفیظ)

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی - ڈھاکہ - لاہور - چٹاگانگ

ایک زمانہ کے جانے پہچانے

ٹریکولین
شرٹس
Ruloflex
رزاق

زخمہ بر تارِ رگِ جاں
(حفیظ)

انتخابِ کلام

نغمہ زار

— ۱۹۲۵ء —

ارشادِ گرامی
سحر
فرصت کی تمنا میں
ابھی تو میں جوان ہوں
برسات
بسنتی ترانہ
بہشت بریں
تاروں بھری رات
سخت گیر آقا
غزلیں

سوز و ساز

— ۱۹۳۲ء —

تکیہ
راوی میں کشتی
صبح و شامِ کوہسار
شہسوارِ کربلا
لاہور
توبہ نامہ
جاگ سوزِ عشق
کرشن بنسری
دل ہے پرائے بس میں
پرانی بسنت
پریت کا گیت
سپنا
اندھی جوانی
والدہ کی موت
غروبِ آفتابِ سخن
ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح
موت کا قافلہ
شہیدوں کی عید
میرا اسلام لے جا
تین نغمے
کنجوس سرمایہ دار
غزلیں

تلخابۂ شیریں

— ۱۹۴۷ء —

غزلیں
تیری منزل دور
منجدھار
درشن درشن
اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے
نیرنگِ فرنگ
محفل بہر مضحکہ
شیروں کو آزادی ہے
اب خوب ہنسے گا دیوانہ
کدھر جاتا ہے دیوانے
نعرۂ تکبیر
میری جوانی
کیا ہوں میں؟
میرا کلام بہتریں
بکوشید
میری شاعری
آغا حشر
سرسید راس مسعود
اقبال کے مزار پر
بنجارہ پربت
ایک مہذب شہر
خون کے چراغ
لبیک

شاہنامۂ اسلام

— اول تا چہارم —

— ۲۷ء تا ۴۷ء —

گیت اور نظمیں

— ۱۹۳۹ء —

خدا سب کچھ دیکھتا ہے
بول میرے مرغے
گوٹے کی چنری
کسان کا لڑکا
دھنیا
مچھلیوں کے ماسٹر جی
پنہاری کا گیت
مانو بلی کا سبق
سونے والو جاگو
تاروں بھری رات

انتخاب کلام اور پھر اپنے کلام میں چُن کر دنیا کے سامنے
پیش کرنے کا مسئلہ بہت ہی پیچیدہ ہے۔ میں اپنے
جگر کے ٹکڑوں میں کس کو کس پر ترجیح دوں۔ صہبا صاحب
بہت ہی اڑیل صاحبِ قلم ہیں۔ اُن کا اصرار انکار سے
ہارنے والا نہیں۔ اس لئے وہ آج میری کتابیں لے گئے
میں نے اُنہی کے قلم سے نشان لگا دیئے ہیں۔
انتخاب موضوعات درپیش ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی
لیکن موضوع میرے فکرِ سخن کی ساری اولاد
ہے ۔ لہٰذا جس پر میرے قلم میں صاد کی جنبش کی
اسوقت وہی صاد ہے

حفیظ
۲ جون 1963

(۱)

نغمہ زار

(نظمیں)

ارشادِ گرامی

فخرِ ایشیا ملک الشعراء حضرت استاذ مکرم مولانا شیخ غلام قادر صاحب گرامی (قدس سرہٗ) نے ذیل کے اشعارِ آبدار اس عاجز کے کلام کے متعلق ارشاد فرما کر ذرّے کو آفتاب بنا دیا تھا۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔ ان اشعار کو پڑھتا ہوں اور شرمندہ ہوتا ہوں کہاں گرامی شہنشاہ اقلیم سخن اور کہاں حفیظ گدائے گوشہ نشیں یادر عامی ہیچ مچ زباں۔ ہاں گرامی کی نسبت نے اس کو گرامی کر دیا ؎

گرچہ خوردیم نسبتے ست بزرگ ۔۔۔ ذرۂ آفتاب تابانیم

حفیظ

فصاحت مجسّم، بلاغت مصوّر ۔۔۔ کلامِ حفیظ است اللہ اکبر

معانی دل آویز و الفاظ دل کش ۔۔۔ کلامِ حفیظ است یا سلکِ گوہر

معانی در آغوشِ الفاظِ پنہاں ۔۔۔ بآب است ماہی بآتش سمندر

معانی در الفاظ پنہاں و پیدا ۔۔۔ بہم کردہ نکرشش مگر شیر و شکر

فصیح معظّم بلیغ مکرّم! ۔۔۔ حفیظِ سخن گو حفیظِ سخن ور

بہ فہرست معنی است نامش مقدم ۔۔۔ بہ بزمِ گرامی کلامش مؤخر

چہ نسبت بود داغ را با حفیظم　　مؤخر مقدم، مقدم مؤخر
بطرز آفرینی طبعِ بلندش　　بود آسماں کارگاہ مسخر
گرامی سحر گفت سالک بگوشم
زبانِ حفیظ است یا موجِ کوثر

سحر

(۳)

فلک پر ایک کارواں　　کہاں سے آ گیا کہاں
کوئی صدائے پا نہیں
جرس نہیں درا نہیں
مسافرانِ شب مگر　　تھکن سے چور ہو گئے
نہ ختم ہو سکا سفر　　تو چلتے چلتے سو گئے
یہ انجمن کی انجمن
ہے خامشی میں غوطہ زن
سرود اس کی خامشی　　سفر نصیب زندگی

(۴)

یکایک ایک نور کا　　غبار شرق سے اُٹھا
جو رفتہ رفتہ بڑھ چلا
اور آسماں پہ چھا گیا
حسینۂ نمود نے　　سیہ نقاب اُٹھا دیا
فسوں گرِ شہود نے　　طلسمِ شب مٹا دیا
یکایک ایک تازگی
یکایک ایک روشنی
نگاہِ جاں میں آ گئی　　حیات میں سما گئی

یکایک ایک نور کا
غبار شرق سے اُٹھا

(۹)

اُٹھی حسینۂ سحر　　پہن کے سر پہ تاجِ زر
لباسِ نور زیبِ بر
چڑھی فرازِ کوہ پر
وہ خندۂ نگاہ سے　　پہاڑ طور بن گئے
وہ عکسِ جلوہ گاہ سے　　سحاب نور بن گئے
نوائے جُوئبار اُٹھی
صدائے آبشار اُٹھی
ہواؤں کے رباب اُٹھے　　خوش آمدید کے لئے
اُٹھی حسینۂ سحر
پہن کے سر پہ تاجِ زر

(۱۳)

اُٹھے حسین خواب سے　　کہ دھوئیں مُنہ گلاب سے
یہ عشوہ سازیوں میں ہیں
ادا طرازیوں میں ہیں
اُدھر سے عشق بھی اُٹھا　　مگر ہے اپنی ہانک میں
ادھر گیا ادھر پھرا　　فضول تاک جھانک میں
شباب جس کی رات بھی
نشاط و عیش میں کٹی
وہ نیند ہی کا ہو گیا　　اُٹھا، پھر اُٹھ کے سو گیا
اُٹھے حسین خواب سے
کہ دھوئیں منہ گلاب سے

فرصت کی تمنّا میں

یوں وقت گذرتا ہے　　　فرصت کی تمنّا میں
جس طرح کوئی پتّا
بہتا ہوا دریا میں
ساحل کے قریب آ کر
چاہے کہ ٹھہر جاؤں
اور سیر ذرا کر لوں　　　اس عکسِ شجر کی
جو دامنِ دریا پر　　　زیبائشِ دریا ہے
یا باد کا وہ جھونکا
جو وقفِ روانی ہے
اک باغ کے گوشے میں
چاہے کہ یہاں دم لوں
دامن کو ذرا بھر لوں
اُس پھول کی خوشبو سے　　　جس کو ابھی کھلنا ہے
فرصت کی تمنّا میں　　　یوں وقت گذرتا ہے
افکارِ معیشت کے　　　فرصت ہی نہیں دیتے
میں چاہتا ہوں دل سے
کچھ کسبِ ہُنر کر لوں
گلہائے مضامیں سے
دامانِ سخن بھر لوں
ہے بخت مگر واژوں
فرصت ہی نہیں ملتی
فرصت کو کہاں ڈھونڈوں　　　فرصت ہی کا رونا ہے

پھر جی میں یہ آتی ہے
کچھ عیش ہی حاصل ہو
دولت ہی ملے مجھ کو
وہ کام کوئی سوچوں
پھر سوچتا یہ بھی ہوں
یہ سوچنے کا دھندا　　فرصت ہی میں ہوتا ہے
فرصت ہی نہیں دیتے
افکار معیشت کے

(سنہ ۲۳ء)

ابھی تو مَیں جوان ہُوں

یہ گشت کوہسار کی　　یہ سیر جُوئبار کی
یہ بلبلوں کے چہچہے　　یہ گل رخوں کے قہقہے
کسی سے میل ہو گیا
تو رنج و فکر کھو گیا
کبھی جو بخت سو گیا
یہ ہنس گیا وہ رو گیا
یہ عشق کی کہانیاں　　یہ رس بھری جوانیاں
ادھر سے مہربانیاں　　ادھر سے لن ترانیاں
یہ آسمان، یہ زمیں
نظارہ ہائے دل نشیں
انہیں حیات آفریں
بھلا میں چھوڑ دوں یہیں

ہے موت اس قدر قریں		مجھے نہ آئے گا یقیں
نہیں نہیں، ابھی نہیں
ابھی تو میں جوان ہوں

(سنہ ۲۴ء)

برسات

(۴)

آموں کے نیچے		ڈالے ہیں جھولے
مہ پیکروں نے
سیمیں تنوں نے
برق افگنوں نے
گیت ان کے پیارے		میٹھے رسیلے
ہلکی صدائیں		سادہ ادائیں
گل پیرہن ہیں		غنچہ دہن ہیں
خود مسکرانا		خود منہ چڑانا
پھر جھینپ جانا
الہڑ پنے سے
آموں کے نیچے		ڈالے ہیں جھولے

(۵)

اٹھلا رہی ہیں		اترا رہی ہیں
خوبانِ ہندی
حورانِ ارضی!
شمعیں گھروں کی
نازک دوپٹے		رنگین ہلکے!
سر پر سنبھالے		شانوں پہ ڈالے

مینہہ لاکھ برسے　　جی لاکھ ترسے
نکلیں نہ گھر سے　　شوہر کے ڈر سے
اپنی نظر سے
شرما رہی ہیں
اٹھلا رہی ہیں　　اِترا رہی ہیں

(سنہ ۱۹۲۴ء)

بسنتی ترانہ

لو پھر بسنت آئی　　پھولوں پہ رنگ لائی
چلو بے درنگ
لبِ آبِ گنگ
بجے جل ترنگ
من پر اُمنگ چھائی　　پھولوں پہ رنگ لائی
لو پھر بسنت آئی

آفت گئی خزاں کی　　قسمت پھری جہاں کی
چلے مے گسار
سوئے لالہ زار
مئے پردہ دار
شیشے کے در سے جھانکی　　قسمت پھری جہاں کی
آفت گئی خزاں کی

(سنہ ۱۹۲۲ء)

بہشتِ بریں

یہ بہشتِ بریں۔ زمیں پر ہے
آسماں پر نہیں۔ زمیں پر ہے
ہاں یہیں ہاں یہیں زمیں پر ہے
امن کی یہ زمیں۔ زمیں پر ہے
ہر جگہ ہر کہیں۔ زمیں پر ہے
دل میں ہے دل نشیں۔ زمیں پر ہے
برزخ آب و گل ہے یہ وادی
میرا اپنا ہی دل ہے یہ وادی

یہ بہشتِ بریں۔ یہ جانِ بہار
کر دیئے دور جس نے سب آزار
میں نے پایا یہ گلشنِ بے خار
لیک۔ بعد از خرابیٔ بسیار
داخلہ اس میں ہے بہت دشوار
اس کو گھیرے ہوئے ہے حلقۂ نار
یہ بہشتِ بریں۔ یہ وادیٔ نور
ہے جہنم کی آگ سے محصور

اس کے چاروں طرف اجاڑ اجاڑ
شعلہ ہائے ہوس پہاڑ پہاڑ
شیر، ہاتھی، دہاڑ اور چنگھاڑ
بھیڑیئے، اژدہے، لتاڑ، پچھاڑ

ہر زباں بر زباں بگاڑ بگاڑ
رہزنی، مار دھاڑ، اکھاڑ پچھاڑ
ہر کوئی ہر کسی کی تاک میں ہے
آدمی آدمی کی تاک میں ہے

(سنہ ۱۹۲۳ء)

تاروں بھری رات

دنیائے انساں		شہرِ خموشاں
دیکھے بھلا کون		رنگِ گلستاں
ہنستے ہیں غنچے		کھلتی ہیں کلیاں
ہر شاخ رقصاں		ہر پھول خنداں

سبزے میں ساری
اک روح جاری
پتّوں پہ طاری
اک کیفِ لرزاں

ہر برگِ گُل پر		موتی جڑے ہیں
موتی ہی موتی		بکھرے پڑے ہیں
قدرت کی ہر شے
گویا دُلہن ہے

باریک ململ		تاریک آنچل
چہرے پہ ڈالے		گھونگٹ نکالے
شب کی ردا میں
دُھندلی ضیا میں

اپنی حیا میں
چپ ہے مگن ہے
گویا دُلہن ہے

(سنہ ۱۹۲۳ء)

سخت گیر آقا

(ایک بے ٹیکی نظم)

آج بستری میں ہوں
کر دیا ہے آج
میرے مضمحل اعضا نے اظہارِ بغاوت برملا
میرا جسمِ ناتواں - میرا غلامِ باوفا
واقعی معلوم ہوتا ہے تھکا ہارا ہوا
اور مَیں
اک سخت گیر آقا ــــ (زمانے کا غلام)
کس قدر مجبور ہوں
پیٹ پوجا کے لئے
دو قدم بھی اٹھ کے جا سکتا نہیں
میرے چاکر- پاؤں - شل ہیں
جھک گیا ہوں - ان کمینوں کی رضا کے سامنے
سر اٹھا سکتا نہیں
آج بستر ہی میں ہوں

(سنہ ۱۹۲۳ء)

غزلیں

(۱)

مستوں پہ انگلیاں نہ اٹھاؤ بہار میں
دیکھو تو ہوش ہے بھی کسی ہوشیار میں

کچھ محتسب کا خوف ہے کچھ شیخ کا لحاظ
پیتا ہوں چھپ کے دامنِ ابرِ بہار میں

وہ سامنے دھری ہے صراحی بھری ہوئی
دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں

اللہ بات کیا ہے کہ دیوانگی مری
دیوانگی نہیں نظرِ ہوشیار میں

تھوڑی تسلیوں سے نہ بہلاؤ جاؤ جاؤ
جاؤ کہ تم نہیں ہو مرے اختیار میں

وہ عندلیبِ گلشنِ معنی ہوں میں حفیظ
سوزِ سخن سے آگ لگا دوں بہار میں

(۲)

آ ہی گیا وہ مجھ کو لحد میں اتارنے
غفلت ذرا نہ کی مرے غفلت شعار نے

او بے نصیب دن کے تصور سے خوش نہ ہو
چولا بدل لیا ہے شبِ انتظار نے

اب تک اسیرِ دامِ فریبِ حیات ہوں
مجھ کو بھلا دیا مرے پروردگار نے

نوحہ گروں کو بھی ہے گلا بیٹھنے کی فکر
جاتا ہوں آپ اپنی اجل کو پکارنے

دیکھا نہ کاروبارِ محبت کبھی حفیظ
فرصت کا وقت ہی نہ دیا کاروبار نے

(۳)　　(سنہ ۱۹۲۳ء)

یہ انتا دل بشرا مڈے گی موج بے کراں ہوکر
یہ کوہِ غم پھٹے گا ایک دن آتش فشاں ہوکر
خدا کی کارسازی کا نیا اک دور آیا ہے
کہ بندے چیخ اٹھے ہیں شاکیٔ جورِ بتاں ہوکر
قیامت ڈھائے گا جوشِ جنوں بنائے دانش کا
اڑے گا دامنِ دنیا کسی دن دھجیاں ہوکر
یہ کس کی تفرقہ پردازیوں پر شور واویلا
اٹھا ہے دیر سے ناقوس مسجد سے اذاں ہوکر
حفیظ اس سینہ کاوی سے یہیں حاصل یہی ہوگا
کہ حاصل کچھ نہ ہوگا شاعرِ رنگیں بیاں ہوکر

(۴)　　(سنہ ۱۹۱۹ء)

شیخ کعبے سے پلٹ آئے خدا کو دیکھ کر
مطمئن ہیں اب بتانِ خوش ادا کو دیکھ کر
جز غلامی کوئی بھی منزل نظر آتی نہیں
مسلکِ اربابِ تسلیم و رضا کو دیکھ کر
انتہائے گمرہی یہ ہے کہ ہنستے ہیں بہم
رہنما مجھ کو۔ ادھر میں رہنما کو دیکھ کر
کوششِ ناکام کو جانے کبھی دے اے چارہ گر
یاالعجب۔ تاثیر ہنستی ہے دوا کو دیکھ کر
صورت و سیرت تو ہیں سب بعد کی باتیں حفیظ
ہم نہ جانے مر مٹے تھے کس ادا کو دیکھ کر

(سنہ ۱۹۲۲ء)

(۵)

اس بزم میں آخر شعرا ہیں کہ نہیں ہیں
انداز مرے سب سے جدا ہیں کہ نہیں ہیں
قسمت سے نہیں۔ حسن کی سرکار سے پوچھو
ہم بندۂ تسلیم و رضا ہیں کہ نہیں ہیں
جلوؤں کی طلب۔ پیروئ حضرت موسےٰ
گمراہ مرے راہنما ہیں کہ نہیں ہیں
آ تجھ کو دکھا دوں کہ ستاروں سے بھی آگے
انسان کے نقش کفِ پا ہیں کہ نہیں ہیں
ہاں مَیں تو لئے پھرتا ہوں اک سجدۂ بے تاب
اُن سے بھی تو پوچھو وہ خدا ہیں کہ نہیں ہیں

(۶)		(سنہ ۱۹۲۴ء)

وہ ابر جو مے خوار کی تربت پہ نہ برسے
کہہ دو کہ خدا را کبھی گذرے نہ ادھر سے
اتنا تو ہوا آہِ شبِ غم کے اثر سے
فطرت کا جگر پھوٹ بہا چشمِ سحر سے
ناصح کو بلاؤ مرا ایمان سنبھالے
پھر دیکھ لیا اُس نے اسی ایک نظر سے
اے خندۂ گلشن یہ ہے انجام شبِ عیش
گل روتے ہیں منہ ڈھانپ کے دامانِ سحر سے

(۷)		(سنہ ۱۹۲۴ء)

ہم دورِ نَو کو دیکھ کے خاموش ہو گئے
کم ظرف ناچنے لگے۔ مدہوش ہو گئے
او بے نصیب حشر کے وعدے کا حشر دیکھ
وہ رفتہ رفتہ وعدہ فراموش ہو گئے

ہم خیر خواہِ بازوئے تیغ آزما رہے
وہ خوش نصیب تھے جو سبک دوش ہو گئے

للہ پھیر لے اسے اے قاسمِ ازل
دل لے کے ہم تو فتنۂ در آغوش ہو گئے

بے ربطیِٔ فسانہ کا اب تذکرہ ہی کیا
خاموش تم نے کر دیا خاموش ہو گئے

طوفاں اٹھائے پھرتے تھے ہوش و خرد حفیظ
دیکھی جنوں کی شکل تو خاموش ہو گئے

(سنہ ۱۹۲۲ء)

دو[2] یادگار غزلیں

کپور تھلہ میں سنہ ۱۷ء اور سنہ ۱۸ء میں گرامی صاحب کے اعزاز میں جو مشاعرے ہوئے تھے۔ ذیل کی دونوں غزلیں اُس کی یادگار ہیں۔ دوسری غزل کا یہ مطلع
"رزّاق دو جہاں نے... الخ"
سُن کر گرامی صاحب بے اختیار آبدیدہ ہو گئے تھے۔ پھر آپ نے فرمایا تھا: "حفیظ تو ملا خبِ ابوالاثر ہے۔ یہ غزلیں میں نے استاد گرامی کو دکھائے بغیر مشاعرے میں پڑھ دی تھیں۔

(حفیظ)

(۱)

وہ ہوئے پردہ نشیں انجمن آرا ہو کر
رہ گیا میں ہمہ تن چشمِ تمنا ہو کر

حسن نے عشق پہ حیرت کی نگاہیں ڈالیں
خود تماشا ہوئے ہم محوِ تماشا ہو کر

آنکھ کم بخت سے اُس بزم میں آنسو نہ رکا
ایک قطرے نے ڈبویا مجھے دریا ہو کر

کوئی ہو دردِ محبت کا مداوا کردے
ملک الموت ہی آجائے مسیحا ہو کر
کچھ تعجب نہیں کعبے میں اگر جی نہ لگے
آئے ہیں ہم طرفِ دیر و کلیسا ہو کر
رنگ و روغن پہ نگاہیں نہ کبھی للچائیں
مجھ کو دنیا نظر آتی رہی دنیا ہو کر

(سنہ ۱۹۱۸ء)

(ب)

اُلفت ہوئی۔ ہوئی۔ وہ ہوا بے وفا ہوا
اچھا ہوا۔ بُرا ہوا۔ جو کچھ ہوا ہوا
رزّاقِ دو جہاں کے خزانے کو کیا ہوا
ملتا ہے رنج وہ بھی کسی کا دیا ہوا
بیمارِ غم کی پوچھتے ہو سرگذشت کیا
اک آہ کی غریب نے اور دم ہوا ہوا
بس دُور ہی سے زندگیٔ خضر کو سلام
زہرابِ غم ہے آبِ بقا میں ملا ہوا
آنکھیں تو پھوٹ پھوٹ کے روتی ہیں ہجر میں
رہتا ہے پھر بھی آبلۂ دل بھرا ہوا
پژمردہ آرزوؤں میں اک رُوح پھونک دی
گذرا پھر اس طرف سے کوئی دیکھتا ہوا

(سنہ ۱۹۱۸ء)

(۱۰)

رنگ بدلا یار نے وہ پیار کی باتیں گئیں
وہ ملاقاتیں گئیں وہ چاندنی راتیں گئیں

پی تو لیتا ہوں مگر پینے کی وہ باتیں گئیں
وہ جوانی وہ سیہ مستی، وہ برساتیں گئیں

اللہ اللہ کہہ کے بس اک آہ کرنا رہ گیا
وہ نمازیں، وہ دعائیں، وہ مناجاتیں گئیں

حضرت دل، اب نئی الفت سمجھ کر، سوچ کر
اگلی باتوں پر نہ بھولیں آپ وہ باتیں گئیں

راہ و رسمِ دوستی قائم تو ہے۔ لیکن حفیظ
ابتدائے شوق کی لمبی ملاقاتیں گئیں

۱۹۲۱ء

(۱۱)

مٹا یا تو نے مجھ کو جوشِ ایماں دیدہ خواہد شد
صنم کہتے ہیں جا ہو جا مسلماں دیدہ خواہد شد

حسینوں کی شکایت داورِ محشر سے کی میں نے
بہت چپکے سے یوں فرما دیا ہاں دیدہ خواہد شد

ہوئے فصلِ گل کے ساتھ ہی دورانِ خوں رخصت
پھر آئے سال لے خارِ مغیلاں دیدہ خواہد شد

بہار آئے تو دو ہوش و خرد جائے تو دو کھڑ د
گلستاں دیدہ خواہد شد، بیاباں دیدہ خواہد شد

فلک لیتا ہے انساں محو ہے تو آرزوؤں میں
بنا بیٹھا ہے پریوں میں سلیماں دیدہ خواہد شد

مسلسل کس میری کا سلوک آباد کاروں سے
بروزِ حشر اے گورِ غریباں دیدہ خواہد شد

ہمارے ہی عزیزوں سے تجھے ہوا اختلاط ایسا
ہمیں ہے نفرت اے مرگِ عزیزاں دیدہ خواہد شد

حفیظ اس گفتگو سے رنگِ مشرب کھل گیا۔ یعنی
ہوئے تم بھی شریکِ بزمِ رنداں دیدہ خواہد شد

(سنہ ۱۹۲۳ء)

(۱۲)

ذرا انصاف کرا دو میری صورت دیکھنے والے
کہیں دیکھے بھی ہیں ایسی مصیبت دیکھنے والے
قفس میرا یہ کہہ کر لے چلا صیاد گلشن سے
تری پستی نہ دیکھیں تیری رفعت دیکھنے والے
مٹائے لوحِ دل سے یاس نے احساس کے نقشے
مجھے نادم نہ کر لفتش ندامت دیکھنے والے
اٹھا رکھا ہے میں نے آپ کا دیدار محشر پر
مرا منہ تک رہے ہیں میری ہمت دیکھنے والے
لگایا اس لئے آئینہ اس نے روزنِ در میں
کہ اپنا منہ تو دیکھیں میری صورت دیکھنے والے
مجھے روتے ہوئے بے ساختہ ہنسنا بھی پڑتا ہے
اذیت پر تری۔ میری اذیت دیکھنے والے

(سنہ ۱۹۱۶ء)

(۱۳)

میں دسمبر سنہ ۱۹۲۱ء میں پہلی بار لکھنؤ گیا تھا، اور مولانا شرر لکھنوی کے یہاں ٹھہرا تھا۔ انہیں دنوں ہمدم کے ایڈیٹر جالب دہلوی کے دفتر میں ایک مشاعرہ ہوا۔ عزیز لکھنوی مجھے باصرار لے گئے۔ اور مشاعرے میں تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ: اب ایک پنجابی کی اردو غزل سنئے۔ یہ غزل اسی مشاعرے کی یادگار ہے۔　　　　(حفیظ)

ہے قفس میں جو ازل ہی سے نشیمن میرا
منہ تکا کرتی ہے برقِ شرر افگن میرا

دیکھ اے رحمتِ حق میرے گلے سے نہ لپٹ
میں گنہگار رہوں آلودہ ہے دامن میرا
کب سے پابندِ قفس ہوں مجھے معلوم نہیں
شاخِ سدرہ پہ کسی دن تھا نشیمن میرا
رُوح کو خاک کے دامن میں لئے پھرتا ہوں
میرا قالب ہی حقیقت میں ہے مدفن میرا
گردنِ غیر میں ہیں ہاتھ حمائل اُن کے
ہاں گلا گھونٹ کمندِ رگِ گردن میرا
جانبِ کعبہ تو چلتا ہوں مگر یا اللہ
بُت کدہ میرا! صنم میرے!! برہمن میرا!!!
نہ لگاؤ ہے کسی سے نہ مجھے لاگ حفیظ
دوست میرا کوئی دنیا میں نہ دشمن میرا

(سنہ ۱۹۲۱ء)

(۱۴)

بے تعلق زندگی اچھی نہیں
زندگی کیا موت بھی اچھی نہیں
آج بھی پایا ہے ان کو بد مزاج
صُورتِ حالات ابھی اچھی نہیں
حسرتِ دل دیکھ آنکھوں میں نہ بیٹھ
اس قدر بے پردگی اچھی نہیں
میں نہ کہتا تھا دلِ خانہ خراب
دلبروں سے دل لگی اچھی نہیں
سیر کیجئے حُسن کے بازار کی
ہاں مگر آوارگی اچھی نہیں

دل لگاؤ تو لگاؤ دل سے دل
دل لگی ہی دل لگی اچھی نہیں
یہ ہوا، یہ ابر، یہ سبزہ حفیظ
آج پینے میں کمی اچھی نہیں

(سنہ ۱۹۳۲ء)

(۱۵)

کُفر کی دل شکنی ہم نہیں کرنے والے
ہم مسلمان ہیں اللہ سے ڈرنے والے
باغِ فردوس تو منزل ہے تھکے ہاروں کی
ہم تو چلتے ہیں ٹھہر جائیں ٹھہرنے والے
وادیٔ عشق ہے یا رو عدم آباد نہیں!
ہم تو ہرگز نہیں خاموش گذرنے والے
ہم کو اقرار ہے ہنگامۂ عالم ہم سے تھے
داورِ حشر بھلا ہم ہیں مُکرنے والے

(سنہ ۱۹۱۸ء)

(۱۶)

دوستی کا چلن رہا ہی نہیں
اب زمانے کی وہ ہوا ہی نہیں
سچ تو یہ ہے صنم کدے والو!
دل خدا نے تمہیں دیا ہی نہیں
حال یہ ہے کہ ہم غریبوں کا
حال تم نے کبھی سُنا ہی نہیں
اُس کی صورت کو دیکھتا ہوں میں
میری سیرت وہ دیکھتا ہی نہیں

عشق میرا ہے شہر میں مشہور
اور تم نے ابھی سنا ہی نہیں

(سنہ ۱۹۱۴ء)

(۱۷)

چلی ہے جان یادِ رفتگاں میں
مسافر ہے تلاشِ کارواں میں
سُنا ہے مہر بن جاتا ہے ذرّہ
اگر آئے نگاہِ مہرباں میں
بتوں سے جنگ کرنے کو خدا نے
مجھے پیدا کیا ہندوستاں میں

(سنہ ۱۹۱۵ء)

(۱۸)

اگر یہ حضرتِ دل عشق سے حذر کرتے
تو کیا ہی لطف سے ہم زندگی بسر کرتے
نہ فرشِ راہ اگر ہم دل و جگر کرتے
قدم قدم پہ قیامت یہ فتنہ گر کرتے
قدم قدم پہ نہ ملتا جو رہبروں کا ہجوم
خیال یہ تھا کہ ہم عمر بھر سفر کرتے
حفیظ کاش جنابِ بیانؔ یزدانی
مرے کلام پر اصلاح کی نظر کرتے

(سنہ ۱۹۱۳ء)

لہ حضرت بیان یزدانی میرٹھی مرحوم ـــ مجھے لڑکپن میں بڑی تمنا تھی کہ آپ سے اصلاح لوں۔ یہ غزل میرٹھ میں کہی تھی۔ لیکن مرحوم خود فراموش ہو چکے تھے (حفیظ)

(۲)

سوز و ساز

(نظمیں)

تکیہ

امارت اور شوکت اور ثروت کی تصویریں
یہ ایوانات سب ہیں حال ہی کی تازہ تعمیریں
ادھر کچھ فاصلے پر چند گھر تھے کاشتکاروں کے
جہاں اب کارخانے بن گئے سرمایہ داروں کے
مویشی ہو گئے نیلام کیوں یہ کوئی کیا جانے
کچہری جانے، ساہوکار جانے یا خدا جانے
زمیں داروں کو جا کر دیکھ لے جو بھی کوئی چاہے
نئے بھٹوں میں اینٹیں تلتے پھرتے ہیں "ملوا ہے"
یہاں اپنے پرانے گاؤں کا اب کیا رہا باقی
یہی تکیہ یہی اک پیڑ یہی اک جھونپڑا باقی
عظیم الشان بستی ہے یہ نو آباد ویرانہ
یہاں ہم اجنبی دونوں ہیں میں اور میرا کاشانہ

راوی میں کشتی

بن گیا ہے آسماں نتھرے ہوئے پانی کی جھیل
یا کسی ساحر نے ساکن کر دیا دریائے نیل
کوئی لہر اُٹھتی نہیں اس بحرِ حیرت جوش میں
بزمِ انجم غرق ہے موسیقیِ خاموش میں
کس قدر یہ نیلگوں وسعت سکوت انگیز ہے
جس کے اندر چاند کا چہرہ تجلی ریز ہے
رات کے افسون میں گم ہو گئی ہے کائنات
یہ گماں ہوتا ہے شاید سو گئی ہے کائنات
شہ درے کے "نوحہ خواں" بیتا رہی خاموش ہیں
مقبرہ بھی، باغ بھی، اشجار بھی خاموش ہیں
اک طرف سائے کو لپٹائے ہے پُل سویا ہوا
چاندنی پر ریت کا ہے جزو و کُل سویا ہوا
اُس طرف اجڑی ہوئی بارہ دری خاموش ہے
اک گئے گذرے پرانے خواب میں مدہوش ہے
اوڑھ کر مغموم بیوہ کی طرح چادر سفید
کروٹیں لیتی ہے راوی ناشکیب و نا اُمید
سینہ جنباں ہے کہ دل میں ہلکا ہلکا درد ہے
یہ ہوا کیا ہے لبِ راوی پہ آہِ سرد ہے
نغمہ سویا بربطِ آبِ رواں کی گود میں
جس طرح اک طفل سو جاتا ہے ماں کی گود میں
چاند بالائے فلک ہے چاند زیرِ آب ہے
چاند ہی ساکن ہے لیکن چاند ہی بیتاب ہے

چاند کو گھیرے میں لے کر بہہ رہی ہے چاندنی
کوئی خواب آور کہانی کہہ رہی ہے چاندنی

اور اس چاندی کے دھارے پر بہا جاتا ہوں میں
خواب کے عالم میں سب کچھ دیکھتا جاتا ہوں میں

یہ مری کشتی بھی گویا خواب کا آغوش ہے
میں کسی عالم میں بیٹھا ہوں بس اتنا ہوش ہے

دو طرف خاموش اور تاریک ساحل ہیں رواں
اس روانی پر روانی کا نہیں ہوتا گماں

چپکے چپکے دوسری جانب چلے جاتے ہیں یہ
میری کشتی کے جلو میں کیوں نہیں آتے ہیں یہ

میں کہاں جاتا ہوں شاید یہ نہیں معلوم انہیں
آنکھ سے فطرت نے رکھا ہے مگر محروم انہیں

دور افق پر اک نیا منظر ہے میرے سامنے
زندگانی کا رخِ انور ہے میرے سامنے

میں وہاں جاتا ہوں نیندیں ٹوٹ جاتی ہوں جہاں
حسرتیں امید کے جلوے دکھاتی ہوں جہاں

صبح و شامِ کوہسار

کس قدر ہنگامہ پرور ہے سکوتِ کوہسار
کارپردازانِ قدرت ہیں یہاں مصروفِ کار

اک بڑے قانون کی تعمیل ہوتی ہے یہاں
قسمتِ آب و ہوا تبدیل ہوتی ہے یہاں

گوشے گوشے میں ہیں قائم کارخانے ابر کے
بن رہے ہیں تن رہے ہیں شامیانے ابر کے
وقت بے چارہ یہاں پابند ہے مجبور ہے
اس مشقت گاہ کا ادنیٰ سا اک مزدور ہے
آسماں گردش میں ہے دو کام کرنے کے لئے
صبح کرنے کے لئے یا شام کرنے کے لئے

شہسوارِ کربلا

لباس ہے پھٹا ہُوا　　غبار میں اَٹا ہُوا
تمام جسمِ نازنیں　　چھدا ہوا کٹا ہوا
یہ کون ذی وقار ہے بلا کا شہسوار ہے
کہ ہے ہزاروں قاتلوں کے سامنے ڈٹا ہوا
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

یہ مردِ حق پرست ہے　　مئے رضا سے مست ہے
کہ جس کے سامنے کوئی　　بلند ہے نہ پست ہے
اُدھر ہزار گھات ہے مگر عجیب بات ہے
کہ ایک سے ہزار ہا کا حوصلہ شکست ہے
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

عبا بھی تار تار ہے　　تو جسم بھی فگار ہے

زمیں بھی ہے تپی ہوئی فلک بھی شعلہ بار ہے
مگر یہ مردِ تیغ زن، یہ صف شکن فلک فگن
کمالِ صبر و تن دہی سے محوِ کارزار ہے
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

لاہور

(تصویر کا ایک رُخ)

خطّۂ لاہور یعنی جنّتِ ہندوستاں
جس کی خوبی سے ہے خاکِ پاکِ پنجاب آسماں
ہے تو یہ جنّت مگر انسان بستے ہیں یہاں
خلد سے نکلے ہوئے ارمان بستے ہیں یہاں

حُسن پھرتا ہے یہاں اٹھکیلیاں کرتا ہوا
سادگی کو بے حجابی سے عیاں کرتا ہوا
عشق ہر سُو اس تماشا گاہ میں آوارہ ہے
زخم خوردہ ہے بہت آزردہ ہے بے چارہ ہے

ولولے اُٹھتے ہوئے بڑھتے ہوئے چڑھتے ہوئے
ردِّ آفات و بلا کی سیفیاں پڑھتے ہوئے
جلوہ آرا ہیں یہاں کیفیّتیں پنجاب کی
سینۂ فولاد میں خاصیّتیں سیماب کی

توبہ نامہ

رنگ محل اسکول لاہور میں امتناعِ مسکرات کا جلسہ زیر صدارت شیخ سر عبدالقادر ہوا تھا۔ شعراء بہت سے تھے جن کو تلقین تھی کہ نشوں کے خلاف شعر پڑھیں۔ میں نے کچھ نہیں لکھا تھا۔ شیخ صاحب مجھے پکڑ کر لے گئے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے یہ اشعار ہو گئے جو میں نے آخر میں پڑھے۔ شیخ صاحب نے آخری تقریر میں فرمایا کہ حفیظ کو نہ لانا بہتر تھا۔ شاعر کو حکم دے کر کچھ لکھوانا ممکن نہیں۔

(حفیظ)

اُف، وہ راوی کا کنارا، وہ گھٹا چھائی ہوئی
شام کے دامن میں سبزے پر بہار آئی ہوئی

وہ شفق کے بادلوں میں نیلگوں سرخی کا رنگ
اور راوی کی طلائی نقرئی لہروں میں جنگ

شہ درے میں آم کے پیڑوں پہ کوئل کی پکار
ڈالیوں پر سبز پتوں، سرخ پھولوں کا نکھار

وہ گلابی عکس میں ڈوبی ہوئی چشمِ حباب
اور نشے میں مست وہ سرمست موجوں کے رباب

وہ ہوا کے سرد جھونکے شوخیاں کرتے ہوئے
بن پیے بدمست کر دینے کا دم بھرتے ہوئے

دُور سے ظالم پپیہے کی صدا آتی ہوئی
پے بہ پے کم بخت پی پی کہہ کے اُکساتی ہوئی

اور وہ میں ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر بیٹھا ہوا
دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر بیٹھا ہوا

شیخ صاحب! سچ تو یہ ہے اُن دنوں پیتا تھا میں
اُن دنوں پیتا تھا یعنی جن دنوں جیتا تھا میں
اب وہ عالم ہی کہاں ہے مے پیے مدت ہوئی
اب میں توبہ کیا کروں توبہ کیے مدت ہوئی

جاگ سوزِ عشق

جاگ سوزِ عشق جاگ!
تُو نے آنکھ بند کی — کائنات سو گئی
حسن خود پسند کی — دن سے رات ہو گئی
زرد پڑ گیا سہاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ!
تو جو چشم وا کرے — ہر اُمنگ جاگ اُٹھے
آہ و نالہ جاگ اُٹھے — راگ رنگ جاگ اُٹھے
جوگ سے ملے سہاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ
جاگ اے نظر فروز! — جاگ اے نظر نواز!
جاگ اے زمانہ سوز — جاگ اے زمانہ ساز
جاگ نیند کو تیاگ!
جاگ، سوزِ عشق جاگ!

کرشن بنسری

بنسری بجائے جا
کاہن مُرلی والے نند کے لال
بنسری بجائے جا
بنسری بجائے جا
پریت میں بسی ہوئی اداؤں سے
گیت میں بسی ہوئی صداؤں سے
برج باسیوں کے جھونپڑے بسائے جا
بسائے جا بسائے جا
کاہن مُرلی والے نند کے لال
بنسری بجائے جا
بنسری بجائے جا
کاہن مُرلی والے نند کے لال
بنسری بجائے جا
بنسری بجائے جا
بنسری کی لے نہیں ہے آگ ہے
اور کوئی شے نہیں ہے آگ ہے
پریم کی یہ آگ چار سُو لگائے جا
جلائے جا جلائے جا
کاہن مُرلی والے نند کے لال
بنسری بجائے جا
بنسری بجائے جا

دِل ہے پرائے بس میں

پرائے بس میں
دل ہے پرائے بس میں
پورب میں جاگا ہے سویرا　　　دُور ہوا دنیا کا اندھیرا
لیکن گھر تاریک ہے میرا
پچھم میں جاگی ہیں گھٹائیں　　　پھرتی ہیں سرمست ہَوائیں
جاگ اُٹھو مے خانے والو　　　پینے اور پلانے والو
زہر ملاؤ رس میں
دل ہے پرائے بس میں

پرائے بس میں
دل ہے پرائے بس میں
بیت گیا دن رات بھی آئی　　　تاروں نے محفل بھی سجائی
اُس نے مگر صورت نہ دکھائی
وہم کئی ٹالے ہیں میں نے　　　تارے گن ڈالے ہیں میں نے
وعدے کا تو کس کو یقیں ہے　　　آنکھ میں لیکن نیند نہیں ہے
نیند نے کھالیں قسمیں
دل ہے پرائے بس میں

پرائے بس میں
دل ہے پرائے بس میں
دوستو اس کا نام نہ پوچھو　　　کچھ بھی نہیں ہے کام نہ پوچھو
مجھ سے کوئی پیغام نہ پوچھو

میرا بھی کم نام نہ لینا　　مل جائے تو یوں کہہ دینا
اک دیوانہ چپ رہتا ہے　　کہتا ہے تو یہ کہتا ہے
دل ہے پرائے بس میں
دل ہے پرائے بس میں

پُرانی بسنت

رنگ دے — رنگ دے قدیم رنگ
رنگ دے قدیم رنگ　　بے دریغ، بے درنگ
جس کی ضو سے مات ہو　　رنگِ بازیٔ فرنگ
عشق کے لباس کو
رنگِ شوخ و شنگ دے

رنگ دے — رنگ دے قدیم رنگ
رنگ دے — رنگ دے قدیم رنگ
ایک ہی اُمنگ دے　　ایک ہی ترنگ دے
دین دھرم مٹ نہ جائے　　پاسِ نام و ننگ دے
دامنِ دراز دے
یا قبائے تنگ دے

رنگ دے — رنگ دے قدیم رنگ
رنگ دے — رنگ دے قدیم رنگ
عمر گھٹ گئی تو کیا!　　ڈور کٹ گئی تو کیا؟
یہ ہوائے تند و تیز　　رُخ پلٹ گئی تو کیا؟
آ گئی بسنت رُت
اور اک پتنگ دے

رنگ دے ۔۔ رنگ دے قدیم رنگ
رنگ دے ۔۔ رنگ دے قدیم رنگ،
صُلح ہو کہ جنگ ہو		ساتھیوں کا سنگ ہو
سب ہمیں پسند ہے		خون ہو کہ رنگ ہو
خون ہو کہ رنگ ہو
ایک رنگ رنگ دے
رنگ دے ۔۔ رنگ دے قدیم رنگ

پریت کا گیت

اپنے من میں پریت
بسا لے
اپنے من میں پریت
من مندر میں پریت بسا لے		او مُورکھ او بھولے بھالے
دل کی دنیا کر لے روشن		اپنے گھر میں جوت جگا لے
پریت ہے تیری ریت پرانی		بھول گیا او بھارت والے
بھول گیا او بھارت والے
پریت ہے تیری ریت
بسا لے
اپنے من میں پریت
(۲)
اپنے من میں پریت
بسا لے
اپنے من میں پریت

کرودھ کپٹ کا اُترا ڈیرا　　چھایا چاروں کونٹ اندھیرا
شیخ برہمن دونوں رہزن　　ایک سے بڑھ کر ایک لُٹیرا
ظاہر داروں کی سنگت میں　　کوئی نہیں ہے سنگی تیرا
کوئی نہیں ہے سنگی تیرا
من ہے تیرا میت
بسا لے
اپنے من میں پریت

(۳)

اپنے من میں پریت
بسا لے
اپنے من میں پریت
بھارت ماتا ہے دکھیاری　　دکھیارے ہیں سب نر ناری
تو ہی اُٹھا لے سندر مُرلی　　تو ہی بن جا شام مراری
تو جاگے تو دنیا جاگے　　جاگ اٹھیں سب پریم پجاری
جاگ اٹھیں سب پریم پجاری
گائیں تیرے گیت
بسا لے
اپنے من میں پریت

(۴)

اپنے من میں پریت
بسا لے
اپنے من میں پریت
نفرت اک آزار ہے پیارے　　دکھ کا دارو پیار ہے پیارے
آجا اپنے روپ میں آجا　　تو ہی پریم اوتار ہے پیارے

یہ ہارا تو سب کچھ ہارا　　　من کے ہارے ہار ہے پیارے
من کے ہارے ہار ہے پیارے
من کے جیتے جیت
بسا لے
اپنے من میں پریت

(۵)

اپنے من میں پریت
بسا لے
اپنے من میں پریت
دیکھ بڑوں کی ریت نہ جائے　　　سر جائے پر میت نہ جائے
میں ڈرتا ہوں کوئی تیری　　　جیتی بازی جیت نہ جائے
جو کرنا ہو جلدی کر لے　　　تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے
تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے
وقت نہ جائے بیت
بسا لے
اپنے من میں پریت

سپنا

دیکھ اس دنیا کا نظارا
میرے ساز کے تاروں میں　　　رنگیں نغمہ زاروں میں
نیندوں کے دریاؤں میں ہے ایک خیالی دنیا
اُس دنیا کو دنیا کہہ دیتی ہے خوابی دنیا
دیکھ اس دنیا کا نظارا

ہلکا ہلکا، پیارا پیارا
میرے ساز کے تاروں میں رنگیں نغمہ زاروں میں
ہستی کیا ہے میٹھا سپنا
سپنا کیا ہے میٹھی پریت میٹھی پریت ہے میرا گیت
میرے میٹھے گیتوں میں بستی ہے ساری ہستی
ساری ہستی گیت ہیں میرے نیند ہے میری بستی
ہستی کیا ہے میٹھا سپنا
دل میں رہنا آنکھ سے چھپنا
سپنا کیا ہے میٹھی پریت میٹھی پریت ہے میرا گیت

اندھی جوانی

گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور
گھٹائیں کالی کالی
خوب برسنے والی
متوالی
پرشور
گھٹائیں
چھائی ہیں گھنگھور
گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور
گلشن کی گل پوش ادائیں آموں کی خاموش فضائیں
کوئل کی مدہوش صدائیں
بن میں بول رہے ہیں مور
گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور

محبّت آہوں کا طوفان　　　محبت آہوں کا طوفان
محبت، پیاری پیاری
میٹھی سی بیماری
بے چاری
انجان
محبت
آہوں کا طوفان
محبّت آہوں کا طوفان
اک کشتی ملّاح سے خالی　　　میں نے اُٹھا طوفان میں ڈالی
اس کشتی کا اللہ والی
لے چل لے چل اے طوفان
محبّت آہوں کا طوفان　　　محبّت آہوں کا طوفان

والدہ کی موت

(سنہ ۱۹۲۵ء میں جب مصنف خیرپور سندھ میں تھا)

اے کہ جینا تھا تجھے بھی ناگوار　　　اے کہ تو مدت سے تھی زار و نزار
مل گئی مٹی میں تو پایان کار　　　بن گیا ہے آج تیرا بھی مزار
فکر تھی تجھ کو بہت اولاد کی
راہ لی آخر عدم آباد کی
موجہائے اشک میں بہتی رہی　　　رفتگاں کی یاد میں رہتی رہی
دائمی ماتم کے دُکھ سہتی رہی　　　جلد مر جاؤں گی یہ کہتی رہی
آج فرصت ہو گئی ہر کام سے
سو، لحد میں سو، بڑے آرام سے

غروبِ آفتابِ سخن

(اپنے استاد حضرت مولانا گرامی قدس سرہ کی وفات پر)

صبح کے ساحل سے جو کشتی چلی تھی نور کی
آخر کار اُس نے طے کر لی مسافت دُور کی

شکر ہے دریائے ہستی کا کنارا مل گیا
بے سہارا حسرتوں کو اک سہارا مل گیا

اس مُسافر کے لئے منزل ہے ساحل شام کا
کٹ گیا لمبا سفر وقت آ گیا آرام کا

آرزو نے پاؤں پھیلائے ہیں سونے کے لئے
ولولے بے تاب ہیں آسُودہ ہونے کے لئے

اب یہ محشر خواب کے طوفان میں کھو جائے گا
نیند آ جائے گی چُپ ہو جائے گا سو جائے گا

شام نے کچھ اس طرح پھیلا دیا ہے دامِ خواب
موت کی تاریکیوں میں گھر گیا ہے آفتاب

اس غمِ جاں کاہ میں چشمِ شفق خوں بار ہے
بادلوں کا اک جلوسِ ماتمی تیار ہے

نور کے شعلے کو یہ کالا کفن پہنائیں گے
پھر اٹھا کر پردۂ ظلمات میں لے جائیں گے

بزمِ ہستی کا چراغِ حسن گُل ہو جائے گا
روزِ روشن رات کے آغوش میں سو جائے گا

یاس ہی کے دل میں رہتی ہے مگر امید بھی
شام ہوتی ہے ہمیشہ صبح کی تمہید بھی

لیکن اے بختِ سیہ یہ شام ہے شامِ فراق
اس کے دامن میں نظر آتے ہیں ایامِ فراق

چھپ رہا ہے اُس کے پردے میں اک ایسا آفتاب
پھر طلوعِ صبحِ محشر تک نہیں جس کا جواب

اپنے بدقسمت ستاروں کو سُلا اے آسماں
سو چکا کیا ہے، صفِ ماتم بچھا اے آسماں

جا رہا ہے بختِ روشن پھر نہ واپس آئے گا
کون دنیا میں ترے اقبال کو چمکائے گا

بے زباں تاروں کی عشرت کیا ہے بزمِ خواب ہے
یہ چمک کچھ بھی نہیں ہے آنسوؤں کی آب ہے

آہ وہ خرمن جہاں سے جھولیاں بھرتے تھے یہ
جس شعاعِ نور سے کسبِ ضیا کرتے تھے یہ

آج وہ خورشیدِ عالم تاب خود گہنا گیا
چشمۂ آبِ بقا تاریکیوں میں آ گیا

مادرِ گیتی سیہ پوشی کی تیاری کرے
میتِ فرزند پر ماتم کرے زاری کرے

اے عروسِ زندگانی لُٹ گیا تیرا سُہاگ
سرد کر ڈالی قضا نے سینۂ الفت کی آگ

اے دلہن زیور بڑھا دے اوڑھ لے چادر سیاہ
ہم کنارِ مرگ ہے تیرا شہِ خاور سیاہ

پتلیوں میں آ بسی جانِ گرامی دیکھ لے
پھر نہ دیکھے گی کبھی شانِ گرامی دیکھ لے

ہے لباسِ شعر خونِ آرزو سے لالہ زار
قبر ہے رنگینیوں کی یادگارِ آمی کا مزار

اُٹھ گیا دن کا عمل، رات آ گئی، خاموش رات
اک بھیانک رات، اندھی رات، ماتم پوش رات

اے نگاہِ حسن جا اپنے سیہ خانے میں بیٹھ
سُرمگیں پلکیں جھکا لے بند کاشانے میں بیٹھ

اڑ گیا اے حسن تصویرِ وفاداری کا رنگ
عشق کے جذبات میں آیا ہوس کاری کا رنگ

ہر طرف تاریکیاں چھائیں اُجالا چھُپ گیا
تیری عصمت کی گواہی دینے والا چھُپ گیا

اے جنونِ عشق داماں و گریباں چاک کر
اپنے ہاتھوں اپنی ہستی کو سپردِ خاک کر

اب تری تصویرِ وحشت پیکرِ بے رنگ ہے
مٹ گئی دنیائے دل میدانِ ہستی تنگ ہے

اب نمائش چاہتا ہے دیدۂ نظارہ بیں
اب کسے آئے گا تیری پاکبازی کا یقیں

اے زبانِ شوق تیری شعلہ گفتاری گئی
اے متاعِ ذوق تیری گرم بازاری گئی

دن ڈھلے ہی بلبلِ باغِ سخن کے ہم صفیر
ہو چکے ہیں اپنے اپنے آشیانوں میں اسیر

اب یہاں موجِ شمیمِ جاں فزا آئے تو کیوں
نالۂ جاں کاہ بلبل کی صدا آئے تو کیوں

اب گلستانِ سخن اُجڑا ہوا ویرانہ ہے
سرد، بے دل، بے زباں آہوں کا ماتم خانہ ہے

اب صبا آتی ہے تھراتی ہوئی ڈرتی ہوئی
رنگ کی بے مائگی پر سسکیاں بھرتی ہوئی

اے تکلم چپ نہ ہو اک آخری فریاد کر
قبر کی خاموش دنیائے سخن ایجاد کر
ہو گئے خاموش ہنگامے تری آواز کے
اب نہ چھیڑے گا مغنی تار تیرے ساز کے

سو گئے میٹھی نیند شور انگیز افسانے ترے
اٹھ گیا پیر مغاں خالی ہیں پیمانے ترے
اب تخیل میں بھرے گا زندگی کے رنگ کون
شعلہ بن کر آب ہو جائے گا زیب سنگ کون

بن گئی رنگینیِ گفتار تصویر خموش
گوشۂ فردوس میں پنہاں ہوا فردوس گوش
رہ گیا رنگِ سخن اترے ہوئے پھولوں کی باس
کون پہنائے گا اب صورت کو معنی کا لباس

ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح

(مولانا محمد علی قدس سرہٗ کی وفات پر)

غضب تھا اک شکستہ ناؤ کا منجدھار میں پھنسنا
وفا کی سسکیاں قسمت کا رونا موت کا ہنسنا
فقط اک "سر پھرا" ملاح طوفانوں سے لڑتا تھا
ہوا کے آب کے جنوں سے شیطانوں سے لڑتا تھا

اگرچہ ناؤ میں انبوہ در انبوہ انساں تھے
یہ سب ملاح کے ہم قوم تھے سچے مسلماں تھے
یہ سب تھے عقل و جرأت میں ارسطو اور اسکندر
مگر آرام سے لیٹے ہوئے تھے ناؤ کے اندر

چلی جاتی تھی کشتی خشمگیں موجوں سے ٹکراتی
ابھرتی، بیٹھتی، دبتی، دباتی اور جھلاتی
کہیں گرداب کے منہ میں کہیں پرشور دھارے پر
کبھی اس کے اشارے پر کبھی اس کے اشارے پر

وہ چلاتا تھا، اُٹھو بھائیو، آؤ ادھر آؤ
ذرا ہمت دکھاؤ دست و بازو کام میں لاؤ

ادھر سیلاب پھر آتا ہوا معلوم ہوتا ہے
ادھر گرداب بل کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے
نہیں ہنگام سونے کا کھڑے ہو جاؤ تن جاؤ
حوادث کے مقابل آہنی دیوار بن جاؤ

وہ چلایا، وہ چیخا، منتیں کیں آہ و زاری کی
مگر بے سود تھا سب کچھ کسی نے بھی نہ یاری کی
نہ آمادہ ہوا کوئی بھی جرأت آزمائی پر
سبھی ہنستے رہے ملاح کی "ہرزہ سرائی" پر
بلاتا تھا وہ نام غیرت اسلام سے لے کر
جھڑک دیتے تھے لیکن سب اسے دشنام دے دے کر

موت کا قافلہ

آتی ہے آواز درا　　یہ قافلہ ہے موت کا
دیکھو وہ گرد اُڑتی ہوئی　　افلاک پر چڑھتی ہوئی

ہر موڑ پر مڑتی ہوئی
ہر سمت کو بڑھتی ہوئی
آہوں کے ڈیرے ساتھ ہیں　　گہرے اندھیرے ساتھ ہیں
حسرت بھری خاموشیاں　　ہیں ساتھ ساتھ اس کے رواں
یہ قافلہ ہے موت کا
آتی ہے آواز درا

پنجے درندوں کی طرح　　بازو پرندوں کی طرح
ہے ہڈیوں کے ڈھانچ پر　　افسردگی لپٹی ہوئی
ڈائن کی صورت سر بسر
آزردگی لپٹی ہوئی
آنکھیں ہیں پتھرائی ہوئی　　مُردہ دلی چھائی ہوئی
پچکے ہوئے سے گال ہیں　　بکھرے ہوئے سے بال ہیں
بازو پرندوں کی طرح
پنجے درندوں کی طرح

اس کے جلو میں ہیں رواں　　گل پیرہن بانکے جواں
بوڑھے بھی ہیں بچے بھی ہیں　　ہیں عورتیں بھی مرد بھی
جھوٹے بھی ہیں سچے بھی ہیں
احرار بھی دل سرد بھی
خاطی بھی ہیں معصوم بھی　　مسرور بھی مغموم بھی
مجبور بھی مختار بھی　　مفلوک بھی زردار بھی
گل پیرہن بانکے جواں
اس کے جلو میں ہیں رواں

شہیدوں کی عید

فرض پورا کر چکے، فرصت ملی ہر کام سے
مقبروں میں سو رہے ہیں آج کیا آرام سے

صبح کی صورت اُٹھے تھے رات کے آغوش سے
ہو گیا زندہ عمل کا جوش ان کے جوش سے

اُن کا اٹھنا تھا کہ تقدیرِ اخوت جاگ اٹھی
خوابِ غفلت میں پڑی تھی آدمیت جاگ اٹھی

ان سروں پہ سایہ افگن تھا علَم اسلام کا
ان لبوں پر وِرد تھا اللہ کے پیغام کا

آیۂ رحمت تھے یہ سارے زمانے کے لئے
آئے تھے اُجڑی ہوئی دنیا بسانے کے لئے

ہو گئیں آباد ان کے نام سے آبادیاں
رشکِ جنت بن گئیں ان کے لہو سے وادیاں

بام و در، کہسار و میداں خشک و تر پست و بلند
ہو گئے اللہ والوں کی صدا سے بہرہ مند

زندگی میں بس گئے آباد کاروں کی طرح
زیست کی مدت گذاری روزہ داروں کی طرح

پیکرِ ہستی میں جب رُوحِ محبت بھر چکے
آئے تھے جس کام کو وہ کام پورا کر چکے

آخر اُن کی عمر کا دن ڈھل گیا شام آ گئی
یعنی صبحِ عید کا شب لے کے پیغام آ گئی

آخری روزہ کیا افطار حق کے نام پر
بہرِ اظہارِ اطاعت جھک گئے سجدوں میں سر

قبلہ رُو ہو کر مصلّوں پر نمازی سو گئے
فتح کر کے جنگ کو مردانِ غازی سو گئے
رات ان کی ہے کہ روزِ عیش کی تمہید ہے
ان شہیدوں کے لئے صبحِ قیامت عید ہے

میرا سلام لے جا

قسمت کے آسماں پر ... سیمائے کہکشاں پر
چمکا ترا ستارا
اُس در پہ حاضری کا ... تجھ کو ہوا اشارا
اے بختیار بندے
اے کامگار بندے
تیری مرادمندی ... تقدیر کی بلندی
تجھ کو پکارتی ہے
آ باریاب ہو جا
اے ذرۂ محبت ... جا آفتاب ہو جا
دربار میں چلا ہے
سرکار میں چلا ہے
رختِ سفر اٹھا لے
اللہ کے حوالے
یثرب کے جانے والے
بس اک پیام لے جا
میرا سلام لے جا

تین نغمے

ہم نوا کوئی نہ پایا جب زمیں کے فرش پر
میرا نغمہ لے چلا مجھ کو اڑا کر عرش پر
ظلمتِ ابلیس کی راہوں سے کتراتا ہوا
بندگی کے گیت اپنے رنگ میں گاتا ہوا
جادۂ پامالِ مہر و ماہ طے کرتا ہوا
مہ بہ مہ انجم بہ انجم راہ طے کرتا ہوا
کہکشاں تا کہکشاں بڑھتا گیا بڑھتا گیا
آسماں تا آسماں چڑھتا گیا چڑھتا گیا

دو فرشتے ساتھ چلتے چلتے آخر رہ گئے
لے بشر اب تیری جرأت ہے یہ نقرہ کہہ گئے

چلتے چلتے ایک ندی راہ میں حائل ہوئی
میرے ارمانوں کی منزل گاہ میں حائل ہوئی
ہلکی ہلکی پُرسکوں لہروں میں لہراتی ہوئی
میٹھے میٹھے گیت ٹھنڈی ریت کے گاتی ہوئی
لہریا آبی دوپٹا تا کمر لپٹا ہوا
دامنوں سے دامنِ شام و سحر لپٹا ہوا

نازنیں شاخیں لچکتیں سرسراتیں جھومتیں
اپنے اپنے عکس کا منہ آئینے میں چومتیں

پھول سے کانٹا حسیں معلوم ہوتا تھا یہاں
سبزہ بیگانہ نہیں معلوم ہوتا تھا یہاں

پاؤں پھیلا کر خنک ندی میں سر دُھننے لگا
آبِ جُو کا نغمۂ جادو اثر سننے لگا

یہ عجب نغمہ تھا اطمینان بخش و بے خروش
یہ عجب نشہ تھا جس میں کوئی بے تابی نہ جوش

نغمہ کیا تھا حدتِ خوں کے لئے برف آب تھا
یا تھکے ماندوں کی بستی میں نفیرِ خواب تھا

نغمہ خواب آور تھا، نیند آنے لگی، میں سو گیا
اپنی منزل بھول کر اس رنگ و بو میں کھو گیا

پھول تھے خوشبو تھی نشہ تھا، فضا تھی میں نہ تھا
ساز کی دھڑکن تھی، نغمے کی صدا تھی، میں نہ تھا
میری اپنی روح کے نغمے کی لے گم ہو گئی
قلب کو گرمانے والی کوئی شے گم ہو گئی

تازیانہ بن گیا بہرِ عمل یہ انفعال
دفعتاً پیدا ہوا خود اعتمادی کا خیال
جاگ اٹھا میں اور کنارے ہی کنارے چل پڑا
سرنگوں ملوارے ہوئے دل کے سہارے چل پڑا

سامنے دیکھا تو اک دریا نظر آیا مجھے
میری منزل آ گئی ایسا نظر آیا مجھے

پھر مرے ذوقِ عمل کو اک سہارا مل گیا
وہ کنارا مجھ سے چھوٹا یہ کنارا مل گیا
ہاں یہ دریا تھا مگر دریائے ناپیدا کنار
خوش نما، پرہول، نغمہ آفریں اور پُروقار

سازِ قدرت واصلِ مضراب تھا دریا نہ تھا
اک مسلسل نغمۂ بے تاب تھا دریا نہ تھا

جس طرح آجائے پیاسا ساحلِ مطلوب پر
یا اچانک کوئی جا پہونچے درِ محبوب پر
اب یہ طوفانِ حیات افزا تھا میرے سامنے
نغمۂ اقبال کا دریا تھا میرے سامنے
درد کی چیخیں اٹھیں میرے شکستہ ساز سے
آب دیدہ ہو گیا دریا میری آواز سے
میرا نغمہ، نغمۂ دریا سے کم آواز تھا
ہاں مگر ہم رنگ و ہم آہنگ و ہم آواز تھا
ہوش نے چاہا کہ فکرِ خود فراموشی کروں
قطرہ ہوں دریا سے مل جاؤں ہم آغوشی کروں
اپنی ہستی کا ابھی تک تھا مگر دھوکا مجھے
شوق نے آگے بڑھایا ضبط نے روکا مجھے

کنجوس سرمایہ دار

آنکھیں اندھی، دل بھی اندھا، اندھی تیری قسمت بھی
تیرصفت گھر میں بھی اندھیرا، اندھی ہے یہ دولت بھی

ظالم تیرے ہاتھوں نے مسکینوں کے دل توڑے ہیں
ظلم کئے ہیں، حق چھینے ہیں، تب یہ پیسے جوڑے ہیں

لعنت دنیا بھر کی تو نے خوب اکٹھی کر لی ہے
لاکھوں جیبیں خالی کر کے اپنی تھیلی بھر لی ہے

مال خزانہ پاس ہے تیرے لیکن اطمینان نہیں
اطمینان کہاں سے آئے جب دل میں ایمان نہیں

یہ بے فیض خزانہ تیرا، تیرے کام نہ آئے گا
تو نے دنیا کو ترسایا، یہ تجھ کو ترسائے گا

چین تری تقدیر میں ہرگز او سرمایہ دار نہیں
مزدوروں کی چیخیں ہیں اشرفیوں کی جھنکار نہیں

تنہائی میں اندیشوں کے بھوت ستاتے ہیں تجھ کو
تیری دولت چھیننے والے ہاتھ ڈراتے ہیں تجھ کو

تھیلی کھول کے ہو جاتا ہے حال بُرا ہر بار ترا
کر دے گی یہ دولت آخر اک دن "بیڑا پار" ترا

غزلیں

(۱)

وہ سحر خوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے
مرے خیالوں میں رنگ بھر دے مرے لہو کو شراب کر دے

حقیقتیں آشکار کر دے، صداقتیں بے حجاب کر دے
ہر ایک ذرہ یہ کہہ رہا ہے کہ آ مجھے آفتاب کر دے
یہ خوب کیا ہے، یہ زشت کیا ہے، جہاں کی اصلی سرشت کیا ہے؟
بڑا مزا ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے
کہو تو رازِ حیات کہہ دوں، حقیقتِ کائنات کہہ دوں
وہ بات کہہ دوں کہ پتھروں کے جگر کو بھی آب آب کر دے
خلافِ تقدیر کر رہا ہوں، پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں
پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں، خدا اگر کامیاب کر دے
ترے کرم کے معاملے کو ترے کرم ہی پہ چھوڑتا ہوں
مری خطائیں شمار کر لے، مری سزا کا حساب کر دے
حفیظ سب سے بڑی خرابی ہے عشق میں لطف کامیابی
کسی کی دنیا تباہ کر دے، کسی کی عقبیٰ خراب کر دے

---

(۲)

مل جائے مے تو سجدۂ شکرانہ چاہئے
پیتے ہی ایک لغزشِ مستانہ چاہئے
ہاں احترامِ کعبہ و بت خانہ چاہئے
مذہب کی پوچھئے تو جداگانہ چاہئے
رندانِ مے پرست سیہ مست ہی سہی
اے شیخ گفتگو تو شریفانہ چاہئے
دیوانگی ہے عقل نہیں ہے کہ خام ہو
دیوانہ ہر لحاظ سے دیوانہ چاہئے
اس زندگی کو چاہئے سامانِ زندگی
کچھ بھی نہ ہو تو شیشہ و پیمانہ چاہئے

او ننگِ اعتبار، دعا پر نہ رکھ مدار
او بے وقوف! ہمتِ مردانہ چاہیے
رہنے دے جامِ جم مجھے انجامِ جم سنا
کھل جائے جس سے آنکھ وہ افسانہ چاہیے

---

(۳)

نہ کر دل جوئی اے صیاد میری
کہ فطرت ہے بہت آزاد میری
اسیری سے رہائی پانے والو
تمہیں پہونچے مبارک باد میری
سہارا کیوں لیا تھا ناخدا کا
خدا بھی کیوں کرے امداد میری
بھلا دو مجھ کو لیکن یاد رکھنا
ستائے گی تمہیں بھی یاد میری
فرشتے کیا مرتب کر سکیں گے
بہت بے ربط ہے روداد میری
پسند آنے لگی تھی سر بلندی
یہی تھی اوّلیں افتاد میری
کیا پابند نے نالے کو میں نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری
مرے اشعار پر چپ رہنے والے
ترے حصے میں آئی داد میری
خداوندا قضا نے چھین لی ہے
مرے آغوش سے ارشاد میری

(۴)

اے دوست مٹ گیا ہوں فنا ہو گیا ہوں میں
اس دردِ دوستی کی دوا ہو گیا ہوں میں

قائم کیا ہے میں نے عدم کے وجود کو
دنیا سمجھ رہی ہے فنا ہو گیا ہوں میں

ہنسنے کا اعتبار نہ رونے کا اعتبار
یہ زندگی ہے جس پہ فدا ہو گیا ہوں میں

ہمت بلند تھی، مگر انتہا دیکھنا
چپ چاپ آج محوِ دعا ہو گیا ہوں میں

ناآشنا ہیں رتبۂ دیوانگی سے دوست
کم بخت جانتے نہیں کیا ہو گیا ہوں میں

یہ زندگی فریبِ مسلسل نہ ہو کہیں
شاید اسیرِ دامِ بلا ہو گیا ہوں میں

اُٹھا ہوں اک جہان خوشی لئے ہوئے
ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدا ہو گیا ہوں میں

ہاں کیفِ بےخودی کی وہ ساعت بھی یاد ہے
محسوس ہو رہا تھا خدا ہو گیا ہوں میں

(۵)

مٹنے والی حسرتیں ایجاد کر لیتا ہوں میں
جب بھی چاہوں اک جہاں آباد کر لیتا ہوں میں

مجھ کو ان مجبوریوں پر بھی ہے اتنا اختیار
آہ بھر لیتا ہوں فریاد کر لیتا ہوں میں

حسن بےچارہ تو ہو جاتا ہے اکثر مہرباں
پھر اسے آمادۂ بیداد کر لیتا ہوں میں

تو نہیں کہتا، مگر دیکھ او وفا نا آشنا
اپنی ہستی کس قدر برباد کر لیتا ہوں میں
ہاں یہ ویرانہ، یہ دل، یہ آرزوؤں کا مزار
تم کہو تو پھر اسے آباد کر لیتا ہوں میں
جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے حفیظ
ایک عادت ہے خدا کو یاد کر لیتا ہوں میں

(۶)

چاند اور ستاروں کا یہ سماں کیا دلکش اور سہانا ہے
افسوس مجھے نیند آئی ہے، افسوس مجھے سو جانا ہے
اک روز مجھے اس کوچے میں ناصح کو لے کر جانا ہے
کچھ دل کو راہ پہ لانا ہے، کچھ دلبر کو سمجھانا ہے
معصوم اُمنگیں جھول رہی ہیں دلداری کے جھولوں میں
یہ کچی کلیاں کیا جانیں کب کھلنا کب مُرجھانا ہے
دل شیشہ بنے پیمانہ بنے ہم دل کی حقیقت جانتے ہیں
بے رنگ سا اک قطرہ ہے جسے آنسو بن کر بہہ جانا ہے
بازارِ دنیا کا ہک بھی نئے اب جنسِ وفا کی قدر نہیں
بے سود نمائش رہنے دے لے دل یہ مال پرانا ہے
اے طائرِ جاں کچھ روز ابھی اڑنے کی ہوس میں رہنا ہے
اس تنگ قفس میں رہنا ہے دکھ سہنا ہے غم کھانا ہے

(۳)

تلخابۂ شیریں

غزلیں

(۱)

تُوہی بھروسا، تُوہی سہارا — پروردگارا، پروردگارا
منظور، منظور اے اہلِ دنیا — اللہ میرا، باقی تمہارا
یوں میں نے جیتی الفت کی بازی — اک بار کھیلا، سو بار ہارا
حاضر ہوں میں بھی حاضر ہے دل بھی — دل بھی تمہارا، میں بھی تمہارا
یہ نا خدا ہے اے اہلِ کشتی! — شاید کسی وقت کرے کنارا
سیراب کر دے دنیا میں ساقی — عقبیٰ کی تلخی مجھکو گوارا
روئے فلک پر چھائی سفیدی — چمکا ہے شاید میرا ستارا
آنکھوں میں آنسو، لب پر تبسم — اُن کا تصوّر، اپنا نظارا
جینا پڑے گا اے جانِ شیریں — کرنا پڑے گی تلخی گوارا
مٹی کے پُتلے کیا چاہتا ہے — بختِ سکندر یا تختِ دارا
عفو و خطا میں ضد ہو گئی تھی — وہ بھی نہ ہارے میں بھی نہ ہارا

پھر یہ جہنم کس کے لئے ہے
آمرزگارا - آمرزگارا

(۲)

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے
تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نہ تمہیں بھلا سکے

تم ہی نہ سن سکے اگر، قصۂ غم سنے گا کون
کس کی زباں کھلے گی پھر، ہم نہ اگر سنا سکے

ہوش میں آ چکے تھے ہم، جوش میں آ چکے تھے ہم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اٹھا سکے

رونق بزم بن گئے، لب پہ حکایتیں رہیں
دل میں شکایتیں رہیں لب نہ مگر ہلا سکے

شوق وصال ہے یہاں لب پہ سوال ہے یہاں
کس کی مجال ہے یہاں ہم سے نظر ملا سکے

ایسا ہو کوئی نامہ بر، بات پہ کان دھر سکے
سُن کے یقین کر سکے جا کے انہیں سُنا سکے

عجز سے اور بڑھ گئی برہمیٔ مزاج دوست
اب وہ کرے علاج دوست جس کی سمجھ میں آ سکے

اہل زباں تو ہیں بہت، کوئی نہیں ہے اہل دل
کون تری طرح حفیظ درد کے گیت گا سکے!

(۳)

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں
وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں

بلا کافی نہ تھی اک زندگی کی
دوبارا یاد فرمایا گیا ہوں

برنگ لالۂ ویرانہ بے کار
کھلایا اور مرجھایا گیا ہوں

اگرچہ ابرِ گوہر بار ہوں میں
مگر آنکھوں سے برسایا گیا ہوں

فرشتے کو نہ میں شیطان سمجھا
نتیجہ یہ کہ بہکایا گیا ہوں

کوئی صنعت نہیں مجھ میں تو پھر کیوں
نمائش گاہ میں لایا گیا ہوں

مجھے تو اس خبر نے کھو دیا ہے
سُنا ہے میں کہیں پایا گیا ہوں

حفیظؔ اہلِ زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

(۴)

مرے مذاقِ سخن کو سخن کی تاب نہیں
سخن ہے نالۂ دل نغمۂ رباب نہیں

اگر وہ فتنہ کوئی فتنۂ شباب نہیں
تو حشر میرے لئے وجہِ اضطراب نہیں

نہیں ثواب کی پابند بندگی میری
یہ اک نشہ ہے جو آلودۂ شراب نہیں

مجھے ذلیل نہ کر عذرِ لن ترانی سے
یہ اہلِ ذوق کی توہین ہے جواب نہیں

جو کامیابِ محبت ہو سامنے آئے
میں کامیاب نہیں ہاں میں کامیاب نہیں

قفس میں زمزمہ پیرا ہے روحِ آزادی
صدائے مرغِ قفس ہے نفیرِ خواب نہیں

اسی کی شرم ہے میری نگاہ کا پردہ
وہ بے حجاب سہی میں تو بے حجاب نہیں

سنا ہے میں نے بھی ذکرِ بہشت و جور و طہور
خدا کا شکر ہے نیت مری خراب نہیں

سخنورانِ وطن سب ہیں آفتاب کمال
تو کیوں کہوں کہ میں ذرہ ہوں آفتاب نہیں

بیانِ درد کو دل چاہیے جناب حفیظ
فقط زبان یہاں قابلِ خطاب نہیں

(۵)

حسن پابندِ رضا ہو، مجھے منظور نہیں
میں کہوں، تم مجھے چاہو، مجھے منظور نہیں

شرط اظہارِ ندامت ہے جو بخشش کے لئے
اے جزا تیری کے گنا ہو مجھے منظور نہیں

حسن والے مرے قاتل ہیں یہ دعویٰ ہے مرا
حسن والوں کو سزا ہو مجھے منظور نہیں

جس نے اس دور کے انسان کئے ہیں پیدا
وہی میرا بھی خدا ہو مجھے منظور نہیں

حشر کے دن مجھے بچ کہنے کی توفیق نہ دے
کوئی ہنگامہ بپا ہو مجھے منظور نہیں

دوستوں کو بھی ملے درد کی دولت یارب
میرا اپنا ہی بھلا ہو مجھے منظور نہیں

اب کوئی راز نہیں اب سے مرا محرمِ راز
کوئی بھی میرے سوا ہو مجھے منظور نہیں

جلوے لاکھوں ہیں خدا ایک ہے اے سجدۂ شوق
ہر قدم لغزشِ پا ہو مجھے منظور نہیں

مجھ کو اے کاتبِ تقدیر تماشا نہ بنا
عشق چہرے پہ لکھا ہو مجھے منظور نہیں

یہ بُری بات ہے، ترغیبِ گُنہ دل کو نہ دو
میری معصوم نگاہ ہو، مجھے منظور نہیں

اے بتو تم پہ اندھا دُھند مَرے خلقِ خدا
اور خدا دیکھ رہا ہو مجھے منظور نہیں

حرم و دیر کو بندوں سے ہے جو کچھ منظور
یہی منظورِ خدا ہو مجھے منظور نہیں

تیرے کردار سکندر تیری رفتار خضر
تو مرا راہ نما ہو مجھے منظور نہیں

خفگی مے کدے والوں کی الٰہی توبہ!
کوئی خوش ہو کہ خفا ہو مجھے منظور نہیں

(۶)

نہ پیتا ہوں نہ پینا چاہتا ہوں
سخن کا اک قرینہ چاہتا ہوں

نگاہ و دل کی یک رنگی تھی درکار
وہ سمجھے جام و مینا چاہتا ہوں

مرا مقصود پردہ ہے نہ جلوہ
فروغِ چشمِ بینا چاہتا ہوں

نہ توڑو دوستو رشتہ وفا کا
میں دل کے زخم سینا چاہتا ہوں

ابھی باقی ہے معیارِ مصیبت
ابھی کچھ اور جینا چاہتا ہوں
حفیظ اس کا سبب مجھ سے نہ پوچھو
مگر میں آج پینا چاہتا ہوں

(۷)

ناکامیٔ عشق یا کامیابی
دونوں کا حاصل خانہ خرابی
آنکھیں سیہ مست چہرہ کتابی
بادہ شبانہ جام آفتابی
پھولوں میں دو پھول رنگوں میں دو رنگ
لب لعل نابی عارض گلابی
دنیا و دیں سے بیگانہ ہو جا
دیوانہ ہو جا بن جا شرابی
اُن کا بہانہ برجستہ گوئی
میرا تبسم حاضر جوابی
دیندار کر دے کافر بنا دے
یہ پردہ داری یہ بے حجابی
ہیں تختِ دل پر سرکار ورنہ
تختہ اُلٹ دیں ہم انقلابی
درباں سے ہوں دست و گریباں
الحمدللہ یہ باریابی !!

رُت سنگیت

(گیت)

تیری منزل دُور

مناظرِ آب و گل سے

تیری منزل
دُور
مُسافر
تیری منزل دُور
نظارے اس آب و گِل کے
رہزن ہیں تیری منزل کے
نغمہ ہو یا رنگِ گل ہو
سب پردے ہیں نگاہ و دل کے
تو ہے طالبِ نُور،
مُسافر
تیری منزل دُور

دل بستگی سے

تیری منزل
دُور
مسافر
تیری منزل دور
لیلیٰ کے محمل سے نکل جا
شیریں کی محفل سے نکل جا

حسن و ادا دونوں کے در پر
دل رو کے تو دل سے نکل جا
دل سے نہ ہو مجبور
مُسافر
تیری منزل دُور

حور و قصور سے

تیری منزل
دُور
مُسافر
تیری منزل دُور
جس میں نہ ہو چلنے کا یارا
وہ کرلے جنّت کو گوارا
شیخ کو لینے دے یہ سہارا
یہ بے چارہ ضعف کا مارا
حُور سے ہے مسرور
مُسافر
تیری منزل دور

عکسِ تجلی سے

تیری منزل
دُور
مُسافر
تیری منزل دور
راہ میں حائل کوہِ سینا
جس کی چوٹی پہلا زینہ

دل آئینہ ہے تو تجھ پر
جھلکیں گے انوارِ مدینہ
بجلیوں میں مستور
مُسافر
تیری منزل دُور

منجدھار

کامی کھیونہار

جھوٹا سب سنسار
پیارے
جھوٹا سب سنسار
موہ کا دریا، لوبھ کی نیّا
کامی کھیونہار
موج کے بل پر چل نکلے تھے
آن پھنسے منجدھار
پیارے
جھوٹا سب سنسار

دُھن کی دُھن اسوار

جھوٹا سب سنسار
پیارے
جھوٹا سب سنسار
تن کے اُجلے، من کے میلے
دُھن کی دُھن اسوار

اوپر اوپر راہ بتائیں
اندر سے بٹ مار
پیارے
جھوٹا سب سنسار

درشن درشن

درشن درشن میرا
بس
درشن درشن میرا
مالی لاکھ کرے رکھوالی
بھونرا گونجے ڈالی ڈالی
پھول پھول پر ڈیرا
بس
درشن درشن میرا
ہر کوئی ہے قید قفس میں
بلبل رنگ میں مکھی رس میں
اپنا من ہے اپنے بس میں
جوگی والا پھیرا
بس
درشن درشن میرا

- - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - -

افرنگ کی دُنیا

(نظمیں)

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

سنہ ۳۸ء میں یہ نظم لندن کے اورسیز ہال میں ہندوستانی اور انگریز مرد عورتوں کے ایک بڑے اجتماع میں میں نے سُنائی تھی۔ لارڈ لیمنگٹن جو بمبئی کے گورنر رہ چکے تھے جلسہ کے صدر تھے۔ سر عبدالقادر اشعار کا ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ ہندوستانی نظم سُن کر رو پڑے تھے۔ (حفیظ)

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

حُسن و نظر کی　　خاموش گھاتیں
عشق و ہوس کی　　دُھومیں براتیں
سب ہیں وہاں بھی　　یہ واردا تیں
دیکھی نہیں کیا　　تو نے وہ راتیں

دولہا دلہن جب
کرتے ہیں باتیں
ہنستی ہیں کلیاں　　کھلتے ہیں تارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن کے　　دن رات نیارے
وہ چاند سُورج　　نوری غبارے
وہ ندیاں ہیں　　امرت کے دھارے

دنیا سے اُونچے　　پربت ہمارے
باغ اور آکاش
پھول اور تارے
سب منتظر ہیں　　میرے تمہارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے
وہ سیدھی سادی　　بچّوں کی مائیں
زلفیں ہیں جن کی　　کالی گھٹائیں
آنچل ہیں جن کے　　ٹھنڈی ہوائیں
بھولو گے کب تک　　اُن کی وفائیں
کب تک کرو گے
اُن پر جفائیں
چھوڑا ہے اُن کو　　کس کے سہارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے
ماضی سے بہتر　　بے شک نہیں حال
علم و ہنر کا　　پھر بھی نہیں کال
ٹیگور کا ساز　　جادوئے بنگال
پنجاب کا ناز　　اعجازِ اقبال
اور یہ مسافر

آوارہ، پامال
ہیں قابلِ دید سارے کے سارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

(سنہ ۳۸ء)

نیرنگِ فرنگ

نیرنگِ طلسمات ہے افرنگ کی دنیا
قسمت نے دکھائی یہ نئے رنگ کی دنیا
رقص و طرب و نغمہ و آہنگ کی دنیا
ہنگامہ و ہول و فتن و جنگ کی دنیا

فردوس بھی ہے خوف سے خالی بھی نہیں ہے
اصلی جو نہیں ہے تو خیالی بھی نہیں ہے

رنگینیٔ گُل، بارِ شجر دیکھ رہا ہوں
حسنِ عمل و حسنِ نظر دیکھ رہا ہوں
ہر سمت فراوانیٔ زر دیکھ رہا ہوں
سرمایہ و محنت کا اثر دیکھ رہا ہوں

اس عقل نے بہت سے بڑا کام لیا ہے
تکلیف اٹھائی ہے تو آرام لیا ہے

آفاق پُر از فتنہ و شر دیکھ رہا ہوں
یہ روز و شب و شام و سحر دیکھ رہا ہوں
قوموں کی ہلاکت کا ہُنر دیکھ رہا ہوں
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

جو دیکھ رہا ہوں وہ بیاں ہو نہیں سکتا
آنکھوں سے کبھی کارِ زباں ہو نہیں سکتا

مٹی ہی نہیں آگ بھی پانی بھی ہوا بھی
مغلوب نظر آتے ہیں زنجیر بہ پا بھی
اک زلزلہ ہے زیرِ زمیں، زیرِ سما بھی
حیران فرشتے بھی ہیں شاہد ہے خدا بھی

دیوار شکستہ ہوئی زندانِ بقا کی
انسان کے پنجے میں ہے تقدیر فنا کی

مشرق میں جو زینت ہے چھپانے کے لئے ہے
مغرب میں مگر جلوہ دکھانے کے لئے ہے
مشرق میں تو زن گھر ہی بسانے کے لئے ہے
مغرب میں یہ بےچاری کمانے کے لئے ہے

آزاد...! معیشت کے سرانجام کی خاطر
مجبور ہے معصوم...! ہر اک کام کی خاطر

تفریح بدن کرتی ہیں لندن کی دکانیں
ہیرے کے یہ بازو ہیں یہ بلّور کی رانیں
پلکیں ہیں یہ تیر اور یہ ابرو ہیں کمانیں
آئینوں میں آئینہ ہیں جوبن کی اٹھانیں

یہ جلوہ مذمت نہ ستائش کے لئے ہے
بیوپار کی خاطر ہے نمائش کے لئے ہے

مہلک ہیں یہ سب رہگذر و کوچہ و بازار
ہر گام پہ صد فتنۂ محشر ہے نمودار
ایمان تو کیا جان کا بچنا بھی ہے دشوار
آنکھوں سے بھی ہشیار رہو دل سے بھی خبردار

اے دوست خطرناک ہے افتادِ نظر کی
پھسلا جو قدم خیر نہیں کاسۂ سر کی
اس حسن کے انبوہِ قیامت کو تو دیکھو
اس ناز و ادا و قد و قامت کو تو دیکھو
میں دیکھ رہا ہوں مری شامت کو تو دیکھو
نادار مسافر کی ندامت کو تو دیکھو
خفت وہ ملی ہے کہ اُٹھائی نہیں جاتی
دل خاک ملے، آنکھ ملائی نہیں جاتی

(سنہ ۱۹۳۸ء)

محض بہرِ ضحکہ

(لندن کے ایک اسٹوڈیو میں)

لندن کے ایک اسٹوڈیو میں مجھے ایک لیڈی آرٹسٹ کو کام کرتے ہوئے دیکھنے کے لئے جایا گیا۔ وہاں ایک پشاوری جو کسی کرنیل کا بیرا تھا اور کرنیل کے بیوی بچوں کے ساتھ لندن گیا ہوا تھا، اسٹوڈیو میں بیٹھا تھا اور لیڈی آرٹسٹ اس کی تصویر پینٹ کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر کہ ہمارے مُلک کی ہنسی اڑانے کے لئے یہ تصویر بنائی جا رہی ہے مجھ پر گہرا اثر ہوا۔ اِس نظم میں وہی تاثرات پیش کئے گئے ہیں۔ (حفیظ)

موقلم کی جُنبشیں
یہ ہاتھ — رنگ رنگ کی گُلکاریاں، سنوارتا نکھارتا ہوا
یہ سامنے نشستہ
اپنے گرسنہ شکم پہ دست بستہ ایک اجنبی
تیرے شاندار شہر میں نئی "گفرنٹ" کا یہ آدمی

کسی قدیم نسل اور وحشیانہ دور کا یہ فرد
میرے جنگ جُو قبائل وطن کا شیر مرد
جس کے سر پہ ہے بندھا ہوا
پشاوری مُشجّر کا ایک پارچہ
مٹے ہوئے سے رنگ کی کلاہِ زر نگار پہ
جبینِ نصف جس کے خم سے ہے ڈھکی ہوئی
ٹکے ہوئے ہیں جس پہ دو سیاہ ابروؤں کے شاہکار
جیسے در نیام منتظر ہوں بہر کار تیغ ہائے آب دار
جن کے تحت تابدار و دور بین و شعلہ ریز
اک عقاب کی نگاہ، بے پناہ و تند و تیز
اک نگاہ، جس کی قہرمانیوں کے سامنے
کبھی تھے گرد پردۂ یہ زمین و آسمان و مہر و ماہ
اور یہ انگارہ برق پارہ
یہ جمالِ رنگِ رُخ، جلالِ آفتابِ ضوفشاں
سیاہ ریش، جس کے سائے میں
حیاتِ تازہ کا دفینہ زیر سینہ ہے نہاں
اور مصوری کا یہ "سٹوڈیو"
تیرا "محملِ" خموش
جس میں آٹھ دس شلنگ کے عوض
تو نے لا کے بھر لیا ہے
ایشیا کے قلب کا خروش
محض بہر مضحکہ، محض بہر مضحکہ جسے
جگا رہی ہیں بار بار
تیرے مُو قلم کی جنبشیں ———! (سنہ ۶۲ء)

شکاری اور شکار

شیروں کو آزادی ہے

شیروں، سانپوں، شاہینوں، گھڑیالوں اور نہنگوں کی آزادی سنہ ۱۹۳۷ء میں لکھی گئی تھی۔ دنیائے انسانی کی آج کیا صورت حال ہے؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب شاید کوئی دوسرا شاعر لکھے۔ (حفیظ)

شیروں کو آزادی ہے
آزادی کے پابند رہیں
جس کو چاہیں چیریں پھاڑیں
کھائیں پئیں آنند رہیں

سانپوں کو آزادی ہے
ہر بستے گھر میں بسنے کی
ان کے سر میں زہر بھی ہے
اور عادت بھی ہے ڈسنے کی

شاہیں کو آزادی ہے
آزادی سے پرواز کرے
ننھی منی چڑیوں پر
جب چاہے مشق ناز کرے

پانی میں آزادی ہے
گھڑیالوں اور نہنگوں کو

جیسے چاہیں پالیں پوسیں
اپنی تند اُمنگوں کو

انساں نے بھی شوخی سیکھی
وحشت کے ان رنگوں سے
شیروں، سانپوں شاہینوں
گھڑیالوں اور نہنگوں سے

دیوانہ بکار
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

شعر کی تعریف میں یہ شرط بیان کی گئی ہے کہ اس کے موزوں ہونے میں شاعر کا ارادہ ضرور شامل ہو ــــ دورانِ سیاحت کشمیر ۳۱ اگست اور یکم ستمبر سن ۳۹ء کی درمیانی شب یہ نظم کاغذ پر لاتے ہوئے میں اس شرط کا پابند نہیں تھا ــــ لہٰذا مطمئن ہوں کہ یہ فقط دیوانے کی ہنسی ہے، یعنی بے معنی ــــ دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد اور حالات کے سبب ــــ میرے بہت سے سخن سنج احباب کو اس میں معنی ہی معنی نظر آئے۔ مجھے اس نظم کے بارے میں اُن کی سخن فہمی پر حُسنِ ظن کا شک ہے۔ (حفیظ)

(۱)

گرم جوشی

اب سورج سر پر آ دھمکے گا
ٹھنڈا لوہا چمکے گا

اور دھوپ جواں ہو جائے گی
سٹھیائے ہوئے فرزانوں پر
اب زیست گراں ہو جائے گی
ہر اصل عیاں ہو جائے گی
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

اب آگ بگولے ناچیں گے
سب لنگڑے لولے ناچیں گے
گرداب بلا بن جائیں گے
روندی ہوئی مٹی کے ذرے
طوفان بپا بن جائیں گے
صحرا دریا بن جائیں گے
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

زور آوری سے کمزوروں کی
اب جیب کٹے گی چوروں کی
اور منڈی ساہوکاروں کی
اک بھوکی "ہوحق" سیر کرے گی
منڈیوں اور بازاروں کی
گت دیکھ کے دنیا داروں کی
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

جینا، دل گردہ ڈھونڈے گا
ہر زندہ "مردہ" ڈھونڈے گا

کوئی کونا کھدرا تہہ خانہ
اب ہر جنگل میں منگل ہوگا
ہر بستی میں ویرانہ
اک نعرہ لگا کر مستانہ
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

---

(۲)

سرد مہری

اب جاڑا جھنڈے گاڑے گا
اور فیل فلک چنگھاڑے گا
اب بادل شور مچائیں گے
اب بھوت فلک پر چڑھ دوڑیں گے
دھرتی کو دہلائیں گے
ہنسنے کے مزے اب آئیں گے
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

ایوان کریں گے بھائیں بھائیں
پھونس کی جھونپڑیوں میں ہوائیں
سائیں سائیں گونجیں گی
اس گونج میں بھوکے ننگوں کی
سنسان صدائیں گونجیں گی
ویران سرائیں گونجیں گی
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

تخریب کی توپیں چھُوٹیں گی
تعمیر کی کلیاں پھوٹیں گی
ہر گورستانِ شاہی میں
بالائے ہوا، زیرِ دریا
غُل ہوگا مُرغ و ماہی میں
اِس نَو آباد تباہی میں
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

اب دال نہ جاگیروں کی گلے گی
آگ مگر دن رات جلے گی
چمڑے کے تنوروں میں
اب کال پڑے گا غلّے کا
بیوپاریوں سے مقدوروں میں
اور پیٹ بھرے مزدوروں میں
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

اب گاڑھا پسینہ پینے والے
اوڑھے پھریں گے شال دوشالے
مفت نہ چھُولیں جھولیں گی
پھُولے ہوئے گال اب پچکیں گے
پچکی ہوئی توندیں پھولیں گی
سب عقلیں چوکڑی بھولیں گی
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

کدھر جاتا ہے دیوانے

بہت سی بستیاں ہیں مسترستان سرد لاشوں کے
طلسمی کارخانے چلتی پھرتی زرد لاشوں کے

بہت سی وادیوں میں رنگِ ہستی ننگِ ہستی ہے
جہاں افتادہی افتادہے پستی ہی پستی ہے

بہت سی محفلیں ہیں سینہ تربانی کے عزاخانے
جہاں بے چارگی کہتی ہے محرومی کے افسانے

بہت سی خلوتوں میں جرم ہے اقدام سرگوشی
مسلسل ایک سناٹا مسلسل ایک خاموشی

بہت سے دل ہیں جن میں کوئی کروٹ نہ انگڑائی
بہت آنکھیں ہیں اب تک جن میں بینائی نہیں آئی

یہ لاتعداد فرزانے ہیں غیر آباد ویرانے
بہت سا کام باقی ہے کدھر جاتا ہے دیوانے

رومان و عرفان

نعرۂ تکبیر

دیکھ افق پر ہے ہویدا صبحِ صادق کا سپیدا
سُرخ، نیلے، کالے، پیلے بادلوں کو چیر کر
چھا رہی ہے پھر اُسی خورشید کی تابندگی
جس سے پیدا ہے ازل سے تا ابد، نورِ اللہ الصمد
مشرق و مغرب کی واحد زندگی

تفرقوں کے دشت میں کھوئے ہوئے سب کارواں
ہو رہے ہیں ہم رکاب و ہم عناں
اے بہانہ باز، حیلہ ساز، انبوہِ فراری
اختیاری ذلت و خواری پہ کب تک فخر و ناز!
دیکھ اپنا مٹ زمانہ چل رہے کس طرح شانہ بشانہ
دیکھ، اعجازِ اخوت
کثرتِ انساں کی وحدت خیز قوت
سرفرازی، سروری کا پا گئی ہے راستہ
ہو رہی ہیں پھر صفیں آراستہ
منزلِ مقصود، اب نہیں نابرد

(سنہ ۱۹۳۴ء)

میری جوانی

دَرد سے ہے بھر پیالہ　　ہو گیا بے کیفی کا ازالہ
میرا قفلِ خموشی ٹوٹا　　قید سے چھوٹے نغمۂ نالہ

اب کی مرتبہ اک ظالم کو　　سُوجھا ہے مضمون نرالا
میری جوانی کے منصوبے　　پوچھ رہا ہے پوچھنے والا

مقصد یہ ہے اپنی بیتی　　جگ کو پھر اک بار سنا دوں
میں یہ دکھڑے رو تو چکا ہوں　　کیوں نہ کلام اپنا دہرا دوں

میری جوانی کے منصوبے　　میرا سخن میری تحریریں
میرے ارادوں کے افسانے　　میری حسرت کی تصویریں

تو یہ سمجھا میں نے شاید　　　لطف کی بات چھپا رکھی ہے
آنسوؤں کی تلخی کے سوا بھی　　　اور کوئی لذت چکھی ہے

تو یہ سمجھا میری جوانی　　　اک بدمست جوانی ہوگی
رندی کا ایک دریا ہوگا　　　دریا میں طغیانی ہوگی

اک مے خانہ ہوگا جس میں　　　بھاری بھاری مٹکے ہوں گے
دیکھ کے میری بادہ پرستی　　　زاہدوں کے منہ لٹکے ہوں گے

تو یہ سمجھا میری تسکیں　　　ناچ رنگ کی محفل ہوگی
اور اس منصوبے کی تہ میں　　　کوئی حور شمائل ہوگی

حسن کی منڈی میں بھی شاید　　　میرا آنا جانا ہوگا
رقاصہ کی چاہت ہوگی　　　مطرب سے یارانہ ہوگا

کوئی ایک پری بھی ہوگی　　　میرے خوابوں کی محبوبہ
جس کو اُڑا کر لایا ہوگا　　　میری جوانی کا منصوبہ

یا اک حسن راہ گذر پر　　　میں نے ڈالے ہوں گے ڈورے
میری بھونڈی گردن ہوگی　　　اُس کے بازو گورے گورے

تیری منشا یہ ہے میں بھی　　　یہ افسانے گھڑ کے سناؤں
لڑکوں کو ترغیبِ گنہ دوں　　　بڈّی بُوڑھوں کی گرماؤں

تو سچا ہے تو نے دیکھا　　　کچھ بھی نہیں جز نفس پرستی
جس کے بیاں سے پالیتے ہیں　　　ہلکے شاعر شہرت سستی

ڈھونڈ لے کوئی رنگیں شاعر　　　جو بن پیئے نہ رہ سکتا ہو
آگ نہ جب تک پیٹ میں اُترے　　　منہ سے حرف نہ کہہ سکتا ہو

جس کے منہ کا حرف ہو گالی　　　ناموسِ اشراف کے حق میں
جس کو سن کر فرق نہ سوجھے　　　یاجی شاعر یا احمق میں

اہلِ نظر سے آنکھ چُرائے　　　عاجز اور نا اہل ہو فن سے
نافہموں کی بزم میں جائے　　　نام اُچھالے مسخرہ پن سے

قہقہوں کو تحسین سمجھ لے　　　سر کو ہلائے نشے میں جھومے
محنت کا حامی کہلائے　　　سرمائے کی پوٹ چومے

خون پیئے مزدور کا دن کو　　　رات کو مزدوری آ کے
جس کی جوانی کا منصوبہ　　　اکثر چلتے جوتے کھا کے

اپنے بیوی بچے تج کر　　　چوک میں گھومے بن کر چھیلا
جس محفل جس بزم میں پہنچے　　　منہ سے نکلے بے لامے لا

فرش سے اُچھلے ذکرِ خدا پر　　　عرش پہ جھپٹے گھونسہ تانے
خبطی ہے یہ ہر کوئی سمجھے　　　چاہتا کیا ہے کوئی نہ جانے

جس کے شعر میں ہو بے ربطی — جس کے مضموں ہوں بازاری
جس کی منزل ہو بد راہی — جس کا مقصد ہو بدکاری

اپنی ملت کا ہو دشمن — گانٹھے غیروں سے یارانہ
طعن کرے پاکانِ سلف پہ — بہرِ حصولِ آب و دانہ

باہر سے ابلہ نظر آئے — اندر سے ہو پکا شاطر
دکھلائے ہر کھیل مداری — اپنے پاپی پیٹ کی خاطر

ایسا شاعر ڈھونڈ لے پیارے — اس سے رونقِ محفل ہوگی
اس کی جوانی کے منصوبے — سن کر دنیا خوش دل ہوگی

جس مسلک پر میں ہوں اس میں — رندی کو ترجیح نہیں ہے
میری جوانی کے قصے میں — سامانِ تفریح نہیں ہے

میری جوانی ہندوستانی — بے چاری مجبور جوانی
قوم و وطن کے دُکھ میں شامل — آزادی سے دور جوانی

میری جوانی نے بھی دیکھے — جوشِ ہوس کے یہ نظارے
شرم نے لیکن پھیر لیں آنکھیں — ہوتے رہے گو لاکھ اشارے

میری جوانی کے منصوبے — شیدائے تحصیلِ ہنر تھے
جب میں جواں تھا میرے رہبر — اہلِ دل تھے اہلِ نظر تھے

جب بھی اکثر ہم عصروں سے　　　　میرا نصبُ العین جُدا تھا
یعنی شرمِ خلق تھی مجھ کو
یعنی مجھ کو خوفِ خدا تھا

(سنہ ۱۹۴۵ء)

کیا ہُوں میں ؟

یہ خیالاتِ عظیم
کیا ہوں میں ؟
درمیانِ قعرِ دریا
اِک یتیم !
ایک تنہا درد
ایک اشکِ گرم
ایک آہِ سرد
خونِ انسانی کے ایسے قلزمِ ذخّار میں
تہلکوں میں
زلزلوں میں
صاعقوں میں
اک نوائے بے نَوا
کوئی بھی سُنتا نہیں
اے مرے ربِّ کریم
کیا ہے یہ اُمیدِ دیم
یہ خیالاتِ عظیم
کیا ہوں میں ؟

(سنہ ۱۹۴۱ء)

میرا کلام بہتریں

آج کل میرے کلامِ بہتریں کی ہے تلاش
آپ بیتی آپ کو اپنی سُنا سکتا ہوں کاش
اک طرف فکرِ سخن تھی اک طرف فکرِ معاش
اس تضاد دم سے ہوا تھا شیشۂ دل پاش پاش
عرش پر گونجی تھی اُس دم ایک آوازِ حزیں
تھی یہ آوازِ حزیں
میرا کلام بہتریں

مُدّتوں جنسِ سخن کے بیچنے پر تھا مدار
میری مزدوری چکاتے تھے مرے سرمایہ دار
کوڑیوں میں رولتے تھے جب وہ موتی بار بار
دید کے قابل ہوا کرتے تھے میرے شاہکار
خندہ آتا تھا مرے لب پر مگر اندوہ گیں
خندۂ اندوہ گیں
میرا کلام بہتریں

شعر کا دامن گزوں سے ناپتے تھے بے شعور
پھر سیاہی بن کے ڈھلتا تھا مری آنکھوں کا نور
بعد ازاں ہوتی تھی میری حاضری ان کے حضور
سرد مہری دیکھتی گرمیٔ چشمِ غیور
پانی پانی ہو کے بہہ جاتی تھی آہِ واپسیں
میری آہِ آتشیں
میرا کلام بہتریں

اس نرالی گرم بازاری سے میں تنگ آ گیا
عارضِ عرضِ سخن پر اک نیا رنگ آ گیا
میرے ہاتھ اک اور ساناک اور آہنگ آ گیا
کچھ نہ کہنے سننے رہنے کا مجھے ڈھنگ آ گیا
اب اُڑائی جا نہیں سکتی یہ طرزِ دل نشیں
ہے یہ طرزِ دل نشیں
میرا کلام بہتریں

ہر ستارا اکملیت میں ہے آپ اپنی مثال
ہر گل رنگیں بجائے خود ہے دنیائے کمال
اے کہ تیرے لب پہ ہے "قدر افادی" کا سوال
دیکھ میرے آنسوؤں کا رنگ داغوں کا جمال
ہے کلام بہتریں میرا نمایاں ہر کہیں
ہے نمایاں ہر کہیں
میرا کلام بہتریں

(سنہ ۱۹۴۰ء)

بکوشید!

مقامی بن کے آیا ہے نہ راہی بن کے آیا ہے
یہ دنیا رزم گہ ہے تو سپاہی بن کے آیا ہے
ترے شایاں نہ دنیا دار کا جامہ نہ زاہد کا
ملا ہے درگہِ حق سے تجھے عہدہ مجاہد کا
تجھے فرصت کہاں ہے محو نا و نوش ہونے کی
گھڑی سر پر کھڑی ہے اب کفن بر دوش ہونے کی

(سنہ ۱۹۴۷ء)

مری شاعری

مری شاعری چاند تاروں کی دنیا
یہ رنگیں گھروندا، طلسم زمانہ
کھلونوں کا ہے اک بڑا کارخانہ
ہوا باندھنا اور غبارے بنانا
غبارے بنا کر فضا میں اُڑانا
مرے شعر کا شعبدہ ہے پُرانا
مری شاعری چاند تاروں کی دنیا

مری شاعری خارزاروں کی دنیا
تہی دستی و پستی و خستہ حالی
بگولوں سے معمور پھُولوں سے خالی
وہ بیشہ کہ ہے مزرعِ خشک سالی
جہاں اَبر بھولا ہے دریا نوالی
نہ بھُولی اسے بھی مری فکرِ عالی
مری شاعری خارزاروں کی دُنیا

مری شاعری شہسواروں کی دنیا
بہادر، جری، سورما اور جیالے
قضا جن کی ڈھالیں، قدر جن کے بھالے
تہوّر کے گھوڑوں کی باگیں سنبھالے
چلے ہیں سُوئے رزم گہ عزم والے
مرے شعر ہیں غازیوں کے رسالے
مری شاعری شہسواروں کی دُنیا

مری شاعری بادہ خواروں کی دنیا

چلے جامِ جم بھی، سجے بزم کے بھی
مگر ساقیا دیکھ اک اور شے بھی
یہ فریاد میری کہ ہے جس میں نے بھی
یہ نالہ مرا جو ہے پابند لے بھی
مرا شعر شیشہ بھی، نشہ بھی مے بھی

مری شاعری بادہ خواروں کی دنیا

مری شاعری میرے پیاروں کی دنیا

وہ پیارے کہ سوئے عدم جا چکے ہیں
وہ کلیاں وہ غنچے جو مرجھا چکے ہیں
ترانے جو آرام فرما چکے ہیں
خزانے جنہیں لوگ دفنا چکے ہیں
مرے شعر میں زندگی پا چکے ہیں

مری شاعری میرے پیاروں کی دنیا

(سنہ ۱۹۴۰ء)

یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا

آغا حشر

حشر کا بھی کام پورا ہو گیا
لو یہ ہنگامہ بھی آخر سو گیا
اور اک روشن ستارہ ٹوٹ کر
رات کی تاریکیوں میں کھو گیا!

ختم ہوتی جا رہی ہے زندگی
موت کو شرما رہی ہے زندگی
ہے اگر مرنا بھی جینے ہی کا نام
زندگی کو کھا رہی ہے زندگی

کس قدر آیا دہے دنیائے دُوں
مُردہ و افسردہ و خوار و زبوں
خاک کا پیوند ہونے کے لئے
صورتِ اشکِ ندامت سرنگوں

اہلِ دل کی زندگی ہے زندگی
رُوح کی تابندگی ہے زندگی
ہو گئے رخصت جہاں نور و سُرور
کچھ نہیں شرمندگی ہے زندگی

حیف وہ آنکھیں جو مے خانہ نہیں
خاک اُس دل پر جو پیمانہ نہیں
موت ہے نشہ اُتر جانے کا نام
زندگی جُز رقصِ مستانہ نہیں

حشر تھا ہنگامۂ عیش و نشاط
اک تلاطم خیز موجِ انبساط
آسمانوں کو تہہ و بالا کرے
اے خدا اک آدمی کی یہ بساط

عاقلی فرزانگی کی بات ہے
عاشقی دیوانگی کی بات ہے
عاقلی، اس پر مسلسل عاشقی
واقعی مردانگی کی بات ہے

کون ہے جو محشر کا ہو جانشیں
عرش ہو جس کے تخیّل کی زمیں
نعرہ زن ہو گنبدِ افلاک پر
ہے کوئی ایسا ؟ نہیں کوئی نہیں

کون عاقل ہے جو دیوانہ بنے
غم کدے میں غم سے بیگانہ بنے
زندگی جس کی حقیقت ہو حفیظؔ
اور مر جائے تو افسانہ بنے

سید راس مسعود

یہ ہست و نیست، یہ "ہے اور نہیں" یہ بود و نبود
خدا ہی جانے خدا کو ہے اس سے کیا مقصود
نہاں ترنّمِ بلبل میں نالۂ ماتم
عیاں تبسّمِ گل سے ہے چشمِ اشک آلود
کمالِ عقل جہالت، مآلِ عشق جنوں
مثالِ حسن ہے شعلہ، زوالِ شعلہ ہے دود

"زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش است"
اسی کا نام ہے دنیا، یہی ہے بزمِ شہود
گناہگار رہوں بے شک اُس ایک ساعت کا
کہ اک نظارۂ دل کش سے رُوح تھی خوشنود
دو جلوے مجھ کو نظر آئے ایک صُورت میں
وہ عشق و عقل کہ دنیا سے آج ہیں مفقود
وہ جس کی ذات سے زندہ تھا عشقِ سرسید
وہ جس کی بات میں قائم تھی دانشِ محمود
وہ اک نمونۂ اخلاص و پیکرِ ایثار
جسے نہ ذوقِ نمائش نہ شوقِ نام و نمود
وہ عزم حوصلہ مند اور وہ نگاہ بلند
وہ طبع فقر پسند و مزاجِ دشمنِ جمود
مری جبینِ عقیدت کو چُومنے والا
مرا شفیق، مرا قدرداں، مرا مسعود
وہ ایک دارِ اماں تھا مرا بروئے زمیں
وہ اک پناہ تھی میری بزیرِ چرخِ کبود
میں اُس کی بزم میں آیا تو اٹھ گیا وہ بھی
طلب نے ہاتھ بڑھایا تو کچھ نہ تھا موجود
شریکِ بزمِ وجود آج بھی ہوں میں لیکن
نہیں ہوں اپنی خوشی سے شریکِ بزمِ وجود
خدا و خلق سے جب تک ہے واسطا اے دوست
نہ خامشی کی اجازت نہ اذنِ گفت و شنود
حفیظ مرگِ احبا کے بعد زندہ ہوں
یہ زندگی ہے کہ پابندیٔ رسوم و قیود!

اقبالؒ کے مزار پر

لحد میں سو رہی ہے آج بے شک مشتِ خاک اس کی
مگر گرمِ عمل ہے جاگتی ہے جانِ پاک اُس کی

وہ اک فانی بشر تھا میں یہ باور کر نہیں سکتا
بشر اقبال ہو جائے تو ہرگز مر نہیں سکتا

بزیرِ سایۂ دیوارِ مسجد ہے جو آسودہ
یہ خاکی جسم ہے ستّر برس کا راہ پیمودہ

یہ خاکی جسم بھی اُس کا بہت ہی بیش قیمت تھا
جسے ہم جلوہ سمجھے تھے وہ پردہ بھی غنیمت تھا

اسے ہم ناپتے تھے لے کے آنکھوں ہی کا پیمانہ
غزل خواں اُس کو جانا ہم نے شاعر اس کو گردانا

یہ نغمہ کیا ہے زیرِ پردہ ہائے ساز، کم سمجھے
رہے سب گوش برآواز لیکن راز کم سمجھے

مقیّد اب نہیں اقبال اپنے جسمِ فانی میں
نہیں وہ بند حائل آج دریا کی روانی میں

ابھی اندازہ ہو سکتا نہیں اس کی بلندی کا
ابھی دنیا کی آنکھوں پر ہے پردہ فرقہ بندی کا
مگر میری نگاہوں میں ہیں چہرے ان جوانوں کے
جنہیں اقبال نے بخشے ہیں بازو قہرمانوں کے

(سنہ ۱۹۳۸ء لاہور)

بنجارہ پربت

دو جانب تا حدِ نظر پھیلے ہوئے بن کے نظارے
کوہ و دمن کے سنگ و شجر کے دشت و چمن کے نظارے
اور دو جانب حور و قصور و خلد و عدن کے نظارے
یہ بنجارہ پربت[1] یہ فردوسِ دکن کے نظارے
جنت میں بھی کون کرے گا ان سے زیادہ شاد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

میں نے اس ویرانے کو بستی میں بدلتے دیکھا ہے
پتھر حسنِ صورت کے سانچے میں ڈھلتے دیکھا ہے
رنگ رنگ کی صنعت کا نیرنگ اچھلتے دیکھا ہے
سنگ سنگ پر شاخ و شجر کو پھولتے پھلتے دیکھا ہے
اب تک ہے یہ دید کی دنیا عیدِ مبارک باد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

کوہ کن و شیریں کا قصہ ، ناکامی کا افسانہ
معمولی سی نہر کی خاطر یوں سر پھوڑ کے مر جانا
دوسروں کا منظورِ نظر فرہاد سا جاہل دیوانہ
اور مرا موضوعِ سخن اک عالی ہمت فرزانہ
میں ہوں ممنونِ مہدیؔ کا ، مطلوب نہیں فرہاد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

---

[1] سید محمد مہدی (مہدی نواز جنگ) جوان دنوں کے صدرِ اعظم حیدرآباد دکن کے سکریٹری تھے۔ انہوں نے بنجارہ پربت پر ایک حیرت انگیز بستی بسائی تھی (حفیظ)

صبح کمندیں پھینکتی ہے جب پست و بلند ہستی پر
پہلی کرنیں سورج کی لہراتی ہیں اس بستی پر
اس بستی کے حسن کا پرتو پڑتا ہے ہر پستی پر
لاکھوں مندر کھل جاتے ہیں چشمِ حسن پرستی پر
سجدوں پر اُکساتی ہے ہر صبح نئی افتاد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

مست ہوائیں پھولوں پر شبنم کے موتی رولتی ہیں
شاخوں کے آغوش میں ننھی کلیاں آنکھیں کھولتی ہیں
بلبل گل پر منڈلاتی ہے، پیڑ پہ چڑیاں بولتی ہیں
میرے دل میں توبہ کی کمزور بنائیں ڈولتی ہیں
یاد آتے ہیں گشتِ مصلےٰ، آبِ رُکنا باد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

کرنیں دن بھر اس ساگر پر نور کا مینہہ برساتی ہیں
اور ہوائیں آبِ رواں پر نقش و نگار بناتی ہیں
موجیں موج زنی کرتی ہیں اور لہریں لہراتی ہیں
نقرئی پریاں کھیلتی ہیں لڑتی ہیں پھر مل جاتی ہیں
ظالم قہقہے مارتی ہیں کہہ کہہ کر آدم زاد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

مغرب میں ہر شام یہاں ساقی کا دریچہ کھلتا ہے
رنگِ شفق سیلاب کی صورت بامِ فلک سے ڈھلتا ہے
نیلم کے ہر ساگر میں یاقوت کا جوہر گھلتا ہے

کس کو خبر یہ خوں نابہ کس شہر سے ملتا جُلتا ہے
ہائے یہی شے ہے یہی شے ہے جس نے کیا برباد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دُنیا کی یاد مجھے

ایک مہذّب شہر

(بمبئی میں ایک شام جب دوسرے دن فساد ہوا)

اک مہذب شہر رونق پر ہے قرب شام ہے
کوچہ و بازار میں انبوہِ خاص و عام ہے
ہر درندہ ان میں خون آشام ہے

شاہراہوں پر ہے رفتارِ ترقی تیز تیز
ہر قدم ہے ولولہ انگیز اور ہنگامہ خیز
بھیڑیے ہونے کو ہیں گرم ستیز

ہم رکاب برق و آہن تیزگی تابندگی
موت دوڑی جا رہی ہے یا بشر کی زندگی
زیر و بالا آلودہ درندگی

شہر زہر آلودہ ہے لیکن یہ ہوتا ہے گماں
بہہ رہی ہیں چار جانب رنگ و بو کی ندیاں
مذبحوں میں خون ہو جیسے رواں

ہر دکاں شیشے میں تہذیب و تمدن کی پری
مشتری تصویر خوش اندامی و خوش منظری
ہر کوئی ہے درپئے غارت گری

طرّے دستاریں کلاہیں باوقار و وضع دار
مشرق و مغرب برابر ہم عنان و ہم کنار
شامتِ اعمال ہر سر پر سوار

ساڑھیوں برقعوں دوپٹوں کی ادائیں رنگ رنگ
سادہ و پُرکار نسوانی قبائیں تنگ تنگ
ہائے سینے کو ہے یہ ناموس و ننگ

اختلافِ نسل و ملبوسات خوش رنگی کے ساتھ
مختلف نغمے اُٹھے ہیں جیسے ہم آہنگی کے ساتھ
چھوٹ پڑے گا نعرۂ جنگی کے ساتھ

عید یا تہوار یا تقریبِ شادی ہے کہیں
شاد ہیں کچھ اس طرح شہر بہذیب کے مکیں
ہے کمینہ پن مگر اندر کہیں

(بمبئی سنہ ۱۹۴۴ء)

خون کے چراغ

(شہیدانِ آزادی کے مزاروں کی پکار)

سُرخ پھولوں سے زمین کشمیر کی ہے سُرخرو
لالہ بن کر پھوٹ نکلا ہے شہیدوں کا لہو
چھوٹے چھوٹے ڈھیر مٹی کے قطار اندر قطار
راہِ آزادی میں لڑنے مرنے والوں کے مزار

معرکہ اس خاک پر گذرا ہے دار و گیر کا
لالہ زار اس کو نہ سمجھو کھیت ہے شمشیر کا
حملہ آور ہیں نہتوں پر مسلح جنگ جُو
آبِ جہلم کی رگیں ہیں اور کشمیری لہو

یہ لہو جتنا بہے گا رنگ لاتا جائے گا
راہِ آزادی میں تازہ گُل کھلاتا جائے گا

اے رفیقو! سرفروشو سنتے جاؤ ایک بات
ہم بھی زندہ تھے کبھی ہم کو بھی پیاری تھی حیات
دیکھتے تھے ہم بھی صبح و شام کی رنگینیاں
ان نگاہوں نے بھی کی ہیں حسن کی گلچینیاں

دل دھڑکتا تھا ہمارا بھی نگاہِ ناز پر
رقص ہم بھی کر چکے ہیں زندگی کے ساز پر
ہم نگاہِ حسن کے طالب بھی تھے مطلوب بھی
عشق ہم نے بھی کیا تھا ہم بنے محبوب بھی
ہم تمہاری ہی طرح کودے تھے اس طوفان میں
جان کی بازی لگا دی ہم نے اس میدان میں

لالہ رویہ تربتیں یہ سینہ ہائے داغ داغ
ہم نے اپنے خون سے روشن کئے ہیں یہ چراغ
سرفروشو! ان چراغوں سے ضیا لیتے ہوئے
آگے اور آگے بڑھو نام خدا لیتے ہوئے

لبیک

(مدینہ کی راہ میں)

ماہ پر آ ہی گئی گردشِ ایام آخر
ہو گیا روئے سفر سوئے مدینہ میرا
معجزہ جس نے نہ دیکھا ہو وہ مجھ کو دیکھے
کس طرح ڈوب کے ابھرا ہے سفینہ میرا

اپنے در پر جو بلاتے ہیں تو اتنا بھی کریں
اب کہیں اور نہ مرنا ہو نہ جینا میرا

(عرفات مکہ میں)

اے مرے آقا، میرا از خطا تو ہے کہ میں؟
بخش دینا کام کس کا ہے خدا تو ہے کہ میں؟
منزلِ مقصد نہیں ملتی، تو اب میں کیا کروں
راہ تیری ہے کہ میری، رہنما تو ہے کہ میں؟
دل کی یہ افتاد میں کب تک لیے پھرتا رہوں
درد تیرا ہے کہ میرا ہے، دوا تو ہے کہ میں؟

(سنہ ۱۹۳۵ء)

حفیظ

شاہنامۂ اسلام

آغاز

محمد مصطفیٰ مہرِ سپہرِ اَوجِ عرفانی
ملی جس کے سبب تاریک ذرّوں کو درخشانی

وہ جس کا ذکر ہوتا ہے زمینوں آسمانوں میں
فرشتوں کی دعاؤں میں مؤذن کی اذانوں میں

وہ جس کے معجزے نے بزمِ ہستی کو سنوارا ہے
جو بے یاروں کا یارا بے سہاروں کا سہارا ہے

وہ نورِ لم یزل جو باعثِ تخلیقِ آدم ہے
خدا کے بعد جس کا اسمِ اعظم اسمِ اعظم ہے

اسی کے اسمِ اعظم سے بڑھی جرأت مرے دل کی
کہ میں نے ڈال دی بنیاد ایسے کارِ مشکل کی

تمنا ہے کہ اس دنیا میں کوئی کام کر جاؤں
اگر کچھ ہو سکے تو خدمتِ اسلام کر جاؤں

مسلمانوں پہ ہے مُردہ دلی چھائی ہوئی ہر سو
سکوتِ مرگ نے چادر ہے پھیلائی ہوئی ہر سو

عزیمت ہے نہ جرأت ہے نہ ہے تاب و تواں باقی
فقط حسرت سے تکنے کے لئے ہے آسماں باقی

ارادہ ہے کہ پھر اُن کا ہو اک بار گرماؤں
دل سنگیں سخن کے آتشیں تیروں سے برماؤں

سناؤں اُن کو ایسے ولولہ انگیز افسانے
کرے تائید جن کی عقل بھی تاریخ بھی مانے

سلام

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی
سلام اے فخر موجودات فخر نوع انسانی

سلام اے ظلّ رحمانی، سلام اے نور یزدانی
ترا نقش قدم ہے زندگی کی لوح پیشانی!

سلام اے سرّ وحدت اے سراج بزم ایمانی
زہے یہ عزت افزائی زہے تشریف ارزانی

ترے آنے سے رونق آگئی گلزار ہستی میں
شریک حال قسمت ہو گیا پھر فضل ربّانی

سلام اے صاحب خلق عظیم انساں کو سکھلا دے
یہی اعمال پاکیزہ یہی اشغال روحانی

تری صورت، تری سیرت، ترا نقشا، ترا جلوہ
تبسم، گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی

اگرچہ فقر فخری رتبہ ہے تیری قناعت کا
مگر قدموں تلے ہے فرّ کسرائی و خاقانی

زمانہ منتظر ہے اب نئی شیرازہ بندی کا
بہت کچھ ہو چکی اجزائے ہستی کی پریشانی

زمیں کا گوشہ گوشہ نور سے معمور ہو جائے
ترے پرتو سے مل جائے ہر اک ذرّے کو تابانی

حفیظِ بے نوا بھی ہے گدائے کوچۂ الفت
عقیدت کی جبیں تیری مروّت سے ہے نورانی

ترا در ہو مرا سر ہو، مرا دل ہو ترا گھر ہو
تمنّا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی

سلام اے آتشیں زنجیر باطل توڑنے والے
سلام اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

کفار کا ڈیرا میدانِ بدر میں

زرہ پہنے ہوئے جب لشکرِ نورِ سحر نکلا
شہِ خاور اٹھا بہرِ مدد سینہ سپر نکلا

فضائے دہر سے اب اُٹھ چلی شب کی عملداری
خدا دینے لگا باطل کو یا داشِ سیہ کاری

شعاعیں برچھیاں بن کر اندھیروں کی طرف لپکیں
بلائیں بھاگ اٹھیں اپنے ڈیروں کی طرف لپکیں

تکبّر، ظلم، گستاخی، دل آزاری، من ومائی
تشدّد، کینہ توزی، ناز، خود بینی، خود آرائی

ستانے کے طریقے، قتل کر دینے کی ایجادیں
یہ بچّے مادرِ شب کے اندھیرے کی یہ اولادیں

ہوئے آ آ کے سب شامل گروہِ اہلِ باطل میں
یہ فتنے آ بسے کفار کے تہ خانۂ دل میں

خودی نے بھر دیئے تھے کبر کے طوفان ہر سر میں
ڈبونے جا رہے تھے کشتیٔ حق آبِ خنجر میں

لگایا بدر کے میدان میں کفار نے ڈیرا
یہاں تدبیر کی تزویر کو تقدیر نے گھیرا

تین سو تیرہ مسلمان

اِدھر سے جا رہی تھی اک جماعت حق پرستوں کی
بباطن روزہ داروں کی بظاہر فاقہ مستوں کی

نہ ان کے ساتھ خیمے تھے نہ سامانِ رسد کوئی
نہ ان کی پشت پر تھا جُز خُدا ہر مَدد کوئی

نہ زرہیں تھیں نہ ڈھالیں تھیں نہ خنجر تھے نہ شمشیریں
فقط خاموش تسکیں تھی، فقط پُرجوش تکبیریں

کوئی ساماں نہیں تھا ایک ہی سامان تھا اُن کا
خدا واحد، نبی صادق ہے، یہ ایمان تھا اُن کا

اِن ہی کے نور سے ہر سُو اُجالا ہونے والا تھا
اِنہی کے دَم سے حق کا بول بالا ہونے والا تھا

نہ ذاتی رنج تھا کوئی نہ کینہ ان کے سینوں میں
صفائے قلب تھی مانندِ آئینہ جبینوں میں

نہ کوئی زعمِ باطل تھا نہ کوئی جوشِ ہنگامی
نہ فکرِ کامیابی تھی، نہ ذکرِ خوفِ ناکامی

نہ کثرت کی کوئی پروا نہ تھا قلت کا غم ان کو
نہ کچھ اندیشۂ پست و بلند و بیش و کم ان کو

نہتے تھے مگر تسکین و اطمینان رکھتے تھے
کہ ساماں پر نہیں، ایمان پر ایمان رکھتے تھے

یہ چند افرادِ عالی حوصلہ عابد تھے زاہد تھے
یہی تھے ہاں یہی اسلام کے سچے مجاہد تھے

مجاہد تھے کہ جوش و ضبط کی خاموش تصویریں
مجاہد تھے کہ دِینِ اللہِ اَفْوَاجًا کی تفسیریں
چلے آئے تھے مسجد کے نمازی آج میداں میں
صفیں باندھے کھڑے تھے بن کے غازی آج میداں میں
نہ مسجد میں نہ بیت اللہ کی دیواروں کے سائے میں
نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سائے میں[1]

نہتے بے سر و سامان، بھوکے اور تھکے ہارے
کہ مل کر تین سو تیرہ جوان دیر تھے سارے
کٹی تھی زندگی جن کی ریاضت میں عبادت میں
شہادت کے لئے آئے تھے میدانِ شہادت میں
پتہ دیتی تھی اُن کی خاکساری سربلندی کا
نگاہوں میں مرقع تھا دلوں کی دردمندی کا
یہ آئے تھے کہ شمع دینِ حق کا بول بالا ہو
پتنگے جل بجھیں لیکن اندھیرے میں اُجالا ہو
یہ مرگ و زندگی میں فیصلہ کرنے کو آئے تھے
جواں مردوں کی صورت مارنے مرنے کو آئے تھے
یہ پہلا جیش تھا دنیا میں افواجِ الہیٰ کا
جسے اعلان کرنا تھا خدا کی بادشاہی کا
یہ لشکر ساری دنیا سے انوکھا تھا نرالا تھا
کہ اس لشکر کا افسر ایک کالی کملی والا تھا

---

[1] اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ
ترجمہ:۔ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے

ساقیٔ کوثر کا فیض

فلک پر مہر جھنجھلاتا ہوا معلوم ہوتا تھا
غضب کی آگ برساتا ہوا معلوم ہوتا تھا

مثالِ شعلہ اُڑتی تھی زمینِ بدر کی مٹی
یہ مٹی تھی کہ دھڑ دھڑ جل رہی تھی آگ کی بھٹی

معاذ اللہ تابش دھوپ کی سیلاب آتش کا
کہ جس کے سامنے ہو جائے زہرہ آب آتش کا

جب ایسی آگ لگتی ہے نہیں اُٹھتا دُھواں شاید
دھواں اٹھ اٹھ کے یا پھر بن گیا ہو آسماں شاید

طمانچے مارتے تھے آتشیں جھونکے ہواؤں کے
جل اٹھتے تھے بدن زیرِ زرہ جنگ آزماؤں کے

مگر اس سے زیادہ آتشیں تھی آنچ تیغوں کی
سرِ میداں بہادر کر رہے تھے جانچ تیغوں کی

غضب کی آ چکی تھی خونِ انسانی میں طغیانی
کسی جانب نظر آتا نہ تھا میدان میں پانی

ہوئے تھے اہلِ کفار کے تپ تپ کے انگارے
نکل آئی تھیں موہنوں سے زبانیں پیاس کے مارے

مزاجِ کائنات اس وقت محوِ شعلہ باری تھا
مگر ہاں رحمۃُ اللعالمیں کا فیض جاری تھا

وہی اک حوض تھا اس وقت ان لوگوں کی قسمت سے
مسلمانوں نے جس کو بھر لیا تھا آبِ رحمت سے

مروت پوچھتی تھی نام مومن کا نہ کافر کا
کہ پینے دو یہ اذنِ عام تھا ساقیٔ کوثر کا[1]

[1] ساقیٔ کوثر کا فیض عام تھا۔ اس لئے کہ دشمنوں کو بھی پانی پینے کی عام اجازت تھی۔ (سیرت النبی)

جناب حمزہؓ نے تلوار پر تلوار کو روکا
سبک دستی سے تھپکی دے کے مہلک وار کو روکا
نظر کچھ بھی نہ آیا جھنجھناہٹ کی صدا آئی
اڑیں چنگاریاں تلوار سے تلوار ٹکرائی
صدا تکبیر کی آئی ، زمین بدر تھرّائی
پلک جھپکی کھلیں آنکھیں تو یہ صورت نظر آئی
پڑی تلوار فولادی سپر کے ہو گئے ٹکڑے
سپر سے تا بہ سر پہونچی تو سر کے ہو گئے ٹکڑے
گلو میں بھی نہ اٹکی ، سینہ کاٹا ، دل جگر کاٹا
لہو چاٹا جگر کا بند زنجیر کمر کاٹا
گلے کے ہار زنجیروں کی لڑیاں کاٹ کر نکلی
زرہ بکتر کے بندھن اور کڑیاں کاٹ کر نکلی
یہ تیغ حمزہؓ تھی دعوے تھے اس کو خاکساری کے
زمیں پر آ رہی کر کے دو ٹکڑے جسم ناری کے
یہ برق نور حق باطل کا قصہ پاک کر آئی
گری یک لخت اور دو لخت کر کے خاک پر آئی
گری جب خاک پر دو ٹکڑے ہو کر لاش خود سر کی
دہان شیر سے نکلی صدا اللہ اکبر کی

حضرت علیؓ اور ولید کا مقابلہ

علم کی اور چوکس ہو کے تیغ آب دار اُس نے
کئے بڑھ کر سنبھل کر پے بہ پے سات آٹھ وار اُس نے
زرہ بکتر کو الجھن چار آئینوں کو سکتہ تھا
مگر عتبہ کا بیٹا وار کرنے سے نہ تھکتا تھا

مگر اب وار خالی دے کے حیدر کو جلال آیا
کہ نازک وقت گذرا جا رہا ہے یہ خیال آیا

کیا نعرہ: ہمارا بھی تو لے اک وار او کافر!
سنبھل، دیکھ آئی یہ اللہ کی تلوار او کافر!

صدائے شیر حق سے چھائی ہیبت قلب دشمن پر
سپر اٹھنے نہ پائی تھی کہ آئی تیغ گردن پر

نہ پائی دیکھنے والی نگاہوں نے بھی آگاہی
کب اٹھی کب گری کیسے پھری تیغ یداللّٰہی

اُحد میں جمع ہونے والے

صف آرا تھے اُحد میں آج تین اقسام کے انساں
شریف انساں خبیث انساں نمود و نام کے انساں

بظاہر تو یہ انساں ایک ہی آدم کے پوتے تھے
مگر ان سب کے باطن تین پر تقسیم ہوتے تھے

بظاہر سازِ تھے ہم صورت و ہم رنگ تینوں کے
مگر پردے سے نکلے مختلف آہنگ تینوں کے

عجب اعمال تھے ان کے عجب تھیں نیتیں ان کی
اثر انداز ہیں تاریخ پر شخصیتیں ان کی

لہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ آیَاتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا۔ (۸ ÷ ۲)

(ترجمہ) مومن وہ ہیں کہ جب قانونِ خداوندی کا نام لیا جائے تو اُن کے دل دہل جائیں، اور جب اس کی آیات پڑھ کر سنائی جائیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جائے۔

دریچۂ چراغِ مصطفوی

یہ مظلوموں کی آہوں کا غبار انسان کی دنیا
جفا و ظلم کی سرمایہ دار انسان کی دنیا
خودی کے نشۂ غفلت میں چُور انسان کی دنیا
خدا کا نام لینے سے نفُور انسان کی دنیا
لرزتی کانپتی خوار و زبوں انسان کی دُنیا
صنم خانوں کے دَر پر سرنگوں انسان کی دنیا
بہر صورت بہر آئینہ زشت انسان کی دُنیا
یہ اندھے بے وقوفوں کا بہشت انسان کی دنیا
یہ دنیا ہاں یہی ھنگامۂ معمورۂ ہستی
نمائش اور کبر و ناز کی جولاں گہ مستی
یہی تھی ان دنوں بگڑے ہوئے انسان کی دنیا
نہیں انسان کی دُنیا کہاں شیطان کی دنیا
اسی دُنیا کے یہ سب حملہ آور تھے نمائندے
کئے تھے منتخب شیطان نے انسان کارندے
صف آرا اک طرف تھا یہ نمونہ فطرتِ بد کا
مقابل جس کے اک چھوٹا سا لشکر تھا محمدؐ کا

انتہائی کشمکش

نظر خورشید عالم تاب کی روئے زمیں پر تھی
کہ جس سے روشنی ملتی تھی وہ صورت نہیں پر تھی
گھٹائیں کفر کی اُلجھی ہوئی تھیں نورِ ایماں سے
اُحد کے سنگریزے سرخ تھے خونِ شہیداں سے

چھلکتا تھا شہیدوں کا لہو اس طرح میداں میں
شفق پھولی ہوئی ہو جس طرح روزِ درخشاں میں

مسلماں بے سر و ساماں تھے اور تعداد میں تھوڑے
مقابل میں ہزاروں کا ہجوم اور سینکڑوں گھوڑے

یہ کثرت نے وحدت کو بہا دینے کی ٹھانی تھی
زمانے سے نشانِ حق مٹا دینے کی ٹھانی تھی

جھلک اٹھتے ہیں کالی بدلیوں میں جس طرح تارے
ہجومِ کفر میں تھے اس طرح اللہ کے پیارے

یہ گویا ایک دریا تھا، بھنور تھے جا بجا اس میں
شناور کو نکلنے کا کوئی رستا نہ تھا اس میں

کہیں پیدل کہیں اسوار تھے قرشی رسالوں کے
بنے تھے چار جانب دائرے سے لڑنے والوں کے

صحابہ مرکزی نقطے تھے ان مہلک دوائر کے
اُٹھے تھے اسطرح جیسے قفس ہو گرد طائر کے

سمٹتے پھیلتے، بڑھتے ہوئے گھٹتے ہوئے حلقے
ابھرتے بیٹھتے، ملتے ہوئے پھٹتے ہوئے حلقے

شہادت گاہِ اُحد پر ایک نظر

ستاروں کی شہادت پر ظہورِ مہرِ تاباں ہے
سحر کا رنگ کیا ہے سُرخیٔ خونِ شہیداں ہے

زمیں اہلِ وفا کے خون سے نمناک ہوتی ہے
تو آزادی یہاں ہل جوتتی ہے بیج بوتی ہے

اُحد کے داغ دیتے باغباں نے پاک فرمائے
تو پھر ستر شہید اس میں سپردِ خاک فرمائے

اذانِ صبح گاہی پر کھُلا تھا بابِ مے خانہ
چلا تھا شام تک اہلِ وفا میں دَورِ پیمانہ[1]

نشہ تھا دیدنی ان خوش نصیبوں کی سعادت کا
نگاہِ لطفِ ساقی جام تھا جن کی شہادت کا

ہوا لبریز جامِ زندگی جن کامیابوں کا
تھا ان پر فاتحہ خواں ایک جھرمٹ آفتابوں کا

مُلکِ خُدا خر گرفت

زمیں پہنائیاں کافی ہیں جس کی اپنی وسعت میں
زمیں ہر ایک حصہ دار ہے جس کی وراثت میں

اسے گنتی کے چند افراد باہم بانٹ لیتے ہیں
یہ شیطاں ورثۂ اولادِ آدم بانٹ لیتے ہیں

یہ بے حس بے حیا یہ خود پسند و خود غرض انساں
یہ انسانوں کی دنیا کے لئے مہلک مرض انساں

یہ پتھر اور سانپوں کے مماثل سنگ دل کیڑے
یہ زہر آلود متعفن بے مروّت تنگ دل کیڑے

یہ کیڑے جن کے سر میں منویانہ جوشِ سرسامی
خدا جن کا ہے خود رائی خودی جن کی ہے خود کامی

یہ مُوذی جانور اک دو نہیں دھاڑے کا دھاڑا ہے
چمن انسانیت کا ان کی یورش نے اُجاڑا ہے

---

[1] آپ جمعہ کی نماز پڑھ کر مدینہ سے نکلے اور احد کی وادی میں داخل ہوئے تھے۔ لیکن اُس روز جنگ نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے روز علی الصبح نماز کے بعد صف آرائی ہوئی تھی۔ اور سارا دن ہنگامۂ جنگ برپا رہا تھا شام کو مغرب سے پہلے کفار پلٹ چکے تھے۔ (تاریخ الخمیس)

یہ اک طبقہ ہے انسانوں میں سانپوں کا درندوں کا
کہ سب مُردار جیتے ہیں لہو پی پی کے زندوں کا

بسا مکّار باہم سازشوں سے کام لیتے ہیں
مشقت دوسرے کرتے ہیں یہ آرام لیتے ہیں

بہت سے ان میں زیر خرقۂ سالوس رہتے ہیں
لباسِ آدمی میں بھیڑیے ملبوس رہتے ہیں

بہت سے یا لتو کتے کھلنڈرے سیدھے سادے ہیں
مگر جب اصل دیکھو گرگ ہیں اور گرگ زادے ہیں

یہ ہر منڈی میں ہر بازار میں آسن جماتے ہیں
یہ محنت توڑتے ہیں اور سرمایہ بناتے ہیں

یہ اندھے سونگھتے پھرتے ہیں زر کی بُو اندھیرے میں
پھریں بُو گیر کتے جس طرح ہر سُو اندھیرے میں

نگاہیں ان کی حرصِ مال و زر سے خیرگی میں ہیں
یہ کالے ہوں کہ گورے انتہائی تیرگی میں ہیں

پسند ان کو بشر کی ٹھوکریں ہیں اور اُفتادیں
کہ یہ ظلمت کے بچے ہیں اندھیرے کی ہیں اولادیں

اِسی دنیائے آدم زاد میں کچھ لوگ جیتے ہیں
یہ جیتے آدمی کا گوشت کھاتے خون پیتے ہیں

نچڑتا ہے لہو کھنچتی ہیں کھالیں اک زمانے کی
مگر رہتی ہے بھٹی گرم اُن کے کارخانے کی

بلا سے آدمی کی بستیاں برباد ہو جائیں
مگر گنتی کے یہ شیطان زادے شاد ہو جائیں

کروڑوں محنتی کرتے رہیں دن رات مزدوری
مگر ان کے نصیبوں میں تو روٹی بھی نہ ہو پوری

ادھر اک طبقۂ بے کار کھائے بھی اڑائے بھی
جمائے دھونس بھی غرّائے بھی اور کاٹ کھائے بھی

تن آسانوں کا یہ طبقہ ہے قائل مفت خوری کا
بنا تا ہے یہی قانون چوری سینہ زوری کا

یہی طبقہ ہے آزادی پسند انسان کا دشمن
یہی ایمان کا لاگو، یہی ہے جان کا دشمن

تپاک باہمی ان کا برائے خواجہ تاشی ہے
کہ یہ سب ایک ہیں مقصود سب کا بدمعاشی ہے

یہ جس قریے میں جس خطے میں جس مملکت میں ہیں
تمنائے حصولِ اقتدار و سلطنت میں ہیں

بناتے ہیں یہ مل جل کر ادارہ خانہ دُزدی کا
بہت بھاری عظیم الشان بے باکانہ دُزدی کا

یہ قانونی ادارہ ہے ریاست نام رکھا ہے
یہ تخویف و تعدی ہے سیاست نام رکھا ہے

غلامی اہلِ محنت کی لوازم اس ریاست کے
ہیں استحصالِ سرمایہ مقاصد اس سیاست کے

ریاست سایۂ اقبال جس کا شعلہ زن آہیں
سیاست خونِ مظلوماں سے قائم جن کی تنخواہیں

وزارت، اہل کاری، لشکریت اور جاسوسی
حیاتِ چند کس میں اجتماعی مرگِ مایوسی

یہ چند افکار کارندے رئیسانہ سیاست کے
بڑی سرکار ہیں افسر ہیں پتلے ہیں نفاست کے

عبارت زیست ہے ان کی لباسوں اور غذاؤں سے
پھلا پھولا ہے ان کا نفس معدے کی ہواؤں سے

انہیں محکوم لوگوں کے ہے سائے سے بھی گھن آتی
وہ کرتے ہیں عرق ریزی یہ بُو ان کو نہیں آتی

نہ شفقت ان کو بچوں سے نہ ہمدردی ضعیفوں سے
اراذل سے انہیں دل بستگی نفرت شریفوں سے

ہے ان کی پیٹ پُوجا کے سوا ہر بات بیہودہ
بشر کا ہر شرف بے معنی ہر اوقات بیہودہ

وہ عامی اور بازاری، یہ سرکاری یہ درباری
وہ سب ہیں بہرِ خدمت اور یہ ہیں بہرِ سرداری

یہ طبقہ باوجودِ قلتِ تعداد و کمزوری
مسلسل رات دن کرتا ہے اک باضابطہ چوری

یہ سب مرغانِ زریں سرخمیدہ اور کمر بستہ
نہیں ذہنی غلامی کے سوا جن کا کوئی رستہ

قصاص اُن کی غلامی کا، غلامی اہلِ محنت کی
کہ مُہریں جن کے ہاتھوں پر ہیں بدقسمت رعیت کی

کسانوں کاشت کاروں کا بھلا کیسے ہو پاس ان کو
میسر بھوکے ننگوں ہی سے ہے رزق و لباس ان کو

یہ بانہیں برقِ خرمن سوز غلہ بونے والوں پر
نگاہیں ناوکِ دل دوز بھوکے سونے والوں پر

یہ دہقانوں کو ہیں جھنجھوڑنے جھنجھوڑنے والے
تہی دستی برائے جیب و دامن چھوڑنے والے

یہ حصہ دار ہر مزدور کی گاڑھی کمائی کے
محصّل دانے دانے کے محاسب پائی پائی کے

غریبوں سے نوالے چھیننا خدمات ہیں ان کی
زبردستوں کے جُوتے چاٹنا عادات ہیں ان کی

شکستِ شیشہ ہائے دل سے ہے پائندگی اُن کی
کہ خونِ آرزو سے ہے بقائے زندگی اُن کی
عوام النّاس کے جینے کا بندوبست کرتے ہیں
کہ ہر سینے میں قانونی چھری پیوست کرتے ہیں
بشر کے مرتبے سے جب بشر ملعون گِرتا ہے
تو اس کے ہاتھ سے نوعِ بشر کا خون گِرتا ہے
معانی بھولتا ہے آدمی جب آدمیّت کے
تو ہر دم سُوجھتے ہیں اس کو منصوبے اذیّت کے
دغا مکر و فریب، آدم شکاری، مردم آزاری
تباہی، غدر، بربادی، فساد و ظلم و خوں خواری
علی الرّغم خدا یہ خدمتِ شیطان کرتے ہیں
درندے جو نہیں کرتے وہ یہ انسان کرتے ہیں
تمنّائے حصولِ اقتدارِ شخصی و ذاتی
سگِ دیوانہ کے مانند ہے ان سب کو دوڑاتی
بہ زورِ پستیٔ فطرت یہ خواہانِ بلندی ہیں
یہ سب ناحق پرست انساں عدوئے حق پسندی ہیں
رگِ باطل سے وابستہ ہے ان سب کا رگ و ریشہ
انہیں دنیا میں ہے بس اِک وجودِ حق سے اندیشہ
تصوّر میں بھی آجائے جو صورت حق پژوہوں کی
دھڑک جاتی ہے چھاتی اہلِ باطل کے گروہوں کی

وُجودِ اہلِ حق

وجودِ اہلِ حق یعنی مساواتِ بنی آدم
وجودِ اہلِ حق یعنی بشر شیر و شکر باہم

وجودِ اہلِ حق یعنی صلائے عام آزادی
جہاں بھر کے غلاموں کے لئے پیغام آزادی

وجودِ اہلِ حق مینارِ روشن بحرِ ظلمت میں
پناہ زندگانی دورِ طوفانِ ہلاکت میں

وجودِ اہلِ حق موجودگی اُن دردمندوں کی
جو کرتے ہیں مدد ہر حال میں مجبور بندوں کی[1]

وجودِ اہلِ حق یعنی سہارا بدنصیبوں کا
جفا و ظلم کے مارے ہوئے عاجز غریبوں کا

وجودِ اہلِ حق یعنی خدا کے باوفا بندے
امینِ وصلح جُو پابندِ تسلیم و رضا بندے

وہ بندے جو زمیں پر امن کی بستی بساتے ہیں
زمانے بھر کو صلح و آشتی کا گُر سکھاتے ہیں

وہ بندے جو گلستانِ جہاں آباد کرتے ہیں
جو اپنا خون صرفِ گلشن ایجاد کرتے ہیں

وہ بندے جو مساوات و اخوت میں یگانے ہیں
نظر میں جن کی سب انسان اک خرمن کے دانے ہیں

وہ بندے جن کے نورِ درد سے معمور ہیں سینے
زبانیں اور دل ہیں جن کے یک رنگی کے آئینے

یقیں ہے جن کا شرع و صدق و انصاف و عدالت پر
ہمیشہ جن کو رحم آتا ہے مظلوموں کی حالت پر

---

[1] المومن للمومن کالبنیان یشدّ بعضه بعضًا وشبك بين اصابعه (حدیث بخاری عن ابن موسیٰ) فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مومن دوسرے مومن کے لئے اس طرح ہے جیسے بنیاد کی اینٹیں، پھر اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا۔ [2] فکوا العانی واطعموا الجائع وعودوا المریض (بخاری عن انس کتاب الادب) فرمایا: اسیروں کو رہائی دلاؤ۔ بھوکوں کو کھانا کھلاؤ۔ بیماروں کی خبرگیری کرو۔

جنہیں مطلوب ہر دم حق رسی ہے زیر دستوں کی
پسند آتی نہیں جن کو جفا قابو پرستوں کی

جو مال و جاں سے امدادِ یتامے کرنے والے ہیں
جو مسکینوں کے محتاجوں کے دامن بھرنے والے ہیں

جو خود فاقے سے رہ کر دوسروں کا پیٹ بھرتے ہیں
زمیں خوشحال ہوتی ہے جہاں سے بھی گذرتے ہیں

جو معذوروں ضعیفوں بے کسوں کے کام آتے ہیں
غلاموں کی مشقت اپنی جانوں پر اٹھاتے ہیں

جو محکوموں کو مظلوموں کو جانیں جرأتیں دے کر
بنا دیتے ہیں جوشِ حریت کے خوش نما پیکر

یہ آزادی کے پتلے سر فرازی جب دکھاتے ہیں
زمانے بھر کے محکوموں کو آزادی دلاتے ہیں

یہی ہیں دیوِ استبداد کا منہ توڑنے والے
یہی سرمایہ داری کی ہیں آنکھیں پھوڑنے والے

یہی ہیں جن سے امیدیں زمانے کی ہیں وابستہ
انہی کا منتظر ہے ہر غلامِ دست و پا بستہ

محمدؐ کا مدینہ

نہاں تھا جن دنوں اندھیر دنیا کے سفینے میں
وجودِ اہلِ حق موجود تھا بس اک مدینے میں

محمدؐ کا مدینہ ہی جہاں میں ایک بستی تھی
جہاں راحت کا سایہ تھا جہاں رحمت برستی تھی

محمدؐ کا مدینہ ہی تھا فردوسِ بہار آرا
دگرنہ باغِ آدم زاد تھا وقفِ خزاں سارا!

کہاں تھے یہ نصیب اللہ اکبر سنگِ اسود کے
یہاں کے پتھروں نے پاؤں چومے تھے محمدؐ کے

محمدؐ بھی یہاں موجود، اصحابِ محمدؐ بھی
پناہ رحمۃ اللعالمینؐ بھی، فضلِ ایزد بھی

یہاں انسان صلح و امن کی بستی میں بستے تھے
نکل آئے تھے غارستان سے گلشن میں بستے تھے

غلاموں کی رہائی کا یہاں سامان ہوتا تھا
کوئی زنگی ہو یا رومی، یہاں آدم کا پوتا تھا[1]

مساوات و اخوت کی یہاں تعلیم ہوتی تھی
بشر کو دولتِ انسانیت تقسیم ہوتی تھی

کمانیں تھیں کے جلوے تھے نگاہِ دردمنداں میں
مسرت مسکراتی تھی جبینِ صبحِ خنداں میں

قبولیت کے دامن تھام رکھے تھے دعاؤں نے
مرادِ زندگی کے ساز چھیڑے تھے ہواؤں نے

حیاتِ نو میسر تھی چمن کو اپنے مالی سے
اُمیدیں پھوٹتی تھیں پتے پتے ڈالی ڈالی سے

نگاہِ عرشیاں میں فرش فردوس نظارا تھا
خُدا کے فضل سے "انسانِ کامل" جلوہ آرا تھا

---

[1] فرمایا: لا فضل لعربي علی عجمي ولا لعجمي علی عربي (الاٰخرۃ) کسی عرب کے رہنے والے کو عجم کے رہنے والے پر اور عجم کے کسی باشندے کو عرب کے کسی باشندے پر، گورے کو کالے پر یا کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں۔ فضیلت صرف خدا ترسی میں ہے

[2] فرمایا: من لا یرحم لا یرحم (صحیح بخاری) یعنی جو شخص دوسرے پر رحم نہیں کھاتا اس پر بھی رحم نہیں کیا جائے گا۔

حفیظ

گیت اور نظمیں

(بچوں کے لئے)

خدا سب کچھ دیکھتا ہے

فہمیدہ کو خدا جانے کس طرح یہ بات معلوم ہو گئی ہے
کہ خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ بڑی رازداری سے
یہ بھید دوسری بہنوں کو بتایا جا رہا ہے۔ اور کیوں نہ بتلائے،
یہ ایسی بات ہے جو سب کو معلوم ہونی چاہئے۔

بہن چاہے کتنا ہی چھپ چھپ کے بیٹھیں
کسی بات کو چاہے دل میں چھپا لیں
مگر۔ پھر بھی سب کچھ خدا دیکھتا ہے

کہیں ساتھ ابا کے جائیں سفر میں
ہوں مکتب میں یا خالہ اماں کے گھر میں
مگر۔ پھر بھی سب کچھ خدا دیکھتا ہے

اگر اوڑھ لیں کوئی موٹی سی چادر
رہیں گود میں اپنی امی کی چھپ کر
مگر۔ پھر بھی سب کچھ خدا دیکھتا ہے

اگر دل میں سوچیں، نہ بولیں نہ چالیں
کوئی بات منہ سے نہ چاہے نکالیں
مگر پھر بھی سب کچھ خدا دیکھتا ہے
کوئی وقت ہو، شام ہو یا سویرا
ہو دن کا اُجالا کہ شب کا اندھیرا
مگر پھر بھی سب کچھ خدا دیکھتا ہے

بول میرے مُرغے

صُبح صُبح مُرغے کو پر پھڑاتے دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ایک گیت بنا لیا ہے۔ مُرغے کو دیکھتے ہی سُنانا شروع کر دیتے ہیں

خوب اکڑ کر　　چڑھ کھاپنے پر
ہاں اب تن جا　　مُرغا بن جا
کھول پَروں کو
کھول میرے مرغے
بول میرے مُرغے
کُکڑوں کُوں!

لے اب گردن　　خوب گئی تن
سر کو جُھکا دے　　دُم کو اُٹھا دے
اپنے بازو
تول میرے مرغے
بول میرے مرغے
کُکڑوں کُوں!

سارے لڑکے　　نور کے تڑکے
سو کے اٹھیں گے　　اور سنیں گے
تیرا نرالا
ڈھول میرے مرغے
بول میرے مرغے
ککڑوں کوں!
ہاں ہاں یوں　　ککڑوں کوں
بانگ ہے تیری　　کتنی اونچی
اس سے اونچا
بول میرے مرغے
بول میرے مرغے
ککڑوں کوں!

گوٹے کی چنری

بنّو نے آج صبح سویرے گوٹے والی چنری اوڑھی ہے۔ بہت خوش ہیں۔ چنری دکھاتی پھرتی ہیں۔ گاتی پھرتی ہیں

دیکھ بُوا میری گوٹے کی چنری
آہا جی! گل ناری چنری
رنگ رنگیلی پیاری چنری
ململ کی اک تاری چنری
نازک نازک ساری چنری
دیکھ بُوا میری گوٹے کی چنری

امّی کے کچھ جی میں آیا
گوٹے کا اک تھان منگایا
چُنری پر سارا چپکایا
ہر کونے پر پھول بنایا
دیکھ بُوا میری گوٹے کی چُنری

لچکا ہے ہاتھوں میں لچکتا
گوٹا ہے کندن سا دمکتا
روشنی میں کیسا ہے چمکتا
ہاتھ لگانے سے ہے مسکتا
دیکھ بُوا میری گوٹے کی چنری

اس کو خراب نہ ہونے دوں گی
بیٹھوں گی تو سنبھال رکھوں گی
گھر میں جا کر رکھ چھوڑوں گی
ہر تہوار کے دن اوڑھوں گی
دیکھ بُوا میری گوٹے کی چُنری

کسان لڑکا

کسان سے بڑھ کر اب کو کسان کے لڑکے سے ھمدردی ہے۔ کیوں نہ ہو۔ ھمجولی ہے نا؟

جاگا ہے کیا سویرے
تاروں بھرے اندھیرے
مکھن کے ساتھ روٹی　　اس کے ہیں تر نوالے
اور ساتھ پی لئے ہیں　　دو چھاچھ کے پیالے

گھر بھر کے ڈھور ڈنگر
ہمراہ اپنے لے کر
ٹشکاری دے رہا ہے　　اُن کو ہنکا رہا ہے
کھیتوں کو جا رہا ہے

کھیتوں پہ ان کو چھوڑا
منہ اور سمت موڑا
کھرپی سے گھاس کھودی　　ڈالا ہے سب کو چارا
پھر اپنی سبزیوں کا　　کرنے لگا نظارا
دو بیل لے کے آیا
لا کر رہٹ میں جوتا
بیٹھا ہے گاہدی پر　　اُن کو چلا رہا ہے
گانے بھی گا رہا ہے

مینڈوں کو جوڑتا ہے
ڈھیلوں کو توڑتا ہے
پُھرتیلا بھی ہے لیکن　　بھولا ہے اور سادہ
معلوم ہو رہا ہے　　کھیتوں کا شاہزادہ
کیا شاد پھر رہا ہے
آزاد پھر رہا ہے
توڑا ہے ایک پتّہ　　منہ سے لگا رہا ہے
سیٹی بجا رہا ہے

اب دوپہر بھی آئی

ہر سمت دُھوپ چھائی
ماں لے کے آ گئی ہے　　چھاچھ اور جَو کی روٹی
پیاز اور دہی کا سالن　　روٹی ہے خوب موٹی
بیٹھا ہے اب نہا کر
اِک چوکڑی جما کر
دیکھو تو کس مزے سے　　ہر چیز کھا رہا ہے
بغلیں بجا رہا ہے

تھوڑی سی دیر سویا
لیکن نہ وقت کھویا
چلاتی دُھوپ میں پھر　　کرنے لگا مشقت
اللہ رے تندرستی　　اللہ رے اس کی ہمت
کاٹا ہے کتنا چارا
گٹھڑ سا ایک باندھا
سر پر اُٹھا کے اُس کو　　گھر لے کے جا رہا ہے
خوشیاں منا رہا ہے

دُھنیا

گھر میں دُھنیے کو بلایا گیا ہے۔ تاکہ سردی کے لئے لحاف توشکیں بھروالی جائیں۔ اب کوئی بات ہاتھ لگی ہے۔ دُھنکی کی آواز کے ساتھ اُچھل رہے ہیں۔ دُھنکی ہوئی روئی پر کُودنے کو تیار ہیں۔ وہ تو عقل بھی ساتھ ہے جو روک رہی ہے۔ ورنہ آپ ضرور ایک لوٹ لگاتے اور دُھنکی ہوئی روئی کو خراب

کر ڈالتے۔ دُھنکی سے روئی اُبھرتی جاتی ہے۔ تو آپ کو خیال آتا
ہے کہ رُوئی کا وزن بھی بڑھ رہا ہے ــــــ واہ رے عقل!

پِنڈک پِنڈک پِنڈک پِنک
دُھنک دُھنک دُھن دُھنک دُھنک

تانت بجی اور نکلا راگ
روئی بنی صابن کا جھاگ
کیسی پھٹتی جاتی ہے
یا دل بنتی جاتی ہے
کتنا ڈھیر ہوا آہا!
میں اس ڈھیر پہ کُودوں گا
کوئی چوٹ نہ آئے گی
روئی مگر دب جائے گی
اِتّی رُوئی اتنا ڈھیر
ہو گئی یاراں تیراں سیر
لے اب رُوئی ہو گئی صاف
بھر لے تکئے اور لحاف
اِن سے سب سُکھ پاتے ہیں
اوڑھتے اور بچھاتے ہیں
ملتا ہے سب کو آرام
واہ رے دُھنیے تیرا کام

واہ ری دُھنکی دُھنک دُھنک
پِنڈک پنڈک پِنک پِنک

مچھلیوں کے ماسٹر جی

ابا جان دوستوں کے ساتھ مچھلیوں کے شکار کو گئے۔ شام کو خالی ہاتھ واپس آئے۔ ہم نے پوچھا: "مچھلیاں؟" — بولے: "کچھ بھی نہیں!" — پوچھا: "کیا دریا میں مچھلیاں نہیں تھیں؟" — جواب دیا: "تھیں کیوں نہیں۔ ہزاروں تھیں۔ لیکن پھنسی ایک بھی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ مچھلیاں بڑی چالاک ہو گئی ہیں۔ کیچوے کھا جاتی ہیں، کانٹے کو ذرا نہیں چھیڑتیں۔ نالائقوں نے ہمارا سارا دن ضائع کر دیا۔" ہم نے کہا: "واہ، وہ تو بڑی لائق مچھلیاں تھیں۔ آپ خواہ مخواہ اُن کو نالائق کہتے ہیں۔" ابا جی نے کہا: "حیرانی تو یہ ہے کہ اُن کو غذا کھا جانے اور کانٹے سے بچ جانے کی ترکیب کیسے آئی؟" — ہم نے کہا: "مچھلیوں کا کوئی اُستاد ہوگا جس نے اُن کو یہ باتیں پڑھا سکھا رکھی ہوں گی۔" ابا جی بہت ہنسے اور کہا: "بھئی سعیدہ، تم نے یہ مچھلیوں کے اُستاد کی ایسی کہی ہے کہ اس پر نظم لکھنے کو جی چاہتا ہے۔" چنانچہ ابا جی نے یہ نظم دوسرے ہی دن ہم کو لکھ دی جس میں بیان کیا ہے کہ مچھلیوں کے ماسٹر جی مچھلیوں کو کس طرح سکھاتے پڑھاتے ہیں۔

(۱)

ننھی ہو تم بچی ہو تم
سب عقل کی کچی ہو تم

آؤ مری باتیں سنو
چالیں سنو گھاتیں سنو

اُستاد کی ہر بات کو
اپنی گرہ میں باندھ لو

جب تم جواں ہو جاؤ گی
مچھلی کی ماں ہو جاؤ گی

پھر یاد آئیں گی تمہیں
لہرے دکھائیں گی تمہیں

باتیں ہماری مچھلیو!
اے پیاری پیاری مچھلیو

(۲)

رہو ہو کی بیٹی کان دھر
سانول کی بچی آ اِدھر

او ننھی منی تو بھی سن
او کٹھن منتھنی تو بھی سن

جوڑے دہانے والیو
او دُم ہلانے والیو

تم بھی سنو چمکیلیو
اے کالی نیلی پیلیو

تم کو یہاں پر دیکھ کر
ندی پہ آجائے اگر

کوئی شکاری مچھلیو؟
اے پیاری پیاری مچھلیو

(۳)

جب وہ کنارے بیٹھ کر
ڈوری کو پھینکے گا اِدھر

ننھے سے کانٹے پر چڑھا
ہو گا مزے کا ..کیچوا

لپکو گی تم سب بے خبر
اِک تر نوالہ جان کر
کانٹا مگر چُبھ جائے گا
بس حلق میں کُھب جائے گا
تڑپو گی اور گھبراؤ گی
لیکن سبھی پھنس جاؤ گی
تم ہاری باری مچھلیو !
اے پیاری پیاری مچھلیو

(۴)

پانی میں جب کانٹا گرے
تم اس کو دیکھو غور سے
اے بے وقوفو اُس گھڑی
لازم ہے چالاکی بڑی
اُس وقت ڈرنا کیا بھلا
ڈر ڈر کے مَرنا کیا بھلا
دل کو نہ اپنے توڑنا
یہ کیچوا مت چھوڑنا
کانٹے سے بچنے کے لئے
بس ہوشیاری چاہئے
بس ہوشیاری مچھلیو!
اے پیاری پیاری مچھلیو

(۵)

پانی کے اندر کیچوا
ہے واہ کیا اچھی غذا

تم دھیان میں رکھو اُسے
ہر سمت سے چکھو اُسے
آنا نہ ہرگز شان میں
کانٹے کو رکھنا دھیان میں

اک بارگی منہ کھول کر
ہے کیچوا کھانے میں ڈر
اس سمت سے اُس سمت سے
کھاتی رہو لے لے مزے

اپنی نہاری مچھلیو!
اے پیاری پیاری مچھلیو

(۶)

جب کیچوا کھا جاؤ تم
بس لوٹ کر آجاؤ تم
لیکن ذرا سا چھیڑ دو
کانٹے کی پتلی ڈور کو

سرکنڈا جب کھنچ آئے گا
دھوکا شکاری کھائے گا
سمجھے گا مچھلی پھنس گئی
کھینچے گا بنسی ڈور کی

پھر شکل اُس کی دیکھنا
ہوتی ہے کیسی دیکھنا

وہ بے قراری مچھلیو!
اے پیاری پیاری مچھلیو

(۷)

اب وہ بہت تھلّائے گا
چیخے گا اور چلّائے گا

پھر کیچوے پر کیچوا
کانٹے میں بھرتا جائے گا

تم بھی اُسی ترکیب سے
کھاتی ہی جانا کیچوے

آخر شکاری ہار کر
اُٹھے گا دل کو مار کر

حیلہ گری رہ جائے گی
ساری دھری رہ جائے گی

ننھی پیاری مچھلیو!
اے پیاری پیاری مچھلیو

پنہاری کا گیت

گھر کے قریب ہی پڑوس میں ایک چھوٹا سا مکان ہے۔ جس میں ایک بیوہ اور اس کی بیٹی اور ننھا سا بچہ ہے۔ بیوہ بیچاری آفت کی ماری چکی پیس کر اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔ بیوہ کی بیٹی اپنی ماں کی ہر طرح مدد کرتی ہے چکی پیسنے میں بھی ہاتھ بٹاتی ہے۔ ننھے بھائی کو بھی کھلاتی بہلاتی ہے۔ محلے کی دوسری لڑکیوں کو ان سے بڑی ہمدردی ہے۔ یہ گیت اسی ہمدردی اور دل سوزی کا اظہار ہے۔

(۱)

چپکیا گھمر گھمر کرتی ہے
چپکیا گھمر گھمر کرتی ہے
ماں بیٹی بیٹھی ہیں، دونوں پیس رہی ہیں آٹا
آٹا پیس کے ان دونوں نے اپنا دکھ ہے کاٹا
ایک نے پتھر سے ہاتھ نکالا ایک نے گالا ڈالا
اس محنت کو دیکھ رہا ہے روزی دینے والا
چپکیا گھمر گھمر کرتی ہے
چپکیا گھمر گھمر کرتی ہے

(۲)

روٹی بیاج ہے محنت مول
محنت سے کھلتے ہیں پھول
چکر کھاتی جاتی ہے کیا چکی ہاتھوں ہاتھ
دونوں مل کر گاتی بھی جاتی ہیں ساتھوں ساتھ
روزی دینے والے رکھنا اس محنت کی لاج
تیرے ہی محتاج ہیں داتا تیرے ہی محتاج
روٹی بیاج ہے محنت مول
محنت سے کھلتے ہیں پھول

(۳)

آٹا ہے کیا خوب مہین
کیوں ہوتی ہے تو غمگین
اچھی بیٹی لے اب آٹا چھلنی لے کر چھان
میں ننھے کو دودھ پلا دوں ننھا ہے نادان
اچھی اماں دم لے لے میں تجھ پر واری جاؤں

آٹے والی کے گھر جا کر تولوں کے بیس دے آؤں
کیوں ہوتی ہے تو غمگین
آٹا ہے کیا خوب مہین

مانو بلی کا سبق

بی ننھی سلیٹ پر حساب سیکھتی ہیں۔ مانو بلی سے بڑی دوستی ہے۔ مانو کو بلا کر گود میں بٹھا لیا ہے اُستانی بنی ہوئی ہیں۔ جس طرح خود سیکھا ہے مانو کو بھی سکھانا چاہتی ہیں۔

اچھا اب پنجوں کو سمیٹ
یہ ہے پنسل اور سلیٹ
جو کچھ لکھوں دیکھتی جا
میں نے کیا لکھا ہے بتا!

اِک دو تین ہوئے چھ بس
چار ملا کر بن گئے دس

دس اور دس ہوئے ہیں بیس
بیس اور بیس ہوئے چالیس
بیس ہوا اور تو بن گئے ساٹھ
اب اِن میں سے نکالے آٹھ

اچھا مانو! تو بتلا!
رہتا ہے اب باقی کیا؟
گونگی کیوں ہے منہ تو کھول
میرے کھیل زباں سے بول

اتنی بھی نہیں تجھ کو سُوجھ
بوجھ آسان سی بات ہے بوجھ

میاؤں میاؤں کرتی ہے
پڑھنے سے کیوں ڈرتی ہے

اچھا میں بتلاتی ہُوں
بات تجھے سمجھاتی ہوں

دُودھ بھرے کُوزے ہیں ساٹھ
خالی تو نے کر دیئے آٹھ

باقی باون ہیں کہ نہیں؟
کیوں بی مانو اب سمجھیں!

سونے والو جاگو

جاگو سونے والو جاگو
وقت کے کھونے والو جاگو

جاگے عبادت کرنے والے
سجدوں میں سر دھرنے والے

باغ میں چڑیاں بول رہی ہیں
کلیاں آنکھیں کھول رہی ہیں

پھول خوشی سے جھوم رہے ہیں
پتوں کا منہ چُوم رہے ہیں

جاگ اٹھے دریا اور نہریں
جاگ اٹھیں موجیں اور لہریں

ناؤ چلانے والے جاگے
پار لگانے والے جاگے
کوّے کالے کالے جاگے
سب کو جگانے والے جاگے

مال خزانے والے جاگے
دفتر جانے والے جاگے
کاروباری جاگ اٹھے ہیں
سب بیوپاری جاگ اٹھے ہیں

بنیئے اور حلوائی جاگے
بابو جاگے نائی جاگے
منڈی کے مزدور بھی جاگے
دوڑ رہے ہیں پیچھے آگے

بولی بولنے والے جاگے
سودا تولنے والے جاگے
ساری دنیا جاگ رہی ہے
کام کی جانب بھاگ رہی ہے

لکھنے پڑھنے والو جاگو
پھولنے پڑھنے والو جاگو
منہ دھو دھا کر ناشتہ کھاؤ
بستہ لے کر مدرسے جاؤ

صبح کا سونا خوب نہیں ہے
اچھا یہ اسلوب نہیں ہے
جاگو سونے والو جاگو
وقت کو کھونے والو جاگو

تاروں بھری رات

لو رات آئی
دُنیا پہ چھائی
نیندوں نے آکر　　ڈالا ہے ڈیرا
آنکھوں میں ایسا　　کاجل بکھیرا
سارے جہاں میں
چھایا اندھیرا
اکثر گھروں کی　　ہے روشنی گُل
کھیت اور جنگل　　تاریک بالکل
انسان، حیوان
جاں دار، بے جان
چُپ ہو رہے ہیں　　یا سو رہے ہیں
لو رات آئی
دنیا پہ چھائی

اے سونے والو!
چادر ہٹا لو
دیکھو فلک پر　　روشن ہیں تارے
چہرے ہیں ان کے　　کیا پیارے پیارے
ہیں قابلِ دید
ان کے نظارے
ہے آسماں بھی　　کیا صاف سُتھرا
اک نیلی نیلی　　چادر ہے گویا

جس پر سجی ہے
بیٹھی ہوئی ہے
پُر نُور محفل　　مسرور محفل
اے سونے والو!
چادر ہٹا لو

ہے یہ نظارا
دل سے بھی پیارا
اک کھیت ہے یہ　　جس میں خدا نے
دنیا کی خاطر　　بوئے ہیں دانے
اور چاہتا ہے
سُورج اُگانے
یا سائباں پر　　ہیرے جڑے ہیں
یا چھت پہ موتی　　بکھرے پڑے ہیں
یا ایک لشکر
میداں کے اندر
اُترا ہے آ کر　　شمعیں جلا کر
دل سے بھی پیارا
ہے یہ نظارا

ہے کیا چمک دار
تاروں کا دربار
پھیلے ہوئے ہیں　　تارے ہی تارے
رہتے ہیں یُوں تو　　خاموش سارے

کرتے ہیں لیکن
باہم اشارے
ندی کے اندر　　منہ دیکھتے ہیں
اور دل ہی دل میں　　خوش ہو رہے ہیں
دریا کی لہریں
پانی کی نہریں
کیا سج رہی ہیں　　تاروں بھری ہیں
ہے کیا چمک دار
تاروں کا دربار

اے پیارے تارو
شب کے دُلارو!
ہاں صبح تک تم　　چمکے ہی جاؤ
بھٹکے ہوؤں کو　　رستے دِکھاؤ
ہم کو بھی ایسی
خدمت سکھاؤ
نیکی کریں ہم　　اور نام چمکے
تاروں کی مانند　　ہر کام چمکے
ہم کو سلیقہ
آ جائے ایسا
دُنیا کو ہم سے　　آرام پہونچے
اے پیارے تارو
شب کے تارو!

ملیریا
سے
نجات
اگر آپ ہر ہفتہ
"ڈاراپرم" برانڈ
پیریمیتھمین بی پی
کی ایک خوراک استعمال کریں تو مچھر آپ کو
کبھی ملیریا میں مبتلا نہیں کر سکتا۔
آپ ہر ہفتہ ۹ پیسے سے کم خرچ کر کے ملیریا کے
بخار سے بچ سکتے ہیں۔
۶ گولیوں کی پٹیاں ۵۰ پیسے میں ہر جگہ،
ہر دوا فروش سے مل سکتی ہیں۔
بروز ویلکم اینڈ کمپنی (پاکستان) لمیٹڈ
میکلوڈ روڈ - کراچی
BWP-57

She is not
a filmstar...
Yet she is
Beautiful
She uses Zulfeqar's
Beauty Toilet Soap
available in 3 beautiful
colours for her soft
and velvety
complexion.
Manufactured by
INDUSTRIES LTD.
KARACHI, 16
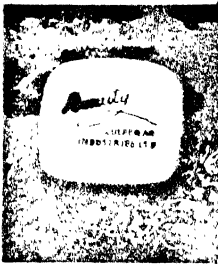
فکر و فن

سید احمد شاہ بخاری پطرس

پہلی رائے

جالندھر کے نغمہ پرور شہر نے حفیظ نامی ایک ساحر پیدا کیا ہے۔ جو کچھ مدت سے لاہور کے شاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مبہوت کر رہا ہے جس کے قلم کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں تصویریں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں، اور غائب ہو جاتی ہیں، اور لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہیں۔

ساون رت، گھنگھور گھٹاؤں میں کھیلتی ہوئی بجلی، موروں کی جھنکار، پپیہوں کی پکار، برسات کی ٹھنڈی ہوا، ہوا میں اڑتے ہوئے آنچل، آنکھوں میں تمنائے دید، اور فراق کے آنسو، دل کو انتظار کی دھڑکن، یہ ایک مست کیف شاعر کی وہ دنیا ہے جس میں حفیظ گاتا پھرتا ہے۔ جب اس کا دل بھر آتا ہے تو وہ آنسو بہا دیتا ہے۔ جب اس کے دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے تو وہ اونچے سروں میں الاپتا ہے اور سننے والوں کا کلیجہ مسل دیتا ہے۔

یہ اس کے کلام کا مجموعہ ہے۔ چند ورق ہیں۔ خشک طبیعتوں کو جا بجا اس میں "فن" کے نقائص بلکہ بے عنانیاں نظر آئیں گی۔ اہل ذوق دیکھیں گے اور جانیں گے کہ ایک وارفتہ عاشق مزاج عشق کے اتھاہ سمندر میں خود بھی کس طرح ڈگمگاتا ہے۔ اور دوسروں کے دل بھی کس طرح ہلاتا ہے۔ حفیظ ایک شاعر ہے جس کے قدم پامال رستے سے ادھر ادھر جا پڑتے ہیں۔ لیکن یہ ایک راہ گم کردہ کی آوارگی نہیں ایک مست کی لغزشیں ہیں۔ نشے میں چور، کیف میں سرشار۔ جو پیتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے۔ پیالے میں بھر کر دیتا ہے اور یوں بھی لنڈھاتا ہے۔ ایک آزاد جوگا تا ہے اور الفاظ اس کی زبان پر ناچتے ہیں۔

ہمارے شاعر برسوں سے ترک شیرازی پرست ہیں۔ ایک مادی شراب طور سے بے خود ہونے کا بہانہ کر رہے ہیں، جو نہ خود پی سکتے ہیں، نہ اوروں کو پلا سکتے ہیں۔ شاعری ایک فریب ہے لیکن اس تصنع کا کیا نام ہے جو کسی کو دھوکا نہ دے سکے ——؟

حفیظ کی نظر ہندوستان کی دلہن پر ہے۔ اور وہ ترک شیرازی کی غلامی سے بالکل آزاد نہیں ہوا۔ اور اس کو کنکھیوں سے کبھی کبھی دیکھ لیتا ہے۔ یہ بے وفائی آخر کب تک؟ عاشق کہ نظر باز؟

(دیباچہ "نغمہ زار" ۱۹۲۵ء)

شیخ سر عبدالقادر

تقریب

حفیظ اور حفیظ کی شاعری محتاج تعارف نہیں مگر شاہنامہ اسلام ایک ایسی تصنیف ہے کہ وہ محض شاعری سے تعلق نہیں رکھتی۔ وہ اسلام کی منظوم تاریخ ہوگی وہ اخلاق اسلامی کی تعلیم کے لئے ایک درسی کتاب کا کام دے گی۔ وہ مصنف کے جذبات مذہبی کی ایک دل کش تصویر ہے جو لفظوں میں کھینچی گئی ہے۔ لفظ سادہ ہیں لیکن ان کی ہم آہنگی اور ترنم جو حفیظ کی شاعری کی خصوصیت ہے تصویر کی تاثیر کو دوبالا کر رہا ہے اس لئے اس کتاب کی تقریب کے طور پر کچھ لکھنا بے محل نہ ہوگا۔ اس کی پہلی جلد شائع ہوتی ہے جس میں دو ہزار سے زیادہ اشعار ہیں اور اس کا بیشتر حصہ اس عہد زریں سے تعلق رکھتا ہے جب اسلام کے مقدس ہادی کی ذاتِ والا صفات اپنے جمال جہاں آرا سے دنیا کو نورانی کر رہی تھی۔ میں خوش ہوں کہ یہ سعادت میرے حصے میں آئی ہے کہ ایسی کتاب کی پہلی جلد کا دیباچہ لکھوں جو نہ صرف ادبی خوبیوں کے اعتبار سے دیرپا معلوم ہوتی ہے بلکہ مذہبی اور اخلاقی پہلو سے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کے لئے چراغ ہدایت ثابت ہو سکتی ہے۔

اسلام کے ابتدائی زمانے کا جو نقشہ شاعر نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس میں زیادہ تر زور سیرت پر دیا گیا ہے۔ بالعموم وہ روایتیں نظم کی گئی ہیں جن سے دنیا کے سب سے بڑے ہادی کی پاکیزہ سیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس اعتبار سے ہر مسلمان حضرت حفیظ کے اس کارنامے کو قدر کی نگاہ سے دیکھے گا بلکہ یہاں تک امید کی جا سکتی ہے کہ ہر وسیع الخیال غیر مسلم بھی شاعر کے کمالِ فن کی داد دے گا۔

اکثر شعرا نے اس قسم کے بڑے کام بڑھاپے میں اپنے ذمہ لئے ہیں حفیظ کے جاننے والوں میں جن حضرات کی نظر سے ان کی وہ نظم گذری ہے جس کا عنوان ہے "ابھی تو میں جوان ہوں" انہیں شاید حفیظ کی شاعری کو اس شانِ بزرگی اور تقدیس میں جلوہ گر دیکھ کر تعجب ہو کہ ان کی طبع رسا بڑائی کے اتنے زینے ایک ہی جست میں کیوں کر طے کر گئی ہے مگر جو شخص اس کے تخیل کی بلند پروازی سے آگاہ ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ جست ان کے لئے دشوار نہ تھی۔ حفیظ عمر میں جوان ہے مگر شاعری میں بوڑھوں کی صف میں جلوہ گر ہے۔ زور طبیعت سے بسنت اور بہار پر ایسی نظمیں لکھتا ہے جس سے معلوم ہو کہ کوئی شخص جو رنگین مزاجی کے سب مرحلوں سے گزر چکا ہے آپ بیتی باتیں لکھ رہا ہے اور جوانی کو مست اور دیوانی دکھلانے میں اپنی کہانی سنا رہا ہے مگر یہ صرف خداداد ذہانت کے کرشمے ہیں۔ ورنہ اسے زمانے نے مہلت ہی نہیں دی کہ دنیا کی رنگینیوں کو قریب سے دیکھے یا ان کے مزے لے۔ صبح سے شام تک لکھتے پڑھتے گزرتی ہے اور لکھنا پڑھنا بھی ایسا کہ فرصت اور اطمینان سے نہیں بلکہ قوت لایموت کے لئے۔ کسی اخبار یا رسالے کے لئے کچھ کام کیا۔ جس کا تھوڑا بہت معاوضہ مل گیا۔ کوئی کتاب لکھی جو کسی نے سستے داموں خرید لی۔ اس پر رسالہ مخزن کے ایڈیٹر کی ذمہ داریاں۔ مشاعروں اور پبلک جلسوں کے لئے نظمیں لکھنا اور پڑھنا۔ یہ حالات تھے جب شاہنامہ اسلام لکھنا شروع کیا۔ مخزن کے دفتر اور وہاں آنے جانے والے ملاقاتیوں سے بھاگ کر اپنے وطن مالوف جالندھر کے پرانے مکان میں گوشہ تنہائی اختیار کرنا پڑا۔ وہاں سے کبھی لاہور آنا ہوا تو قدردانوں سے خط و کتابت کے لئے وہ اپنے آپ منشی۔ اپنی کتاب کے پروف دیکھنے کے لئے وہ اپنے آپ مصحح

اور مطلب والوں سے تعارف کرانے کے لئے وہ اپنے آپ ہی ہیں۔ ان کی محنت و مصروفیت دیکھ کر غالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مگر خدا کی حکمتیں خدا ہی جانے شاید یہی حالات ہیں جو باوجود مالی مشکلات اور کثرتِ کار کے توسنِ طبع کے لئے تازیانہ کا کام دیتے ہیں اور روحانی زندگی کی بحالی کا باعث ہیں۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ شاعری کی قوت کو مفید مذہبی خدمت کی تحریک انہی اسباب سے ہوئی ہے

چند سال ہوئے جب میں نے حفیظ کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ شاید اکثر لوگوں نے بھی انہیں لاہور میں اسی زمانے میں دیکھا ہو۔ اس سے پہلے کوئی انہیں پہچانتا نہ تھا۔ مگر پہلے ہی موقعہ پر جب وہ لب کشا ہوئے تو سب جان گئے اور مان گئے کہ ادب اردو پر ایک نیا ستارہ چمکا ہے۔

لاہور میں ایک بڑا مشاعرہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے کی کرسیوں پر چند کہنہ مشق شاعر متمکن ہیں۔ اور ان میں ایک نو عمر سا شخص دبلا پتلا بہت سادہ لباس پہنے ہوئے بیٹھا ہے جو ہر ایسے شعر پر جو داد کے قابل ہو داد دیتا ہے اور یوں اس کے دل کی کیفیت ایک خاص طرزِ اظہار رکھتی ہے یعنی شعر سنتے ہی وہ ہمہ تن داد بن کر اپنی جگہ سے اٹھنے کو ہوتا ہے اور تالیاں ہاتھ بجا کر اور انگشت شہادت شاعر کی طرف اٹھا کر کہتا ہے "کیسا اچھا شعر ہے"

یہ بے ساختہ اظہار خیال چونکہ کسی قدر نرالا ہوتا ہے میری توجہ اس طرف ہوئی میں نے کسی صاحب سے پوچھا "یہ کون صاحب ہیں؟" انہوں نے کہا "ہمیں نام تو معلوم نہیں مگر سنا ہے کہ جالندھر سے آئے ہیں اور مولانا گرامی کے شاگرد ہیں۔"

میں مولانا کے فارسی کلام کے مداحوں میں تھا اور ان سے ذاتی مراسم رکھتا تھا وہ بھی کبھی کبھی اسی طرح انگلی اٹھا کر اور یہ کہہ کر "اونچے پائے کا شعر ہے" اپنے دوستوں کے کلام کی داد دیا کرتے تھے۔ شاگرد میں کچھ استاد کی جھلک نظر آئی اور میں انتظار میں بیٹھ گیا کہ ان کا کلام سن کر جاؤں گا۔ تھوڑی دیر بعد حفیظ صاحب کی باری آئی۔ جب یہ پڑھنے کو اٹھے تو ایک اور مشابہت ان میں اور ان کے استاد میں نظر آئی۔ نہ ان کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ فارسی کے ایسے ادیب اور نامور شاعر ہیں نہ ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ اردو نظم میں ایسی دستگاہ رکھتے ہیں۔ مگر ہوا یہ کہ ایک تو کلام سادہ پرکار تھا اور دوسرے آواز دلکش۔ نظم لے سے پڑھی گئی اور جلسے پر ایک بے خودی سی چھا گئی۔ میں نے اس کے بعد بارہا حفیظ کو بڑے بڑے جلسوں کو مسحور کرتے دیکھا ہے اور ان کی پراثر لے سنی ہے جس سے اب ہندوستان سے دکن تک لوگوں کے کان آشنا ہو چکے ہیں مگر اس دن کی کیفیت چونکہ اپنے رنگ میں بالکل نئی تھی اس لئے نہیں بھولتی۔ معلوم نہیں حفیظ صاحب کے نام کے ساتھ ابوالاثر کا لقب اس دن سے پہلے تھا یا نہیں۔ نہ مجھے یہ خبر ہے کہ یہ نام انہوں نے خود رکھا ہے یا کسی نے ان کے لئے تجویز کیا ہے مگر یہ ضرور کہوں گا کہ ان کے لئے موزوں اور نہایت موزوں ہے۔ فی الواقع اثر ان کے کلام کا غلام خانہ زاد ہے۔

ابوالاثر نے جس دن سے نظم کی بنسری بجائی ہے اس بنسری سے طرح طرح کے راگ نکلتے ہیں اور نظموں کے اس مطبوعہ مجموعہ میں جس کا نام "نغمہ زار" ہے اور بعض غیر مطبوعہ نظموں میں جو اس کے بعد لکھی گئی ہیں اس نے اپنی وسیع ہمدردی اور اپنی قدرتی شاعری کے میلان سے کہیں کرشن کے گن گائے ہیں اور کہیں پریت کے گیت سنائے ہیں۔ مگر اس نے تھوڑے عرصے میں محسوس کر لیا کہ شعر کے لحاظ سے جو بات پیغمبر اسلام کی زندگی کے واقعات میں ہے وہ کسی دوسرے انسان کی زندگی میں نہیں پائی جاتی اور اگر کلام میں سچی اور پائیدار تاثیر ڈھونڈنی ہے تو ایسے چشمہ فیض سے سیراب ہونا چاہئے جس کا پانی کلام کے حق میں آب حیات بن جائے اور اسے جاودانی زندگی بخش دے۔ پس اس میں شک نہیں کہ حفیظ نے جو مضمون اب چنا ہے وہ ذریعہ الہام اور اس کی شاعری اپنی صفائی اور سادگی کے جوہروں کے ساتھ مذہب اور اخلاق کی علم بردار ہو گئی ہے۔

جب سے شاہنامہ اسلام کے چھپنے کا اعلان ہوا ہے میں نے کئی لوگوں کو اس نام پر اعتراض کرتے سنا ہے کوئی کہتا ہے کہ فردوسی سے برابری کا دعویٰ اسی سے نکلتا ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ پہلے حصہ میں ہمارے مذہبی بادشاہوں کا حال درج ہے اور آگے چل کر دنیاوی بادشاہوں کے حالات ہوں گے اور یہ کس قدر بے جوڑ سی بات ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ بحیثیت مجموعی شاید کسی اور کے نام سے اس جامعیت کے ساتھ مصنف کے ارادے

کا اظہار نہ ہو سکتا۔ پیغمبر اسلام شاہِ دین بھی تھے اور شاہِ دنیا بھی اور یہی حال خلفائے راشدین کا تھا۔ پس انہیں شاہ کہنا اور ان کے حالات کا نام شاہنامہ لکھنا بھی غیر موزوں نہیں ہے بلکہ اگر صرف بزرگانِ دین کا حال اس میں درج ہوتا تو میں اسے شہنشاہ نامہ کہدیتا۔ نام نیا بھی ہوتا اور حسبِ حال بھی مگر اس میں سب بادشاہانِ اسلام کے حالات آئیں گے رہا فردوسی کی ہمسری کا دعویٰ۔ سو مصنف نے اپنے عجز و انکسار کا کافی اعتراف اپنے تمہیدی اشعار میں کر دیا ہے۔ اگر سوءِ ادب کا مرتکب ہوئے بغیر مصنف نے یہ ہمت کی کہ رزم و بزم کے اس وسیع میدان میں تگ و دو کرے جس میں فردوسی جیسا بڑا شہسوار اپنی شہسواری کے جوہر دکھا چکا ہے تو کم از کم یہ بلندیٔ ہمت کی دلیل ہے۔ باقی حسنِ قبول خدا کے ہاتھوں میں ہے۔ فردوسی نے فارسی میں حق شاعری ادا کیا اور حفیظ اردو میں طبع آزمائی کر رہا ہے اگر اردو والوں کو اپنی زبان میں ایسی کتاب ملے جو پہلوانان و رہبرانِ اسلام کی یاد کو اس طرح تازہ کردے جس طرح فردوسی نے غیر معروف پہلوانوں اور آتش پرست بادشاہوں کی بھولی ہوئی کہانیوں کو تازہ کر دیا تھا تو اردو ادب یقیناً مدت دراز حفیظ کا شرمندۂ احسان رہے گا۔

کوئی تصنیف ہو اور کتنی ہی پسند کی جائے اس کے مصنف کی حوصلہ افزائی اس سے ہوتی ہے کہ اسے اپنی محنت کا صلہ کچھ مالی شکل میں بھی مل جائے۔ فردوسی نے شاہنامہ لکھا۔ اس وسیلے پر کہ بادشاہِ وقت سلطان محمود غزنوی اسے بیش قرار انعام دے گا۔ اس تحریص کے بغیر شاید اتنا بڑا کام انجام نہ پاتا۔ حفیظ ایسے زمانے میں پیدا ہوا ہے کہ اس کے لئے اس کی قدر دان اردو دان پبلک ہی محمود بن سکتی ہے اور کم از کم یہ بات نہایت ہمت دلانے والی ہے کہ سینکڑوں خریداروں نے کتاب چھپنے سے پیشتر اور اسے دیکھے بغیر کتاب کے دام پیشگی مصنف کے پاس بھیج دیے ہیں اور مصنف نے وہ روپے کتاب کی چھپائی پر لگا دیے۔ اس کے بعد جو روپے آئیں گے وہ دوسری جلد کی تیاری میں صرف ہوں گے اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہے گا۔ اگر مصنف کو اپنی دل سوزی اور دماغی محنت کا کچھ معاوضہ ملے گا تو اس رقم میں سے جو سب جلدوں کے چھپنے کے بعد اس کے پاس بچ سکے گی۔ امید ہے کہ کتاب کی قدر دانی اس کے شائع ہوتے ہی اور ترقی کرے گی اور شاہنامہ اسلام کو اس مایوسی سے سابقہ نہ پڑے گا جو مالی اعتبار سے دنیا کی اس اہم تصنیف کو نصیب ہوئی تھی جس کے عالی شان نام سے حفیظ نے استفادہ کیا ہے۔

پہلی جلد چونکہ اب تیار ہے اس میں سے چیدہ چیدہ نمونے کے طور پر اس دیباچے میں درج کرنے کی ضرورت نہیں۔ اہل نظر کی نگاہ ان حصوں کو ڈھونڈ لے گی لیکن خوش قسمتی سے مجھے یہ کتاب شائع ہونے سے پہلے مل گئی اور میں نے اسے شوق سے پڑھا۔ اس لئے کچھ اشعار بے ساختہ زبان قلم پر آتے ہیں سب سے پہلا شعر جو ابتدائی اشعار میں مجھے پسند ہے وہ ہے جس میں شاعر نے وجہ تالیف بتاتے ہوئے اپنی آرزو کو ان سادہ مگر موثر لفظوں میں بیان کیا ہے ؎

تمنا ہے اس دنیا میں کوئی کام کر جاؤں
اگر کچھ ہو سکے تو خدمت اسلام کر جاؤں

میں سمجھتا ہوں یہ تمنا پہلی جلد ہی میں بہت حد تک پوری ہو گئی ہے اور بیش بہا سبق نظم کے پیرائے میں اس میں دیے گئے ہیں انہیں واقعی خدمت اسلام کہا جا سکتا ہے

شاعر نے فردوسی کے شاہنامہ اور اپنے کام کا ذکر بہت اچھے طریق سے کیا ہے جس میں واجبی انکسار کے علاوہ صورت واقعہ اور دلی درد کا اظہار ہے:

کیا فردوسی مرحوم نے ایران کو زندہ　　خدا توفیق دے تو میں کروں ایمان کو زندہ
تقابل کا کروں دعویٰ یہ طاقت ہے کہاں میری　　تخیل میرا ناقص نامکمل ہے زباں میری
زبانِ پہلوی کی ہم زبانی ہو نہیں سکتی　　ابھی اردو میں پیدا وہ روانی ہو نہیں سکتی
کہاں ہے اب وہ دورِ غزنوی کی فارغ البالی　　غلامی نے دبا رکھی ہے میری ہمت عالی

آخری مصرعے میں جو درد ہے اس سے آج کل کے اکثر نوجوان آگاہ ہیں اور فی الحقیقت ہمتیں اس زمانے میں بہت پست ہو رہی ہیں مگر جس بلند ہمتی کا ثبوت ہمارے شاعر نے دیا ہے وہ قابل تعریف ہے کہ ناداری کے سنگ گراں کے باوجود ایسے اہم کام کا بیڑا اٹھایا ہے جس سے بڑے بڑے سرمایہ دار گھبرائیں اور باوجودیکہ آغاز کار کے وقت یہ معلوم نہ تھا کہ جو ہزار اگر لکھے بھی گئے تو چھپ سکیں گے کہ نہیں، یہ دھن سے لکھتا چلا گیا اور لکھتا جا رہا ہے۔

پیغمبر عرب کی ولادت کا بیان کرنے سے پہلے شاعر نے ان کے جد امجد حضرت اسماعیل کا حال لکھا ہے۔ جب حضرت ابراہیم اپنی بیوی کو ہمراہ لے کر عرب کی طرف آئے تو اس مختصر سے قافلے کا صحرائے عرب میں سفر ذیل کے تین شعروں میں بہت پاکیزہ لفظوں میں بیان ہوا ہے ؎

خدا کا قافلہ جو مشتمل تھا تین جانوں پر
معزز جس کو ہونا تھا زمینوں آسمانوں پر

چلا جاتا تھا اس تپتے ہوئے صحرا کے سینے پر
جہاں دیتا ہے انساں موت کو ترجیح جینے پر

وہ صحرا جس کا سینہ آتشیں کرنوں کی بستی ہے
وہ مٹی جو سدا پانی کی صورت کو ترستی ہے

یہ خوبی ساری کتاب میں نمایاں ہے جو بیان کوئی اور بیس شعروں میں کرے ہمارا شاعر تین شعروں میں کر دیتا ہے اور الفاظ کی سادگی اور کلام کی رنگینی دلچسپی ملحوظ رہتی ہے۔

آنحضرتؐ کے دنیا میں تشریف لانے کے متعلق جو اشعار لکھے ہیں انہیں پڑھ کر عاشقان نبی پر حالت وجد طاری ہو گی:

یہ کس کی جستجو میں مہر عالمتاب پھرتا تھا
ازل کے روز سے بیتاب تھا بیخواب پھرتا تھا

کروڑوں رنگتیں کس کے لئے ایام نے بدلیں
ہیا لے گردشیں کس دھن میں صبح و شام نے بدلیں

یہ سب کچھ ہو رہا تھا ایک ہی امید کی خاطر
یہ ساری کاوشیں تھیں ایک صبح عید کی خاطر

ان شعروں میں تو آپؐ کی آمد کی امید کا ذکر تھا۔ اب ذرا آمد کی شان ملاحظہ ہو ؎

معین وقت آیا زور باطل گھٹ گیا آخر
اندھیرا مٹ گیا ظلمت کا بادل چھٹ گیا آخر

مبارک ہو کہ دور راحت و آرام آ پہونچا
نجات دائمی کی شکل میں اسلام آ پہونچا

مبارک ہو کہ ختم المرسلیں تشریف لے آئے
جناب رحمۃ للعالمیں تشریف لے آئے

خبر جا کر سنا دو شش جہت کے زیر دستوں کو
زبردستی کی جرأت اب نہ ہو گی خود پرستوں کو

ضعیفوں بے کسوں آفت نصیبوں کو مبارک ہو
یتیموں کو، غلاموں کو، غریبوں کو مبارک ہو

کس عجیب پیرایے میں ان خصائل کا ذکر کیا گیا ہے جو آنحضرت کے اخلاق کا جزو تھیں اور کیسا لطیف اشارہ اس اہم کام کی طرف ہے جس کے لئے وہ مبعوث ہوئے تھے۔ میں حضرت حفیظ سے معافی چاہتا ہوں کہ مندرجہ بالا اشعار کی ترتیب میں میں نے کچھ تبدیل کر لیا ہے اور جس ترتیب سے انہوں نے لکھے تھے اس ترتیب سے نقل نہیں کئے۔ مجھے انہیں اس طرح پڑھنے میں کچھ خاص لطف آیا اس لئے یہ تصرف کیا۔ اس کے علاوہ اختصار بھی مدنظر تھا۔ امید ہے کہ صاحبان ذوق اصل ترتیب کے ساتھ پورا بند ملاحظہ فرمائیں گے اور بار بار پڑھیں گے۔

ولادت کے بعد یتیمی۔ دائی حلیمہ کی گود میں پلنا۔ پردادا کے زیر سایہ تربیت پانا۔ جوان ہو کر سچائی اور امانت میں شہرت حاصل کرنا۔ حضرت بی بی خدیجہ سے نکاح اور اس کے بعد وحی نازل ہونے اور پیغمبری ملنے کے تاریخی واقعات اختصار کے ساتھ مگر شاعرانہ خوش اسلوبی کو نباہتے ہوئے لکھے گئے ہیں۔ ان اشعار کو انتخاب کر کے یہاں لکھنے کی گنجائش نہیں۔ رسول برحق نے جو تکالیف فرض رسالت ادا کرنے میں اٹھائیں۔ مشکلات کا جو دلیرانہ مقابلہ کیا وہ حالات معنی خیز طریق سے نظم کئے گئے ہیں۔ اور آخر میں ہجرت اور غزوات کے تذکرے نہایت موثر پیرایے میں لکھے ہیں۔ جس شب کو آنحضرت

(باقی صفحہ ۴۷۳ پر)

شیخ سر عبدالقادر

حفیظ کا شاہنامۂ اسلام

شاہنامۂ اسلام کی پہلی جلد کو اگر حفیظ کی رزم نگاری کا نقشِ اول کہیں تو دوسری جلد جو اب شائع ہوئی ہے وہ لفظی اور معنوی طور سے نقشِ ثانی کہلانے کی مستحق ہے۔ ہر صاحبِ فن کا نقشِ ثانی نقشِ اول سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ جلد دوم میں اشعار کی آمد اور روانی پہلے سے زیادہ زورِ جوانی دکھا رہی ہے۔ پہلی جلد کو جو کامیابی نصیب ہوئی اس کے بعد دوسری جلد کے لئے کسی تمہید یا تقریب کی حاجت نہیں مگر مصنف کی محنت اور جگر کاوی کی مستحقِ اعتراف ہے اور جی چاہتا ہے کہ دوسری بار کا خیر مقدم بھی اسی جوش سے ہو جس کا اظہار پہلی جلد کی اشاعت کے وقت کیا گیا تھا۔

کامیابی کئی طرح کی ہوتی ہے۔ شاہنامۂ اسلام کو خدا نے ہر طرح سے کامیابی دی۔ کتاب اگر مقبول ہو اور بکثرت اشاعت پائے تو یہ اس کی پہلی اور سب سے بڑی فتح ہے۔ اس کتاب کی پہلی جلد جتنی چھپی تھی ایک سال کے اندر فروخت ہو گئی اور دوسری اشاعت کی نوبت آئی۔ اس کی خوبی کا دوسرا ثبوت یہ ملا کہ قرونِ اولیٰ کے رہبرانِ اسلام کے کارناموں کو نظم کا لباس پہنانے کی جو طرز حضرت حفیظ نے اختیار کی تھی اس کی تقلید جابجا ہونے لگی اور کئی لکھنے والوں نے اسی طرز پر اسلامی نظمیں شائع کیں۔ قبولِ عام اس تصنیف کو اس قدر حاصل ہوا کہ قومی مجالس میں جب کسی نے اسے پڑھ کر سنایا تو لوگوں نے انتہائی توجہ اور شوق سے سنا اور جہاں کہیں لوگوں کو خود مصنف کی زبان سے شاہنامۂ اسلام کے کچھ حصے سننے کا موقع ہوا وہاں جیسے محویت طاری ہوگئی۔ عام قدردانی تو کتاب کی فروخت کی کثرت سے ظاہر ہوئی مگر زیادہ تر اس امر سے کہ بہت سے شائقین نے بہتر قسم کے مجلّد نسخے فی نسخہ بارہ بارہ روپے کو خریدے حالانکہ معمولی نسخہ کی قیمت تین روپے فی نسخہ تھی۔ ہمارے رؤسا میں سے ایک فیاض طبع اور نیک دل قدردان نے جن کے نامِ نامی کے اعلان کی اجازت نہیں شاہنامۂ اسلام جلد اول کا پہلا نسخہ ایک ہزار روپے میں خریدا۔ یہ سب باتیں حوصلہ افزا ہیں۔ ان سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے کلام کو بجا طور پر ملک میں قبولیت حاصل ہوئی ہے۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ابھی زندہ قوم ہیں اور اسلام کی سچی خدمت کو پہچاننے اور خادموں کی ہمت بڑھانے کی قابلیت رکھتے ہیں

پہلی جلد میں مصنف نے یہ کوشش کی تھی کہ جو روایات نظم کی جائیں وہ ایسی ہوں جن کی صحت تاریخی اعتبار سے مسلّمہ ہو۔ یہی احتیاط دوسری جلد میں ملحوظ رکھی گئی ہے بلکہ جابجا ایسے نوٹ دیئے گئے ہیں جن سے روایات کے ماخذ کا پتہ چلتا ہے اس احتیاط کے متعلق کچھ اشعار اس جلد میں "عذرِ مصنف" کے عنوان سے درج ہیں ان میں سے چند بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔ مصنف نے کیا خوب کہا ہے

مجھے ملحوظ ہے اس تذکرے میں راست گفتاری ۔۔۔ وگرنہ شاہبازِ فکر اڑنے سے نہیں عاری
جو موضوعِ سخن مجھ کو اجازت اک ذرا دیتا ۔۔۔ زمینوں کو اٹھا کر آسمانوں پر بٹھا دیتا
مجھے گر یاد ہیں قطرے کو طوفاں کر دکھانے کے ۔۔۔ کسی ذرے کو وسعت میں بیاباں کر دکھانے کے

میرے دامن میں ہے ابرِ خزانی بھی بہاری بھی
کہ ہے آتش فشانی بھی نفس میں برف باری بھی

تخیل پر نہیں بنیاد میرے شاہنامے کی
صداقت کی طرف جاتی ہے راہ اس نغمے کی

نہ کوئی داستاں ہے جس میں لطفِ داستاں بھر دوں
نہ افسانہ ہے جس کو جس طرح چاہوں بیاں کر دوں

یہ قرآنی بیاں ہے ایک کالی کملی والے کا
کہ جس کے نور سے ظلمت نے منہ دیکھا اجالے کا

ممکن ہے کہ مندرجہ بالا تعریف سے کوئی یہ سمجھے کہ کتاب نظم کے اعتبار سے روکھی پھیکی ہوگی اور جو حالات لکھے ہیں ان کی تصویر اگر مطابقِ اصل ہے تو اس میں مصور کو رنگ بھرنے کا کیا موقع ملا ہوگا مگر طبعِ رنگین اپنے لئے راستہ نکالے بغیر کہاں رہ سکتی ہے۔ سیدھی سادھی روایتوں کے منظوم بیان میں حفیظ کی شاعری نے اپنی خصوصیات کے اظہار کے لئے گنجائش نکال لی ہے اور دوسری جلد میں ایسے ادبی جواہر پیش کئے گئے ہیں جنہیں شائقین پسند کریں گے اور مزے لے لے کر پڑھیں گے۔ مثلاً جنگِ بدر کا بیان ہے کہ جہاں جنابِ رسالت مآب کا چھوٹا سا لشکر ایک ریگستانِ بے آب میں پانی کی تلاش میں ہے۔ اس وقت حسنِ اتفاق سے مینہ برس گیا۔ اس سادہ سی بات کو بیان کرنے کے لئے حفیظ کے تخیل نے یہ سماں باندھا کہ خود صحرا کے دل میں آرزو پیدا کی کہ جس طرح ہو سکے اپنے مقدس اور مقتدر مہمانوں کے لئے پانی بہم پہنچائے اور اس نے نہایت عجز سے بارگاہِ ایزدی میں دعا مانگی کہ آسمان سے پانی برسائے۔ وہ دعا منظور ہوگئی اور مینہ آگیا۔ اس موقع پر "دعائے صحرا" کے نام سے جو ٹکڑا حفیظ کے قلم سے نکل گیا ہے وہ ان کے ادبی کارناموں میں پائیدار شہرت کا مستحق ہے۔ یہاں تخیل نے اپنا زور دکھایا ہے مگر کسی تاریخی واقعہ میں تصرف نہیں کرنا پڑا۔ واقعہ اتنا ہی ہے کہ مینہ برسا اور ان لوگوں کی تکالیف رفع ہوگئیں جو پیغمبرِ اسلام کے ہم رکاب تھے مگر اس کے بیان کے پیرائے میں جدت پیدا کرنے سے مضمون رنگین ہوگیا ہے۔

ایک دوسری خوبی جو شاہنامۂ اسلام میں ملحوظ رکھی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ بزرگانِ سلف کی خوبیاں بیان کرتے کرتے ضمناً مگر نہایت دلآویز طریق سے اپنے اخلاق کی تلقین کی جاتی ہے جن کی موجودہ زمانے میں بھی ہم کو ضرورت ہے۔ اس مطلب کی وضاحت ذیل کے اشعار سے ہوگی جہاں اس چھوٹی سی فوج کا ذکر کرتے ہوئے جو جنگِ بدر میں اسلام کے ہادیٔ برحق کی اپنی سپہ سالاری میں خدا کی راہ پر پہلی لڑائی کرنے کو نکلی تھی۔ مصنف یوں نغمہ پیرا ہوتا ہے ؎

نہ کوئی زعمِ باطل تھا نہ کوئی ہوسِ ہنگامی
نہ فکرِ کامیابی تھی نہ ذکرِ خوفِ ناکامی!

نہ کثرت کی کوئی پروا نہ تھا قلت کا غم ان کو
نہ کچھ اندیشۂ پست و بلند و بیش و کم ان کو

نہتے تھے مگر تسکین دل اطمینان رکھتے تھے
کہ سامان پر نہیں ایمان پر ایمان رکھتے تھے

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ رزم کا آغاز زیادہ تر اسی جلد سے ہوتا ہے اور مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ رزم کے میدان میں بھی ہمارے مصنف کے اشہبِ قلم کی رفتار قابلِ تعریف ہے۔ ذیل کے رزمیہ ٹکڑوں میں صفائی بیان اور الفاظ کی موزونیت ملاحظہ ہو ؎

پڑی تلوار فولادی سپر کے ہوگئے ٹکڑے
میسر تا بہ سینہ پہنچی تو سر کے ہوگئے ٹکڑے

گلے کے ہار زنجیر داں کی لڑیاں کاٹ کر نکلی
زرہ بکتر کے بندھن اور کڑیاں کاٹ کر نکلی

بہت بے باک تھی یہ تیغ اب کچھ اور چل نکلی
کبھی شانے پہ چمکی اور کبھی زیرِ بغل نکلی

مخالف فوج کے سرگروہ ابوجہل کا بیان کرتے ہوئے کہ وہ میدان میں اپنے آپ کو کس طرح محفوظ کئے ہوئے تھا اور دل کڑا کر آتا تھا اور آپ تیغ کے منہ پر نہ آتا تھا۔ لکھا ہے ؎

مسلح پہلوانوں کی تھیں لوہا لاٹ دیواریں
جو اس کے آگے پیچھے چل رہے تھے لے کے تلواریں

کسی کی دسترس اس تک نہ ہوتی تھی بآسانی
کہ تھا اک چلتے پھرتے قلعے میں اس جنگ کا بانی

جلد دوم میں سب سے زیادہ پر لطف اور پر اثر وہ حصے ہیں جن میں جہاد کے اصلی معنی واضح کئے گئے ہیں اور وہ اصول بتائے گئے ہیں جو آنحضرت نے اپنی فتوحات کے بعد ملحوظ رکھے اور جن پر کاربند ہونے کی اپنے پیروؤں کو تاکید کی۔

یورپ کے سفر کا ارادہ حفیظ صاحب نے صحت کی بہتری کی امید سے کیا تھا اور ایک حد تک ان کی صحت کو فائدہ بھی ہوا۔ مگر سب سے بڑا کام جو اس ششماہی میں ہوا جو انہوں نے یورپ میں بسر کی۔ وہ یہ تھا کہ جلد سوم کا پہلا نصف ان دنوں میں تیار ہو گیا۔ اس میں ایک مضمون ایسا ادق تھا کہ اس کے لئے ان کی طبیعت غیر معمولی یکسوئی چاہتی تھی۔ اور وطن میں جو ان کے مشاغل تھے ان کے ساتھ سادہ کی یکسوئی میسر نہ تھی۔ انگلستان میں وہ ایک خاموش حصہ ساحل پر جا کر رہے تو وہ تنہائی اور خاموشی نصیب ہوئی جس سے ان کے قلم کو جنگ احد کا حال لکھنے کے لئے گویائی ملی

انہوں نے مجھے بتایا جو مشکل انہیں درپیش تھی اور جس نے بار ہا ان کے قلم کو روانی سے روکا یہ تھی کہ جنگ احد کے حالات جنگ بدر سے بالکل برعکس تھے بدر میں مسلمانوں کی فتح نمایاں اور احد میں افسوسناک شکست ہوئی تھی۔ اس کی وجہ اسلامی فوج کے بعض حصوں کی کمزوری اور بعض کی جانب سے صریح ہدایات کی عدم پیروی تھی۔ مصنف کی یہ خواہش تھی کہ شکست کے جو اسباب تھے وہ بھی بیان ہو جائیں مگر ان لوگوں کا پاس بھی ملحوظ رہے جو اس وقت حکم عدولی کے مرتکب ہوئے کیونکہ بعد میں رسول خدا نے ان کو معاف کر دیا اور ان میں بعض نے دوسرے مواقع پر نیک عمل سے اپنی کوتاہی کی تلافی کر دی۔ اس لئے اس مضمون کو اس احتیاط کے ساتھ بیان کرنا "کج دار و مریز" کا مصداق ہے اور میں جناب حفیظ کو مستحق مبارکباد سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اس دشوار منزل کو اس میں ایسی اچھی طرح طے کیا

جنگ احد میں دو کمزوریاں لشکر اسلام میں رونما ہوئیں۔ اول تو یہ کہ اس فوج میں سے جس کی تعداد صرف ایک ہزار تھی تین سو آدمی تو شروع ہی میں نکل گئے کیونکہ وہ دل سے مسلمانوں کے ساتھ نہ تھے اور ان کا سردار یہ بہانہ بنا کر کہ آنحضرت نے اس کے مشورے کو نہیں مانا فوج اسلام کا ساتھ چھوڑ گیا مگر آنحضرت اس کی بے وفائی سے چنداں متاثر نہیں ہوئے۔ اور باقی ماندہ فوج کو میدان جنگ میں اپنی اپنی معینہ جگہ پر جمے رہنے کی ہدایت فرمائی۔ ایک گروہ پچاس تیر اندازوں کا ایک ٹیلہ پر تعینات کیا گیا۔ جس کا یہ فرض تھا کہ وہ مخالفین پر تیر برسائیں انہیں ہٹائیں اور کسی حالت میں بھی اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔ دوسروں کو یہ ہدایت تھی کہ لوٹ مار کی طمع کر کے اپنے دشمن سے غفلت نہ کریں۔ لیکن ہوا یہ کہ نہایت سخت لڑائی کے بعد جس میں اللہ فدایان رسول نے شجاعت کی پوری داد دی۔ اسلامیوں کی فتح ہونے کو تھی جب بت پرست قریشیوں کو بھاگتا دیکھ کر مسلمان یہ سمجھے کہ غنیم اب بالکل ہار گیا ہے اور مخالفین کے خیموں کو لوٹنے اور مال غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہو گئے۔ انہیں لوٹتا دیکھ کر تیر اندازوں میں سے اکثر نے جنہیں ٹیلہ سے کسی طرح نہ ہٹنے کی تاکید کی تھی لوٹ میں شمولیت شروع کر دی اس وقت خالدؓ ابن ولید جو ابھی مشرف بہ اسلام نہ ہوئے تھے اور دوسری طرف کے ایک بڑے جنگی افسر تھے اپنا جنگی رسالہ بڑھا کر فوج اسلام پر حملہ کر دیا جس سے بچنے کے لئے یہ اندازوں کو ٹیلہ پر متعین کیا گیا تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی رہی سہی ہمت جاتی رہی۔ جب انہوں نے یہ غلط خبر سنی کہ آنحضرت صلعم اس جنگ میں شہید ہو گئے حالانکہ واقع یہ تھا کہ حضور زندہ و سلامت تھے۔ حضور نے جو عزم و استقلال اس جنگ میں دکھایا اس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے کیونکہ باوجود مجروح ہونے کے آپؐ آخر تک دشمنوں کا مقابلہ کرتے رہے اور دشمن کے بڑے بڑے جری سالاروں کو تہ تیغ کیا۔ یہ سب حالات اور جو سبق ان سے حاصل ہوتے ہیں سلیس اردو اور پُر اثر شعروں میں جس خوبی سے نظم ہوئے ہیں داد کے قابل ہے

کتاب کی مخصوص خوبیوں کے ساتھ حفیظ کی طبع رسا نے جا بجا رنگینیٔ کلام کے بھی جوہر دکھائے ہیں۔ عربی کے اس مشہور گیت کا اردو ترجمہ قابل تحسین ہے جو ان عرب عورتوں نے جنگ احد کے موقع پر گایا تھا جو مخالف اسلام قریشیوں کو حوصلہ دلانے اور جنگ پر ابھارنے آئی تھیں اس کے عربی جاننے والے ترجمہ کی خوبی کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ عربی کے گیت کی روح اردو الفاظ میں کس عمدگی سے آ گئی ہے۔

چھوٹی بحروں میں اور سادہ لفظوں میں گانے کے قابل نظم لکھنا حفیظ کے فن کا ایک شیوہ خاص ہے۔ ایک گیت علم نبوی کی شان میں لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ گیت مسلمانوں میں اس قدر مقبول ہو کہ وہ اپنے سیاسی جلسوں میں پرچم اسلامی لہرائیں تو یہی ترانہ زبان پر لائیں۔

میں اقتباسات سے دیباچہ کو طول دینا نہیں چاہتا۔ آپ کو مطالعہ سے خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ ایک واقعہ حضرت ام عمارہؓ کے متعلق ہے جو ایک نہایت باہمت بی بی تھی جو زخمیان جنگ کو پانی پلاتی تھی اس کا شوہر اور فرزند بھی شریک جنگ تھے۔ جب اس نے دیکھا کہ رسولؐ کی ذات پاک پر حملہ ہو رہا ہے تو مشک ہاتھ سے رکھ کر جنگ کے لئے کمربستہ ہو گئی۔

یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ اس پر وہ قوم جس میں ایسی بیبیاں پیدا ہوئی ہوں جس قدر فخر کرے کم ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ رسالت میں عورتیں

جنگوں میں شریک ہوتی تھیں۔ زخمیوں کی امداد کرتی تھیں اور وقتِ ضرورت حرب میں بھی شریک ہو جاتی تھیں اس لئے اس بی بی کی تعریف جناب حفیظ نے ان دو اثر بھرے مصرعوں میں کی ہے ؎

یہی مائیں ہیں جن کی گود میں اسلام پلتا ہے
اسی غیرت سے انسان نور کے سانچے میں ڈھلتا ہے

ایک عنوان ہے "خالد کی حیرت" اس میں شاعر نے دکھایا ہے کہ خالد اگرچہ اس وقت کفر کا حامی اور اسلام کا مخالف تھا مگر اس کے دل میں آنحضرتؐ کے اعلیٰ خصائل کا اثر اس میدان جنگ میں بیٹھا۔ اگرچہ وہ اس وقت مشرف بہ اسلام نہ ہوا لیکن اس کے جوشِ اسلام اور خدمت دین کی بنیاد یہیں پڑی یہاں تک کہ وہ اسلامی فوجوں کا ایک زندہ جاوید اور بلند نام سردار بن گیا۔ اس کے دل کے تاثرات کا حفیظ نے جس طرح کھینچا ہے اس کو پڑھیئے اور دیکھئے کہ شاعر کس طرح دونوں پر قابو حاصل کر لیتا ہے۔

شاہنامہ اسلام کی تیسری جلد کی خوبی کلام کے نمونے بطور اقتباس درج کرنے کی ضرورت نہیں۔ دو ہزار سے اوپر اشعار اور ان کے چیدہ چیدہ حصے اصل کتاب میں دیکھیں اور اس خادم اسلام کے حق میں دعا کریں جس نے اپنی زندگی تاریخ اسلام کو لباس نظم سے آراستہ کر کے مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے وقف کر رکھی ہے۔

(شاہنامہ اسلام - جلد سوم)

تقریب (صفحہ ۴۶۷ سے آگے)

ہجرت کے ارادے سے مکہ شریف سے کفار کے نرغے کے باوجود نکلتے ہیں۔ دیکھئے اس کا بیان کس انداز سے ہوا ہے ؎

نظر آتی تھیں چاروں سمت تلواریں ہی تلواریں
اندھیرے میں چمک اٹھتی تھیں بجلی کی طرح دھاریں

وہ دیتا ہوا۔ وحدت کا دم بھرتا ہوا نکلا
تلاوت سورۂ یٰسین کی کرتا ہوا نکلا!

کھنچی رہ گئیں خونریز و خوں آشام شمشیریں
کسی نے کھینچ دی ہوں جس طرح کاغذ کی تصویریں

مدینے پہونچنے پر جو زندگی مسلمانوں نے اپنے ہادیٔ برحق کے زیر سایہ شروع کی اس کا نقشہ ذیل کے اشعار میں ملاحظہ ہو ؎

تھے انصار و مہاجر اک نمونہ شان وحدت کا
کہ اس تسبیح میں تھا رشتہ محکم اخوت کا

مسلمان تھے کہ تھیں زہد و ورع کی زندہ تصویریں
نمازیں اور تسبیحیں۔ اذانیں اور تکبیریں

تجارت یا زراعت یا دعائیں یا مناجاتیں
مشقت کیلئے دن تھے عبادت کیلئے راتیں

ان اقتباسات کو میں ان اشعار پر ختم کرتا ہوں جن میں مسئلہ جہاد پر جو حکم ہمارے رسول نے دیا ہے اسے واضح کیا گیا ہے۔ اس سے بہتر اصول وضع کرنا ناممکن ہے۔ افسوس کہ دنیا اس کے حکم کے متعلق گوناگوں غلطیوں میں مبتلا ہے ؎

تمہارا خدا اس تم کو لڑنے کی اجازت ہے
خدا کے دشمنوں کو دفع کرنے کی اجازت ہے

مگر تم یاد رکھو صاف ہے یہ حکم قرآں کا
ستانا بے گناہوں کو نہیں شیوہ مسلماں کا

نہیں دیتا اجازت پیش دستی کی خدا ہرگز
مسلماں ہو تو لڑنے میں نہ کرنا ابتدا ہرگز

فقط ان سے لڑو جو لوگ تم سے جنگ کرتے ہیں
فقط ان سے لڑو جو تم پہ جینا تنگ کرتے ہیں

خوش مذاق صاحبان کے لئے چند نمونے حفیظ صاحب کے تازہ ترین کلام کے اوپر درج کئے ہیں کافی ہیں۔ اب لازم ہے کہ وہ خود کتاب حاصل کریں اور پڑھیں اور صاحب دل شاعر کے حق میں دعا کریں کہ خدا اسے محنت کا صلہ دے اور توفیق دے کہ وہ اس اہم کام کو بخوبی انجام دے سکے جو اس جلد اول کی اشاعت میں شروع کیا گیا ہے۔

(شاہنامہ اسلام - جلد اول)

ڈاکٹر تاثیر

معیار

کسی نظم یا شعر کے متعلق کسی قسم کی رائے کا اظہار کرنا بظاہر ایک معمولی سی بات ہے۔ داغ کو ہوسناک۔ غالب کو قنوطی۔ انشا کو ہزال اور اقبال کو قومی شاعر کہہ دینا بدیہی مسئلہ معلوم ہوتا ہے۔ کیا داغ وصل اور بوسے کے الفاظ استعمال نہیں کرتا۔ کیا غالب زندگی کا رونا نہیں روتا۔ کیا انشا پھکڑ نہیں لڑھتا۔ کیا اقبال کا ترانہ ہر جگہ نہیں گایا جاتا؟ تو کیا یہ آرا بدیہیات میں سے نہ ہوئیں۔ کیا ان کے متعلق کسی مزید غور و فکر کی ضرورت ہے؟

مگر مشکل یہ ہے کہ یہ تمام تصورات ہوس۔ فلسفہ۔ ہزل۔ قومیت ایک طرزِ خیال کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتے۔ ایک طرف ان شعرا کی ایک عام مشترک خصوصیت کا ذکر کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان سب کو ایک ہی نام (شاعر) سے پکارا جاتا ہے اور دوسری طرف انہیں نفسیات۔ اخلاقیات اور مختلف معیاروں پر تولا جاتا ہے کسی کو ایک وجہ سے مقہور قرار دے دیا جاتا ہے اور کسی کو دوسری وجہ سے سراہا جاتا ہے۔ کیا تنقید کا یہ طریقہ صحیح ہے؟

یہ درست ہے کہ ہر تنقید سے حقیقتاً ذاتی پسند کا اظہار ہوتا ہے۔ نقاد کے اصول خواہ کس قدر مستند اور قدیم کیوں نہ ہوں ان کا اختیار کرنا بجائے خود ایک ذاتی فعل ہے اور ان کا اولین واضع ایک ہی فرد ہوگا مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بیک وقت ایک ہی فن کے متعلق مختلف معیار استعمال کئے جائیں نقاد کی پسند ذاتی سہی لیکن اس میں یگانگت کا ہونا ضروری ہے ورنہ تنقید محض ایک کھیل ایک دل لگی سی بن جائے گی۔ جو چاہے نقاد ہو جائے اور جو منہ میں آئے کہتا چلا جائے۔

تنقید کو ایک معین علم بنانے کے لئے چند ابتدائی امور کا تصفیہ ضروری ہے۔

کیا ادبی تصانیف کو جانچنے کے لئے ایک مقرر کردہ اصولی نظام (ایک خارجی ضابطہ) ضرورتاً درکار ہے؟

ہماری فصاحت و بلاغت کی پرانی کتب اس سوال کا جواب ہیں لیکن ان کی استنادی حیثیت قریباً مفقود ہو چکی ہے اور کیوں نہ ہوتی؟ عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو میں منتقل ہو کر بھی یہ کتابیں جوں کی توں رہیں۔ زمانہ اور اس کا مذاق بدل گیا مگر یہ نہ بدلیں اور کیسے بدلتیں جب ان کا اساسی اصول ہی یہ ہو کہ تبدیلی گناہ ہے اور جب ان کے پاس ہر شعبہ ادب کے لئے ایک ہی معیار ہو۔

مگر ان کتب کی نامقبولیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام تجزیاتی ہیں۔ ان کے نزدیک ایک متحد تصنیف کو جانچنے کے لئے اسے پرزہ پرزہ کر ڈالنا ضروری ہے اور پھر ان کے پیش کردہ معیار یوں بھی تسلی بخش نہیں

حقیقت یہ ہے کہ مختلف انواعِ ادب کیا ایک ہی نوع کے مختلف مظاہر کو کسی ایک ضابطے سے جانچنا غلطی ہے۔ یہ ہی نہیں کہ نثر و نظم (ڈراما۔ افسانہ غزل وغیرہ) کے لئے خاص معیار بنانا ضروری ہے بلکہ ایک شاعر سے دوسرا شاعر مختلف ہے اور مختلف معیارِ تنقید کا حقدار ہے ورنہ ادبیات میں جدت

کا خاتمہ ہو جائے اور فقیہوں کے استدلال کل جدید بدعت - کل بدعت" ضلالۃ - کل ضلالۃ فی النار کی نذر ہو جائے -

اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ہر تصنیف کو اس کے داخلی معیار سے دیکھیں - یہ دیکھیں کہ لکھنے والے کا مقصد کیا تھا اور وہ اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہے - یہ نہ ہو کہ غزل گو کو اس لئے دھتکار دیا جائے کہ اس میں "پیام" نہیں اور "بانگ درا" کو اس لئے غیر شاعرانہ کہہ دیا جائے کہ اس میں تغزل کمیاب ہے - اس انفرادی معیار کو قائم کرنے کے بعد ہم یہ پوچھنے کے مجاز ہو سکتے ہیں کہ کیا مقصد بذاتِ خود قابل قدر ہے اور اگر ہے تو کیا اسے ادبیات میں شامل کیا جا سکتا ہے؟ اور اسے کس نوع ادب میں شمار کرنا چاہئے نثر یا نظم میں ، افسانے میں یا ڈرامے میں ؟ مگر عام طور پر یہ بحث ایک حد تک غیر ضروری اور خارجی ہوگی -

یہ کوئی ایسی پیچیدہ باتیں نہیں ہیں مگر ان کے پیشِ نظر نہ ہونے کی وجہ سے عجب عجب مضحکہ خیز مغالطے پیدا ہو جاتے ہیں - چند سال ہوئے دلی میں کسی بزرگ نے ایک انگریز شاعر کے نظریۂ شاعری کو معیار بنا کر غالب کو تحت الثریٰ میں گرا دیا - معمولی مفروضات و روایات سے بے خبر نوجوان ہماری مشرقی شاعری کو سرے سے بے معنی قرار دے ڈالتے ہیں - ہمارے یو۔پی کے پرانے استاد لوگوں نے اقبال کو تو جو کچھ سمجھنا تھا سمجھا - اپنے ہم وطن اکبر کو بھی نہ چھوڑا جس پر انہیں تنگ آکر کہنا پڑا سہ

تم سے استادوں میں میری شاعری بیکار ہے
ساتھ سارنگی کا بلبل کے لئے دشوار ہے

جس طرح بلبل کے نغمے خارجی قانون سے آزاد ہیں اسی طرح ہر شاعر کو ایسی آزادی کا حق حاصل ہے - یہ نہیں کہ جھٹ کہہ دیا کہ "شاہنامۂ اسلام" ایک مثنوی ہے - اس کا وزن مثنوی کے مقررہ وزن سے باہر ہے - سعدی اور کبریٰ مرتب - نتیجہ ظاہر ہے - شاہنامۂ اسلام مثنوی بھی نہیں اور حفیظ شاعر بھی نہیں ـــ رباعی اور قطعات کی بحث بڑھانے والے نقاد بھی اسی تماش کے ہیں - اگر ان اہلِ فن بزرگوں کے معیار پر اکتفا کیا جائے اور معانی کو نظر انداز کر کے محض الفاظ کے الٹ پھیر کو شاعری کا منتہا قرار دیا جائے تو یقیناً جرکین اپنے وقت کا ملک الشعرا کہلانے کا مستحق نہ ہوگا - استادوں میں تو اب بھی متصور ہوتا ہوگا -

"شاہنامۂ اسلام" کا مقصد تلاش کرنے کے لئے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں - مصنف نے خود ہی اس کو واضح کر دیا ہے - ضروری ہے کہ کسی مصنف کا پیش کردہ مقصد ہی اس کا صحیح ادبی مقصد ہو -

گئی دنیا سے آقائی محمد کے غلاموں کی	بھلا بیٹھے جو یاد اپنے سلف کے کارناموں کی
ارادہ ہے کہ پھر ان کا لہو آئے پار گرما دوں	دلِ سنگین سخن کے آتشیں تیروں سے برماؤں
سناؤں ان کو ایسے ولولہ انگیز افسانے	کرے تائید جن کی عقل بھی تاریخ بھی مانے

سلف کے کارناموں کو ولولہ انگیز طریقے سے سنانا - یہ ہے شاعر کا مقصد - عقل اور تاریخ کی بندش غیر ضروری ہے - اس کا خیال اسی حد تک کرنا چاہئے جس حد تک اس پابندی سے ولولہ انگیزی میں نقص نہیں پیدا ہوتا - ظاہر ہے کہ اس صدی میں اگر خلافِ عقل واقعات پیش کئے جائیں تو ولولہ کی جگہ ہنسی پیدا ہوگی اسی طرح سلف کے ایسے تاریخی واقعات میں جن سے ہر خاص آگاہ ہے - تبدیلی کرنے سے اصل میں رکاوٹ پیدا ہوگی - مگر تصور کی وسعت کو روکنا عبث ہے

حفیظ نے اپنے مقصد کو اس طرح متعین کر کے اپنے راستے میں بہت سی مشکلیں پیدا کر لی ہیں - ہومر کے سامنے ایک افسانہ تھا جس میں وہ عشق و محبت حسد و نفاق ، رقابت اور جذبہ داری کی کشاکش کے ساتھ ہر طرح کے عقلی اور غیر عقلی واقعات بیان کئے جاتا تھا - فردوسی کے شاہنامے کا زمانہ بھی ماقبلِ تاریخ ہے - ہمارے مرثیہ نگاروں نے تاریخ کو طلسم بنا رکھا ہے جو چاہا جس طرح چاہا بیان کر ڈالا - حفیظ ان سب کے بعد آتا ہے اور سب سے بڑی مہم پیش نظر رکھ لیتا ہے - اس کے سامنے کوئی ایسی مثال نہیں جو اس کی رہنمائی کر سکے - وہ اپنی منزل بھی آپ تلاش کرتا ہے اور اپنا راستہ بھی خود ہی بناتا ہے - یقیناً اس کا راستہ پل صراط سے زیادہ کٹھن ہے - تخیل کو دبائے تو شاہنامہ محض منظوم تاریخ رہ جائے - واقعات کو بدلے تو تحریف کا مرتکب ٹھہرے - یہی تکالیف اس کے حق میں رحمت بن جاتی ہیں - یہی مشکلات اس کی کامیابی کو غیر فانی بنا دیتی ہیں - اور حفیظ کو حالی - اقبال اور اکبر کی صف میں جگہ حاصل کرنے کا حقدار کر دیتی ہیں -

"شاہنامۂ اسلام" (حصہ دوم) تاریخی کتابوں ، آیات ، اور احادیث کے حوالوں سے بھرا ہوا ہے - مصنف قدم قدم پر تاریخی تفصیلات کے بیان سے واقعات

کی صداقت ظاہر کئے جاتا ہے۔ اور اسلاف کے ان کارناموں کو مصوّر الفاظ اور مناسب اصوات سے زندہ کر دکھاتا ہے۔ تاریخی تفصیلات سے محض عقل کی تسلی ہوتی ہے۔ اس نظم میں ان کی قدر محض منفی حیثیت رکھتی ہے ع

مبارک جمعہ کا دن سترھویں تھی ماہ رمضاں کی

اور ع　یہ ستر اونٹ دو گھوڑے یہاں سیراب ہو جائے

ایک مسلسل بیان ہے ؎

بنایا اک عریشہ پھونس کا ارباب ہمت نے　　　قیام اس میں کیا محبوب رب العالمین نے

نبی نے امر فرمایا کہ دو اہل نظر جائیں　　　کہ بہ ساتھی ہوئی ہے جو نبی کی خبر لائیں

علی اور سعدؓ نے بڑھ کر نظر ہر سمت دوڑائی　　　قریشی کافروں کی ہر جانب چھائی ہوئی پائی

پلٹ کر عرض کی فوج گراں معلوم ہوتی ہے　　　زمیں گویا حرارت سے رواں معلوم ہوتی ہے

مقام عدوۃ القصویٰ کا ٹیلہ اک طرف رکھ کر　　　ہے آسودہ وادی کے دشمنوں کا اک بڑا لشکر

یہ اونٹوں کی تعداد۔ تاریخ اور دن کا تعین۔ عریشہ کی تفصیل، مقامات اور افراد کے نام۔ ان تفصیلات سے واقعیت کی فضا پیدا ہوتی ہے مگر اتنا کام تو ہر ایک بند بری بھلی طرح سرانجام دے سکتا ہے مگر حفیظ کا کمال یہ ہے کہ وہ اس ارضیہ کے آگے ایک جیتی جاگتی تصویر تخلیق کر دیتا ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ اس میں سنیما کا کس قدر اثر شامل ہے۔ یوں یہ واقعیت ادبیات حاضرہ کی عالمگیر خصوصیت ہے۔ یہ بات طلسم ہوشربا اور کسی جدید ناول کے مقابلے سے ظاہر ہوتی ہے۔ ہمارے مراثی میں بھی یہ حقیقت وضاحت سے نظر آتی ہے۔ ایسی جزئیات میں اس کا مظہر ہے گو زمانہ کی بدمذاقی اور ماحول کی نااستواری اسے کبھی کبھی ایہام نما کر دیتی ہے مگر حفیظ بیسویں صدی کا شاعر ہے۔ واقعیت اس کے "شاہنامہ" کی جان ہے جنگ بدر کا نقشہ ہے۔ بے جان واقعات نہیں ولولہ انگیز کارناموں کا بیان ہے

دشمنوں کا لشکر ؎

امڈتی دوڑتی اٹھتی ہوئی بڑھتی ہوئی آندھی　　　زمیں پر پھیلتی۔ افلاک پر چڑھتی ہوئی آندھی

امڈتی۔ دوڑتی۔ اٹھتی ۔۔۔۔ یہ سہانی الفاظ پے در پے آ کر معانی کی کس قدر صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ اس ٹکڑے میں اصوات کے مناسب استعمال کی اور مثالیں بھی نظر آتی ہیں

ہاں اس بریں نمودوں کی دھم دھم دف کی دف دف تھی　　　معانقہ کا لیوں کا شور تھا کتوں کی عف عف تھی

ان اشعار کو اگر کوئی اردو سے ناواقف انگریز بھی سن لے تو محض اصوات سے معانی کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ اصوات کے ساتھ مصوّر الفاظ مل کر واقعات کو کس طرح زندہ کر دیتے ہیں۔ انفرادی جنگ کا منظر دیکھئے حضرت حمزہ اور عتبہ کا مقابلہ ہے ؎

جناب حمزہؓ نے تلوار پر تلوار کو روکا　　　سبک دستی سے تھپکی دے کے مہلک وار کو روکا

نظر آیا نہ پھر اک جھنجھناہٹ کی صدا آئی　　　اڑی چنگاریاں تلوار سے تلوار ٹکرائی

ذرا مہلت جو پائی ایک پل دم دے سے حمزہؓ نے　　　سبک ہو کر نکالا اپنا ہاتھ حمزہؓ نے

لیا دشمن کو بڑھ کر تیغ زرخ فال کے نیچے　　　مگر عتبہ نے اپنا سر چھپایا ڈھال کے نیچے

حضرت زبیرؓ اور آہن پوش پہلوان ابو کرش کے مقابلے میں کہیں کہیں شگفتہ ظرافت کی بھی جھلک ہے جس سے مشتعل جذبات کو کچھ کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔ سننے والا دم لے کر آگے بڑھتا ہے ؎

نظر آیا کہ یہ انسان نہیں پتلا ہے آہن کا　　　کوئی حصہ بجز آنکھوں کے نظر آتا نہیں تن کا

بشر تھا یا کہ تھا بیڈول سا اک ڈھیل لوہے کا　　　چڑھا رکھا تھا اس نے تن کے اوپر خول لوہے کا

یہ کل آہن کی شاید ڈھل کے آئی تھی جہنم سے
زمیں پہ اپنے پیروں چل کے آئی تھی جہنم سے

بلا کے طعن تھے پر پیچ جو میں تھیں تسکا بل تھیں
سنانیں تھیں کہ دو دھن دار سانپوں کی زبانیں تھیں

جما کر پینترا کر کے اشارہ مرد غازی نے
انی رکھتے ہی اک کر جو مارا مرد غازی نے

ہوا میں کر دیا باطل کے نیزہ باز کا نیزہ
زمیں پر سر کے بل آیا غرور ناز کا نیزہ

قریشی پہلواں کے ہاتھ سے جب اڑ گیا بھالا
تو ہٹ کر ہاتھ اس نے قبضۂ شمشیر پر ڈالا

مگر اب جاں نثار احمد مرسل کی باری تھی
کہ برچھی ہاتھ میں تھی اور قضا کی ساز گاری تھی

جھپٹ کر شیر نے اک وار دشمن پر کیا کاری
جہاں آنکھوں کے دو سوراخ تھے برچھی وہاں ماری

سناں اس زور سے آہن کا چہرہ توڑ کر گذری
گھسی یہ تیر عدوئے دیں کا سر پھوڑ کر گذری

سر خود سر نے حق سے سرکشی کرنے کا پھل پایا
کہ پھل برچھی کا سر میں دوسری جانب نکل آیا

گرا فولاد کا پیکر زمیں پر سرنگوں ہو کر
تکبر بہہ گیا آنکھوں کے رستے موج خوں ہو کر

قفس کے ٹوٹنے سے طائر جاں اڑ گیا آخر
ادھر کھینچی جو برچھی زور سے پھل مڑ گیا آخر

جگہ جگہ مضمون آفرینی بھی کی گئی ہے ؎

یہ تیغ حمزہ تھی۔ دعوے تھے اس کو خاکساری کے
زمیں پر آ رہی کر کے دو ٹکڑے جسم ناری کے

اور جب تصور عقل کی اٹھی زنجیروں کو توڑ کر پرواز کشادہ کرتا ہے حفیظ کا جذبۂ نیاز و عقیدت تاریخی واقعات کے سہارے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ صحرا کی دعا میں صحرا کوئی بے جان بیابان نہیں خود دیدار یار کا بے کس تمنائی شاعر ہے۔ ہم ہیں، تم ہو، ہر صاحبِ دل ہے ؎

خبر کیا تھی الٰہی ایک دن ایسا بھی آئے گا
کہ تیرا ساقیٔ کوثر یہاں تشریف لائے گا

خبر کیا تھی یہاں تیرے نمازی آ کے ٹھہریں گے
شہید آرام فرمائیں گے غازی آ کے ٹھہریں گے

شاہنامہ اسلام میں وہ سب کچھ ہے جو رزمیہ نظموں میں ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ سب کچھ ہے جو اس قسم کی نظموں میں ہونا چاہئے۔ یقیناً حفیظ اپنے بیان کردہ مقصد میں کامیاب ہے جن لوگوں نے شاہنامہ کے کچھ حصص بھی سنے ہیں ان کے لئے یہ دعویٰ تحصیل حاصل ہے۔ وہ دل بہت ہی سنگین ہوگا جسے یہ آتشیں تیر نہ برما سکیں!

(شاہنامۂ اسلام جلد دوم)

"— میرے نزدیک اچھا شعر وہ ہے جس کے الفاظ کا تأثر جو شاعر کا مقصود ہے۔ قاری کے ذہن کو بھی متاثر کر دے

(حفیظ)

ڈاکٹر تاثیر

شاعرِ شباب

حفیظ کی شاعری امید افزا ابتدا سے تکمیل تک جا پہونچی ہے مگر میرے دل میں جو جگہ نغمہ زار کی نظموں کے لئے ہے وہ کسی اور نظم کے لئے نہیں۔ نغمہ زار کے بعد حفیظ نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ فن اور نفس مضمون کے اعتبار سے بلند تر ہے اور پختہ تر ہے۔ متانت اور علوِ تخیل۔ لطافت الفاظ سے اس طرح ممتزج ہوئے ہیں۔ کہ ادبیات میں ان کا مقام جاودانی ہے مگر جو سبک سیری جو فرحت فزائی نغمہ زار کے الفاظ معانی اور بحورؐ میں ہے وہ اور کہیں نہیں ملتی۔ نغمہ زار حفیظ کا شباب ہے اور اس میں شباب کی جملہ خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں اور جب تک اس عجوزہ دہر پر شباب مسلط ہے اس کا سکہ جوان ہمت دلوں پر جمارہے گا۔

کسی ایک نظم یا غزل کو دیکھو وہی شباب کی سرشوری، استغنا اور انانیت نظر آتی ہے۔ کرشن کنہیا، اس نام سے کسی قدر عقیدت وابستہ ہے مگر شاعر نے اس عقیدت کو طوقِ گردن نہیں بنایا اور شاعرانہ سربلندی سے طرب و غنا کی مسرتوں کی آرزو کی ہے:

بت خانے کے اندر
خود حسن کا بت گر
بت بن گیا آکر

وہ گوپیوں کے ساتھ   ہاتھوں میں دیے ہاتھ
رقصاں ہوا برج ناتھ

ہنسی میں جوئے ہے
نشہ ہے نہ مے ہے
کچھ اور ہی شے ہے
اک روح ہے رقصاں   اک کیف ہے لرزاں

ملہ حفیظ کے استعمال بحور و قوافی پر ایک مستقل مضمون درکار ہے (تاثیر)

آتا نہ اکیلے　　　ہوں ساتھ وہ میلے

سکھیوں کے جھمیلے

ہر نظم شباب کی حسن آفرینی اور جدت پسندی کا نمونہ ہے اور اس روحِ خیال کی ترجمانی کے لئے اسے انداز بھی تازہ ملا ہے نظم کی یہ صورت۔ یہ مسلسل قطرہ زنی جو سیلاب امواج سے زیادہ سنگ فرسا ہے اپنے ساتھ ایک مخصوص ترنم لائی ہے۔

شعر اور نغمے کا تعلق تو شاعری کے مظہر یعنی الفاظ سے ظاہر ہے۔ الفاظ کیا ہیں؟ اصوات ـــ ایسی آوازیں جن میں مختلف لوگوں نے مختلف معنی ڈال دیئے ہیں۔ شاعری کیا ہے؟ بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب۔ بہترین اصوات کا مجموعہ! یہی وجہ ہے کہ مشاہیر شعرا اپنے شاہکار روزمرہ کے سوقیانہ تجارتی لہجہ کو ترک کر کے لے میں پڑھتے ہیں۔ اگر ایران کا عارف تنز دنی بربط لے کر اپنی تصنیف گاتا پھرتا ہے تو "زبورِ عجم" کا مصنف "آسا کی دھن" میں سامعین کے قلوب پر حملہ ریز ہوتا ہے۔ شعرا اپنے اپنے ترنم پر ناز کرتے ہیں۔ اور حافظ تو موسیقی کی دیوی ناہید سے صف آرا ہو جاتا ہے

غزل سرائی ناہید صرفہ نبرد

در آں مقام کہ حافظ بر آورد آواز

شاعری تو اپنے مظہرِ صوتی یعنی الفاظ کی وجہ سے موسیقی سے ہم آہنگ ہے مگر یورپ کی جدید مصوری کے مدد سے تصویر کشی کو بھی موسیقی سے مماثل کرنا چاہتے ہیں۔ وسلر کی تصاویر کے نام "آہنگ ارزاق" "نغمہ زرد" مشہور عوام ہیں۔ غرض شاعری اور نغمے میں اگر فرق ہے تو شراب اور شیشے کا۔ اور شراب صافی اور شیشۂ شفاف کا فرق ایک عرب شاعر یوں بیان کرتا ہے

رق الزجاج ورقت الخمر　　　فتشاکلھا وتشابھا الامر

فکانما الخمر ولا قدح　　　وکانما القدح ولا خمر

(شفاف ساغر اور صاف شراب نے امتیاز دشوار کر دیا ہے۔ کبھی یوں معلوم ہوتا ہے کہ شراب ہے قدح نہیں۔ کبھی یہ کہ قدح ہے اور شراب نہیں)

حفیظ کا مروجہ طرز اس قدر مقبول ہوا ہے کہ اسے اب مقبولیت کی مضرتیں بھی لاحق ہو گئی ہیں۔ حاسدین کی زندگی کی دوڑ میں ان کا ہونا ضروری ہے اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں کہ شاعر کی ہمت کو مہمیز کر دیں مگر خطرناک وہ مخلص خوشامدی ہیں جنہوں نے اپنی ستائش کو تتبع کے انداز میں پیش کیا ہے۔ تبلوی اور پھر ایسی لطیف مترنم شاعری کے لئے فطری مناسبت درکار ہے ورنہ آواز تو کوئل اور مینڈک، بلبل اور چڈینگا بھی نکالتے ہیں!

مجھے ڈر ہے کہ تتبع کا یہ طوفان بدتمیزی کچھ عرصہ کے لئے اصل کے اوصاف کو بھی نہ چھپالے۔

"شباب اور نغمہ" یہ ہے حفیظ کے اس دورِ اول کی خصوصیت جس کی بنا پر میں "نغمہ زار" کو "نغمہ شباب" کہا کرتا ہوں۔ غالباً اس طرزِ خیال کی بہترین ترجمانی کا گیت ہے ـــ "ابھی تو میں جوان ہوں"

یہ آسمان یہ زمین

نظارہ ہائے دل نشین

انہیں حیات آفریں

بھلا میں چھوڑ دوں یہیں!

ہے موت اس قدر قریں　　　مجھے نہ آئے گا یقین

نہیں نہیں، ابھی نہیں!　　　ابھی تو میں جوان ہوں

شباب ہر جگہ اپنا نقطۂ نظر، اپنا طرزِ خیال پیش کرتا ہے۔ یہ "انانیت" نظم سے گزر کر غزل میں بھی نظر آتی ہے اور حفیظ میں LOCAL COLOUR اس قدر نمایاں ہے کہ جہاں کہیں ردیف میں "میں" یا "مجھے" ہوتی ہے۔ غزل کی سطح بہت بلند ہو جاتی ہے

لے جاؤ ساتھ ہوش کو۔ اے اہلِ ہوش جاؤ
ہے خوب اپنی بے خبری کی خبر مجھے

نا آشنا ہیں رتبۂ دیوانگی سے دوست　　　کم بخت جانتے نہیں کیا ہو گیا ہوں میں
قائم کیا ہے میں نے عدم کے وجود کو　　　دنیا سمجھ رہی ہے فنا ہو گیا ہوں میں
اٹھا ہوں اک جہانِ خموشی لئے ہوئے　　　ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدا ہو گیا ہوں میں

(دیکھو سوز و ساز)

مطلب پرست دوست نہ آئے فریب میں
بیٹھا رہا لئے ہوئے دامِ وفا کو میں!

(دیکھو سوز و ساز)

سیال جذبات کو اپنے من کی موج سے مختلف صورتوں میں ڈھال لینا مقابلۃً سہل ہے مگر یہ "خود نظری" نیچر کے جامد جسم کو بھی اپنی مرضی کے مطابق موڑ لیتی ہے "بسنت" ایک موسم ہے جو ابتدائے آفرینش سے یکساں خصوصیات کے ساتھ آتا جاتا رہتا ہے مگر حفیظ اس میں خوشی اور غم دونوں قسم کے جذبات کھ دیتا ہے اور آخری بند تو گویا بسنت کا ایک مستقل مجازی نشان SYMBOL بن گیا ہے:

اک نازنین نے پہنے　　　پھولوں کے زرد گہنے
ہے مگر اداس
نہیں پی کے پاس
غم و رنج و یاس　　　دل کو پڑے ہیں سہنے
اک نازنین نے پہنے
پھولوں کے زرد گہنے

غزل کا شعر ہے:

غنچہ غنچہ خوف سے بلبل کو نظر آیا قفس
پتے پتے پر ہوا دھوکا کفِ صیاد کا

مگر شباب خود نظری کی اس کاوش سے بہت جلد تنگ آ جاتا ہے اور فکر کے بوجھ سے آزاد ہو کر مناظر کی رو میں بہنے لگتا ہے: منظر کشی، مصوری میں ہو یا شاعری میں شباب کا آزاد مشغلہ ہے اور خالص مسرت کا بہترین نمونہ۔ اردو شاعری کے اس نئے دور میں یہ شعبہ بہت سے یورپ زدہ شعرا کا تختۂ مشق بنا رہا ہے۔ مگر تکلف اور جبر منظر کشی میں بالخصوص سخت نازیبا ہیں اس میدان میں بھی حفیظ جملہ معاصرین سے آگے نکل گیا ہے۔

نمودِ سحر

یکایک ایک اور کا　　　غبار شرق سے اٹھا

جو رفتہ رفتہ بڑھ چلا
اور آسماں پہ چھا گیا

حسینۂ نمود نے　　سیہ نقاب اٹھا دیا
فسونگر شہود نے　　طلسم شب مٹا دیا

یکایک ایک تازگی
یکایک ایک روشنی

نگاہ جاں میں آگئی　　حیات میں سما گئی
یکایک ایک نور کا　　غبار شرق سے اٹھا

یہ بند ٹیپ کے صحیح استعمال کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اسلوب ایسا تازہ ہے کہ ٹیپ پر تکرار کا شبہ نہیں ہوتا۔

اشنان

کنار گنگ برہمن　　جوان دیر۔ مرد و زن
چڑھا کے دیوتا کو جل
وہ جھک رہے ہیں مہ کے بل

وہ اک حسین گھاٹ پر　　نہار ہے ہیں گل بدن
برو ئے آب سر بسر　　کھلا ہوا ہے اک چمن

جھولا

آموں کے نیچے　　ڈالے ہیں جھولے
مہ پیکروں نے　　سیمیں تنوں نے
برق انگنوں نے

"برق انگنوں" کی ترکیب نے گویا ساکن جھولوں کی پینگیں آسمان پر ڈال دی ہیں:

"رکھوالا لڑکا"۔ "شب زاد نظارے"۔ اور ایسے متعدد نقشے اردو شاعری کا مستقل جزو بن چکے ہیں مگر یہ نیچرل شاعری محض "حواس خمسہ" کی شاعری ہے
اور یہ ظاہری حواس بذات خود دیرپا اور عمیق نہیں ہوتے۔ اردو شاعری میں یہ طرز انگریزی کے تتبع میں مروج ہوا مگر حفیظ اس پابندی سے بھی آزاد ہے اور اس کے
ماخذ (اگر شاعری جیسی بدیہی چیزوں میں ان کا ہونا ممکن ہے) یا رجحانات خالص ایشیائی ہیں۔ آزاد مرحوم جنہوں نے غالباً سب سے پہلے اس صنف کو کامیابی سے
ترویج دی محض اجزا شماری کرتے ہیں اور منظر کشی میں حواس خمسہ کی بجائے عموماً ایک حس بصارت ہی کو استعمال کرتے ہیں۔ اور عام اردو شاعروں کا یہی دستور
ہے۔ حفیظ منظر کشی میں عرب اور ایرانی شعرا کے راستے پر چلتا ہے۔ اس کا مقصد فقط نباتات و جمادات کا گنوانا نہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے آزادانہ دیکھتا ہے
اور دوسروں کی آنکھوں کے سامنے ظاہری اور دل کی آنکھوں سامنے ایک غیر فانی نقشہ پیش کرتا ہے جس میں جذبات اور حواس سب کا امتزاج ہوتا ہے۔ یہی
آزاد نگاہی ہے جو اسے یورپ زدہ شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ تم ان لوگوں کو چھوڑ دو جو نیچرل شاعری کو محض اس لئے سراہتے ہیں کہ یورپ اسے پسند کرتا ہے اور
ان کو بھی جو اپنی بے بسی پر تقلید مغرب سے تنفر کا پردہ ڈالتے ہیں۔ ان تعصبات سے بالا ہو کر دیکھو کہ نیچرل شاعری کا اصل مقصد کیا ہے اور کیا حفیظ
اس مقصد میں کامیاب ہے۔

امراء القیس کو لو کہ حواسِ ظاہری کا استعمال اس سے زیادہ خوبی سے کون کر سکتا تھا۔ برسات کا سماں دکھاتے ہوئے کہتا ہے:

کان ثبیرا فی عرانین وبلہ
کبیر اناس فی بجاد مزمل

یعنی موسلا دھار بارش میں کوہِ ثبیر یوں نظر آتا ہے جیسے کوئی بوڑھا سفید دھاری والا سیاہ کمبل اوڑھے ہوئے کھڑا ہو۔

عتابی کہتا ہے۔

والغیم کالمثوب فی الآفاق منتشر

یعنی گھٹا اس طرح ہے جیسے کوئی کپڑا تنا ہوا ہو۔ پھر کہتا ہے کہ یہ کپڑا بظاہر ٹھوس معلوم ہوتا ہے لیکن دھاریں بہنے لگیں تو خیال ہوتا ہے کہ اس میں... سوراخ ہو گئے ہیں اور گرنے لگے تو کہو گے کہ۔ وہ پھٹا۔ اور اگر بجلی چمکے تو کہو کپڑے میں آگ لگ گئی۔

یہ تو تھے کھلی ہوا میں رہنے والے عرب جنہیں مناظرِ قدرت سے خاص دلبستگی تھی ایرانی شعرا کا انداز دیکھو:

فارسی شاعری کے ابوالآبا ءرودکی کی غزل سنو:

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی　　　　یادِ یارِ مہرباں آید ہمی
ریگ آموو درشتیہائے او　　　　زیرِ پایم پرنیاں آید ہمی

کہتے ہیں رودکی نابینا تھا اور گویا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہمارے شعرا کے خلاف وہ بصارت کے علاوہ قوتِ سامعہ و شامہ کو بھی استعمال کرتا ہے پہلے شعر میں مولیوں کی بو یاد ہے اور دوسرے میں آمو دریا کی ریگ کے لمس کا تذکرہ ہے!

منوچہری کہ نیچرل شاعری کا باوا آدم ہے ایک مرغ آبی کی آزادی کا نقشہ کھینچتا ہے:

بر ساعتکی بط سخنے چند بگوید　　　　در آب جہد جامہ دگر بار بشوید
در آب کند گردن و در آب بر دید　　　　گوئی کہ مگر چیزکے در آب بجوید
چوں سینۂ عنبا اندیک لخت بپوید　　　　از ہر برش بجہد صد درِ شہوار

بط پانی کی سطح پر تیرتی پھرتی دکھلائی دیتی ہے۔

متاخرین شعرائے قاچار میں قاآنی اس صنف کا استاد سمجھا جاتا ہے لیکن میرے خیال میں وہ واقعہ بندی کا استاد ضرور ہے مگر منظر کشی کی حقیقت سے ناواقف ہے۔ اس کا وہ مشہور بہاریہ قصیدہ لے لو جو اس نے میرزا تقی خان کی شان میں لکھا ہے۔ تم دیکھو گے کہ عبارت کی روانی۔ لغت کی وسعت۔ محاکات کی درستی غرض شاعری کے حسن کا بہترین نمونہ موجود ہے۔ ہر شعر ایک مستقل تصویر ہے۔ مگر تمام اشعار مل کر ایک متحد منظر پیش نہیں کرتے اور ایک شعر دوسرے شعر پر کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ قاآنی جملہ حواسِ خمسہ کو استعمال کرتا ہے مگر ان سب کو ممتزج کر کے ایک متوازن نقشہ نہیں بناتا۔

نسیم خلد می وزد مگر ز جوئبار ہا　　　　کہ بوئے مشک می دہد ہوائے مرغزار ہا
نوائے خویش فاختہ دو صد اصول ساختہ　　　　ترانہا نواختہ چو زیر و بم تارہا

دیکھو فاختہ ساختہ اور نواختہ کے اندرونی قوافی کس قدر مترنم ہیں۔ اگلے شعر میں یہ اثر اور بھی تیز ہو جاتا ہے

ز ریزش سحابہا بر آبہا حبابہا　　　　چو جوئے نقرہ آبہا روان در آبشارہا

جوئبار کی ہوائیں اور مرغزار کی خوشبو۔ طیور کی صدائیں اور حبابِ آبجو کے نقشے خوب ہیں مگر ان طویل جزئیات کے بعد پھر وہی سہ

فراز سرو بوستاں نشستہ اندر قمریاں　　　　چو مقریان نغز خواں ز منبریں منارہا

اس کی تشبیہات بھی کئی دفعہ محض بے جان رسمی صفات کا اعادہ ہوتی ہیں۔ مثلاً ابوالمظفر محمد شاہ کی مدح میں لکھتا ہے ؎

از سبزہ چمن چو روضۂ رضواں
از لالہ دمن چو سینۂ سینا!

حضرت علی بن موسیٰ الرضا کی مدح میں:

ز فیض لالہ و سوسن ز نور نور دسترد ان
دمن چوں وادیٔ ایمن چمن چوں سینۂ سینا

نہایت اچھے الفاظ ہیں مگر حاصل کچھ بھی۔
قدیم اردو شعرا نے بھی اس فرسودہ طرز کا تتبع کیا۔ سودا کا پیش کردہ منظر دیکھیے

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل	تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل
تار بارش میں پروتے ہیں گہر ہائے تگرگ	ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل
عکس گلبن یہ زمیں پر ہے کہ جس کے آگے	کار نقاشی مانی ہے دوم دہ اول!

اس پر محسن کاکوروی لکھتا ہے:

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

دونوں قصیدے مردہ الفاظ کے جنگیزی مینار ہیں۔ البتہ محسن کہیں کہیں عربی تشبیہات سے تازگی پیدا کر دیتا ہے۔
ذوق کے قصیدہ بھی اسی قماش کے ہیں:

یہ آیا جوش پہ باران رحمت باری
کہ سنگ سنگ میں ہے سنگ دیدہ کی تاثیر

مرزا غالب بھی اردو میں حسن تعلیل تک ہی پہنچتے ہیں:

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی۔

اس بحث سے میرا مقصد یہ تھا کہ قدیم ایرانی و عرب شعرا کے بعد ایشیائی شاعری سے صحیح منظر کشی مفقود ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ بادیہ نشینی پر شہری تہذیب نے غلبہ پا لیا۔
اسی سبب سے جب لاہور کے مشاعروں میں آزاد مرحوم نے اردو شاعری میں ایک نئی روح پھونکنی چاہی تو ان کے سامنے فقط ہول رائڈ صاحب کے بتائے ہوئے سطحی اصول تھے اور بس۔
جب حفیظ اس قسم کے اصول سے آزاد ہو کر اس میدان میں اترا تو اس کی حالت بعینہ ان شعرا کی تھی جو اپنے لئے خود مشعل راہ تھے اور ادبی روایات کی بجائے محض اپنے حواس خمسہ کی پیروی کرتے تھے
حفیظ کے مناظر اس کی آزاد نگہی پر دال ہیں۔
عتابی کی تشبیہہ "الغیم کالثوب" اور "ابوتمام کی مشہور قوس قزح"

کاذیال خوداتبلت فی عنلاشل
مصختا والبعض اقصر من لعض

یعنی قوسِ قزح کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوشیزہ رنگ برنگ کے باریک کپڑے پہن کر نکل آئی ہے اور ہر کپڑا دوسرے سے چھوٹا اور اونچا ہے یہ اسی آزاد نگہی کے شاہکار ہیں۔ حفیظ متقدمین سے رتبہ میں کم سہی مگر اس کا زاویہ نگاہ وہی ہے :

"شام" کے ایک منظر میں حفیظ لکھتا ہے ؎

کرنوں نے رنگ ڈالا بادل کی دھاریوں کو
پھیلا دیا فلک پر گوٹے کناریوں کو

کیسی اچھوتی تشبیہہ ہے اور اس لحاظ سے کہ اس کے بعد پنگھٹ کے جمگھٹوں کا نقشہ ہے کس قدر مناسب ہے شام کے سیاہ اور سرخ رنگ ہر شاعر کی نظر میں ہوتے ہیں لیکن اردو شاعری کی کم مائگی اور "ڈگر پرستی" کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہو گی کہ نیلگوں سرخی کا پیش پا افتادہ مضمون فقط حفیظ ہی کو سوجھا ہے اس کی وجہ وہی آزاد نگہی! وہ ایک اور نظم میں شام کے متعلق لکھتا ہے ؎

وہ شفق کے بادلوں میں نیلگوں سرخی کا رنگ
اور رلدی کی سنہری نقرئی لہروں میں جنگ

یہی "شام" کا مضمون کسی اور جگہ یوں باندھا ہے

بن گیا ہے آسماں نتھرے ہوئے پانی کی جھیل
یا کسی ساحر نے ساکن کر دیا دریائے نیل

یہ شام لبِ دریا کی شام ہے اس لئے تشبیہہ بھی اسی انداز کی ہے!
"تاروں بھری رات" میں جھیل کو "ضو ریز قندیل" کہا ہے۔ مگر بڑھتی ہوئی تاریکی کا بہترین نقشہ ایک تازہ نظم میں ہے۔ ہر تشبیہہ اچھوتی اور مصورانہ ہے!

شام آئی ہے سکوں کے جال پھیلائے ہوئے
ساحرہ بیٹھی ہے کالے بال بکھرائے ہوئے

اس طرح اونچے پہاڑوں میں گھری ہیں وادیاں
جس طرح دیووں کے گھر میں قید ہوں شہزادیاں

جھاڑیاں کالی ردائیں اوڑھ کر چپ ہو گئیں
بند کلیاں اپنی خوشبو سے لپٹ کر سو گئیں

بے زبان خاموشیاں جاگیں۔ صدائیں سو گئیں
شورشیں چپ ہو گئیں۔ خاموشیوں میں کھو گئیں

دیکھو ایک ہی مضمون کس قدر تنوع اور تازگی سے پیش کیا ہے۔

(باقی صفحہ ۴۹۷ پر)

پنڈت ہری چند اختر

حفیظ کے فنی کمالات

شاہنامۂ اسلام اور نغمۂ زار وغیرہ کا مصنف اب کسی ماہر فن اور بلند آواز نقیب کی خدمات سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ مہذب محفل میں نو وارد اور اجنبی [illegible] تعارف کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس قاعدے کی رو سے جب حفیظ نو وارد اور اجنبی تھے انہوں نے اپنا تعارف اہل بزم سے خود بخود کرلیا تھا۔ [illegible] ۱۹۲۵ء میں ان کے کلام کا سب سے پہلا مجموعہ "نغمۂ زار" کے نام سے شائع ہوا تو ملک الشعراء حضرت مولانا گرامی قدس سرہ نے چند تعریفی یا تعارفی [illegible] اور پروفیسر سید احمد شاہ صاحب بخاری (پطرس) نے چند سطور لکھ کر یہ ضابطہ پورا کردیا تھا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۲۷ء میں "نغمۂ زار" دوسری مرتبہ شائع ہوا تو میرے دوست پروفیسر تاثیر ایم۔ اے[1] نے ایک مختصر مگر جامع دیباچہ اس خیال سے بڑھا دیا کہ یہ طرز سخن بالکل نیا ہونے کے باعث اردو [illegible] میں نو وارد کی حیثیت رکھتا تھا اور اس نرالے طرز سخن کی خصوصیات و امتیازات پر مختصر طور پر ہی سہی روشنی ڈالنا تعارف کی شرائط میں داخل [illegible]

پس جہاں تک بزم شعر و سخن میں تعارف و تقریب کا تعلق ہے یہ کام ضابطہ کی حد تک انجام پا چکا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس جامۂ [illegible] کے ساتھ پطرس نے حضرت حفیظ کو بزم شعر و سخن میں پیش کیا تھا وہ اس تعریف کے اہل ثابت ہوئے ہیں یا نہیں اور ان کے طرز شاعری کے متعلق جن خصوصیات اور امتیازات کا تاثیر نے دعویٰ کیا تھا انہیں اہل بزم نے تسلیم کرلیا ہے یا نامطبوع اور نامعقول کہہ کر رد کردیا ہے۔

کسی شاعر کے کلام اور طرز سخن پر ہم دو پہلوؤں سے نظر ڈال سکتے ہیں یعنی موجودہ قبولیت اور قبول دوام کی توقع۔ حضرت حفیظ کی موجودہ قبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی شاعری اور طرز سخن کو قبول عام کا مرتبہ حاصل ہو چکا ہے بلکہ بقول حضرت تاثیر قبولیت کی مفرتیں بھی لاحق ہو گئی [illegible] یعنی جب سے حضرت حفیظ نے مناظر قدرت کی تصویر کشی چھوٹی چھوٹی مترنم بحر دل میں جذبات کے اظہار اور درد دل کو ملکی دھنوں اور گیتوں [illegible] ڈھالنے کا آغاز کیا ہے۔ اردو کا کوئی رسالہ اٹھا کر دیکھئے شعر و سخن کی کسی محفل میں شریک ہو کر اندازہ کیجئے آپ کو بیک وقت حفیظ کے تتبع کے متعدد نمونے نظر آئیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ تتبع کرنے والوں میں سے اکثر و بیشتر فطری مناسبت سے محروم ہونے کے باعث بہت بری طرح [illegible] کھاتے ہیں اور اپنے آپ کو مضحکہ کا سامان بنا لیتے ہیں لیکن سوال کامیاب یا ناکام نقالی کا نہیں بلکہ رجحان و قبولیت کا ہے۔ بے بضاعت اور کم [illegible] لوگوں کی لغزشوں کو آپ قبولیت کی لغزشیں کہہ سکتے ہیں لیکن اگر تتبع واقعی قبولیت کا سب سے نمایاں اعتراف ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ [illegible] جس کی تخلیق کا باعث حفیظ ہے۔ اردو دنیا کو بڑی حد تک متاثر کر چکا ہے۔ ایک طرف سخن فہم اور ذوق صحیح رکھنے والا طبقہ حفیظ کو مخترع تسلیم

---

[1] ڈاکٹر تاثیر کا سنہ ۱۹۵۰ء میں انتقال ہو چکا تھا۔ اب تک اس دور میں اردو ادب کے سب سے بڑے نقاد تسلیم کئے جاتے ہیں (ناشر)

کر رہا ہے۔ دوسری جانب کم تنخ معاصرین کو یہ سیلاب رنگ بہائے لئے جا رہا ہے۔ مبتدیوں کا ذکر نہیں کہنہ مشق اور پرانے اسکول کے مستند شعرائے اردو بھی اس طرز نو کا تتبع کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ طرز نہ صرف مقبول ہو رہا ہے بلکہ قدامت پرستی کے دعوے دار بھی جو ابتدا میں بعض گفتنی یا ناگفتنی وجوہ کی بنا پر حضرت حفیظ کی جدت کو بدعت قرار دے کر ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے۔ اب اپنے کو حفیظ کے تتبع پر مجبور پاتے ہیں۔

قبول دوام کے متعلق میں تسلیم کرتا ہوں کہ فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام لینا سخت خطرناک ہے۔ قبولیت ایک عجیب و غریب مخلوق ہے کہ مر کر زندہ ہوتی ہے اور جی جی کر مر تی ہے۔ ایک وقت ہے کہ کوئی پوچھتا بھی نہ ہو کچھ مدت کے بعد وہی پکنے لگتا ہے اور کل جس کے جھنڈے گڑے تھے آج اس کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ ہومر جب دنیا میں موجود تھا تو اس کے اشعار سن کر لوگ بمشکل بھیک دیتے تھا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا کہ یونان کے سات شہر ... وہ دربدر خاک بسر پھرتا تھا اس کی جائے ولادت ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگے۔ ایرانی شعرا میں سے ایک طرف عمر خیام ہے جس کی قسمت دیکھئے کتنی مدت کے بعد جاگی اور کہاں جا کر جاگی۔ دوسری جانب حافظ شیراز ہیں کہ ان کی قبولیت ان کی زندگی سے اس وقت تک بدستور قائم ہے اور نہ جانے کب تک قائم رہے گی۔ اردو شاعروں میں غالب اور ذوق کو لیجئے۔ اپنی زندگی میں ذوق ملک الشعرا خاقانی ہند تھا اور غالب مہمل گو لیکن آج ملک سخن میں غالب کا سکہ رواں ہے اور ذوق کی شہرت آزاد مرحوم کا وہ سحر کار قلم بھی قائم نہ رکھ سکا جس نے اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو آفتاب عالم تاب ثابت کرنے کی کوشش میں اردو شاعری کو کم از کم پچاس سال پیچھے پھینک دیا ہے۔

ان حالات کے پیش نظر بظاہر یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ قبولیت کے پیدا ہونے کا وقت مقرر کرنا اور اس کے بڑھنے پھیلنے گھٹنے سمٹنے سے اس کی عمر کا اندازہ لگانا سخت مشکل ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آنے والا زمانہ کس کو کس وقت زندہ درگور کر دیں گے اور کس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر سر پر رکھ لیں گے آنکھوں سے لگائیں گے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ظاہری موانع کے باوجود قبول دوام کے متعلق تھوڑا بہت اندازہ کر لینا ناممکن نہیں۔ مندرجہ بالا بیان سے قبولیت کے اندازہ کی دشواریوں کے علاوہ کچھ اور بھی معلوم ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ جن شعرا کو ہم عصروں کی بدمذاقی اور مذہبی مجلسی یا منفعتی تعصبات کے باعث یا دیگر حالات کی بنا پر اپنی موت کے بعد قبولیت حاصل ہوئی ان کے کلام میں کچھ ایسی باتیں ضرور موجود تھیں جن کا کبھی نہ کبھی کسی وقت مرغوب خلائق ہونا لازمی امر تھا۔ حافظ کے کلام میں اکثر باتیں وقت کی ضرورت اور حالات کے مطابق تھیں مگر طرز سخن اور موضوع کلام اس قدر نمایاں مقامی رنگ کے باوجود زمان و مکان کی زنجیروں میں ایسی بری طرح جکڑے ہوئے نہیں تھے کہ آئندہ زمانے اور دیگر ممالک کے با مذاق لوگ حافظ کے کلام سے محظوظ اور مستفید نہ ہو سکیں چنانچہ وہ اپنی زندگی میں بھی مقبول ہوا اور اب تک مقبول چلا آتا ہے۔ خیام کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ نہ صرف اس کے ہم عصروں کی بدمذاقی اور تنگ نظری پر دال ہے بلکہ اس افسوسناک حقیقت کا بھی کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ایشیائی نقاد کو یورپی عینک کے بغیر کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا

غالب کی مثال سے جہاں وقتی رائے کی بے وقعتی کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ راز بھی کھلتا ہے کہ بعض قابل قدر جدتیں قبل از وقت معرض وجود میں آ کر کچھ مدت کے لئے نامطبوع بلکہ مردود ہو جاتی ہیں مگر وقت آنے پر ان کی ایسی قدر ہوتی ہے کہ ملک کے ادب میں دائمی جگہ حاصل ہو جاتی ہے۔ پس اگر عام شعری محاسن کے علاوہ کسی شاعر کے کلام کی نمایاں خصوصیات اور دلچسپی کی وسعت کو پیش نظر رکھ کر قبول دوام کا اندازہ کیا جائے تو اغلب یہی ہے کہ وہ اندازہ بڑی حد تک درست ہو گا اور میرا خیال ہے کہ اگر اس کسوٹی سے کام لیا جائے تو ان مبصرین کی رائے کو درست تسلیم کر لینے میں ذرا تامل نہیں ہوتا جن کے نزدیک اردو ادب میں حفیظ کی شاعری کا مقام جاودانی ہے

حضرت حفیظ کے کلام اور طرز سخن کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ کرنے سے پہلے چند امور کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ عام طور پر کسی شاعر کے نتائج طبع کو اس نظر سے دیکھا جاتا ہے جیسے وہ متقدمین کی تصانیف اور موجودہ ماحول سے الگ تھلگ یکایک خلا میں پیدا ہو گئے ہوں۔ ان پر غور کرتے وقت اس امر کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ جس وقت اس خاص مصنف نے قلم سنبھالا اس وقت ملک کا لٹریچر کس مرحلہ تک پہنچ چکا تھا

پنڈت ہری چند اختر

اور مصنف کے معاصرین کا عام رجحان کیا تھا لیکن یہ طریقہ درست نہیں کیونکہ اس طرح مصنف کے کارناموں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بڑے
بڑے مصنفوں پر یہ "ہر لہ آمد عمارت نو ساخت" کا مقولہ کتنا ہی صادق آتا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیائے ادب کی ہر ایک بستی میں
ان عمارتوں کی بنیادیں قدما کے کارناموں کی صورت میں پہلے ہی موجود ہوتی ہیں اور ہر نئے مصنف کو اپنی عمارت ان بنیادوں پر کھڑی کرنی پڑتی ہے اس لئے
کسی نئے معمار کی چابک دستی کا اندازہ عمارت کی ساخت یا شکل و صورت سے نہیں ہو سکتا بلکہ ساتھ ہی یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس نے یہ عمارت کن
بنیادوں پر اٹھائی اور ان بنیادوں پر اس قسم کی عمارت اٹھانے میں کس قدر ہنرمندی کی ضرورت تھی

اسی طرح ہر مصنف پیشرو ادبا سے بھی لازمی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ کسی قوم کی تاریخ کو اگر اس کے سوانح قرار دیا جائے تو لٹریچر کو اس کے خود
نوشت سوانح حیات کہنا بالکل بجا ہوگا اس لئے کسی زمانہ کے مصنفوں کی تصانیف ایک طرف تو قوم کی خود نوشت سوانح حیات کا ایک باب ہوتی ہیں
اور دوسری جانب یہ باب خود اس زمانہ کی روداد پر مشتمل ہوتا ہے۔ کسی دور کے ادبی کارناموں سے ہم اس زمانہ کے متعلق بہت سی باتوں کا اندازہ کر سکتے ہیں
چنانچہ مختلف محققین نے اپنی تحقیقات کے سلسلہ میں لٹریچر سے بہت فائدہ اٹھایا ہے اس سے ظاہر ہے کہ کوئی مصنف ماحول کے اثرات سے محفوظ
نہیں رہ سکتا۔ اسے قوم کی خود نوشت سوانح عمری کے اس باب کی تکمیل میں حصہ لینا پڑتا ہے جو خود اس کے زمانہ کی داستان کا حامل ہوتا ہے پھر وہ ماحول
سے بے نیاز ہو سکتا ہے؟ پس کسی مصنف کی تصانیف کو خلا کی پیداوار سمجھنے کی بجائے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس نے اپنے زمانہ کی داستان لکھنے میں
کس قدر حصہ لیا۔ یہ حصہ کس خوبی سے لکھا گیا اور اس حصے کو نہ صرف اس باب میں جس کا تعلق اس زمانہ سے ہے بلکہ ساری داستان میں کس قدر اہمیت
حاصل ہے

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ شاعر اپنی زبان اور ادب کی خدمت دو طریقوں سے کر سکتا ہے یا تو پرانی روش پر چل کر ملکی ادب کی تکمیل و تزئین میں
حصہ لے اور یا پھر اپنے لئے نئی راہیں نکال کر ملک و قوم کے ادبی سرمایہ میں بیش بہا اور قابل قدر اضافہ کا باعث بنے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر زمانے میں کسی
قوم کا ادب بعض خاص رائج الوقت رجحانات کے ماتحت پرورش پاتا ہے لیکن جہاں ایک طباع شاعر پرانی روش کو چھوڑ کر نئی راہ اختیار کر لیتا ہے وہاں
اسے اپنے عہد کی رسمی زنجیروں کو توڑنے میں بھی تامل نہیں ہوتا۔ اور وہ اپنے زور طبع سے معاصرین کا مذاق بدل کر لٹریچر میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے وہ
سراسر زمانہ کے مذاق کے تابع رہ کر عام رو میں بہہ جانے پر قانع نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بازار کی مانگ کی نسبت زمانے کی ضرورت کا زیادہ خیال رکھتا ہے اور
اسی ضرورت شناسی پر اس کے تفوق کا انحصار ہے۔

حفیظ کے طرز سخن کو کسی خاص ندرت یا ایک آدھ جدت کی بنا پر اچھوتا نہیں کہا جاتا بلکہ اردو شاعری کی عام روش و افتاد کو مدنظر رکھیں تو
حفیظ کی شاعری ہر لحاظ سے نرالی ہے۔ موضوع کلام مضمون و خیالات، بحور و قوافی کے استعمال اور موضوع کلام سے ان کی مناسبت، انداز منظر
کشی اور مناظر کا تجزیہ، تشبیہات و تلمیحات غرض کسی پہلو سے دیکھئے حفیظ کا کلام انقلاب انگیز جدتوں کا حامل نظر آئے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جس
چیز کو ہم اب تک "ہماری شاعری" کہتے رہے ہیں وہ اکثر و بیشتر اسکے سوا کسی اعتبار سے ہماری نہیں کہ اس کے مصنف ہندوستان میں پیدا
ہوئے تھے۔ اس شاعری میں خیالات و جذبات۔ محاورات و طرز تکلم "پشت منظر" (بیک گراؤنڈ) اور اصل تصویر سب کچھ ایران ہے اور ہندوستان
کا کچھ بھی نہیں حتیٰ کہ اس شاعری کی بنا پر تہذیب و تمدن اور طرز معاشرت کا مقابلہ کر کے اگر کوئی مستشرق ہندوستان کو مملکت ایران کا ایک
صوبہ یا ضلع کہہ دے تو میرے خیال میں ہمیں اس کو مطعون کرنے کا کوئی حق نہ ہوگا۔

نغمہ زار کے دیباچہ میں پطرس لکھتے ہیں "ہمارے شاعر برسوں سے ترک شیرازی پر مست ہیں" یہ فقرہ بڑا بلیغ اور پر معنی ہے۔ اس
میں وہ سب کچھ موجود ہے جو اس قسم کی مصنوعی اور صرف شاعر کی اپنی ذات کو فریب میں مبتلا رکھنے والی شاعری کے متعلق بجا طور پر کہا
جا سکتا ہے اور جس کی بنا پر ہماری اردو شاعری نے عام طور پر ایک غیر فطری شکل اختیار کر لی ہے لیکن اگر اس فقرے کے صرف الفاظ کو ہی لیا

جائے تو یہ صورت حال بھی کچھ کم باعث ندامت نہیں۔ مانا کہ ہندوستان میں رستم و اسفندیار ایسا کوئی شہزور پیدا نہیں ہوا اور ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی ہندوستانی کو گرز اور کمان سے کام لینے کی طاقت اور اہلیت عطا نہیں ہوئی۔ مانا کہ تیغ ہندی کی تعریف بھی ایرانی شاعروں نے محض مروت کی راہ سے یا شاید برسبیل استہزا کردی تھی اور اس لئے ہمیں اپنی رزمیہ شاعری میں اس کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بھی تسلیم کہ یہاں تہذیب و تمدن کی روایات سرے سے موجود نہیں۔ لیکن کیا اس وسیع براعظم میں جہاں دنیا کی انسانی آبادی کا پانچواں حصہ بستا ہے کسی کم بخت کو عاشق ہو جانے کی بھی توفیق نہیں ہوئی؟ اور اگر ہوئی تو اس کا محبوب بیاہا گیا گزرا تھا کہ ہمارے شاعروں کو اس کا ذکر تک گوارا نہیں؟

یہ تو خیر اپنی اپنی پسند کی بات سہی لیکن ہمارے اکثر شعرا کو ہندوستان کی قدیم یا موجودہ زندگی میں بھی کوئی ایسی خصوصیت نظر نہیں آتی جو کلیۃً ہندوستانی ہو۔ اور تو اور یہاں کے موسم اور قدرتی مناظر بھی کسی اعتبار سے قابل امتیاز نہیں معلوم ہوتے۔ مثلاً بسنت ہندوستان کی بہار کا پیش خیمہ ہے اور ہمارے موسم بہار کی چند خصوصیات بھی ہیں لیکن ہمارے شاعروں کے موسم بہار میں وہی بہمن و دے کا چمنستان سے عمل اٹھتا ہے اور تیغ اردی بلک خزاں کو مستاصل کرتی ہے۔ قدرت کی قلم کاریوں کا مقابلہ صرف مانی اور بہزاد کے کارناموں سے ہوتا ہے سرسوں نہیں پھولتی بلکہ زمین برعکس گلبن پڑتا ہے۔ نرگس شہلا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر ان ایرانی باغوں اور مرغزاروں میں بلبل کے سوا کس کا زمزمہ فردوس گوش بن سکتا ہے علیٰ ہذا اس موسم کا استقبال بسنت یا ہولی منا کر نہیں بلکہ ایسے انداز میں کیا جاتا ہے جس سے کنار رکنا باد کی بزم نے نوشی اور گلگشت مصلیٰ کا حظ حاصل ہو۔ پھر لطف یہ کہ یہ سب کچھ تو ایران میں ہوتا ہے اور بہار ہندوستان میں آجاتی ہے! اب اس بہار کے ذکر سے کسی ہندوستانی کے دل میں کن واقعات اور کن مناظر کی یاد تازہ ہو سکتی ہے ۔؟ اور جب ان بے چاروں کو اس شاعری میں کوئی چیز مانوس ہی معلوم نہ ہو تو وہ اس سے کیا لطف حاصل کر سکتے ہیں ۔؟

بخلاف اس کے حفیظ کے ہاں بسنت میں سرسوں پھولتی ہے۔ باغوں اور کھیتوں میں ہندوستانی بہار آتی ہے۔ لڑکے ڈور اور پتنگ کی خاطر باہم دست و گریباں ہوتے ہیں۔ کوئی مار کھاتا ہے اور کوئی ہنستا کھکھلاتا ہے۔ خون میں جوش آتا ہے۔ عشق و جنون کی مستی پیدا ہوتی ہے اور دوسری جانب ایک عصمت مآب شوہر پرست ہندوستانی عورت نے پھولوں کے زرد گہنے تو پہن لئے ہیں مگر شوہر پردیس میں ہے۔ اس لئے ؎

ہے مگر اداس
نہیں پی کے پاس
غم و رنج و یاس
دل کو پڑے ہیں سہنے!

اسی طرح برسات آتی ہے تو جہاں باغوں میں بلبلوں کی بجائے کوئل کی کوکو اور پپیہے کی پی کہاں سنائی دیتی ہے وہاں آموں کے نیچے جھولے ڈال کر پینگیں بڑھانے والی ماہ پیکروں کے پیارے پیارے گیتوں کی میٹھی رسیلی تانیں بھی فردوس گوش بنتی ہیں۔ ساتھ ہی حفیظ ننھی بچیوں کی ہنڈ کلھیا اور گڈے گڑیا کی شادی کو بھی نہیں بھولتا۔ ذرا یہ جھولے کا منظر دیکھئے کس قدر مانوس معلوم ہوتا ہے ورشاعر کی نظر اس پر کس انداز میں پڑتی ہے لیکن ہندوستانی عورت کی نمایاں ترین خصوصیات امر ہستی اور الھڑ پنے کی شوخی بھی حفیظ کے پیش نظر رہتی ہیں چنانچہ جھولا جھولنے والیاں ہنستے کھیلتے۔ مسکراتے، منہ چڑاتے اور ہلڑ مچاتے نچاتے یکایک جھینپ بھی جاتی ہیں اور اس کے بعد ؎

اٹھلا رہی ہیں —— اترا رہی ہیں
حوبان ہندکی —— حوران ارضی
رونق گھروں کی

نازک دوپٹہ — رنگین پلّہ
سر پر سنبھالے — شانوں پہ ڈالے
مینہ لاکھ برسے — جی لاکھ ترسے
نکلیں نہ گھر سے
شوہر کے ڈر سے

پھر یہی نہیں بلکہ —

اپنی نظر سے — شرما رہی ہیں

نغمہ زار کی ان نظموں "دور جلوہ گر"، "تاروں بھری رات" وغیرہ کو چھوڑ کر سوز و ساز کی نظموں کو دیکھئے تو ان میں بھی یہ مقامی رنگ اسی طرح نمایاں نظر آئے گا۔ برسات کا گیت۔ چاندنی میں کشتی۔ شام رنگین۔ جاگ سوز عشق اور چناب وغیرہ کو پڑھ کر قدیم اور موجودہ اردو شاعری سے مقابلہ کیجئے۔ زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس مقامی رنگ کے باوجود نظموں کی دلچسپی محدود نہیں ہوتی بلکہ غیر ہندی شائقین ادب کو بھی اس سے وہی حظ حاصل ہوتا جو خالص ہندوستانی شاعری سے ہونا چاہئے اور حفیظ کی قادر الکلامی اور وجدان صحیح کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

تشبیہات و تلمیحات اور بحور و قوافی کے معاملہ میں بھی اردو شاعری اصولی نقائص سے خالی نہیں ہے۔ دوسری زبانوں میں تشبیہہ و استعارہ اور تلمیحات کے مانوس ہونے کے باعث عوام الناس بھی شعر سے پورا پورا حظ اٹھا سکتے ہیں اور شاعرانہ اشاروں اور کنایوں کو فوراً سمجھ لیتے ہیں لیکن ہمارے ہاں شاعری کی فضا اس قدر نامانوس ہوتی ہے کہ عوام تو درکنار خواص بھی شعر سے وہ لطف حاصل نہیں کر سکتے جو مانوس فضا میں ایک عامی تک کو حاصل ہوتا ہے۔ بحور و قوافی کا سلسلہ بہت بڑی حد تک اجنبی ہے چنانچہ ہندوستانی موسیقی اور اردو شاعری کے تال سم میں بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ ملکی دھنوں سے مسلسل غفلت بلکہ دانستہ بے اعتنائی روا رکھی ہے حتیٰ کہ ہندوستانی گیت اردو شاعری کے نام نہاد عروضیوں کو اس لئے غیر موزوں معلوم ہوتے ہیں کہ ان میں ملکی زحافات سے کام لیا جاتا ہے۔ کیا یہ افسوسناک بات نہیں کہ جو سم اور تال ہندوستانیوں کی روح میں بسے ہوئے ہیں ان کو تو اجنبی اور غیر مانوس کہا جائے اور غیر مانوس زیر و بم ہمارے اشعار کی موزونیت یا عدم موزونیت کا معیار بنا لئے جائیں؟ یہی وجہ ہے کہ ہمارے [illegible] موزونیت کے قدرتی معیار سے کام لیتے [illegible] طور پر نسبتاً بہت جلد مہارت حاصل ہو سکتی ہے ایک اجنبی یا تقریباً اجنبی میزان کا استعمال سیکھنا پڑتا ہے اور [illegible] یہ ہے کہ اردو شعرا میں سے پانچ فی صدی بھی عروضی نکات سے کما حقہٗ واقفیت کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

لیکن سوال صرف عروضی مہارت کا نہیں۔ اصل بحث یہ ہے کہ آیا یہ عربی اور ایرانی اوزان سب کے سب ہندوستانی کانوں کو مانوس اور پسندیدہ معلوم ہوتے ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بعض اوزان ہمارے ہاں پہلے ہی موجود ہیں یا کم از کم ہندوستان میں بھی خوشگوار معلوم ہو سکتے ہیں ان سے ضرور کام لیا جائے لیکن جو اوزان قطعاً اجنبی اور نامانوس ہونے کے باعث ناگوار معلوم ہوتے ہیں ان کا بھاری پتھر کیوں چوم کر چھوڑ دیا جائے [illegible] ہے؟ مثال کے طور پر بحر منسرح کو لیجئے۔ یہ عربی بحر ایرانی فضا میں بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اگر کوئی ایرانی شاعر اس بحر میں لکھا ہوا فارسی کلام اپنے مخصوص لہجے میں پڑھ کر سنائے تو واقعی حظ حاصل ہوتا ہوگا لیکن اردو شاعری کے لئے یہ بحر نہ صرف اجنبی معلوم ہوتی ہے بلکہ اس میں لکھے ہوئے اردو اشعار کے متعلق غیر موزونیت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ اس بحر کو زور طبع کی نمائش کے لئے ضروری سمجھتے ہوں مگر اس نمائش کا نتیجہ "مغز ما خورد و حلوا بو برید" کے سوا کچھ نہیں۔ پس اگر ایرانی شعرا اس بحر پر جان چھڑکتے ہیں تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ لیکن ہمیں خواہ مخواہ پتھر ڈھونے کی کیا ضرورت ہے؟

میں یہ نہیں کہتا کہ حفیظ نے قدیم رنگ اور قدیم طرز سخن سے کوئی سروکار نہیں رکھا یا اجنبی عروض سے کامل بے اعتنائی کا برتاؤ کیا ہے۔ حفیظ

حفیظ کے فنی کمالات

[illegible] حفیظ نامہ

پنڈت ہری چند اختر

ادبی کمالات [illegible] کھڑی کرلی تھی اور وہ ماحول کے اثر سے بھی محفوظ نہیں رہ سکتا تھا لیکن بامذاق حضرات پر کلام حفیظ کے مطالعے سے فوراً واضح ہو جاتا ہے کہ

کہ قدیم رنگ میں بھی [illegible] پر عمل کرتے ہوئے تقریباً تمام فضولیات کو ترک کر دیا ہے اور عام طور پر صرف انہی خصوصیات کو لیا ہے جو ہر

لحاظ سے پسندیدہ یا لازم [illegible] حقیقت ہیں۔ اس کے ساتھ جدت کا پہلو اس قدیم رنگ میں بھی نمایاں ہے

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شاعر اپنی زبان و ادب کی خدمت دو طریقوں سے کر سکتا ہے۔ قدیم اور رائج الوقت طرز کی تکمیل میں حصہ لے کر یا نئی راہیں نکال کر

لیکن حضرت حفیظ کے متعلق بے تامل یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے یہ دو طریق اختیار کئے اور دونوں پہلوؤں میں نہایت ہی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ قدیم

اردو شاعری اور قدیم طرز سخن کی تکمیل و تزئین اور اصلاح و تہذیب کے سلسلے میں حفیظ کے کارنامے اس قدر اہم اور قابل قدر ہیں کہ اردو شاعری ہمیشہ ان کی ممنون احسان

رہے گی لیکن حفیظ کا پروگرام یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ یہ تزئین و تہذیب ابتدا تھی۔ اس انقلاب کی جو حفیظ نے اردو شاعری میں پیدا کیا ہے اور جس کے بغیر ہمارا ادب

بڑی حد تک پسماندہ تھا۔

مثلاً اردو ادب کا دامن مناظر فطرت کی تصویروں سے خالی ہے اور گیت کا تو ذکر ہی جانے دیجئے۔ یہ وہ صنف ہے جس کی طرف کسی نے توجہ ہی نہیں کی۔

حالانکہ شعر اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہندوستان یہ سوال کر سکتا ہے کہ موسیقی جو ہندوستانی طبائع پر زبردست اثر رکھتی ہے کیا اس کا اردو پر اتنا بھی حق نہ تھا

کہ ہمارے شعراء اپنے سوز و گداز کا اظہار کرتے وقت اس سے کام لیتے۔؟

دنیا بھر کی زبانوں میں گیت کو ذوق و سرمستی اور سوز و گداز کا بہترین مظہر مانا گیا ہے۔ اردو شاعری میں حفیظ اس مخصوص صنف کا موجد ہے اور کامیاب موجد

اس کے گیتوں نے اردو شاعری میں ایک نئی لذت ایک نیا رس پیدا کر دیا ہے۔ اس کے قلم نے گیت کو وہ مقام بخشا ہے کہ اردو زبان ہمیشہ حفیظ کی احسان مند رہے گی

تقریباً یہی کیفیت حفیظ کے انداز منظر کشی کی ہے۔ وہ بحر اور وزن یا تشبیہ و استعارہ ہی سے نہیں اپنی نظم کے ایک ایک لفظ سے منظر کی تصویر کھینچ دیتا

ہے۔ وہ اپنے پیش نظر منظر کے لئے ہر لحاظ سے مناسب بحور اور مناسب الفاظ استعمال کرتا ہے اور اسی طرح وہی کیفیت دوسرے پر وارد کر دیتا ہے جو خود

اس کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے

حفیظ کا فن یہ ہے کہ لفظ دوسرے لفظ پر، مصرع دوسرے مصرعے پر اور شعر دوسرے شعر پر اس طرح اضافہ کرتا ہے جس سے دیدہ و دل کے سامنے پوری

تصویر بے نقاب ہوتی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لطافت اور سادگی اور دلآویزی کے ساتھ کہ اس میں شاعر کی اپنی ذات اور گرد و پیش کی خصوصیتیں زائل نہیں ہونے پاتیں

منظر کشی کا یہ اسلوب قادر الکلامی اور قوت اختراع کا زبردست ثبوت ہے اس کو دیکھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حفیظ کے اس رنگ سخن نے فطری شاعری کی

دنیا میں ایک بالکل نئے اور انقلاب انگیز باب کا اضافہ کیا ہے

بحور نوائی کے متعلق حفیظ کے متعلق اجتہاد اس قدر اہم ہے کہ ان کی شاعری کی نمایاں ترین خصوصیت بن گیا ہے "ڈگر پرست" فاعلاتیوں کے

جذبات کا احترام اس پہلو میں بھی ملحوظ رکھا گیا ہے لیکن صرف اس قدر کہ دوسری جانب ہندوستانی کانوں کو سمع خراشی کی شکایت کا موقع پیدا نہ ہونے پائے۔ پھر

انہوں نے بعض بحور و اوزان کو چھوڑنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی جگہ نئے اوزان پیش کر کے اردو شاعری کے سرمایہ میں اضافہ اور میدان میں وسعت پیدا کی ہے

چند بحور و اوزان ترک کر دینا کسی بامذاق شاعر کے لئے کچھ ایسی بڑی بات نہیں۔ اصل کام نئے اوزان کی تلاش تھا جس میں انتخاب اور انتخاب در

انتخاب کی ایسی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے کہ ان پر قابو حاصل کر لینا حفیظ ہی کا کام تھا۔ ظاہر ہے کہ غیر مانوس اور سمع خراش اوزان کی جائے محض ہندوستان

کے اوزان پیش کر دینا کافی نہ تھا۔ بلکہ ایسے نعم البدل منتخب کرنے کی ضرورت تھی جنہیں اردو شاعری آسانی سے قبول کرے اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا

کہ جو لیں اردو شاعری کے موجودہ سانچے میں بالکل ٹھیک بیٹھ جائیں۔ پھر ان نئے اوزان کو کامیابی سے رواج دینے کے لئے ضروری تھا کہ کسی موضوع پر نظم لکھتے

وقت ان منتخب اوزان میں سے بھی ایسا وزن منتخب کیا جائے جو نفس مضمون کے ساتھ پوری پوری مناسبت رکھتا ہو۔ آپ نے اپنی عمر کے کسی حصہ میں اس

قسم کی داستانیں سنی ہوں گی کہ ایک مرتبہ جب کہ آسمان پر بادلوں کا نام و نشان تک نہ تھا اور آفتاب عالم تاب پوری شان سے جلوہ افروز تھا۔ پھو بادرائے اظہار

گایا اور آناً فاناً گھنگھور گھٹائیں اٹھ کر موسلا دھار مینہ برسانے لگیں یا تان سین نے آدھی رات کو دیپک چھیڑ دیا اور شمع کے بجھے ہوئے چراغ خود بخود روشن ہو گئے۔ آپ ان داستانوں اور موسیقار کے متعلق مشہور و معروف روایات کو من گھڑت اور ایام جہالت کی ذہنی یادگاریں چاہیں کہہ لیں لیکن موضوع کلام اور بحور و اوزان کی باہمی مناسبت کی ضرورت اور اہمیت کی طرف جو اشارہ ان میں موجود ہے اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ دور کیوں جائیے خود ہمارے ہاں بحور و اوزان میں سے بعض خاص اوزان کو اردو شاعری میں بھی بعض خاص موضوعات کے لئے مخصوص یا قابل ترجیح سمجھا جاتا ہے

حفیظ نے اس انتخاب میں جس بالغ نظری اور ذوق صحیح کا ثبوت دیا ہے وہ اردو شاعری میں اپنی مثال آپ ہے۔ "بسنت" اور "ابھی تو میں جوان ہوں" کے چلبلے اوزان میں کس قدر مستی ہے۔ کتنا جوش ہے! جلوۂ سحر کے نفس مضمون سے قطع نظر صرف زیر و بم ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات خواب راحت سے بیدار ہوئی ہے اور ایک آخری انگڑائی کے ساتھ تمام سستی اور غنودگی کو پرے جھٹک کر روزانہ معمولات کے لئے مستعد ہو رہی ہے۔ دوسری جانب "تاروں بھری رات" سنتے وقت نہ صرف دنیائے ہست و بود کے محو خواب ہونے کا یقین ہو جاتا ہے بلکہ خود سامعین پر بھی غنودگی طاری ہونے لگتی ہے۔ "برسات" کی نظم جتنی دیر آپ سنتے رہیں گے یہی محسوس ہو گا کہ آپ برسات کے موسم میں کسی باغ کی سیر کر رہے ہیں جھولا جھولنے والیاں ملہار گا رہی ہیں اور ان کے ارمانوں بھرے گیت سن کر دل میں ہوک اٹھتی ہے

اسی طرح سوز و ساز کی نظموں میں "فرشتہ کا گیت" دیکھئے۔ اس کا وزن آسمانی نغموں کے لئے کس قدر موزوں ہے! کانوں کے ساتھ دل بھی یہی محسوس کرتا ہے کہ ایک رحمت کا فرشتہ ہاتھ میں پھول سی ستار لئے بے فکری کے عالم میں گاتا پھر رہا ہے۔

دیکھ اس دنیا کا نظارہ
میرے ساز کے تار دیکھیں

"پریت کے گیت" میں "پریم رس" کی مسلسل قطرہ زنی دل کو بغض و عناد کے میل سے پاک کرتی محسوس ہوتی ہے لیکن اس نقاط کے آگے آگے نظم کا وزن دل میں پریم رس کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا جاتا ہے۔ "سوز عشق" کو پڑھیئے شاعر کے ساتھ نظم کا وزن بھی فریاد کر رہا ہے۔ "شہسوار کربلا"۔ ایسی نظمیں عام طور پر صرف اظہار عقیدت کے لئے لکھی جاتی ہیں لیکن حفیظ نے دوسرے فریق کو نظر انداز نہیں کیا اور اس نظم کے وزن پر غور کرو محض اصوات سے میدان جنگ کا نقشہ کھینچ جاتا ہے۔ میں بخوف طوالت دوسری نظموں کے ذکر اور تفصیلی بحث سے احتراز کرتا ہوں۔ کتاب آپ کے سامنے ہے خود پڑھ کر مختلف نظموں کے بحور و اوزان کی مناسبت کا اندازہ کر لیجئے۔ البتہ یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ سب کچھ خود بخود بلا ارادہ نہیں ہو گیا بلکہ شاعر کے حسن انتخاب کا نتیجہ ہے۔ حفیظ کو اس حسن کی ضرورت و اہمیت اور حسن انتخاب میں اپنی کاوش و کامیابی کا پورا پورا احساس ہے اور وہ بالکل بجا دعویٰ کرتا ہے

کیا پابند نے نالے کو میں نے
یہ طرز خاص ہے ایجاد میری

حفیظ کے اس دعویٰ کی صحت اور اس طرز خاص کے نو ایجاد ہونے کا سب سے نمایاں ثبوت اس رد یہ میں موجود ہے جو ان کے مخالفوں نے اپنے قدم شہرت کی بنیادوں کو متزلزل دیکھ کر اختیار کیا تھا۔ نیا سیلاب اس قدر اچانک آیا کہ یہ لوگ بھونچکے رہ گئے اور اس بوکھلاہٹ میں نئی شاعری کی تمام خصوصیات سے آنکھیں بند کر کے یہ پراپگنڈا کرنے لگے کہ حفیظ کی کامیابی اور روز افزوں مقبولیت محض اس کی مترنم آواز کا نتیجہ ہے۔ اس "پراپگنڈے" میں اس قدر شدت سے کام لیا گیا کہ خود پراپیگنڈہ کرنے والوں کو بھی اپنے دعوٰی کی صداقت کا یقین سا ہو گیا چنانچہ اس غلط فہمی کے باعث لاہور میں مدتوں گلے بازی ہوتی رہی جس کسی کی آواز میں ذرا سا لوچ تھا وہی شاعر بن بیٹھا اور الٹی سیدھی تک بندیوں کو گا گا کر اردو ادب میں "بے بہا" اور قابل فخر اضافہ کرنے لگا۔ شعر اور نغمہ میں جو گہرا تعلق ہے اس سے کسی کو انکار نہیں لیکن نغمہ بذات خود شعر نہیں کہلا سکتا۔ حضرت امیر خسرو نظم کے عروس خوب اور نغمہ کو اس کا زیور قرار دے کر فرماتے ہیں

عیب نبود گر عروس خوب بے زیور بود

پس اگر عروس خوب و با زیور ہو تو سبحان اللہ اور اگر بے زیور ہو تو بھی کوئی حرج نہیں لیکن عروس کا خوب ہونا ضروری ہے بلکہ میرے خیال میں تو عروس خوب کو بھی کوئی زیور اسی صورت میں زیب دے سکتا ہے جب کہ وہ اس کے تمام محاسن سے پوری پوری مناسبت رکھتا ہو۔ ورنہ زیور کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ ایک پری چہرہ خاتون کو انگریزی لباس پہنا کر گلے میں سیر سوا سیر کی ہیکل باندھ دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے حفیظ کی شاعری کے متعلق موضوع کلام، نفس مضمون، طرزِ سخن اور وزن کی باہمی مناسبت کو اس قدر اہمیت دی ہے۔ کاش یہ لوگ بھی زیور کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے پہلے ان شعری محاسن کی فکر کرتے جو حفیظ کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس صورت میں ایک طرف تو اردو ادب اور اردو شاعری کے سرمایہ میں قابل قدر ——— اضافہ ہوتا اور دوسری جانب ان کا سارا کھیل " خوش گلو ایکٹ ول " اور "وق الیھ ٹک" سین سینری" کے باوجود اس طرح ناکام رہتا۔

مخالفوں کی آنکھوں پر تو خیر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی تھی لیکن افسوس یہ ہے کہ بعض مبتدی مداح بھی اس رو میں بہہ گئے کہنے کو تو یہ حضرات حفیظ صاحب کا تتبع کر کے بزعم خود اردو ادب اور اردو شاعری کی خدمت میں مصروف تھے مگر یہ سمجھنے کی زحمت انہوں نے بھی گوارا نہ فرمائی کہ صرف "

ٹپ ٹپ ٹپا ٹپ

مینہ موسلا دھار

کہہ دینے سے بارش کا سماں نہیں بندھ جاتا بلکہ برسات کی فضا پیدا کرنے کے لئے ترنم کے علاوہ بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے اور جب تک وہ چیزیں موجود نہ ہوں۔ ترنم محض "تانا ریری" یا "طبلے" ہنگامہ سا ہنگامہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ جس قدر توجہ انہوں نے مترنم ہندوستانی بحروں والی نظموں پر مبذول کی۔ اگر اس کا عشر عشیر بھی دوسری نظموں مثلاً "ذہنیت کی تلاش" "آزادوادی" "ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح" "دریچہ" "چاندنی میں کشتی" "شام رنگین" وغیرہ پر صرف کرتے بلکہ خود مترنم بحروں والی نظموں ہی کو گویئے کے بجائے شاعر کی آنکھوں سے دیکھتے تو ان پر حفیظ کی شاعری کے تمام محاسن اور حفیظ کی کامیابی کا حقیقی راز بہت جلد کھل جاتا۔

اس مقصد کے لئے حفیظ کی غزلوں کا مطالعہ خاص طور پر کارآمد ثابت ہو سکتا ہے لیکن تتبع کرنے والے اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوئے "ہفت پیکر" حفیظ کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے مقدمہ میں سید امتیاز علی صاحب تاج لکھتے ہیں:

> " جو لوگ حضرت حفیظ کو بحیثیت شاعر جانتے ہیں اگر ان سے کہا جائے حفیظ کے افسانے ان کی شاعری سے کم قابل قدر نہیں تو فی الحال کوئی اس پر غور کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو گا۔ لوگ حفیظ کی شاعری سے اس قدر متاثر ہو چکے ہیں کہ اب انہیں کسی دوسری حیثیت سے دیکھ کر داد دینے کی مطلق گنجائش نہیں رہی ..... ہمیشہ سے یوں ہوتا آیا ہے دنیا صرف ایک ہی حیثیت سے کسی کو غیر معمولی داد دیا کرتی ہے۔ بیک وقت دو حیثیتوں سے اعتراف کمال کرنا ان کی بساط سے باہر ہے۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا حوصلہ اس سے بھی زیادہ تنگ ہے وہ شاعری میں بھی مختلف اصناف سخن کے متعلق حفیظ کے کمال کا اعتراف کرنے سے قاصر رہی ہے مثلاً غزل ہی کو لیجئے "یاران نکتہ داں" کے نزدیک غزل گوئی میں حفیظ کا مرتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو لیکن لوگ ان کی نظموں (بلکہ صرف مترنم بحور والی نظموں) سے اس قدر متاثر ہو چکے ہیں کہ ان کو اب تک ان محاسن کا احساس ہی نہیں ہوا جن کی بنا پر ماہرین فن حفیظ کو غزل میں بھی "صاحب طرز" تسلیم کرتے ہیں اس طرح اگر ان نظموں کو دیکھیں جو حفیظ نے بچوں کے لئے لکھی ہیں تو شاعری کی اس صنف میں بھی حفیظ مخترع نظر آئے گا۔ خصوصاً جو نظمیں صغیر السن بچوں کے لئے ہیں۔ ان میں تو شاعر نے کمال اختراع کا حیرت انگیز ثبوت دیا ہے لیکن دنیا کو یہاں بھی اعتراف کمال کی توفیق نہیں ہوئی میں مثالیں دے دے کر حفیظ کی امتیازی خصوصیات اور عام محاسن شعری پر تفصیلی بحث سے احتراز کرتا ہوں۔ ان کے متعلق پروفیسر تاثیر اور دیگر حضرات تھوڑا بہت لکھ چکے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بہت کچھ لکھا جائے گا۔ مزید براں یہ دیباچہ مجمل اشاروں ہی میں کافی طویل ہو گیا ہے لیکن جو لوگ حفیظ

(باقی صفحہ ۵۰۳ پر)

امتیاز علی تاج

حفیظ کی افسانہ نگاری

ادبِ اردو میں حفیظ صاحب کو جو شہرت اور ناموری حاصل ہے وہ تمام تر ان کی شاعری کی ممنونِ احسان ہے اور اس میں ان کے مختصر افسانوں کو ذرا بھی دخل نہیں۔

جو لوگ انہیں بحیثیت شاعر کے جانتے ہیں ان میں سے اکثر کو علم نہ ہوگا کہ وہ مختصر افسانے لکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے اگر ان سے کہا بھی جائے کہ حفیظ کے افسانے ان کی شاعری سے کم قابلِ قدر نہیں تو فی الحال کوئی اس پر غور کرنے کو آمادہ نہ ہوگا

لوگ حفیظ کی شاعری سے اس قدر متاثر ہو چکے ہیں کہ اب انہیں کسی دوسری حیثیت میں دیکھ کر داد دینے کی مطلق گنجائش نہیں رہی۔

حفیظ صاحب نے اپنے مختصر افسانے کتنے ہی چاؤ سے لکھے ہوں اور مختصر افسانہ سے دلچسپی رکھنے والے گنتی کے چند لوگ ان کو کتنا ہی پسند کرتے رہیں ان کے افسانوں کو اب وہ داد نہیں مل سکتی جس کے وہ حقیقت میں مستحق ہیں۔

ہمیشہ سے یوں ہی ہوتا آیا ہے جو لوگ شیکسپیئر کے نام سے واقف ہیں ان میں سے کتنوں کے ذہن میں یہ خیال موجود رہتا ہوگا کہ وہ "سائنس" کتنے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ غالب کے متعلق کسی سے پوچھئے کہ آپ اسے کس حیثیت سے جانتے ہیں؟ اردوئے معلّی کی بے مثال نثر کا بہت کم لوگوں کو خیال آئے گا۔ دنیا صرف ایک ہی حیثیت سے کسی کو غیر معمولی داد دیا کرتی ہے بیک وقت دو حیثیتوں سے اعتراف کمال کرنا اس کی بساط سے باہر ہے

ایسی حالت میں حفیظ کے افسانوں کی خصوصیات میں کتنے ہی خلوص اور محنت سے لکھوں کوئی سننا پسند نہ کرے گا۔ جہاں حفیظ نظم پڑھ رہا ہو وہاں کسی اور موضوع پر کسی کو کوئی اور بات سنانا ناممکن ہے۔ کوئی سنے گا بھی تو تو اس کے گوشۂ چشم میں شبہہ جھلکتا رہے گا۔ سننے کے بعد کسی کو خوشی حاصل نہ ہوگی۔

پھر اردو میں بمقابلہ شعر کے مختصر افسانہ کا ذوق بہت کم ہے۔ ہمارے لٹریچر میں شعر کا قابلِ قدر ذخیرہ موجود ہے ہمارے ہاں شعر کی روایات ہیں ہم ان ہی میں پلتے بڑھتے ہیں شعر کے متعلق ہر پڑھے لکھے ہندوستانی کا کچھ نہ کچھ ذوق بن جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مختصر افسانہ ایک بالکل نئی چیز ہے۔ اس کے نہ اعلیٰ نمونے ہماری زبان میں ہیں نہ اس کے متعلق ہمارے کوئی خیالات ہیں۔ ان حالات میں بھلا کون سننا چاہے گا کہ شاعر حفیظ قابل قدر افسانہ نویس بھی ہے۔

مگر میرے دل میں انہی خیالات کے باعث خصوصیت سے حفیظ کے افسانوں کی قدر ہے۔ اردو کی موجودہ حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے حفیظ کی شاعری مجھے اتنی غیر معمولی نہیں معلوم ہوتی جتنی حفیظ کی افسانہ نویسی

اردو میں مختصر افسانہ بطور اصلاح کے جو معنی آج کل اختیار کرتا جا رہا ہے وہ ہمارے دیس کی پیداوار نہیں بلکہ مغرب سے آئے ہیں اور اردو کے

لئے ابھی تک اتنے اجنبی ہیں کہ ہماری زبان مختصر افسانہ کے صحیح مفہوم ہی سے بڑی حد تک ناآشنا کہی جاسکتی ہے

مغرب کے اعلیٰ مختصر افسانے نسبتاً بہت کم تعداد میں اردو میں ترجمہ ہوئے ہیں۔ اکثر انگریزی داں اردو نویس جن افسانوں کا ترجمہ کرتے ہیں یا جن افسانوں کو اپنے سامنے بطور نمونہ رکھ کر خود طبع آزمائی کرتے ہیں وہ انگریزی کے ادنیٰ رسائل میں محض تجارتی اغراض سے لکھے جاتے ہیں۔

ان میں نہ مختصر افسانہ کی کوئی خصوصیت ہوتی ہے اور نہ ادب کی، نہ حکیمانہ مشاہدہ فطرت ہوتا ہے نہ فلسفیانہ ادراک حیات اور نہ نفاست و شائستگی کا اظہار۔

مغرب کی تیز رفتار اور عورت مرد کی مخلوط زندگی کے باعث یہ افسانے ایک ادنیٰ قسم کی دلکشی سے محروم نہیں ہونے پاتے اور عوام کے لئے تفریح کا اچھا خاصا سامان بہم پہنچا دیتے ہیں۔

مگر اس قسم کے ترجمے یا اس انداز کے طبع زاد افسانے زبان اردو میں مختصر افسانہ کا صحیح ذوق کسی طرح پیدا نہیں کرسکتے چنانچہ ان کی موجودگی میں بھی یہی کہنا پڑتا ہے کہ اردو زبان مختصر افسانہ سے بڑی حد تک ناآشنا ہے

لیکن اجنبیت کی اس حالت میں اگر حفیظ کے افسانوں میں بعض ایسی خصوصیات نظر آئیں جو مغرب میں اس مغربی صنفِ ادب کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہیں تو میرا اسے ایک غیر معمولی بات کہنا غالباً نامناسب نہ قرار دیا جائے گا

اور پھر حفیظ مغربی زبانوں سے بھی ناواقف ہیں چنانچہ ان گنتی کے چند اعلیٰ مختصر افسانوں سے جو بری بھلی طرح اردو میں منتقل ہوئے ہیں ان کا مختصر افسانے کے محاسن کو نامعلوم طریق پر اخذ کرلینا میرے لئے حیرت انگیز ہے۔ ان کے افسانے مختصر نہیں بلکہ واقعی مختصر افسانے ہیں۔ اس سے میری مراد کیا ہے یہ مجھے کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا ہوگا۔

اصطلاح کی صورت اختیار کرنے سے پہلے مختصر افسانہ کا لفظ صرف ان افسانوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا جن کی نمایاں خصوصیت محض اختصار ہوتی تھی۔

لیکن انیسویں صدی میں بعض اور خصوصیات مختصر افسانے میں اس کثرت سے نمایاں ہونے لگیں اور ان کے اظہار کے لئے یہ میدان ایسے جداطور پر مخصوص ہوگیا کہ مختصر افسانہ اور وہ خصوصیات گویا لازم و ملزوم بن گئیں۔ اس طرح مختصر افسانے کے معنوں میں زمین و آسمان کا فرق پڑگیا اور اس لفظ نے ایک اصطلاح کی صورت اختیار کرلی۔

انیسویں صدی میں مغرب کے غور و فکر کے طریق میں ایک یہ انقلاب پیدا ہوا کہ لوگوں نے اپنے سے جدا اشیاء کے تاثر کو اہمیت دینی شروع کردی۔ اس انداز خیال کا اثر تمام فنون لطیفہ پر پڑا اور اس رجحان نے افسانے کی دنیا میں ایک صورت مختصر افسانے کی اختیار کرلی۔

اس انداز خیال کے رواج پانے سے واقعات کی طرح تاثرات بھی افسانہ نویسوں کو زیادہ اہم معلوم ہونے لگے۔ تجربات زندگی کی طوفانی رَو میں کوئی موثر صورت حالات یا نمایاں تضاد انہیں شدت سے محسوس ہوا تو ان کا جی چاہنے لگا کہ اسی شدت سے دوسروں کو بھی محسوس کرائیں۔

کئی تاثرات ناول کی مروجہ وسعت و ضخامت کے لحاظ سے غیر متناسب معلوم ہوئے اور انہیں ناول کے واقعات کے سلسلے میں بیان کرنے سے ان کی اہمیت زائل ہوتی نظر آئی اس لئے ان کے اظہار کے واسطے مختصر افسانہ کا میدان مناسب معلوم ہوا۔

پہلے تو مختصر افسانے میں صرف یہ خصوصیت ہوتی تھی کہ اس میں کم واقعات کی کہانی ہو۔ اب اس کی یہ خصوصیات بن گئیں کہ اس میں کسی واحد تاثر کو احسن طور پر منتقل کرنے کے لئے کم سے کم مناسب واقعات ہوں۔

مصنفین نے مختصر افسانے لکھنے کو واقعات کی لڑی بنانی چھوڑ دی۔ جب انہیں کوئی واحد تاثر انوکھے طور پر محسوس ہوتا تو اسے پورے طور پر پڑھنے والے کو منتقل کرنے کے لئے وہ موزوں واقعات بنانے لگے۔

تاثر کی وحدت نے مصنفین کو خاص طور پر محتاط کر دیا کہ اپنے پہلے فقرے سے لے کر آخری فقرے تک ایک لفظ بھی ایسا نہ لکھیں کہ پڑھنے والے کے دماغ کو مطلوبہ اثر قبول کرنے سے بے راہ کر سکے چنانچہ اس طریق کی احتیاط سے واحد تاثرات کی ایسی مکمل اور واضح تصاویر عبارت میں بننے اور دلوں میں اترنے لگیں جو کسی طرح سے ناولوں میں پیش نہ کی جا سکتی تھیں۔

اردو کے بہت کم مختصر افسانوں میں یہ بات نظر آتی ہے۔ اکثر مصنفین کے افسانوں سے واضح ہوتا رہتا ہے کہ ان کے افسانے محض اسی وجہ سے مختصر ہیں کہ ان کے لئے نسبتاً کم واقعات کی ایک لڑی بنائی گئی ہے

ہمیں ابھی عام طور پر زندگی کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادت نہیں ہوئی جو مغرب میں انیسویں صدی نے پیدا کر دی تھی۔ تجربات زندگی میں اس قسم کے تاثرات مختصر افسانے کا مواد بنتے ہیں جو ہمیں محسوس ہوئے بغیر گذر جاتے ہیں۔

لیکن حفیظ خصوصیت سے ایسے تاثرات کو محسوس کرتا ہے جو مختصر افسانہ کے لئے مناسب و موزوں ہوتے ہیں اور پھر یہ بھول کر کہ مخلوط و منتشر زندگی کے واقعات یا خیالات نے ان تاثرات کا احساس دلایا تھا وہ اپنے مختصر افسانے کے لئے از سر نو واقعات تعمیر کرتا ہے جو نہایت باقاعدگی اور خوب صورتی سے مطلوبہ اثر پڑھنے والے پر وارد کر دیتے ہیں۔

مثلاً آوارہ گرد کو لیجئے۔ اس میں ذہنی لمحے کا تاثر افسانہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے جب سوسائٹی کے مفرور کے لئے بے عنان زندگی اپنی تمام رعنائی اور دل کشی کھو چکتی ہے اور ذمہ داریوں کی عدم موجودگی روح میں ایک ایسا خلا پیدا کر دیتی ہے جو ذمہ داریوں کے بوجھ سے زیادہ درد انگیز معلوم ہوتا ہے

یہ تاثر ایک خاص طرح کی ذہنی نشو و نما اور دماغی کیفیت کے باعث مصنف کو محسوس ہوا اور ضروری نہیں کہ ان ہی حالات و کیفیات میں ایک دوسرا شخص بھی اسے محسوس کر سکتا۔ چنانچہ یہ بھی ضروری نہیں کہ جس سلسلۂ خیال کے باعث یا جن حالات کو دیکھ کر مصنف نے اسے محسوس کیا۔ اگر وہ بجنسہٖ کاغذ پر لکھ دیئے جائیں تو دوسرا شخص جس کی ذہنی نشو و نما اور دماغی کیفیت بہر حال مصنف سے مختلف ہے اسے مطلوبہ شدت و وضاحت سے محسوس کرے۔ چنانچہ محض اس اثر کو منتقل کرنے کے لئے مختصر افسانہ کے فن سے امداد لینے کی ضرورت ہوئی

وہ مکمل تاثر جو دماغ میں ایک مبہم صورت میں موجود تھا۔ اس کے اقتضا کو مدِ نظر رکھ کر کہانی کے لئے مفید طلب مواد جمع کیا گیا۔

"بادو باراں کی آمد آمد کی وجہ سے بازار بے رونق اور سنسان تھے۔ خوانچے والے۔ تمباکو فروش۔ تنبولی نصف شب تک لہرا لہرا کر گرما گرم چائے کی صدا لگانے والے آج دس بجے ہی اپنے بچے کھچے سودے سمیٹ سمٹا گھر دل کو جا چکے تھے۔ اکا دکا مسافر بہکے ہوئے شرابی آوارہ مزاج سیلانی۔ تماش بینوں کے گروہ طوفان کی آمد آمد دیکھ کر اپنے اڈوں کی خیر منا رہے تھے

ان حالات کے باعث آوارہ شخص معمول سے پہلے اپنے ٹھکانے پر واپس آ جانے کے لئے مجبور ہو گیا۔ جو وقت عام طور سے باہر بازاروں کی گھما گھمی میں صرف ہو جایا کرتا تھا آج خلاف معمول گویا آوارہ گرد کے سر پر کھڑا ہوا تھا

سرائے میں ایک غیر معمولی خاموشی تھی جس میں ہوا سیٹیاں بجا رہی تھی۔ موسم کی وجہ سے آوارہ گرد کی طبیعت پر ایک اضمحلال اور افسردگی طاری تھی۔ دماغ زیادہ خیالی چیزوں میں مصروف نہ ہو سکتا تھا۔ اپنے گرد و پیش کی چیزیں زیادہ شدومد سے اسے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں

فرسودہ چارپائی۔ نامکمل بستر۔ چند پرانے ادبی رسائل چارپائی کے دونوں طرف سینکڑوں سگرٹوں کے جلے ہوئے ٹکڑے سوختہ دیا سلائیاں۔ سگرٹ کے خالی بکس۔ ملے دلے کاغذ۔ گرد آلود میلی اور پان کی پیکوں سے داغ دار دیواریں۔ اکھڑا ہوا فرش جس پر ہر طرف مونگ پھلی کے چھلکے بکھرے پڑے تھے۔"

اس جگہ آوارہ گرد نے کوٹ اتارا۔ صبح سات بجے کا پہنا ہوا بوٹ پیروں سے جدا کیا اور اپنے بستر میں گھس گیا۔ جو پانچ راتوں سے از سر نو نہ بچھایا گیا تھا۔

"موم بتی تمام ہو جانے کی وجہ سے مطالعہ کی ناتمام کوشش ختم کر دینے کے سوا چارہ نہ رہا اور اندھیرے میں آوارہ
گرد کا خیال ماضی و حال کے طوفانی سمندر میں غوطے کھانے لگا اور ایک غیر معلوم خوف، ایک موہوم ہراس آہستہ آہستہ
اس کے قلب کی حرکت تیز کرنے لگا۔"

آوارہ گردی کے اجمال کا جو تاثر مصنف کے دماغ میں موجود تھا اسے واضح کرنے کے لئے اب یہ اکتا دینے والا ماحول ایسا اعتماد انگیز بن گیا جس میں
پڑھنے والے کا خیال آوارہ گرد کی ذہنی کیفیت سے ہمدردانہ اشتراک کر سکتا تھا

اگر اس ماحول کا بیان نہ ہوتا اور مثلاً کہانی یک لخت آوارہ گرد کے جذبات سے شروع ہوتی تو اس کے اور پڑھنے والے کے احساسات ہمدردانہ
طور پر مشترک نہ ہونے پاتے اور مصنف جو تاثر پیدا کرنا چاہتا تھا وہ اپنا زور کھو ڈالتا۔

اس طرح تمام کہانی کو دیکھئے۔ یہ تیا خیال بالواسطہ یا بلاواسطہ ہمیں تاثر سے قریب تر کرتا چلا جا رہا ہے اور ہر فقرے کی تہ میں مصنف کا مقصد
پورے طور پر موجود ہے

اور واقعی مختصر افسانے میں ایک ایک فقرہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ذرا مقصد سے ہٹا تو اس غلط سُر کی طرح نمایاں ہونے لگتا ہے جسے باجہ
بجانے والا غلطی سے چھو کر راگ کو بے ڈھنگا بنا ڈالتا ہے مثلاً جس جگہ بازار کی ویرانی اور آوارہ گرد کے خلاف معمول جلد آ جانے کا ذکر ہے وہاں فقرہ ہے کہ:

"میرے لئے اس کے سوا چارہ کار نہ رہا کہ آج معمول سے پیشتر اپنی ویران کوٹھری کی خیال آفریں تنہائی میں چلا جاؤں"

اگر اس کے آگے یہ بھی لکھ دیا ہوتا "چنانچہ گذشتہ رات میں نے جو تھیٹر دیکھا تھا میں اس کی ٹھمریاں گاتا ہوا سرائے کی طرف روانہ ہو گیا" تو آوارہ گرد
کے طریق زندگی کو دیکھتے ہوئے شاید اس فقرے کو بے موقع نہ کہا جا سکتا لیکن اس کی طبیعت پر اضمحلال کے جس اثر کو دکھانا تھا اس کے لحاظ سے
ٹھمری گاتے ہوئے گھر لوٹنے کا خیال راگ کے غلط سُر کی طرح دماغ کو صدمہ پہنچاتا۔

غلط اثر پیدا کرنے والے فقروں کے ساتھ مختصر افسانے میں مختلف چیزوں کے بیان کی مقدار بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ جہاں مختصر افسانہ میں
سے بیان کا تناسب دور ہوا مصنف اپنے مقصد میں واضح طور پر ناکام ہو جاتا ہے۔ اردو مصنفین میں تناسب کی سمجھ بہت کم ہے۔ اگر ایک چیز
کے متعلق ان کے مشاہدات کثیر اور دلچسپ ہیں اور مختصر افسانہ کے دوران میں اسی کے استعمال کی ضرورت پڑ گئی تو پھر اپنے مشاہدات کے اظہار کا
شوق اعلیٰ افسانہ لکھنے کی آرزو پر غالب آ جاتا ہے۔ وہ اپنے مشاہدات میں سے حسب ضرورت مواد منتخب نہیں کر سکتے۔ بلکہ تمام احتیاطوں سے
بے پرواہ ہو کر پھوٹ بہتے ہیں۔

اندھیرے میں لیٹے لیٹے آوارہ گرد کا خیال ماضی و حال کے طوفانی سمندروں میں غوطے کھا رہا ہے:

"میں نے اسکو چھوڑ دیا" یہ الفاظ میرے کانوں میں کوئی آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے ایک
گہرا سانس لیا اور کوشش کی کہ ماضی کی ناگوار یاد میرے حافظہ سے محو ہو جائے مگر ایک متوسط درجے کے مکان میں
ایک معمر بزرگ کی مظلوم صورت بیکسانہ انداز سے مجھے گھور رہی تھی۔ اس کے آنسو اس کی سفید داڑھی کو تر کر رہے تھے
"آہ میرا باپ" وہ باپ جس نے اپنی زندگی کی تمام آسائشیں میری ترقی و بہبود کی امید کے ہاتھ فروخت کر رکھی
تھیں جس نے مجھ پر بھروسہ کرنے میں پدرانہ شفقت کے ساتھ قدرے سادہ لوحی کا ثبوت بھی دیا تھا
اس کی آنکھیں مجھے اس خاموش تاریکی میں ملامت سے گھور رہی تھیں اور کالے کوسوں دور میں اپنی ماں کے غمناک
چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ عین اسی بے بسی کی حالت میں جس طرح سے میں نے اسے چھوڑا تھا۔"

ماں باپ کی نسبت کی کتنی تصویریں ہر شخص کے ذہن میں محفوظ ہوتی ہیں۔ ماں باپ کا نام زبان پر آتے ہی کتنے بہت لوچدار واقعات دماغ میں

گھومنے لگتے۔ ان سب کو ہاتھوں میں لے لے کر تولنا۔ صرف اپنے افسانے کی ضرورت کے اعتبار سے چند چیزیں لے لینا اور خیال کی باقی تمام رعنائیوں اور دلکشیوں کی طرف پیٹھ کر دینا مختصر افسانہ نویس کا سب سے بڑا امتحان ہوتا ہے

ان احتیاطوں سے مختصر افسانہ لکھا جاتا ہے اور یہی احتیاطیں ہیں جن کی بنا پر میں نے حفیظ صاحب کے افسانوں کو اردو میں غیر معمولی چیز کہا تھا۔

میں ایک ہی افسانے کے تجزیے میں اتنے بہت صفحے لکھ چکا ہوں کہ باقی افسانوں پر تفصیل سے اظہارِ رائے کرنا اور ان کی خوبیوں کی طرف پورے طور سے توجہ دلانا اس موقع پر دشوار ہے

"افسانہ در افسانہ" میں پنجاب کی دیہاتی زندگی جیسی مکمل تصویر ہے

"ہوشیار دیوانہ" میں جیسے کمال اور احتیاط سے بتدریج انکشافِ سیرت کیا گیا ہے۔

"حیاتِ تازہ" میں محل وقوع نے جو شادابی اور رعنائی پیدا کی ہے

"خودکشی" میں پنجاب کے نچلے متوسط طبقے کی غیر منظم زندگی کے جس پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے

"طمع" میں اندھے دیوتا کی فریب کاریوں کو جس لطف سے ظاہر کیا گیا ہے اور

"سہاگ کی رات" میں مسرت کے نقاب کے نیچے سے جو ہیبت پیدا ہوتی دکھائی گئی ہے ان پر تفصیل سے اظہارِ خیال بہت فرصت چاہتا ہے اور پھر یہ امید تو کی جا سکتی ہے کہ حفیظ کی شاعری کے بے شمار قدردان شاید حفیظ کے افسانے پڑھ لیں لیکن مختصر افسانے کے فن پر کوئی طویل اور خشک مضمون پڑھنا غالباً ان کے لئے زیادہ دلچسپی کا موجب نہ ہو۔ ایسی حالت میں میں جو کچھ لکھ چکا ہوں اگر وہی توجہ سے پڑھ لیا گیا تو میں اپنے لئے غنیمت اور حفیظ کی افسانہ نویسی کے محاسن سمجھنے کے لئے کافی تصور کروں گا۔

(ہفت پیکر)

شاعرِ شباب

(صفحہ ۴۸۴ سے آگے)

مگر شاعر ایک سچا شاعر ان ظاہری حواس کے تاثرات سے دیر تک مطمئن نہیں رہ سکتا۔ حفیظ پہلے ہی ان سطحی مناظر سے عمیق جذبات کو ملا دیتا ہے۔ اور "نغمہ زار" کے بعد کی نظمیں تو تمام تر اسی راہ کے ارتقائی مراحل ہیں۔

مکرر آنکہ — نیجرل شاعری کے سلسلہ میں حفیظ کی ایک اور خصوصیت قابلِ ذکر ہے جو ہم عصر شعرا میں نادر نہیں بلکہ معدوم ہے یہ "لوکل کلر" (مقامی رنگ) ہے۔ مناظرِ قدرت کی نقل ہی میں نہیں بلکہ ان کے جذباتی ماحول میں بھی اس کا استعمال نمایاں ہے "طوفانی کشتی" یا "پانچ دریاؤں کے ملک" کا کس قدر سچا ڈرامہ ہے! اسی طرح پنجاب کی دیہاتی زندگی کے اور بہت سے نقشے نظر آتے ہیں۔

(دیباچہ۔ نغمہ زار)

ڈاکٹر سید عبداللہ

حفیظ کی شاعری - نالہ پابندی

ہمیں حفیظ کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کہ ان کی شاعری محض نالہ دل ہے، نغمہ درباب نہیں - وہ شاعری کیا جس کی شاعری میں نالہ دل اور نغمہ درباب مل جل کر سامنے نہ آئیں - شاعری تو ایک لحاظ سے ہے ہی موسیقی اور موسیقی بھی اس نوع کی کہ اس کو کان کے علاوہ دل بھی سن سکتا ہے - شعر کی ایک داخلی موسیقی بھی ہوتی ہے جس کو گائے بغیر بھی گایا جا سکتا ہے اور سنا جا سکتا ہے اور اگر شاعری کبھی اپنی اندرونی موسیقی کے علاوہ نغمہ درباب کی بھی ہم قدم بن جائے تو اسے عیب نہ کہئے کیونکہ یہ تو وہ ہنر ہے جو شعر کو دو آتشہ بنا دیتا ہے ! مدعا یہ ہے کہ حفیظ کی شاعری نالۂ دل بھی ہے اور نغمہ درباب بھی - اور ان دونوں چیزوں کے علاوہ اس میں اور بھی بہت کچھ ہے - اس میں غبارے اور کھلونے بھی ہیں جو فضا میں اڑتے نظر آتے ہیں - اس کی شاعری کے بہ ٹھاٹھ بھی ہیں کہ نلک شامیانہ ہے اور پربت قناتیں اور اسی ٹھاٹھ کے ہمراہ اس کے یہاں تہی دستی و پستی و خستہ حالی بھی ہے، یعنی وہ خار زاروں کی دنیا جو گولوں سے معمور اور پھولوں سے خالی ہے اور معلوم نہیں کتنی اور دنیائیں ہیں جو شاعر کے تخیل میں ہیں جن سے وہ اپنی شاعری کی کائنات آباد کرنا چاہتا ہے - یکجا ان تمام دنیاؤں کی ایک جھلک حفیظ نے اپنی نظم "میری شاعری" میں دکھا بھی دی ہے !

ع مرا شعر شیشہ بھی، تیشہ بھی ہے بھی

ع میرے شعر میں غازیوں کی رسالے

ع مرے شعر آنسو، مرے شعر آہیں

ع مرا شعر اخلاص کا ترجمان ہے

اور ایک سبب اس رنگا رنگی کا یہ ہے کہ حفیظ کی زندگی کے تجربات و حوادث بھی رنگا رنگ ہیں - بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر اپنی زندگی کے حوادث سے بلند تر اور ان سے یک سو بھی ہو جاتا ہے مگر حفیظ کی شاعری میں زندگی نے ہر حادثے سے ایک اثر قبول کیا ہے چنانچہ ابتدائی دور مفلوک الحالی اور محنت کشی سے لے کر، اور جنگ عظیم اول سے گزر کر جنگ عظیم ثانی تک اور اس کے بعد قیام پاکستان کی تحریک سے لے کر پاکستانی سلطنت کے نظام کے فروغ تک کونسی وہ جد و جہد ہے جس میں حفیظ شریک نظر نہیں آتا - حفیظ کی تخیلی زندگی اس کی عملی زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے - وہ ایک باعمل شاعر ہے جو جہاد زندگی سے مفرور کبھی نہیں ہوا - مختلف شاعروں کا باہمی موازنہ کرنے کی عادت کوئی اچھی عادت نہیں مگر یہ تو تسلیم ہے کہ حفیظ زندگی کا اور عمل کا شاعر ہے کسی اور شاعر سے زیادہ نہ سہی، کسی اور سے کم بھی تو نہیں بلکہ بہت کم شاعر ایسے ہوں گے جو زندگی کے معاملہ میں اتنے باوفا ہوں گے - میں حفیظ کی شاعری کی اس حیثیت پر اس لئے زیادہ زور دے رہا ہوں کہ عام طور سے ان کی شاعری کی اس حیثیت پر زور کم دیا جاتا ہے - حفیظ کو یار لوگوں نے گیت لکھنے والا

دل بہلانے والا اور گیت گانے والا شاعر مشہور کر رکھا ہے۔ بے شک وہ گیت گانے والا ہے مگر وہ درد مند بھی تو ہے، وہ غریبوں کا غم گسار بھی تو ہے۔ وہ دل فگاروں کا ساتھی بھی تو ہے وہ اپنے من کی دنیا کی جراحتوں کا فریادی بھی تو ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی یہ فریاد اور اس کے یہ نالے پابند نے یا پابند نغمہ ہیں۔ ع

کیا پابندِ نے نالے کو میں نے!

اور اس سے (ماسوا خود حفیظ کے) کسی کو کچھ نقصان بھی تو نہیں ہوا نہ سننے والے کو، نہ شاعری کو، نہ فن کو۔! اس کی شاعری جیسی کچھ ہے نقاد کی نظر میں اس کی حیثیت اتنی ہی ہے جتنی کہ وہ مستحق ہے۔ تنقید کرنے والا مشاعرے کی محفل سے الگ اپنے کتاب گھر کے دریچے کے سامنے بیٹھ کر شاعری پر نظر ڈالتا ہے اس لئے حفیظ کے نالۂ پابند نغمہ سے نقاد کے دین و ایمان میں کچھ فرق نہیں آیا۔! دریچے کی ایک نظر یہ کہتی ہے کہ حفیظ کی شاعری میں بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جن کی کامیاب ترجمانی اس کے معاصروں میں، اس کے سوا بہت کم لوگ کر سکے ہیں اور جو پیغام اس کا ہے اس کو جس خوبی سے مقبول عام سطح پر وہ پہونچا سکا ہے اس کے ہم عصروں میں دوسرا کوئی نہیں پہونچا سکا۔ یہ صحیح ہے کہ دوسروں نے بھی اپنے اپنے مزاج کا رنگ، اپنے اپنے انداز میں ہنرمندی اور اخلاص سے ظاہر کیا ہوگا مگر عام لوگوں تک یعنی بچے، بچے تک، جوان سے بوڑھے تک اپنی بات پہنچانے میں جو کامیابی حفیظ کو نصیب ہوئی ہے وہ بہت کم لوگوں کو ہوئی۔ ہاں یہ قبول عام بعض اوقات خود اس کے لئے مزدور وجۂ بدنامی بن جاتا رہا ہے مگر مجھ سے پوچھئے تو میں کہوں گا ع

مجھ کو منظور نکو نامیٔ فرہاد نہیں

حفیظ کی شاعری میں ایک مستقل نقطۂ نظر ہے جو بدلی ہوئی شکلوں میں بار بار سامنے آتا ہے اور وہ ہے قومی، وطنی اور ملی احساس۔ حفیظ نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو ہندوستان ایک عظیم اضطراب سے دوچار تھا۔ رولٹ ایکٹ جلیانوالہ باغ، تحریک خلافت، ہندو مسلم اتحاد، ترک موالات وغیرہ۔ اس عالم اضطراب میں حفیظ دو عظیم شخصیتوں سے متاثر ہوا۔ اقبال اور محمد علی سے۔ یہ دونوں رہنمایان فکر اپنے اپنے رنگ میں حفیظ کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہے۔ ملک کی آزادی کا مسئلہ کوئی اختلافی مسئلہ نہ تھا مگر محمد علی اس میدان کے عملی مجاہد تھے اور اس زمانے کے بہت کم لوگ ہوں گے جوان کی طوفانی زندگی سے متاثر نہ ہوئے ہوں۔ اقبال مسلمانان ہند کے علمی اور ذہنی رہنما تھے۔ شاعر بھی تھے فلسفی بھی تھے۔ حکمت آموز اور حکمت شناس بھی تھے۔ حفیظ پر ان کا اثر مستقل اور دیرپا ہوا۔ غرض حفیظ نے اپنے ماحول میں ان دو بزرگوں کے زیر اثر ایک نقطۂ نظر قائم کیا جس کو میں نے بغرض سہولت قومی اور ملی نقطۂ نظر کہا ہے۔

حفیظ کی مجموعی ترجمانی کے پیش نظر ان کو اگر ملی شاعر کہہ دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ میں نے ملی اور قومی میں امتیاز اس لئے کیا ہے کہ حفیظ وطن دوست اور قوم پرور ہونے کے باوجود، قومیت کی مذہبی اساس کا معتقد رہا اور یہ اقبال و محمد علی کے اثر کے علاوہ اس سبب سے بھی ہے کہ حفیظ کی فطرت ہی عقیدتوں سے سیراب و شاداب ہے۔ عقیدت نفس انسانی کی ایک ایسی تمنا کا نام ہے جو عقلی تجزیے سے بے نیاز ہو کر جذبات کی دنیا سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔ عقیدت کے پھول تخیل کی ان رفعتوں پر اگتے ہیں جہاں محبت ہی محبت ہوتی ہے اور تجزیہ و قیل و قال کے کانٹوں کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ حفیظ بھگتی داسوں کے مانند قلب انسانی کی انہی سرشاریوں کو پیش کرتا ہے ع

مرا شعر شیشہ بھی نشہ بھی مے بھی

مگر عقیدتوں کی بحث تھوڑی دیر بعد آئے گی۔ ابھی میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ حفیظ ایک مذہبی مزاج کا آدمی ہے۔ اس میں بغاوت کم اور تسلیم کی خو زیادہ ہے۔ اسی عادت کی وجہ سے اسے ملیت اور قومیت کے اس تصور سے کبھی وحشت نہیں ہوئی جس کی اساس مذہب پر ہے اور اسی وجہ سے وہ پاکستان کے قیام سے پہلے بھی قوم سے زیادہ ملت کے زاویہ نظر سے دیکھتا اور سوچتا رہا اور اسی وجہ سے وطن دوست ہونے کے

ساتھ ساتھ مسلمانوں کی الگ ہستی اور انفرادیت کا بھی معتقد اور طلب گار رہا۔ پاکستانی ذہن و شعور پیدا کرنے والوں میں حفیظ کا بھی بڑا حصہ ہے۔ یہ شعور (جیسا کہ معلوم ہے) وطنی اور مذہبی تقاضوں کے امتزاج کی پیداوار تھا چنانچہ اس کی شاعری میں وطن کی آزادی کے جذبے کے ہمراہ ملت کی آزادی کا احساس بھی نمایاں ہے۔ انگلستان میں اس نے جو نظمیں لکھیں (مثلاً نیرنگِ فرنگ اور اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے) ان میں وطن کی محبت کارفرما ہے۔ مگر عید شہیدوں کی عید، ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا، اور درۂ خیبر وغیرہ میں اس کی آواز ایک دوسری لے اختیار کرتی ہے۔ پھر بھی وہ وقت کے دوسرے اہم افکار سے اثر لیتا رہا۔ "خوب ہنسے گا دیوانہ" یہ نظم اقتصادی ناہمواریوں کا انکشاف کرتی ہے اور وہ اس طبقاتی شعور کی بھی نمائندگی کرتا ہے جو سنہ ۳۰ ـ ۴۷ کے درمیان کے ہندوستان کے ذہن و فکر پر خاصا مسلط تھا۔ اس زمانے میں حفیظ نے بھی ایک خواب دیکھا۔ اس نے اس عالم خواب میں سرمایہ داری کے قصر گرتے دیکھے اور اس نے یہ دیکھا کہ غریبوں کے غلبے کے آتے ہی امرا کے ایوان زرنگار بھائیں بھائیں کرنے لگیں گے اور دنیا اس جبر و تعدی سے نجات پالے گی جو سرمایہ پرستوں کے راج کا لازمی نتیجہ ہے۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے اعلان آزادی کے بعد ملک کی جو حالت ہوئی حفیظ کو اس سے بھی دکھ ہوا۔ اس نے فریب آزادی میں اپنے اس ردعمل کا بھی اظہار کیا ہے جو آزادی سے وابستہ توقعات کی شکست کے باعث پیدا ہوا۔

سماجی تصورات کے اعتبار سے حفیظ ان رسموں، روایتوں اور طریقوں کا بڑا مداح رہا ہے جو تاریخ نے مسلمان قوم کو دیے۔ اس کی نظم "رقاصہ" اس کی بے حد مقبول نظم ہے جو مقبول اس لئے بھی ہے کہ وہ جمہور کے سماجی خیالات کی ترجمانی کرتی ہے۔

حفیظ کی شاعری کا یہ حصہ اپنے زمانے میں جتنی توجہ سے پڑھا اور سنا گیا ضروری نہیں کہ بدلے ہوئے حالات میں بھی اس کی اتنی ہی قدر کی جائے۔ اس سے زیادہ دیرپا اور مستقل اہمیت ان کی عقیدت مندانہ شاعری کی ہے جس کی سب سے محکم صورت ان کی نعتوں اور سلاموں میں نظر آتی ہے۔ بعض لوگ نعتوں کی شاعری کو مذہبی شاعری کہہ کر اس کی تنقیص کرتے ہیں مگر نعتیہ شاعری محض ایک کنارے سے مذہبی شاعری ہوتی ہے — مذہب کی شاعری وہ ہوتی ہے جس میں مذہب کے مسائل بیان ہوں یا مذہب کی تمجید و تقدیس کے لئے موعظتی طرز بیان اختیار کیا جائے۔ لیکن مذہبی شخصیتوں کی عقیدت کی شاعری جس میں جذبہ محبت بھی ذاتی، انفرادی اور شدید شکل اختیار کر لیتا ہے، خشک نظم گوئی نہیں ہوتی۔ اس کی نوعیت ایک خاص حد تک عشقیہ شاعری کی ہو جاتی ہے جس میں جذبہ عشق تجریدی صورت میں پاک اور منقح ہو کر نمایاں ہوتا ہے اور اس کے اظہار کے لئے جو علامتیں اور اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں وہ بھی عاشقی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔

"میرا سلام لے جا" عقیدتی شاعری کا شاہکار ہے۔ محسن کاکوروی کا قصیدہ نعتیہ بھی بڑا مقبول و معروف نظمیہ شاہکار ہے مگر اس کی ہندوانہ فضا کو دیکھ کر کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے عقیدت کے جوش میں آنحضرتؐ کو ملکی دیومالا کی فضا میں دیکھا اور دکھایا ہے۔ اور اگرچہ محبت کے معاملہ میں زبان سے زیادہ جذبہ قابل لحاظ ہے مگر آداب کا فتویٰ یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے تعلق میں "با محمد ہوشیار" کی احتیاط ملحوظ رہے تو بہتر ہے۔۔۔ حفیظ دفورِ عقیدت کے طوفان میں بھی پاس ادب کی کشتی کو سنبھالنے میں کامیاب رہا ہے۔ ضبط اور وقار اس سلام کا سب سے بڑا خاصا ہے اور نظمیہ تعمیر کے اعتبار سے تو یہ حسن ترکیب کا بہترین موقع ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں حفیظ کو زندہ رکھنے کے لئے اس کا یہی ایک سلام کافی ہے۔ نظم "مدینہ کے مسافر" بھی کامیاب ہے مگر "میرا سلام لے جا" میں جس قسم کی والہیت پائی جاتی ہے وہ شاہنامۂ اسلام کے سلاموں میں بھی نہیں۔ "سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی" احترام کی تصویر ہے۔ عاشقی کی ترجمان نہیں۔ شاہنامہ اسلام بھی بہت بڑی نظم ہے جس کی بنا پر شاعر خود کو فردوسی اسلام کہہ کر اپنے کارنامے پر خود کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔۔۔ اور ہم بھی اس مبارک باد میں اس کے ہم نوا ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ شاعری کو جب تاریخ نگاری کے بوجھ تلے چلنے پر مجبور کر دیا جائے تو وہ بے چاری ذرا تکلیف سے ہی چلتی ہے۔۔۔ رزمیہ نگاری اور رزم نگاری اور تاریخ نگاری تینوں کے دائرے مختلف ہیں اور ان میں شاعری کو سب سے زیادہ تکلیف اس آخری چیز سے ہوتی ہے

کیونکہ تاریخ میں امرِ واقعہ کی سچائی لازمی ہے جس کے دائرے میں تخیل کے فرشتے کے پر جلتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سائنسی سچائی سے سرمو تجاوز ممکن ہی نہیں جب صورت یہ ہو تو شاعری کے لئے اس میں کونسا میدان باقی رہ جاتا ہے۔۔۔۔ ایپک کی بات اور ہے۔ اس میں تخیل کو کھلا سانس لینے کی اجازت ہوتی ہے

پھر بھی شاہنامہ اسلام خوب صورت مرقع نگاری سے خالی نہیں اور ملی ادبیات میں تو اس کا مقام منفرد ہی ہے۔ شاعری میں حفیظ کا اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے گیت کو مقبول بنانے میں بڑا حصہ لیا۔ گیت لکھنے والے اور بھی ہیں مگر حفیظ نے گیت کی کلا کو سچ مچ گانے کی چیز بنا دیا اور اس میں گیت کی معنوی روح بھی بھر دی۔ گیت کا آہنگ سنگیت کے تابع ہے اس کی داخلی روح نیم افسردگی اور نیم نشاط کے امتزاج سے ترکیب پاتی ہے۔ گیت میں غم ہو سکتا ہے جسے درد اشتیاق کہیئے مگر اس غم کی لہر نشاط زندگی کے چشمے سے ابھرتی ہے۔ گیت بڑی اونچی سطح پر نامعلوم فضاؤں میں پرواز کرنے والی چیز ہے مگر اس کی ایک زمینی سطح بھی ہے جو اس کے تاروں کو تمام و کمال اور دم بدم زمینی رشتوں سے وابستہ کئے رکھتی ہے۔ گیت حد سے زیادہ غم انگیز اور الم خیز مضمون کا متحمل نہیں ہو سکتا اسی طرح گیت ضرورت سے زیادہ جوش انگیز مضمون اور پُر خروش لے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ گیت کو دوہے کی طرح درس حکمت بھی نہیں بن جانا چاہیئے اور نہ بھجن کی طرح اسے نغمہ الوہیت بن جانے کی اجازت ہے۔ گیت تو فقط بھولپن، معصومیت، قبل از عنفوان شباب کے بے سادہ جذبات یا درد اشتیاق کی ان صورتوں کے لئے موزوں ہیں جن میں غم شوق کی دل شکستگی شوق زیست کی خوشی سے شیر و شکر ہو جاتی ہے اور اپنے آخری تاثر میں ایک شیریں خواب کی یاد حسرت آلود شکل میں محفوظ رہ کر ایک مبہم سی خوشی پیدا کر کے فضاؤں میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ گیت کے الوہی نغمے، ان روحانی کیفیتوں کو بھی خوب ادا کرتے ہیں جو بھگتی یا عقیدت کے جذبے کی پیداوار ہیں۔

حفیظ اردو کے واحد گیت نگار نہیں مگر منفرد گیت نگار ضرور ہیں۔ انہوں نے گیت کی تکنیک کی پابندی کی بھی ہے اور نہیں بھی کی حفیظ کے گیت کرشن بھگتوں کے گیتوں سے یہ مماثلت ضرور رکھتے ہیں کہ ان میں معصوم شرارتوں کی لہریں کبھی کبھی سطح پر بھی نظر آتی ہیں مگر عام طور سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے گیتوں میں ولولہ اور جوش زیادہ ہے اور وہ نیم دل شکستگی یا ہلکا ہلکا درد نہیں پایا جاتا جو گیتوں کی جان ہے۔ ان کے گیتوں کی بحر اور مصرعوں کی ساری اندرونی ترتیب و ترکیب اکثر رجزیہ ہوتی ہے۔

جاگ سوزِ عشق جاگ!

پھر اسی اٹھان سے — تیر اٹھے، کمان اٹھے
صبر کس زبان سے — شور الامان اٹھے

جاگ اٹھیں دلوں کے بھاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

رنگ دے، رنگ دے، قدیم رنگ
رنگ دے قدیم رنگ، بے دریغ بے درنگ
جس کی ضو سے مات ہو، رنگ بازیٔ فرنگ
عشق کے لباس کو رنگ دے قدیم رنگ
رنگ دے، رنگ دے، قدیم رنگ

(پرانی بسنت)

"اندھی جوانی" میں مصرعوں کی ترتیب اور قطع و برید ایسی ہے جس سے رجزیہ جوش اور مستی پیدا ہوتی ہے۔ حفیظ کے گیتوں میں ٹیپ یا استھائی کی تکرار بھی اسی کیفیت کی آئینہ دار ہے۔ کرشن بنسری میں ٹیپ در ٹیپ کا غیر معمولی اہتمام کیا ہے ان کے بعض گیتوں میں مختلف بحروں کے امتزاج کے تجربے بھی ملتے ہیں بسنتی ترانے" میں اس کی نمایاں مثال ملتی ہے، ورنگا بہ شیرین کی ایک نظم (جس کو گیت کہا جا سکتا ہے) ترک منزل دورمسافر بھی اس کی تائید میں ہے۔ بسنتی ترانے کے دو بند ملاحظہ ہوں:

لو پھر بسنت آئی　　　پھولوں پہ رنگ لائی
چلو بے درنگ
لب آب گنگ
بجے جل ترنگ
من پر امنگ چھائی　　　پھولوں پہ رنگ لائی
لو پھر بسنت آئی

کھیتوں کا ہر چرندہ　　　باغوں کا ہر پرندہ
کوئی گرم خیز
کوئی نغمہ ریز
سبک اور تیز
پھر ہو گیا ہے زندہ　　　باغوں کا ہر پرندہ
کھیتوں کا ہر چرندہ

بعض لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ حفیظ نے میرا بائی اور بہاری کی طرح کے گیت کیوں نہیں لکھے یعنی ان کے گیتوں میں ہندی الفاظ اور استعارے کیوں زیادہ نہیں مگر یہ اعتراض بڑے مزے کا اعتراض ہے کیونکہ زندگی بہاری اور میرا بائی کے زمانے پر آ کر رک تو نہیں گئی۔۔ نہ جدت اور تجربے پر قدغن لگ گئی ہے۔ حفیظ اپنے مزاج کو اور اپنے زمانے کا پابند ہے اس لئے یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں کہ ان کے گیت، ہندی کے بجائے فارسی ترکیبوں سے کیوں معمور ہیں البتہ یکسبات ضرور کہنے کی ہے کہ گیت کی صنف کے لئے دل شکستگی اور نشاط کی جس آمیزش کی تلاش ہمیں ہے وہ حفیظ کے گیت میں نہیں ہے اس کو کوئی عیب کہے تو کہہ سکتا ہے مگر میں تو اس کو بھی جدت ہی کہوں گا جس طرح اقبال کی آخری دور کی غزل کو میں غزل کے نئے تجربہ سے تعبیر کرتا رہتا ہوں اگرچہ غزل مجھے میر ہی کی اچھی لگتی ہے اور گیت میرا بائی کے دل پسند ہیں، اور مجھے تو عظمت اللہ خان، مقبول احمد پوری اور اختر شیرازی کے گیت بھی اسی معنی میں گیت نہیں لگتے کہ ان میں سے ہر ایک کے یہاں گیت کے کسی نہ کسی ضروری عنصر کی کمی نظر آتی ہے اور حفیظ کے معاملے میں ایک عذر اور بھی تو ہے، وہ یہ کہ ان کا زمانہ روحانی انفرادیت کے ولولہ خیز عناصر کا ترجمان ہے اور حفیظ کے سر بھی اسی گت میں ہیں۔

حفیظ نے بچوں کے لئے جو شاعری کی ہے اس میں بھی تخیل کی عجائب تیزی سے زیادہ بچوں کی طبعی ہنگامہ پسندی کے رجحان کو برانگیختہ کیا گیا ہے یوں یہ ضرور مدنظر رہنا چاہئے کہ حفیظ نے مناظر و مظاہر قطرت کے بیان میں اس معصومانہ استعجاب و حیرت کا ثبوت دیا ہے جو نیچر کی شاعری کا ایک جزو خاص ہے لیکن یہ جذبہ و مسرت اور استعجاب ورڈز ورتھ کا سا نہیں۔ حفیظ اس انفعالی مسرت کا شاید معتقد ہی نہیں جو ہنگامۂ زیست سے منقطع نہ سہی، ذرا فاصلے پر ہو۔ بچوں کی شاعری میں حفیظ بچوں کے روپ میں سامنے آتا ہے مگر وہاں بھی وہ بوڑھا بچہ نہیں، سچ مچ بچہ ہے۔۔۔۔ اور

وہ بھی ایک تیز طرار اور شوخ شریر بچہ ۔! حفیظ کا بچپن ہر عمر میں اس کا رفیق و ندیم ہے

یہ سب کچھ کیا ہے؟ حفیظ کا مزاج خاص، جو مستانہ لے اور آہنگ کا شاعر ہے اور یہ لے اس کی خمریہ شاعری تک محدود نہیں بلکہ ہر قسم کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ "بجے جل ترنگ، لب آب گنگ" سے لے کر "مستوں پر انگلیاں نہ اٹھاؤ بہار میں" تک اور "ابھی تو میں جوان ہوں" سے "میرا اسلام لے جا" تک ہر صنف شاعری میں حفیظ کی لے جوانی کی لے اور آہنگ جوش زندگی کا آہنگ ہے۔

غزل گو حفیظ (جہاں تک میں سمجھا ہوں) گیت لکھنے والے حفیظ کے مقابلے میں پچھلی صف کا آدمی معلوم ہوتا ہے؛ خیر یہ تو ہوئی حفیظ کی حفیظ سے لڑائی کی بات مگر باہر سے کسی دیکھنے والے کو یہ ضرور محسوس ہوگا کہ حفیظ کی غزل کے خمریہ حصے میں سرشاری کی ایک خاص کیفیت پائی جاتی ہے۔۔ اور کچھ غزلیں ایسی ہیں جن کو جی چاہتا ہے بے تکلف گیت کی صف میں کھڑا کردوں۔ بعض ایسی بھی ہیں جن کو حفیظ کے کلام سے نکال دینے کو جی چاہتا ہے (اگرچہ خود حفیظ نے محسوس نہ کیا کیونکہ ان کو یہ اعجاز حاصل ہے کہ جب میدان میں اتر آئیں تو ریں گلے اور خشک بسکٹ کا بھاؤ کرکے دکھادیں) مگر میں نہیں چاہتا کہ ان کا اعجاز اتنا معجز بن جائے کہ بھیڑ بکری برابر ہو جائے کیوں کہ ان کی غزل میں ـــــ ایسا سرمایہ بھی ہے جو غزل کی سچی چاشنی رکھتا ہے یعنی ہنگامہ نہیں مچاتا ہلکی ہلکی المیہ دردمندی کو لطافت کے انداز میں (جسے تغزل کہتے ہیں) پیش کرتا ہے مگر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ حفیظ ہنستا ہوا ہی اچھا لگتا ہے۔ وہ اداسی کے موڈ کو تا دیر برداشت نہیں کرسکتا۔ ایسا موڈ اگر مستقل ہو جائے تو اس لہجے میں تلخی اور چہرے پر جھنجھلاہٹ کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں، اور حفیظ کے خشک لبوں پر مجروح تبسم جب بھی نمودار ہوا ہے وہ مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔

حفیظ ہمارے رومانی شاعروں میں سب سے الگ اس لئے ہے کہ اس کی رومانیت کا رنگ جدا ہے۔ وہ اختر شیرانی سے اس لئے الگ ہے کہ وہ ایک ایسی محبوبہ پر فریفتہ رہا ہے جسے حفیظ نے رقاصہ کا خطاب دیا ہے۔ حفیظ کی رومانیت بعد کے رومانی شاعر مجاز سے اس لئے الگ ہے کہ حفیظ آداب زندگی کے لحاظ سے اس "آوارگی" کا کبھی معتقد نہیں ہو سکتا جو مجاز کا خاص اسلوب حیات ہے وہ میراجی اور ن۔م راشد اور جوش سے بھی مختلف ہے اور ہونا چاہئے۔ اس کی رومانیت تو اس کی اپنی ہی ہے جو ایک طرف اس کی سرشاری اور جوش زندگی میں اور دوسری طرف اس کے ملی اور وطنی ـــ احساسات میں منعکس ہوئی ہے۔ وہ نغمۂ ٹیگور کی خواب آلود موسیقی سے بھی مسحور ہے اور اسے اقبال کے لہجوں سے بھی خاص وابستگی ہے مگر اقبال کی شاعری کے انداز اور اس کی فکری گہرائی اور وسعت سے حفیظ کو کچھ زیادہ حصہ نہیں ملا۔۔۔ اور یہ بہت اچھا ہوا کہ حفیظ نے اقبال سے اشارہ پاکر۔۔ پوری بات اپنے ہی انداز میں کی۔۔۔ ورنہ آج حفیظ پر مضمون لکھنے کی کسی کو ضرورت ہی نہ پڑتی اور وہ محض وغیرہ کی صف میں شمار ہو کر قلم انداز ہو جاتے۔

حفیظ کے فنی کمالات

(صفحہ ۴۹۲ سے آگے)

کے کلام کا بغرض استفادہ مطالعہ کرنا چاہیں ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ صرف کسی خاص صنف میں شاعر کے نمونۂ کمال اور اس نمونہ کی بھی محض ایک آدھ خوبی سے متاثر ہو کر بس اسی کے نہ ہو رہیں بلکہ جن اصناف سخن میں حفیظ نے طبع آزمائی کی ہے ان سب کے مختلف نمونوں کا بہ نظر امعان مطالعہ کریں۔ ہر نظم اور ہر غزل میں ان کو وہ تمام شعری لوازم نظر آئیں گے جن کے متناسب مجموعے کا نام شعریت ہے۔ ان لوازم کے ساتھ ان کو اس تناسب کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ جس کے باعث حفیظ اور شعریت گویا مترادف بن گئے ہیں۔ حفیظ کی کامیابی کا راز یہی شعریت ہے جو ترنم کی خانہ زاد نہیں بلکہ خالق ہے۔

(دیباچہ "سوز و ساز")

بریگیڈیر گلزار احمد

حفیظ

ہر شاعر اپنے عصر کی پیداوار ہوتا ہے اس لئے یہ کہنا کہ حفیظ اپنے عصر کی پیداوار ہے کوئی نئی بات نہ ہوگی البتہ جو بات حفیظ میں نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ حفیظ اپنے گرد و پیش سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا ہے۔ شاعر کی کامیابی کا مدار اس پر ہوتا ہے کہ وہ کس شدت سے تاثر لیتا ہے اور پھر اس کا ذہن اس تاثر کے تحلیل و تجزیہ میں کس خوبی اور سرعت سے کامیاب ہوتا ہے۔ واقعات کا مشاہدہ فی نفسہٖ کوئی معنی نہیں رکھتا ہر واقعہ اپنے گرد و پیش کا ایک جزو ہوتا ہے۔ بادی النظر میں اکثر واقعات میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی۔ عام آدمی ان واقعات کو روزمرہ دیکھتے ہیں مگر ان کے قلب و ذہن کسی غیر معمولی کیفیت کی آماجگاہ نہیں بنتے۔ شاعر کے لئے ہر واقعہ معنی خیز ہوتا ہے اور جس قدر شدت سے کسی شاعر کے قلب و ذہن ان واقعات سے متاثر ہوں گے اسی قدر وضاحت سے ان کو وہ معنی بخش سکتا ہے جو ان واقعات کی تہہ میں مضمر ہوا کرتے ہیں۔ جب شدتِ جذبات قلب کو مضطرب کر دیتی ہے تو دماغ انہیں پہنچا کر الفاظ کا جامہ پہناتا ہے جنہیں مزین صورت میں دیکھ کر آپ اور ہم شعر کا نام دیتے ہیں۔ الفاظ کو پرزنا موتیوں کے پرونے کے مترادف ہوتا ہے اور جب موتی ہیرے اور رنگارنگ لعل و گہر ایک ہی لڑی میں پروئے جا رہے ہوں تو رنگوں کے امتزاج اور گہر ہائے گرانقدر کے تموّل اور چمک دمک کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے اس جڑاؤ گری کو شاعری کا آخری زینہ سمجھنا چاہئے اور یہ ہے وہ خصوصیت جو حفیظ کو اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔

حفیظ کی زندگی کا پس منظر یوں تو اس کے عصر کے عام افراد سے کچھ مختلف نہیں۔ ہاں مگر اس کے ماحول کی تفصیلات کچھ ایسی دقت طلب رہی ہیں کہ ایک طرف حساس دل اور دوسری طرف عزم بلند اور مستقل صبر و ضبط نے اس جوہر کو ایسی جلا دی کہ وہ نایاب ہیرا بن گیا۔ عجیب اتفاق کہ عام طور پر تاتراشیدہ ہیرے کو بھی ماہر ہیرا تراش کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ کام حفیظ کے لئے مصائب و آلام نے کیا۔ جہاں دوسرے اپنے جوہر کو تعلیم سے نکھارتے رہتے وہاں اسے حوادث زمانہ نے اپنے کرخت ہاتھوں سے کچھ اس طرح تربیت دی کہ اس کی چمک دمک میں ہر گام اضافہ ہی ہوتا گیا۔

غلام ملک کے ایک ضلع کے صدر مقام میں سنہ ۱۹۰۰ء میں اور بھی بہت سے بچے پیدا ہوئے ہوں گے۔ آبائی سپہ گری پر ناز کرنے والے اور بھی سینکڑوں خاندان ایسے ہوں گے جنہیں حادثات زمانہ کی وجہ سے تجارت کی طرف توجہ دینی پڑی ہوگی اور ان خاندانوں میں ہزاروں ایسے بچے ہوں گے جو زمانہ کے رسم و رواج کے ہاتھوں خانگی امن و سکون کھوئے ہوئے ماں باپ کے گھر پیدا ہوتے ہوں گے۔ ایسے ہی بہت سے بچے محلہ کی مسجد میں چار سال چار ماہ اور چار دن کی قید پوری کرنے کے بعد مولوی صاحب کے سامنے زانوئے تہہ کر کے بیٹھے ہوں گے۔ جہاں تک حفیظ کا تعلق ہے ان سب باتوں کو اس کے قلب و ذہن کی ساخت میں غیر معمولی دخل حاصل رہا ہے۔ ان حقیقتوں نے اپنے اثرات گہرے چھوڑے ہیں کہ حفیظ اگر آج بھی ان سے نجات حاصل کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ فطری بات ہے کہ ان کا اثر اس شاعری میں ظاہر ہوتا۔ ایسا ہی ہو کر رہا۔

شاعر اور حقیقی شاعر جسے فطرت نے قلبِ مضطرب عطا کیا ہوتا ہے اور جو زبان پر قدرت حاصل کر لیتا ہے وہ اپنے گردوپیش سے اثر لینے پر ہی اکتفا نہیں کرتا۔ وہ اثر لے چکنے کے بعد ہر شے اور ہر واقعہ سے متاثر ہو کر ایک ایسی صدا بلند کرتا ہے جس سے اس کا ماحول اثر پذیر ہوتا ہے اور یوں وہی گردوپیش جس نے شاعر کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا ہوتا ہے۔ اب شاعر کی طاقتور آواز کے زور سے اپنے سانچے میں رکھنے محسوس کرنے لگتا ہے۔ اب شاعر اور اس کے ماحول کے درمیان ایک غیر محسوس سی جنگ شروع ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ اکثر یہ ہوا ہے کہ ادھر ماحول کی شکل و صورت بدل جاتی ہے اور دوسری طرف شاعر نحیف و نڈھال ہو جاتا ہے۔ جہاں تک حفیظ کا تعلق ہے اس جنگ نے بھی کچھ ایسا ہی رنگ اختیار کیا۔ ایک طرف تو ماحول غیر محسوس طور پر بدلتا گیا اور دوسری طرف حفیظ کے عوارض زیر بار ہوتے گئے مگر جیسا کہ آزمودہ کار سپاہیوں کا معمول ہے۔ مادی کمزوریوں کا ازالہ قلب و ذہن کی تنومندی کی صورت میں رونما ہوتا گیا۔

ہم حفیظ کی شاعری کو اس کی زندگی کا آئینہ بتا چکے ہیں۔ سب سے پہلے اس بات کو لیجئے کہ وہ غلام ملک میں پیدا ہوا۔ یہ وہ ملک تھا جو ہتھیار ڈال چلنے کے بعد ہتھیاروں کے نام تک بھول چکا تھا۔ اس ملک کی شکست، شکست فاش تھی اور بیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے معاشرے میں کسی کو امید نہ تھی کہ غلامی کی زنجیریں زنگ خوردہ ہونے کے سبب یک بیک خود ہی پاش پاش ہو جائیں گی اس لئے بہت کم لوگ انہیں توڑنے کا خیال کر رہے تھے۔ حفیظ کا خیال کچھ اور تھا۔ وہ رجز کی طرف متوجہ ہوا مگر تاریخ کی اوٹ لے کر۔ اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتا ہے ؎

یہ غفلت کیوں ہے اے خاموش عزلت کے سودائی
ملا ہے دَرگہِ حق سے تجھے سامانِ گویائی
قلم سے زندہ کر سکتا ہے تو ان کارناموں کو
سنا سکتا ہے تو پیغامِ آزادی غلاموں کو

ملاحظہ ہو۔ یہ "ضمیر کی آواز" "شاہنامۂ اسلام" کی پہلی جلد کی اولیں نظموں میں سے ہے۔ اس کا زمانہ سنہ ۱۹۲۷ء سے بعد کا نہیں ہو سکتا۔ یہ مردِ آزاد طبع اس وقت آزادی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ یہ خواب وہ اپنی ملت کے ہر فرد تک پہنچائے گا اور یوں تاریخ کی دہائی دے کر انہیں جنگِ آزادی کے لئے تیار کر دے گا۔ وہ جانتا تھا کہ امراء "نشۂ زر اور مستی مے میں" "طاؤس و رباب" کے کھیلوں میں مصروف ہیں اگر آزادی کے لئے کسی نے جان و مال کی قربانی کی تو وہ عوام ہوں گے۔ وہ اگلے ہی شعر میں کہتا ہے

نہ شاہوں سے توقع رکھ نہ دنیا کے امیروں سے
عظیم الشان ہے یہ کام نکلے گا فقیروں سے

اور پھر طریقہ بھی بتا دیتا ہے

عوام الناس میں ہنگامۂ احساس پیدا کر	دلوں کو از سرِ نو حسنِ حریت پہ شیدا کر
اٹھے نام خدا جب بت شکن بن کر قدم تیرا	ہزاروں غزنوی پیدا کرے زورِ قلم تیرا

غلام ملک کے پرانے سپہ گری کے دلدادہ خاندان کے ایک اوسط گھر کے حساس فرد کے دل کی دھڑکنوں کی صدا اس سے بہتر رجز خوانی نہیں کر سکتی۔

حفیظ کے بچپن کا زمانہ وہ تھا جس میں مشرق کے پرانے معاشرتی خدوخال ابھی پوری طرح موجود تھے خاص طور پر اوسط طبقے کے گھروں میں عورتیں بھی پرانی طرز کی زندگی پر قائم تھیں۔ چرخہ کاتنا۔ چکی پیسنا۔ کھانا پکانا۔ گھر کی صفائی میں مصروف رہنا اور جب دو چار پڑوسنیں مل کر بیٹھتیں تو زیرِ لب گنگنا بھی لیتیں۔ شادی بیاہ پر ڈھولک کے ساتھ گیت بھی الاپے جاتے تھے۔ اگر مردوں نے ڈھولک کے گھر میں آنے کی ممانعت کر دی تو

گھڑا اور تھال لے کر ہی میٹھے میٹھے سروں والے دلپسند گیت گا لئے جاتے۔ سادہ الفاظ اور سادہ تانیں جس میں جذبات کی ترجمانی تو ہوتی تھی مگر شعر و فلسفہ کے امتزاج کی پیدا کردہ پیچیدگی نام کو نہ ہوتی تھی۔ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ حفیظ نے نہ صرف یہ کہ پنجاب کے دیہات کی لڑکیوں بالیوں کے یہ گیت شوق سے سنے ہوں گے بلکہ اس نے یہ گانے اپنی تنہائیوں میں گائے بھی ہوں گے اور لطف بھی لیا ہوگا ورنہ وہ یوں نہ کہتا ؎

آموں کے نیچے
ڈالے ہیں جھولے
مہ پیکروں نے سیمیں تنوں نے
برق انگنوں نے
گیت ان کے پیارے میٹھے رسیلے!
ہلکی صدائیں سادہ ادائیں۔
گل پیرہن میں غنچہ دہن میں
خود مسکرانا خود منہ چڑانا
پھر جھینپ جانا
اکھڑ پنے سے
آموں کے نیچے ڈالے ہیں جھولے

حفیظ لاکھ اپنے مصائب و آلام کی خشک زندگی کے ثبوت پیش کرے اور کہے کہ اس نے تو یہ بھی کہا تھا:۔

شہر اور بن خموش دشت اور چمن خموش
تن خموش من خموش
سب جہاز راں خموش کشتی رواں خموش
بحر بے کراں خموش
اور میں بھی ہاں خموش دیکھتا چلا گیا!

البتہ ہم بھی تو یہی کہتے ہیں کہ اس نے یہ سب کچھ دیکھا۔ ممکن ہے خموشی سے دیکھا ہو، دیکھا اور اثر لیا۔ یہی نہیں بلکہ اثر لینے کے بعد ان پُر کیف لمحات کی یاد سے اپنے ہم وطنوں کے خاموش لمحات کو بھی رنگینی بخشنے کی کوشش کی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کوشش کامیاب کوشش نہ تھی

یہ گیت اس کی جوانی کے گیت ہیں۔ سنہ ۱۹۲۵ء سے قبل کے گیت یعنی پچیس سال کی عمر سے پہلے کے گیت۔ آغاز شباب میں گھر داری کی ذمہ داریوں نے اسے کیوں نہ قبل از وقت ہی سنجیدہ بنا دیا ہو مگر جوانی تو رد کے ۔۔ نہیں رکتی اور نس نس سے پھوٹ پھوٹ کر اپنی موجودگی کا اعلان کیا کرتی ہے۔ پھر شاعر کی جوانی کیسے چپ چاپ اپنے دن گزار دے بلکہ جب محنت و مشقت کے عادی شاعر کی نحیف جان اور لاغر بدن کو آس پاس کے لوگ دیکھ کر قبل از وقت پیری کا گمان کرنے لگے تو اس کے محبوب تخیل نے بھی بغاوت کر دی اور اسے کہنا ہی پڑا۔

سبو اٹھا پیالہ بھر پیالہ بھر کے دے ادھر
چمن کی سمت کر نظر سماں تو دیکھ بے خبر
وہ کالی کالی بدلیاں

افق پہ ہو گئیں عیاں
وہ اک ہجوم میکشاں
ہے سوئے میکدہ رواں
یہ کیا گماں ہے بدگماں   سمجھ نہ مجھ کو ناتواں
خیال زہد ابھی کہاں
ابھی تو میں جوان ہوں

ہم اس سے قبل کہہ چکے ہیں کہ حفیظ نے اپنے ماحول سے غیر معمولی طور پر اثر لیا۔ خیال رہے کہ جب یہ گیت لکھا گیا تھا تو حفیظ کسب معاش کی تلاش میں لاہور پہنچ چکا تھا۔ جنہوں نے سنہ ۱۹۲۵ء کا لاہور دیکھا ہے۔ وہ حفیظ کی تصویر کشی کو کیوں نہ حقیقت نگاری کا نام دیں۔ جب وہ کہتا ہے ؎

حسین جلوہ ریز ہوں   ادائیں فتنہ خیز ہوں
ہوائیں عطر بیز ہوں   تو شوق کیوں نہ تیز ہوں
نگارہائے فتنہ گر
کوئی ادھر کوئی ادھر
ابھارتے ہوں عیش پر
تو کیا کرے کوئی بشر
چلو جی قصہ مختصر   تمہارا نقطہ نظر
درست ہو تو ہو مگر
ابھی تو میں جوان ہوں

ان دو بندوں کے بعد کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ حفیظ پر بھی جوانی آئی ہوگی اور یہ کہ اگر اور کچھ نہیں تو اسے خوشبو کی مہک اور رنگ روپ کی جھلک ضرور دکھائی گئی ہوگی۔ راوی یہاں خاموش ہے۔ ان گیتوں کی نغمگی کے سبب یا اس اعلان جوانی کی وجہ سے اسی سال یعنی جب حفیظ نے اپنے کلام کا پہلا مجموعہ "نغمہ زار" اپنے ادبی دوستوں کے سامنے کتابی صورت میں پیش کیا تو اسے سرکار خیر پور سے بلاوا آیا اور وہ درباری شاعر ہو کر وہاں پہنچا۔ کاش انسان کو یہ معلوم ہوتا کہ وہ اپنے اصلی گردوپیش سے ہٹ کر ذہنی نشوونما نہیں جاری رکھ سکتا۔ حفیظ کو بھی دربار کا ماحول راس نہ آیا البتہ اس مختصر سے دور کی یادگار "رقاصہ" موجود ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جس نظم نے اس دور کو مختصر بنایا وہ اب بھی ایک عہد اور ایک تہذیب کی تصویر کشی میں یکتا ہے۔ یہ نظم ایک منظر کا نقشہ ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب کا نوحہ ہے۔ اس برصغیر ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلامی میں عیش و نشاط اور رقص و سرود نے حکمران طبقے کے افراد کو ناکارہ کر دیا تھا۔ شوق شہادت سے خون کو گرم کرنے والوں کی اولاد کی رگوں کو نغمہ و شباب سے سرور حاصل ہونے لگا تو ملک کا تختہ ہی الٹ گیا مگر حکومت کے چلے جانے نے بھی ان امراء کو بیدار نہ کیا اور ان کی رنگین محفلوں میں فرق نہ آیا۔ خود دار شاعر کی غیرت اس نقشے کو نہ دیکھ سکی اور جب سابق مغنیہ اور رونق دربار بیگم نے خواہش ظاہر کی کہ دربار کا ملک الشعراء اس کا قصیدہ لکھے تو شاعر کی رگ حمیت اور بھی پھڑک اٹھی۔ اس نے قصیدہ لکھا اور ایسا لکھا کہ تاریخ میں ہمیشہ کے لئے بے مثل رہے گا۔ غربت و ناداری سے خستہ بدن شاعر کو بمشکل آسودگی کے چار دن میسر آئے تھے مگر وہ غیرت مند تھا اور اس نے باعزت خشک ٹکڑوں کو ذلت کے تر نوالوں پر ترجیح دی۔ قصیدہ ختم ہوا۔ ساتھ ہی اس کی دربار کی حاضری بھی ختم ہوئی اور اسے مار پیٹ کر سڑک کے کنارے پھینک دیا گیا جہاں سے وہ بمشکل جان بچا کر نکلا اور ایک بار پھر لاہور کے ادبی حلقوں کی ٹھکا دینے والی کوچہ گردی شروع کر دی

اگر حفیظ یوں نہ کرتا تو وہ حفیظ نہ ہوتا کچھ اور ہوتا۔

سنہ ۱۹۲۸ء کا واقعہ ہے۔ میں علی گڑھ میں تھا۔ علی گڑھ کا سالانہ مشاعرہ نہایت بڑے پیمانہ پر ہوا کرتا تھا۔ اس مشاعرے میں حفیظ بھی بلایا گیا مجھے اب تک حفیظ کو سننے کا موقع نہ ملا تھا۔ علی گڑھ کی وہ شب بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔ سحر ہونے کو آئی ہوگی جب کہیں جا کر سامعین نے حفیظ کو دم لینے دیا۔ شاہنامۂ اسلام اور مسلمانوں کی سب سے بڑی درس گاہ کے طلبا کے سامنے حفیظ اپنے خاص انداز میں پڑھ کر سنا رہا ہو۔ درست کہ اس وقت مسلمان غلام تھے۔ حکمرانی کی بو باس بھی وہ بھول چکے تھے مگر یہ جذبہ سوال ان کی دکھتی رگ سے واقف تھا۔ اس نے نا معلوم کس قدر شب بیداری کے بعد "شاہنامہ" لکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور پھر نا معلوم کتنی طویل راتوں کی عرق ریزی کا نتیجہ تھا جو وہ ان نوجوان مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ احساس غلامی بڑا ہی درد آمیز ہوا کرتا ہے۔ یہ رجز خوانی انہیں اس احساس غلامی سے چھٹکارا دلا رہی تھی۔ پھر وہ کیسے اس دلخوش کن طلسم کے ٹوٹنے پر رضا مند ہوتے جب اس نے اس تصنیف کا سبب بیان کیا تو ہال تحسین و آفرین کے بے ساختہ نقروں سے گونج اٹھا۔

گئی دنیا سے آزادی محمدؐ کے غلاموں کی　　　بھلا بیٹھے ہیں یاد اپنے سلف کے کارناموں کی

ارادہ ہے کہ پھر ان کا لہو اک بار گرماؤں　　　دل رنگین سخن کے آتشیں تیروں سے برماؤں

کیا دو سو ہرس قوم نے ایران کو زندہ　　　خدا توفیق دے تو میں کروں ایمان کو زندہ

اور پھر جب حفیظ نے قطب الدین ایبک والی نظم سنائی تو سامعین کی حالت بیان سے باہر تھی۔ چند اشعار قند مکرر کے طور پر ملاحظہ ہوں:

وہ جس کی تیغ ہیبتناک سے سفاک ڈرتے تھے　　　وہ جس کے بازوؤں کی دھاک سے افلاک ڈرتے تھے

وہ جس کی ذات پر لفظ غلامی ناز کرتا ہے　　　ترقی کا تخیل عرش تک پرواز کرتا ہے

تخیل مجھ کو لے جاتا ہے اک پر ہول میدان میں　　　جہاں باہم بپا ہوتی ہے جنگ انبوہ انساں میں

نظر آتا ہے لہراتا ہوا اسلام کا جھنڈا　　　بہر سو نور پھیلاتا ہوا اسلام کا جھنڈا

علم کے سائے میں سلطان غازی کا بڑھے جانا　　　سر دشمن پر افواج حجازی کا چڑھے جانا

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ غازی مرد میں بھی ہوں　　　برائے لشکر اسلام کا اک فرد میں بھی ہوں

مرا جی چاہتا ہے اب نہ اپنے آپ میں آؤں　　　اسی آزاد دنیا کی فضا میں جذب ہو جاؤں

ہر نوجوان کے دل میں یہی جذبہ پیدا ہونا فطری سی بات تھی۔ ایک علی گڑھ ہی کا کیا ذکر ہے حفیظ جہاں جاتا اور شاہنامۂ اسلام سناتا یہی حال ہوتا۔ محکوم قوم کے نوجوانوں کو آزادی کے خواب سچے ہوتے نظر آئے اور وہ کم از کم شاہنامہ سنتے وقت یہی محسوس کرتے کہ وہ میدان جنگ میں ہیں اور کفار پر غلبہ پا رہے ہیں۔ ایسی ہی محفلیں تھیں جنہوں نے مسلمانوں میں آزاد اسلامی وطن کی آرزو کی چنگاریاں روشن کیں یہی چنگاریاں جب شعلے بن گئیں تو تاریک گھٹائیں خود بخود کافور ہو گئیں مگر وہ تو بعد کی بات ہے۔

ہم پہلے حفیظ کے بچپن کے احول کے متعلق ذکر کر چکے ہیں۔ اس ماحول میں مسلمانوں کو ایک بات کی اجازت تھی اور وہ یہ کہ انفرادی طور پر وہ اسلام کے ساتھ وابستگی کا اظہار کر سکتے تھے۔ ان کی محفلوں میں مسلمانوں کی تنظیم کا ذکر یا اس کی طرف رجوع حکام کے لئے باعث تشویش تھا۔ البتہ وہ ان محفلوں میں حمد و نعت سے مستفیض ہو سکتے تھے۔ جب حکم اور حکومت چھن گئے تو مسلمانوں نے دل میں دبی ہوئی آرزوؤں کو روشن کرنے کے لئے مذہبی مجالس کو ہی غنیمت سمجھا۔ یہ محفلیں رفتہ رفتہ خواہش آزادی کا باعث بنیں۔ حفیظ پر ان محفلوں کا اثر غیر معمولی ہوتا ہے۔ انہیں محفلوں نے حفیظ کو عشق رسولؐ کی سعادت بخشی۔ اس عشق کا اظہار اس نے اس وقت کیا جب مولانا محمد علی علیہ الرحمۃ سنہ ۱۹۲۶ء میں حجاز جا رہے تھے۔ عرشۂ جہاز مولانا کے گرویدوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ اس وقت حفیظ نے اپنی نظم "مرا اسلام لے جا" پڑھی۔

کس قدر جذب و شوق اور انتہائی عقیدت ہے اس سلام میں!

قسمت کے آسماں پر سمائے کہکشاں پر
چمکا ترا ستارا
اس در پہ حاضری کا تجھ کو ہوا اشارہ
اے بختیار بندے
اے کامگار بندے
تیری مرادمندی تقدیر کی بلندی
تجھ کو پکارتی ہے
آ بار یاب ہو جا
اے ذرۂ محبت جا آفتاب ہو جا
دربار میں چلا ہے
سرکار میں چلا ہے
جنت سفر اٹھالے اللہ کے حوالے
یثرب کے جانے والے بس اک پیام لے جا
میرا سلام لے جا

ایک ایک لفظ سے عشق و محبت کی مہک آتی ہے۔ یہ سادگی، یہ پیار، آرزو کی دبی ہوئی چنگاریاں، مقصد کی بلندی اور الفاظ کی سادگی۔ سالہا سال تک میرا سلام لے جا، ہر مسلمان کے وردِ زبان تھا۔ امراؤ ضیا بیگم کے گائے ہوئے سلام کے ریکارڈ ہر گھر میں پائے جاتے تھے۔ جو سبق سے متنفر تھے اور نسوانی آواز کو سننا گناہ سمجھتے تھے وہ بھی امراؤ ضیا بیگم کے ریکارڈ کی آواز سن کر رک جاتے تھے۔ بارہا دیکھنے میں آیا کہ سخت سے سخت دل جیالے مردوں کی آنکھیں یہ سلام سن کر آبدیدہ ہو جاتی تھیں۔ آج بھی حفیظ کے قدر داں جب اس کے ساتھ تنہائی میں بیٹھتے ہیں تو اسی سلام کی پیش کش کرتے ہیں۔

جب دو سال بعد حفیظ نے دوسرا سلام لکھا تو وہ بھی کچھ کم اشتیاق کا حامل نہ تھا۔ سلام کی تمہید ولادت باسعادت سے ہوتی ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں

یہ کس کی جستجو میں مہرِ عالم تاب پھرتا تھا ازل کے روز سے بے تاب تھا بے خواب پھرتا تھا
یہ کس کی آرزو میں چاند نے سختی سہی برسوں زمیں پر چاندنی برباد و آوارہ رہی برسوں
مرادیں بھر کے دامن میں مناجات زبور آئی امیدوں کی سحر پڑھتی ہوئی آیات نور آئی
خدا نے ناخدائی کی خود انسانی سفینے کی کہ رحمت بن کے چھائی بارھویں شب اس مہینے کی
ستوں کعبے میں قائم ہو گئے جب دین بیضا کے گرے غش کھا کے چودہ کنگرے ایوانِ کسریٰ کے
صدا ہاتف نے دی اے ساکنانِ خطۂ ہستی ہوئی جاتی ہے پھر آباد یہ اجڑی ہوئی بستی
مبارک ہو کہ ختم المرسلیں تشریف لے آئے جنابِ رحمۃ للعالمیں تشریف لے آئے
بصد اندازِ یکتائی بغایت شانِ زیبائی
امیں بن کر امانت آمنہؓ کی گود میں آئی

اور پھر یہ

فرشتوں کی سلامی دینے والی فوج گاتی تھی
جناب آمنہ سنتی تھیں۔ یہ آواز آتی تھی

اس سلام پرشوق کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی　　سلام اے فخر موجودات فخر نوع انسانی
سلام اے ظل رحمانی سلام اے نور یزدانی　　ترا نقش قدم ہے زندگی کی لوح پیشانی
حفیظ بے نوا بھی ہے گدائے کوچۂ الفت　　عقیدت کی جبیں تیری مروت سے ہے نورانی
ترا در ہو مرا سر ہو، مرا دل ہو ترا گھر ہو　　تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید ہے طولانی

سلام اے آتشیں زنجیر باطل توڑنے والے
سلام اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

یہ شاہنامہ اسلام کی پہلی جلد تھی۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں دوسری بار شائع ہوئی۔ پھر تیسری اور چوتھی جلدیں۔ مسلمانوں نے جو قدر مقدم اس کتاب کا کیا وہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔

یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ حفیظ کے ایسے دوست بھی ہیں جنہیں اس سے اس شدت کا اختلاف ہے کہ وہ یہ ماننے کے لئے تیار ہی نہیں کہ شاہنامہ اسلام اس کی تصنیف ہے۔ جب پہلی جلد شائع ہوئی تو کہا گیا کہ ایک بزرگ نے اصلاح کے لئے بھیجی تھی۔ حفیظ کی طرف اپنی کتاب روانہ کر چکنے کے بعد وہ راہی عدم ہو گئے۔ پھر کیا تھا حفیظ نے شاہنامہ اپنے نام سے چھپوا دیا۔ جب کوئی جواباً کہتا کہ نہیں بھئی یہ اس کا اپنا کلام ہے تو معاندانہ مزاجی سے کہا جاتا

"تو پھر دوسری جلد کیوں نہیں شائع ہوتی"

جب دوسری جلد بھی شائع ہو گئی تو اب الزام کی نوعیت قدرے سنگین تر ہو گئی۔ کہا گیا کہ ایک صوفی منش، باریش، متشرع بزرگ اپنا کلام لے کر حفیظ کے پاس پہنچے۔ اس نے کلام تو رکھ لیا اور ان بزرگ کو راتوں رات ٹھکانے لگا دیا۔ دیکھا آپ نے دو ہی جلدیں تھیں۔ یکے بعد دیگرے وہ تو شائع ہو گئیں۔ اب اگر یہ حضرت شاعر ہیں تو تیسری جلد کیوں نہیں شائع کرتے؟

بالآخر تیسری جلد بھی شائع ہو گئی اور پھر چوتھی۔ ان کے درمیانی وقفہ میں راقم الحروف کو کسی قسم کا طعنہ سننے کا موقع نہیں ملا۔ البتہ چار پانچ سال کی بات ہے ایک نہایت ہی سنجیدہ، قوم کا درد رکھنے والے صاحب نے یہ الفاظ دہرائے:

"آپ نہیں جانتے۔ یہ چار جلدیں تو حفیظ صاحب کو ایک بزرگ کے تکیہ سے ملی تھیں۔ وہ انہوں نے اپنی کہہ کے چھپوا دیں خود شاعر ہوتے تو پانچویں جلد نہ چھپ جاتی"

اللہ کرے حفیظ ان الفاظ کو پڑھ کر اس الزام سے بریت کا کوئی طریقہ پیدا کرے ورنہ اس کی تھکا دینے والی خموشی نے اس کے دوستوں کو لاجواب کر دیا ہے۔ ایک صاحب نے خوب کہا:

"پاکستان بننے کے بعد حفیظ شاعر نہیں رہا"
دوسرے نے پوچھا "وہ کیسے"
جواب ملا "وہ اب افسر بن گیا ہے"
سننے والوں نے کہا "انا للہ وانا الیہ راجعون"

حفیظ کے دوست تمام اسباب کا درویش کے تکیہ کی طرف اشارہ اتفاقاً ہدف پر پڑا۔ راوی کا بیان ہے کہ حفیظ کی عمر کوئی سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی کہ بے روزگاری اور مصائب سے تنگ آکر شہر سے باہر ایک کٹیا میں جاکر رات گزارنے کے لئے پناہ لی۔ وہاں چند درویش بھی پناہ گزیں تھے۔ ان کے حسن سلوک نے اسے اتنا متاثر کیا کہ حفیظ کئی دن ان کے ساتھ قریہ قریہ اور کوچہ کوچہ پھرتا رہا۔ جب طبیعت کی گرانی کم ہوئی تب کہیں جاکر گھر کی طرف کا رخ کیا

اسی زمانے کا ذکر ہے۔ شاید حفیظ کی عمر بیس سے کچھ اوپر ہوگی کہ گھر بار چھوڑ کر کشمیر کا رخ کیا۔ اور پیدل وادیٔ کشمیر جا پہنچا۔ جتنا عرصہ وہاں رہنے کا اتفاق ہوا ہر جگہ پیدل گیا۔ کئی سال بعد جب حفیظ معروف شاعر بن چکا تھا جب اس کے کلام کے دل دادہ ہزاروں کی تعداد میں اس کے ایک ایک لفظ پر داد تحسین دیتے تھے۔ اس نے دوبارہ کشمیر کا سفر اختیار کیا۔ اس مرتبہ ماحول بہت بہتر تھا اور وہ نظم لکھی گئی جس کا عنوان ہے "ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا"
اس نظم کے اقتباس سے اس کی صحیح بلندی کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کی تہہ میں اس پہلے سفر کے نقوش موجود تھے جو پیدل سفر کے دوران ذہن پر نقش کالحجر کی طرح پیوست ہو گئے تھے۔

غلام ملک کے باشندے کو غلامی سے نفرت ہوتی ہے۔ حفیظ کو اپنی غلامی کا احساس تھا مگر جب کشمیر کے مسلمان کی غلامی دیکھی تو خون کے آنسو جاری ہو گئے اور یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ

شیر سے محروم ہے مالک ہے جوئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اور پھر سے

سانس لینے میں بھی اسکو خوف ہے تعزیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

یہ پورا بند بھی ملاحظہ کے قابل ہے

یہ چمن اغیار کی شعلہ خرامی کے لئے — یہ ثمر شیریں ہیں اپنی تلخ کامی کیلئے
زندگانی ہے یہاں مرگ دوامی کے لئے — مائیں جنتی ہیں یہاں بچے غلامی کے لئے
ہر نفس اک سلسلہ ہے قیدِ بے زنجیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ان دنوں کشمیر کی یہ حالت تھی کہ آج کے غلام کشمیر کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔
سنہ ۱۹۲۸ء میں حفیظ کو انگلستان جانے کا موقع ملا۔ جاننے والوں کی زبانی سننے میں آیا ہے کہ حفیظ کی پذیرائی وہاں نہایت شاندار پیمانے پر کی گئی۔ اس برعظیم کے رہنے والوں کی بہت بڑی تعداد مستقل طور پر سکونت اختیار کر چکی تھی اور شاید اب بھی وہاں ہی آباد ہیں۔ وطن کے معروف اور ہر دل عزیز شاعر کا ان میں پہنچنا ان کے لئے خوش بختی کا مقام تھا۔ ہر جگہ حفیظ کو بلایا گیا۔ اس کی دعوتیں ہوتیں۔ عصرانے ہوتے۔ جلسے ہوتے اس نے خوب خوب اپنا کلام سنایا اور ملکی زبان کے پیاسوں کو محظوظ کیا۔
غلام ملک کے باشندے انگلستان کی آزاد فضا اور وہاں کے رنگ و روغن سے اس قدر مسحور ہو چکے تھے کہ اپنے صیاد کے گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگ گئے تھے۔ شاعر کے حساس دل کو یہ آزاد فضا بھی گھٹی گھٹی سی محسوس ہونے لگی۔ اس طرح کی آزادی کو وہ آزادی نہ کہہ سکتا تھا اس نے اپنے ہم وطنوں کو اپنے مخصوص انداز میں یاد دلایا کہ اگر وہ غیر ذہن کی ظاہرا دل چسپیوں سے دل بستگی پیدا کر چکے تھے تو وہ غلطی پر تھے۔ کہتا ہے !

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

رشکِ عدن ہے — باغِ وطن بھی
گل بھی ہیں موجود — گل پیرہن بھی
نازک بدن بھی — غنچہ دہن بھی
لیلیٰ روش بھی — شیریں سخن بھی
کچھ کم نہیں وہ
اجڑا چمن بھی
اس کو بھی اک بار — کر لے نظارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اور اگر ان بے وطن، وطن پرستوں کا قیاس یہ ہو کہ رنگین نغمے اور حسن دلفریب صرف افرنگ ہی کا خاصہ ہے تو وہ غلطی پر ہیں۔ اس لئے کہ ؎

حسن و نظر کی — خاموش گھاتیں
عشق و ہوس کی — دھومیں برائیں
سب ہیں یہاں بھی — یہ وارداتیں
دیکھی نہیں کیا — تو نے وہ راتیں
دولہا دلہن جب
کرتے ہیں باتیں!
ہنستی ہیں کلیاں — کھلتے ہیں تارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اس میں کیا شک ہے۔

حفیظ اپنے دوستوں کے معاملہ میں خوش قسمت رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ — مولانا محمد علی مرحوم۔ شیخ سر عبد القادر، سر راس مسعود، گرامی۔ آغا حشر کاشمیری، حسن نظامی، پطرس اور دوسرے اہل فکر و نظر اس کی قدر دانی کرتے رہے ہیں بلکہ انہوں نے اسے ملک و ملت کے لئے باعث فخر سمجھا ہے۔ حفیظ کو ان میں سے بعض مقتدر ہستیوں کے وجود کے ساتھ جو عشق تھا وہ اس نے عقیدت کے پھولوں کی صورت میں اپنے اشعار میں ظاہر کیا ہے۔

مولانا محمد علی کی وفات حسرت آیات پر "ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح" کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں:۔

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل — نہنگان اجل کی نیتیں بیداد پر مائل
ہوا کے دوش پر خونخوار عفریتوں کی فوجیں تھیں — پہاڑ اٹھ اٹھ کے ٹکراتے تھے یا پانی کی موجیں تھیں
تعجب ہے کوئی پروا نہیں تھی ناؤ والوں کو — کہ طوفاں میں نظر آئی تھی خامی باکمالوں کو

مگر وہ "سہرِ ملت" تنہا تھا اکیلا تھا　　ادھر موجوں کی شدت تھی۔ ادھر پانی کا ریلا تھا
وہ چلایا۔ وہ چیخا۔ منتیں کیں آہ و زاری کی　　مگر بے سود تھا سب کچھ کسی نے بھی نہ یاری کی
بلاتا تھا وہ نامِ غیرتِ اسلام لے لے کر　　جھڑک دیتے تھے لیکن سب اسے دشنام دیدکر
شکستہ ناؤ کا ملاح بے دم ہو گیا آخر　　بڑھا کر حوصلہ تن میں ہمسو کم ہو گیا آخر
نہ جھکتا تھا کبھی پیر و وزیر و شاہ کے آگے　　وہ سر اک مرتبہ پھر جھک گیا اللہ کے آگے

شکستہ ناؤ میں طوفان کی اس چیرہ دستی میں
وہ اپنا فرض پورا کر چکا تھا بحرِ ہستی میں

آغا حشر کاشمیری کی موت پر کس سادگی سے کہا ہے :

حشر کا بھی کام پورا ہو گیا!
لو یہ ہنگامہ بھی آخر سو گیا
اور اک روشن ستارہ ٹوٹ کر
رات کی تاریکیوں میں کھو گیا!

سر راس مسعود کی قدردانی کی تعریف کس لطیف پیرائے میں کی ہے ؎

میں اس کی بزم میں آیا تو اٹھ گیا وہ بھی
طلب نے ہاتھ بڑھایا تو کچھ نہ تھا موجود

حسن تشکر اسی کو کہتے ہیں۔
اقبالؒ کی زندگی میں اقبالؒ سے متعلق جو نظم لکھی اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو :

ہے ازل کی اس غلط بخشی پہ حیرانی مجھے
عشقِ لافانی ملا ہے زندگی فانی مجھے!

اور پھر اسی نظم میں حسن طلب کی مثال دیکھئے ؎

میرے دل میں بیٹھ مجھ کو سوئے منزل لے کے چل　　ناخدا ہے تو یہ کشتی تا بہ ساحل لے کے چل
تیرا درسِ زندگی میرا شریکِ حال ہے　　اے مرے روشن ستارے تو مرا اقبال ہے

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ حفیظ کی شاعری اس کی زندگی کا عکس ہے۔ وہ آزادی کا دلدادہ تھا اس لئے وہ آزادی کی تمنا کرتے وقت تخیل کی بلندیوں پر پرواز کرتا ہے اسی طرح جب آزاد بندوں کی یاد میں کچھ کہتا ہے تو اس کے الفاظ میں وہی اثر ہوتا ہے جو دل سے نکلی ہوئی بات میں ہونا چاہیئے۔ شاعری کو نظاروں، چاند تاروں اور خارزاروں کی دنیا کہنے کے بعد جب جنگ و جدل کی عکاسی کی طرف پلٹتا ہے تو کہتا ہے :-

بہادر، جری، سورما، اور جیالے　　تقاضائے بن کی ڈھالیں، قدر جن کے بھالے
تہور کے گھوڑوں کی باگیں سنبھالے　　چلے سوئے رزم گہ عزم والے

مرے شعر ہیں غازیوں کے رسالے
مری شاعری شہسواروں کی دنیا

شاہنامہ کا مصنف اس طرح فخر کرنے پر حق بجانب ہے۔

حفیظ نے غزل کی طرف بھی توجہ دی ہے اور اس صنف شاعری میں بھی اپنا مقام پیدا کیا ہے۔ شعر کی کوئی صنف ہی کیوں نہ ہو جب تک انداز بیان تخیل کی بلندی کا ساتھ نہ دے شعر میں اثر پیدا نہیں ہوتا مگر غزل کے لئے یہ صفت اور بھی ضروری ہے۔ غزل کہنا محض رواجی ضرورت ہی نہیں بلکہ زبان و بیان اور اظہار خیال کے سنوارنے کے لئے اس سے بہتر طریق مشق سخن ابھی ایجاد نہیں ہوا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہر شاعر اپنی شاعرانہ زندگی کا آغاز اسی سے کرتا ہے۔ حفیظ نے میدان غزل میں بھی ابتدائی ہی میں اپنے لئے اولیں صف میں جگہ پیدا کر لی تھی۔ عہد شباب کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

امیدیں، آرزوئیں کھیلتی ہیں یوں مرے دل سے — پلٹ جاتی ہیں موجیں جس طرح ٹکرا کے ساحل سے
رہ تقلید حفیظ اپنا کوئی ہم دم نہ تھا لیکن — نگہ کچھ دیر تک لڑتی رہی شمشیر قاتل سے

کعبہ کو جا رہا ہوں۔ نگہ سوئے دیر ہے — ہر پھر کے دیکھتا ہوں۔ کوئی دیکھتا نہ ہو

مجاز عین حقیقت ہے باصفا کے لئے — بتوں کو دیکھ رہا ہوں مگر خدا کے لئے
یہ جانتا ہوں کہ ہے نصف شب مگر ساقی — ذرا سی چاہیئے اک مرد پارسا کے لئے

ملا جو درد دیا دل تو کیا ملا نہ ملا — ترس کے عمر کٹی درد آشنا نہ ملا
کرم کیا دل بے مدعا دیا تو نے — ترے کرم کا مگر کوئی مدعا نہ ملا
بتوں نے عشق دیا، وہ بھی لاعلاج مرض — خدا سے درد بھی مانگا تو لا دوا نہ ملا
برنگ شعلہ اڑا ہے مرے شباب کا رنگ — شراب تند ملی تھی مگر مزا نہ ملا

ان کو جگر کی جستجو۔ ان کی نظر کو کیا کروں — مجھ کو نظر کی آرزو اپنے جگر کو کیا کروں
رات ہی رات میں تمام طے ہوئے عمر کے مقام — ہو گئی زندگی کی شام اب میں سحر کو کیا کروں
اہل نظر کوئی نہیں اس لئے خود پسند ہوں — آپ ہی دیکھتا ہوں میں اپنے ہنر کو کیا کروں

حفیظ وہ خوش بخت شاعر ہے جس کے "نغمہ وطن" کو قبولیت کا شرف بخشا گیا ہے۔ اگر حفیظ نے اور کوئی یادگار نہ چھوڑی ہوتی تو یہی ایک قومی ترانہ اس کے نام کو دوام بخشنے کے لئے کافی تھا مگر وہ اور یادیں کیسے نہ چھوڑتا۔ اس کے "گلہائے رنگارنگ"، "تسنیم" کے گیت، اس کی رجزیہ نظمیں اور اس کا شاہنامہ — یہ سب پیش خیمہ تھے اس "قومی ترانے" کے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سالہا سال وہ راتوں کو اس لئے آنکھوں میں کاٹا کرتا تھا کہ اس کا ہنر پختہ سے پختہ تر ہوتا جائے حتیٰ کہ ایک دن جب اس کی قوم آزاد ہو جائے تو وہ اس خوشی میں رجز، اور گیت، تاریخ اور خواب مستقبل کو ایک ہی لڑی میں پرو دے اور یوں حیات جاوداں کا حقدار بن جائے

پاک سر زمین شاد باد — کشور حسین شاد باد

کہہ کے اس نے صرف ۱۴ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کے جذبات کی ترجمانی ہی نہیں کی بلکہ جب سے مسلمان ایک آزاد وطن کا خواب دیکھ رہے تھے اس وقت سے ہر مسلمان کے جذب و شوق کی ترجمانی کی ہے۔ خدا اسے اس کی جزا دے۔

میجر سیّد ضمیر جعفری

حفیظ - ایک نئی آواز

رواں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے میں اردو کے جن شعراء کو امتیازی قبولیت و شہرت حاصل ہوئی، اقبال کے بعد حفیظ کا نام ان میں سرِ فہرست نظر آتا ہے۔ ان کے اکثر گیت اور بعض نظمیں ملک کے محبوب و مرغوب نغمے بن چکی ہیں۔ یہ شرف کسی کسی کے حصے میں کبھی کبھی آتا ہے۔

اس شرف میں "شائبہ خوبیٔ تقدیر" بھی یقیناً ہوتا ہے۔ لیکن اگر غیر معمولی "جوہرِ قابل" ساتھ نہ دے تو خالص و محض "خوبیٔ تقدیر" زیادہ دیر تک اور زیادہ دور تک ساتھ نہیں دیتی۔ حفیظ کی شہرت و قبولیت کی جڑیں ہوا میں نہیں، زمین میں ہیں۔ بہت گہری، بہت دور تک۔ اس کی محبوبیت کا راز (جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں) اس کے گلے کے "نور" میں نہیں، اس کے شعر کے "سرور" میں ہے جس کا مختصر سا جائزہ لینا اس فرصت کا مقصود ہے۔

عمر کے لحاظ سے موجودہ صدی اور حفیظ ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ اس وقت تک "شاہنامۂ اسلام" کی چار جلدوں کے علاوہ، کلامِ حفیظ کے تین مجموعے — "نغمہ زار" (۱۹۲۵ء) "سوز و ساز" (۱۹۳۳ء) اور "تلخابۂ شیریں" (۱۹۴۶ء) شائع ہو چکے ہیں۔ طویل خاموشی کے بعد گذشتہ کچھ مدت میں شدہ چند غزلیں بھی سامنے آئی ہیں ؎

تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

۱- نئی آواز

حفیظ اردو ادب میں ایک "دھماکے" کے ساتھ نمودار ہوا۔ یہ "دھماکہ" — "نغمہ زار" تھا جو اپنے دامن میں اردو شاعری کے لئے کچھ نئے پھول اور کچھ انوکھے نغمے لایا — خوب صورت، شیریں۔

حفیظ نے اردو شاعری کو پہلی مرتبہ:

(۱) اتنے میٹھے، اتنے پیارے اور اتنے بہت سے گیت دیئے جو اس سے پہلے نہیں لکھے گئے تھے۔

ان گیتوں کی مٹھاس، ان کے رس، رچاؤ، بہاؤ اور سبھاؤ نے یک بارگی ادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

ان کا رسیلا پن سیدھا دلوں میں اُتر گیا۔ ان کی دوڑتی گاتی ہوئی نغمگی بے ساختہ لبوں سے بہہ نکلی: "ابھی تو میں جوان ہوں" "پریت کا گیت" اور بعض دوسرے نغمے فضا پر چھا گئے۔

"بسنتی ترانے" کا ایک بند سنئے ؎

ہے عشق بھی جنوں بھی　　مستی بھی جوشِ خوں بھی

کہیں دل میں درد

کہیں آہ سرد

کہیں رنگ زرد

ہے یوں بھی اور یوں بھی　　مستی بھی جوش خوں بھی

ہے عشق بھی جنوں بھی

گیت کی یہی طرح تو آگے چل کر "سوز و ساز" اور "تلخابۂ شیریں" میں "جاگ سوزِ عشق جاگ" "دل ہے پرائے بس میں" "تیری منزل دور مسافر" اور "درشن دو شن میرا" ایسے مشہور گیتوں میں ڈھل کر اردو شعر کو نئی نئی لطافتوں سے آشنا کرتی چلی گئی — "تلخابۂ شیریں" تک حفیظ کی رنگا رنگ جینیئس کا یہ سوتا ابھی خشک تو نہیں ہوا مگر "نغمہ زار" اور "سوز و ساز" والی بھرپور مستی و تازگی ایک حد تک ضرور مدھم پڑ گئی ہے ؎

زمانے! او زمانے! مار ڈالا

حفیظ کے گیتوں کے متعلق فراق نے اپنی ایک براڈ کاسٹ تقریر (۱۹۴۰ء) میں کہا تھا:

"یہ تیاری، یہ ابلتی ہوئی اور اٹھلاتی ہوئی جوانی، یہ بے تکلف اور بے لاگ رچاؤ اور نکھار۔ یہ شوخ اور چنچل رنگینی، یہ دھن یہ سُریلاپن، یہ رنگ یہ رس، یہ کسک اور یہ انگڑائیاں، ہم کو آج تک کسی اردو شاعر میں نہیں ملتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصرعے اور اشعار رکھے نہیں گئے ہیں، بلکہ چھلک پڑے ہیں۔"

حق یہ ہے کہ ان سے بہتر الفاظ میں حفیظ کے نغماتی آرٹ کی خوب صورتیوں کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔
گیت حفیظ کی پہلی خصوصیت تھی۔ ایک تڑپا دینے والی خصوصیت۔ اردو شاعری میں ایک نئی آواز جس نے ادب کو چونکا دیا۔

۲۔ تکنیکی تجربات

حفیظ نے ہیئت و اسلوب میں تکنیک کے نئے نئے تجربات کئے اور اس طرح اردو شاعری کو نئی وسعتیں اور نئے امکانات دیئے۔

یہ ٹھیک ہے کہ روایاتِ فن کے لحاظ سے حفیظ اصلاً اردو کے کلاسیکی دور کا شاعر ہے۔ تاہم حفیظ کا شمار اُن

فطین و عظیم فن کاروں میں ہوگا۔ جن کی صلاحیت اپنے ادب کو بعض نئے افق اور نئی بنیادیں بھی دے جاتی ہیں۔ حفیظ نے جہاں قدیم سکہ بند اسالیب کو سنوارا اور نکھارا۔ انہیں ایک نئی تابندگی و تازگی بخشی۔ وہاں اپنے تجربات کی صورت میں رنگارنگ کے نئے سانچے بھی دیتا چلا گیا ہے۔ محض تجربہ کرنا ایسے کمال کی بات نہیں۔ کمال یہ ہے کہ اس کے تجربات کامیاب و دل نشیں ثابت ہوئے۔ مقبول و محبوب ٹھہرے۔ اس نے بحور میں کمی و بیشی، صوتی جھٹکوں اور نغماتی ہلکوروں سے اس حسن کاری کے ساتھ کام لیا ہے کہ اس اپج کو ایک مستقل آرٹ کا مقام مل گیا ہے۔ میری رائے میں اردو شاعری کے جدید ترین تکنیکی رجحانات کی بنیاد واضح اور شعوری طور پر سب سے پہلے حفیظ ہی نے رکھی۔

"سوز و ساز" تک حفیظ نے اپنی اس خصوصیت کو بڑی مہارت نہایت خوبی اور انتہائی تازگی کے ساتھ برتا ہے۔

۳- حفیظ اور نغمگی

حفیظ نے اردو شاعری کو موسیقی و نغمگی کا ایک نیا امتزاج اور رچاؤ دیا۔

شاعری کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے ایک موقع پر ایک نہایت جامع بات یوں کہی تھی ——

"—— شاعری کیا ہے —— ؟

بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب !"

یہ "بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب" دراصل شعر میں وہ موسیقی اور نغمگی پیدا کرنے کا ذریعہ ہے جو شعر کی جان ہوتی ہے۔ شعر اور موسیقی کا رشتہ بڑا لطیف ہے۔ شعر میں اگر نغمگی نہیں، جو ظاہر ہے کہ "بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب" ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ تو وہ شعر ایک رسیلی اور پیاری، دل کش اور دل آویز چیز نہیں۔ آرٹ کی ایک جمیل تخلیق نہیں۔ خیال کتنا اونچا بھی کیوں نہ ہو، شعر موثر نہ ہوگا۔ بات چاہے دل ہی سے نکلی ہو تیر کی طرح دوسرے کے سینے میں ترازو نہیں ہوگی۔ "غم جاناں" ہو یا "غم دوراں" کلام میں اگر شیرینی نہیں تو سب بے کار۔ شاعری محض فلسفہ یا ریاضی کا نام نہیں۔

حفیظ بلاشبہ اس آرٹ کا بادشاہ ہے۔ اس کے ہاں موسیقیت یں رچی بسی "بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب" اس حسن، تناسب، لطافت اور کثرت کے ساتھ ملتی ہے کہ اس کے بغیر ہم اس کے آرٹ بلکہ خود حفیظ کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ایک لطیف و متوازن نغمگی اس کے آرٹ کا سب سے بڑا حسن ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہوا میں بہتی ہوئی ایک بے نام لذت کو اس کی پوری مٹھاس، رس اور لوچ کے ساتھ اشعار میں نچوڑ تا چلا جاتا ہے۔ اس کے الفاظ گاتے ہیں۔ مصرعے گنگناتے ہیں۔ نرم۔ رواں دواں۔ کوئی ٹکڑا اٹکتا نہیں۔ کوئی لفظ کھٹکتا نہیں۔

ایک نظم کا یہ بند دیکھئے ؎

عطر بیز لالہ زار
نغمہ ریز جوئبار
حشر خیز آبشار

کیفِ موجِ بے قرار
چاندنی میں کوہسار
تھا بہار در بہار
میں یہ شانِ کردگار
دیکھتا چلا گیا

(چاند کی سیر)

"ابھی تو میں جوان ہوں" — "برسات" — "تاروں بھری رات" اور دوسری بہت سی نظمیں اسی بھرپور رنگینیت سے چھلک رہی ہیں۔

الفاظ کے انتخاب میں فطرت نے حفیظ کو ایسا لطیف وجدان عطا کیا ہے کہ باید و شاید۔ یہ لطافت اس روپ اس رس، چھل بل اور چہک و مہک کے ساتھ کسی دوسرے کے یہاں نہیں ملتی۔ شعر کی روح میں گھلی ملی نغمگی کی جو ہلکی ہلکی لہریں اول اول چکبست اور درگا سہائے، سرور اور محسن کاکوروی یا اکبر الٰہ آبادی کی بعض مشہور نظموں میں ابھری تھیں، حفیظ نے انہیں نکھیر کر ایک مستقل فن بنا دیا ہے — آرٹ کی اس جمالیاتی معراج کو پا لینا آسان نہیں۔

یہ خصوصیت محض کچھ نظموں یا گیتوں تک ہی محدود نہیں۔ اس کی غزل میں بھی قطرہ زن، مترنم نغمگی کا وہی عالم ہے۔ مصرعے زبان پر آتے ہی نغمے میں تحلیل ہو جاتے ہیں کہ یہ نغمگی خود شعر کے اندر موجزن ہوتی ہے۔ وہ الفاظ کی معنوی دھوپ چھاؤں، تکرار، ان کے الٹ پھیر، قافیے کے ٹکراؤ، بندشوں کے بہاؤ، اور ردیف کے رچاؤ سے ایک عجیب گاتی اٹھلاتی ہوئی نغمگی پیدا کرتا ہے۔ یہی اس کا آرٹ ہے۔

ذرا دیکھیے ؎

جادۂ پامال مہر و ماہ طے کرتا ہوا
مہ بہ مہ، انجم بہ انجم، راہ طے کرتا ہوا
لہریا آبی دوپٹا تا کمر لپٹا ہوا
دامنوں سے دامنِ شام و سحر لپٹا ہوا
میری اپنی روح کے نغمے کی لے کم ہو گئی
قلب کو گرمانے والی کوئی شے کم ہو گئی
میرا نغمہ۔ نغمۂ دریا سے کم آواز تھا
ہاں مگر ہم رنگ و ہم آہنگ و ہم آواز تھا

(تین نغمے)

اور غزل میں ؎

ارادے باندھتا ہوں سوچتا ہوں توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے
الٰہی! دل نوازی پھر کریں وہ مے فروش آنکھیں
الٰہی! اتحادِ شیشہ و پیمانہ ہو جائے

دریا سے موج اٹھی، سوئے دریا پلٹ گئی
مجھ کو لئے ہوئے مری توبہ لئے ہوئے

حفیظ کی غزل اسی داخلی نغمگی سے لبریز ہے۔

غزل تو غزل "شاہ نامۂ اسلام" ایسی طویل و سنگلاخ نظم میں بھی جہاں جہاں کوئی نخلستان آگیا ہے، بہا لے گیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی نغمہ دری نے عرب جنگ آزماؤں کے کھٹن نالوں سے بھی سُر تال پیدا کر لیا ہے۔ مثلاً

یہاں تک ابرِ باراں کی رسائی ہو نہیں سکتی
گھٹا روتی ہوئی آتی ہے لیکن رو نہیں سکتی

ہلا دیتی تھی کہساروں کو جن کی دھاک پیدل تھے
جنابِ حمزہ کیا، خود صاحبِ لولاک پیدل تھے

شاہ نامے میں ایسے اشعار کم نہیں ہیں۔ اور اس خالص تذکرہ نگاری میں نغمگی، موسیقی کو یوں سموتے چلا جانا حفیظ ہی کا حصہ ہے۔

حفیظ کی یہ نغمہ آفرینی اب تک قائم ہے۔ البتہ "تلخابۂ شیریں" میں وہ نغمگی جو کبھی ایک گاتی ہوئی ندی، گنگناتی ہوئی چاندنی اور مسکراتی ہوئی کرن تھی۔ رفتہ رفتہ لب و لہجے کی متانت میں بھی دب گئی ہے ؎

زندگی کی منزلوں میں جس قدر آگے بڑھے
دلکشی کے ساتھ رستہ پُرخطر ہوتا گیا

۴۔ نیچرل شاعری

حفیظ نے اردو شاعری میں نیچرل شاعری کے ایک نئے دبستان کا اضافہ کیا۔

نیچرل شاعری کے ضمن میں اولیت کا سہرا تو خیر حفیظ کے سر نہیں باندھا جا سکتا۔ تاہم یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ اس صنف کی جلا دتہذیب میں حفیظ کا بڑا دخل ہے۔ اس نے اظہار کے اچھوتے پیرائے، منظر کشی کے نئے زاویئے، محسوسات کے نادیدہ افق، اور آرٹ کے ممکنات کے نئے نئے راستے ضرور دریافت کئے اور اس کی نغمہ بار نظرت اس رنگ میں بھی اسے وہاں لے آئی جہاں وہ سب سے الگ بھی ہے اور دل آویز بھی۔ حفیظ کی نظم بے ساختہ سادگی اور

بے ساختہ نغمے کا ایک دل کش امتزاج ہے۔

یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس کی نیچرل شاعری میں گہرائی و گیرائی ایسی زیادہ نہیں ہوتی۔ وہ منظر کے عقب میں جا کر اس کی روح کو اپنی گرفت میں نہیں لاتا۔ نہ منظر یہ تاثرات کو آفاقی احساسات سے ہم کنار کرتا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اپنی حسن کارسادگی کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ بعض دوسروں کی طرح وہ بھی ایک سرے سے دوسرے سرے تک محض بحر و بحر کہتا آتا چلا جاتا ہے۔ اس کا طغرائے امتیاز اس کا جزرس مشاہدہ، طرزِ بیان کی وہ شگفتگی ہے جو فطرت کی طرح ہنستی کھیلتی ہے۔ اور قدرت کے ساتھ اس کا سچا خلوص جو اس کی نظم کو اس طرح منظر کا ایک جزو بنا دیتا ہے کہ پروفیسر احمد شاہ بخاری کے الفاظ میں :

"قدرت کی نیرنگیاں تصویریں بن بن کر آنکھوں کے سامنے
آتی اور غائب ہو جاتی ہیں۔ اور لطافت و نزاکت شاعری کا جھلملاتا
ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہیں "

"جلوۂ سحر" "ستاروں بھری رات" "تصویر کشمیر" "برسات" "راوی میں کشتی" "شام رنگیں" "صبح و شام کہسار" "بجارہ پربت" وغیرہ میرے نزدیک اس رنگ کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ مثالاً چند اشعار نقل ہیں ؎

بن گیا ہے آسماں نتھرے ہوئے پانی کی جھیل
یا کسی ساحر نے ساکن کر دیا دریائے نیل
رات کے افسون میں گم ہو گئی ہے کائنات
یہ گماں ہوتا ہے شاید سو گئی ہے کائنات
اک طرف ساتے کو لپٹائے ہے پل سویا ہوا
چاندنی پہ ریت کا ہے جزو کل سویا ہوا
اوڑھ کر معدوم بیوہ کی طرح چادر سپید
کروٹیں لیتی ہے راوی ناشکیب و ناامید
نغمہ سویا۔ ربطِ آبِ رواں کی گود میں
جس طرح اک طفل سو جاتا ہے ماں کی گود میں

(راوی میں کشتی)

اور ؎

کرنوں نے رنگ ڈالا بادل کی دھاریوں کو
پھیلا دیا فلک پر گوٹے کناریوں کو

نور کے زرّیں ایوانوں میں تالے پڑ گئے
ارغوانی بدلیوں کے رنگ کالے پڑ گئے

کوہ پر ظلمات کی پریوں نے پَر پھیلا دیئے
ہر طرف تاریک دامن کھول کر پھیلا دیئے

آپ نے دیکھا کہ کس چابک دستی کے ساتھ حفیظ اپنی نیچرل شاعری کو خوش نحری کی طرح سادہ و بے تکلف رکھتا ہے۔ گہنے ضرورت سے زیادہ لاد دیئے جائیں تو خوب صورت عورت بھی بھدی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح گرا گراتے ہوئے بلند بانگ الفاظ کی ریل پیل حد سے بڑھ جائے تو بجائے اس کے کہ سرو و صنوبر پہاڑ پر نظر آئیں پہاڑ ان پر نظر آنے لگتا ہے۔ حفیظ کا آرٹ یہ ہے کہ جب وہ چینی کے نازک نازک برتن بناتا ہے تو برتن ہی بناتا ہے عظیم الشان قلعے نہیں بناتا۔ لیکن جب قلعے بناتا ہے (مثلاً "درۂ خیبر") تو پتھر اور چٹانیں گھڑ لے آتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس نے پیارے پیارے پھول اور نازک نازک برتن اتنے زیادہ بنائے ہیں کہ گمان ہوتا ہے وہ مرمر کے عالی شان قصر شاید بنا ہی نہیں سکتا۔

مُقامی رنگ

منظر نگاری میں حفیظ کی بڑی امتیازی خوبی جو ہمارے ادب میں اسی کا عطیہ ہے اس کی نظموں کا مقامی رنگ ہے۔ گو یہ نقوش اس سے پہلے بھی یہاں وہاں دکھائی دیتے ہیں، مگر ان کی حیثیت یا تو محض جھلکیوں کی سی ہے یا پھر نظیر اکبرآبادی کی طرح اس کی نوعیت ہی دوسری تھی۔ حفیظ (غالباً پہلا اور اس وقت تک) تنہا شاعر ہے جس نے اپنے دیس کی زندگی کو اپنی نظموں میں جگہ دی ہے۔ اور اس دل آویزی و فن کاری کے ساتھ کہ ایرانی روایات نے خود آگے بڑھ کر ان نئے استعاروں اور اس نئی "لذت" کو اپنے آغوش میں جذب کر لیا ہے۔

نظم "برسات" کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو ؎

آموں کے نیچے
ڈالے ہیں جھولے
مہ پیکروں نے　　سیمیں تنوں نے
برق افگنوں نے
گیت ان کے پیارے　　میٹھے، رسیلے
ہلکی صدائیں　　سادہ ادائیں
گل پیرہن ہیں　　غنچہ دہن ہیں
خود مسکرانا　　خود منہ چڑانا
پھر جھینپ جانا
الھڑ پنے سے
آموں کے نیچے　　ڈالے ہیں جھولے

اٹھلا رہی ہیں
اترا رہی ہیں

دیکھئے، دیس کی زندگی کی کتنی سچی اور من موہنی تصویر ہے۔ مگر یہ شاہراہ بھی حفیظ ہی کی جودتِ طبع نے دریافت کی ـــ

عام نظم نگاری میں ـــ "مری شاعری چاند تاروں کی دنیا" ـــ "میرا کلام بہتر ہے" - "نیرنگ فرنگ" - "فریب آزادی" وغیرہ منظومات حفیظ کے فکری افق اور فن کارانہ قدرت کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ مجموعی حیثیت سے حفیظ کی نظم نگاری میں صناعی کا پہلو فکری تعمق پر غالب ہے۔ اس کی نظمیں جس قدر دل آویز ہوتی ہیں اتنی خیال انگیز نہیں ہوتیں۔ وہ مفکر سے زیادہ ایک آرٹسٹ ہے۔ البتہ غزل میں فکری تعمق کا عنصر بہت غالب ہے۔

تغزّل

خوش نصیب حفیظ کی ایک بدقسمتی یہ رہی کہ اُس کے پُربہار گیتوں اور نغمہ افروز نظموں نے اس کی دوسری عظمتوں پر گویا پردہ سا ڈال دیا ہے۔ یہ طلسم کچھ ایسا تھا کہ اس کی شاعری کے دوسرے شعبوں کی طرف نظر بہت کم جا سکی۔ کسی کی تو دل آسانی سے یہ بات ماننے پر آمادہ نہ ہوا کہ ع

جناب شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

زمانہ یوں بھی ایک ہی آدمی کو ایک وقت میں اس کی مختلف حیثیتوں کی یکساں داد نہیں دے سکتا۔ پھر آدمی بھی کون جو ہمارے درمیان زندہ موجود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ میرے نزدیک گیت اور نظم کی طرح غزل میں بھی حفیظ ایک نمایاں انفرادیت، ایک مخصوص طرز، ایک خاص لب و لہجہ اور ایک اپنا ہی رنگ رکھتا ہے۔ اس کی غزل میں دل اور روح، سوز و گداز، شیرینی اور تاثر، درد اور کسک، غرضیکہ وہ سب باتیں ہیں جن سے کلاسیکی غزل کا خمیر اٹھتا ہے۔ اور ان کے علاوہ اور ان سب سے بڑھ کر وہ پُرکار سادگی اور زندگی کے ساتھ بے پناہ خلوص جو حفیظ کی خالص اپنی چیزیں ہیں۔

حفیظ کی ابتدائی غزلوں میں داغ کا رنگ جھلکتا ہے۔ اسی پیروی نے اسے وہ سادگی، صفائی، سلجھاؤ، گھلاوٹ، اور ایک قسم کی شوخ و شنگ رمزیت بخشی جو بعد میں حفیظ کی غزل کا نشانِ امتیاز بن گئی۔ لیکن داغ کا رنگ صرف اسلوب تک محدود رہا۔ غزل کی روح اس کی اپنی رہی۔

حفیظ اُن شعراء میں سے ہے جو اپنا راستے اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ خود بناتے ہیں۔ چنانچہ کنگھی چوٹی کے اس زمانے میں حفیظ نے اپنی غزل کی بنیاد زندگی، اس کے سچے محسوسات اور اس کی ہمہ گیر سچائیوں پر استوار کی۔ اُس کی غزل ـــ حتیٰ کہ شباب میں بھی ـــ محض عورتوں سے بات چیت نہ بن سکی۔

حُسن و عشق کی سطحی معاملہ بندیوں میں بھی اُس نے ایک الگ راستہ اختیار کیا جسے ہم "طہارتِ فکر" یا "پاکیزگی ذوق" کا راستہ کہوں گا ـــ

اُسی کی شرم ہے میری نگاہ کا پردہ
وہ بے حجاب سہی میں تو بے حجاب نہیں

اس کے ہاں شوخی ہے مگر چھکڑپن نہیں۔ رنگینی ہے لیکن بازاریت نہیں۔ سرمستی تک ہے مگر شائستگی کے ساتھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص پابندیٔ وضع اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ شعر کہتا ہے۔ اور اسے حفیظ کا کمال کہنا چاہئے کہ "طہارتِ فکر" کی اس "مہم" میں وہ "بدمزہ" نہیں ہونے پاتا۔

"نغمہ زار" حفیظ کے شباب بلکہ نوعمری کی تخلیق ہے۔ میں یہاں اسی سے چند اشعار نقل کرتا ہوں۔ کم و بیش یہی سائے آگے چل کر وقت، حالات اور تجربے کے ساتھ ساتھ ہلکے یا گہرے ہوتے چلے گئے ہیں ؎

حال یہ ہے کہ ہم غریبوں کا
حال تم نے کبھی سنا ہی نہیں!

میں جانتا ہوں کہ ہے نصف شب مگر ساقی
ذرا سی چاہئے اک مردِ پارسا کے لئے

جھوٹی تسلیوں سے نہ بہلاؤ، جاؤ، جاؤ
جاؤ کہ تم نہیں ہو مرے اختیار میں

یاس کی بستی میں اک چھوٹی سی امیدِ وصال
اجنبی کی طرح سے پھرتی ہے گھبرائی ہوئی

بے تعلق زندگی اچھی نہیں
زندگی کیا، موت بھی اچھی نہیں

سوز و ساز

"سوز و ساز" میں سادگی زیادہ پُرکار ہو گئی ہے۔ لب و لہجہ کی تازگی و ملائمت کے ساتھ ساتھ فکر گہرا ہو گیا ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ تعمقِ فکر کی وجہ سے حفیظ نے اپنے سبک، رواں دواں شگفتہ اندازِ بیان کو ڈانواڈول نہیں ہونے دیا۔ وہی محسوسات و واردات کی دھوپ چھاؤں ہے اور وہی سہل و سادہ میٹھا پیارا اور رسیلا اسلوبِ اظہار، یہ بات آسان نہیں۔ دیکھئے ؎

یہ خوب کیا ہے یہ زشت کیا ہے، جہاں کی اصلی سرشت کیا ہے
بڑا مزہ ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے

ہنسنے کا اختیار نہ رونے کا اختیار
یہ زندگی ہے جس پہ خدا ہو گیا ہوں میں

سمجھا ہوا ہوں شوخیٔ دستِ دعا کو میں
کچھ روز اور دیکھ رہا ہوں خدا کو میں

پھر "تلخابۂ شیریں"!

جس میں واقعی وہ تلخی بڑی شدت سے ابھر آئی ہے جسے دوسری جنگ عالمگیر کے سیاق و سباق نے جنم دیا ہے۔ اب "نغمہ زار" لہریں بتدریج غائب اور غور و فکر کے سائے زیادہ گہرے ہوگئے ہیں۔ تاہم صاحب طرز شاعر نے بات کہنے کا اپنا ڈھنگ پھر بھی نہیں بدلا۔ ورنہ اس دور کے اکثر خاصے ذہین شعراء اس جنون کی بھینٹ چڑھ گئے تھے کہ اونچی بات کہنی ہو تو اقبال کے لب و لہجہ میں کہو۔ حالانکہ اقبال کے لب و لہجہ کے پیچھے اس کا عظیم الشان آرٹ اور اس کی عظمتِ فکر کار فرما تھی۔ لیکن حفیظ اپنی شخصیت اور حیات و مسائل حیات کو دیکھنے اور دکھلانے کا ایک اپنا زاویۂ نگاہ رکھتا تھا۔ چند اشعار دیکھئے ؎

جینا پڑے گا اے جانِ شیریں
کرنا پڑے گی تلخی گوارا

موت نے کس امید پر سونپ دیئے ہیں بحر و بر
مشتِ غبار ہے بشر، مشتِ غبار کیا کرے

ہاں میرے مجروح تبسم خشک لبوں پر آتا جا
پھول کی ہست و بود یہی ہے کھلتا جا مرجھاتا جا

میری یہ زندگی ہے کہ مرنا پڑا ہے مجھے
اک اور زندگی کی تمنا لئے ہوئے

"تلخابۂ شیریں" کے بعد اب تک حفیظ کی جو غزلیں سامنے آئی ہیں۔ ان میں سلاست و روانی اور فنی جگر کاوی تو خیر عروج پر نظر آتی ہے۔ مگر شگفتگی طنز میں بدل گئی ہے۔ اور طنز لطیف سے زیادہ تلخ ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تلخی

حالات کی پیداوار ہے۔ تاہم حفیظ ایسے غیر معمولی شاعر سے کچھ توقع سی تھی کہ وہ وقت کی تلخی اور عصر کی تاریکی سے اُوپر ابھر کر، زندگی کی بنیادی اور لازوال قدروں پر خالص فن کارانہ انداز میں نظر ڈالتا رہے گا۔

یوں تو حفیظ ابتدا ہی سے شعر میں سامنے کی بات نہیں کہتا۔ بلکہ عام بات کو بھی پہلو دار بنا کر پیش کرتا ہے۔ لیکن اب تو سادہ سادہ مصرعوں میں پہلو داری کا عالم ہفت رنگ ہوتا جا رہا ہے، جو اُستادانہ بلاغت کی معراج ہے بیشک

میں اسے دوست ہی سمجھتا ہوں
دوست حیران کیوں نہ ہو جائے؟

پناہِ زندگانی ڈوب مرنے کے سوا کیا تھی
یہ کشتی موجِ دریا تھی مگر بیرونِ دریا تھی

کوئی چارہ نہیں دعا کے سوا
کوئی سنتا نہیں خدا کے سوا

معنویت میں سموئی ہوئی یہ بلاغت اور اس سادگی کے ساتھ۔ ہر شخص کے بس کا کام نہیں — اس سے ظاہر ہے کہ حفیظ نے اردو غزل کو ایک نیا مزاج دیا، اور برابر اس صنف کے امکانات کو پھیلاتا چلا گیا۔

حفیظ کا کلام کمزوریوں سے خالی نہیں ہے۔ اس کے ہاں بھی ہلکے اشعار ملتے ہیں مگر بہت کم۔ البتہ تیسرے درجے کے گھٹیا اور پوچ اشعار جن سے بڑے بڑے قدآوران ادب کے دیوان اَٹے پڑے ہیں۔ اس کے ہاں نہیں ہیں۔ اور بھونڈا شعر تو خیر سرے سے ناپید ہے۔ حفیظ کی سادگی جو اس کے آرٹ کا کمال ہے بعض اوقات اس کا عیب بھی بن گئی ہے صاف سیدھی بات کہئے اور پھر قاری کو گویا اس کے گھر تک جا کر اپنا مطلب خوب اچھی طرح سمجھانے کی دھن میں بعض وقت وہ ادب کی خوب صورت بلندیوں سے پھسل کے بہت نیچے صحافت کی سطح پر اتر آتا ہے اور یوں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آدمی اس پر افسوس کرے یا تعجب۔

بہر حال حفیظ نے اردو شاعری کو اس قدر رنگا رنگ پھول دیئے ہیں کہ اس دور کے ایک صاحب طرز، منفرد اور عہد آفریں شاعر کی حیثیت سے اب وہ ہماری تاریخ ادب میں زندۂ جاوید ہو گیا ہے۔ اور اس کے خلاف جو کچھ بھی کہا جائے، جتنا بھی کہا جائے، جو بھی کہے، — کوئی بات اب اس کی عظمت کو کم نہیں کر سکتی۔ حفیظ چمنستان ادب کا وہ سدا بہار پھول ہے جس کا رنگ سب سے الگ بھی ہے اور غالباً سب سے پیارا بھی — وہ خود بھی تو کہتا ہے ؎

اس بزم میں آخر شعرا ہیں کہ نہیں ہیں
انداز مرے سب سے جُدا ہیں کہ نہیں ہیں

اور انفرادیت کا یہ امتیاز حفیظ سے کوئی چھین نہیں سکتا۔

پروفیسر حمید کوثر

حفیظ اور عشقِ رسولؐ

پنجاب کا قصباتی ماحول۔ سات برس کا سن۔ دوسرے درجے کی طالب علمی کا زمانہ۔ تختی لکھنے کی مشق ہو رہی ہے۔ یکایک شاعری اپنا رنگ ظہور دکھاتی ہے ؎

محمدؐ کی کشتی میں ہوں گا سوار

تو ہو جائے گا میرا بیڑا بھی پار

ایک شعر، دو شعر، طویل نظم، غزل، زندگی، مشقِ سخن کی صورت میں بدل جاتی ہے۔ لیکن پہلی ہی عشقیہ نظم بارگاہِ رسالت سے دلی وابستگی اور والہانہ عقیدت کی مخبری کرتی ہے۔ شاہنامۂ اسلام کا نغمہ مترنم نہایت بھولپن سے اپنے نصب العین کا اعلان کرتا ہے۔ محافلِ میلاد اور قصباتی مذہبی ماحول آتشِ عشق کو اور بھڑکاتے ہیں رسول اللہؐ کی محبت دل میں استوار ہوتی جاتی ہے۔ دامنِ مصطفےٰ خدا کی پناہ نظر آنے لگتا ہے ؎

اب پناہِ خدا میں بستا ہوں

دامنِ مصطفےٰ میں بستا ہوں

دل کی لگی کچھ چیز ہی اور ہے۔ معمولی طریق سے اظہارِ عقیدت عاشقِ صادق کے لئے باعثِ اطمینان نہیں ہو سکتا۔ جستہ جستہ نعتیہ شعر کہنے سے دل کی تسکین نہیں ہوتی۔ حفیظ اپنے مقصد کی طرف چلتا ہے اس کی حقیقی منزل رسول صلعم ہیں۔ وہ انہیں کا ذکر کرنا چاہتا ہے لیکن ابھی شوق کی راہ میں ہے۔ جس قدر بیان کرنا چاہتا ہے ہنوز اس کی ہمت نہیں رکھتا۔ طبیعت بے چین ہے۔ اضطراب کا عالم ہے۔ آخر ایک دن مدینہ کا ایک مسافر مل جاتا ہے۔ اس سے مخاطب ہو جاتا ہے ؎

دربار میں چلا ہے سرکار میں چلا ہے

رختِ سفر اٹھا لے اللہ کے حوالے

یثرب کے جانے والے

بس اک پیام لے جا میرا سلام لے جا

سرورِ کائنات کی خدمت میں سلام پیش کر چکنے کے بعد اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کرتا ہے۔ اسے مسلمانوں کی اس حالت سے جھنجھلاہٹ ہوتی ہے کہ وہ ذوق و شوق اور عشق و مستی سے منہ موڑ کر لذتِ طلب سے محروم ہو گئے ہیں۔ جس کے سبب ان کی حالت بدتر ہو گئی ہے۔ وہ اپنے پیارے نبی کی امت کو اس حال میں دیکھ نہیں سکتا۔ تڑپ کر کہتا ہے ؎

گئی دنیا سے آقائی محمدؐ کے غلاموں کی　　　بھلا بیٹھے ہیں یاد اپنے سلف کے کارناموں کی
ارادہ ہے کہ پھر ان کا لہو اک بار گرماؤں　　　دل سنگین سخن کے آتشیں تیروں سے برماؤں
سناؤں ان کو ایسے ولولہ انگیز افسانے　　　کرے تائید جن کی عقل بھی تاریخ بھی مانے
کیا فردوسیٔ مرحوم نے ایران کو زندہ　　　خدا توفیق دے تو میں کروں ایمان کو زندہ

محمدؐ کا یہ عاشق فردوسیٔ اسلام بن جانے کا عزم کر کے قلم اٹھاتا ہے۔ شاہنامۂ اسلام کا آغاز ہوتا ہے مگر بانیٔ اسلام سے نہیں خلافت انسانی سے کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ زمین و آسمان اور اس میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اسی ذات پاک کی برکت سے ہے جس کا ذکر منظور ہے اس لئے جب تک ابتائے آفرینش سے سلسلہ قائم نہ کیا جائے سیرت پیغمبر اسلام نامکمل سمجھی جائے گی۔

کیوں کہ نشان اسلام اللہ نے عالم میں رکھا ہے
کہ نور احمدؐ پیشانیٔ آدم میں رکھا ہے

حفیظ اپنے موضوع پر حاوی ہے اسے تاریخ اسلام پر پورا عبور ہے اور بانیٔ اسلام سے والہانہ عشق ہے۔ اس نے شاہنامۂ اسلام میں تاریخی حالات اور عاشقانہ روایات کا حسن امتزاج قائم کیا ہے۔ بیان سلجھاؤ، موثر اور منطقی ہے۔ واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملتی چلی گئی ہیں۔ شروع سے آخر تک تسلسل قائم رکھا ہے۔ واقعات کی نقاہت عشق کی آنچ کھا کر اور بھی نکھر گئی ہے۔ حفیظ جس پر محمدؐ عربی کے نام ہی سے رقت طاری ہو جاتی ہے۔ اور آنکھیں ساون بھادوں کا سماں باندھ دیتی ہیں اپنے بے مثل ممدوح کی تعریف میں غلو اور مبالغے سے کام نہیں لیتا بلکہ تاریخ میں تحقیق سے جام بھر بھر کر دیتا ہے حالانکہ اس میدان میں بڑے بڑوں کے قدم لڑکھڑا گئے ہیں تاہم اگر اس کے یہاں کوئی ناہمواری ہے تو وہ خلوص ——— سبب یہ ہے کہ حفیظ کو رسولؐ سے جذباتی لگاؤ ہے جہاں بالواسطہ نبی کا ذکر ہو وہاں اس کا رہوار قلم بگٹٹ دوڑتا ہے اور خلوص اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے

صدا ہاتف نے دی اے ساکنان خاک ہستی　　　ہوئی جاتی ہے پھر آباد یہ اجڑی ہوئی بستی
مبارک باد ہے ان کے لئے جو ظلم سہتے ہیں　　　کہیں جن کو اماں ملتی نہیں برباد رہتے ہیں
مبارک باد بیواؤں کی حسرت زدہ نگاہوں کو　　　اثر بخشا گیا نالوں کو، فریادوں کو، آہوں کو
ضعیفوں بیکسوں آفت نصیبوں کو مبارک ہو　　　یتیموں کو غلاموں کو غریبوں کو مبارک ہو
مبارک ٹھوکریں کھا کھا کے پیہم گرنے والوں کو　　　مبارک دشت غربت میں بھٹکتے پھرنے والوں کو
خبر جا کر سنا دو شش جہت کے زیر دستوں کو　　　ربوبیت کی جرأت اب نہ ہوگی خود پرستوں کو
معین وقت آیا زور باطل گھٹ گیا آخر　　　اندھیرا مٹ گیا ظلمت کا بادل چھٹ گیا آخر
مبارک ہو دور راحت و آرام آ پہونچا　　　نجات دائمی کی شکل میں اسلام آ پہونچا
مبارک ہو کہ ختم المرسلین تشریف لے آئے　　　جناب رحمۃ للعٰلمین تشریف لے آئے

بصد انداز یکتائی بغایت شان زیبائی
امین بن کر امانت آمنہ کی گود میں آئی

یہاں وہ اپنے دل سے مجبور ہے۔ اس کے سینے میں سچے عاشق کا دل ہے جب وہ اپنے محبوب کا ذکر کرتا ہے تو اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ سانس سینے میں رکنے لگتی ہے۔ سارا خون سمٹ سمٹ کے دماغ میں آجاتا ہے اور وہ عقیدت کے زخار سمندر میں غوطے کھانے لگتا ہے۔ سرور دو عالم کے حضور میں فرشتوں کا سلام بھی اسی داخلی کیفیت کا آئینہ دار ہے ۵

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی　　سلام اے فخر موجودات فخر نوع انسانی
سلام اے ظل سبحانی سلام اے نور یزدانی　　ترا نقش قدم ہے زندگی کی لوح پیشانی
سلام اے سرّ وحدت اے سراج بزم ایمانی　　زہے یہ عزت افزائی زہے تشریف ارزانی
ترے آنے سے رونق آگئی گلزار ہستی میں　　شریک حال قسمت ہو گیا پھر فضل ربانی
سلام اے صاحب خلق عظیم انساں کو سکھلا دے　　یہی اعمال پاکیزہ یہی اشغال روحانی
تری صورت، تری سیرت، ترا نقشا، ترا جلوہ　　تبسم، گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی
اگرچہ فقر فخری رتبہ ہے تری قناعت کا　　مگر قدموں تلے ہے فرّ کسرائی و خاقانی
زمانہ منتظر ہے اک نئی شیرازہ بندی کا　　بہت کچھ ہو چکی اجزائے ہستی کی پریشانی
زمیں کا گوشہ گوشہ نور سے معمور ہو جائے　　ترے پرتو سے مل جائے ہر اک ذرے کو تابانی
حفیظ بے نوا بھی ہے گدائے کوچۂ الفت　　عقیدت کی جبیں تیری مروّت سے ہے نورانی
ترا در ہو مرا سر ہو، مرا دل ہو ترا گھر ہو　　تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی

سلام اے آتشیں زنجیر باطل توڑنے والے
سلام اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

جلال و جبروت کی جو گونج حفیظ کے کلام میں سنائی دیتی ہے وہ آتشیں زنجیر باطل توڑنے والے، کی عطائے خاص ہے۔ حفیظ کے دل پر نبی اکرم.. کی مجاہدانہ زندگی کا گہرا نقش ثبت ہے۔ وہ غازیانہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ قطب الدین ایبک مرحوم سے اس کی گہری عقیدت اور شاہنامۂ اسلام جیسی رزمیہ کی تصنیف اس حقیقت کی نقاب کشائی کرتی ہے کہ حفیظ فوج اسلام کا سپاہی ہے، جس کی رگوں میں ایک مجاہد کا خون دوڑ رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ اسے شہادت حسین جیسے دل دوز واقع میں بھی رزم کا پہلو ہی زیادہ پسند ہے کیونکہ اس میں رسول اللہ کے جوش جہاد کی جھلک ہے۔ چنانچہ "شہسوار کربلا" میں حضرت حسین کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

لباس ہے پھٹا ہوا　　غبار میں اٹا ہوا
تمام جسم نازنیں　　چھدا ہوا، کٹا ہوا
یہ کون ذی وقار ہے　　بلا کا شہسوار ہے
کہ ہے ہزاروں قاتلوں کے سامنے ڈٹا ہوا
یہ کون ہے حسین ہے　　نبی کا نور عین ہے

حضرت حسین کو نور عین کہہ کر حفیظ نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کر دی ہے اس کا معیار عظمت "حق شعاری" ہے جو اس نے ہادی برحق سے لیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ حق شعاری مجاہدانہ ذہنیت اختیار کرے بغیر ممکن نہیں جب تک سر ہتھیلی پر نہ رکھ لیا جائے سچائی کو اپنایا نہیں جا سکتا لیکن اس سے قطعاً یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ حفیظ کا عشق رسول کسی خاص صفت پر مبنی ہے یا اسے محض ادائے جہاد پسند ہے۔ شاہنامۂ اسلام میں حفیظ نے نبی اکرم کی زندگی کا ہر پہلو پیش کیا ہے اور مکمل سیرت کو عقیدت کے ساتھ واضح کیا ہے۔ مثلاً طائف کے لوگوں کے مظالم سے متاثر ہو کر حضرت زید بن حارث نے جناب رسالت مآب سے درخواست کی کہ ان لوگوں کو بد دعا دیجئے۔ اس موقع پر آنحضرت کا جواب شاہنامۂ اسلام سے ملاحظہ ہو ؎

جناب رحمت للعالمین نے سن کے فرمایا　　کہ میں اس دہر میں قہر و غضب لیکر نہیں آیا　　(باقی صفحہ ۵۳۶ پر)

فاروق علی خاں

بچوں کا حفیظ

اگرچہ بظاہر یہ کسی طباع انسان کے منہ سے نکلی ہوئی ایک شاعرانہ بات معلوم ہوتی ہے ۔ میں نے نظریات کی دنیا میں اسے ہمیشہ انسانی دماغ کے ایک بڑے انقلاب سے تعبیر کیا ہے ۔ میرے خیال میں اس کہاوت سے بچے کے متعلق مغرب کے ایک جدید نقطۂ نظر کا واضح طور پر اظہار ہوتا ہے ۔ مشرقی ممالک میں ایک زمانے تک بچے کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی ۔ بچے کے متعلق ہمارے نقطۂ نظر کا اظہار ایک کہاوت ہی کے ذریعے ہوتا ہے ۔ وہ کہاوت ہے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ـــــ اس کہاوت کی صداقت پر ایمان رکھنے والوں کے متعلق آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ بچوں کے معاملے میں صرف ان کی فطری صلاحیتوں کے قائل تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ جو بچہ قدرت کی طرف سے غیر معمولی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتا ہے وہ بچپن ہی سے دوسرے بچوں کے مقابلے میں زیادہ ذہین اور ہوشیار ہوتا ہے اور اس کا بچپن ہی اس کی آئندہ زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے چنانچہ اکثر مشرقی والدین نے اپنی اولاد میں صرف انہیں بچوں پر زیادہ توجہ دی ہے جو اپنی ذہانت کی وجہ سے ان کے نزدیک اسکے زیادہ مستحق تھے یہ ایک ایسا روگ تھا جس نے ہماری نسلوں میں صدیوں تک اپنے زہریلے اثرات پھیلائے ہیں بخلاف اس کے مغربی ملکوں کے اس احساس میں جو انقلاب پیدا ہوا ہے وہ زیادہ حقیقت پر مبنی ہے جہاں تک غور کر کے انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ فطرت فیاض ہے بخیل نہیں ۔ قدرت اپنی نعمتیں سب میں برابر تقسیم کرتی ہے اور جو فرق ہمیں نظر آتا ہے وہ بہت حد تک خود ہمارا پیدا کیا ہوا ہے ۔

مغربی قوموں کے احساس میں جو انقلاب رونما ہوا اس میں حقیقت کا یہ پہلو غالب ہے کہ عام حالات میں بچوں کی سوجھ بوجھ تقریباً ایک سی ہوتی ہے صحیح تعلیم سے ہر بچے کی صلاحیتوں کو چمکایا جا سکتا ہے ۔ چونکہ یہ نظریہ بہت سے نفسیاتی تجربوں کا نچوڑ تھا اس لئے ترقی یافتہ اقوام بھی اس کی صداقت کی قائل ہو گئیں اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق غور و فکر کرنے لگے اور شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ نے آج مجھ ایسے کم فہم شخص کو اپنی ادبی سرگرمیوں میں اتنا وقت تو دیا ہے کہ میں اس بزم میں بساط بھر آپ سے بچوں کے ادب کی باتیں کروں ورنہ شاید اس سے پہلے ارباب ذوق کے اس ادبی حلقے نے شاید اس اہم سوال پر بہت اہم غور کیا ہے کہ ہم اپنی اس ادب نوازی سے اپنے بچوں کو کیا حصہ دے رہے ہیں ۔

میں اس وقت آپ سے اردو ادب میں صرف بچوں کی شاعری کے متعلق کچھ عرض کروں گا

بچوں کے لئے شاید باقاعدہ طور پر سب سے پہلے مولوی اسماعیل میرٹھی نے لکھنا شروع کیا ۔ ان کی نظمیں بچوں میں بہت مقبول ہوئیں اگر آج ہمارے بچوں کے ادب میں مولوی اسماعیل میرٹھی کی نظمیں کبھی نہ ہوتیں تو ہمارے مختصر سے سرمائے میں اور بھی بہت بڑی کمی ہوتی لیکن بچوں کے اس پہلے شاعر اسماعیل میرٹھی کا وجود بھی محض اتفاقات کا مرہون منت ہے کیوں کہ اگر انہیں بچوں کا نصاب مرتب کرنے کے لئے نہ کہا جاتا تو شاید اپنی شاعری چھوڑ کر وہ کبھی بچوں کے لئے الگ نظمیں نہ لکھ پاتے ۔

اسماعیل کے بعد حالی اور آزاد کا نمبر ہے۔ حالی کی بہ حیثیت ادیب، نقاد اور قومی شاعر کی حیثیت سے زیادہ ہے لیکن انہوں نے بچوں کے لئے بھی بعض اعلیٰ درجے کی نظمیں لکھی ہیں۔ مولانا کو بچوں کے لئے لکھنے کا بہت اچھا سلیقہ تھا۔

مولانا محمد حسین آزاد نے بھی ایسے موضوعات پر نظمیں کہی ہیں جن سے بچے دلچسپی لیتے ہیں مثلاً زمستان، شب سہ ما، ور شب ابر وغیرہ مگر جیسا کہ ان عنوانات کے مشکل الفاظ سے ظاہر ہے ان کی اکثر نظمیں بچوں کی سمجھ سے بالاتر ہو کر رہ گئی ہیں۔ تقریباً اسی زمانہ میں مولوی نذیر احمد صاحب نے بعض ایسی نظمیں لکھی ہیں جنہیں بچوں کے ادب میں شامل کیا جا سکتا ہے انہوں نے اپنے صاحب زادے مولانا بشیر احمد کے نام جو اس وقت زیر تعلیم تھے بہت سے خطوط لکھے تھے۔ ان خطوں میں پند و نصیحت کے علاوہ درس و تدریس کا انداز بھی ہے جو بات بچے کو زبانی یاد رکھنی چاہیئے، ان کے خیال میں آئی تو وہ اسے فوراً اشعار میں ڈھال دیا کرتے تھے۔

ایک لمبے دور کے بعد بچوں کے لئے بعض شاعروں نے مشہور انگریزی نظموں سے ترجمے بھی کئے ہیں ایسے شعرا میں علامہ اقبال کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔ ہاں علامہ اقبال نے بچوں کے لئے چند طبعزاد نظمیں بھی کہی ہیں مگر ان کی نظموں کا مرکزی خیال اکثر بچوں کی سمجھ سے بالاتر ہوتا ہے یہ نظمیں ایسی ہیں جنہیں پڑھ کر ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے انہیں پڑھیں مگر بچوں کو شاید ان سے دلچسپی نہ ہو سکی تاہم علامہ کے ایسے کلام میں بچے کی دعا کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔

متذکرہ بالا شاعروں نے بچوں کے لئے جو کچھ لکھا ہے اس کے متعلق آپ یوں سمجھ لیجئے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں سے بچوں کو اپنی شاعری کا روُنگا دیا ہے بالکل اسی طرح جس طرح بچہ ایک دوکان دار سے گھر کا سودا خریدتا ہے تو جاتی دفعہ جب وہ دوکاندار سے روُنگا مانگتا ہے تو وہ اسے کوئی چٹکی بھر میٹھی چیز تھما کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا ہے۔

اس دلیل میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان شاعروں نے بچوں کے لئے جو نظمیں لکھیں ہیں ان کے لئے آپ کو بچوں کی کوئی الگ کتاب نہیں ملے گی مثلاً مولوی اسماعیل میرٹھی کی کوئی نظم اگر آپ بچے کو پڑھوانا چاہتے ہیں تو "کلیاتِ اسماعیل" اسے دے دیجئے۔ حالی کی کوئی نظم پڑھوانا چاہیں تو دیوانِ حالی۔ اقبال کی کوئی نظم چاہیں تو بانگ درا۔ گویا ہم سے بچوں کے لئے ابھی تک اتنا کام بھی نہیں ہو سکا کہ ان شاعروں کے کلام سے بچوں کی نظمیں ہی الگ کر لیں۔

اب حفیظ کا نمبر آتا ہے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے حفیظ کو جو شہرت حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ لوگ اسے شاہنامے کے مصنف کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اس کے مدھر اور سریلے گیتوں پر سر دھنتے ہیں اور اس کی غزلوں کی داد دیتے ہیں۔

لیکن شاعر کی حیثیت سے اس کی عظمت کا سب سے روشن پہلو بچوں کے لئے اس کی شاعری ہے۔ یہی ایک حیثیت ہے جس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

حفیظ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بچوں کی دلچسپی کی چیزوں کو انہی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ انہیں کی طرح محسوس کرتا اور انہیں کے الفاظ میں ادا کرتا ہے۔ موضوعات کے تنوع کے علاوہ حفیظ نے بچوں کے انتخاب میں بھی ترنم اور بچوں ہی کی نغمگی کا خیال رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حفیظ کی اپنی طبیعت میں نغمہ و ترنم کی ایک رچی ہوئی کیفیت ہے جو اکثر گیتوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بچوں کے لئے ان کی جتنی نظمیں ہیں ان کا شمار بھی ہلکے پھلکے گیتوں میں کر سکتے ہیں۔ اکثر بچے انہیں پڑھنے سے زیادہ گنگناتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔ حفیظ کی یہ نظمیں دوسرے شعرا کی نظموں کے مقابلے میں بچے آسانی سے گا لیتے ہیں۔

ان نظموں میں حفیظ بچوں کو یہ احساس نہیں دلاتا کہ وہ ان کا استاد یا بزرگ ہے اور انہیں کوئی چیز پڑھانا یا سکھانا چاہتا ہے۔ ان نظموں میں بچوں کو خود اتنی دلکشی نظر آتی ہے کہ وہ خود شوق سے انہیں پڑھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

بچوں کے لئے حفیظ کے کلام کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس نے مختلف عمر کے بچوں کے لئے مختلف نظمیں لکھی ہیں۔ بہت چھوٹے بچوں کو سب سے پہلے جانوروں سے دلچسپی ہوتی ہے اور گھر میں بچوں کا سب سے محبوب جانور بلی ہی ہے۔ آپ میں سے کئی حضرات بھی جب بچے ہوں گے تو غالباً گھر کی بلی سے کھیلے ہوں گے۔ حفیظ کی یہ نظم سنئے:

مانو بلی چھوٹی سی — چھوٹی سی اور موٹی سی
باجی کی ہمجولی ہے — میری بھی تو سہیلی ہے
باجی کرتی ہیں آرام — اماں کو ہوتا ہے کام
ابا باہر ہوتے ہیں — یا کمرے میں سوتے ہیں
آکر مجھ سے کھیلے کون — گود میں مجھ کو لے لے کون
مانو ہی سے کھیلوں گا — گود میں اس کو لے لوں گا
آہا ہاہا آہا ھاھا — واہ بھئی واہ واہ بھئی وا
ریشم سے ہیں اسکے بال — کیسی نرم ہے اس کی کھال

اب ذرا بلی کے متعلق بچے کے جذبات دیکھئے اور حفیظ کو داد دیجئے!

کھیل رہا ہوں اس کے ساتھ — پھیر رہا ہوں اس پر ہاتھ
کھینچتا ہوں اب اس کا پاؤں — خوب کرے گی میاؤں میاؤں
کھیل ہے یہ مانو کو پسند — آنکھیں کر لیتی ہے بند
دُم اوپر کو اٹھاتی ہے — خُوخُو کرتی جاتی ہے

اب ننھے میاں کو شرارت سوجھتی ہے۔

جی میں آتا ہے اب یوں — دُم پکڑوں اور چکر دوں
لیکن یہ گھبرائے گی — جا کر ہاتھ نہ آئے گی

اس نظم کو سن کر شاید آپ نے کبھی اپنے کو بچہ محسوس کیا ہو۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کی روانی ہے چھوٹے بچوں کی زبان پر الفاظ جلد نہیں چڑھتے مگر حفیظ نے نظم ہی ایسی کہی ہے کہ اس کے الفاظ تتلی زبان پر بھی آسانی سے چڑھتے جائیں۔

چھوٹے بچوں کے لئے گھر کی چڑیا ایک بہت ہی دلچسپ جانور ہے بلکہ اڑنے والے جانوروں میں ہم پہلے چڑیا ہی سے بچے کا تعارف کراتے ہیں۔ چڑیا اور ننھے بچے کے عنوان سے حفیظ نے ننھے منوں کے لئے جو نظم کہی ہے۔ واللہ اپنا جواب آپ ہے۔

بچہ جب چلنے پھرنے لگتا ہے تو چڑیا کو دیکھ کر بچے کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ چڑیا اس کے پاس آجائے مگر جب چڑیا اس کے پاس نہیں آتی وہ دور ہی سے اس کے لئے ترستا ہے اس کے پیچھے بھاگتا ہے یہ اڑجاتی ہے تو اسے افسوس ہوتا ہے پھر آبیٹھتی ہے تو خوشی سے پھول جاتا ہے۔ چڑیا کے لئے ننھے میاں کی معصوم محبت کو حفیظ نے اپنی نظم میں یوں ادا کیا ہے ؎

آجا ری چڑیا — آجا ری چڑیا
منڈیر پر کیوں — کرتی ہے چوں چوں
آجا تجھے میں — دانہ کھلا دوں

روٹی کے بھورے — چھت پر بکھیرے دوں
لے اپنا کھا جا — کھا جاری چڑیا

اب ننھے میاں کو چڑیا کے گھونسلے میں اس کے بچے بھی دکھائی دیے۔ چڑیا سے زیادہ اب بچوں کی فکر پڑ گئی۔

سن لے ری چڑیا — سن لے ری چڑیا
کیا ننھے ننھے — بچے ہیں تیرے
کرتے ہیں چیں چیں — اتنے سویرے
لے میں نے گیہوں — چھت پر بکھیرے
یہ دانے دنکے — چن لے ری چڑیا
سن لے ری چڑیا — سن لے ری چڑیا

چڑیا بھی دانے اٹھا اٹھا کر لے جا رہی ہے اب ننھے میاں خوش ہیں۔

آ پیاری چڑیا — آ پیاری چڑیا
اڑ اڑ کے آنا — مڑ مڑ کے جانا
بچوں کو اپنے — دانہ کھلانا
لگتا ہے جی کو — کیسا سہانا
کیا پیارا پیارا — ہے تیرا گانا
گا خوب دن بھر — گا پیاری چڑیا
آ پیاری چڑیا — آ پیاری چڑیا

آپ نے دیکھا حفیظ بالکل بچہ بن چکا ہے۔ چڑیا سے اس کی دلچسپی اتنی بڑی ہوئی ہے کہ اب اسے دور سے گھر کی پالتو مانو بلی بھی نظر آ گئی ہے۔ ننھے میاں جانتے ہیں کہ مانو بلی اور چڑیا کی سہیلیاں نہیں ہیں اس لئے اب ان کو چڑیا کے لئے اندیشہ بھی پیدا ہو گیا ہے ؎

اڑ جا ری چڑیا — اڑ جا ری چڑیا
وہ مانو بلی — بیٹھی ہے دبکی
تجھ کو پکڑ کر — بس کھا ہی لے گی
ممٹی کے اوپر — جا بیٹھ اونچی
نیچے نہ آنا — مڑ جا ری چڑیا
اڑ جا ری چڑیا — اڑ جا ری چڑیا

بچوں کے ادب میں آپ کو اس موضوع پہ اس سے اچھی کوئی نظم نہیں ملے گی۔ اس ترنم میں اور اتنے آسان الفاظ میں حفیظ نے جس خوبی سے پورے مضمون کو بچے کے لئے باندھا ہے وہ حفیظ ہی کر سکتا تھا۔ اچھی سے اچھی غزل کہہ لینا آسان ہے یہ نظم کہنا مشکل ہے۔
پالتو جانوروں میں مرغا بھی ایک ایسا جانور ہے جس سے بچوں کو بے حد دلچسپی ہوتی ہے۔ خصوصاً مرغا جب بانگ دیتا ہے تو بچے اس کی اکڑ فوں اور آواز سے بہت ہی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ حفیظ نے مرغے کے لئے بچوں کا جو گیت لکھا ہے کون بچہ ہے جو اس کو اپنے دل کی بات

نہ سمجھے۔ دیکھئے بچہ جیسے مرغے کو مرغا بننا سکھا رہا ہے ؎

خوب اکڑ کر — چڑھ کھانچے پر
ہاں اب تن جا — مرغا بن جا
کھول پروں کو — کھول میرے مرغ
بول میرے مرغے
ککڑوں کوں
لے اب گردن — خوب گئی تن
سر کو جھکا دے — دم کو اٹھا دے
اپنے بازو — تول میرے مرغ
بول میرے مرغ
ککڑوں کوں
سارے لڑکے — نور کے تڑکے
سو کے اٹھیں گے — اور سنیں گے
تیرا نرالا — ڈھول میرے مرغ
بول میرے مرغے
ککڑوں کوں
بس ہاں یوں — ککڑوں کوں
بانگ تیری کتنی ہے اونچی
اس سے اونچا
بول میرے مرغ
ککڑوں کوں

حفیظ اس نظم میں بچوں سے بھی کھیلا ہے اور لفظوں سے بھی۔ تھوڑی دیر کے لئے تعجب ہوتا ہے کہ اتنا بڑا آدمی ہو کر حفیظ کس آسانی سے بڑی عمر سے نکل کر ایک خوب صورت بچہ بن جاتا ہے اور پھر کتنے پیارے انداز میں دل کو لبھا دینے والی باتیں کرنے لگتا ہے۔

ایک اور نظم سنیئے گھر کے دوسرے دھندوں سے فارغ ہو کر بی اماں چرخہ کاتنے بیٹھی ہیں۔ شاید ننھے میاں کی دادی ہیں یا پھوپھی مگر آپ تشریف لے آئے ہیں۔ چرخہ آپ کے لئے دلچسپی کی چیز ہے دل میں طرح طرح کے خیال پیدا ہوتے ہیں اور زبان ان کا اظہار بھی کرتی ہے بار بار آپ کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتے ہیں کہ بی اماں کاتنے سے رک جاتی ہیں۔ ڈرتی ہیں کہیں ننھے کا ہاتھ چکر میں نہ پھنس جائے یا تکلا نہ چبھ جائے۔ اس کیفیت میں کہتے ہیں

بی اماں لو پھر کاتو
اک دو چکر آنے دو

ٹھہرو ٹھہرو دیکھو نا! — اس میں بول رہا ہے کیا
چرخ چوں گھوں گھوں — چرخ چوں گھوں گھوں
بی امی کا چرخہ ہے — رنگ رنگیلا چرخہ ہے
پریاں اس میں گاتی ہیں — دیکھو تو چھپ جاتی ہیں
چرخ چوں گھوں گھوں — چرخ چوں گھوں گھوں

اب ذرا ملاحظہ فرمائیے:

واہ رے چرخے تیری چال — کبھی گھوم رہی ہے مال
بھئی جب چل جاتی ہے — پھر آواز یہ آتی ہے
چرخ چوں گھوں گھوں — چرخ چوں گھوں گھوں
ہاتھ میں اب لیتا ہوں روک — تکلے کی ہے تیکھی نوک
امی تار نکالو تم — پونی اور اٹھاؤ تم
چرخ چوں گھوں گھوں
چرخ چوں گھوں گھوں

بچے کو صوتی اثرات سے ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے جبھی وہ بچپن میں جانوروں کی بولیاں بول کر خوش ہوتا ہے اس نظم میں حفیظ نے بچے کی ان نفسیات کو سمجھ کر چرخے کی آواز کو شعر میں چرخ چوں گھوں گھوں کہہ کر اس طرح باندھا ہے کہ بچہ اسی گونج پر فدا ہو جاتا ہے اسی طرح کئی اور نظموں میں بھی حفیظ نے صوتی اعتبار سے ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جو بچوں کو ہنساتے اور گدگداتے ہیں۔ حفیظ نے بچوں کے لئے نظمیں اور گیت لکھتے وقت جہاں اور بہت سی باتوں کا خیال رکھا ہے وہاں ہمیں صرف اسی کے ہاں یہ خاص بات نظر آتی ہے کہ لڑکا ہو یا لڑکی بطور بچے کے دونوں کی اکثر دلچسپیاں اگر کم و بیش ایک سی ہوتی ہیں مگر پھر بھی بعض موضوعات ایسے ہیں جہاں صرف لڑکیوں ہی کو مخاطب کرنا چاہئے۔ مثلاً لڑکیوں کے کھیل ہی الگ ہیں۔ ننھی مہندی رچانے کا شوق ہے۔ آئے دن یہی کھیل کھیلا جاتا ہے۔ لیجئے بچی کہتی ہے ؎

بھیا سے کہہ کر — منگوالی مہندی
آئی ہے کیسی — رنگیلی مہندی
لاؤ کسی سے
پتے منگائیں
مہندی رچائیں

لیکن مہندی رچنے کا مزا تنہا کہاں۔ ننھی بھی اس بات کو جانتی ہے

امی بھی آئیں — آپا بھی آئیں
باجی کہاں ہے — اس کو بلالیں
آؤ تو مل کر — سب بیٹھ جائیں
مہندی رچائیں
مہندی رچائیں

اس سے آگے وہ سب کچھ ہے جو بچیاں مہندی کے سلسلے میں کیا کرتی ہیں۔

لڑکیوں کو چونکہ ڈھولک کے ساتھ گانے کا بہت شوق ہوتا ہے اس لئے حفیظ نے اس نظم میں یہ خیال بھی رکھا ہے کہ نظم لڑکیاں گا سکیں ۔ یہ آواز میں لڑکیوں کا ایک ڈھولک گیت ہے۔ حفیظ کے سوا یہ خیال کسے سوجھ سکتا تھا۔

اسی طرح لڑکیوں کو گوٹے کی چنری پہننے کا بہت شوق ہوتا ہے پہلے پہل جب ماں بچی کو ایک رنگ دار خوب صورت چنری دیتی ہے تو وہ خوشی سے جیسے دیوانی ہو جاتی ہے ۔ بنّو نے آج صبح سویرے گوٹے والی چنری اوڑھی ہے ۔ بہت خوش ہے سب کو چنری دکھاتی اور گاتی پھر رہی ہے

دیکھ بوا میرے گوٹے کی چنری

آہا جی گلناری چنری	رنگ رنگیلی پیاری چنری

ململ کی اک تاری چنری	نازک نازک ساری چنری

دیکھ بوا میرے گوٹے کی چنری

امی کے کچھ جی میں آیا	گوٹے کا اک تھان منگایا

چنری پر سارا چپکایا	ہر کونے پر پھول بنایا

دیکھ بوا میرے گوٹے کی چنری

ساری نظم کو پڑھیئے تو آپ کی نظروں کے سامنے ایک ایسی لڑکی کی تصویر آجاتی ہے جو گوٹے کی گلناری چنری لے کر تتلی بنی ہوئی ہے

بچوں کی شاعری میں گیت کہانی کی بنیاد بھی حفیظ ہی نے رکھی ہے ۔ ایک تو بچوں کو یوں بھی کہانیاں سننے کا بہت شوق ہوتا ہے اور حفیظ جب ایک پرانی کہانی کو بچے کے لئے شعروں میں ڈھال دیتا ہے تو یہ سونے پر سہاگا ہو جاتا ہے ۔ چڑیا اور چڑے کی کہانی جو یوں شروع ہوتی ہے

سنیئے مجھ سے آپا جانی	میں کہتی ہوں ایک کہانی

اک تھی چڑیا اک تھا کوا	دونوں نے اس دن یہ سوچا

آؤ آج پکائیں کھچڑی

دونوں مل جل کھائیں کھچڑی

اسی روانی سے یہ کہانی آخر چلی جاتی ہے ۔ اسی طرح مرغی بلی اور کتے کوے کی کہانی اور ترم ترم ٹم ٹرم پھر کسی شہر میں ایک تھا بادشاہ ، کی کہانیاں بچوں کی دلچسپی کے وہ خزانے ہیں جو حفیظ ہی دے سکتا تھا۔ کہاں تک لکھا جائے آپ بچوں کے لئے حفیظ کی کتابیں آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں۔

اس جگہ میں آپ سے حفیظ کی ایک اور کتاب ، ہندوستان ہمارا " کا ذکر کرنا چاہتا ہوں ۔ اس کتاب میں حفیظ نے بچوں کے لئے اہم تاریخی واقعات کو بہت ہی سہانے انداز میں کہانیوں کی شکل میں نظم کیا ہے ۔ یہ شاہنامۂ اسلام کی تصنیف سے بھی بہت پہلے کی تصنیف ہے بلکہ بہت ممکن ہے کہ بچوں کے لئے ہی منظوم تاریخی کہانیاں لکھ کر حفیظ کو شاہنامۂ اسلام لکھنے کا خیال آیا ہو۔

بچوں کے لئے اگر حفیظ نے حمد لکھی ہے تو اس کا انداز بھی جداگانہ ہے ۔ بچوں کو یہ بتانا کہ خدا کیا ہے بہت مشکل ہے میں نے بچوں کے لئے کئی حمدیں پڑھی ہیں مگر حفیظ جس طرح بچے سے خدا کی ذات کا ذکر کرتا ہے وہ کوئی اور نہیں کر سکا ۔ اس کا انداز ہی اپنا ہے ۔ ہمارے ، یہ بہت بڑی کمی ہے کہ ہم بچوں کو وہ اہمیت نہیں دیتے جس کے وہ مستحق ہیں حالانکہ اہمیت بچے کے لئے اتنی ضروری خوراک ہے جتنی کوئی اور غذا ۔ حفیظ اپنی نظموں میں بچوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ اپنی جگہ بہت اہم ہیں چنانچہ بچوں کو بہت سی باتیں وہ بچوں ہی کی زبانی سناتا ہے ۔ سننے والا بچہ جب یہ دیکھتا ہے کہ یہ بات ۔ ۔نے والا بھی بچہ ہے تو اسے خود اپنے ہم عمر کا سا بننے کا شوق پیدا ہوتا ہے اور یہ خیال اسے بہت کچھ سیکھنے پر ابھارتا ہے ۔

فہمیدہ کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ خدا سب کچھ دیکھتا ہے۔ وہ بڑی بن کر اپنی بہن کو بتاتی ہے کہ خدا کیا ہے۔

بہن چاہے کتنا ہی چھپ چھپ کے بیٹھیں　　کسی بات کو چاہے دل میں چھپا لیں
مگر پھر بھی سب کچھ خدا دیکھتا ہے

کہیں ساتھ ابا کے جائیں سفر میں　　رہیں جا کے یا خالہ اماں کے گھر میں
مگر پھر بھی سب کچھ خدا دیکھتا ہے

اگر اوڑھ لیں کوئی موٹی سی چادر　　رہیں گر میں اپنی امی کی چھپ کر
مگر پھر بھی سب کچھ خدا دیکھتا ہے

اگر دل میں سوچیں نہ بولیں نہ چالیں　　کوئی بات منہ سے نہ چاہے نکالیں
مگر پھر بھی سب کچھ خدا دیکھتا ہے

کوئی وقت ہو شام ہو یا سویرا　　ہو دن کا اجالا کہ شب کا اندھیرا
مگر پھر بھی سب کچھ خدا دیکھتا ہے

جیسا کہ میں شاید پہلے بھی کہہ چکا ہوں حفیظ نے مختلف عمر کے بچوں کے لئے مختلف موضوعات چنے ہیں ادب کے موضوع سے لے کر حفیظ نے اس عمر کے بچوں تک کے لئے شاعری کی ہے۔ جب ہم انہیں کفائت شعاری، تن درستی اور علم کے فائدے بتا سکتے ہیں۔ ان سب نظموں میں حفیظ نے بچوں کے لئے تفریح کے ذریعے تعلیم کی اچھی سے اچھی راہیں اختیار کی ہیں۔ اردو ادب نے بڑے بڑے شاعر پیدا کئے ہیں مگر بچوں کے لئے صرف ایک ہی بڑا شاعر پیدا کیا ہے اور وہ ہے حفیظ۔

اس سلسلے میں ہمیں صرف اس اکیلے زندہ شاعر پر فخر ہے اردو ادب اسے جتنا بھی خراج تحسین ادا کرے کم ہے۔
اگر اس نے بھی بچوں کے لئے کچھ نہ کیا ہوتا تو اس دور میں اردو کی گود بچوں کی محبت سے خالی رہ جاتی۔

حفیظ اور عشق رسول (صفحہ ۵۲۸ سے آگے)

اگر یہ لوگ آج اسلام پر ایماں نہیں لاتے　　خدائے پاک کے دامان وحدت میں نہیں آتے
مگر نسلیں نہ ہوں ان کی اسے پہچان جائینگی　　در توحید پر اک روز آ کر سر جھکائیں گی
میں ان کے حق میں کیوں قہر الہی کی دعا مانگوں　　بشر ہیں بے خبر ہیں کیوں تباہی کی دعا مانگوں

عام طور پر عاشق بدنصیب ہوتے ہیں لیکن بحمد اللہ حفیظ کا عشق، عشق کامل ہے جس میں وہ ناکام نہیں۔ شاہنامۂ اسلام کے مصنف کو خوش خبری ملتی ہے کہ تمہارے سلام بارگاہ رسالت میں قبول ہوئے۔ سفر کا سامان کرو اور دربار نبوی کی زیارت کے لئے روانہ ہو۔ عاشق صادق اس حکم پر لبیک کہتا ہے اس موقع پر مدینہ کی راہ میں جن جذبات کا اظہار کیا ہے وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں ؎

راہ پر آ ہی گئی گردش ایام آخر　　ہو گیا روئے سفر سوئے مدینہ میرا
معجزہ جس نے نہ دیکھا ہو وہ مجھ کو دیکھے　　کس طرح ڈوب کے ابھرا ہے سفینہ میرا
اپنے در پر جو بلاتے ہیں تو اتنا بھی کریں
اب کہیں اور نہ مرنا ہو نہ جینا میرا

فضیل جعفری

نغمہ زار کی غزلیں

ایک ادبی محفل میں جب یہ شعر پڑھا گیا ؎

ناصح کو بلاؤ مرا ایمان سنبھالے
پھر دیکھ لیا اس نے شرارت کی نظر سے

تو پوری محفل صدائے تحسین سے گونج اٹھی لیکن جب شاعر کا نام حفیظ بتایا گیا تو حاضرین کے چہرے یوں سوالیہ نشان بن گئے جیسے انہیں یقین نہ آرہا ہو یا کم از کم انہیں حفیظ سے ایسے تغزل سے بھرپور شعر کی امید نہ رہی ہو۔ یہ واقعہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ نہیں۔ جب بھی کبھی تحریروں میں، تقریروں میں یا ادبی مباحثوں میں حفیظ کا ذکر چھڑا ہے تو بحیثیت ایک بلند پایہ و منفرد گیت نگار یا پھر بحیثیت صاحب شاہنامۂ اسلام کے لوگ باگ حفیظ کی غزلوں کو بالکل اسی انداز میں —— نظر انداز کرتے رہے ہیں جیسے جوش ملیح آبادی کی نثر کو۔ غور و تامل سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ حفیظ غزل کے صرف اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک منفرد طرز و اسلوب کے مالک بھی ہیں۔ حفیظ کے اولین مجموعۂ کلام "نغمہ زار" میں کم و بیش ساٹھ غزلیں اور کچھ متفرق اشعار ہیں۔ یہ تمام غزلیں اپنی صورت شکل، رنگ، روپ، چمک دمک اور سجاوٹ کے اعتبار سے بے حد خوب صورت اور جاندار ہیں۔ "نغمہ زار" کی غزلوں میں برقِ حسن کا مہکتا ہوا شعلہ، جیتی زندگی کی شادمانیاں، کنول جیسی خوب صورت نگاہوں کے افسانے، شعلۂ سحر کی تابندگی، شفق کی گلکاریاں۔ الفاظ کی لطیف جھنکاہٹیں۔ محبوب کی زلفِ خم بہ خم کی رعنائیاں۔ نرگسِ نیم باز کا خمار، حیات و کائنات کے رموز و اسرار سے واقفیت، وجدان و جمال کے سہارے آگے بڑھنے والے جذبات کے تیز دھارے۔ احساسات کی پاکیزگی اور بانکپن۔ جذبۂ عشق کی بےکلاہی دلوں کو چرا لینے والی ادائیں اور سرمستی۔ خود کو پا لینے کی اتھاہ لگن۔ آواز کی موسیقی سے پیدا ہونے والی تھرتھراہٹ۔ مدھ میں ڈوبی رسیلی تانوں کی گنگناہٹ اور اس طرح کے دوسرے اہم تر اور خالص شعری عناصر یوں رچ بس گئے ہیں کہ ٹھہر ٹھہر کر غور کرنے اور رک رک کر سوچنے والا ذہن حفیظ کی غزلوں کی انفرادیت اور اہمیت کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا اگرچہ حفیظ نے خیالات و جذبات کی ندرت اور اندازِ بیان کے تیکھے پن کے اعتبار سے اردو غزل میں کئی اہم اضافے کئے ہیں مگر انہوں نے روایتی تغزل کی نزاکتوں اور لطافتوں سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا ہے انہوں نے حسین روایتوں کو صرف اس لئے نہیں چھوڑ دیا کہ وہ قدیم ہیں بلکہ انہیں اپنے نئے مثال اور ان کے حقیقی حسن کو اپنے لئے نقطۂ آغاز تصور کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار قدیم و جدید طرزِ غزل گوئی کے قابلِ قدر امتزاج کی بہترین مثال ہیں۔

ہوں وادیٔ حیات میں اس طرح سست گام — جیسے ہو پا شکستہ کوئی خارزار میں
آرزوئے جلوہ ہائے حسنِ رنگا رنگ نے — باندھ رکھا ہے طلسمِ زندگی میرے لئے

کس قدر نا آشنا نکلے مآلِ عشق سے　　　کر گئے جو وضعِ رسمِ عاشقی میرے لئے
بدلی ہوئی نگاہ کو پہچانتا ہوں۔ میں　　　دینے لگے پھر آپ فریبِ نظر مجھے
پھر خاک اُڑاتے ہوئے پھرتے ہیں بگولے　　　پھر دشت میں مٹی ہوئی برباد کسی کی
پھر باب اثر کا کہیں رستہ نہیں ملتا　　　پھر بھٹکی ہوئی پھرتی ہے فریاد کسی کی
ناکامیاں پیامبرِ مرگ ہی نہ ہوں　　　کیوں اسے امیدِ زیست ترا کیا خیال ہے
نازک مزاج پھول کا منہ سرخ ہوگیا　　　چٹکی سی ایک لی تھی نسیمِ بہار نے
رفتہ رفتہ ہوتے جاتے ہیں ہم طرز آشنا　　　آشنا طرزِ سلوکِ آشنا کو دیکھ کر

اسی قبیل کے چند شعر اور سنیئے۔ آخری شعر میں چھپی ہوئی رجائیت خصوصی توجہ چاہتی ہے۔

اتنا تو کوئی حسن کی سرکار سے پوچھے　　　ہم بندۂ تسلیم و رضا ہیں کہ نہیں ہیں
وقتِ رخصت مری آنکھوں کی سفیدی پہ نہ جا　　　چہرۂ صبح کو دیکھ تو نہیں نورِ نظر بھی ہے
مبادا پھر اسیرِ دامِ عقل و ہوش ہو جاؤں　　　جنوں کا اس طرح اچھا نہیں حد سے گزر جانا
چاکِ دامانِ گل کا ہے گلہ کیا بلبل　　　کہ الجھتا ہے یہ خود بادِ سحر سے پہلے
ہاں اس لئے کہ خاک کا رتبہ بلند ہو　　　مٹ مٹ گئے دیئے نہ مگر آسمان سے

حفیظ کے ذہن و ادراک میں بلا درجہ پختگی اور لطافت ہے ان کے ذہن میں احساسات و تجربات کا ایک وسیع مینا بازار آباد ہے جو انہیں قدم بہ قدم اپنی تخالیق میں ابدیت کے عناصر سمونے اور آفاقی قدروں کو اجاگر کرنے میں مدد دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کا مطالعہ کرنے سے قاری کا ذہن نہ صرف متحرک اور سوچنے پر مائل ہوتا ہے بلکہ اس میں ایک طرح کی کشادگی اور توانائی کا بھی احساس جاگتا ہے۔ حفیظ کی وسیع النظری اور ذہنی بلندی نے ان کی غزلوں میں ایسے امکانات اور وسعتیں پیدا کردی ہیں جو خالص عشقیہ جذبات کا نتیجہ نہیں ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ پر بالکل درست ہے کہ عشق و محبت کے خمیر سے پیدا ہونے والی کیفیات تمام انسانی جذبات و احساسات میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں مگر نرم و ریشمی الفاظ کے لبادوں میں لپٹے ہوئے جذبوں کے بل بوتے پر ہی بڑی شاعری نہیں کی جاسکتی۔ غزل میں وسعت، عظمت، سنجیدگی، گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ رسمی رومانیت سے کنارہ کشی کی جائے۔ حفیظ نے شعوری یا غیر شعوری طور پر بہرحال اس بات کی کامیاب کوشش کی ہے چنانچہ ان کی غزلیں حیات و کائنات کے مخصوص ارتقائی عمل سے ہم آہنگ ہیں اور ان میں ایک خاص قسم کی تمکنت اور پھیلاؤ ملتا ہے مزید وضاحت کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

کتابِ دہر میں اک بابِ عبرت ہے مری ہستی　　　مجھے دیکھو کہ بیٹھا ہوں مجسم داستاں ہوکر
محوِ عبرت ہوں مآلِ نقشِ پا کو دیکھ کر　　　اپنا آئینہ ہوں تصویرِ فنا کو دیکھ کر
بود و نبود اس کے سوا اور کچھ نہیں　　　ہشیار ہو گئے کبھی بے ہوش ہو گئے
شوخیٔ باد ہوئی باعثِ تعمیرِ حباب　　　یعنی ہستی ہی میں رکھا تھا فنا ہو جانا
وہ قافلہ آرام طلب بھی ہو تو کیا ہو　　　آوازِ نفس ہی جسے آوازِ درا ہو
زباں کی دسترس پہنائے دامانِ بیاں تک ہے　　　یہ دل ہی جانتا ہے وسعتِ معنی کہاں تک ہے
غمِ منزل نشانِ نقشِ پائے رہرواں تک ہے　　　تلاشِ کارواں مشکل سراغِ کارواں تک ہے
زندگی کی منزلوں میں جس قدر آگے بڑھے　　　دل کشی کے ساتھ رستہ پُرخطر ہوتا گیا

اثر میں ہو گئے کیوں سات آسماں حائل　　　ابھی تو ہاتھ اٹھے بھی نہیں دعا کے لئے

یہ تمام اشعار تغزل سے تعلق رکھنے کے باوجود بڑی حد تک الگ تھلگ ہیں یہاں سوز ہجر، لذتِ وصل، شکوۂ محبوب، ذکرِ رقیب اور نالہ ہائے بے اثر جیسی غزل کی عام روائتی خصوصیتیں نظر نہیں آتیں بلکہ ان میں خیال کی بلندی، فکر کی ندرت اور اشیا کا حکیمانہ ادراک موجود ہے۔ ان کے موضوعات میں کائناتی وسعت اور ہمہ گیریت ہے جس کی بنا پر یہ اشعار ایک بلند مخصوص مقام رکھتے ہیں۔

ایک اور خصوصیت جو حفیظ کو دوسرے ہم عصر غزل گو شعرا میں ممتاز کرتی ہے وہ ان کی غزلوں میں ڈرامائی انداز بیان کا عنصر ہے۔ ان کا مکالماتی طرزِ تحریر اپنے اندر بالکل غالب کے خطوط کی سی چاشنی رکھتا ہے۔ وہی سلاستِ ادا، وہی طنز کی نرم رولہریں، وہی تیکھاپن، وہی شوخیٔ بیان، وہی اندازِ تخاطب۔ غرض ایسا لگتا ہے جیسے فی الحقیقت مخاطب سامنے موجود ہے۔ ان اشعار میں ڈرامائی عنصر کے ساتھ ساتھ مناسب منظر کشی بھی خاصے کی چیز ہے۔ یوں تو غزل کے اشعار میں فنِ مصوّری کے جس قدر اور جیسے اعلیٰ درجے کے نمونے ہمیں میر کے یہاں ملتے ہیں کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں لیکن فنِ مصوّری اور فنِ مکالمے کے امتزاج سے حفیظ نے بڑا اچھوتا اور موثر اسلوب بیان نکالا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

اچھا! جناب عشق ہیں؟ تشریف لائیے　　　خوب آئے آپ، آئیے حضرت، کہاں رہے

توبہ توبہ شیخ جی! توبہ کا پھر کس کو خیال؟　　　جب وہ خود کہہ دے کہ پی تھوڑی سی پی لی چاہئے

چھیڑو نہ میٹھی نیند سے اے منکر و نکیر　　　سونے دو کھائی میں تھکا ہارا ہوں راہ کا

جاؤ ہاں جاؤ، رقیبوں کی مرادیں بر لاؤ　　　رہنے دو، رہنے دو نا کام تمنا ہم کو

طرف داری نہ کر انصاف کر اے داورِ محشر　　　سزا دے ان بتوں کو ورنہ ہم فریاد کرتے ہیں

وہ آواز اذاں آئی، ہوا وقت نماز؟ اچھا　　　جناب شیخ چلئے سوئے مسجد میں وضو کرلوں

لے جاؤ ساتھ ہوش کو اے اہلِ ہوش جاؤ　　　جاؤ کہ تم نہیں ہو مرے اختیار میں

دیکھئے پہلے شعر سے آخری شعر تک بحور و اوزان کے سانچوں میں الفاظ ترشے ترشائے خوش نما نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ جس شعر میں جس قسم کا جذبہ پیش کیا گیا ہے اس کی مطابقت سے ایسے الفاظ و تراکیب اور اسلوب کا انتخاب کیا ہے کہ شعر سنتے یا پڑھتے ہی آنکھوں کے سامنے پوری تصویر اجاگر ہو جاتی ہے اس کے علاوہ جناب عشق حضرت شیخ، منکر نکیر، داورِ محشر اور اہلِ ہوش غرض کہ جس کو بھی مخاطب کیا ہے اس انداز میں کیا ہے کہ اس کا پورا کردار ابھر کر سامنے آجاتا ہے اور بڑی خوش اسلوبی سے شاعر کے خیالات کی حقیقی روح قاری تک منتقل ہو جاتی ہے۔

فراق صاحب کی غزل گوئی پر مضمون لکھتے ہوئے اردو کے ذہین نقاد پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے ایک جگہ بڑے پتے کی بات کہی ہے اور وہ یہ کہ تشبیہوں کے انتخاب سے شاعر کے ذہنی عمل کا پتہ چلتا ہے، یہ حقیقت ہے کہ ہر شاعر اپنی ذہنی تربیت اور اُپج کے اعتبار سے تشبیہوں کا انتخاب کرتا ہے۔ جو شاعر جتنا اچھا ہوگا اس کی تشبیہوں میں اتنی ہی زیادہ ندرت، وسعت اور خوب صورتی ملے گی۔ حفیظ نے ہمیشہ اور ہر جگہ عام اور مستعمل تشبیہات سے پہلو تہی کی ہے۔ انہوں نے اپنی افتادِ طبع کے مطابق نہ صرف نادر تشبیہیں منتخب کی ہیں بلکہ اختراع بھی کی ہیں اور اپنی اختراع اور ایجاد کردہ تشبیہوں کو اس بچے تلے انداز میں نظم کیا ہے کہ نئی اور انوکھی ہونے کے باوجود یہ تشبیہیں اکھڑی اکھڑی یا اجنبی نہیں لگتیں ورنہ ہی انہیں پڑھتے ہوئے ذہن میں کسی قسم کی کھٹک محسوس ہوتی ہے بر خلاف اس کے یہ تشبیہیں اذہان میں حیرت و سرخوشی کے ملے جلے تاثرات پیدا کرتی ہیں اور انہیں تازہ تر لطافتیں عطا کرتی ہیں۔۔

خورشید قیامت کی طرف دیکھ رہا ہوں　　　ملتی ہوئی صورت ہے مرے داغِ جگر سے

امیدیں آرزوئیں کھیلتی ہیں یوں مرے دل سے　　　پلٹ جاتی ہیں موجیں جس طرح ٹکرا کے ساحل سے

چلی ہے جان یادِ رفتگاں میں — مسافر ہے تلاشِ کارواں میں
کوئی پہلو نہیں ویران ہے میخانہ آج — گردشِ قسمت ہے گویا گردشِ پیمانہ آج
اٹھ اٹھ کے بیٹھ بیٹھ گئے پھر رواں رہے — ہم گرد کی طرح سے پسِ کارواں رہے
برنگِ شعلہ اڑا ہے مرے شباب کا رنگ — شراب تند ملی تھی مگر مزا نہ ملا
ہم بے بسی کے فیض سے دریائے شوق میں — تنکے کی طرح موج کے بل پر رواں رہے

حفیظ نے اردو کے دوسرے شعرا کی طرح عاشقانہ شاعری بھی کی ہے اور اس چمن میں بھی تخیل کے بیش بہا شگوفے کھلائے ہیں۔ عشقیہ غزلوں میں انہوں نے داخلیت اور خارجیت کا بڑا رچا ہوا امتزاج پیش کیا ہے۔ سوز و گداز سے بھرے ہوئے درد میں ڈوبے ہوئے اشعار بھی [illegible] ہیں۔ مگر یہ اشعار ایک خاص طرح کی نشاط آمیز رنگینی لئے ہوئے ہیں۔ شدید داخلی جذبات کو زبان و بیان کی نرمی اور لہجے کی شیرینی ایک معتدل ذہنی فضا سے ہم آہنگ کر لیتی ہے اسی طرح خارجی جذبات اور پر تصنع خیالات کو بھی انہوں نے اس فطری سادگی اور خوبی سے نظم کیا ہے کہ ان میں درد و سپردگی کی کیفیات پیدا ہو گئی ہے اور جن سے دوچار ہونے والا لازماً حفیظ کے بانکپن اور ان کی ہمہ گیری کا قائل ہوتا ہے۔ کبھی کبھی حفیظ کے یہاں سطحی جذبات بھی نظر آجاتے ہیں لیکن ترنم سلاست سرمستی اور حسنِ بیان ان کی سطح و صورت اس انداز میں نکھار دیتے ہیں کہ ان کی سطحیت دب جاتی ہے۔ ان کی عشقیہ غزلوں میں غمزدگی، اضمحلال، سوز، ہجر، آنسو ہیں، بے کسی، گریہ و زاری، نالہ و فریاد، گھٹی گھٹی سانسیں۔ موت کی خواہش، کوئے قاتل کے پھیرے، محبوب کے جھوٹے وعدوں کے تانے بانے، رقیب، ابتذال جیسی عام روایتی باتیں نہیں ملتیں۔ بلکہ ان میں ایک طرح کا وقار، شیرینی، شگفتگی، متانت، خود اعتمادی، رجائیت اور عالی ظرفی ملتی ہے یہ روتے بسورتے ہوئے اشعار نہیں بلکہ شکر لب اور شیریں ادا ہیں۔ یہ اشعار سبک رفتار چشموں کی طرح صاف اور شفاف اور نسیم کے سرد جھونکوں کی طرح دلوں کو بے خود کر دینے والے ہیں آپ بھی پڑھئے اور حظ اٹھائیے۔

دیکھا کئے ہماری طرف بزمِ غیر میں — تجدیدِ رسم و راہ نہ کی ہم بھی چپ رہے
آنکھوں میں دل ہے دل میں امیدِ وصال ہے — تم دیکھتے نہیں؟ مری صورت سوال ہے
رہبرِ راہِ محبت کس قدر ہشیار ہے — راہ کتراتا ہے شکلِ رہنما کو دیکھ کر
اتنا تو ہوا آہِ شبِ غم کے اثر سے — فطرت کا جگر پھوٹ بہا چشمِ سحر سے
بس کر اے بیخودیِ فرق ندامت بس کر — بھول جائے نہ غمِ دوش میں فردا ہم کو
وہ نگہ باندھ گئی دل میں طلسمِ امید — نظر آتی ہے تمنا ہی تمنا ہم کو
دل کو اب آنکھ کی منزل میں بٹھا رکھیں گے — عشق گزرے گا اسی راہ گزر سے پہلے
وہ اور ہمارے پاس خدا سازبات تھی — ہم مدتوں خدا کی قسم بدگماں رہے
برسوں فریبِ عشق دیا اک حسین کو — اور دل نے ہاں اسی دلِ ناکردہ کار نے
یہ بھی کمالِ عشق کی ہیں بے نیازیاں — جو تھا نیاز مند وہی بے نیاز ہے

ان اشعار کو شروع سے لے کر آخر تک پڑھ جائیے۔ کہیں بھی آپ کو "کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ" والی کیفیت نہیں ملے گی اور نہ ہی آپ کہیں "مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا" والی خارجیت سے دوچار ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حفیظ نے محض مشق اور فن کے بل بوتے پر شاعری کا جادو نہیں جگایا بلکہ حقیقی تجربات و احساسات کے معنی خیز پہلوؤں کو بڑے لطیف پیرایہ میں کاغذی پیرہن عطا کیا ہے۔ ان اشعار میں نہ تو میر اور فانی کی طرح شدید المیہ جذبہ ہے اور نہ سودا اور ناسخ کی طرح جوش و خروش اور تلاطم ہے بلکہ ان میں مصحفی کی غزلوں کی طرح داخلی اور خارجی جذبات کی ملی

جلی ہوئی ایسی رنگینی اور خوشبو ہے جس نے زبان اور لہجے کو ہموار بنا کر اشعار میں نکھار پیدا کر دیا ہے

فارسی شاعری کی طرح اردو شاعری کا بھی ایک بڑا حصہ خمریات پر مشتمل ہے اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر قلی قطب شاہ سے لے کر اب تک کوئی اچھا یا شاعر ایسا نہیں ہے جس نے خمریاتی شاعری نہ کی ہو۔ ریاض خیرآبادی اور کچھ دوسرے شعرائے تو باقاعدہ اسے ایک الگ صنفِ سخن کے طور پر برتا ہے۔ مے و مینا کا ذکر کرنے والے ان شعرا میں کچھ تو واقعی ایسے ہیں جو رند شاہد باز رہے ہیں اور کچھ لوگوں نے صرف تخیل کے کرتب دکھائے ہیں معلوم نہیں حفیظ صاحب کبھی اپنی زندگی میں اس دخترِ رز اور نگاہِ ساقی ہوش کے شکار ہوئے ہیں یا نہیں بہر حال ان کے یہاں اس تعلق سے اشعار ضرور مل جاتے ہیں۔ اور انہوں نے بھی شراب، ساقی، محتسب کے چوکھٹے میں شعر کی مورتیاں بٹھائی ہیں۔ جب ہم حفیظ کی خمریاتی شاعری کا دوسرے شعرا کی خمریاتی شاعری سے مقابلہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میدان میں بھی انہوں نے اپنی مخصوص اعتدال پسندی اور رکھ رکھاؤ سے کام لیا ہے نہ تو انہوں نے ساقی کی بے جا خوشامدیں کی ہیں اور نہ ہی کہیں شیخ و محتسب کو برا بھلا کہا ہے۔ ان کی خمریاتی شاعری میں کیف و سرور اور تخیل کی انبساط آمیز روش ملتی ہیں جو ذہن پر بڑا اچھا اثر مرتب کرتی ہیں۔

کچھ محتسب کا خوف ہے کچھ شیخ کا لحاظ	پیتا ہوں چھپ کے دامنِ ابرِ بہار میں
وہ سامنے دھری ہے صراحی بھری ہوئی	دونوں جہان ہیں آج مرے اختیار میں
بے موسمی کا شغل تھا اپنی نماز بھی	فصلِ بہار آگئی مے نوش ہو گئے
پی تو لیتا ہوں مگر پینے کی وہ باتیں گئیں	وہ جوانی، وہ سیہ مستی وہ برساتیں گئیں
دگرگوں ہے زمانہ مے کشوں کی خیر ہو یارب	ہوا خواہِ طریقِ محتسب پیرِ مغاں تک ہے
مجھے ہے گردشِ پیمانہ گویا گردشِ قسمت	کہ آیا محتسب بھی ساتھ جب جامِ شراب آیا
لحاظِ خاطرِ احباب دیرینہ ہے اے زاہد	چلوں کیا سوئے مسجد راہ میں میخانہ آتا ہے
نہیں نیت جنابِ شیخ میں کی حوضِ کوثر میں	وہ جلوہ دیکھتے ہیں دو جہاں کا ایک ساغر میں
محتسب کا ہائے پھر دستِ تعدی ہے دراز	ہائے پھر ٹوٹے پڑے ہیں ساغر و پیمانہ آج

دیکھئے پہلے شعر میں شاعر نے محتسب اور شیخ کو گالیاں دے کر کسی قسم کے احساسِ کمتری یا ذہنی اوچھے پن کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ان دونوں کے مرتبے کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے اپنی رندی کو برقرار رکھا ہے۔ اسی طرح دوسرا شعر بظاہر زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتا لیکن غور کرنے پر اس کے پس منظر میں چھپی ہوئی کُذ نفسیاتی نہیں ملتی ہیں۔ شراب پینے کے بعد انسانی ہوش و حواس جن غیر معمولی بلندیوں پر پرواز کرنے لگتے ہیں ان کی طرف بڑا لطیف اور بلیغ اشارہ کیا ہے۔ چوتھے شعر میں شراب کے تعلق سے عام شعرا کی طرح اس نظریہ کی طرفداری نہیں کی کہ:

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

بلکہ عمر و موسم کی مناسبت سے بڑی فطری بات کہی ہے اور اس طرح حفیظ نے غیر محسوس طریقے پر منفرد اندازِ بیان اختیار کیا ہے

نغمہ زار کی غزلوں میں کثرت سے ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں الفاظ کی ترتیب و نشست ایسی ہوتی ہے کہ اکثر و بیشتر ان کی نثر نہیں کی جاسکتی۔ بظاہر یہ چیز بہت زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتی بلکہ سطحی قاری تو اس خوبی کو محسوس بھی نہیں کر سکتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ شعر کے کسی مخصوص بحر اور وزن میں جہاں ایک رکن کی کمی زیادتی بھی بار نہیں پا سکتی، ایسے بچے تلے شعر کہنا معمولی آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے بڑی ریاضت جانفشانی، الفاظ کے انتخاب پر قدرت اور فنی باریک بینی درکار ہے۔ ان اشعار کا یہ بھی ایک کمال ہے کہ نثریت سے اس درجہ قریب ہونے کے باوجود ان میں شعریت کا رس، ترنم، نشتریت، نرمی، لچک اور تھرتھراہٹ

جیسی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ انہیں پڑھ کر حفیظ کا معترف سے سخت نقاد بھی ان کی فنی مشق و ریاضت زبان و بیان پر قدرت کا قائل ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر کچھ شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

اب میری جھولیوں پر کہہ دیتے ہیں وہ ہنس کر — سودائی ہے سودائی، دیوانہ ہے دیوانہ
بے ربطیٔ فسانہ کا اب تذکرہ ہی کب — خاموش ہم نے کر دیا خاموش ہو گئے
بڑی بات یہی تھی یہ کہ ہم نے دوست دشمن کو — نہ سمجھا، نہ سمجھا، نہ جانا تھا مگر جانا
بے تعلق زندگی اچھی نہیں — زندگی کیا موت بھی اچھی نہیں
یہ ہوا یہ ابر یہ سبزہ — حفیظ — آج پینے میں کمی اچھی نہیں۔
مسیحا کو نہ آنا تھا نہ آئے — قضا آئی قضا نے مار ڈالا
یہ سن کہیں عشق کو بندہ نہ کر دے — دنیا کی حقیقت سے خبردار نہ کر دے
اے حسرتِ ناکامی تیرا ہی بھروسا ہے — تو جانِ تمنا ہے، ایمانِ تمنا ہے
الفت ہوئی، ہوئی، وہ ہوا جو نصیب ہو — اچھا ہوا، برا ہوا، جو کچھ ہوا ہوا

نغمہ زار کی غزلوں کا ذکر ختم کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ حفیظ کے کچھ مقطع نقل کر دیے جائیں جو اپنے تاثر، تغزل اور رعنائی کے اعتبار سے بڑی اہم خصوصیتوں کے حامل ہیں۔ حفیظ کے مقطعے اپنی نوعیت اور مواد کے اعتبار سے دوسرے شعرا کے مقطعوں سے بالکل الگ ہیں۔ ان مقطعوں میں حفیظ نے اپنی شاعری، تفصیلات اور شخصیت کی طرف بڑے بلیغ اشارے کئے ہیں ؎

وہ عندلیب گلشنِ معنی ہوں میں حفیظ — سوزِ سخن سے آگ لگا دوں بہار میں
بنتے تھے حفیظ ایسے ہم جہاں گئے ان کو — یہ طرزِ غزل خوانی، یہ شیوۂ رندانہ
نسخۂ ہستی میں عبرت کے سوا کیا تھا حفیظ — سرخیاں کچھ مل گئیں اپنے فسانے کیلئے
حفیظ اس سلسلۂ نادیدہ میں حاصل یہ ہوگا — کہ حاصل کچھ نہ ہوگا شاعرِ رنگیں بیاں ہو کر
شاعری میں کفش بردارِ گرامی ہوں حفیظ — بے کمالی کے سوا کوئی نہیں دعویٰ مجھے

حفیظ اپنی بے کمالی کا دعویٰ لاکھ کریں لیکن سورج اپنی ہزار کوششوں کے باوجود بھی اپنی روشنی اور نور کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ افکار کا ہر زندار حفیظ نمبر ان کے باکمال ہونے اور ادبیات اردو میں ان کی شخصیت کی اہمیت اور قدر و قیمت متعین کرنے کا نہ صرف کھلا ہوا بلکہ زندہ و پائندہ ثبوت ہے۔

ادھر چند برسوں سے حفیظ نے غزلیں کہنی تقریباً بند کر دی ہیں ممکن ہے ان کی دیتا نغمہ زار کی آخری غزل کے یہ دو شعر ہوں ؎

اب شعر و شاعری کے زمانے کہاں رہے — وہ دن ہوئے کہ ہم جو رہے ہم زبان رہے
گزرے ہوئے شباب کے قصے نہ چھیڑیے — وہ ہم نہیں رہے نہ وہ اب تم کہاں رہے

سخنورانِ وطن سب ہیں آفتابِ کمال
تو کیوں کہوں کہ میں ذرہ ہوں آفتاب نہیں

(حفیظ)

مسعود قریشی

حفیظ کے گیت

میں بہت پریشان تھا۔ حفیظ جالندھری کا تعارف کرانے کا میں کیسے اہل ٹھہرا؟ صرف جالندھری ہونا تو اس کام کے لئے موزوں ہونے کا کوئی معیار نہیں! اور پھر حفیظ کا تعارف کیا معنی؟ حفیظ کو کون نہیں جانتا؟ اس مشک کی خوشبو تو نصف صدی مہک رہی ہے اور کشمیر میں تو عطار بھی نہیں صرف گاہک ہوں۔ اس مخمصے سے ہنڈی گلڈ کے کنوینر مجمل صاحب نے یہ کہہ کر نجات دلائی کہ میاں حفیظ نہیں، حفیظ کے گیتوں کا تعارف کرانا ہے

اردو ادب میں گیت کا ذکر آتے ہی حفیظ کا نام ذہن میں یوں ابھرتا ہے جیسے اردو میں گیت کو حفیظ نے کہتے ہوں۔ یہ طرز خاص ہے ایجاد میری۔ گیت گانے کی چیز ہے جیسے ڈرامہ کھیلنے کی۔ حفیظ نے گیت کو پڑھنے کی چیز بھی بنا دیا جیسے شکسپیر نے ڈرامے کو پڑھ کر لطف اندوز ہونے کی خاصیت بھی عطا کی۔ ہیئت میں اردو ادب کو حفیظ کی دین شاہنامۂ اسلام نہیں گیت ہیں۔ حفیظ نے شاہنامۂ اسلام کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ شاہنامہ اسلام لکھنے سے پہلے میں نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ مقصد صرف مشق تھا کہ شاہنامہ کے لئے طبع موزوں ہو۔ یہ دروغ تقدس آمیز ہے۔ اس لئے کہ اگر گیت اور دوسری اصنافِ سخن سے مقصد شاہنامہ کے لئے ایک موزوں پیرایۂ اظہار کی تلاش تھی تو پھر شاہنامہ کی بحر اور ہیئت کے بعد اس تلاش کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی لیکن حفیظ نے شاہنامہ سے پہلے شاہنامہ کے درمیان اور شاہنامہ کے بعد بھی گیت لکھے۔ گیت حفیظ کی طبیعت کا تقاضا ہیں۔ مشق کا بہانہ یا پیرایۂ اظہار کی تلاش نہیں۔ جیسے پھول مہکنے پر مجبور ہے ویسے ہی حفیظ گیت لکھنے پر۔

ہندوستان میں حفیظ سے پہلے گیت ہندی اور دوسری مقامی بولیوں اور زبانوں کا خاصہ سمجھے جاتے تھے۔ گیتوں کی اس سرزمین ہندوستان کی کوکھ سے پیدا ہونے اور اس کی گود میں پروان چڑھنے والی زبان اردو کا دامن اس ہندوستانی خصوصیت سے خالی تھا جب بھی کسی کو گیت لکھنا ہوتا وہ مقامی بولیوں یا ہندی کی طرف رجوع کرتا چاہے وہ ہندی اردو املا میں لکھی جائے لیکن ہوتی ہندی ہی تھی اردو نہیں اور لاشعوری طور پر خیالات، انداز روایات تشبیہیں اور اشارے، استعارے بھی ہندوانہ ہوتے۔ جیسے اردو میں گیت بننے کی لوچ ہی نہ ہو یا مسلمان رہ کر گیت لکھنا ناممکن ہو۔ حفیظ نے اس خفت کے احساس کو ختم اور کمی کو پورا کیا

تو ہے طالبِ نور مسافر

تیری منزل دور مسافر ---- تیری منزل دور

حفیظ کی طبیعت گیتوں کے لئے موزوں تھی۔ اس کے لئے لفظ صوت پہلے ہیں اور معنی بعد میں۔ پہلی گیت کی امتیازی خصوصیت ہے

صوتی ہم آہنگی اور گھلاوٹ حفیظ کی تمام شاعری کی جان ہے ۔ اس کے گیتوں میں یہ خصوصیت اپنے معراج پر ہے ۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اس گھلاوٹ اور ہم آہنگی کے لئے وہ شدھ ہو کر ہندی کی دریوزہ گری نہیں کرتا ۔ اردو زبان میں ہی گیت لکھتا ہے ۔ اس اردو میں جو برج بھاشا اور مقامی بولیوں کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی کے الفاظ کا بھی مجموعہ ہے ۔ حفیظ کو اس فارسی عربی والی اردو سے اپنے گیتوں کے لئے مترنم الفاظ چننے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی ۔ یہی اس کے گیتوں کی نمایاں خصوصیت ہے ۔ اسی خصوصیت نے گیت جیسی بظاہر کم تر صنفِ سخن کو اردو ادب کے مسند پر لا بٹھایا ۔ گیت کی اس مقبولیت اور اعزاز کو دیکھتے ہوئے دوسرے اردو شاعر بھی گیتوں کی طرف متوجہ ہوئے لیکن حفیظ کا یہ پیغام بھول گئے کہ اگر اردو گیت لکھنے ہیں تو اردو زبان میں ہی لکھو مگر اردو گیت پھر ہندی کی طرف مائل ہو گیا چنانچہ بہت جلد عامی لغات لوں کے ہاتھوں اردو گیتوں نے پھر اپنا ادبی اعزاز کھو دیا ۔ اور اب صرف حفیظ کے گیت ہی اردو ادب کا جزو ہیں ۔

ایک اور بات جو حفیظ کے گیتوں کو باقی تمام زبانوں کے گیتوں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان گیتوں میں فکر اور تخیل کا عنصر ہے ۔ گیت کو عموماً ہلکے پھلکے جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہی سمجھا گیا ۔ یہ پابندی شاید اس روایتی تصور نے عائد کی جو گہری سوچ یا سنجیدہ تخیل کو مترنم گاتے ناچتے لفظوں میں ڈھالنا دشوار ہی نہیں ناممکن سمجھتا ہے ۔ حفیظ کی جدت پسند طبیعت اس پابندی کو گوارا نہ کر سکی ۔ شاید حفیظ کی موزونیٔ طبع ہی ایسی ہے کہ فلسفہ و تاریخ اور جغرافیہ بھی اس کی زبان سے گیت بن کر ڈھلتے ہیں ۔ تیری منزل دور مسافر ۔ اور اب خوب ہنسے گا دیوانہ ۔ اس کی واضح مثالیں ہیں جہاں سانچہ اور لفظی تو گیت کی ہے لیکن تخیل نظم کا ۔

اب آگ بگولے ناچیں گے
سب لنگڑے لولے ناچیں گے
گردابِ بلا بن جائیں گے
روندی ہوئی مٹی کے ذرے　　طوفان بپا بن جائیں گے
صحرا دریا بن جائیں گے　　اب خوب ہنسے گا دیوانہ!

لیکن نہیں اگر میں مثالیں دینے لگا تو پھر حفیظ کے تمام گیت سنانے پڑیں گے اور اگر گیت سننے ہی ہیں تو کیوں نہ حفیظ سے سنے جائیں ۔ ایک نو مصنف نیکو کند بیاں اور پھر حفیظ کا انداز کس کو نصیب

اہلِ زباں تو ہیں بہت کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تری طرح حفیظ درد کے گیت گا سکے
(حفیظ)

پروفیسر صدیق کلیم

حفیظ جالندھری

اردو شاعری میں ایک نئی آواز

حفیظ کی ابتدائی شاعری کے متعلق ڈاکٹر تاثیر نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے "حفیظ کی شاعری امید افزا ابتدا سے نکل کر کمال تک پہنچ چکی ہے مگر میرے دل میں جو جگہ نغمہ زار کی نظموں نے کی لی ہے وہ کسی اور نظم کے لئے نہیں۔" میں یہاں نغمہ زار کے ساتھ سوز و ساز کو بھی شامل کر لیتا ہوں۔ اس ترمیم کے ساتھ مجھے ڈاکٹر تاثیر کی رائے سے مکمل اتفاق ہے۔ جب کہ پروفیسر پطرس بخاری، ڈاکٹر تاثیر اور پنڈت ہری چند اختر نے نغمہ زار اور سوز و ساز کی اشاعت کے وقت دیباچوں کی صورت میں حفیظ کی شاعری کے متعلق جو کچھ لکھا ہے مجھے اس سے کم و بیش اتفاق ہے۔ میں حفیظ کی ان نظموں کو گزشتہ پچیس برس سے سن رہا ہوں اور پڑھ رہا ہوں۔ ان سے میں آج بھی ایک گونہ لطف حاصل کرتا ہوں۔ اگرچہ اس عرصے میں اردو شاعری میں بھی کئی قسم کی تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مجھے مذکورہ بالا تینوں بزرگوں کی تنقید سے اتفاق ہے تو پھر میں یہ سطور کیوں لکھ رہا ہوں۔ اس کا جواز محض یہی ہے کہ میں آج کوئی پچیس برس کے بعد اپنی تنقیدی زبان میں اسی شاعری کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں چونکہ اس عرصے میں تنقیدی زبان بھی بدل چکی ہے۔

حفیظ کی یہ شاعری اس دور کی پیداوار ہے جسے آج ہم رومانوی دور کہتے ہیں جہاں اختر شیرانی، ساغر نظامی اور جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری کے ان معنوں میں ہم عصر ہیں۔ مجھے اس وقت ان شعرا کے تقابل سے غرض نہیں۔ ان میں جو بات مشترک ہے وہ رومانوی دنیائے شعر ہے۔ اس دور میں ہندوستان کی علمی و ادبی فضا میں انگریزی رومانوی شاعری کا چرچا تھا۔ انگریزی ادبیات کے انگریز استادوں کا اپنا ذوق رومانوی تھا اور وہ غلط یا صحیح طور پر ہندوستانی مزاج کو بھی رومانوی ہی سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ اس شاعری کا بڑی محبت سے چرچا کرتے تھے۔ ہندوستانی ادیبوں کو بھی اس قسم کا ادب مرغوب تھا اور دوسری صنفِ ادب پر بھی رومانیت ہی غالب تھی۔ حفیظ نے یہ اثرات کس طرح قبول کئے، یہ سوال میں کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھتا ہوں یا خود بھی حفیظ صاحب سے پوچھنے کی کوشش کروں گا۔ اردو ادب میں تو یہ ڈانڈے غزل سے ملتے ہیں۔ بالخصوص حسرت موہانی کی غزل سے جو اس وقت مقبول تھی اور جس کے حسیاتی رنگ نے نئے لکھنے والوں کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ بات داغ کی رندی اور سرمستی تک بھی جا پہنچتی ہے اور ان کے لونڈوں کی نشاط پروری کا ذکر بھی بے جا معلوم نہیں ہوتا۔ اردو اور فارسی خمریات کا ماحول اور قصائد کی تشبیب اور بہاریہ تو بین اثرات میں جو ہماری فضا میں رچے بسے ہوئے تھے۔ ہمارے رومانوی شعرا کی شاعری مقامی رنگ سے اپنے آپ کو سنوارتی اور ان مختلف اثرات کو خوش اسلوبی کے ساتھ سمو لیتی ہے۔ یہ شاعری غمِ زندگی اور مسائلِ زندگی سے یکسر کنارہ کشی اختیار کر لیتی ہے اس لئے میرے نزدیک اسے شبابیات کی شاعری کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

حفیظ کی یہ شاعری دراصل گیتوں کی شاعری ہے۔ یہ شاعری خود اپنی اک دنیا تعمیر کرتی ہے، کیف و سرود، نغمہ و آہنگ جہاں غم و اندوہ، یاس و حرمان کا گزر تک نہیں ہوتا۔ یہ دنیا بہت حد تک تخیل کی دنیا ہے۔ یہ شاعری فرار اور گریز کی شاعری بھی قرار دی جا سکتی ہے۔ اس شاعری میں اردو اور فارسی شاعری کی روایات

پوری طرح منعکس ہوتی ہیں۔ عشق اور حسن سے خطاب۔ محبوبہ اور عاشق کی جگہ بھی عشق اور حسن کی اصطلاحات کا استعمال۔ محبوبہ کا دنیائے شعر سے خارج ہونا ساقی سے خطاب۔ یہ سب باتیں اردو شاعری کی روایات ہی کا تسلسل ہیں مگر ان روایتی عناصر میں شبابیات کے بھرپور اظہار اور مقامی رنگ اور رسوم کے امتزاج سے ایک نئی دنیا وجود میں آتی ہے۔ ایک نیا تجربہ تخلیق ہوتا ہے جس کی بنا پر ڈاکٹر تاثیر نے اسے بجا طور پر انقلابی شاعری کا درجہ دیا ہے۔ اس شاعری کا انقلابی کردار ہی کی تکنیک پر مشتمل ہے۔ یہ تجربہ شعر غنائیہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ بحریں موسیقیت کا روپ دھار لیتی ہیں۔ بحور کے تجربات اور ردیف و قوافی کے آزادانہ استعمال سے ان نظموں کو نہ صرف ترنم و نغمگی ملتی ہے بلکہ تازگی اور دلکشی بھی۔ ان کی تخلیقی زندگی کا راز ان کی تکنیک میں مضمر ہے گو ان نظموں کی تکنیک عضوی وحدت سے محروم ہے۔ نظم کے مختلف حصوں میں مختلف مناظر آنکھوں کے سامنے سے گزرتے ہیں یہ تصاویر دلکش و دلفریب، رنگین و کیف پرور ہیں کہ ان مصرعوں کی غنائیت ہماری سوچ اور فکر کو کچھ عرصے کے لئے سلا دیتی ہے۔ ان نظموں کا ذریعہ اظہار تو الفاظ ہی ہیں مگر یہ وہ الفاظ ہیں جو نغماتی تانوں کی سی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور تصاویر نغمے کی رواں دواں لہروں میں رقص کرتی، آنکھوں کو لبھاتی، تخیل کی دنیا میں بس جاتی ہیں۔ ان گیتوں کی زبان بہرحال اس وقت کی اردو شاعری کی زبان ہے جو اقبال کی شاعری سے لی گئی ہے۔ حفیظ اس اکتساب فیض کے ساتھ اپنا ایک اسلوب تخلیق کرتا ہے۔ یہ خیال کہ حفیظ سادہ زبان اختیار کرتا ہے ان نقیدی آراء میں سے ہے جو غلط ہوتے ہوئے بھی قبول عام کی سند حاصل کر لیتی ہیں حفیظ کی ان نظموں میں دو طرح کی زبان ملتی ہے ایک تو اس عہد کی وہ اردو جو سادہ ہونے کے باوجود فارسی اسلوب کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہے اور دوسری واقعی سادہ اردو جو نظیر اکبرآبادی کے ہاں بہت پہلے سے اثر کا پتہ دیتی ہے۔ حفیظ کا اسلوب ان دونوں پیکرہائے زبان کے امتزاج سے ہوتا ہے۔ وہ دراصل ان اسالیب کے بارے میں کسی علمی نقطہ نظر سے غور نہیں کرتا اسے الفاظ سے سوتی تاثرات اخذ کرنا ہیں اور جو الفاظ اسے یہ خدمت سرانجام دیتے ہوئے معلوم ہوں وہ انہیں بے تکلف استعمال کرتا ہے اس سے اردوئے معلی سے لے کر ہندوستانی اور ہندی سب زبانوں کے پیکر باہم دگر مل کر حفیظ کا اسلوب بن جاتے ہیں مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار دیکھئے ان میں آپ کو یہ سب عناصر ملیں گے مگر ان پر حفیظ کی چھاپ ہے۔ یہ بھانت بھانت کی بولی نہیں معلوم ہوتی یہ بولی محض حفیظ کی ہے ؎

طرب کے سیل نور سے　　جہاں کی نیند دھل گئی
حیات کے وفور سے　　خوشی کی آنکھ کھل گئی

یا

ہوا بھی خوش گوار ہے　　گلوں پہ بھی نکھار ہے
ترنم ہزار ہے　　بہار پر بہار ہے

حفیظ کی اس دنیائے شعر میں زندگی سے بے تعلق ہو جانے کے سبب ایک طرح کی سادگی اور معصومیت بھی در آئی ہے۔ یہ دراصل "پیگن" (pagan) قسم کی ساخت ہے جہاں عشق و ہوس اور لطف و لذت میں تمیز مشکل ہو جاتی ہے

اس دنیا میں گناہ کا تصور بھی موجود نہیں ہے۔ اگر مثال دینا لازمی ہو تو "ابھی تو میں جوان ہوں" اور "برسات" اس بات کی دلالت کرتی ہیں ؎

حسین جلوہ ریز ہوں　　ادائیں فتنہ خیز ہوں
ہوائیں عطر بیز ہوں　　تو شوق کیوں نہ تیز ہو
نگار ہائے فتنہ گر　　کوئی ادھر کوئی ادھر
ابھارتے ہوں عیش پر
تو کیا کرے کوئی بشر

یا ـــــــــــ یہ بھی رہا خوب　　واللہ کیا خوب!

رند اور مست جا میں   ہم اور پلٹ جائیں!
مے خانہ چھوڑیں   شیشوں کو توڑیں
دل پر کریں جبر!   عشاق اور صبر!
یہ رت ہو یہ ابر
یہ دن یہ راتیں
زاہد کی گھاتیں   بے کار باتیں

اس دنیائے حسن کی تعمیر کے لئے حفیظ کے ہاں مذہب کی کوئی تمیز نہیں رہتی۔ وہ کہیں اسلام کو بہترین نظام سمجھتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور کہیں قدیم ہندو تہذیب کو۔ "میرا سلام لے جا"، "شاہسوار کربلا" "کرشن کنہیا" اور "کرشن بنسری" اس بات کی گواہی دیتی ہیں۔ یہ عناصر جن کا میں اس وقت ذکر کر چکا ہوں "بسنتی ترانہ" میں تخلیقی طور پر مجتمع ہو جاتے ہیں۔

لو پھر بسنت آئی   پھولوں پہ رنگ لائی
چلو بے درنگ   لب آب گنگ
بجے جل ترنگ
من پر امنگ چھائی   پھولوں پہ رنگ لائی
لو پھر بسنت آئی

اسی طرح سوز و ساز کی نظمیں "جاگ سوز عشق جاگ"، "اندھی جوانی"، "دل ہے پرائے بس میں"، "پرانی بسنت" اور "پریت کا گیت" اعلیٰ پائے کی تخلیقات ہیں۔

جاگ سوز عشق جاگ   جاگ سوز عشق جاگ
جاگ کام دیوتا   فتنہ ہائے نو جگا
بجھ گیا ہے دل مرا   پھر کوئی لگن لگا
سرد ہو گئی ہے آگ
جاگ سوز عشق جاگ

انداز کی والہانہ پن، سرمستی، وجد و جوش کا ایک اور نمونہ بھی ملاحظہ ہو۔

رنگ دے، رنگ دے، قدیم رنگ
صلح ہو کہ جنگ ہو   ساتھ میں ترنگ ہو
خون ہو کہ رنگ ہو   وہ نئے ڈھنگ سے
آ رنگ دے، رنگ دے، قدیم رنگ

یہ دراصل ایک پیگن دنیا ہے جو محض اس سمت سے دیکھی ہی آئی ہے کہ اس کا شاعر ابھی انکار و مسائل سے بہرہ آشنا نہیں ہوا۔ وہ ابھی وسیع مشاہدے کی مدد سے ہی اپنی نظموں کا کینوس تیار کرتا ہے۔ شاید کوئی مقصود حفیظ کے نغمہ زار اور سوز و ساز کی ان لفظی اور نغماتی تصویروں کے رنگوں، مرکبات یا تشکیل بھی دے۔ بہرحال حفیظ اردو شاعری میں ان کی بدولت زندہ رہے گا۔

منظر ایوبی

عشقیہ حقیقت نگاری

(کلامِ حفیظ کا ایک خاص موضوع)

تقریباً ہر دور اور ہر زمانے میں "حسن و عشق" اردو شاعری کا بنیادی موضوع رہا ہے۔ آج بھی جب کہ اردو شاعری کئی منزلوں سے گزر چکی ہے، حسن و عشق اور ان کے متعلقات کی ترجمانی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آج حسن و عشق کا تصور بڑی حد تک بدل چکا ہے۔ آج حسن و عشق اور ان سے پیدا ہونے والے جذبات و احساسات، تجربات و مشاہدات کی تصویریں اس صورت سے پیش نہیں کی جاتیں جس طرح گزشتہ تقریباً چار سو (۴۰۰) سال تک پیش ہوتی رہیں۔ حسن و عشق کا وہ روایتی تصور اور فرسودہ رجحان مدت دراز تک اردو شاعروں کے دل و دماغ پر چھایا رہا اور ایک طویل عرصہ تک وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ تعمیر کرتے رہے۔ صدیوں اردو شعراء اپنے فن کی محدود دنیا میں اس طرح کھوئے رہے کہ انہیں خارجی زندگی کے لامحدود انکشافات و ایجادات کا علم تک نہ ہو سکا۔ اس کا تصور بھی نہ تھا۔ ان ادوار کے سیاسی و سماجی حالات ہی ایسے تھے جو ادیبوں اور شاعروں کو اپنے خارجی حالات و واقعات سے بے نیاز رکھتے تھے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اردو شاعری کے آغاز سے سنہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی تک برصغیر ہند و پاک کا سیاسی و سماجی نظام تقریباً یکساں اصولوں کا پابند رہا اور اس مدت میں کوئی اتنی اہم اور واضح تبدیلی رونما نہیں ہوئی جو اردو شاعری کے روایتی عشقیہ تصورات اور مروجہ رجحانات پر اثر انداز ہوتی۔

سنہ ۱۸۵۷ء کا سال اردو ادب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اب تک اردو شاعروں کے اہم موضوعات "حسن و عشق"، "مذہب"، اور "مدح و ذم اور ہجو" اور منظر نگاری تھے۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد جب برصغیر ہند و پاک کی سیاسی و سماجی تاریخ کا نیا باب شروع ہوا تو اردو شاعری کی بساط ہی پلٹ گئی۔ سرسید، حالیؔ اور شبلیؔ کی اصلاحی تحریک سے ادب و شاعری میں مقصدیت، افادیت اور حقیقت در آئی۔ حسن و عشق کا تصور بھی بدلا۔ شاعر کی خیالی محبوبہ اور اس کی رسمی باتوں میں فرق آ گیا۔ شاعر اپنی ذات کے علاوہ دوسروں میں بھی دلچسپی لینے لگا۔ اب اسے خارجی مناظر اور قدرتی مظاہر بھی متاثر کرنے لگے۔ غرض شاعری سے جھوٹی محبت رسمی عقیدت اور خیالی عشق خارج ہونے لگا اب اردو شعراء زندگی کی الجھنوں اور کائنات کے مشاہدوں کی اہمیت سمجھنے لگے۔ یہاں سے عشقیہ حقیقت نگاری کا آغاز ہوتا ہے اور بیسویں صدی میں عشقیہ حقیقت نگاری ایک خاص موضوع کی حیثیت سے داخل ہوتی ہے اس کے اسباب پر غور کرنے اور کلامِ حفیظ کی اس خصوصیت کو سمجھنے کے لئے بیسویں صدی کے مختصر سیاسی و سماجی حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

بیسویں صدی ایشیائی قوموں کے لئے نیا جذبہ، نیا جوش و خروش نئی امنگ اور ایک نیا پیغام لے کر آئی ہے۔ یہ دور ایشیا کی بیداری کا دور ہے شہنشاہیت اور استبداد کے خاتمے اور جمہوریت کے آغاز کا عہد ہے۔ سرمایہ داری کے خاتمے اور نئے معاشی نظام کے استحکام کا زمانہ ہے۔ ترکی کا انقلاب، ایران کا قومی فروغ، چین کی بغاوت اور جاپان کے مقابلے میں روس کی شکست، اس دور کی وہ چند نعمتیں اور لعنتیں ہیں جنہوں نے ساری دنیا کو تقریباً یکساں طور پر متاثر کیا۔ یہ انقلابات اور بیداری محض سیاسی یا معاشی نہیں، ذہنی بھی ہے۔ بیسویں صدی میں تعلیم عام ہوتی ہے۔ خواندہ لوگوں کی تعداد میں

اضافہ ہوتا ہے۔ اخباروں اور رسالوں کی اشاعت بڑھتی ہے۔ قدیم علوم و فنون جو کسی حد تک اپنی افادیت سے محروم ہو چکے تھے، محدود ہو کر رہ جاتے ہیں اور نئے علوم و فنون انسان کو ایک نیا ذہن اور نیا شعور عطا کرتے ہیں۔ یہ نیا دور جو سائنس، عقلیت اور شعور کا دور ہے۔

اردو شاعری میں جو مقصدیت، افادیت، واقفیت اور حقیقت داخل ہوئی وہ کچھ تو سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے زندگی کے گوناگوں پیچیدہ مسائل کا نتیجہ تھی اور زیادہ تر بیسویں صدی کے ان مذکورہ سیاسی، معاشی، اقتصادی اور سماجی محرکات کا جنہوں نے اردو شاعروں کو اس طرف مائل کیا کہ وہ زندگی، سماج اور شاعری کے باہمی رشتے کو پہلے سے زیادہ مستحکم کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسن و عشق اور محبت کا روایتی تصور ادب سے بڑی تیزی سے خارج ہونے لگا۔ ایک طرف اقبال، عظمت اللہ، شبلی، سلیم، چکبست، سرور، نظم طباطبائی، شوق قدوائی، عزیز لکھنوی، ثاقب اور شاد نے قومیت، وطنیت اور حریت کو اپنے کلام کا موضوع بنایا تو دوسری طرف جوش، حسرت اور دوسرے شاعروں نے عشقیہ حقیقت نگاری کو فروغ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب لوگ زبان کے چٹخاروں، ہجر و وصال کی گوناگوں کیفیتوں، سب و عارض اور قد و گیسو کی شگفتگی سے لطف اندوز ہونے کے بجائے زندگی کے تلخ حقائق اور زیست کی صحیح اقدار کی ترجمانی پسند کرنے لگے۔

حفیظ بھی اسی دور کی پیداوار ہیں۔ انہوں نے جب شاعری شروع کی تو فضائے ادب، قومیت، وطنیت اور حریت کے نعروں سے گونج رہی تھی اس کے باوجود اردو شاعروں کا ایک خاص طبقہ شاعری کو صرف قلبی واردات اور داخلی کیفیات کی ترجمانی کا ایک ذریعہ سمجھتا تھا۔ حسن و عشق اور ان سے پیدا ہونے والے مختلف جذبات و احساسات، واردات و حادثات کا بیان اب بھی اردو شاعری میں ہو رہا تھا مگر اب اس موضوع کے بیان میں بڑی واضح تبدیلی ہو چکی تھی۔ یہ تبدیلی رومان پسندوں کے ہاتھوں ہوئی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جہاں قومیت، وطنیت اور حریت کے متعلق بہت سے موضوعات اردو شاعری میں داخل ہو رہے تھے وہاں زندگی کی حقیقتوں سے کم و بیش بے نیاز رومان پسندوں کا ایک ایسا گروہ بھی ابھر رہا تھا جس نے اردو شاعری میں نہ صرف نئے موضوعات کا اضافہ کیا بلکہ ہیئت، اسلوب اور انداز بیان میں بھی نئے نئے تجربے کئے۔ رومانوی رجحان کے علمبرداروں میں اختر شیرانی، جوش، احسان دانش، ساغر، روش اور راشد بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ حفیظ بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یوں تو مومن کے بعد حسرت کا کلام بھی عشقیہ حقیقت نگاری کا بہترین نمونہ ہے مگر حسن و عشق اور ان کے متعلقات کو جتنی مستعدی، شعوری اور مجنونانہ طور پر رومان پسندوں نے اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے ان سے پیشتر کسی شاعر کے ہاں نظر نہیں آتا۔ دوسرے تلاش حسن اور نیا عالم پانے کی آرزو کے لئے انقلاب اور سماج، اخلاق اور معاشرے کو تبدیل کرنے کا نعرہ اس سے پہلے کبھی اردو شاعری میں نہیں ملتا۔

حفیظ نے زندگی کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔ ان کا کلام مختلف موضوعات پر مشتمل ہے۔ دوسرے رومان پسندوں کی طرح انہوں نے بھی گیت، غزلیں اور نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے ان گیتوں، غزلوں اور نظموں کا خاص موضوع عشقیہ حقیقت نگاری ہے جس کی بہترین مثالیں ان کی وہ نظمیں ہیں جو انہوں نے سنہ ۱۹۴۷ء کی آزادی سے پہلے لکھیں۔

حفیظ کے یہاں عورت کا تصور اتنا ارفع نہیں۔ اختر اور دوسرے رومان پسندوں کی طرح حفیظ کی محبوبہ بھی گوشت پوست کی ایک لڑکی ہے جو مختلف عنوانات کے تحت ان کے کلام کا موضوع بنی ہے۔ کہیں وہ رقاصہ ہے اور کہیں حسینہ ہے۔ حفیظ ذاتی محبوب سے کہتی آپس میں ... اور نا ... ہیں یا نہیں؟ حفیظ کی محبوبہ جب سر پر تاج زریں پہنتی ہے تو زندگی کے سیاہ خانے روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ میخانے میں غم روزگار بھلانے کے لئے نہیں جاتے بلکہ ان کی زندگی جو سرتاپا میخانے کی سرمستی اور نشہ کی کیفیتوں سے سرشار ہے انہیں پیمانہ اٹھانے پر مجبور کر دیتی ہے اور وہ عمر ہونے کے باوجود خود کو "ابھی تو میں جوان ہوں" کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ جب سوز عشق جگاتے ہیں تو ان تعی سرد آہوں میں حرارت پیدا ہو جاتی اور خوابیدہ کائنات کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ مترنم اور چھوٹی چھوٹی بحروں میں ان کی نظمیں جوان لڑکوں اور حسین اراد ... سے جڑتے ہوئے رسیلے گیت اور ان کی سادہ غزلوں میں ہجر و وصال کے شوخ رنگوں میں نئی بوئی عشقیہ تصویریں ہیں عشقیہ حقیقت نگاری کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

دوسرے رومان پسندوں کی طرح حفیظ نے بھی پہلی مرتبہ رومان اور انقلاب میں ایک رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے یہ دوسری بات ہے

(باقی صفحہ ۵۶۷ پر)

نصیر احمد زار

حفیظ کی غزل

غزل مشرقی شاعری کی وہ خصوصی صنف ہے جس کا جواب مغربی شاعری کی کسی صنف میں بھی نہیں ملتا۔ اس کا باعث اور غالباً واحد باعث یہ ہے کہ مشرق میں تہذیب و تمدن کی ترقی یافتگی نے معاشرتی حالات کو اس قدر پیچ در پیچ بنا دیا تھا کہ ان حالات کا اظہار کھلے لفظوں میں سیاسی اعتبار سے خالی از خطرہ نہ تھا چنانچہ مشرقی شاعر جو طبعاً زیادہ حساس اور سرد ممالک کے شعرا کے مقابلے میں زیادہ جذباتی تھا اپنے خیالات کے اظہار کے لئے رمز و ایما کا یہ نادر اسلوب ایجاد کرنے پر مجبور ہو گیا۔ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ضرورت اس اسلوب کی کار و بار عشق میں پیش آنی لازمی تھی کیونکہ یہ جذبہ اول تو دوسرے جذبات سے شدید تر ہوتا ہے اور پھر مشرق میں محبت کو کبھی بزرگوں کی تائید حاصل نہیں رہی لیکن فارسی اور اردو کے تمام عظیم شعرا کے کلام کا اگر بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے جذبات بالعموم ذاتی سے بڑھ کر معاشرتی اور آفاقی ہیں اور غزلیات کے دواوین شعرا کے انفرادی عشق و محبت کے بجائے ان کے پورے ماحول کے بارے میں نہایت مستند تاریخی و تنقیدی دستاویزات ہیں چنانچہ گزشتہ برس پروفیسر نذر منور نے اپنے ایک مضمون میں خواجہ حافظ شیرازی کی رندی و سرمستی کی تہ میں جن تاریخی حقائق کی نشان دہی کی ہے وہ اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ یہ بظاہر پریشان خیالی کا مجموعہ جسے غزل کہتے ہیں ایک نہایت ہی مربوط رمزیہ دستاویز ہوتی ہے جس سے آئندہ کا مورخ اس وقت کے معاشرے کی بہت ہی صحیح اور دیانت داری سے پیش کی ہوئی تصویر دیکھ سکتا ہے

اردو شاعری میں غزل کی روایت فارسی سے آئی اور اس رمزیہ کے بہت سے اشارات اسی وجہ سے فارسی ہی سے ماخوذ ہیں لیکن ایک بڑی مدت تک ان اشارات کا استعمال محض تقلیدی رہا ہے اور اس میں تخلیقی شان الا ماشاء اللہ بہت کم پیدا ہو پائی ہے۔ یہ قصور اشارات کا نہیں ہے جیسا کہ بعض نقادوں کا خیال ہے بلکہ خود شعرا کے تجربے کی محدودیت کا ہے کہ وہ ان اشارات کو اپنے لئے نہیں برت سکے بلکہ لفظاً و معنیً دونوں ہی مستعار استعمال کرتے رہے ہیں۔ اردو شعرا کی طویل فہرست میں میر اور غالب کے سے کتنے نام ملتے ہیں؟ اور ایسے ناموں کی اس خوف ناک قلت کا باعث کیا ہے ان سوالوں کا جواب بہت آسان ہے۔ اردو کے شاعر کی زندگی مثبت عملی زندگی نہیں تھی بلکہ زندگی سے کنارہ کشی کا مشغلہ شاعری قرار پایا تھا۔ ایسے حالات میں وہ ذاتی تجربات جو عملی تخلیق کو زندہ رکھتے ہیں ناپید تھے لہٰذا اردو شاعری محض فارسی شاعری کی کبھی نظر فریب اور کبھی بھونڈی نقالی بن کر رہ گئی تھی۔ اس حقیقت کا احساس سب سے پہلے حالی کو ہوا اور اس عظیم المرتبت شخصیت نے اردو شاعری کے اس غیر فطری طرز عمل پر صرف کڑی نکتہ چینی ہی نہیں کی بلکہ شاعری کو اپنے تجربات کی آمیزش سے جیتی جاگتی سانس لیتی ہوئی شاعری بنا کر بھی پیش کیا۔ حالی کی آواز نے دو مختلف قسم کے لوگوں میں مختلف قسم کا ردعمل پیدا کیا تہذیبی انحطاط کے نمائندوں نے صرف اس کا منہ چڑا دیا اور کروٹ بدل کر پھر سو گئے اور اپنی خواب آلود شاعری پر کاربند رہے لیکن جن میں زندگی کا احساس و شعور موجود تھا انہوں نے اس کی اہمیت کو سمجھا اور اپنی روش بدلنے کا تہیہ کر لیا۔ یہ دوسرا گروہ جس نے اپنی روش بدل کر زندگی کا ہمسفر بن کر راستہ

اختیار کیا اسی گروہ میں حفیظ بھی ہمیں بہت پیش پیش نظر آتے ہیں اور یہ اسی نقطہ نظر سے ہے کہ راقم الحروف نے حفیظ کی غزل کا مطالعہ کیا ہے

حفیظ کی غزل ہیئت کے اعتبار سے قطعی روایتی غزل ہے۔ ہیئت کا انقلاب اقبال کے لئے مقسوم ہو چکا تھا لیکن اس روایتی سانچے میں خیال و احساس کی ندرت نے حفیظ کی غزل کو روایتی غزل سے بالکل الگ کر دیا ہے چنانچہ یہ بات ناقدین کو نغمہ زار (حفیظ کا پہلا مجموعہ کلام) چھپتے ہوئے ہی معلوم ہونے لگی تھی۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں اور بہت صحیح لکھتے ہیں کہ "یہ 'انانیت' نظم سے گذر کر غزل میں بھی نظر آتی ہے اور حفیظ میں Local Colour اس قدر نمایاں ہے کہ جہاں کہیں ردیف میں "میں" یا "مجھے" ہوتی ہے غزل کی سطح بہت بلند ہو جاتی ہے۔

لے جاؤ ساتھ ہوش کو اے اہل ہوش جاؤ
ہے خوب اپنی بے خبری کی خبر مجھے۔
قائم کیا ہے میں نے عدم کے وجود کو
دنیا سمجھ رہی ہے، فنا ہو گیا ہوں میں ——— وغیرہ۔

حفیظ کی غزل میں یہی شعور ذات اسے موت کے مقابلے میں زندگی اور خواب کے مقابلے میں بیداری کا ساتھ دینے پر مجبور کرتا ہے اور جو شخص زندہ و بیدار ہو وہ زندگی کے رنگا رنگ ماحول سے آنکھیں ہرگز بند نہیں کر سکتا چنانچہ حفیظ کی غزل میں انفرادی احساس کی بجائے اجتماعی احساس و رکے جذبات کی حیثیت سے نمایاں ہے اور اس احساس سے پیدا شدہ عزم ہر موڑ سے جھانکتا دکھائی دیتا ہے

زنداں کی دیواریں ہیں مانع آزادی
ہاں اے سر شوریدہ! ہاں ہمت مردانہ

یہی احساس کبھی کبھی تنقیدی رنگ بھی اختیار کر لیتا ہے۔ اظہار شعر میں طنز کے پیرائے میں ہوتا ہے

جز غلامی کوئی بھی منزل نظر آتی نہیں
مسلک ارباب تسلیم و رضا کو دیکھ کر
انتہائے گمرہی یہ ہے کہ پہنچتے ہیں ہم
رہنما مجھ کو۔ ادھر میں رہنما و دیکھ کر

اور پھر تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر کھری کھری کہنے پر اتر آتا ہے

ہو نہ احساس اسیری تو رہائی ہے محال
ایسے قیدی نام تک لیتے نہیں میعاد کا

حفیظ کی یہی جرأت برہنہ گفتن ہے جو اسے غزل سے پھر بیانیہ نظم کی طرف لے جاتی ہے لیکن چند دوسرے موضوعات ایسے بھی ہیں جن کے لئے صرف غزل ہی کا سانچہ راس آسکتا ہے۔ ایسے مضامین میں سب سے نمایاں دستوں کے لئے شاعر کی محبت اور شاعر کے ساتھ دوستوں کی بے مہری کا مضمون ہے۔ یہ موضوع بھی ایک زندہ اور بیدار شخصیت ہی کو اپنی طرف کھینچ سکتا تھا جو اپنے ماحول سے ہر وقت باہمی تعامل کے باعث نئے نئے تجربات سے دوچار ہو رہا ہے بعض دوستوں کی دوستی اسے متاثر کرتی ہے اور ان سے دوری اسے شاق گذرتی ہے۔ بعض دوستوں سے خلاف توقع غداری دیکھ کر شاعر کے دل پر چوٹ لگتی ہے اور چونکہ غم کے تجربات خوشی کے تجربات سے زیادہ گہرے ہوتے ہیں لہٰذا دوستوں کی نادوستی حفیظ کی غزل کا ایک مستقل عنوان بن گیا ہے

یہ بھی دیکھا ہے عموماً بن گئے ناآشنا   تمنا طرز سلوک آشنا کو دیکھ کر

پھر پند و نصیحت کے لئے آنے لگے دوست　　　وہ دوست جو کرتے نہیں امداد کسی کی

دوستوں کی درمندانہ ہنسی نے اے حفیظ　　　کردیا مجبور مجھ کو درد کے اظہار پر

ایسا سبق مرے رفقا دے گئے مجھے　　　اپنے لہو کے گھونٹ مزا دے گئے مجھے

مطلب پرست دوست نہ آئے فریب میں　　　بیٹھا رہا لئے ہوئے ام دفا کو میں

پیاروں کی موت نے مری بستی اجاڑ دی　　　یاروں نے جا کے دور بسائی ہیں بستیاں

وفا کے مسئلے میں کہہ گئے اک حرف حق ہم بھی　　　ہمارے دوست ہم کو دار کے قابل سمجھتے ہیں

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف　　　اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

حفیظ کی غزل کا یہ انداز عام اردو روایتی غزل سے بالکل مختلف تھا۔ روایتی غزل میں دردِ دل بیتی کو غزل میں کمال کی ضمانت سمجھا جاتا تھا لیکن نئے تقاضے اب شاعر کو صرف اپنے ماحول ہی سے نہیں بلکہ آفاق سے تعلق استوار کرنے پر مجبور کر رہے تھے چنانچہ حفیظ نے ان تقاضوں کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے لئے وہ راہ چن لی جو آئندہ ادوار کے لئے راہ منزل قرار پانے والی تھی۔ اس کا احساس خود حفیظ کو بھی ہے

اس بزم میں آخر شعرا ہیں کہ نہیں ہیں　　　انداز مرے سب سے جدا ہیں کہ نہیں ہیں

کیا پا مندیٔ نالہ کو میں نے　　　یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

اس طرزِ خاص کا طرۂ امتیاز کیا ہے یہ حفیظ ہی سے سنئے :

اہل زباں تو ہیں بہت کوئی نہیں ہے اہل دل　　　کون تری طرح حفیظ درد کے گیت گا سکے !

بیان درد کو دل چاہئے جناب حفیظ　　　فقط زبان یہاں قابل خطاب نہیں

اور اس کے ساتھ ساتھ

حفیظ اپنے افکار کی سادگی کو　　　تکلف کی الجھن سے آزاد رکھنا

دراصل یہ بات کہنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ شاعری کی زبان شاعر کے تجربے اور موضوع کی پابند ہوتی ہے۔ اردو غزل گویوں کے ہاں جب تک بناوٹی عشق ہی ایک موضوع خاص تھا۔ زبان میں بھی تصنع کی فراوانی تھی۔ ہر موضوع جب تجربۂ ذاتی بن کر شعر کے قالب میں آتا ہے تو موضوع کو شاعر کی شخصیت کا رنگ دے کر ایک مخصوص زبان اپنے ساتھ لاتا ہے اور جب تک کوئی موضوع محض تقلیدی طور پر دوسروں کی نقالی کی حیثیت سے ادا ہوتا ہے شعر میں فکر و زبان کا آہنگ قائم نہیں ہو پاتا۔ حفیظ کے ہاں یہ آہنگ تو دراصل نئے تجربات کے اصلی ہونے کا بجائے خود ایک ثبوت ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آہنگ وقت کے ساتھ ساتھ کامل سے کامل تر ہوتا چلا گیا ہے۔ یہاں تک کہ تلخابۂ شیریں کی غزلیں حفیظ کے رنگ خاص کا خالص نمونہ ہیں۔ ہر غزل چونکہ شاعر کی شخصیت میں ڈوب کر نکلی ہے اس لئے زبان و بیان کے اعتبار سے مثالی طور پر ہموار ہے۔ جن غزلوں میں فکری عنصر کی زیادتی ہے ان کی زبان اقبال کی زبان سے بہت قریب آگئی ہے مثلاً :

آ تجھ کو دکھا دوں کہ ستاروں سے بھی آگے　　　انسان کے نقش کف پا ہیں کہ نہیں ہیں

حسن نظر کی آبرو صنعت برہمن سے ہے　　　جس کو صنم بنا لیا، اس کو خدا بنا دیا

نقش وفا تو میں ہی تھا اب مجھے ڈھونڈتے ہو کیا　　　حرف غلط نظر پڑا، تم نے مجھے مٹا دیا

نہ چلے گی حشر کے دن یہ تری سخن طرازی　　　کہ تو نامۂ عمل میں نہ شہید ہے نہ غازی

جن کا ظہور ہو نہ سکا مہر و ماہ میں　　　وہ جلوہ ہائے نور ہیں میری نگاہ میں

حفیظ کی جدید غزل زندگی کی نقیب ہے۔ اس میں توانائی ہے۔ جوش ہے اور استقلال ہے۔ وہ عزم ہے جس کے سامنے منزل بھی سنگِ راہ... دکھائی دینے لگتی ہے

دونوں سنگِ راہ طلب ہیں، راہنما بھی منزل بھی　　ذوقِ طلب! ہر ایک قدم پر دونوں کو ٹھکراتا جا!

نغمے سے جب پھول کھلیں گے چننے والے چن لیں گے　　سننے والے سن لیں گے، تو اپنی دھن میں گاتا جا

اس دورِ شاعری میں جب کہ شعراء "آشیاں جلتا رہا ہم ناتواں دیکھا کئے" پر سر دھن رہے تھے اور بقول اقبال "یہ تو فیقوں میں اتنی ہمت نہ تھی کہ بڑھ کر ایک لوٹا پانی کا اس پر ڈال دیتے" حفیظ نے نئی زندگی کا پیغام سنایا۔ جدید شاعری کا علم بلند کیا۔

سب سے آخر میں حفیظ کی غزل کی ایک خوبی جو اگرچہ آخری نہیں ہے اس کا اظہار بھی بہت ضروری ہے۔ حفیظ کی غزل میں نغمہ و آہنگ کا التزام دوسرے شعرا کی نسبت اتنا زیادہ ہے کہ اکثر غزلیں ہر قاری کو گانے پر مجبور کر دیتی ہیں جیسے

تو ہی بھروسا، تو ہی سہارا　　پروردگارا — پروردگارا۔

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے　　تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نہ تمہیں بھلا سکے

او دل توڑ کے جانے والے دل کی بات بتاتا جا　　اب میں دل کو کیا سمجھاؤں مجھ کو بھی سمجھاتا جا

کوئی دوا نہ دے سکے مشورۂ دعا دیا　　چارہ گروں نے اور بھی درد کا دل بڑھا دیا ..... وغیرہ

الغرض فکر، زندگی اور نغمہ یہ ہے حفیظ کی غزل جو آج ہی بس نہیں بلکہ آئندہ کیلئے نشانِ منزل بنی رہے گی۔ اب آیئے کچھ متفرق اشعارِ غزل سے آپ بھی لطف اندوز ہوئیے جو شاعر کی زندگی ہی میں زبان زدِ خاص و عام ہو کر کلاسیکی ادب میں شمار ہوگئے ہیں۔

ہاں میں تو لئے پھرتا ہوں اک سجدۂ بیتاب　　ان سے بھی تو پوچھو وہ خدا ہیں کہ نہیں ہیں

اب ابتدائے عشق کا عالم کہاں حفیظ　　کشتی مری ڈبو کے وہ دریا اتر گیا

بتوں کا نام کیوں لیتی ہے دنیا　　مجھے میرے خدا نے مار ڈالا!

سرِ مقتل حفیظ ایسا کوئی ہمدم نہ تھا لیکن　　نگہ کچھ دیر تک آتی رہی شمشیرِ قاتل سے

لگایا اس لئے آئینہ اس نے روزنِ در میں　　کہ اپنا منہ تو دیکھیں میری صورت دیکھنے والے

اب جہنم میں لئے جاتی ہے دل کی گرمی　　آگ چمکی تھی یہ اللہ کے گھر سے پہلے

حفیظ سب سے بڑی خرابی ہے عشق میں لطفِ کامیابی　　کسی کی دنیا تباہ کر دے، کسی کی عقبیٰ خراب کر دے

رندانِ مے پرست سیہ مست ہی سہی　　اے شیخ گفتگو تو شریفانہ چاہیئے

رہنے دے جامِ جم مجھے انجامِ جم سنا　　کھل جائے جس سے آنکھ وہ افسانہ چاہیئے

ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں　　کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے

مرے ڈوب جانے کا باعث تو پوچھو　　کنارے سے ٹکرا گیا تھا سفینہ

چاند اور ستارہ نکلا یہ سماں کیا دلکش ہو چلا ہے　　افسوس مجھے نیند آتی ہے، افسوس مجھے سو جانا ہے

عجز سے اور بڑھ گئی برہمی مزاجِ دوست　　اب وہ کرے علاجِ دوست جس کی سمجھ میں آسکے

ہوئی جاتی ہے کیوں بے تاب منزل　　برابر چل رہا ہوں، آ رہا ہوں —!

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں　　وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں —!

(باقی صفحہ ۵۶۰ پر)

محمد خورشید عاصم

حفیظ بحیثیت نثر نگار

جس طرح کوئی دو شخصیتیں ایک دوسرے کی مماثل نہیں ہو سکتیں اسی طرح دو مختلف شخصیتوں کی تحریریں بھی ایک جیسی نہیں ہو سکتیں ہر تحریر میں اس کے خالق کی ذات کا پرتو ضرور موجود ہوتا ہے۔ تحریر میں شخصیت کی یہ جھلک ہی اس کو دوسروں کی تحریر سے مختلف کرتی ہے اور اسے ایک خاص اسلوب کا مالک بناتی ہے۔ اسی کی بنا پر ایک تحریر کو دوسری سے ممیز کیا جاتا ہے جس طرح ہم مختلف شخصیتوں میں امتیاز کرتے وقت ان کے خد و خال۔ کردار اور اطوار کو مدنظر رکھتے ہیں اسی طرح تحریر میں بھی الفاظ کی نشست۔ فقروں کا در و بست تشبیہات و استعارات کا استعمال اور بعض پسندیدہ الفاظ کی تکرار مدنظر رہتی ہے۔ شخصیتیں اپنے خصائص کے باعث منفرد ہیں — اور تحریریں اپنے اوصاف کے سبب۔

حفیظ ایک ایسے متوسط گھرانے کے متدین ماحول میں پلے بڑھے جن کا شعار اسلامی سادگی تھا۔ اس ماحول کا اثر اتنا گہرا تھا کہ زندگی کے مختلف نشیب و فراز دیکھنے۔ تحسین و آفرین کی بے پایاں دولت سمیٹنے اور حکومت کے یہاں باوقار عہدے پالینے کے باوجود وہی سادگی ان کا اوڑھنا بچھونا رہی۔ یہ سادگی گویا ان کی طبیعت کا جزو بن چکی ہے۔ کاریں اور کوٹھیاں بھی کسی کبابیئے کے پاس بیٹھ کر کباب کھانے یا اس سے گپ شپ لڑانے میں کبھی حائل نہیں ہوتیں۔ ان کی یہی سادگی اور بے تکلفی اس امر کا باعث بنی کہ وہ بات کو سیدھے سادے انداز میں بیان کر دیں۔ ان کا یہی انداز دوسروں کے پرتکلف اور تصنع آمیز کلام سے کہیں زیادہ موثر ہوتا ہے۔ حفیظ کی شاعری میں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود ہے لیکن نثر میں یہ بات اور بھی زیادہ نمایاں ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ سادگی سپاٹ اور بے مزہ نہیں ہوتی بلکہ اس میں بڑی پرکار شگفتگی اور نکھار ہوتا ہے۔ حفیظ عبارت آرائی کے لئے الفاظ کی تلاش میں سرگرداں نہیں ہوتے بلکہ ان کی سرگردانی عبارت کو سادہ سے سادہ بنانے کے لئے وقوع پذیر ہوتی ہے۔ وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ مشکل سے مشکل بات سادہ الفاظ میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔

اس وقت حفیظ کی بہت کم نثری تحریریں دستیاب ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے نثر میں کم لکھا ہے۔ نہیں بلکہ انہوں نے جو کچھ لکھا اس کا زیادہ حصہ شباب اردو۔ ہزار داستان۔ نونہال تہذیب نسواں اور پھول یا مخزن کے پرانے فائیلوں میں دفن ہے۔ ان رسالوں کی ادارات نے بھی حفیظ کی نثر کو ایک خاص اسلوب دیا جس کا بنیادی جوہر یہی سادگی ہے لیکن اس سادگی میں ایک زور ہے۔ وہ ایسے اعتماد کے ساتھ بات کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو خواہ مخواہ ان کا ہم نوا ہونا پڑتا ہے مثلاً ان کی ایک پرانی تحریر دیکھئے:

"اگر اچھی کتاب زندگی کا خزانہ ہے تو بری کتاب ایک ڈائن ہے جو کلیجہ چاٹ جاتی ہے۔ اچھی کتاب وہ ہے جو راست بازی۔ سچائی اور شرافت کی تعلیم دے۔ انصاف اور انسانیت کے اصول سمجھائے۔ ہم ان کتابوں کو بری سمجھتے ہیں جو خود غرضی۔ بے اعتمادی۔ بداعتقادی اور سفلی جذبات پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے۔ جو جذبات کو ہیجان میں لاکر انسان کو

جانور بننے پر اکساتی ہے ......"

"یہ قول نہایت شر انگیز ہے کہ فن کو فن کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر نفاست کو پیش نظر رکھا جائے تو برائی کا آدھا اثر دور ہو جاتا ہے۔ یہ خیال بہت گمراہ کن ہے کیونکہ وہ برائی بہت ہی خطرناک ہے جو رنگین لفظوں اور حسین بندشوں میں مرصع ہو کر دل میں کھب جائے۔"

یہ حفیظ کی سنہ ۱۹۲۷ء کی تحریریں ہیں۔ ان سے ان کے نظریہ فن کی بھی وضاحت ہوتی ہے اور ان کے اسلوب کی سادگی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ وہی سادگی جو ساری عمر ان کا اوڑھنا بچھونا رہی۔ حفیظ کے خطوط میں یہ سادگی اور بھی زیادہ شوخ ہو جاتی ہے بلکہ خطوط میں تو وہ بھی سرسید احمد خان کی طرح فقروں کے دروبست کی طرف دھیان دینے کی بجائے مدعانویسی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انہوں نے کبھی بھی قلم سنبھال کر خط نہیں لکھے۔ وہ نہیں چاہتے کہ تصنع سے کام لے کر مطلب کو عبارت آرائی کی نذر کر دیں۔ ان کے خطوط میں بڑی بے ساختگی ہے اور مکتوب الیہ سے جو ان کا تعلق ہوتا ہے وہ تحریر میں پوری طرح جلوہ گر رہتا ہے۔ الفاظ کے الٹ پھیر میں اپنے جذبات کو دبا دینا انہیں پسند نہیں۔ ان کی زندگی کا انداز بھی یہی ہے جو بات کہنا ہو وہ بے محابا کہتے ہیں۔ وہ شدید قسم کے جذباتی ہیں۔ اپنی پسند و ناپسند پر ریاکاری اور منافقت کے غلاف کبھی نہیں چڑھاتے۔ خطوط کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اس نمبر میں ان کے خطوط شامل ہوں گے جو اس دعوے کے شاہد عادل ہیں۔

اپنی نثر میں کبھی کبھی ایمائیت کو کام میں لا کر چند لفظوں میں یا دو ایک فقروں میں وسیع معانی بیان کر جاتے ہیں یا کوئی ایسا منظر کھینچ کر رکھ دیتے ہیں کہ قاری بہ سہولت معنوی تاثر پالیتا ہے لیکن اگر وہ بیان کرنے لگے تو مفہوم کئی جملوں میں بیان ہو۔ اس اسلوب کو انہوں نے جوانی میں لکھے ہوئے افسانوں میں بڑی مہارت کے ساتھ برتا تھا۔ شاعری کی وجہ سے انہوں نے افسانوں کی طرف توجہ نہ دی۔ حالانکہ انہوں نے اس زمانے میں افسانے لکھے جبکہ ابھی افسانہ محض ایک تجربہ کی حیثیت سے سامنے آ رہا تھا اور ابھی لوگ اس کے وجود کے قائل نہ ہوئے تھے۔ افسانہ میں چونکہ فالتو الفاظ کی بھرتی کبھی بھی قابل قبول نہیں ہوتی اسلئے حفیظ کا انداز افسانے کو آگے بڑھانے میں بہت ممد ہوا۔ "آہ یہ دہشت ناک جنگل۔ یہ ہو کا عالم۔ درندوں کا مسکن اور ایک ننھی سی جان"

یا پھر:

"بے آبروئی۔ شرم۔ بے غیرتی۔ انتقام"

ان چند الفاظ سے سوچنے والے کے ذہن اور تصورات کی رو کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ بے غیرتی کی وجہ سے اس پر کیا ردعمل ہوا اور اس کا چارہ وہ کس انداز میں کرنا چاہتا ہے۔

حفیظ شاعر ہیں۔ انہیں آہنگ اور نغمہ کا بہت رچا ہوا شعور حاصل ہے۔ ان کی نثر سادہ ہونے کے باوصف بعض اوقات ایک خاص قسم کا آہنگ اپنے اندر سموئے ہوتی ہے جو وہ الفاظ کی تکرار یا الفاظ کی صوتی ہم آہنگی سے پیدا کرتے ہیں۔ اگر اس میں ان کی شعوری کوشش شامل بھی ہوتی ہے تو بھی یہ سب کچھ اس صفائی سے واقع ہوتا ہے کہ بے ساختگی کا احساس ہوتا ہے

"تنبولی نصف شب تک لہرا لہرا کر گرما گرم چائے کی صدا لگانے والے آج دس بجے ہی اپنے کچے پکے سودے سمیٹ سمٹا گھروں کو جا چکے ہیں۔ اکا دکا مسافر۔ بہکے ہوئے شرابی۔ آوارہ مزاج سیلانی تماش بینوں کے گروہ طوفان کی آمد آمد دیکھ کر اپنے اپنے اڈوں کی خیر منا رہے تھے:

"میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ گرم گرم۔ تلخ تلخ۔ ..."

"ریاض نے جلد جلد اسی گوشت سے یخنی بنائی اور گرم گرم بوڑھے کو پلائی"

حفیظ بھی محمد حسین آزاد کی طرح تحریر کے دوران میں کبھی خود کو خطاب کر کے بات کرتے ہیں اور کبھی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ جب وہ خود

کو مخاطب کر رہے ہوتے ہیں تو اپنے آپ کو غائب جان لیتے ہیں۔ ان کا یہ انداز تحریر ہی میں نہیں وہ باتوں میں بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ جب وہ کسی پرانے واقعہ یا معرکہ کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں "میں نے کہا حفیظ جی . . " اور پھر ایسے انداز میں ذکر کرتے ہیں گویا حفیظ کوئی دوسرا آدمی ہے جسے انہوں نے مشورہ دیا تھا اب اس بات کا ذکر کر رہے ہیں۔ بقلم خود میں ایسے فقرے اکثر نظر آتے ہیں۔

". . . . انجمنوں کے جلسوں میں بھی چندہ کرنے کے لئے حفیظ جالندھری اچھا خاصا ذریعہ تھا"

"میرے دل نے مجھ سے کہا اوشاعر نامدار اسکول سے بھاگ نکلنے کی سزا ملنے ہی والی ہے"

"اپنی باری آتے دیکھ کر میں بغلیں جھانکنے لگا۔ دل سے پوچھا کیا کیا جائے۔ دل نے کہا میاں حوصلہ نہ ہارو جس دھن میں شعر کہتے وقت گنگنایا کرتے ہو سوا سی دھن میں سنا بھی دو"

"دونوں رسالے جناب چیف ایڈیٹر ابوالاثر جالندھری کی ادارت صفحہ اول پر لئے میرے سامنے آئے تو . . . . "

لیکن وہ صرف اپنے آپ کو ہی خطاب نہیں کرتے ہیں بلکہ تحریریں وقتاً فوقتاً قاری کو بھی "لیجئے۔ سنیئے۔ جناب والا" کہہ کر اپنی طرف متوجہ کرتے رہتے ہیں ان کا یہ رنگ بالکل بات چیت کا رنگ ہوتا ہے۔

"نہیں جناب والا اس دور میں میری ہی یہ بیہودہ کوشش ادبی تا جنگ بے رنگ تھی"

"لیجئے سنیئے میں ان دنوں پنجاب بھر کی اسلامی انجمنوں کے جلسوں میں مسلمانوں کی تعلیم کے لئے . . ."

"اگر آپ اس قسم کے سوالات کریں گے تو بپاس احترام ہنسوں گا تو نہیں البتہ سر جھکا کر یہ عرض کر دوں گا کہ یہ مسجد ہے حضور والا — !

حفیظ چونکہ شاعر ہیں اور بہت بڑے شاعر ہیں اس لئے سادہ نثر لکھنے کے عادی ہونے کے باوجود اگر ان کے قلم سے ایک آدھ فقرہ شاعرانہ قسم کا نکل جائے تو پھر نثر ہی میں شاعری شروع ہو جاتی ہے اور ان کا خامہ صفحۂ قرطاس پر موتی بکھیرتا چلا جاتا ہے

تاہم اے میری محبوبہ، اے میری زندگی۔ اے حسینۂ فن جتنا جی چاہے مجھ پر خفا ہو لے۔ سزا دے لے لیکن عتاب کر، حجاب نہ کر۔ مجھ سے چہرہ نہ چھپا۔ میں کام چور نہیں محتاط ہو چکا ہوں شاید ضرورت سے زیادہ محتاط —"

"دیکھ تو سہی تیرے ہی حریم ناز۔ تیرے ہی خانہ باغ کی تزئین و آرائش کے لئے نوادر جمع کر لایا ہوں۔ میرے احساسات۔ میرے تجربات۔ پھولوں بھرے گلدستے . . ."

"ہاں میں ان ہی کے لئے سرگرداں رہا ہوں۔ شاہراہوں سے گذرتا ہوا۔ شاہراہوں سے دور۔ دور پگڈنڈیوں سے بھی دور —

پگڈنڈیاں شاہراہوں سے جا ملتی ہیں اور شاہراہیں تیرے دربار عام کی سیڑھیوں تک پہنچا دیتی ہیں لیکن پٹا بھی دیتی ہیں۔ آج کل ان پر بڑا ہجوم ہے۔ آنے والے جانے والوں کا۔ آنے والے۔ جانے والے اور ان دونوں پر پھول برسانے والے۔ ڈھیلے پھینکنے والے بھی — !

ان تحریروں کو پڑھ کر نیاز فتحپوری کے ان مضامین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو انشائے لطیف کے اعلیٰ نمونے گنے جاتے ہیں لیکن ان میں نیاز کی طرح غیر موزوں یا بھاری بھرکم عربی کے لفظ نہیں ہیں جو عبارت کی سلاست کو ٹھیس لگائیں۔ اپنے نظریہ فن اور شاہنامہ اسلام کے بارے میں لکھتے ہیں:

کیا آپ کسی ایسے باغبان سے واقف نہیں جو اپنے باغ میں رنگ رنگ کے پھول بھی کھلاتا ہے اور پھل دار درخت بھی لگاتا ہے۔ کیا آپ یہ کہتے ہیں کہ پھولوں کے بنانے سنوارنے یا آپ کی زبان میں رچنے اور نکھارنے میں تو باغبان کا فن قابل تحسین ہے لیکن ثمر آور درختوں کو پروان چڑھانے میں کوئی ہنر نہیں — للعجب — !

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں

"اور کتنے بے شمار کام ودہن ہیں جو شاہنامۂ اسلام کے ثمار سے لذت یاب ہیں۔ بے شک شاہنامہ اسلام میرے دوسرے کلام سے بہت مختلف ہے۔ یہ اختلاف کیا ہے۔ یہی نا کہ من موہن صورتیں۔ کلیوں کے گجرے۔ نازک رسیلی باتیں، شوخیاں ناز و انداز۔ اٹھلاتی ہوئی جوانیوں کی انگڑائیاں۔ اڑتے ہوئے آنچل بسنت۔ ساون۔ ٹھنڈی ہوائیں۔ اودی گھٹائیں۔ زلفیں اور ان میں جھلکتی ہوئی بجلیاں۔ آنکھوں میں تمنائے دیدار اور فراق کے آنسو یا وصال و بغل گیری کی چٹکیاں شاہنامہ اسلام میں نہیں ہیں۔ ہاں نہیں ہیں۔ یقیناً نہیں ہیں۔ اس لئے نہیں ہیں کہ ان کو یہاں نہیں لایا گیا۔ میری مرضی کے بغیر یہ مسخرے یہاں کیسے گھس سکتے ہیں"

حفیظ تمثیل و تلمیح وغیرہ کے استعمال میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں لیکن ان کا استعمال بالعموم ایسے موقعوں پر کرتے ہیں جہاں وہ شوخی پر اتر آئیں۔ یا پھر مزاح سے بڑھ کر طنز کو اپنا لیں۔ ویسے وہ طنز و مزاح کا نشانہ صرف دوسروں کو ہی نہیں بناتے بلکہ خود اپنے پر بھی ہنسنے کا گر جانتے ہیں۔ دراصل ہر قسم کے حالات میں ہنستے رہنے کی صلاحیت ہی نے حفیظ کو وہ قوت عطا کی ہے کہ انہوں نے ہر قسم کے نامساعد حالات کا مقابلہ بڑی پامردی سے کیا اور بڑے سے بڑے مد مقابل کے سامنے ہتھیار ڈالنا گوارا نہیں کیا۔ طنز ان کے ہاتھ میں ایک بہت بڑا حربہ تھا اور انہوں نے اس کے استعمال میں اس زمانے میں مہارت حاصل کی ہوگی جب کہ وہ انجمن ارباب علم کے کرتا دھرتا مولانا تاجور نجیب آبادی اور ان کے ہم نوا اور شاگردوں کے حملوں کا تابڑ توڑ جواب دے رہے تھے۔ وہ زمانہ حفیظ کے لئے بڑے کڑے امتحان کا زمانہ تھا۔ اس چومکھی لڑائی نے نہ صرف یہ کہ انہیں ہر قسم کے خیالات کے اظہار پر قادر ہونے کا موقع عطا کیا بلکہ ان کا لوہا دوسروں سے بھی منوایا۔ اس میدان کو مار لینے کے بعد حفیظ کے سامنے شعر و سخن کی وسیع سلطنت تھی جس میں وہ لا غیری کے نعرے لگاتے رہے۔ لیکن وہ اپنی گزشتہ زندگی کو نہیں بھولے۔ اپنی مختلف حالتوں کا ذکر کر کے آپ بھی مسکراتے ہیں اور دوسروں کو بھی لطف اندوز ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ شباب اردو کا مدیر مقرر ہونے پر لکھتے ہیں :-

"یہ خبر سسرال آ کر میں نے اس طرح سنائی جیسے پنجاب کا لیفٹننٹ گورنر بن گیا ہوں"

اور پھر تنخواہ کے بارے میں بیان کرتے ہوئے اس طرح رقم طراز ہیں :

"آئندہ کے لئے دو روپے روز پر معاملہ تقریباً ایک سال تک چلتا رہا۔ ایڈیٹر بنے رہنے کی خوشی میں ہم بھی مگن رہے۔ یہ دو روپے بھی ہر اتوار اور بے اتوار بھی، خان صاحب کے چھٹی منا لینے پر چھٹی اور تہوار پر تہوار منا لیتے تھے۔"

ایک دفعہ علامہ اقبال نے حفیظ سے باتیں کرتے ہوئے ان کے بارے میں لفظ جینئس برتا۔ آپ لکھتے ہیں :

"مجھے لفظ جینئس کے معنی معلوم نہ تھے تاہم جی خوش ہوا کہ حضرت فرماتے ہیں تو کوئی اچھی بات ہی ہوگی"

"بیوی کی کم فہمی سے اپنا محاسبہ کرنا پڑا۔ جیل جانے سے باز رہا ورنہ میرا رخ شاعری سے لیڈری کی طرف پلٹ جاتا تو ایک آدھ جلوس تو میرا بھی کسی نہ کسی وقت نکل ہی جاتا"

"ادھر ملک بھر کے عملی خاص و عام اور ہی دھوم دھام دکھا رہے تھے جو زبر تھے وہ زیر کو زیر رکھنا چاہتے تھے اور جو بیچارے زیر تھے کم از کم ایک مرتبہ زبر کی سطح پر ابھر آنے کے لئے لوٹنیاں لگا رہے تھے۔ ہم شاعر لوگ اس زیر و زبر میں بھی زیر و زبر تھے۔"

"میں جسمانی مزدوری میں لگا ہوا تھا کہ شہر میں ایک دنگل ہوا۔ کمشنری جالندھر کے پانچ ضلعوں کے شاعر کشتی لڑنے آئے اور آریہ اینگلو ورنیکلر اسکول کے ماسٹر گوپال داس کی انگیخت پر طرحی غزل اور متعین مضمون پر ایک نظم راتوں رات میں نے

لکھی - ماسٹر جی مجھے میرے گھر سے اپنے ساتھ دنگل میں لے گئے۔ بھاری بھرکم شاعروں کے مقابلے میں اکھاڑے کے اندر اترتے وقت میری عمر اور دفع پر سب ہنسے لیکن میں فرزانہ آزاد" کا "صف شکن ٹیپو" ثابت ہوا۔"

حفیظ کی نثر میں ایک خاص قسم کی شگفتگی ہے۔ وہ بات بات میں لطیفہ پیدا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ خود لکھتے ہیں کہ "سوگوار منمناتی اور بسورتی ہوئی بے ثبات افسردگی کے بجائے میں نے شگفتگی کو اپنا فن بنانے کی ٹھانی" اگرچہ انہوں نے یہ عہد شاعری کے ضمن میں کیا تھا تاہم ان کی ذہنی افتاد نثر میں بھی گل بوٹے کھلانے سے باز نہ رہ سکی۔ ان کی زندہ دلی ہر جگہ اپنا رنگ دکھاتی ہے"

"... یہ دور تھا جب مجھ پر اردو کا پہلا دورہ پڑا ..."

"سر راہ ایک حویلی کے صحن میں بہت سے لوگ جمع پائے۔ شور سن کر ہم بھی جا گھسے۔ محفل کے درمیان ایک مرد معقول "کریما ببخشا" کی بولی میں (جو مجھے مسجد میں رٹائی جا چکی تھی) ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ سنا رہا تھا۔ سننے والے واہ بھئی واہ خوش گفتی۔ سبحان اللہ۔ درست فرمایا کہتے تھے۔ سر ہلاتے۔ زانوں پر ہاتھ مارتے اور لوٹن کبوتر ہوئے جاتے تھے۔ بے اختیار ہنسی چھوٹی۔ میں اور میرے ساتھی بیچ میدان کود کود کر وہی حرکتیں کرنے لگے جو دیکھ رہے۔ بڑے بوڑھے کر رہے تھے۔ لیا "چیتیائے" اور دھکیائے گئے۔ تھپڑ سے میری نکسیر پھوٹ گئی مگر اس پٹائی کے باوجود ہم اپنے گھروں تک "کریما ببخشا" کی مہارتی سے باز نہ آئے۔ گھر پر والد نے سوجا ہوا منہ دیکھ کر جب ٹٹولا تو پتا چلا کہ دادا آ رہے آگئے ہیں دادا ہی کی تقریر سے پتہ چلا کہ وہ "کریما ببخشا" کی بولی بولنے والا فارسی کا ایک بڑا شاعر ہے۔ جالندھر ہی کا رہنے والا ہے۔ ہمارے دوست شیخ سکندر بخش کا لڑکا ہے۔ بچپن میں سب اسے مست کہتے تھے۔ تکیں جوڑا کرتا تھا۔ اب دیوان حافظ کی ٹکر کا ہے۔ ماں باپ نے غلام قادر نام رکھا تھا۔ گرامی خود بن بیٹھا ہے۔ تمہارے باپ کا ہم مسجد تھا اب دکن کے بادشاہ کے دربار میں رہتا ہے۔ کبھی کبھی جالندھر آتا ہے۔ بے نکا رہے ڈگیں وہ اور فارسی عالم علما محفل جماتے ہیں۔ اس کی فارسی سن کر واہ واہ کرتے ہیں۔ دیکھا دیکھی اور لوگ بھی تکیں جوڑنے لگے۔ مگر توبہ جی۔ کہاں راجہ بھوج کہاں گنگا تیلی"

"ردیف قافیے ملازمت کے سفارشی نہ بنے۔ تجارت کی سوجھی۔ ایک دادی اماں کا جس نے مجھے متبنیٰ بنا رکھا تھا آخری زیور فروخت کیا۔ عطر اور خوشبویات کی دکان کھول لی جو عشق و محبت کی دکان ثابت ہوئی۔ اصلاح لینے والوں کا ہجوم اور شاعروں کا جمگھٹ رہنے لگا۔ رنگ رنگ کے حسین سورت لوگ عطر اور لونڈر کی شیشیاں مسکرا مسکرا کر اٹھا لے جانے لگے گرمئی بازار ایسی بڑھی کہ دکان بڑھانی پڑی ....

تیسرے دن امرتسر میں جلیاں والے باغ کا سانحہ پیش آیا۔ یہاں بھی پکڑ دھکڑ ہوئی۔ پولیس نے مجھے تین دن حوالات میں رکھ کر کم سنی اور شاعری کے الزام میں چھوڑ دیا ؎

محشر والوں نے بھی مجھ کو شاعر کہہ کر چھوڑ دیا
میری فرد عمل کو سمجھے مجموعہ افسانوں کا

مکان کا گر دی رکھنا کب تک مخفی رہتا۔ والد نے میری بیوی اور شیر خوار بچی کے سامنے میرے سر کو جوتوں سے نوازا اور میری والدہ کو شوہریت کے دعوے سے واپس گھر لے گئے ...."

لیکن حفیظ شوخی اور مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کے بہت دلدادہ ہیں۔ وہ اپنے مد مقابل پر ایسے گہرے وار کرتے ہیں کہ اسے بالکل عاجز و بے بس کر کے رکھ دیتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ اپنی رو میں حد اعتدال سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں۔ اور ان کے طنز میں بڑی تلخی آ جاتی ہے۔ یہ ممکن ہے ابتدائی لسانی اور ادبی

معرکوں کی یاد کا اثر ہو

"مارکھائی۔ حکمت آئی۔ پتہ چلا کہ سیاسی، مذہبی، ملکی، ملی معاملات پر جدال و قتال کی خاطر میدان میں اترنے والے قسمت آزماؤں کی نسبت زبان و بیان کے لئے عوربن سعدان فتح و شکست کے بارے میں زیادہ سریع الحس ہیں۔"

"۔۔۔ اپنے مربیوں کا شکر، اپنے مقابل معرکہ آراؤں کا ذکر ان کا بھی جو تشریف لے جا چکے ہیں اور ان کا بھی جو اب قطعاً استاد ہو چلے ہیں اور اپنے پٹھوں کو گلا پکڑنے کے داؤ پیچ بتا رہے ہیں۔"

ایک اخبار میں شملہ کے اس مشاعرے کی روئیداد پڑھ کر جس میں خود بھی شامل تھے اپنا رد عمل اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"ان کالموں میں وہ شعراء نام بنام اپنے کلام کے ساتھ "بہار آمیز گر" تھے جو اسٹیج پر تشریف تو لائے مگر سنے نہ گئے آخری سطروں میں یہ فقرہ تھا ایک پنجابی موسیقار حفیظ جالندھری نے بھی ترنم ریزی سے محفل کو محظوظ کیا۔"

"ارباب علم والے" اس سلسلے میں دہلی سے ایک بڑی توپ لائے۔ یہ حکیم راج نرائن تھے۔ ۔ ۔ ۔

"نہیں جناب والا اس دور میں میری ہی یہ بیہودہ کوشش اور یہی جنگ بے درنگ تھی جس نے سخن وری کی پری کو فضاؤں میں اڑنے کے لئے آزاد کر دیا۔"

"۔۔ میرے صندوقچے کو ردی پیڑی کی لشافت سے پاک کر کے غائب ہو گئے۔۔۔"

"اور لاہور میں "بزم ادب پنجاب" کے ساتھ پنجاب ہی کو بنیادوں تک کو ڈھا دینے کے لئے ہر گلی کوچے میں مطلع و مقطع کی دونالیوں سے ردیفوں قافیوں کے گولے برسنے لگے۔"

طنز کو وہ صرف مد مقابل ہی کے لئے استعمال میں نہیں لاتے بلکہ عام بات چیت۔ بحث یا حالات کا ذکر کرتے ہوئے بھی طنزیہ انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ ان کا خاص فن ہے دیکھئے:

"یہ فسادی بادل لاہور پر بھی پھٹ پڑا اور شہر قتل و غارت آتش زنی کی بسنت منانے لگا۔"

جو لوگ شاہنامہ کو شاعری کی صف سے خارج کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور اس کی مقبولیت کو صرف حفیظ کے پڑھنے کے انداز تک محدود رکھنا چاہتے ہیں ان سے کہتے ہیں:

"آپ فرمائیں گے کہ حفیظ کے پڑھنے کا انداز ہی ایسا ہے۔ بجا۔ لیکن حفیظ سے بہتر انداز میں پڑھنے اور سنانے والوں کے لئے دو تین غزلوں یا ایک ہی نظم کے دوران میں لوگوں کو کھانسی کیوں شروع ہو جاتی ہے۔

شاید میرے نقادوں میں سے کوئی صاحب میری جگہ ہوتے تو گول میں کھڑے ہو کر نعرۂ اللہ اکبر بلند فرماتے یا درۂ خیبر سے گزرتے ہوئے حملہ آوروں میں شامل ہو کر بنسری کی تان اڑاتے لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میرا آرٹ یہ نہیں ہے"

یہاں حفیظ بتانا چاہتے ہیں کہ ہر بات کا موقع و محل ہوتا ہے۔ شاعری کا مزاج موضوع کے مطابق ہونا ضروری ہے ورنہ وہ تاثیر خالی ہو گی جیسا کہ انہوں نے طنزیہ انداز میں مثالیں دے کر بات ثابت کر دی۔

حفیظ کا خمیر پنجاب کی سرزمین سے اٹھا ہے اور انہیں اس پر ناز ہے۔ اگرچہ وہ پنجابی کو اردو کے مقابل نہیں لانا چاہتے اور قومی زبان کی ترقی اور ترویج میں سر توڑ کوشش کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اپنی عبارت میں بعض اوقات جان بوجھ کر پنجابی الفاظ جڑ دیتے ہیں اور حق یہ ہے کہ ایسا لفظ استعمال کرتے ہیں کہ جو موضوع کو اور زیادہ فصیح کر دیتا ہے۔ اس قسم کے الفاظ اگر استعمال ہونا شروع ہو جائیں تو بے شک اردو کا دامن اور بھی وسیع ہو جائے گا

"دلوی دیال میرا ہانڈی وال۔ گھوست مستقل مہمان اور برگزیدہ ہائے گوشت خوروں کا نگران"

"مجھے بھی ہاتھ گھسائی کے سو سوا سو بن جاتے۔ یہ میں کماؤ ثابت ہونے کے لئے اپنی والدہ اور بیوی کو جو جالندھر چلی گئی تھیں پہنچا دیتا۔ خود "شباب" کی دہاڑی داری پر گزر کرتا۔"

"پانچ روپے ماہوار پر ایک چبارہ لیا۔"

"دو مہینے کی یادگار خجل خواری کے بعد پلٹے تو خان صاحب نے میرے دو روپے دہاڑی بھی بند کر دیئے۔"

ہر ادیب غیر شعوری طور پر بعض الفاظ کو اپنا لیتا ہے اور ان الفاظ کو بے دریغ استعمال کرتا ہے۔ حفیظ بھی بعض الفاظ اپنا چکے ہیں ایسے الفاظ میں "فرمانا" اور "جھتہ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں "فرمانا" کو وہ بالعموم "کرنا" کی بجائے استعمال کرتے ہیں:

"وہ اپنی آمدنی میں چونی دونی کا اضافہ فرما کر گھر پلٹتا۔"

"محفلوں اور ٹی پارٹیوں میں کچھ ایسا رویہ اختیار فرمایا کہ . . . ."

"آج اردو شاعری کی فضا شاید ترقی فرما کر ان نکمی باتوں سے پاک ہو چکی ہے"

"ہر جگہ ہر مقام پر مشاعروں کے مقابل عملی زندگی کے مظاہرے فرما رہے تھے"

اسی طرح گروہ بندی یا پارٹی بازی کی بجائے جھتہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں:۔

"لاہور میں آئے ہوئے اہل زبان اور پنجابی بے زبان حوصلہ افزائی اور سخن سرائی کے لئے مولانا اور ان کے جھتے کے محتاج تھے"

"میرا ان کا ذاتی جھگڑا ہو ہی نہ سکتا تھا۔ وہ عالم فاضل، ایڈیٹر، پروفیسر، وکیل وکلا۔ جھتہ بند اور یوں بھی "مردان معتبر" ۔۔ میں تھا ہی کیا ۔۔"

"ادھر پورا جھتہ اور یہی مشغلہ سخن سازی و مشاعرہ بازی بطور کاروبار۔ ادھر دو تین فرد۔ ہر کوئی فکر معیشت کے پنجے میں گرفتار"

"میں تاجور صاحب کے اہل زبان ہندو مسلمان سکھ تلامذہ اور جھتے کے دوسرے شعراء کے ساتھ تملہ پہنچا۔"

بعض اہل قلم کسی خاص صنف میں اس قدر مشہور ہو جاتے ہیں کہ دوسری اصناف میں ان کے کام کے بارے میں لوگ صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ایک صنف میں ان کا کمال ان کے دوسرے کمالات کو دبا دیتا ہے۔ حفیظ کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ ان کی شاعری نے ان کو بحیثیت نثر نگار لوگوں کے سامنے نہیں آنے دیا حالانکہ وہ نثر میں ایک خاص اسلوب کے مالک ہیں جو رواں دواں۔ سادہ اور شگفتہ ہے۔

حفیظ کی غزل (صفحہ ۵۵۳ سے آگے)

حسن پابند رضا ہو، مجھے منظور نہیں — میں کہوں، تم مجھے چاہو، مجھے منظور نہیں
شرط اظہار ندامت ہے جو بخشش کیلئے — اے جوانی کے گناہو، مجھے منظور نہیں۔
جس نے اس دور کے انسان کئے ہیں پیدا — وہی میرا بھی خدا ہے، مجھے منظور نہیں،
حشر کے دن مجھے سچ کہنے کی توفیق نہ دے — کوئی ہنگامہ بپا ہو، مجھے منظور نہیں،
روز روشن کو ہوں میں رات سمجھنے والا — ہے کوئی آج مری بات سمجھنے والا ۔۔؟
تو اگر آج نشہ میں ہے تو مجھ سے نہ الجھ — میں ہوں کم ظرف کی اوقات سمجھنے والا

پرویز کاکوی

بچّوں کا ادب اور حفیظ

"میں نے بچوں کے لئے بہت کچھ لکھا ہے۔ اور میرا ارادہ ہے
کہ مرنے سے پہلے ہمیشہ کے لئے بچّہ بن جاؤں اور بچوں
ہی کے لئے لکھوں"

مندرجہ بالا سطور ایک ایسے شاعر کی تحریر کردہ ہیں جس کا مقام اردو شاعری میں نہایت بلند ہے جس نے جدید نظم نگاری کو ایک نیا موڑ عطا کیا ہے جس نے آہنگ اور لے کا سہارا لے کر منظومات کی ہیئت بدل ڈالی ہے جس نے مترنم بحروں سے گل کدۂ نظم کی تزئین کی ہے۔

جدید نظم نگاری کو ایک نئے موڑ سے آشنا کرنے والے حفیظ صرف بڑوں کے ہی نہیں بچوں کے بھی شاعر ہیں۔ ان کے دل کے شبستان میں معصوم بچوں کی محبت کا چراغ بھی فروزاں ہے۔ زندگی کا ایک طویل عرصہ گزارنے کے باوجود بچپن انہیں نہیں بھولا۔ وہ اس پیرانہ سالی میں بھی بچہ بن جانے کی تمنا کرتے ہیں۔ ادب عالیہ تخلیق کرنے کے باوجود وہ بچوں کے لئے ننھی منی نظمیں لکھنے کے آرزومند ہیں۔ بچہ بن جانے کی اسی تمنا اور ننھی نظمیں لکھنے کی اسی آرزومندی نے حفیظ کو ادب الاطفال میں ایک اونچا مقام عطا کیا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بچوں کا ادب تخلیق کرنے میں خاصی جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ اس اہم فریضہ سے بخوبی عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک فنکار کو بچہ بننا پڑتا ہے۔ جب تک شاعر و ادیب بچوں کی ذہنی سطح تک اتر نہیں جاتا وہ ننھے قاریوں کے لئے دلچسپ و دلآویز ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ صرف بچہ بن کر نچلی سطح تک آجانا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اپنے دل میں بچوں کے لئے خلوص و محبت کا جذبہ پیدا کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ رسکن کے اس مقولے:

No noble or right art was yet
founded but out of a sincere heart

کی وجہ بھی صرف بڑوں کے ادب کے لئے ہی نہیں ادب الاطفال کے لئے بھی ہے۔ بچوں کے ننھے دل میں اتر کر سما جانے کے لئے ان سے والہانہ محبت کا پیدا ہونا اشد ضروری ہے۔ ایسی نظم و نثر جو خلوص دل سے لکھی جاتی ہے، ننھے قاری کو ہمیشہ متاثر کرتی ہے۔ ایسے ادب پارے کو وہ کسی حال میں بھی فراموش نہیں کرتا۔
حفیظ جالندھری بچوں کے ادب کے اس اہم عنصر سے کماحقہٗ واقف ہیں۔ بچوں کی محبت اس طرح ان کے دیدۂ دل میں محیط ہے کہ وہ ان کا ادب تخلیق کرتے وقت اپنے آپ کو "شاہنامہ اسلام"، "نغمہ زار"، اور "سوز و ساز" کا خالق نہیں محسوس نہیں کرتے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ محض ایک کم سن بچے ہیں جس کے دل میں یہ معصوم تمنا جاگ اٹھی ہے ؎

چلو آج چھٹی منانے چلیں   کسی باغ میں بیر کھانے چلیں

چھیڑ منانے، ورغلانے کی خواہش حفیظ کو بچوں میں مدغم کر دیتی ہے۔ لڑکے بالے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہیں سوچتے کہ یہ باسٹھ سالہ معمر شخص ان کے لئے اجنبی ہے۔ اس کی بوڑھی آنکھیں کسی وقت بھی استاد کی خشمگیں نگاہوں کا روپ دھار لیں گی۔ اس کا ہاتھ سختی سے ان کی گرفت میں لے لیگا۔ بچے ایسا مطلق نہیں سوچتے۔ وہ اس بوڑھے کو اپنا دوست اور دستگیر سمجھتے ہیں جو ان کے ساتھ چھیڑ منانے اور باغ میں بیر کھانے کے لئے ہر آن تیار رہتا ہے۔ بچوں کے ذہن و دل سے اس درجہ ہم آہنگی پیدا کر لینا ہی دراصل ایک بڑے فنکار کا کمال ہے اور یہ کمال حفیظ میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔

بچوں کے ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل کرنے میں، اخبار "پھول" کی ایڈیٹری حفیظ کی زبردست معاون ثابت ہوئی۔ اس ادارت نے حفیظ کو بچوں سے بے حد قریب کر دیا۔ اس اہم ذمہ داری سے بخوبی عہدہ برآ ہونے کے لئے انہوں نے بچوں کے ادب کی جملہ خصوصیات کو مدنظر رکھا۔ بچوں کے خطوط اور ان کی لکھی ہوئی نظموں نے حفیظ کو معصوم دلوں کے راز ہائے سربستہ سے باخبر کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ پھول میں حفیظ کی جتنی نظمیں چھپیں وہ بچوں کے دل میں سما گئیں۔ انہوں نے ان نظموں کو پڑھ کر یہ محسوس کیا کہ شاعر اجنبی نہیں بلکہ ان کا اپنا دوست ہے ——— اس طرح بچوں کے دل میں سما جانے اور ان کا دوست بن جانے کی صلاحیت کوئی معمولی صلاحیت نہیں خاص کر ایک ایسے شاعر کے لئے جو سنہ ۱۹۲۵ء میں ہی اپنے پہلے مجموعہ کلام نغمہ زار کی بدولت ادبی حلقے میں تمام تر مقبول ہو چکا تھا جس نے اپنے نرالے طرز سخن سے بزم شاعری کو اجال دیا تھا اور جس نے پنڈت ہری چند اختر کے بقول ؎

"جب سے مناظر قدرت کی تصویر کشی چھوٹی چھوٹی مترنم بحروں میں جذبات کے اظہار اور درد دل کو ہلکی دھنوں اور گیتوں کے سانچے میں ڈھالنے کا آغاز ہوا ہے۔ اردو کا کوئی رسالہ اٹھا کر دیکھئے۔ شعر و سخن کی کسی محفل میں شریک ہو کر اندازہ کیجئے آپ کو جابجا حفیظ کے تتبع کے متعدد نمونے نظر آئیں گے۔"

ایسا شاعر جس کے نقش قدم کی پیروی کی جاتی ہو۔ جس کی لے اور آہنگ کا اتباع ہو رہا ہو، وہ بچوں کی بزم میں آ کر بزرگی کا لبادہ اتار ڈالتا ہے اور ۔۔۔۔ بچہ بن جاتا ہے۔ ننھے منے بچے اس کے قریب کھسک آتے ہیں اور اس کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر خود بھی مسکرا اٹھتے ہیں۔

بزم اطفال میں مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ حفیظ نصیحت کے ڈنڈے نہیں گھماتے۔ بچوں کو اخلاق کی کڑوی کسیلی گولیاں نہیں کھلاتے۔ وہ بچوں سے ناصحانہ انداز میں یہ نہیں کہتے کہ "دیکھو بچو ایسا کام نہیں کرو — بہت برا ہے" وہ اس طرح کی کھوکھلی باتوں سے قطع نظر کر کے بچوں کی دکھتی ہوئی رگ پکڑتے ہیں۔ وہ ان کی رگ رگ میں سما جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے دل میں ڈوب کر ان کی بیکراں خواہشات کو کریدتے ہیں اور ان خواہشوں کو بروئے کار لانے کے لئے خود آگے قدم بڑھاتے ہیں اور منہ بسورتے، روتے اور آنسو بہاتے ہوئے بچوں کو نہایت شفقت سے اپنی طرف بلا کر کہتے ہیں ؎

ادھر آؤ جی ٹولیاں دو بنا لیں　　　لکیر ایک کھینچیں، نشان اک لگا لیں
چلے ایک لڑکا نشاں سے نکل کر　　　مقابل کی ٹولی پہ جھپٹے سنبھل کر
زباں سے یہ کہتا ہوا چل کبڈی
چلا چل کبڈی ——— چلا چل کبڈی

حفیظ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ بچوں کو کھیل کی پوری آزادی ملنی چاہئے تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اچھل کود کر سکیں۔ قدم قدم پر استاد کی خشمگیں نگاہیں ان کا تعاقب و احتساب نہ کریں۔ بڑوں کی گرجدار آواز ان کے کھیل کے دائرے کو توڑ پھوڑ نہ دے ——— حفیظ بچوں کو صرف کھیلنے کی ہی اجازت نہیں دیتے بلکہ خود بھی کھیل میں شریک ہو کر ان کی خوشیوں کو دوبالا کرتے ہیں۔ جدید نفسیاتی نقطۂ نظر سے حفیظ کا یہ اقدام نہ صرف درست بلکہ ناگزیر ہے اس لئے کہ بچوں کی فطرت کو پابجولاں کرنا ایک سنگین جرم ہے اور حفیظ بچوں کے ساتھ "کبڈی" کھیل کر اس آہنی زنجیر کو چکنا چور کر دیتے ہیں۔ انہیں دائرۂ خوف و دہشت سے نکال کر مسرتوں کے میدان میں لے آتے ہیں جہاں بچہ سکھ کا سانس لیتا ہے جہاں وہ بلا خوف و خطر قلابازیاں کھاتا چلا جاتا ہے

حفیظ جالندھری نے بچوں کی نفسیات کا بخوبی مطالعہ کیا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ بچے میلے اور تہوار کے موقع پر کس قدر شاداں ہوتے ہیں انہیں یہ

معلوم ہے کہ بچوں کو عید کا بڑی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے۔ وہ مارے خوشی کے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتے ہیں۔ بچوں کی اس فطرت کو حفیظ نے اچھی طرح محسوس کیا ہے ؎

ننھے بچے ہیں جامے کر مسرور	لیتے ہیں عید اب ہے کتنی دور
بچوں کی آنکھوں میں ہے نیند کہاں	ہیں انہیں خوش ہوکے بدلی خوشیاں
ہو گئی رات کاٹنی مشکل	کل کے دن پر لگا ہوا ہے دل

حفیظ اس امر سے بھی آگاہ ہیں کہ بچے تہوار کے کپڑے نہایت ہی احتیاط سے رکھتے ہیں اور چاند رات یہ عالم ہوتا ہے کہ ؎

بچے بے اعتبار ایسے ہیں
ان کو رکھ کر سرہانے سوئے ہیں

ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے حفیظ بچوں کی جبلت کے رازداں ہیں۔ انہیں ان کی ہر حالت و کیفیت کا علم ہے اور وہ بچوں کے رازداں بن کر ان کی پوری حمایت کرتے ہیں۔ ان کا حق دلانے کے لئے سرگرداں نظر آتے ہیں اور بلا تامل یہ اعلان کرتے ہیں ؎

کیوں نہ ہو کھیل کا یہی سن ہے
اور پھر آج عید کا دن ہے

اسی طرح "شبرات" کے موقع پر لڑکوں کو شاداں و فرحاں دیکھ کر وہ خود بھی ان کی ٹولی میں پہونچتے ہیں اور جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جشنِ شبِ برات ہے تو خوش ہو کر گانے لگتے ہیں ؎

پھیلی ہوئی لڑکوں میں ہیں کس بات کی خوشیاں
شبرات کی خوشیاں بھئی شبرات کی خوشیاں!

حفیظ بچوں کو صرف کھیلنے ہی کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ انہیں ساتھ لے کر مختلف مقامات کی سیر بھی کراتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ بچوں میں تلاش و تجسس کا مادہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ نئی نئی اشیا کو متشاقانہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں اس لئے سیر و تفریح سے نہ صرف ان کے ذوقِ تجسس کی آسودگی ہوتی ہے بلکہ ان کی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ حفیظ جالندھری بچوں کے غول کو لے کر "رہٹ" کی طرف چل پڑتے ہیں اور دور سے اسے دیکھ کر بچوں کو خوش خبری سناتے ہیں ؎

سہانی ہے اور کیسی میٹھی صدا ہے	اُدھر دیکھنا وہ رہٹ چل رہا ہے
ذرا آؤ تو پاس سے چل کر دیکھیں	اگر ٹھیک سمجھو تو ہم بھی نہالیں!

کبھی "دھنیا" کے گھر پہونچتے ہیں۔ اس کے کام کا بغور مطالعہ کرتے ہیں اور پھر یہ گنگناتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں ؎

واہ رے دھنکی دھنک دھنک
فندک فندک تک تک تک

کبھی دھوبی سے ملاقات ہو رہی ہے۔ اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی جا رہی ہے اور "چھوا چھو، چھوا چھو" کی صدا لگاتے ہوئے میلے ٹھیلے کی طرف چل پڑے ہیں، کبھی "دیوالی" کا جشن دیکھنے کا پروگرام بن رہا ہے اور کبھی کچھ نہیں تو تیتری کو ہی متعارف کرایا جا رہا ہے ؎

چمن میں اڑ رہی ہے ایک ننھی سی پری دیکھو
بہت ہی خوبصورت بھولی بھالی تیتری دیکھو

اور جو کبھی بارش تھم گئی، مطلع صاف ہو گیا اور بچے نہال ہو کر ادھر ادھر دوڑنے لگے تو حفیظ بھی ان کے ساتھ دوڑتے ہوئے ایک نئی "چیز" کا پتہ دیتے ہیں ؎

دیکھنا — وہ کیا اچھا ہے — ارے وہ دیکھنا
آسماں پر — ان درختوں سے پرے — وہ دیکھنا!

اور بچے اس نئی چیز "دھنک" کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے ہیں — مختصر حفیظ نے اپنی متنوع منظومات کے ذریعہ بچوں کو گرویدہ کر لیا ہے۔ مختلف مقامات کی سیر کرا کر اور متعدد مناظر دکھا کر وہ اپنے ننھے دوستوں کو ہمیشہ بہلاتے رہتے ہیں۔ ان کے کم سن ساتھی ان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتے اور ہر وقت ان کی معیت میں مٹر گشتی کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

مندرجہ بالا سطور کو پڑھ کر یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ حفیظ بچوں کے نادان دوست ہیں۔ ہر وقت ساتھ لئے گھومتے رہتے ہیں۔ ان کی اصلاح و تربیت کا چنداں خیال نہیں رکھتے۔ ان کی تعلیم و تہذیب کی فکر انہیں دامن گیر نہیں — نہیں یہ بات نہیں ہے — حفیظ کو بچوں کا بے حد خیال ہے۔ وہ ان کے شاندار مستقبل کے متمنی بھی ہیں۔ بچوں سے انہیں گو بے پناہ محبت ہے لیکن یہ محبت اندھی نہیں چونکہ وہ بچوں کی نفسیات سے باخبر ہیں اس لئے جاہل استادوں کی طرح جا بجا نصیحت کے دفتر کھولنا پسند نہیں کرتے۔ وہ اپنی قہر آلود نگاہوں سے گھور کر ان کے دل کے معصوم کنول کو مرجھا نہیں دیتے — وہ تو مناسب موقع سے بچوں کے اخلاق و اعمال کی تزئین کرتے ہیں۔ ان میں شرافت و انسانیت کے جوہر پیدا کرنے کی ترکیبیں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرنا ہر انسان کا فرض ہے اس فرض کا احساس بچوں میں پیدا کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ وہ بچپن ہی میں ہمدردی کے جذبے سے آشنا ہو جائیں اور آگے چل کر مفلوج اور حاجت مند انسانوں کی مدد کر سکیں — بچوں کو یہ اہم تعلیم زمانہ ہائے دراز سے دی جا رہی ہے۔ ادیب و شاعر نے نظموں اور کہانیوں کے ذریعے بچوں کو اس فریضے کی طرف راغب کیا ہے۔ لیکن دیکھا یہی گیا ہے کہ ایسی نصیحت آمیز نظم و نثر سے خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا اس لئے کہ ان میں براہ راست بچوں کو مخاطب کر کے یہ کہا جاتا ہے ؏

چپا ہو اگر بڑائی — کہنا بڑوں کا مانو

اس طرح کی نظمیں اور کہانیاں پڑھ کر بچے مطلق متاثر نہیں ہوتے — حفیظ بچوں کی اس فطرت سے آشنا ہیں اس لئے ان کے دل میں محبت و ہمدردی کا جذبہ جاگزیں کرنے کے لئے بالکل ہی دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہیں وہ اپنی نظم "بھکاری" میں سب سے پہلے رات کا پر ہول نقشہ کھینچتے ہیں کہ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ بجلی چمکتی ہے اور بادلوں کی گرج سنائی دیتی ہے۔ زور کا طوفان آیا ہوا ہے۔ ایسے بھیانک سمے ہر ایک اپنی اپنی جگہ خاموش ہے

سب لوگ چپ ہوں بیٹھے دروازے بند کر کے
بچے دبک گئے ہوں ماں کی بغل میں ڈر کے

ننھے بچے جب تمام اشعار پڑھ کر رات کی ڈراؤنی فضا سے آگاہ ہو جاتے ہیں تو حفیظ چپکے سے انہیں یہ بتاتے ہیں ؎

اس وقت ایک لڑکا کمزور اور لاغر — تم کو دکھائی دے گا پھرتا ہوا سڑک پر
بالکل پھٹے پرانے کچھ چیتھڑے ہیں تن پر — بہتا ہے مینہ کا پانی سوکھے ہوئے بدن پر
بھیگے ہوئے ہیں کپڑے پانی ٹپک رہا ہے — دروازے پر کھڑا حسرت سے تک رہا ہے

اتنا پڑھتے ہی ہر بچے کے دل میں ہمدردی کی لہریں موجزن ہو جائیں گی۔ ہر ایک اپنے اپنے بستر سے اٹھ کر [illegible] ہوا تا پلی میں بھکاری کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہو جائے گا اور اسے شاعر کی یہ آواز دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوگی ؎

یہ وقت رات کا ہے اور رات ہے ڈراؤنی
اس وقت تم کو اس پر لازم ہے مہربانی

اس طویل نظم میں حفیظ صرف یہ فقرہ اپنی طرف سے ادا کرتے ہیں "اس وقت تم کو اس پہ لازم ہے مہربانی" لیکن ان کی یہ بات ناصحانہ رنگ اختیار نہیں کرتی۔ بچے اسے سن کر ناک بھوں نہیں چڑھاتے اس لئے کہ اس فقرے کی ادائیگی سے پہلے ہی معصوم ذہن کو سرگرم عمل ہونے کے لئے تیار کر لیا گیا تھا۔ ان کے دل کی کھیتی میں ترحم کی آبیاری کر دی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہمدردی کے پودے کا ابھرنا چنداں دشوار نہیں۔

کہیں کہیں تو حفیظ بچوں کو اپنی طرف سے ایک آدھ فقرہ بھی نہیں کہتے بلکہ مختلف مقامات و مناظر کی سیر کراتے ہوئے غیر شعوری طور پر ان کے اخلاق کی تزئین کرتے ہیں "تاروں بھری رات" میں جو لطف و سرور حاصل ہوتا ہے حفیظ بچوں کو اس سے محروم رکھنا نہیں چاہتے۔ وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر گھر کے تاریک و ویران ماحول سے باہر نکل جاتے ہیں اور انہیں انگلی کے اشارے سے یہ دکھاتے ہیں۔

ہے کیا چمکدار
تاروں کا دربار

پھیلے ہوئے ہیں   تارے ہی تارے
رہتے ہیں یوں تو   خاموش سارے
کرتے ہیں لیکن
باہم اشارے
ندی کے اندر   منہ دیکھتے ہیں
اور دل ہی دل میں   خوش ہو رہے ہیں
دریا کی لہریں
پانی کی تہ میں
کیا ناچتی ہیں   تاروں کو لے کر
ہے کیا چمک دار
تاروں کا دربار

بچوں کو یہ شاندار اور پرلطف مناظر دکھاتے ہوئے حفیظ ایک موڑ لیتے ہیں ایسا موڑ جس میں ایک درس چھپا ہوا ہے — نیک کام کرنے کا جذبہ کار فرما ہے حفیظ بچوں سے براہ راست مخاطب ہو کر یہ نہیں کہتے کہ تم بھی نیک کام کرو ورنہ تاروں سے عبرت پکڑو" وہ ناصحانہ طریقہ بالکل اختیار نہیں کرتے۔ بس وہ تو بڑے سادہ سے مگر دل نشین انداز میں تاروں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں؛

اے پیارے تارو
رب کے دلارو
ہاں صبح تک تم   چمکے ہی جاؤ
بھٹکے ہوؤں کو   رستہ دکھاؤ
ہم کو بھی ایسی
خدمت سکھاؤ
نیکی کریں ہم   اور نام چمکے

تاروں کی مانند　　　ہر کام چمکے

ہم کو سایہ تھے

آجا سائے ایسا

دنیا کو ہم سے　　　آرام پہونچے

حفیظ تاروں کی تعریف کرتے کرتے خود نیک ہونے اور اچھے کام کرنے کی دعا مانگنے لگتے ہیں۔ ان کے ہم راہ جو بچے تاروں بھری رات کا حسین منظر دیکھ رہے ہیں وہ بھی اپنے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں اور شاعر کے دوش بدوش دل کی گہرائیوں سے یہ دعا مانگنے لگتے ہیں ؏

نیکی کریں ہم ——— اور نام چمکے

حفیظ جالندھری نے چپکے چپکے نیک بننے کا جو جذبہ بچوں کے دل میں پیدا کر دیا ہے یہی دراصل ان کا کمال ہے۔

حفیظ نے اسلوب و ہیئت کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول کی ہے اور اس میں بھی نئی انفرادیت روا رکھی ہے۔ یہاں اس حقیقت کی وضاحت ضروری ہے کہ بچوں کے ادب میں الفاظ و انداز بیان کی اہمیت مسلم ہے بلکہ انہیں دوسری تمام خصوصیات پر فوقیت دینا نامناسب نہیں۔ بچوں کی کم علمی اور محدود ذہانت کا یہ تقاضا کہ ان کے لئے جو کچھ بھی لکھا جائے وہ سادہ اور سلیس ہو۔ ساتھ ہی اس میں شگفتگی بھی ہو۔ بچے سادہ اور روکھے پھیکے اسلوب سے نہیں بہلتے بلکہ ان کے لئے چٹ پٹی عبارت و انداز بیان کا ہونا لازمی ہے۔ حفیظ جالندھری نے اس خصوصیت کو پیش نظر رکھ کر اپنی نظموں میں زیادہ سے زیادہ شگفتگی پیدا کی ہے سادگی و سلاست کے باوجود ان میں ایک دلآویزی ہے اور یہ دلآویزی الفاظ کی نشست و ترکیب اور مترنم بحروں سے پیدا کی گئی ہے۔ حفیظ اس رمز سے بخوبی واقف ہیں کہ بچے موسیقی کے دلدادہ ہوتے ہیں گنگناتا اور گاتے ہیں گویا ان کا فطری ذوق ہے حفیظ بچوں کے اس فطری ذوق کا لحاظ کرتے ہیں اور مختلف طریقے سے اپنی نظموں کو مترنم بناتے ہیں ان گوناگوں طریقوں میں نہ صرف مترنم بحر کا استعمال ہوتا ہے بلکہ تکرار لفظی اور مصرعوں کا طول و اختصار بھی شامل ہے مثلاً ؎

اے رستان دار گنگا

اے پربہار گنگا

گنگوتری سے نکلی　　　کیسی اچھل اچھل کر

اور پربتوں سے اتری　　　پہلو بدل　　　کر

" اچھل " اور " بدل " کی تکرار، " گنگا " اور " گنگوتری " میں " گ " کا اشتراک، ہر مصرع میں " ر " کی بھرمار اور بحر کا اختصار و طول موسیقیت کا موجب بن گیا ہے۔ اسی طرح حفیظ کی نظم " بول میرے مرغے " بھی ترنم اور جاذبیت میں اپنی مثال آپ ہے۔

بول میرے مرغے

ککڑوں کوں

خوب اکڑ کر　　　چڑھ کھاٹ پر

اب تن جا　　　مرغا بن جا

اپنے بازو　　　تول میرے مرغے

بول میرے مرغے

ککڑوں کوں

حفیظ جالندھری نے بچوں کو اپنی نظموں کے چند مجموعے دئے ہیں لیکن افادیت کے لحاظ سے ادب الاطفال میں یہ سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں

اسماعیل میرٹھی - حامد اللہ افسر، شفیع الدین نیر اور صوفی تبسم کی طرح حفیظ نے بھی بچوں کے ادب کو پروان چڑھایا ہے - بچوں کے دلی جذبات و احساسات اور ان کی گوناگوں خواہشات کو نہایت ہی سیدھے سادے مگر شگفتہ انداز میں پیش کر کے انہوں نے طفل دبستاں کا حق ادا کر دیا ہے —— لیکن افسوس کہ بچوں کا یہ ہمدرد دوست عرصے سے خاموش ہے اس نے کئی سال سے "رپٹ" ، "دیوالی" "تاروں بھری رات" اور "بول بیبے مرغے" جیسی نظمیں نہیں لکھیں، بچے حفیظ کے درج ذیل شعر ؂

میری نظمیں پڑھنے والو
میری کتابیں سب پڑھ ڈالو

کے پیش نظر ان کی کتابیں ہزار مرتبہ پڑھ چکے ہیں —— لیکن اب وہ اس حفیظ کا انتظار کر رہے ہیں جو کسی طرف سے اچھلتے کودتے ہوئے ان کے پاس پہنچیں اور تفریح کا یہ پروگرام پیش کر دیں ؂

چلو آج چھٹی منانے چلیں
کسی باغ میں بیر کھانے چلیں

عشقیہ حقیقت نگاری

(صفحہ ۵۹۴ سے آگے)

کہ انقلاب کا تصور ان کے یہاں ترقی پسندوں کی طرح اس سماجی و معاشی تبدیلی کا نام نہیں ہے جس کے ذریعہ طبقاتی نظام کا خاتمہ ہوتا ہے اور سماج کے تمام افراد کو یکساں طور پر زندگی گزارنے کا موقعہ ملتا ہے - اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حفیظ کا تصور انقلاب ہماری سماجی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا - دراصل حفیظ کے انقلاب کی بنیاد حقیقت اور صداقت پر استوار ہوئی ہے - طوائف ہمارے معاشرے کا ایک اہم جزو ہے اس کا کوٹھا شرفا اور اونچے طبقے کے لڑکے بچوں کی تربیت کے لئے ایک ٹریننگ اسکول کی حیثیت تو ضرور رکھتا ہے مگر یہی طوائف سماج کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بھی تصور کی جاتی ہے - ہماری سوسائٹی طوائف کی آغوش میں پرورش پائے ہوئے بچے کو تو اونچا مقام دے سکتی ہے مگر طوائف کا وجود اس کے جسم کا رستا ہوا ناسور ہے - حفیظ سماج کی اس برائی اور کلاسیکل قدروں کے مخالف ہیں - وہ ان فرسودہ رسموں اور روایتی تصورات کی جڑ ہمارے معاشرے سے اکھاڑ دینا چاہتے ہیں - ان کا یہ عمل رومان اور انقلاب کے درمیان ایک رشتہ قائم کرنا نہیں تو اور کیا ہے - وہ اپنی سوسائٹی اور سماج سے متعلق بڑی بڑی باتوں کو اپنی نظموں میں مصرعوں کی تکرار اور الفاظ کے دروبست سے ظاہر کرتے ہیں -

کلام حفیظ کے اس خاص موضوع —— عشقیہ حقیقت نگاری —— سے ہر شخص دلچسپی رکھتا ہے - ان کی نظموں میں ہمیں اپنے دل کی دھڑکنیں محسوس ہوتی ہیں - ان میں جوان دلوں کے دھڑکنے کی صدائیں ہیں - ان میں حقیقت اور صداقت کا رنگ ہے - ان میں بیتی ہوئی باتوں کا تذکرہ ہے - ان میں محبوب کو بے نقاب پیش کیا گیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ حفیظ کی نظموں کی ہیروئن ہمیں اپنے گلی کوچوں اور بازاروں کی عورت معلوم ہوتی ہے - ان کا کلام پڑھ کر ہماری آنکھوں میں اپنے دیس کی سوندھی مٹی، اپنے وطن کے گیہوں اور دھان کے کھیت - اپنے ملک کے پہاڑ، جنگل، دریا اور اپنے دیہاتوں کی الھڑ دوشیزاؤں کی تصویریں رقص کرنے لگتی ہیں اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ حفیظ نے عشق اور محبت کی بنیاد حقیقت اور صداقت پر استوار کی ہے - جب تک سینوں میں دل دھڑکتے رہیں گے ہمیں حفیظ کی عشقیہ شاعری اپیل کرتی رہے گی -

---

مودود احمد صابری

حفیظ - ایک مطالعہ

حفیظ کے قدردانوں میں ادیبوں اور انشا پردازوں کی کچھ کمی نہیں لیکن باوجود اس کے حفیظ کا کوئی مبسوط تذکرہ مرتب نہ ہوا جن حضرات نے اس عنوان پر قلم اٹھایا ان کی نظر میں حفیظ محض ایک ملی شاعر ہے اس کے شعر کا کمال شاہنامہ اسلام کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ حفیظ کو محض ایک ملی شاعر کہہ کر گزر جانا اس کے ساتھ اس کی شاعری اور فنکاری کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے۔ آرٹ پر اگر طبقاتی لیبل لگا دیا جائے تو اس کی فنی اہمیت جاتی رہتی ہے۔ حفیظ دنیائے شعر و ادب کا ایک عالی مقام فنکار ہے۔ شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے شاہنامۂ اسلام بھی اس کی فنکاری کا ایک بے مثال کارنامہ ہے مگر شاہنامہ سے ہٹ کر بھی اس کا کلام شعریت کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے مسلمان ہونے کی حیثیت سے حفیظ نے جو کچھ لکھا وہ قابل داد ہے مگر اس سے زیادہ قابل ستائش اس کا وہ کلام ہے جو قوم و ملت کی قیود سے آزاد ہے۔ میں نے حفیظ کو ایک فنکار کی حیثیت سے دیکھا ہے فردوسی اسلام کی حیثیت سے نہیں اس لئے میں نے شاہنامہ کے جو اقتباسات دیئے ہیں ان کا انتخاب فنی اعتبار سے کیا گیا ہے مذہبی اعتبار سے نہیں۔ گوئٹے، جرمنی کا مشہور فلسفی شاعر ہے لیکن اس کا مقام فنی اعتبار سے بلند ہے۔ مسیحی اعتبار سے اس کو نہیں پرکھا جاتا اس کے کلام کی بلندی اس کے فن کی وجہ سے ہے کلیسائی ترازو میں اس کو تولنا سراسر ناانصافی ہے۔ یہی حال شیلے، فردوسی، سعدی، کالیداس، ٹیگور اور دوسرے فنکاروں کا ہے۔ ان کے ہم مذہبوں میں وہ کسی وجہ سے ہر دلعزیز ہوں مگر دنیائے شعر و ادب ان کو محض فنکار کی حیثیت سے جانتی اور مانتی ہے۔ فردوسی شیعہ تھا کہ سنّی، دنیا کو اس سے سروکار نہیں البتہ شاہنامہ میں جس اعلیٰ درجے کے فن کا اس نے مظاہرہ کیا وہ ہر قوم، ہر ملت اور ہر دور کے لئے قابل ستائش ہے یہی وجہ ہے کہ مشرق و مغرب میں آج تک شاہنامہ کو دنیا کی ایک بلند کتاب کا درجہ حاصل ہے۔ حفیظ بھی ایک فن کار ہے، شاعر ہے اور شاعرانہ اعتبار سے بہت بلند مقام رکھتا ہے۔ یہ مقام اس کو ہر جگہ اور ہمیشہ حاصل رہے گا جب اردو شعرا کا ذکر چھڑے گا خواہ وہ ہندوستان میں ہو یا پاکستان میں حفیظ کا ذکر خیر ضرور کیا جائے گا۔ مندرجہ ذیل سطور میں اس کی حیثیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میری نگاہ میں حفیظ ایک زندہ جاوید فنکار ہے اس کا فن فانی نہیں باقی ہے جس پر امتداد ایام سے کبھی موت وارد نہیں ہو سکتی۔

نام و نسب اور حالات

محمد حفیظ نام۔ حفیظ تخلص۔ ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۰۰ء میں بمقام جالندھر پیدا ہوا۔ والد کا نام حافظ شمس الدین تھا۔ ایک متوسط چوہان راجپوت گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ عرفی تعلیم کے اعتبار سے صرف ساتویں جماعت تک اسکول میں پڑھا۔ بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا جس نے تعلیم بھی چھڑا دی۔ بچہ بظاہر ہونہار معلوم ہوتا تھا مگر پڑھنے لکھنے کے معاملے میں بدشوق نکلا۔ شوخیٔ طبع اور ذہانت کی وجہ سے گھرانہ کو حفیظ سے بڑی توقعات تھیں جس کا ذکر اس نے شاہنامہ اسلام

میں بایں الفاظ کیا ہے ؎

زمانہ کو تمنا تھی کہ تھیں دنیا کی بہ سندی کی
کہ اس طفلی میں ایک تہمت تھی مجھ پر ہوشمندی کی

سات برس کی عمر میں حفیظ نے ایک نظم لکھی جس کے دو اشعار اب تک اس کو یاد ہیں انکو اشعار کہا جائے یا تک بندی اس کا فیصلہ ہم آگے چل کر کریں گے مگر یہ دو اشعار اس کے ذوقِ شعر کی نشان دہی ضرور کرتے ہیں ؎

محمدؐ کی کشتی میں ہوں گا سوار | تو لگ جائے گا میرا بیڑا بھی پار
محمد حفیظ نے بنائی غزل | ہے اس وقت اس پر خدا کا فضل

جس گھرانہ میں حفیظ پیدا ہوا اس کا ماحول مذہبی تھا۔ پنجاب کے مسلمانوں میں مذہب کا ذوق ہمیشہ سے راسخ چلا آیا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے صوبجات میں بسنے والے مسلمان دینی اعتبار سے ہمیشہ پنجاب سے پیچھے رہے۔ اس صوبہ کی سارہ زندگی میں اسلامی تہذیب کا چراغ بڑی آب و تاب کے ساتھ جلتا رہا۔ آج بھی مذہبی اعتبار سے پنجاب کے لوگ اسلامی زندگی سے دوسروں کی نسبت زیادہ قریب ہیں۔ لاہور اور لائل پور کی اکثر مساجد نمازیوں سے بھرپور ملتی ہیں برخلاف اس کے کراچی اور حیدر آباد میں مسجدیں نمازیوں کو یاد کرتی رہتی ہیں۔ اسی ماحول کا تقاضا تھا جس نے حفیظ سے شاہنامہ اسلام سی لافانی نظم لکھائی اور اس کی پیشانی سرکار دوعالم کی بارگاہ میں جھکا دی۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں حفیظ نے ساتویں جماعت کا امتحان دے کر اسکول کو خیرآباد کہا اور پھر مڑ کر ادھر کا رخ نہ کیا والدین نے ہزار کوشش کی کہ لڑکا اسکول کی طرف رخ کرے مگر ادبی آوارگی " کا جو طوفان امڈا تھا اس کو نہ اترنا تھا نہ اترا اور آخر مایوس ہو کر گھر والوں نے ایک ہونہار بچہ سے قطع نظر کر لیا۔ باپ کی بہ نسبت ماں اولاد سے زیادہ مانوس ہوتی ہے اور آسانی سے قطع نظر نہیں کر سکتی۔ والدہ نے اپنا چاؤ پورا کرنے کے لئے یا حفیظ کو سیدھے راستے پر لانے کے لئے اس کی شادی کر کا ذمہ داری کا بوجھ پڑا تو حفیظ کو کمانے کی سوجھی۔ علم و ہنر سے معرا شخص جب دنیا کی منڈی میں نکلتا ہے تو اس کے خریدار بہت کم ہوتے ہیں۔ کم علمی کی وجہ سے اس نو آموز شاعر کا کوئی خریدار نہ نکلا اور وہ دھر ادھر ادھر پریشان پھرتا رہا۔

سنہ ۱۷ء میں پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے جالندھر میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں دو انعامات رکھے گئے تھے ایک انعام بہترین غزل پر اور ایک بہترین نظم پر۔ حفیظ کی عمر اس وقت سترہ سال تھی۔ اس نے دونوں انعامات حاصل کر لئے۔ اس کامیابی پر احباب حفیظ کے والد کو مبارک باد دینے گئے تو بظاہر ان کے چہرے کو خوشی سے بشاش پایا مگر دل میں وہ اپنے بیٹے کی اس کامیابی سے اتنے خوش نہ تھے جتنا اس کی ناکارگی سے کبیدہ تھے۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں مولانا غلام قادر گرامی حیدر آباد دکن سے وظیفہ لے کر اپنے وطن مالوف جالندھر آئے تو حفیظ نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور باضابطہ استادی شاگردی کا تعلق پیدا ہو گیا۔ مولانا گرامی فارسی کے کہنہ مشق شاعر تھے اور دربار آصف جاہی میں ملک الشعرا کی حیثیت سے سرفراز رہ چکے تھے ہر چند کہ اردو شاعری سے انہیں لگاؤ نہ تھا مگر فنی تربیت میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

ان کے زیر سایہ حفیظ کی شاعری کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں ہمارے نوجوان شاعر نے جالندھر سے ایک اردو رسالہ جاری کیا جس کا نام " اعجاز " تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب حفیظ کے مالی حالات بھی خراب تھے اور گھر والوں کا تعاون بھی حاصل نہ تھا۔ یہی خامیاں راہ میں حائل ہوئیں اور رسالہ چار پانچ ماہ سانس لے کر چل بسا۔ گھر والوں کا عتاب حق بجانب تھا۔ تعلیم چھوڑی۔ ادبی آوارگی اختیار کی اور مالی نقصان کو دعوت دی۔ کونسی خطا کاری تھی جو حفیظ بے نوا سے سرزد نہ ہوئی ہو۔ والد نے گھر سے نکال دیا۔ ایک عدد بیوی اور ایک عدد بچی کو ساتھ لے کر گھر سے نکلا تو شاعر بے بدل پر دنیا تنگ تھی۔ کہاں جائے۔ اور کس کو پکارے۔ لاہور میں سسرال تھی۔ تین جانوں کا یہ بے سر و سامان قافلہ لاہور پہنچا اور حفیظ بیوی بچی کو سسرال میں چھوڑ کر رہنے کشمیر ہوا مگر وہ جہاں گیا ناکامی اس کے ساتھ گئی۔ سفر کشمیر بھی بیکار گیا واپسی پر لاہور آ کر رسالہ " شباب اردو " کے ادارے سے منسلک

ہوگیا۔ سنہ ۲۲ء سے سنہ ۲۹ء تک حفیظ کا بیشتر وقت لاہور میں گزرا۔ صحافت پیشہ تھا اور شعر و سخن مشغلہ۔ نونہال، ہزار داستان، تہذیب نسواں، پھول، ہدایت اسلام، اخبار اور مخزن کا ایڈیٹر رہا۔ صحافت کی دنیا آج بھی مایوس کن ہے اور اس زمانہ میں بھی حوصلہ آزما تھی۔ ناداری سے تنگ آکر اس دوران میں کچھ عرصہ کے لئے خیرپور، سندھ میں وقت گزارا جہاں وہ نواب صاحب خیرپور کا درباری شاعر مقرر ہوگیا تھا لیکن ایک دیسی ریاست کی درباداری ۔۔ پیدائشی شاعر کو کیا راس آتی۔ کچھ دن بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا اور حفیظ پھر لاہور آگیا۔ قیام خیرپور کی یاد اس شہرۂ آفاق نظم کی صورت میں باقی رہ گئی ہے جس کا نام ہے "رقاصہ"۔ اس نظم پر آپ آگے چل کر تنقید ملاحظہ فرمائیں گے۔ ابھی ہم حفیظ کے سوانح زندگی کے میدانوں سے گزر رہے ہیں لاہور واپس آکر ہفتہ وار "کارزار" جاری کیا۔

سنہ ۱۹۲۷ء میں شاہنامہ اسلام لکھنا شروع جس کے ابتدائی اشعار مخزن میں بطور نمونہ شائع ہوئے جو اس زمانہ میں حفیظ کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اشعار کا چھپنا تھا کہ ہندوستان کے عرض و طول میں ایک شور مچ گیا اور حفیظ کی شہرت آسمان پر پہنچ گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جمعہ کا دن تھا کہ ڈاکیہ نے مخزن لاکر دیا۔ میں نے کھولا تو حفیظ کے شاہنامۂ اسلام کی تمہید نظر سے گزری۔ میں وہ اشعار پڑھ رہا تھا اور جھوم رہا تھا۔ جو احباب اس وقت موجود رہے وہ بار بار مجھ سے فرمائش کرتے تھے اور شاہنامہ کے اشعار سن سن کر سر دھنتے تھے۔ تاریخ اسلام کو منظوم کرنے کا خیال نہ جانے کیسے حفیظ کے ذہن میں ہوگا مگر جب اس طویل نظم کی تمہید عوام کے سامنے آئی تو معلوم ہوا کہ جالندھر کا ایک نوخیز شاعر بلا کی صلاحیت کا مالک ہے۔ ہر چند کہ تمہیدی اشعار میں بے انتہا انکسار سے کام لیا گیا تھا مگر کلام منہ سے بول رہا تھا کہ فردوسی کی روح نے اردو کے ایک بے بضاعت شاعر کے روپ میں دوبارہ جنم لیا ہے۔ شاہنامہ کی مقبولیت بڑھی اور چار طرف سے اس کی مانگ ہوئی تو حفیظ نے مخزن کی ادارت چھوڑ دی اور ماڈل ٹاؤن لاہور میں بیٹھ کر اس کام کو مکمل کرنا شروع کر دیا۔ پہلی جلد سنہ ۲۸ء میں شائع ہوئی۔ دوسری سنہ ۳۲ء میں۔ اسی سال حفیظ کے اشعار کا دوسرا مجموعہ سوز و ساز شائع ہوا۔ پہلا مجموعہ نغمہ زار کے نام سے سنہ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوچکا تھا۔ سوز و ساز پر پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی طرف سے حفیظ کو انعام ملا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اردو نظم پر گورنمنٹ کی طرف سے انعام دیا گیا۔

اب حفیظ کی شہرت ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل چکی تھی جگہ جگہ سے تمغات ملنے شروع ہوگئے تھے۔ سنہ ۳۵ء میں حکومت کی طرف سے "خان صاحب" کا خطاب ملا۔ نواب صاحب بھاولپور اپنے ساتھ حج کو لے گئے۔ ریاست ٹونک نے ملک الشعرا کا خطاب دیا۔ حیدرآباد سے "نواب حسان الملک بہادر" کا خطاب ملا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد صدر اعظم دولت آصفیہ نے خزانۂ شاہی سے تین سو روپے ماہوار وظیفہ جاری کیا ۱۹۳۸ء میں حفیظ کے مالی حالات بدل چکے تھے۔ اس کو قدرے سکون حاصل ہوچلا تھا۔ شاہنامہ کی تیسری جلد مکمل کرنے کے لئے اس کو سکون و یکسوئی کی تلاش تھی۔ ہندوستان میں آئے دن "شاعرانہ سفر" درپیش رہتے تھے۔ آج حیدرآباد ہے تو کل رامپور۔ آج علی گڑھ ہے تو کل بہاولپور کام کی فرصت بالکل نہ ملتی تھی۔ ہندوستان کا کوئی مشاعرہ بدوں حفیظ کے مکمل نہ سمجھا جاتا تھا۔ لکھنؤ اور دلی کے اہل زبان یوں تو پنجاب کی اردو دانی کا سکہ نہیں مانتے مگر حفیظ کا جادو تھا کہ پورے ہندوستان کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ سکون کی تلاش میں حفیظ نے انگلستان کا انتخاب کیا اور کچھ عرصہ کے لئے اپنا دیس چھوڑ کر مغربی فضاؤں میں نغمہ خوانی کرنے کے لئے معتکف ہوگیا۔ آٹھ ماہ وہاں قیام کرکے تیسری جلد مکمل کی مگر فرانس اور انگلستان میں بھی ہندوستانیوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ مشاعروں کے چکر نے وہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ حالات بدلے تو فردوسیٔ اسلام پر بھی مغربیت کا جادو چل گیا۔ یورپ سے واپسی پر ان کے حرم میں ایک یورپین خاتون بحیثیت زوجہ کے داخل ہوگئیں۔ اس خاتون نے انگریزی میں حفیظ کا تذکرہ لکھا جو سنہ ۴۲ء میں شائع ہوا۔ تذکرہ کا نام ہے:

"Hafiz, poet, son of India"

سنہ ۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی اور اسی سال شاہنامہ کی تیسری جلد شائع ہوئی۔ ساتھ ہی گیتوں کے مجموعے بھی شائع ہوئے جن میں سے

اکثر بچوں کے لئے لکھے گئے ہیں، پھول، بہار کے پھول، پھول مالا، ہندوستان ہمارا، حفیظ کے گیت اور نظمیں، یہ ان مجموعوں کے نام ہیں۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں حفیظ سرکاری ملازم ہو کر دہلی چلا گیا۔ تقریباً ساڑھے چار برس یہ ملازمت چلی سنہ ۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہوئی تو حفیظ کی خدمات کا اعتراف حکومت ہند نے "خان بہادر" کے خطاب سے کیا۔ جنگ ختم ہوتے ہی آزادیٔ ہند کی تحریک نے پھر سر اٹھایا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی رسّہ کشی شروع ہوئی۔ حفیظ نے لیگ کے جلسوں میں شرکت کرنا پسند کیا تو حکومت نے اسے ناپسند کیا کہ انگریزی دور میں حکومت ہند پر ہندوؤں کا غلبہ تھا۔ انگریز محض کنٹرول کرتے تھے۔ حکومت دراصل "ابنائے وطن" ہی کے ہاتھوں میں تھی۔ اس صورت حال سے دل برداشتہ ہو کر حفیظ نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اب دوبارہ لاہور کی محفلوں میں حفیظ کی شمع جگمگانے لگی۔ اسی زمانے میں اس نے کشمیر کا سفر کیا۔ یہاں بھی ایک معرکہ کارزار برپا تھا۔ شیخ عبداللہ عوام کے ہر دلعزیز لیڈر تھے اور ڈوگرہ حکومت ان کے اقتدار کو پسند نہ کرتی تھی۔ شیخ عبداللہ کے جلسوں میں حفیظ کی نظمیں آگ لگانے لگیں تو ڈوگرہ حکومت بہت گھبرائی۔ اول تو اس کا جادو اثر کلام پھر اس کا ترنم۔ جب نظم پڑھی جاتی تو معلوم ہوتا کہ اقتدار حکومت برف کے تودہ کی طرح گلا جا رہا ہے۔ کچھ ہی دن میں کشمیر کے بچہ بچہ کی زبان پر حفیظ کا نام جاری ہو گیا۔ اور اس کا سکہ کوچہ و بازار میں چلنے لگا۔ حکومت کا عتاب نازل ہوا اور حفیظ کو مع اہل و عیال ریاست بدر کر دیا گیا۔ مسلم لیگ نے خطابات کی واپسی کا مطالبہ کیا تو اس نے تمام خطابات واپس کر دیے۔

تقسیم ہند کے وقت حفیظ شملہ میں تھا اس کے گھر والے جالندھر میں تھے۔ قتل و غارت گری کا سیلاب آیا۔ جالندھر سے اس کا تباہ شدہ گھرانہ لاہور پہونچا حفیظ اس زمانہ میں شاہنامہ اسلام کی چوتھی جلد لکھ رہا تھا۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں یہ جلد لاہور سے شائع ہوئی۔ ساتھ ہی اس کا نیا مجموعۂ کلام "تلخابہ شیریں" کے نام سے شائع ہوا۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں حفیظ شملہ سے لاہور آیا۔ ۱۱ ستمبر کو لاہور پہونچا تو وہ بالکل ایک درماندہ انسان تھا۔ کیونکہ راستے میں ابنائے وطن کی جو ستم کاریاں وہ دیکھتا ہوا آیا تھا ان کا ایک گہرا نقش اس کے ذہن پر مرتسم ہو چکا تھا۔

پاکستان آ کر کچھ دن لاہور میں قیام کیا۔ پھر آزاد کشمیر کی تحریک کا رضاکار بن گیا۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں پاکستانی فوج کی دعوت پر فوجی شاعر کے فرائض اس کے سپرد کئے گئے تو ان کو پوری دیانت داری کے ساتھ ادا کرنا شروع کیا۔ اس وقت بھی حفیظ حکومت پاکستان کے کسی نشری محکمہ سے متعلق ہے۔

نظم کے علاوہ حفیظ نے نثر کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے افسانوں کا ایک مجموعہ "ہفت پیکر" کے نام سے چھپا ہے مگر نثر اس کا میدان نہ تھا۔ وہ ایک پیدائشی شاعر ہے اور قدرت نے اس کو شعر گوئی کے لئے مخصوص کر کے بھیجا تھا اس لئے نثر کے میدان میں وہ زیادہ دیر نہیں رکا اور ایک جھلک دکھا کر چلا گیا آئیے اب ہم حفیظ کے صحن شاعری میں چلیں جہاں روش روش پر فنی رعنائیاں اور ادبی دل طرازیاں بکھری پڑی ہیں۔

روانی تو شاعری کی جان ہے جس کے بغیر شعریت پیدا ہی نہیں ہوتی مگر ندرت ہر شاعر کا حصہ نہیں ہے۔ عام طور پر لوگ پرانے ڈگر کے عادی ہوتے ہیں جو ذخیرہ پہلے آ چکے ہیں اسی کو الٹ پلٹ کر کے دینا شعر کی مقبولیت کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ کلام صرف الفاظ کی ترکیب اور بندش بدل جاتی ہے مضمون وہی رہتا ہے لیکن فطرت بعض فنکاروں کو ندرت کا جوہر خاص عطا فرماتی ہے اور یہی صفت ان کو دوسروں سے ممتاز کر دیتی ہے۔ حفیظ نے جس دور میں نغمہ سرائی شروع کی وہ حسن و عشق کا دور تھا۔ جور و تواں بھی مقرر اور معین تھے۔ آہ و بکا ہی کا نام شاعری تھا۔ آزاد، حالی اور شبلی نے اگرچہ اس پرانے سانچے کو توڑنے کی کوشش کی مگر یہ مساعی نفوذ پذیر ہوئی تھیں کہ حفیظ کا دور آ گیا عام طور پر مشاعرے، مجالس عزا کی حیثیت رکھتے تھے۔ اول اول حفیظ نے بھی انہی جور و تواں میں طبع آزمائی فرمائی جن پر پرانے بزرگ چلتے آئے تھے مگر قدرت نے اس کو ندرت کی صفت خاص سے نوازا تھا جس کے آثار اول کار ہی میں محسوس ہونے لگے۔

صبح کی آمد ایک بہت ہی فرسودہ مضمون ہے جس پر مختلف شعرا کے اشعار لکھیے جائیں تو ایک مکمل دیوان بن جائے مگر حفیظ کی نگاہ اس مضمون پر پڑی تو اس نے اپنے مزاج کے مطابق وہ گل کاری کی کہ عقل حیران و ششدر ہے اس کی دقت نگاہ، قوت مشاہدہ اور شاعرانہ بلیغ نظری کا اندازہ اس کے ہی الفاظ سے ہو سکتا ہے۔ نقاد اگر پوری کتاب بھی لکھ ڈالے تو پڑھنے والوں کو وہ لطف نہ آ سکے گا جو خود حفیظ کے بیان سے حاصل ہوگا

بجز کے عنوان سے لکھتا ہے :

تمام ملک پست پر　　　　بلند اور پست پر
تسلط جمود حیات پر
بساط کائنات پر

نمو نہیں ، دبے چلن　　　　سکوت حکمران ہے
فسون مرگ ، سحر زن　　　　حیات بے نشان ہے
وہ جوشش زندگی نہیں
ہنسی نہیں خوشی نہیں

وجود بے وجود ہے　　　　نمود بے نمود ہے
تمام ملک پست پر
بلند اور پست پر

اس نظم کے چودہ بند ہیں ۔ ہر بند میں نیا منظر پیش نظر ہے ۔ مگر شاعر کا کلام دسویں بند میں معراج پر ہے ۔ لکھتا ہے :

نسیم سر سرا گئی　　　　چمن میں گل کھلا گئی
کلی کو گدگدا گئی
تو پھول کو ہنسا گئی

طرب کے سیل نور سے　　　　جہان کی نیند ڈھل گئی
حیات کے وفور سے　　　　خوشی کی آنکھ کھل گئی
گلوں کی نکہتیں اٹھیں
ہوا کے دوش پر چلیں
پڑی جو مہر کی نظر　　　　تو اوس بن گئی گہر
نسیم سر سرا گئی
چمن میں گل کھلا گئی

حفیظ یا شعر وہی شعر ہے جو منہ چوم لیتی ہے اور رہتی دنیا تک جسے یاد رکھتے ہیں ۔ حیات کے وفور سے جس طرح خوشی کی آنکھ کھلی ہے شاید کسی دوسرے کو یہ اندر تہ سوجھا ہوگا ۔ تیری بلند پروازی ندرت ، دقت نگاہ اور حسن بیان پر صرف یہی ایک مصرعہ سند ہے

حیات کے وفور سے خوشی کی آنکھ کھل گئی ـــ

یہ نظم یاد رہے حفیظ نے سنہ ۱۹۲۴ء میں لکھی تھی جب اقبال کے نغمات سے پورا ہندوستان گونج رہا تھا ۔ اردو خواں دنیا نے جب اقبال کا کلام سنا تو شوکت بیان ، درمعنویت سے دل و دماغ مرعوب ہو گئے ۔ ایسے ماحول میں نوآموز حفیظ کا یہ نغمہ رندانہ دلوں میں گھر کر گیا تو محض اپنی سادگی ، بیساختگی اور ندرت کی وجہ سے ورنہ معنی کے لحاظ سے الفاظ میں نہ کوئی فلسفہ ہے نہ عمیق نکتہ ۔ بات بہت سادہ سی ہے مگر طرز ادا نے مضمون کو چار چاند لگا دیے ہیں

پنڈت ہری چند اختر حفیظ کے بہت پرانے اور مخلص دوست ہیں جو خود بھی بہت بڑے باکمال شاعر و ادیب ہیں۔ سوز و ساز کے دیباچہ میں پنڈت جی نے جہاں حفیظ کی تعریف و توصیف کی ہے وہاں ایک نئے عنوان پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ لکھتے ہیں کہ مجموعی قوانی کے معاملے میں اردو شعراء آج تک کسی حد تک شعرائے ایران کے پیرو ہیں۔ اور یہی حال تلمیحات کا ہے۔ اردو شعراء گو اس دیس (ہندوستان) کی بحروں میں گو یہ پسند ہے نہ یہاں کے مقامات میں سے کوئی مقام۔ یہ ایک ذہنی غلامی کی علامت ہے کہ انسان کو اپنے وطن میں تو کوئی رنگینی و رعنائی نظر نہ آئے۔ پردیس کی ہر چیز دلربا معلوم ہو۔ حسن کی تلاش ہو تو رخ لیلیٰ میں نظر آئے۔ مقام طرب کی جستجو ہو تو رکن آباد و مصلیٰ کو ڈھونڈا جائے۔ اور کے اپنے دیس میں نہ کوئی حسینہ ہو نہ کوئی مقام دلفریب ہو نہ وہاں کے لوگ حسن و عشق کے علاوہ زندگی کے کسی اور جذبے سے متاثر ہوتے ہوں۔ پنڈت جی کی یہ تنقید غلط ہے یا صحیح اس کا فیصلہ تو پڑھنے والے خود کریں مگر اتنی بات ضرور وزنی معلوم ہوتی ہے کہ رسم قدیم کی کورانہ تقلید فن کو زندگی سے محروم کر کے ایک بے جان ڈھانچہ بنا دیتی ہے۔ رسم و رواج پر قصر تخانے اٹھانا آسان ہے اس لئے کہ معمار کو محنت نہیں کرنی پڑتی اور [illegible] اکثر معمار اسی کے عادی ہوتے ہیں کہ پرانی بنیادوں پر نئی دیواریں کھڑی کر کے اپنی فن کاری کے جھنڈے بلند کر دیں۔ ایران کے اس کورانہ تتبع سے منہ موڑ کر اپنی نئی راہ پیدا کرنے والوں میں حفیظ پہلا شاعر ہے جس نے نظم میں اپنے دیس کا مقامی رنگ بھرا۔ برسات سب سے پہلی نظم ہے جس میں ہم خالص دیسی رنگ ملتا ہے اس نظم سے اردو دان دنیا کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ ہندوستان میں بھی برسات آتی ہے اور اپنے جلو میں نشاط اور انبساط کا ایک طوفان لاتی ہے پھر اس نظم کی لے بھی نئی ہے جو عوام سے بہت قریب ہے۔

آئی ہے برسات

چھائی ہے برسات

کوہ و دمن پر　　　دشت و چمن پر

شہر اور بن پر

دوشیزہ جوبن　　　سب بے ساختہ پن

رنگین جوانی　　　[illegible]

گل پوش جلوے　　　مدہوش نغمے

دلکش فضائیں　　　ٹھنڈی ہوائیں

اودی گھٹائیں　　　لائی ہے برسات

آئی ہے برسات

چھائی ہے برسات

اس نظم کے چوتھے بند میں حفیظ نے ہندوستانی دیہات کا بڑا دلکش نقشہ کھینچا ہے (میں جب ہندوستان لکھتا ہوں تو میری مراد ہند و پاکستان سے ہوتی ہے) پڑھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ واقعی برسات کے موسم میں کسی باغ کی سیر کر رہا ہے جہاں آموں میں جھولے پڑے ہیں اور خوبانِ ہندی دادِ عیش دے رہی ہیں۔ کہتا ہے ؎

خوبانِ ہندی　　　حورانِ ارضی

شمعیں گھروں کی

نازک دوپٹے　　　رنگین ہلکے

شانوں پہ ڈالے　　　سر پر سنبھالے

مینہ لاکھ برسے　　　جی اکھ ترسے

بعض جگہ بازاری پھبتی تک پہنچ جاتی ہے۔ اساتذہ کا احترام کرتے ہوئے بھی یہ کہنا غالباً کچھ غیر واقعی نہ ہوگا کہ شیخ و ساقی کے گرد سوقیانہ مضامین کا جو انبار لگایا گیا ہے وہ کبھی کبھی طبع لطیف پر گراں گزرنے لگتا ہے۔ بات جب طنز سے اتر کر پھبتی اور گالی تک آ جائے تو اس میں لطافت باقی نہیں رہتی۔ پھر اس عنوان کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ شیخ ناصح، واعظ، وغیرہ کے الفاظ میں جو تلمیحات مضمر ہیں ان میں ایرانی رنگ غالب ہے۔ حفیظ کے دیس میں عمر خیام والا ساقی نہ کبھی وجود میں آیا نہ مے نوشی کی معروف محفلیں یہاں کبھی گرم ہوتی ہیں۔ تاریخ ہند کے کسی دور میں بھی محتسب اور قاضی کبھی اس کار خاص میں منہمک دکھائی نہیں دیتے کہ محلہ در محلہ جائیں اور بادہ نوشوں کی محفلوں پر چھاپے ماریں۔ چونکہ اردو شاعری میں یہ مضمون تواتر کے ساتھ بار پاچکا ہے اس لئے حفیظ کے لئے اس سے بالکل دامن بچا لینا تو ممکن نہ تھا لیکن یہ ضرور ممکن تھا کہ مضمون کی فرسودگی میں وہ اپنے مزاج فن کے اعتبار سے ندرت اور شگفتگی پیدا کر دے چنانچہ "پیئے جا" والی نظم میں حفیظ نے جس لطافت سے اس طنز کو نبھایا ہے وہ اس کی ذہنی استعداد اور شاعرانہ بالغ نظری کی دلیل روشن ہے۔ لکھتا ہے ؎

شراب خانہ ہے بزم ہستی		ہر ایک ہے محو عیش مستی
مآل بینی و مے پرستی		ارے یہ ذلت ارے یہ پستی

شعار رندانہ کیے جا

خیال روز حساب کیسا؟		ثواب کیسا؟ عذاب کیسا؟
بہشت و دوزخ کے یہ فسانے		خدا کی باتیں خدا ہی جانے

فضول سوچا نہ کیجئے جا

یہ تجھ پہ آوازے کسنے والے		تمام ہیں میرے دیکھے بھالے
نہیں مذاق ان کو میکشی کا		یہ خون پیتے ہیں آدمی کا

تو ان کا شکوہ نہ کیجئے جا

حفیظ کی صلاحیتوں کا اندازہ کرتے ہوئے یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ نظم سنہ ۱۹۲۲ء میں لکھی گئی تھی جب وہ مشق سخن کی منازل سے گزر رہا تھا۔ نقش نگاری جس کو اصطلاحی زبان میں محاکات کہا جاتا ہے ابتدا سے حفیظ کا طرۂ امتیاز ہے وہ جب کسی کیفیت یا منظر کو بیان کرنا چاہتا ہے تو بیان کی سادگی اور بیساختگی کی وجہ سے دلوں میں گھر کرتا چلا جاتا ہے۔ کیفیت بیان کرتا ہے تو سننے والے پر وہی کیفیت طاری کر دیتا ہے منظر پیش کرتا ہے تو الفاظ کے ذریعے نقشہ کھینچ کر رکھ دیتا ہے اور یہی شعر کا کمال ہے۔ بات بہت معمولی ہوتی ہے مگر حفیظ کی فنکاری اس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ تاروں بھری رات کے چوتھے پہر کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ محتاج داد و توصیف نہیں۔ لکھتا ہے ؎

دل کش نظارے		شب زاد سارے
ندی کی تہ میں		رقصاں ہیں تارے
گاتی ہیں لہریں		گیت ایسے پیارے
چپ دم بخود ہیں		دونوں کنارے
ہر سمت سبزا		سرمست صہبا
نیتا ہے نیلا		پاؤں پسارے
یہ سرسراہٹ		سرگوشیوں کی
یہ کام آہٹ		خاموشیوں کی

ندی کا پانی محو روانی

پلٹا مچلتا — پہلو بدلتا
بہتا بہاتا — کچھ گنگناتا
تاروں کا دفتر — سینہ کے اندر

رہ رو زمین پر

ضو آسمانی — ندی کا پانی

شب زاد نظارے اور سبزہ کا پاؤں پسار کر لیٹنا دونوں حفیظ کے طبع زاد سکے ہیں جن پر اس کی اقلیم سخن کی مہر ثبت ہے۔ الفاظ کی بندش اور ترکیبوں کا انوکھا پن مست دل رہا ہے۔ محاکات کے اعتبار سے شاہنامہ اسلام میں بھی بعض بعض جگہ حفیظ کے قلم نے گل کاریاں کی ہیں حالانکہ اس میدان میں ان نے اپنے سمند طبع کی تیزی کی لگام پہنا رکھی ہے۔ خود کہتا ہے ؎

تخیل پر نہیں بنیاد میرے شاہنامے کی — صداقت کی طرف جاتی ہے راہ راست خامہ کی
کہیں جائز نہیں اس تذکرہ میں رنگ آمیزی — گنہ ہے ان زمینوں پر سمند طبع کی تیزی

پھر بھی وہ ایک شاعر ہے۔ جب طبیعت جولانی پر آتی تو روکے نہیں رکتی۔ شاہنامے کی پہلی جلد میں لکھتا ہے کہ ایک روز میں لاہور میں گھوما پھرا قطب الدین ایبک کے مزار پر بیٹھا تھا اور اپنے کام کی مشکلات کو سوچ رہا تھا۔ قطب الدین ایبک کے مزار کا نقشہ اس نے کس طرح پیش کیا ہے خود انہیں کی زبان سے سنئے ؎

یہ تربت ہاشمی ہے ان حجازی شہسواروں کی — مسلمانوں نے جن سے زندگی پائی جن کے مزاروں کی
یہاں تک ابر باراں کی رسائی ہو نہیں سکتی — گھٹا روتی ہوئی آتی ہے لیکن رو نہیں سکتی
شعاعوں سے یہاں تک خورشید دامن بھر نہیں سکتا — فلک اس پر ستاروں کو نچھاور کر نہیں سکتا
یہ تربت چادر مہتاب سے محروم رہتی ہے — نگاہوں سے چھپی رہتی ہے نامعلوم رہتی ہے
ادھر لاہور کی دنیا کا ایمان سوز نظارہ — جہاں تہذیب نو پھرتی ہے بازاروں میں آوارہ
ادھر ایک تربت خاموش کا اندوہ گیں منظر — الم انگیز، حسرت خیز، عبرت آفریں منظر
نہیں ہے چار گز ٹکڑا زمیں کا جس کی قسمت میں — یہ تربت آسماں رفعت ہے میری چشم عبرت میں

جن احباب نے لاہور میں قطب الدین ایبک کا مزار دیکھا ہے اور انارکلی مال روڈ دیکھنے کا شرف حاصل کیا ہے وہ ان اشعار کی حقیقی روح تک پہنچ سکتے ہیں اور اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک تاریک گلی میں واقع اس مزار کی عبرت نائی کا اس سے بہتر نقشہ شاید ہی الفاظ میں کھینچا جا سکے۔

گفتگو بندش الفاظ اور محاکات پر ہو رہی ہے جس کی سند میں تاروں بھری رات اور شاہنامہ کے چند اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ اسی نظم کے پانچویں بند میں کہتا ہے ؎

ہر ایک وادی — گلزار نزادی
ہر چشمہ جھیلی — ضو ریز قندیل
ہر سنگ بے طور — ہر قریہ بے دور

نور علی نور

شاعر کے جذبات — تاروں بھری رات

وہ خرابِ لذتِ عشق ہوں [illegible]

سوزِ سخن سے آگ لگا دوں بہار میں

جوں جوں وقت گزرتا گیا حفیظ کی طبیعت رفتہ رفتہ غزل سے کنارہ کر کے نظم کی طرف متوجہ ہوتی گئی لیکن غزل کا دامن اس نے کلیتہً کبھی نہ چھوڑا۔ آج بھی بعض مشاعروں میں فرمائش ہوتی ہے تو حفیظ ایک آدھ غزل بھی سنا دیتا ہے لیکن جو مقام دنیائے شعر و ادب میں شاہنامہ اسلام کو یہیں حاصل ہوا اور اس کی دیگر نظموں کو حاصل ہوا وہ غزل کو حاصل نہ ہو سکا۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں [illegible] نمائش میں مشاعرہ تھا مولانا احسن مارہروی مرحوم صدارت کر رہے تھے۔ سردی کا موسم، آدھی رات [illegible] کہ مولانا نے حفیظ سے غزل سنانے کو کہا۔ مجمع [illegible] تھا بیان سے باہر ہے۔ سامعین ہمہ تن شوق تھے کہ اس نے غزل شروع کی۔ مصرع طرح تھا یہ ہماری زبان ہے پیارے حفیظ نے [illegible] کو خوب [illegible] کر کے سنائی ہے

جنگ چھڑ جائے ہم اگر کہہ دیں

یہ ہماری زبان ہے پیارے

اس [illegible] مشاعرہ میں یہ چیلنج اہل زبان کے لئے کتنا بھاری ہوگا مگر آنکھوں نے دیکھا اور تصور [illegible] میں آج تک محفوظ ہے [illegible] تکرار ہو کر حفیظ سے چمٹ گئے اور چاروں طرف سے واہ واہ [illegible] کی صدائیں بلند ہوئیں۔ مولانا احسن بار بار [illegible] کرتے تھے اور سنتے تھے۔ حفیظ [illegible] حفیظ کا بیان، مولانا کی تحسین اور [illegible] ہے

جنگ چھڑ جائے ہم اگر کہہ دیں

یہ ہماری زبان ہے پیارے

دوسری غزل [illegible] سنانے پر تیار ہوا تھا مگر مجمع کے اصرار پر ایک غزل اور سنائی جس کا ایک شعر آج تک راقم الحروف کے کانوں میں گونج رہا ہے —

دکھ درد کی برکھا بندے — دین ہے تیرے داتا کی

شکرِ نعمت بھی کرتا جا — دامن بھی پھیلاتا جا

"— کتاب ایک زندہ آواز ہے جو روئے زمین پر چکر لگاتی ہے یہ ایک ایسے شخص کا زندہ خیال بنی رہتی ہے جو ہمارے ملک ہماری ملت اور ہمارے وقت سے خارج ہو چکا ہے — انسانی خیال ہی ہے جو پائندہ ہے۔ خیال ہی ہے جو پیچھے رہ جاتا ہے جسے فنا نہیں۔ سقراط اور افلاطون کیا ہوئے۔ غزالی اور سعدی کہاں ہیں۔ ان کی مٹی، مٹی میں مل گئی۔ لیکن وہ زندہ ہیں پائندہ ہیں — اپنی تمام نیکیوں اور شرافتوں کے ساتھ زندہ ہیں۔ اس لئے کہ ان کے خیالات — ان کی تصانیف زندہ و پائندہ ہیں —"

(حفیظ)

ڈائمنڈ سلک ملز لمیٹڈ۔ کراچی
کے
تیار کردہ مشہور پارچہ جات
ساٹن
لیڈی ہملٹن
پیلیس جارجٹ
بروکیڈس
نائلون وغیرہ
شہر کے ہر دوکاندار سے خرید کیجئے
ڈائمنڈ سلک ملز لمیٹڈ۔ کراچی
آفس:
۳۱۹/۲ کیمبل اسٹریٹ، کراچی
فون: ۳۲۷۷۸
فیکٹری
اے/۲۸۔ ایس۔ آئی۔ ٹی۔ ای۔ کراچی
فون: ۷۰۹۰۵۴

جسم کو پھولوں
کی طرح سُبک
اور مُعطّر رکھئے!
TIBET
TALCUM POWDER
KOHINOOR CHEMICAL CO. KARACHI
تبّت ٹالکم پاوڈر
شادابی و شگفتگی کے لئے
غُسل کی تازگی کو دن بھر قائم رکھنے کے لئے تبت
کے نفیس ولطیف ٹالکم پاوڈر استعمال کیجئے۔
یہ جلد کو تپش اور پسینے کے اثرات سے
محفوظ رکھتے ہیں اور بدن انکی بھینی بھینی خوشبو میں بسا رہتا ہے۔
کوہِ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ۔
کراچی ۔ ڈھاکہ
TTP 9/312
united
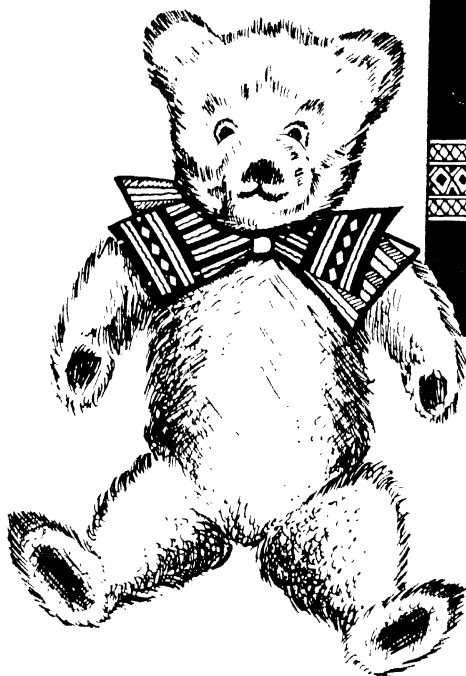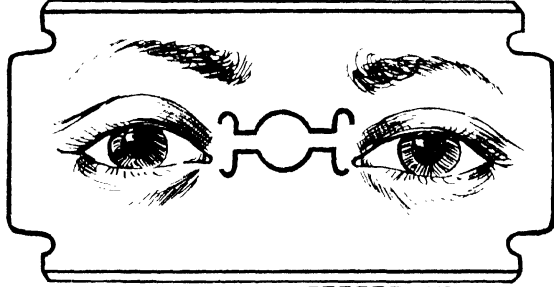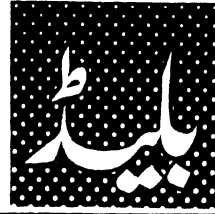
بلیڈ کی نظر
اُن پر ہے جو
آسان اور رواں
شیو پسند کرتے ہیں!
مشرقی پاکستان کا واحد بلیڈ
کلفٹن
کبھی تکلیف نہیں دیتا!
ANTISEPTIC
LIFTON
BLADE
BEST SHAVING BLADE
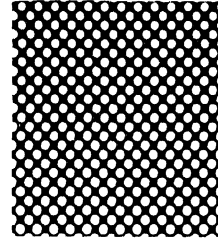
اچھا ادب اگر آپ کی ذہنی نشو و نما میں اضافہ کرتا ہے ....
تو
اچھی غذا آپ کی صحت کی نشو و نما میں اضافہ کا باعث ہوتی ہے ۔
اور اسی لئے اچھے لوگ ہمیشہ
B.P
کی تیار کردہ اشیا پسند کرتے ہیں ۔
کیونکہ
وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں
کہ
B.P کی ڈبل روٹی ۔ فروٹ بن ۔ شیرمال
B.P بسکٹ ___ اور ___ مٹھائیاں
خوش ذائقہ ہونے کے ساتھ ساتھ
نفاست اور حفظانِ صحت کے اصولوں پر
خود کار مشینوں کے ذریعہ تیار کی جاتی ہیں ۔
اس کے علاوہ
ہر قسم کی خوشی کی تقریبات میں بی ۔ پی کی مٹھائیوں کی بمعہ نام وغیرہ کے اسپیشل
پیک کی ہوئی تھیلیاں آپ فخر سے مہمانوں کو پیش کر سکتے ہیں ۔
بی پی بسکٹ فیکٹری ۔ لارنس روڈ ۔ کراچی
BP Sweets

نذرانے

"حفیظ نمبر" کے سلسلے میں موصول شدہ پیغامات اور تاثرات کے علاوہ ذیل میں چند گراں مایہ شخصیتوں کے وہ پیغامات بھی پیش کئے جا رہے ہیں جو حفیظ کے جشن پنجاہ سالگی پر حفیظ کو لاڑن جوبلی کمیٹی راولپنڈی کو ۵۰ء میں موصول ہوئے تھے۔ جوبلی کمیٹی کے سرپرستوں اور عہدیداروں میں ملک کی سربرآوردہ شخصیتیں شامل تھیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صدر پاکستان (جو اُن دنوں میجر جنرل تھے)، شیخ دین محمد گورنر سندھ، میجر جنرل نواب زادہ آغا محمد رضا، میجر جنرل نذیر احمد، ہادی حسین کمشنر راولپنڈی، بریگیڈیر گلزار احمد صدر جوبلی کمیٹی، میجر سید ضمیر جعفری (جو ان دنوں کیپٹن تھے) سکرٹری جوبلی کمیٹی۔

جوبلی کمیٹی نے نہ صرف راولپنڈی میں حفیظ کے شایان شان جشن طلائی منایا، بلکہ کمیٹی کی تحریک پر ملک کے دوسرے حصوں اور بیرونی ملکوں میں بھی حفیظ کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔

ملک کے بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں نے حفیظ کی عہد آفریں خدمات کا جس کھلے دل سے اعتراف کیا اس کا ثبوت ذیل کے پیغامات سے مل سکتا ہے۔

یہ غیر مطبوعہ اور قیمتی تحریریں خوش قسمتی سے میجر سید ضمیر جعفری کے پاس محفوظ تھیں جو انہوں نے "حفیظ نمبر" کے لئے ہمیں عطا فرما دیں، اُن کے اس کرم بے پایاں کے لئے ہم سراپا شکر گزار ہیں۔ حفیظ نمبر میں شمولیت کے بعد یہ نادر و یادگار تحریریں یقیناً ہمیشہ محفوظ رہیں گی۔

ان پیغامات اور تاثرات کے علاوہ چند قابل ذکر اہل قلم کے نذرانے اور عذرانے بھی پیش کئے جا رہے ہیں"

صہبا

مولانا عبدالماجد دریابادی

۳۰ جون سنہ ۱۹۶۳ء

عزیزی صہبا صاحب لکھنوی

جوش نمبر کے بعد "حفیظ جالندھری نمبر" — آتش سیال ہو یہ دورِ مالعم کا اور شربتِ روح افزا کا! الحاد کو نشہ دینے کے بعد تحسین اور پیشوائی شہسوارِ اسلام کی! — حسن تبدیلی کا حسین و قابلِ دید نمونہ!

"شاہنامہ اسلام" کا مصنف اور "سربیڑا ملاح" کا خالق، آپ کے ملک میں اندھیرے گھر کا چراغ ہے۔ اکبر و اقبال دونوں کا سچا جانشین!

"شاعرِ اسلام" نمبر نکالنا، یقیناً خدمتِ شعر و ادب کے ساتھ خدمتِ دین و ملت بھی ہے۔ اور اس تہنیہ پر آپ دلی اور مخلصانہ مبارکباد کے مستحق۔

والسلام

عبدالماجد

پروفیسر سید احتشام حسین

University of Allahabad
Allahabad

17.8.1963

صہبا صاحب - افکار کا حفیظ نمبر نکالنا مبارک ہو!

جوش نمبر اور پھر کچھ ہی وقفہ کے بعد 'حفیظ نمبر' بہت خوب! حضرت
جوش ملیح آبادی کی طرح جناب حفیظ جالندھری بھی جدید اُردو شاعری کے
اُن معماروں میں سے ہیں جن کی خدمات کا سراہنا ہم سب کا فرض ہے۔
حفیظ پنجاب میں پیدا ہوئے جہاں زرخیزی تھی، زندہ دلی تھی، امنگ
تھی، لچکنے اور بہکنے کی فضا تھی، ماہیا اور ہیر کی نغمہ انگیزی تھی اور
بھانگڑے کی گرمی اور جوش۔ حفیظ نے اس جادو بھری سرزمین سے
شاعری کا رس پیا، نغمہ سرائی کی، جھومے اور اپنی آواز سے دوسروں کو
مست کرنے لگے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی زمانہ میں اُردو غزل کا بڑا حصہ
رسمی شاعری کا سہارا رہا اور اُردو نظم پر سرسید کی اصلاحی اور مقصدی
تحریک کا کچھ ایسا اثر تھا کہ اس میں بے رنگی اور خشکی پیدا ہو گئی تھی۔
اقبال کی روحانیت نے نئی راہ نکالی لیکن وہ دوسری طرف چلی گئی،
نوجوان شعراء کے ایک گروہ نے شاعری کے نئے افق تلاش کئے اور
بہتوں کو اُن پر چل لینے کی ترغیب دی۔ حفیظ بھی اسی کاروان میں

شریک تھے، کسی منزل پر راہی اور کسی پر رہبر — انھوں نے اردو شاعری کو تازگی بخشی، از سرِ نو اُسے قلبی واردات اور جوان جذبات سے آشنا کیا اور بندھی ٹکی راہوں پر چلتے رہنے سے بغاوت کی۔ یہ ایسی باتیں نہیں ہیں جن کو اُردو شاعری کا مورخ یا نقاد نظر انداز کر سکے۔

میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو انھیں صرف "شاہنامۂ اسلام" کا شاعر سمجھتے ہیں، ایسے لوگ بھی ملے ہیں جنھیں حفیظ کا نام صرف ایسی نظموں کے ساتھ یاد ہے جیسے "اپنے من میں پریت بسا لے"، "رقاصہ" اور "ابھی تو میں جوان ہوں"، کچھ اُن کے طرزِ شعر خوانی ہی کو اُن کا سب سے بڑا کمال قرار دیتے ہیں، کچھ اُن کی غزلوں میں جذبات کی عمومیت اور اظہار کی برجستگی پر فریفتہ ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ اور کچھ نہیں اگر صرف اِن تمام پسندیدگیوں ہی کو جمع کر دیا جائے تو کیا ان میں ایک بلند پایہ اور کامیاب شاعر کی بہت سی خوبیاں یکجا نہیں ہو جاتیں، ایسی خوبیاں جو

آمین زندہ رہیں گے !

مجھے یقین ہے کہ اس نمبر کے لئے آپ نے بہت سا
ایسا مواد اکٹھا کیا ہوگا جو میرے لئے بالکل نیا ہوگا اور میں اس سے
بہت کچھ حاصل کر سکوں گا۔
میں آپ کی ان تمام نیک خواہشوں میں شریک
ہوں جو اس نمبر کی ترتیب اور اشاعت کی محرک ہوئیں۔

سید احتشام حسین

پروفیسر آل احمد سرور

حفیظ صاحب کے متعلق مجھے ذاتی واقفیت زیادہ نہیں ہے صرف چند بار ملا ہوں۔ ہاں ان کا کلام پڑھا ہے اور اس کی قدر کرتا ہوں مگر ادھر ایسی مصروفیات ہیں کہ مضمون نہ لکھ سکوں گا۔ امید ہے کہ آپ میری معذرت قبول فرمائیں گے۔

شیخ سر عبدالقادر

حفیظ گولڈن جوبلی کمیٹی راولپنڈی نے قیام پر شیخ سر عبدالقادر مرحوم کی خدمت میں سرپرستی کی گذارش کی تو شیخ صاحب مرحوم نے ۱۵ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء کو ذیل کا مکتوب جواباً تحریر فرمایا۔ غالباً شیخ صاحب مرحوم کی یہ آخری تحریر ہے۔

مکرمی۔ السلام علیکم

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ ممنون ہوں یہ دیکھ کر کہ آپ میرے دوست حفیظ جالندھری صاحب کی پچاس سالہ جوبلی منانے کا اہتمام کر رہے ہیں، خوشی ہوئی۔ آپ چاہتے ہیں کہ میرا نام اس تحریک کے سرپرستوں میں لکھا جائے۔ میں بخوشی

اس عزت کو منظور کرتا ہوں۔ گو اس وقت میں کمزوریٔ صحت کے سبب سے ایسی حالت میں ہوں کہ کوئی عملی خدمت کرنے سے قاصر رہوں گا۔ مگر میری پوری ہمدردی آپ کی تحریک کے ساتھ ہے۔ اور اس کی ہر طرح سے کامیابی کے لئے دعا کرتا رہوں گا۔ حفیظ صاحب کی خدمات جو انہوں نے اردو اور ملک و ملت کے حق میں کی ہیں وہ نہایت قابلِ قدر ہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ پبلک اس میں آپ کا ساتھ دے گی۔ ان کی خدمت میں پبلک کی طرف سے تھیلی پیش کرنے کا خیال بھی بہت مناسب ہے۔

میں انشاء اللہ صحت بہتر ہوجانے پر کوئی تحریری پیغام بھی بھیجوں گا۔ حفیظ صاحب کو میری طرف سے سلام شوق کے ساتھ دلی دعا دیں کہ خدا ان کی عمر میں برکت دے۔ اور وہ شاہنامے کی پانچویں جلد تیار کر سکیں۔ اور مذہبی اور قومی ترقی کے لئے ساعی رہیں۔ اور ملک و قوم ان کی مساعی سے مستفید ہوتی رہے۔

مولانا نیاز فتحپوری

سرزمینِ پنجاب نے دو غیر فانی شاعر پیدا کئے۔ ایک اقبال دوسرا حفیظ۔ اقبال نے کہا ؎

خونے بہ جگر تبع کن و رنگ بروں آر

حفیظ کہتا ہے ؎

نظارہ کن زچاک کتاں ماہتاب را

دنیا نہ اُسے بھلا سکتی ہے نہ اِسے۔

جوش ملیح آبادی

مبارک باد

ہندوستان، اور نامِ خدا قدر کرے، وہ بھی شاعر کی، اور پھر اس حد تک کہ چشمِ بد دُور اس کی جوبلی بھی منائے کتنی عجیب بات، کس قدر بے حد نہایت عجیب بات۔ ؎

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
کہا حیرت سے اس نے یہ بھی ہوتا ہے زمانے میں

آج سے دس پانچ ہزار برس پیشتر ممکن ہے اس سرزمین پر کبھی اربابِ قلم کی بھی حقیقی عزت و قدر رہی ہو۔ لیکن اب تو ؎

پارینہ حدیثے ست، بہ تسلیم نہ ارزد
گویند کہ زیں پیش وفا ہم اثرے داشت

اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے دوست ابو الاثر حضرت حفیظ جالندھری کی جوبلی کو کیا کہوں۔ جادو؟ طلسم؟ سحر؟ خرقِ عادت یا کرامت؟ یہ تمام الفاظ اس جوبلی کی بوالعجبی کے سامنے اوچھے، ہلکے، سبک اور بے مایہ ہیں،

البتہ لغت میں ایک لفظ ہے جو اس جوبلی کی حیرت ناکی کے بار کو، بہ مشکل سہی، لیکن کسی قدر اٹھا سکتا ہے، اور وہ لفظ ہے "معجزہ"!

معجزات کا دور گذر چکا ہے۔ یہ مادّی بیسویں صدی افکار کی صدی ہے لیکن حفیظ صاحب قسمت مارہ کھنحال لے کر آئے ہیں کہ ان کی خاطر اس پیر زال مادہ پرست کی روحانی جوانی واپس آگئی ہے۔

ممکن ہے کوئی کہے کہ جوبلی تو پاکستان میں ہو رہی ہے۔ اور میں ہندوستان کا نام لے رہا ہوں۔ سو اس کے جواب میں یہ عرض ہے کہ خدائے عالم و عالیان کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں "وہ" نہیں ہوں، نہ بحمد اللہ کبھی بن ہی سکتا ہوں، جسے "مرد سیاست داں" کہا جاتا ہے۔ میں تو محض ایک سیدھا شاعر ہوں۔ بے جھجک میں نے اپنے آپ کو "شاعر" کہہ دیا۔ احتیاط کے خلاف ہے یہ امر، اس لئے کہ اس کا فیصلہ تو پانسو برس کے بعد ہوسکے گا کہ میں شاعر تھا یا محض تُک بند۔ تو احتیاط سے کام لے کر مجھے یہ کہنا چاہئے کہ میں تو صرف ایک شعر گو ہوں یعنی ایک ایسا "گدائے گوشہ نشیں" جسے "اُمورِ مملکت" سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اور خیریت بھی ہے میری اسی بات میں...... [1]

جب میں ہندوستان کہتا ہوں تو اس میں پاکستان، اور جب پاکستان کہتا ہوں تو اس میں ہندوستان کا مجموعی تصور کار فرما رہتا ہے۔

حفیظ صاحب کو ایک مدت دراز سے جانتا ہوں غالباً وہ مجھ سے ملنے کی خاطر سنہ ۲۱-۱۹۲۲ء میں جب ملیح آباد تشریف لائے تھے اس وقت سے جانتا ہوں ــــــ ہم ایک دوسرے سے سیکڑوں بار مل چکے ہیں، ہم ایک دوسرے سے حسن ظن بھی رکھ چکے ہیں اور سوءِ ظن بھی۔ ہم ایک دوسرے سے بار بار روٹھے اور بار بار منے ہیں۔ خود سے روٹھے ہیں اور خود سے منے ہیں۔ نوجوانی کی حماقتوں کا جزر و مد کوئی تفسیر نہیں چاہتا۔ لیکن اب جب کہ ہم دونوں خدا کے فضل یا قہر سے نوجوانی اور جوانی کی منزلوں سے آگے نکل آئے ہیں، اس وقت بھی شاید یہ صورت حال ہے کہ میں تو اب حفیظ صاحب سے روٹھا ہوا نہیں ہوں۔ لیکن حفیظ صاحب منے ہوئے بھی نہیں ہیں۔ میں بالغ ہو چکا ہوں۔ ان کے بلوغ میں ابھی غالباً ایک آنچ کی کسر ہے۔

خیر، دیر آید درست آید۔

یہ درست ہے کہ حفیظ صاحب کے اور میرے افکار و کردار میں شدید اختلاف ہے اور ہمارے فکری راستے اس قدر مختلف اور دور دور واقع ہوئے ہیں کہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی ہم ایک دوسرے کے قریب ہو کر نہیں گذرتے۔

---

[1] یہاں جوش صاحب نے چند سطور تقسیم ملک کے بارے میں لکھی ہیں۔ جن کا تعلق براہ راست حفیظ سے نہیں۔ پیامات کو سیاسی اختلافات کے معاملات سے الگ رکھنے کے لئے یہاں یہ سطور حذف کر دی گئی ہیں۔ انشاء اللہ بڑے مجموعے میں یہ سطور بجنسہٖ شائع کر دی جائیں گی۔　　　　(کمیٹی)

لیکن اس کے یہ معنی تو ہرگز نہیں ہو سکتے کہ میں حفیظ صاحب کے ادبی محامد و محاسن سے روگردانی کا ارتکاب کر بیٹھوں۔

ہم اربابِ ہند (یعنی ہند و پاکستان) میں یہ بڑا شرمناک عیب ہے کہ ہم اختلافات کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ایک رائی بھر اختلاف ہمیں پربت بھر مشتعل کر دیتا ہے۔ ہم انگاروں پر لوٹنے لگتے اور ایک دوسرے کی خوبیوں کو دفن کر کے اس کی خرابیوں کو کرید کر اور اُچھالنے لگتے ہیں۔ لیکن میرے اور حضرت حفیظ کے مابین جو ذہنی و عملی اختلافات ہیں اُن اختلافات کی بنیاد نہیں کہ وہ مجھے صراطِ مستقیم سے ہٹا کر حفیظ صاحب کے شاعرانہ جمال سے انکار کر دینے کی حماقت میں مبتلا کر دیں۔ حفیظ صاحب ایک ایسے شیریں مقال شاعر ہیں جو دلوں میں گھر کر چکے ہیں۔ ان کی شاعری صداقت، سلاست، صفائی، شگفتگی، روانی، رنگینی اور رعنائی کی لہروں سے بھیگی ہوئی ہے۔ ان کے رسیلے گیت فضا میں ساون کے بادلوں کی طرح جھوم رہے ہیں۔ اور ان کا دل نشیں و دلنواز ترنم ادب کی محراب میں وہ جھنکار پیدا کئے ہوئے ہے کہ زہرہ آسمان پر رقص کر رہی ہے۔

ہر چند میں ان کی جوبلی میں شریک نہیں ہوں، لیکن ع

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست

میری بہترین آرزوئیں اور بے نہایت مسرتیں اس تقریبِ سعید سے وابستہ ہیں۔ اور اگر میں دعا کا قائل ہوتا تو کہتا کہ اے خدائے ادب نواز حفیظ صاحب اتنا جئیں کہ اپنی ڈائمنڈ جوبلی بھی دیکھیں اور ڈائمنڈ جوبلی کے بعد بھی اس قدر جئیں جس قدر کوئی انسان جی سکتا ہے۔

تاجور نجیب آبادی
دیال سنگھ پبلک لائبریری
۲۵ نسبت روڈ لاہور

اقبال کے معجزانہ اندازِ فکر کی ہمہ گیر نقالی نے اردو شاعری کے ایک پورے قافلے کو صدقۂ راہ بنا دیا ہے۔ مگر حفیظ کی ادبی ذہانت اُسے مرگِ انبوہ کے اِس جشنِ عام سے بچا لے گئی۔

یقیناً حفیظ نے اپنے لئے نئی راہ اور نئی تابناک منزل پیدا کی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ پنجاب کے صحتمند "ترقی پسندوں" کا کارواں حفیظ کی شاعرانہ تجلیات کو نشانِ راہ بنا کر آگے بڑھ رہا ہے۔

تاجور

۱۶ر اپریل سنہ ۱۹۵

پروفیسر تلوک چند محروم

مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی کہ میرے عزیز دوست ابوالاثر حفیظ جالندھری کی گولڈن جوبلی منائی جا رہی ہے۔ کاش میں اس وقت راولپنڈی میں ہوتا۔ اور حفیظ صاحب کو اس مسرت افزا تقریب پر اپنی زبان سے ہدیۂ تبریک پیش کر سکتا۔ ان کی اس عزت افزائی پر میری غائبانہ خوشی اور دعا کو شامل سمجھئے۔ خدا کرے حفیظ صاحب دیر تک سلامت رہیں اور اپنی زندگی سے متعلق کئی جشن اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ میں حفیظ کی شاعری کا اس وقت سے مداح ہوں جب انہوں نے پہلی نظم اپنی خاص طرز میں لکھی اور اس پر رائے مجھ سے دریافت کی۔

کم و بیش تیس سال سے ان کی نظمیں نہایت شوق سے پڑھتا اور ان کی زبان سے سنتا آیا ہوں۔ اردو شاعری میں جو قیمتی اضافہ انہوں نے خداداد جدت طبع اور اپنی محنت سے کیا ہے وہ ادبی دنیا میں ہمیشہ ان کے نام کو زندہ رکھے گا

قطعہ

حفیظ خوش نوا بزم سخن میں
قیامت تک رہے گی یاد تیری
سرور جاں تیرے نغمات رنگیں
جہانِ دردِ غم فریاد تیری

"کیا پابند نے نالے کو تو نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد تیری"

حفیظ ہی — ایک دفعہ حفیظ صاحب نے انارکلی لاہور میں اپنا دفتر کھولا تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے تین اشعار کا ایک قطعہ موزوں ہو گیا جو دوستوں کی تفنن طبع کے لئے درج ذیل ہے:

دفتر جو بالا خانے میں دیکھا حفیظ کا
محرم سچ تو یہ ہے کہ دل شاد ہو گیا
رونق ہوئی انارکلی کی چہار چند
بازار سوز و ساز سے آباد ہو گیا
جن منزلوں سے حسن کبھی جلوہ ریز تھا
اب ان میں عشق مائلِ فریاد ہو گیا

ڈاکٹر تاثیر

برادر مکرم، تسلیمات
ایک خط نے کاروانِ حیات کی منظر کشی کر دی۔ وقت کا مجسمہ بنا دیا۔
نصف صدی گذر گئی۔
کیا کیا انقلابات ہوئے۔
مگر انسان کی سچی خوشی میں ترقی نہ ہوئی۔

ہاں حفیظ — بڑے اولوالعزم، بڑے خوش نصیب کہ ابھی تک سرگرم کار، جو کام شاہنامے سے شروع کیا تھا اسے جاری رکھ کر اب اپنی ملت کی مجاہدانہ تعمیر میں شامل۔

باقی رہی شخصی انفرادی حالت سو اس کا اندازہ تو آپ اپنے دل کی خوشی سے کر سکتے ہیں۔ اگر تکالیف کے باوجود خوش ہو تو شخصیت کی تربیت صحیح ہو رہی ہے۔ نہیں تو مراتع کو کم کرو۔ ثبوت چالیس سال سے پہلے نہیں بعد میں شروع ہوئی۔

ہو سکے تو مجھے کبھی کبھی صورت دکھا دیا کرو۔ "منہ اُدن توں بھانویں۔ بول نہ بول" تم "اکثر یاد کرتے ہو" کیوں کہتے ہو، اس کی وجہ تم خود سُن لو۔

مولانا عبدالمجید سالک

حفیظ صاحب کی شاعری کے متعلق میرا کچھ کہنا بالکل

تحصیل حاصل ہے۔ ملک تسلیم کر چکا ہے۔ کہ وہ بہت
اچھے شاعر ہیں۔ اسلئے بھی کہ ان کا اسلوب
نہایت دلفریب ہے۔ اور اسلئے بھی کہ ان کی شاعری
بے مقصد نہیں۔ بلکہ ہر اچھے نصب العین کی
خدمت و حمایت کے لئے وقف ہے۔ وہ اسلام
کے شاعر ہیں۔ ملت کے شاعر ہیں۔

حفیظ صاحب کی زندگی کا یہ پہلو بے حد
محبوب ہے۔ کہ انہوں نے کبھی کام پر آرام کو
ترجیح نہیں دی۔ ان کی صحت میری معلومات کے
مطابق عمر بھر خراب رہی ہے۔ لیکن ان کی محنت و
جفاکشی۔ ان کی سفر دوستی۔ ان کی کوفت پسندی
کوئی فرق نہیں آیا۔ اہل ملک کو اُن کی زندگی کے
جشن طلائی کو ذوق شوق سے منانا چاہیئے۔ اور دعا
کرنی چاہیئے۔ کہ اللہ تعالیٰ حفیظ صاحب کو بیش از بیش
خدمت ملک و ملت کی توفیق عطا فرمائے۔

سالک

(مصوّرِ مشرق) عبدالرحمٰن چغتائی

مکرم معظم حفیظ صاحب سلام مسنون

"فرسودہ باتیں" یہ میری ایک کتاب کا نام ہے۔ جو میں ایک مدت سے لکھ رہا ہوں۔ اس کتاب میں دوستوں کا ذکر ہے اور ان محفلوں کا بھی جو پھر کبھی نصیب نہ ہوں گی۔ اس کتاب میں آپ کا ذکر بہت ہے۔ بلکہ اس کی ابتدا آپ کے ایک شعر سے کی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا اختتام بھی آپ کے ایک شعر پر ہو — جنگ کے دنوں میں شاہی قبرستان نئی دہلی میں آپ کا دفن ہو جانا اور زندہ نکل آنا آپ کا حصہ ہے۔

میں نے اس کتاب میں تین شاعروں کی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ مخدوم، فیض اور حفیظ۔ اس کتاب میں میں نے اس رات کا بھی ذکر کیا ہے جو ہم سب دوستوں نے پروفیسر بخاری کے ہاں گزاری تھی۔ اور آپ نے بھری محفل میں کہا تھا "ہم ایسے جاہل لکھتے رہیں گے اور آپ ایسے عالم اسے پڑھتے رہیں گے"۔ مجید سالک صاحب بھی اس رات ہم میں موجود تھے۔

میں آپ کا مدّاح بھی ہوں، دوست اور بھائی بھی۔ میں نے آپ کو قریب اور دور سے دیکھا ہے۔ آپ نے جس ہمت سے اپنے فرائض کو انجام دیا ہے۔ میں نے اپنے دوستوں میں ویسا کوئی بھی نہیں دیکھا۔ دنیا میں زندہ رہنا صرف اسی کا حصہ ہے جو دنیا کے دامن کو پکڑ کر بلندی کی طرف اڑتا ہے اور اپنی بلندی سے دوست اور دشمن پیدا کرتا ہے۔

میں نے فنی نقطۂ نگاہ سے آپ کے کارناموں پر تنقید بھی کی ہے۔ مگر سراپا اس طرح ہے کہ حفیظ نے شعر کو زندہ رکھنے کے لئے ہر ممکن اور غیر ممکن آزمائش میں اپنے آپ کو ڈالا، اور پار نکل گیا۔ اگرچہ اس کے دوستوں کو اس سے زیادہ وسائل حاصل تھے۔ زیادہ مطالعہ اور علم تھا۔ اور نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ حالانکہ رسائل اور اخبار اُن کی پشت پناہ تھے۔

خدا آپ کو اپنے خاندان کے لئے، دوستوں کے لئے، قوم کے لئے زندہ رکھے۔ جب تک آپ کا مقصد پورا نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ شاعر اور آرٹسٹ کی یہی معراج ہے کہ وہ اپنے مقصد کو پورا کر سکے۔ اس کے بعد اگر وہ زندہ بھی ہے تو بھی وہ زندہ سمجھا نہیں جا سکتا۔

حفیظ ایک مخلص دوست ہے۔ جس نے دوستوں کی نکتہ چینی پر کان نہیں دھرا، بلکہ یہ نکتہ چینیاں اور تنقید ہی تو ہے جس نے اسے زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

(مُصوّرِ پاکستان) پروفیسر اللہ بخش

حفیظ کی شاعری میں ہماری زندگی اور اس زندگی میں جو کچھ شامل ہے سب کی تصویریں ہیں — فطرت کی تصویریں — انسانی جذبات کی داخلی و خارجی تصویریں — تصویریں ہی تصویریں — جن میں رنگینی ہے سادگی بھی ہے، اور

پُرکاری بھی — یہ تصویریں ہر طبقے اور ہر معیار کی ہیں لیکن سب انسانی اخلاق کو بلند کرنے کے لئے۔

میں مصوّر ہوں۔ میری زندگی کے پچاس سال تصویریں بنانے ہی میں گذرے ہیں۔ میں نے رنگوں سے کام لیا ہے۔ حفیظ نے لفظ استعمال کئے ہیں۔ میری روح حفیظ کے کام کی قدر جانتی ہے۔ اس نے اچھے اچھے مصوّروں کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔

آج میرے بھائی حفیظ یعنی ایک مصوّر شاعر کی پچاس برس کی زندگی پر خوشی منائی جا رہی ہے۔ میں اس خوشی میں دل و جان سے شامل ہوں۔ اور میں نے اس خوشی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنے رنگوں اور حفیظ کے لفظوں کو بغل گیر کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ عنقریب حفیظ کے "نغمہ زار" "سوز و ساز" اور "تلخابۂ شیریں" کی بہت سی نظموں اور گیتوں کو مصوّر کر کے شائع کر دیا جائے گا۔

دعا ہے کہ خدا حفیظ کو عمرِ خضر عطا فرمائے۔

اثر لکھنوی

مکرمی۔ یاد آوری کا شکریہ۔

بڑی مسرت کا باعث ہے کہ آپ حضرات حفیظ جالندھری کی گولڈن جوبلی منا رہے ہیں۔ میں اس تقریب میں ضرور شرکت کرتا مگر صحت اس قابل نہیں رہی کہ دور دراز سفر کی صعوبت برداشت کر سکوں۔ حضرت حفیظ کی خدمت میں میرا ہدیۂ تبریک پیش کر دیجئے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی

جوبلی کی تقریب ایک خاص مدت تک زندہ رہ چکنے کا اعلان نہیں ہے۔ کسی شخص یا ادارے کی جوبلی منائے جانے کا اگر کوئی صالح اور معقول مفہوم ہو سکتا ہے تو یہی کہ اس کی خدمات اور فتوحات کا جائزہ لیا جائے۔ اس کی قدر و قیمت متعین کی جائے اور مستقبل میں اس کی ذات سے مزید سعادتوں کی توقعات وابستہ کی جائیں۔ ورنہ کسی تودۂ خاک کو محض قوالی کے شور و غوغا سے زیارت گاہ میں نہیں تبدیل کیا جا سکتا!

حفیظ نے جن جدت سامانیوں اور ندرت طرازیوں کے ساتھ شعر وسخن کی محفل میں قدم رکھا، نظم کی مختلف اصناف میں ابداع سے کام لیا، پھر ان کے شاعرانہ اجتہادات کو جو قبول عام نصیب ہوا اور اپنے ہم عصروں اور پس روؤں کو انہوں نے جس طور سے اور جس حد تک متاثر کیا یہ سب باتیں ایک مبارک وکامران ادبی داستان کے مختلف گوشے ہیں اور اس میں کلام نہیں کہ یہ خوش طالعی حفیظ کے ماحول اور زمانہ کے کسی دوسرے شاعر کے حصہ میں بہت کم آئی۔

حفیظ نے جوش، اختر شیرانی اور دوسرے ہم عصر شعرا کے ساتھ اردو نظم کو ان جدید رجحانات اور نئے اسالیب سے آشنا کیا جنہوں نے موجودہ دور میں زیادہ واضح اور نمایاں شکلیں اختیار کیں، اس طرح وہ جوش واختر شیرانی کے ساتھ اردو کی جدید ترین شاعری کے پیشرو قرار پاتے ہیں۔ اسکی تفصیل اردو شاعری کے مورخ اور نقاد کا کام ہے لیکن اتنی بات بہر نوع مسلم ہے کہ حفیظ نے اپنی منظری اور محاکاتی نظموں اپنی غزلوں کی تاثیر اور سریلے پن اپنی گیتوں کی مٹھاس اور سرور و توانائی کے سلسلہ میں اپنی دلکش جدتوں سے اردو شاعری کو بہت کچھ دیا، اور بڑی حد تک متنوع بنایا۔

اردو شعر و ادب کو لکھنؤ اور دلی کی گرفت سے
آزاد کرانے میں علی گڑھ نے حالی سے جو کام لیا وہ کسی تفصیل کا محتاج نہیں۔
اسکے بعد اردو شاعری نے جس ہمہ جہت ترقی کا ثبوت دیا وہ کبھی کوئی
راز نہیں ہے۔ حالی کا مسدس پنجاب میں اقبال اور حفیظ کی ملی شاعری
کا جس رنگ و آہنگ سے محرک ہوا اور موخر الذکر دونوں نے
حالی کے نقطہ نظر کو اپنی اپنی طور پر جس طرح فروغ دیا ایک بڑا دلچسپ
اور بصیرت افروز مطالعہ ہے۔ اقبال کے کارناموں سے قطع نظر
حفیظ کے شاہنامہ اسلام کو ایک زمانے میں ایسا فروغ ہوا کہ کوئی
محفل میلاد ایسی نہ ہوتی جہاں شاہنامہ اسلام انتہائی شوق و عقیدت
سے پڑھا یا سنا نہ جاتا۔ بیسویں صدی کی دوسری ربع میں
شاہنامہ اسلام کا یہ قبول عام حفیظ کی شاعری کا خاصا بڑا
کارنامہ تھا!

میں اس جوبلی کو حفیظ کی خدمات کا بڑا مبارک
اعتراف۔ اعلان سمجھتا ہوں۔ لیکن میرا عقیدہ ہے کہ کہ شاعر کوئی
بڑا شاعر نہیں جو صرف اپنے جمع کئے ہوئے سرمایہ پر بقیہ زندگی

بسر کرنے لگے خواہ وہ ذخیرہ کتابوں میں ہو، بلکہ نئے کیوں نہ ہو یا عمر وہی ہے جو اپنے نت نئے کارنامہ میں زندہ رہ سکے۔ حفیظ کو اسکے مواقع رہیں۔ ایسے مواقع جوش یا انکو پہلے کبھی نصیب نہ تھے۔ میں بڑے تردد آمیز شوق سے یہ دیکھتا رہوں گا، کہ حفیظ کیا کرتے ہیں! خصوصاً ان کے شوق اور حوصلہ کو بڑھاتے اس اعتبار سے اور اسی کے خاطر انکی زندگی کو میں آزمائش سے بچنے کی دعا نہیں کر سکتا آزمائش سے عہدہ برا ہونے کا حوصلہ پیدا ہونے کی دعا بڑے شوق سے مانگتا ہوں

رشید احمد صدیقی
شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۱۱ مئی سنہ ۱۹۵۰ء

پروفیسر تاج محمد خیال

حفیظ صاحب کی جوبلی کے موقع پر مندرجۂ ذیل سطور میری طرف سے پڑھ دیجئے۔ ممنون ہوں گا۔ یہی میرا پیغام ہے آپ چاہیں تو اسے شائع بھی کر سکتے ہیں:

"میں حفیظ صاحب کو اس زمانے سے جانتا ہوں جب کہ وہ ابھی ابوالاثر حفیظ نہ تھے۔ بلکہ سوسائٹی کے مظلوم حصہ کے ذہین رکن ہونے کی حیثیت سے اپنے آپ اور اپنے ماحول کو بدلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی تمام زندگی ایک مسلسل کش مکش ہے جس کی ابتدا جوانی میں نہیں بلکہ بچپن میں ہو چکی تھی۔ اس طویل عرصے کے بعد اب یہ بات مسلم ہے کہ حضرت حفیظ ان بلند پایہ انسانوں میں شمار ہو سکتے ہیں جو اپنی زندگی آپ بناتے ہیں۔ جو ابتدائی مالی اور

علی کمزوریوں کو خاطر میں نہ لاکر اپنے مقاصد کی تحصیل کے لئے کوشاں رہتے ہیں اور آخر کامیاب ہوتے ہیں۔ میری نگاہ میں ایسے انسان قابلِ صد تحسین ہیں اور میں ان کی دل سے قدر کرتا ہوں۔

حضرت حفیظ نے شعر و ادب کی جو خدمت کی ہے وہ اس قدر معروف ہے کہ اب کسی اعتراف یا تعریف کی محتاج نہیں۔ اسی لئے اس کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔

خدا اُن کی عمر میں برکت دے اور بیش از بیش خدمت کا موقع بخشے!"

چراغ حسن حسرت

حفیظ ہمارے ملک کے ان شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے ہم عصر شعراء کو بہت متاثر کیا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اردو شاعری کی تاریخ لکھے اور حفیظ کو نظر انداز کر جائے۔ ان کی شاعری میں ترنم کے ساتھ ساتھ بڑا لوچ اور گداز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی غزلیں اور گیت اردو شاعری میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

مُمتاز حَسن

۲۵۶ء، انکل روڈ، کراچی
۱۰/ر مئی سنہ ۱۹۵۰ء

محب دلنواز! میں مشرقی میں
کچھ عرصے کی سرکاری آوارگی (جسے عرفِ عام میں
'دورہ' کہا جاتا ہے) کے بعد کراچی واپس آیا۔ تو
ضمیر جعفری صاحب کا دعوت نامہ ملا۔ میں سوچے

اس کا یقین کر سکتا ہوں کہ حفیظ کو یہ
'جشنِ طلائی' مبارک ہو۔ اور خدا اسے
ایسے بہت سے جشن نصیب کرے۔ میں اگر
مشرقی پاکستان نہ بھی گیا ہوتا۔ تو بھی راولپنڈی
پہنچنا مشکل تھا۔ کام کاج آجکل اس قدر ہے
کہ سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی۔ اور بقول
عبداللہ چغتائی "فرصت ملتی ہے تو وقت نہیں
ملتا"۔ تمہارے جشنِ طلائی کے متعلق ایک عرصہ
ہوا خبر ملی تھی۔ اس کے بعد ایک مدت تک
بے خبری رہی۔ یعنی اگرچہ اس کی تیاری کے متعلق
اخبار خبریں دیتے رہے مگر وہ مجھ تک نہیں پہنچیں۔
خیال تھا کہ وہ مضمون جس کی ابتدا پچھلے سال کی تھی۔

اس سال مکمل ہو جائیگا۔ اور جشن کے موقع پر
پیش کر سکوں گا۔ مگر وہ کاغذات ہی لاپتہ ہیں۔
بہرحال خدا نے چاہا تو اسے خواہ دوبارہ ہی
کیوں نہ لکھنا پڑے۔ میرا احساس یہ ہے کہ اگرچہ
حفیظ کی قوم نے اسے پہچانا۔ اور اپنا شاعر سمجھا۔
دنیائے شعر و ادب میں اس کی ذات اور اس کے
کارنامے کی کما حقہ قدر نہیں کی گئی۔ اسی لئے میں نے
جرأت کی تھی کہ شاید کسی حد تک دوسروں کی
رہنمائی کر سکوں۔

باقی کیا لکھوں۔ کراچی آؤں تو تم
سے باتیں کروں۔ بہت سی باتیں ابھی

تک تو یہی افسوس ہے کہ اپنی مصروفیتوں اور مجبوریوں کے سبب تمہارے جشن طلائی میں شامل نہ ہوسکا

نظر بخویش شکستہ ام کہ جلوہ دوست
جہاں گرفت و مرا فرصت تماشا نیست

کراچی ایک صحرا ہے اور میں
صحرا نشین

شاد عارفی

حفیظ صاحب سے میری ملاقات تقریباً دو گھنٹے سے زیادہ نہیں رہی - وہ بھی اس وقت جب میں لاہور کے ایک مشاعرے میں مولانا تاجور کی حیات میں لاہور پہونچا موصوف شام کے وقت لان میں ایک آرام کرسی پر دراز تھے دوسرے شعرا اپنی اپنی کرسیوں پر لان میں بیٹھے تھے۔

میں پہونچا تو احسان دانش صاحب نے تعارف کرایا ـــ تعارف کے بعد موصوف کا رنگ بالکل برادرانہ اور پرخلوص رہا ـــ اس کے بعد ـــ جدا ہوگئے پھر مشاعرے کے پنڈال میں دور سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے - ریڈیو والوں کے انتخاب کے سلسلے میں میں نے انتخاب برداشت نہ کیا، اس لئے اس مشاعرے سے نظم پڑھے بغیر چل دیا - اور تاجور مرحوم

کے ہاں قیام کرکے واپس چلا آیا۔

...... تو اس مختصر سی یکجائی میں کوئی ایسی بات ہاتھ نہ لگی جسے میں اس وقت نمک مرچ لگا کر بیان کروں صرف موصوف کے اخلاق کا تاثر بے شک آپ تک پہونچا سکتا ہوں۔ رہ گیا موصوف کی شاعری پر تبصرہ یا نقد و نظر کا مرحلہ تو وہ بھی فرصت طلب ہے۔ کیوں کہ حفیظ صاحب کی شاعری ٹڈی دل کی طرح کم سے کم دس میل کے اندر پھیلا ہوا ہے صرف "شاہ نامۂ اسلام" ہی کو لے لیجئے۔ اور اس کی آمد اور ندرت بیان پر لکھتے جائیے ابوالفضل والے دفتر کے دفتر۔ پھر۔ آخر میں غالب کی زبان میں لکھئے کہ ع

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے

چاہئے اس بحر بے کراں کے لئے، ـــ اگر کہیں گے کہ انہیں چاہئے، تو میں آپ سے دست و گریباں ہونے میں تامل نہ کروں گا۔ کیوں کہ کسی ہٹ دھرم کو کسی بات پر آمادہ کرنے کے لئے گتھم گتھا ہونا ضروری ہے ورنہ وہ مرغ کی ایک ٹانگ پر اڑا رہے گا۔ اس لئے عموماً مرغ کی دو ٹانگیں ثابت کرنے کے لئے "ہشت" کہنا ضروری ہے۔ اس "ہشت" کا لطف وہی حاصل کر سکیں گے جنہیں "مرغ کی ایک ٹانگ" کا لطیفہ معلوم ہے۔ جی چاہتا تھا کہ میں یہ لطیفہ بیان کر دوں مگر اس خیال سے کہ آپ اس میں اپنی معلومات عامہ کی توہین نہ سمجھیں، خاموش رہ رہا ہوں۔ اور حفیظ صاحب سے چھوٹی سی ملاقات پر ایک چھوٹا سا مقدمہ لکھ کر آپ کی فرمائش کا پیٹ بھر دینا چاہتا ہوں۔ اور غالباً اس طرح کہ آپ مطمئن ہو جائیں گے کہ واقعی میں نے کاوش نظر سے کام لے کر دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے ـــ جہاں ایک گندی مچھلی تالاب کو گندہ کر سکتی ہے وہاں ایک اچھا چاول اپنے پورے خرمن کی عمدگی کا پتہ دیتا ہے۔ چنانچہ "بانگی" اور "نمونہ" اسی اعتبار سے "معیار" تصور کیا گیا ہے کہ ہم جزء سے کل پر عبور حاصل کر سکیں ـــ اسی کو غالب نے "قطرہ میں دجلہ دکھائی دینے" سے تعبیر کیا ہے۔

میں نے ادھر ادھر کی باتیں بنا کر آپ کو کافی پریشان کیا ہے اور ابھی اور امکان ہے کہ اپنے ساتھ لٹکائے چلوں مگر اب میں خود بور ہو چکا ہوں۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ طشت میں بھیگے ہوئے "تیموریہ" یعنی لنگڑے آم" دعوتِ طعام دے رہے ہیں۔ اس لئے مقطع عرض ہے۔ یعنی بیشتر مشہور شعرا کا ایک ایک شعر ان کی زندگی پر حاوی رہا ہے۔ اور زندۂ جاوید

مثلاً مومن خاں کا "تو کہاں جائے گی" والا شعر۔ تبد کا "دکھایا کنج قفس مجھ کو آب و دانہ نے"، اور نظام رامپوری کا انگڑائی والا شعر ان کی تاریخی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ اسی طرح حفیظ جالندھری یہ سب کچھ نہ کہتے جو اُن سے منسوب ہے ان کی ادبی حیثیت اور شاعرانہ وقار کسی تعارف کے محتاج نہ تھے۔ میرا خیال ہے کہ، موصوف کا یہ شعر ان کی شخصیت کو اہرام مصر کی طرح "ٹھوس" لافانی بنائے رکھے گا۔

آپ تو بے تاب ہیں۔ لیکن یہ بے تابی اچھی نہیں۔ کیوں کہ ڈاکٹر اقبال نے شاہین سے کہا تھا کہ کبوتر کے خون میں وہ مزہ نہیں جو اس پر جھپٹنے میں ہے۔

اسی مضمون کو میں نے اپنے انداز بیان کے تحت یوں کہا ہے ؎

خواہش کی تکمیل میں عجلت کھوتی ہے تکمیل کا لطف
"آنکھ ملائے جا ساقی سے ہاتھ بڑھا دے جام نہ لے"

تو..... میرے نزدیک حفیظ صاحب کی عمر بھر کی شاعری کا لب لباب یہ شعر ہے ؎

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

اس شعر میں کیا کمی رہ گئی ہے بتائیے۔ کیا زندگی کا کوئی ایسا پہلو ہے جس کو اس نے احاطہ نہ کیا ہو؟ میں نہیں سمجھتا کہ دنیائے ادب ایسے شاعر کو جس نے یہ شعر کہا ہو، کس طرح بھلا سکے گی؟

پیر علی محمد راشدی

فردوسی اسلام ابوالاثر حفیظ جالندھری نے اردو ادب اور ملت کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ ہمیں مسرت ہوئی کہ آپ حفیظ کی گولڈن جوبلی منا رہے ہیں۔ ہماری رائے میں اس موقع پر اگر آپ حفیظ کی کوئی مستقل یادگار قائم کرنے کی کوشش کریں تو یہ ان کی خدمات کا صحیح اعتراف ہوگا۔

حمید نظامی

میں حفیظ کے متعلق کیا لکھوں؟ میں نہ شاعر ہوں نہ مجھے سخن فہمی کا دعوے ہے۔ حفیظ کو قریب سے دیکھنے اور جاننے کا شرف ضرور حاصل ہے۔ اور میرے نزدیک اس کی سب سے قابل قدر متاع اس کا دردمند اور حساس دل ہے جو اپنی قوم، اپنے ملک اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کی محبت سے معمور ہے۔ حفیظ کا خلوص ہی اس کی شاعری کی جان ہے۔ باقی میں تو عروض سے بھی واقف نہیں۔ حفیظ نے ملت کی جو خدمت کی ہے اس کا دل سے معترف ضرور ہوں۔

الحاج خواجہ ناظم الدین

مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ ۱۴ رمئی کو پاکستان کے شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری کی گولڈن جوبلی منانے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ یہ اہل پاکستان کی جوہر شناسی کا بڑا ثبوت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تقریب ایک قومی شاعر کے شایان شان منائی جائے گی۔

اس برصغیر ہند و پاکستان میں حفیظ کا شمار چوٹی کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ کسی شاعر کی مقبولیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے اہل وطن اس کی زندگی ہی میں اس کے متعلق اظہار جذبات کے لئے ایک ایسا موقع نکالیں۔

حفیظ نے اپنی پچاس سال کی عمر میں ادب کی خدمت کے لئے جو راہ بھی اختیار کی خواہ وہ رسالہ "مخزن" کی صورت میں ہو یا شاہنامۂ اسلام کی شکل میں "قبولیتِ عام" نے اس کا دامن نہ چھوڑا۔ کچھ عجیب نہیں کہ یہی شاہنامہ اسلام" اس کی بقائے دوام کا سبب بن جائے۔
میں اس موقع پر جناب حفیظ کو اس قبولِ عام پر اور اہلِ پاکستان کو اس قدر شناسی پر تہِ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔

سردار عبدالرب نشتر

میں ابوالاثر حفیظ جالندھری صاحب کی گولڈن جوبلی منائے جانے کے خیال کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ حفیظ اس دور کے مشہور ترین شعرا میں سے ہیں، اور اپنی بیش بہا تخلیقات کے لئے وہ اردو ادب میں نہایت اہم مرتبہ رکھتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ وہ ابھی دیر تک زندہ و سلامت رہیں، اور اپنی قومی زبان کی بیش از بیش خدمت کر سکیں۔

نواب مشتاق احمد گورمانی

آج ہم اپنے وطن کے مشہور شاعر و ادیب حفیظ کی پچاس سالہ جلیل القدر ادبی خدمات کا اعتراف کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔ یوں تو دنیا کی تمام زندہ اور آزاد قومیں جلدی یا دیر سے اپنے مشاہیر کی عزت افزائی اور ان کی خدمات کا اعتراف کرتی چلی آئی ہیں، لیکن بہت کم مشاہیر کو اپنی زندگی ہی میں اپنی قوم سے خراج تحسین حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔
اس لحاظ سے میں محض حفیظ ہی کو خوش قسمت نہیں سمجھتا بلکہ حفیظ کی اس عزت افزائی کو پاکستان کی قومی زندگی کے لئے بھی ایک نیک فال سمجھتا ہوں۔ قابلِ مبارکباد ہے وہ قوم جس میں بچپن ہی سے فرض شناسی اور احسان مندی کے جوہر موجود ہوں، اور جس کی بلیغ نظر اپنی سہ سالہ زندگی ہی میں تعمیرِ قومی کے مختلف شعبوں کا جائزہ لینے کی صلاحیت رکھتی ہو۔
شاعری کے میدان میں حفیظ اپنی طرز کے موجد ہیں۔ عوام کے جذبات کی ترجمانی جس خوش اسلوبی سے حفیظ اپنے کلام میں کرتے ہیں۔ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ حفیظ کے گیتوں اور نظموں کو جو قبولِ عام حاصل ہوا ہے وہ بہت کم شاعروں کی خدمات کو میسر ہے۔ ان کی بیشتر نظمیں ہمارے قومی جذبات کا مرقع ہیں۔ ان کے گیتوں نے جہاں ادبی محفلوں اور ایوانوں کو نغمہ زار بنایا ہے وہاں لہلہاتے کھیتوں میں بھی ترنم پیدا کیا ہے۔ انہوں نے اپنے نرالے سوز و ساز سے زندگی کے تلخ پہلوؤں کو شیریں بنانے کی کوشش کی ہے۔ حفیظ کی حساس طبیعت نے جہاں قوم کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کی ہے وہاں اسے اسلامی کردار اور اخلاق سے بھی روشناس کرایا ہے۔ جب حفیظ کا کلام بارگاہِ خیر الانام میں مقبول ہوا تو انہیں شاہنامۂ اسلام لکھنے کی توفیق ارزانی ہوئی جس کی بدولت

انہوں نے فرزندانِ توحید کو اپنی شاندار روایات اور روشن ماضی سے متعارف کرایا۔ اور انہیں اپنا اصلی مقام پہچاننے میں مدد دی۔ شاہنامۂ اسلام درحقیقت انسانیت کے ارتقا کی منظوم تاریخ ہے۔ یہ ان نقوش کا خاکہ ہے جو نقاشِ حقیقی کی بہترین صنعت کا نمونہ ہیں۔ یہ وہ بیاض ہے جس میں قوموں کی بلندی اور سرافرازی کے مجرب نسخے درج ہیں۔ یہ اس شمعِ ہدایت کا عکس ہے جو ہمیشہ شاہراہِ ترقی پر اقوامِ عالم کی ہدایت اور رہنمائی کا موجب رہے گی۔

خواجہ شہاب الدین

مجھے یہ سن کر انتہائی مسرت ہوئی ہے کہ حضرت حفیظ جالندھری صاحب کی گولڈن جوبلی منائی جا رہی ہے۔ ملک کی تعمیر و ترقی میں شاعروں کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ حفیظ صاحب نے شاہنامۂ اسلام لکھ کر ملت کی بیش بہا خدمت انجام دی۔ اور ہماری قومی زندگی میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ ان کی عمر میں برکت دے۔ اور انہیں ملت کی بیش از بیش خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میجر جنرل آغا محمد رضا

یوں تو میں حفیظ صاحب کو عرصہ پچیس سال سے جانتا ہوں۔ تاہم میرے روابط ان سے جنگِ عالمگیر کے زمانے میں زیادہ ہوئے۔ جب وہ حکومت ہند کے ماتحت رزمیہ گیتوں کے ذریعے ہندوستانیوں کے دلوں میں جنگی ولولے ابھارنے کی مہم پر مامور تھے۔ یہ کام انہوں نے جس خوبی سے نبھایا، نتائج اس پر شاہد ہیں۔ اس کے بعد برِعظیم ہند کا بٹوارہ ہوا۔ اور اگرچہ حفیظ کی شاعری وہ ناقابلِ تقسیم ملکی جائیداد تھی جس میں پاکستان اور بھارت برابر کے شریک تھے۔ تاہم وہ خود ذاتی طور پر پاکستان کے حصے میں آئے، اور انہوں نے راولپنڈی میں قیام کیا۔

یہاں انہوں نے اپنے فن خداداد کو جہادِ کشمیر کے لئے وقف کر دیا۔

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے پاکستانی فوج کے ایڈجوٹنٹ جنرل کی حیثیت سے ان کی خدمات فوج کے جوانوں کو درسِ شجاعت و ہمت دینے کے لئے حاصل کیں۔ وہ یہ خدمات جس شان دار طریقے سے انجام دے رہے ہیں محتاجِ بیان نہیں۔

پاکستانی فوج کے ہر جوان کے لئے ان کے اشعار جنہیں وہ اپنی سوز و گداز بھری ہوئی ترنم آواز میں اُن کے کانوں کے ذریعے ان کے دل کی گہرائیوں تک پہونچاتے ہیں، ایک الہامی پیغام کا حکم رکھتے ہیں۔

چودھری نذیر احمد

حفیظ نے ملّت اسلامیہ کی جو خدمت آج تک کی وہ کسی سے مخفی نہیں۔ حفیظ کو شاعر اسلام کہئے یا مصنّف شاہ نامۂ اسلام، واقعہ یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی کا ایک بڑا قیمتی حصہ اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر کے مسلمانوں پر ایک ایسا احسان عظیم کیا ہے جس کو ہم آسانی سے نہیں بھول سکتے۔ مبالغہ نہ ہوگا، اگر میں یہ کہوں کہ حفیظ کی شاعری نے اس ذہنیت کی تربیت میں ایک نمایاں حصہ لیا ہے جس ذہنیت کا عکس ہم آج پاکستان کے قیام کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔

حفیظ سے دیرینہ اور قلبی مراسم کی بنا پر میں ان سے درخواست کروں گا کہ ع

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

کے بلند ترین اصول کو کبھی دل سے نہ بھلائیں۔ کیوں کہ ان کی شاعری کا "عہد زریں" وہی زمانہ رہا ہے جس میں اُس نے محض شاعر کی حیثیت سے کچھ کہا ہے۔

میری دعا ہے کہ بقول حفیظ، حفیظ "جوان" رہے اور قوم کو جوانی کے ولولہ انگیز پیغاموں سے گرماتا رہے۔

(خان بہادر) ایس۔ایم۔شریف

حفیظ نے شاہ نامۂ اسلام لکھ کر ہمارے اسلاف کے عظیم الشان کارناموں کو از سرِ نو زندہ کیا ہے۔ اس کی جذبے اور لے میں رچی ہوئی غزلیں اور سہانے گیت اردو ادب و شعر کا ایک حسین کارنامہ ہیں میں اپنی طرف سے اور محکمۂ تعلیم کے نمائندے کی حیثیت سے انہیں اس پچاس سالہ جوبلی کی تقریب پر ہدیۂ مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

چودھری غلام عباس

حفیظ اپنی لازوال شاعری، اچھوتے فکر، شوخیٔ بیان اور موقر قومی و ملّی خدمات کی بدولت عام تعارفی مراسم یا سلور یا گولڈن جوبلی کی تقاریب سے مستغنی ہو چکے ہیں۔ جو علم و ادب پر حفیظ کے پیہم احسانات ہیں اور جو ملّی خدمات کا بوجھ انہوں نے آج تک اٹھایا ہے، زباں زد عام حقیقت ہے۔ البتہ آپ نے ان کی گولڈن جوبلی منانے سے ان کے شیدائیوں، فداکاروں اور قدر دانوں کی طرف سے اظہار عقیدت کا ایک اہم اور دلچسپ تقاضا پورا کیا ہے۔

آپ اس مستحسن فریضے میں مجھے بھی اپنا ہم نوا تصوّر فرمائیں۔ کیوں کہ آپ کی طرح بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ میرے اور حفیظ کے درمیان ذاتی مراسم ہیں..... مجھے امید ہے کہ یہ تقریب اسی خلوص و عقیدت اور آب و تاب کے ساتھ منائی جائے گی جو حفیظ کے شایانِ شان ہو۔

خلیفہ شجاع الدین

حفیظ جالندھری کی گولڈن جوبلی منانے کا خیال نہایت مبارک ہے۔ حفیظ کی ملّی اور ادبی خدمات یقیناً اس قابل ہیں کہ قوم ان کا ایک منظم طریق پر اعتراف کرے۔ اور یہ گولڈن جوبلی اس اعتراف کی بہترین صورت ہے شاہنامۂ اسلام ایک ایسی بلند پایہ تصنیف ہے کہ اس کی وجہ سے حفیظ کا نام رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ لیکن حفیظ کے دیگر کارنامے بھی ایسے نہیں جن کو نظر انداز کیا جا سکے۔ بالخصوص ان کی وہ معرکہ آرا نظمیں جو انہوں نے وقتاً فوقتاً انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں سنائیں۔ اور جنہوں نے اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ ان کی وجہ سے انجمن کو ہزاروں روپیہ چندہ وصول ہوا۔

میں تو خاص طور پر حفیظ کا ممنون ہوں کہ کئی مرتبہ جب انہوں نے سالانہ جلسے میں تشریف لانے سے انکار کر دیا تو میری ذاتی درخواست پر وہ نہ صرف تشریف لائے بلکہ حاضرین کو اپنے کلام معجز نظام سے اتنا گرمایا کہ روپے کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ اللہ تعالےٰ انہیں تا دیر سلامت رکھے۔ آمین۔

ابنِ انشا

جناب صہبا!

حفیظ صاحب کے متعلق چند یادداشتیں رقم کی تھیں۔ مسودہ کہیں کھو گیا۔ اب مل بھی جائے تو فائدہ؟ آپ کہیں گے ؎

ہم سے دفتر نہیں دیکھا جاتا!

اسی نامۂ معذرت کو تحفۂ نیاز سمجھئے۔

حفیظ صاحب سے میری دوستی اور نیاز مندی کو سات برس ہوتے ہیں۔ ان میں محبتیں بھی رہیں اور لڑائیاں بھی۔ لڑائیاں تو آخر پشیمانیوں سے دھل گئیں محبتیں زیادہ پائیدار ثابت ہوئیں، بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ ان پر جلا ہوتی گئی۔ آپ سے اور قارئین افکار سے اس باہمی ربط ضبط، راز و نیاز اور معاملات من و تو کا افسانہ کیا کہیں ــــ حدیث دل انہی لوگوں تک محدود رہنی چاہیئے جن سے اس کا تعلق ہے۔ اب وہ ایام خواب کی سی باتیں معلوم ہوتے ہیں۔ اور کسی کے فائدے نقصان کی بات نہیں کرتا۔ حفیظ سے دل بستگی نے خود میری شخصیت کو جو سوز و ساز بخشا ہے وہ میری شاعری میں صاف جھلکتا ملے گا۔

حفیظ کی "نغمہ زار" اور "سوز و ساز" میں نے عمر کے گیارھویں برس میں اپنے گاؤں کی لائبریری سے لے کر پڑھیں کسی شاعر کے باقاعدہ اور بھرپور مطالعے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اور اس کا اثر بھی قدرتاً زیادہ گہرا اور پائیدار ثابت ہوا یہ ایک طرح میری خوش قسمتی تھی کیوں کہ یہ دونوں کتابیں اردو میں سچی شاعری کے نمونے ہیں۔ اس بات کو بہت برس ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے سیکڑوں نہیں تو درجنوں اشعار ضرور اسی زمانے سے یاد ہیں۔ جب میں نے ایک دو

سال بعد شاعری میں ٹوں ٹاں شروع کی تو وہ حفیظ کے اسلوب سخن ہی میں تھی۔

میں نے اپنے گم شدہ مضمون میں ان کی جرأت و ہمت اور بڑوں کے مقابلے میں صلابت کی داستانیں لکھی تھیں۔ ان کے دہرانے کا موقع نہیں۔ وہ جو چاہتے تھے کسی نہ کسی طور کر گذرتے تھے۔ جس زمانے میں ہمارے پاس کراچی کے ملٹی سٹوری دفتر میں صرف ایک کمرہ تھا اور ہماری سپاہ میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا اور ارباب حل و عقد ہماری ضروریات سے غفلت اختیار کئے ہوئے تھے۔ ایک روز قریب دوپہر سیکڑوں کمروں اور پانچ منزلوں کی یہ عمارت جس میں وزیر اور سکریٹری امور داخلہ اور صنعت و حرفت، فنانس اور کامرس، لیبر اور آبادکاری۔۔۔ نہ جانے کیا کیا وزارتیں لئے بیٹھے تھے۔ طبلے کی دھمک اور ہارمونیم کی آوازوں سے گونج اٹھی۔ لوگ پہلے چونکتے ہوئے کہ اس ماحول میں یہ آوازیں۔ پھر استعجاب کے مارے بھگدڑ مچاتے اس کاریڈور میں ہجوم کر آئے جس کے ایک کمرے پر ابوالاثر حفیظ جالندھری کا بورڈ لگا تھا۔ محمود تھاپ دے رہا تھا۔ عنایت خاں ستار بجا رہا تھا استاد قادر پیارنگ کان پر ہاتھ رکھے کوئی اونچی تان اڑا رہے تھے۔ اور میں اور احمد بشیر محظوظ ہو کر سر ہلا رہے تھے کہ ایک افسر بالا ڈرتا جھجکتا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، اور بولا:

"حفیظ صاحب یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"جناب ویلج ایڈ کے ایک ترانے کی دھن بن رہی ہے۔ آپ بھی سنئے۔"

"لیکن یہاں؟"

"جی ہاں۔ یہ قومی کام ہے جو میرے سپرد کیا گیا ہے۔ اور آپ کے کام سے زیادہ اہم ہے۔ یہ تو یونہی ہوگا۔ ہاں تو استاد قادر۔۔۔"

دوسرے روز ہمیں ایک لق و دق دفتر دے دیا گیا۔ کوئی چار میل دور۔ دینے والے بھی خوش، لینے والے بھی خوش۔ پانچ سال میں ہم نے چھ دفتر بدلے، اور کچھ اسی شان سے۔ ایک دفتر جو ایک بنک کے ساتویں مالے پر تھا ان کی غیر موجودگی میں بدلا گیا۔ پندرہ دن مال اسباب میزیں کرسیاں سیڑھیوں سے اوپر پہونچانے میں لگے، اور پندرہ دن فوراً ہی نیچے اتارنے میں۔ کیوں کہ حفیظ صاحب دورے سے واپس آ گئے تھے۔ انہوں نے نیچے ہی سے اُوپر دیکھ کر کہا:

"دفتر؟ میں تو اوپر نہیں چڑھوں گا۔ یہاں بنکوں اور بیمہ کمپنیوں کے ماحول میں تخلیقی کام ہو سکتا ہے؟ اُتارو سامان۔۔۔"

اب کے جو دفتر انہیں دیا گیا شہر سے بارہ کوس باہر ویرانے میں تھا۔ جہاں دن کو اُلو بولتے تھے اور رات کو گیدڑ۔ اس دفتر کی ویرانی وہیں سے شروع ہوئی۔ حفیظ باہر گئے۔۔۔ پھر تو لوگوں نے جو ناک میں تھے میرے، سید ضمیر جعفری اور احمد بشیر کے سارے بل بوتے کے باوجود محکمہ ہی توڑ تاڑ کے رکھ دیا۔

شاہنامۂ اسلام کے مصنف کو میں نہیں جانتا۔ ہاں اس دھوم مچانے والے کھلنڈرے بچے کی داستانیں کو سنی ہوں جسے حفیظ کہتے ہیں جو مچلتے پارے کی ایک ڈلی ہے جو کڑکتا بھی ہے اور گمزر ہو کر پھیل بھی جاتا ہے۔۔۔ سو وہ ہم سے ملے۔

خوب صورت اور معیاری کتابیں

پروفیسر سید نواب علی

○ تاریخ صحف سماوی (تاریخ و تحقیق) =/۵

○ معارج الدین المعروف سائنس اور اسلام (〃) ۴/۷۵

کرشن چندر

○ ایک وائلن سمندر کے کنارے (نیا ناول) =/۶

○ ایک عورت ہزار دیوانے (ناول) =/۵

○ باون پتے (ناول) ۶/۵۰

○ ایک خوشبو اڑی اڑی سی (۱۶ نئے افسانے) ۵/۲۵

○ کالا سورج (۱۶ افسانے) ۴/۵۰

مجتبیٰ حسین

○ ادب و آگہی (نئے تنقیدی مضامین) =/۷

○ تہذیب و تحریر (تنقیدی مضامین) =/۵

انور عظیم

○ دھواں دھواں سویرا (نیا ناول) =/۸

جوگندر پال

○ اک بوند لہو کی (نیا ناول) ۴/۲۵

صہبا لکھنوی

○ میرے خوابوں کی سرزمین مشرقی پاکستان (سفرنامہ ڈائری) =/۴

○ مجاز ایک آہنگ (شخصیت و فن) =/۱۰

○ جوش نمبر مجلد دوسرا ایڈیشن باضافہ (〃) =/۱۲

پروفیسر شور علیگ

○ نبض دوراں (مجموعہ کلام) =/۶

سید آل رضا

○ غزل معلی (مجموعہ کلام) =/۵

آپ اچھی کتابیں پڑھتے ہیں
ہم اچھی کتابیں شائع کرتے ہیں

فہرست طلب کیجئے

مکتبہ افکار۔ رابسن روڈ۔ کراچی

فون :- ۷۳۹۹۳

(مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی طابع: مشہور آفسٹ پریس کراچی ۔ دفتر رابسن روڈ کراچی)